www.KitaboSunnat.com

تفسیر

أحسن الکلام

للشیخ ابی زکریا سید عبد السلام الرستمی رحمہ اللہ

ترجمہ وتخریج

نصیب شاہ سلفی منجاکوٹی

جلد سوم

سورۃ مائدہ تا سورۃ رعد

حقوق طبع محفوظ ہیں

وَهَٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ أَنزَلْنَاهُ ... وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

تفسیر

أحسن الكلام

للشیخ أبی زکریا سید عبد السلام الرستمی ؒ

ترجمہ و تخریج

نصیب شاہ سلفی منجاکوٹی

جلد سوم

سورۃ مائدہ تا سورۃ رعد

مکتبہ محمدیہ

نیو حاجی کیمپ سلطان آباد کراچی

0343-5302948

(تمام جملہ حقوق محفوظ ہیں)

کتاب کا نام : تفسیر حسن الکلام

مصنف : شیخ القرآن سید عبدالسلام رستمی رحمہ اللہ

مترجم : شیخ نصیب شاہ سلفی منجاکوٹی حفظہ اللہ

اشاعت اول : 2021

ملنے کا پتہ : مکتبہ محمدیہ ٹیو حاجی کیمپ سلطان آباد کراچی

0300-2615407 - 0347-5114825

جامعہ عربیہ لاشاعۃ التوحید والسنۃ بڈھ بیر، پشاور۔ 0313-8580079

اسکے علاوہ پاکستان کے ہر بڑے شہر کے معروف مکتبہ سے حاصل کریں

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
.1	جہالت کے مظالم کا ذکر	1
.2	شعائر اللہ کی تفصیل	4
.3	حرام چیزوں کی تفصیل	6
.4	اکملت لکم دینکم کے نزول کے بعد آپ 81 دن حیات رہے	9
.5	اہل کتاب خواتین سے نکاح	13
.6	تیمم کا مسئلہ	17
.7	نبی کریم نور یا بشر تھے	25
.8	نصاریٰ کا باطل دعویٰ	29
.9	عیسیٰ محمد علیہم السلام کے مابین مدت اور وقفہ	31
.10	صحابہ کرامؓ کے جذبات کا اظہار کہ ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں ہیں	35
.11	مقتول بنو اور قاتل نہ بنو	38
.12	مسلمان کا خون تین وجوہات کے علاوہ بہانا حرام ہے	41
.13	وسیلہ کے مسئلے پر تفصیلی بحث	44
.14	شرعی وسیلہ کی اقسام و دلائل	48
.15	غیر شرعی وسیلہ	51
.16	اشکالات کے جوابات	54
.17	موضوعی روایات	58
.18	عثمانؓ بن حنیف کی حدیث کا غلط مفہوم اور اس کا ازالہ	57
.19	قصاص میں ہر عضو کا بدلہ برابری کا ہے	69
.20	تمام نبیوں کا دین ایک ہے	72
.21	قرآن وسنت کے خلاف تمام احکامات جہالت پر مبنی ہیں	76
.22	اہل کتاب کی دوستی سے منع کیا گیا ہے	76
.23	نبوت کے جھوٹے دعوے	79
.24	دوستی کے قابل لوگ کون سے ہیں	80
.25	ہر وہ قول وفعل بیان کرنا نبی کی ذمہ داری تھی جو سبب نجات تھا	91
.26	اہل کتاب کے باطل عقائد	95
.27	قسم کے احکام کفارہ وغیرہ	109
.28	شراب کی حرمت اور اس کی تفصیل	112
.29	عہد میں شہید صحابہ کرام کے شراب نوشی سے متعلق سوالات کے جواب	115
.30	حالات احرام میں شکار سے متعلق تفصیلات	118
.31	بے فائدے سوالات سے منع	123
.32	عمرو بن لحی نے عرب میں شرک منتقل کیا	127
.33	آیت 107 کی تفسیر اور چوری کا قصہ	134
.34	قیامت والے دن علم غیب سے نبیوں کا انکار	138
.35	عیسیٰ علیہ السلام سے علم غیب کی تفصیلی نفی	140
.36	مرزا قادیانی کی کفر پر صریح دلیل	142
.37	نزول مائدہ کے لئے دعاء	144

.38	صفا پہاڑی کو سونا بنانے کی دعا اور جبریل	147
.39	سورۃ انعام	154
.40	اہل توحید پر امتحانات	178
.41	مشرکین کے سوالات کے جوابات	179
.42	آیت 65 کی تشریح میں تین دعاؤں میں سے ایک رد ہوئی	185
.43	بے دین لوگوں کی مجالس سے اجتناب لازم ہے	187
.44	نفخ فی الصور قرآن میں 10 مرتبہ مذکور ہے	191
.45	17 انبیاء سے عقیدہ توحید پر دلیل نقلی کا ذکر ہے	198
.46	سابقہ ادیان بھی ہمارے لئے حجت ہیں بشرطیکہ	201
.47	آداب دعوت	214
.48	جس کیساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کریں اسکا سینہ دین کیلئے کھول دیتے ہیں	223
.49	بقول ابن عباس جس نے عرب کی جہالت دیکھنی ہو سورۃ انعام آیت 130 سے آگے پڑھے	229
.50	یہودیوں کی طرح حیلہ بازی مت کرو	235
.51	دین میں تفرقہ بازی سے منع	243
.52	سورۃ انعام کی خصوصیات	247
.53	سورۃ الاعراف: قیامت والے دن اعمال کا وزن بکثرت تعداد سے نہیں بلکہ قرآن وسنت کی موافقت سے ہوگا	251
.54	شیطان کے کہنے پر حلال وحرام کے فیصلے مت کرو	259
.55	قیامت والے دن برہنہ بغیر ختنہ کے پیدائش	260
.56	مجرم کی روح کیلئے آسمان کا دروازہ نہیں کھلے گا	264
.57	جنت وجہنم والے براہ راست گفتگو کریں گے	269
.58	استویٰ کی تشریح وتفسیر	274
.59	6 نبیوں کے واقعات	278
.60	سابقہ نبیوں کے واقعات کے بعد موجودہ مشرکین سے خطاب ہو رہا ہے	293
.61	موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ جو چھ حصوں پر مشتمل ہے	296
.62	آدم علیہ السلام سے ساری اولاد کی تخلیق	325
.63	قیامت تک اہل حق کی ایک جماعت ہوگی	329
.64	نبی کریم سے علم غیب کی نفی اور صاحب اختیار بھی نہیں ہیں	332
.65	آدم علیہ السلام کی طرف شرک کی غلط نسبت	333
.66	واذا قرأ القرآن کی تشریح	338

.67	سورۃ الانفال: مال غنیمت میں اختلاف اس لئے ہوا کہ کوئی حکم پہلے سے نہیں اترا تھا	343
.68	جنگ بدر کے سبب	345
.69	ظاہری مدد کے فوائد	347
.70	جہاد کے چار قوانین	352
.71	تقویٰ کے فائدے	356
.72	جہاد و مجاہدین کا آٹھواں قانون	369
.73	انفال کی خصوصیات	376
.74	سورۃ توبہ: اس سورۃ کا خلاصہ	377
.75	اس سورۃ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کیوں نہیں	378
.76	جہاد کے اسباب	391
.77	مولویوں اور پیروں کو رب بنانے کی تشریح	392
.78	وہ مال جس کا حق ادا نہیں کیا گیا سانپ کی صورت میں چاندی سونا آگ میں گرم اکٹھا کیا جائے گا	395
.79	منافقین کی 76 عادات قبیحہ کا ذکر	396
.80	واقعہ غار ثور کی طرف اشارہ	398
.81	نفاق سے بچنے کیلئے اچھی صفات	405
.82	مصارف زکوٰۃ کا ذکر جو کہ آٹھ ہیں	405
.83	معذور لوگوں کیلئے جہاد سے استثناء	420
.84	جنگ تبوک کا واقعہ اور صحابہ کرامؓ کے تین قسم کے لوگوں کا تذکرہ	425

.85	ان صحابہ کرامؓ کا تذکرہ جنہوں نے ستونوں کے ساتھ اپنے آپکو بندھوا دیا تھا	427
.86	بقول ابن مسعودؓ صدقہ اول اللہ کے ہاتھ میں پھر بندے کے ہاتھ میں	428
.87	کعبؓ بن مالک اور انکے ساتھیوں کا جنگ تبوک سے رہ جانے کا واقعہ	429
.88	مسجد ضرار ابو عامر راہب کے مشورے پر بنائی گئی تھی	430
.89	ایمان والوں کی دس صفات کا ذکر	433
.90	علم سیکھنے کی ترغیب	438
.91	سورۃ توبہ کی خصوصیات	441
.92	سورۃ یونس: شفاعت قہریہ کی تردید	451
.93	سفارش کے تین طریقے	452
.94	موسیٰ و ہارون علیہم السلام کی دعا کی قبولیت	484
.95	اس سورۃ کی خصوصیات	493
.96	سورۃ ہود:	494
.97	قوم نوح کے چار اعتراضات	506
.98	مومنوں کے 4 اعتراضات کے جواب	508
.99	قوم کا تمسخر اور اسکا جواب	510
.100	کنعان بن نوح کی والد سے گفتگو	512
.101	نوح علیہ السلام کے لئے بشارتیں	514
.102	نبی کریم ﷺ سے علم غیب کی نفی	515
.103	نبیوں کے اچھے اعمال و اخلاق قبل نبوت بھی رہے	520
.104	علم غیب اللہ کا خاصہ	523

528	اللہ تعالی لوط علیہ السلام پر رحم فرمائیں	.105
540	سورۃ ھود اور اس جیسی سورتوں نے مجھے بوڑھا کیا	.106
542	ترک دعوت سبب عذاب ہے	.107
544	اس سورۃ کی خصوصیات	.108
545	**سورۃ یوسف:** مختلف طریقوں سے شرک کی تردید	.109
547	اس سورۃ میں اچھے اور برے اعمال اور انکے نتائج	.110
550	تفصیلی حصہ کی ابتدا جو بارہ مقامات پر مشتمل ہے	.111
553	رونے کی دس اقسام	.112
558	عورتوں نے ورغلانے کے مختلف طریقے اختیار کئے تھے	.113
562	تکیہ لگا کر کھانا منع ہے	.114
563	معصیت کے خوف سے نیک لوگ مصیبت کو ترجیح دیتے ہیں	.115
597	سارے انبیاء مرد تھے	.116
588	حسد کے سبب سے بندہ بھیک مانگنے پر مجبور ہوتا ہے	.117
599	سورۃ یوسف کی خصوصیات	.118
610	**سورۃ رعد:** حق و باطل کے لئے مثالیں	.119
621	خواہش پرستوں کے شبہات کا جواب	.120
624	اس سورۃ کی خصوصیات	.121

رکوعاتها ١٦ ٥ سُوۡرَۃُ الۡمَآئِدَةِ مَدَنِيَّةٌ ١١٢ اٰیاتها ١٢٠

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خاص اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان اور رحیم ہے

اس سورۃ کے دیگر نام یہ ہیں سورۃالعقود، سورۃ المنقذہ ربط (تعلق) کئی وجوہ سے ہے۔

(۱) سابقہ سورۃ میں جہالت کے ان مظالم کا رد کیا گیا جو کمزور مخلوق پر کیے جاتے تھے تو اب جہالت کے وہ مظالم جو اپنی طرف سے حلال وحرام کرتے تھے اس کا ذکر ہے۔ (۲) اُس سورۃ میں کمال انسانیت کیلئے خطاب عام تھا تو اس سورۃ میں کمال ایمان کیلئے خطاب خاص ہے۔ (۳) سابقہ سورۃ میں یہود کی قبیح صفات اور نصاریٰ کے شرک کا رد ہوا تو اب اس سورۃ میں ان کی دوستی سے منع مذکور ہے اور اس کے دیگر اسباب کا ذکر ہے اور نصاریٰ کے رد کیلئے عیسیٰ علیہ السلام کی گواہی کا ذکر ہے جو وہ قیامت میں فرمائیں گے۔ سورۃ کا عنوان: عقود ایمانیہ پر وفاداری کا عمومی اور حلال وحرام میں خصوصی حکم۔ اور یہود ونصاریٰ پر تنقید ہے جنہوں نے عقد میں وفاداری نہیں کی، اقسام شرک کا رد ہے یعنی شرک فی التصرف۔ شرک فی العلم شرک فی العبادات۔ شرک فی التحلیل والتحریم نیز اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی پہچان کیلئے اسمائے حسنیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کے پندرہ صفاتی ناموں کو ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ کا خلاصہ: اجمالی خلاصہ یہ ہے کہ اس سورۃ میں (۱۶) سولہ مرتبہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا: ذکر کیا گیا ہے اس کو عقود ایمانیہ کہا جاتا ہے اور سات (۷) مرتبہ اٰمَرَ یعنی حکم اس میں مذکور ہیں اور (۶) مرتبہ اس میں نہی یعنی ممنوعات ذکر ہیں جبکہ تین (۳) مرتبہ اس میں واقعات بیان ہوئے ہیں۔ سورۃ کے آغاز اور اختتام میں ایمان والوں سے خطابات ہیں درمیان میں یہود ونصاریٰ کی برائیوں کا ذکر ہے اور نصاریٰ کیلئے دعوت ہے۔ تفصیلی خلاصہ: اس سورۃ میں تین حصے ہیں پہلا حصہ آیت 14 تک ہے اس میں دو باب ہیں۔ پہلا باب آیت نمبر 41 تک ہے اس میں ایمان والوں سے پانچ خطابات کی گئی ہیں جو کہ عقود ہیں جن میں شرک فی التحلیل والتحریم کا رد ہے۔ پہلی آیت میں تحریم بغیر اللہ کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کا ذکر ہے۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کے متعلق آداب کا ذکر ہے جس کو نذور الٰہیہ بھی کہتے ہیں۔ اور تیسری آیت میں حرام کردہ چیزوں کی تفصیل اور غیر اللہ کی نذر کا رد ہے۔ آیت چار اور پانچ میں دیگر حرام کردہ چیزوں کا ذکر ہے۔ چھٹی آیت میں تیسرا خطاب طہارت بدنی سے متعلق ہے۔ ساتویں آیت میں

عقد کی وفاء کا حکم ہے۔ آٹھویں آیت میں چوتھا خطاب استقامت اور عدل سے متعلق ہے۔ نویں آیت میں خوشخبری ہے اور دسویں آیت میں تخویف اخروی مذکور ہے۔ گیارہویں آیت میں پانچواں خطاب ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر سے متعلق ہے۔ بارہویں آیت میں بنی اسرائیل کے پانچ عقد کا ذکر ہے اور تیرھویں آیت میں مذکورہ عقود توڑنے پر پانچ دنیوی عذاب مذکور ہیں۔ چودہویں آیت میں نصاریٰ کے عقد توڑنے پر عذاب کا ذکر ہوا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ○

"ایمان والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو تمہارے لئے چوپائے مویشی حلال کردیے گئے ہیں سوائے ان کے جن کی تلاوت تم پر کی جائے گی اس حال میں کہ جب تم حالت احرام میں ہو تو شکار کو حلال جاننے والے نہ ہوں یقینا اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے" [1]۔

تفسیر 1 (ا) عقد سے مراد وہ تمام احکام ہیں جو قرآن وسنت میں بتقاضائے مسلمانوں پر عموماً لازم کردیے گئے ہیں اور حلال وحرام میں خصوصاً چونکہ یہ سورۃ فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوئی ہے اس لئے سب سے پہلے مشرکین مکہ کی اپنی طرف سے رائج کردہ حلال وحرام کے رسوم شرک فعلی کا رد ہے کیا یعنی رَدُ شِرْكٍ فِي التَّحْلِيْلِ وَ التَّحْرِيْمِ : یہ ان کی شرکیہ رسم تھی۔ عقود اور عھود میں فرق یہ ہے کہ عقود ایمان والوں کے ساتھ خاص ہیں اور عھود عام ہے ہر اس شخص کیلئے جس نے آسمانی کتاب کو تسلیم کیا ہو خواہ وہ کتابی کافر ہو یا مؤمن ہو۔ اس لئے سورۃ بقرۃ آیت 40 میں اَوْفُوْا بِعَهْدِيْ : کہا گیا ہے۔ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ بُهْمٌ سے بَهِيْمَةٌ لیا گیا ہے اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس کی زبان تو ہو مگر بول نہیں سکتی ہو۔ اَنْعَامٌ نَعَمٌ سے لیا گیا ہے چرنے والے جانور کو کہتے ہیں اور دونوں کا مصداق ایک ہی ہے یعنی چوپائے مراد ہیں لفظ بَهِيْمَةٌ میں عموم کا معنیٰ ہے جسے جنس (مفرد) ذکر کیا ہے۔ لفظ انعام میں بہت ساری قسموں کی طرف اشارہ ہے اس لئے اس کو جمع ذکر کیا ہے۔ اُحِلَّتْ یہ مطلق حلال کیلئے استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں تو مشرکین کی تحریم بغیر اللہ کا رد ہے۔ بحیرہ۔ سائبہ وغیرہ کے نام سے حرام قرار دیتے تھے۔ معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ : کے نصب میں اختلاف ہے۔ حال ہے لَكُمْ کی ضمیر سے بطریقہ استثناء کے اگر لفظ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ بشامل ہو صَيْدِ کو تو پھر استثناء متصل ہے اگر شامل نہ ہو تو منقطع ہے لیکن بہتر قول یہ ہے کہ اس کا فعل مخفی كُوْنُوْا ہے۔ اس طرح ابن مالک نے الفیہ میں لکھا ہے کہ عرب كَانَ کو اسم

کے ساتھ حذف کرتے ہیں اور خبر کو باقی رکھتے ہیں یہ توجیہ اس لئے بہتر ہے کہ اس میں مستقل مسئلہ یعنی تحریم الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو آیت 94 میں تفصیل سے ذکر ہوگا۔ إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ: یہ اجمالی طور پر سابقہ تحلیل وتحریم کیلئے علت ہے۔اس میں معتزلہ کا رد بھی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر احکام شریعہ میں بندوں کی مصلحتوں کا لحاظ کرنا واجب ہے تو یہ عقیدہ غلط ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنْ رَبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۚ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَنْ صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَنْ تَعْتَدُوا ۘ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢﴾

° اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم اللہ کے نشانیوں کی بے حرمتی مت کرو اور نہ ہی حرمت والے مہینوں کی اور نہ حرم والی قربانی کی اور علامتوں والے جانوروں کی اور نہ حرم کے طرف قصد کرنے والوں کی وہ جو اپنے رب کے فضل ورضامندی کو تلاش کرتے ہیں اور جب تم احرام کھول دو تو تم شکار کر سکتے ہو اور تمہیں دشمنی کسی قوم کی آمادہ نہ کرے اس وجہ سے کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روک لیا تھا یہ کہ تم زیادتی کرو۔تم ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کے کاموں میں تعاون کرو اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو گناہ اور زیادتی کے کاموں میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے°[2]۔

تفسیر 2 اس آیت میں ان چیزوں کا حکم بیان ہو رہا ہے جو کعبۃ اللہ سے متعلق ہو چاہے زمانہ ہو مکان جانور ہو انسان ہو نذور الٰہی سے جن کی تعبیر ہو سکتی ہے۔اس آیت میں تین کاموں سے منع اور تین کا حکم دیا گیا ہے۔اور یہ عقود میں سے دوسری عقد ہے: لَا تُحِلُّوا إحلال: حرمت کی پامالی کو کہا جاتا ہے اور حرمت دو قسم کی ہے۔ایک قسم منہیات ہیں اس میں حرمت کی پامالی اس عمل کا ارتکاب ہے جس سے منع کیا گیا ہے اور دوسری قسم حرمت احترام اور عزت کے معنی میں ہے تو اس میں احلال بے حرمتی کی معنی میں ہے یہاں پر دوسرا معنی مراد ہے۔شَعَائِرَ اللّٰهِ: شعائر شعیرت کی جمع ہے یعنی ہر وہ چیز جس کے ذریعے دوسری چیز معلوم ہو خاص علامت ونشانی کو کہا جاتا ہے۔پھر ہر دین ومذہب کیلئے خاص علامات ہیں جن کے ذریعے وہ دین اور اس دین کے ماننے والے معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ ہندوؤں کے دین کی نشانی مندر ہے گلے میں زنار ہے۔سکھوں کے

دین کی نشانی تلوار، خنجر لٹکانا، بالوں کی چوٹیاں بنانا ہے۔ نصاریٰ کے دین کی نشانی صلیب اور گرجا وغیرہ ہیں تو دین اسلام کی بھی خاص علامات ہے مساجد، نمازیں، حج کے مناسک، صفا مروہ، منیٰ، عرفات، مزدلفہ، قربانی، قلائد، پٹے دار جانور، قرآن کریم اور دیگر عبادات شرعیہ یعنی اللہ تعالیٰ کے قربت کا ذریعے ہوتے ہیں اور مسلمان اس سے پہچانے جاتے ہو تو ان شعائر کی بے حرمتی کرنا حرام ہے اس کا ذکر سورۃ بقرہ آیت 153، سورہ حج آیت 23 اور 63 میں بھی ہوا ہے: وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ: لانفی کی تاکید کیلئے ہے۔ الشَّهْرَ مفرد ہے لیکن جمع کے معنی میں ہے اور وہ چار مہینے ہیں جیسا کہ سورۃ بقرہ 194، 217، سورۃ توبہ 36 میں ہے۔ اَلْحَرَامَ حرمت والا اس میں قتال حرام اور منع ہے دیگر فسادات تو یقینا حرام ہیں اہل علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ حرمت والے مہینوں میں قتال اب بھی حرام ہے یا حرمت منسوخ ہوچکی ہے۔ اس میں علماء کا ایک قول یہ ہے کہ اس میں ابتداء اب بھی حرام ہے البتہ جوابی قتال یعنی دفاعی قتال جائز ہے۔ وَلَا الْهَدْيَ یہ اس جانور (قربانی) کا نام ہے جو احرام والا شخص عمرہ یا حج کی نیت سے جاتے ہوئے یا کسی کے ساتھ روانہ کرے اس کی بے حرمتی کرنا یعنی حرم پہنچنے سے پہلے راستے میں قتل کرنا یا ذبح کرنا حرام ہے: وَلَا الْقَلَآئِدَ: یہ عام بیان کے بعد خاص بیان ہے هَدْيَ عام ہے اور قَلَآئِدَ خاص ہے یہ اس جانور کو کہا جاتا ہے جس کے گلے میں بطور علامت کوئی رسی پٹا ڈالا جائے اور اپنے ساتھ یا کسی کے ساتھ حرم کی طرف روانہ کیا جائے تو ان جانوروں کی بے حرمتی بھی حرام اور منع ہے۔ وَلَآ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ: وہ لوگ جو حج یا عمرہ کے ارادے سے حرم کا قصد کریں تو ان کو روکنا بھی حرام ہے۔ پھر اس میں علماء کے دو قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ یہ قول مشرکین کو بھی شامل ہے البتہ اس میں تخصیص ہے اس آیت کے ذریعے کہ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ: دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد صرف مومنین ہیں جن کی وَرِضْوَانًا سے تخصیص کی گئی ہے۔ خطیب شربینی نے حسن بصری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ مائدہ میں منسوخ نہیں ہے لہٰذا اس بناء پر پہلا والا قول زیادہ صحیح ہے: وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شکار کی حرمت احرام اور حرم کے ساتھ خاص ہے مستقل نہیں ہے۔ اِصْطَادُوْا کا امر اباحت کیلئے ہے۔ امام ابن کثیر نے فرمایا کہ اَمر اباحت کیلئے ہے اگر منع سے پہلے وجوب کیلئے ہو تو بعد میں امر وجوب کیلئے ہوگا اور اگر منع سے پہلے امر اباحت کیلئے ہو تو بعد میں بھی اباحت کیلئے ہوگا۔ لہٰذا شکار کرنے کا حکم پہلے بھی مباح تھا اور منع کے بعد بھی امر اباحت کیلئے ہے۔ یعنی ہر امر نہی کرنے کے بعد اباحت کیلئے نہیں ہوتا۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ: الخ یہ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ: سے تعلق رکھتا ہے اور لَا تُحِلُّوْا پر عطف ہے۔ واقعہ

یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقعے پر مشرکین نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مسجد حرام میں جانے سے منع کیا تو صحابہ کرام کے دلوں میں مشرکین کیلئے نفرت پیدا ہوئی لہٰذا جب آٹھ ہجری میں مکہ فتح ہوا تو بہت سے مشرکین عرب مسلمان ہوئے تو شاید صحابہ کرام نے ان کو روکنا چاہا جس پر یہ آیت نازل ہوئی کیونکہ وہ حج یا عمرہ کیلئے آنا چاہتے تھے اور صحابہ کرام کو بھی انہوں نے حرم میں حج وعمرہ ادا کرنے سے روک لیا تھا صحابہ کرام نے جب اس انتقامی کارروائی کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس قول کے ذریعے ان کو منع فرمایا کہ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ :اور اس میں دو وجوہات ہیں پہلا سبب اور وجہ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے تو اب ان سے بغض ودشمنی نہیں ہوگی کیونکہ ایمان لانے کے بعد ان کے سارے گناہ معاف ہوگئے ہیں۔دوسرا سبب اور وجہ یہ ہے کہ اگر تم ان پر زیادتی کروگے تو یہ :لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللّٰهِ: کی مخالفت ہوگی۔یعنی شَعَائِرَ اللّٰهِ:الشَّهْرَ الْحَرَامَ،هَدْيَ،قَلَائِدَ :اور بیت اللہ کا ارادہ کرنے والوں کی بے حرمتی ہوگی لَا يَجْرِمَنَّكُمْ : اجرام سے ماخوذ ہے یعنی جرم کے کرنے پر آمادہ کرنا۔شَنَاٰنُ سخت نفرت کو کہتے ہیں۔ أَنْ صَدُّوكُمْ : اس میں لام مقدر ہے یعنی لِأَنْ يَصُدُّوكُمْ :یہ اجرام کیلئے علت ہے یا پھر قوم کیلئے محل صفت میں ہے:أَنْ تَعْتَدُوا یہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ :کیلئے دوسرا مفعول ہے۔اعتداء سے ان کو قتل کرنا یا مسجد حرام سے روکنا اور قربانیوں ھدی جانوروں کی بے حرمتی کرنا مراد ہے:وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى بغض کے مقابل محبت کرنا ضروری ہے اور محبت کا تقاضا تعاون ہے لہٰذا نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔اللہ تعالیٰ کے حکموں پر عمل کرنے کو بِرّ کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں سے اجتناب کرنے کو تقویٰ کہتے ہیں لہٰذا بِرّ میں سب سے پہلے ایمان وتوحید داخل ہیں اور تقویٰ میں بدعت وشرک سے اجتناب داخل ہے یا بِرّ حقوق العباد میں ہے اور تقویٰ حقوق اللہ میں ہے۔

وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۔اِثْم سے مراد اللہ تعالیٰ کے حکموں کو چھوڑنا اور عُدْوَان سے مراد اللہ تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں کا ارتکاب کرنا ہے۔یا اِثْم سے مراد وہ گناہ ہے جو حقوق اللہ سے متعلق ہے اور عُدْوَان سے مراد وہ گناہ ہے جو حقوق العباد سے متعلق ہے۔اِثْم میں شرک وکفر داخل ہے اور عُدْوَان میں بدعت داخل ہے۔وَاتَّقُوا اللّٰهَ:تقویٰ اطاعت کے معنی میں ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٣﴾

"تمہارے لئے حرام کیے گئے ہیں مردہ جانور خون سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے سے مر جانے والا و چوٹ لگ کر مرنے والا اوپر سے گر کر مرنے والا کسی کا سینگ لگ کر مرنے والا اور وہ جانور بھی جسے درندے کھا جائیں سوائے اس کے جسے تم ذبح کر لو اور وہ جانور جو آستانو پر ذبح کیا جائے اور یہ کہ تم فال کے تیروں سے قسمت معلوم کرو یہ سب گناہ کے کام ہیں آج وہ لوگ نا امید ہو گئے جنہوں نے تمہارے دین کا انکار کیا لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور پس جو شخص بھوک سے بے بس ہو جائے جبکہ وہ گناہ پر مائل ہونے والا نہ ہو تو یقیناً اللہ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے"[3]۔

تفسیر 3 اس آیت میں ۱۲ محرمات الہیہ کے ذکر سے محرمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے جس میں مَآ أُهِلَّ اور مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ میں غیر اللہ کی نذر مراد ہے جو کہ شرکیہ عمل ہے۔ یہ مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ: کی بھی تفصیل ہے جو پہلی آیت میں گزرا ہے۔ حُرِّمَتْ سورۃ بقرۃ آیت 173 میں حَرَّمَ معلوم صیغہ سے ذکر ہوا ہے جس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے یہاں فاعل اس لیئے ذکر نہیں کیا کہ ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ پہلے سے معلوم ہے۔ چار اصول محرمات ابدیہ کے ہیں جو کھانے پینے سے متعلق ہیں یہ تمام آسمانی کتب اور دینوں میں حرام قرار دیئے جا چکے ہیں اس کی تفسیر سورۃ بقرہ آیت 173 میں گزر چکی ہے۔ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ: سورۃ بقرہ میں غَيْرِ اللَّهِ کے ساتھ بِهٖ کو ذکر کیا تھا اور یہاں اس کے برعکس ہے۔ سبب یہ ہے کہ وہ سورۃ اس مسئلہ میں پہلی سورۃ ہے اس لئے اس میں لفظ کی بھی رعایت کی گئی ہے یعنی اہل کو بِهٖ کے ذریعے متعدی کیا گیا ہے اس سورۃ میں سورۃ انعام آیت 145 اور سورۃ نحل آیت 115 میں معنی کا لحاظ کیا گیا ہے یعنی حرمت کا سبب غَيْرِ اللَّهِ کی طرف نسبت ہے۔ وَالْمُنْخَنِقَةُ اس سمیت پانچ چیزوں کی تخصیص بعد تعمیم ہوئی ہے یعنی الْمَيْتَةَ سے تخصیص کی گئی ہے۔ یعنی ہر وہ

چوپاتے وغیرہ جو شرعی طریقہ سے ذبح نہ ہوا ہو یا وہ چیز شریعت میں حرام ہو اگرچہ اس کا ذبح شرعی طریقہ پر ہوا ہو جیسے کتا وغیرہ۔ یہ وہ پانچ چوپائی ہیں جو شرعاً تو حلال ہیں مگر چونکہ ان کا ذبیحہ شرعی طریقے سے نہیں ہوا ہے اس لئے حرام مردار ہو گئے۔ اَلْمُنْخَنِقَةُ: عام ہے کوئی اس کا گلا گھونٹ دے یا خود گھٹ کے مرجائے۔ وَالْمَوْقُوْذَةُ: وہ جانور جو لکڑی یا پتھر سے مارا جائے نیز اس میں وہ شکار بھی داخل ہے جو صحیح بخاری کتاب الذبائح حدیث 5476 صحیح مسلم کتاب الصید حدیث 1929 وغیرہ میں مذکور ہے کہ تیر کی نوک کے بجائے چوڑان سے مارا جائے۔ امام شربینی نے (بندوق کی) گولی کا شکار بھی اس حکم میں شمار کیا ہے کیونکہ وہ تیز دھار کی وجہ سے نہیں بلکہ وزنی (بھاری) ہونے کی وجہ سے چیز کو چیر پھاڑ دیتی ہے۔ شکار کو بھاری چیز سے قتل کرنے کے سلسلے میں امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وَالْمُتَرَدِّيَةُ: وہ جانور جو اونچی جگہ سے گرجائے یا کنوے میں گر کر مرجائے۔ وَالنَّطِيحَةُ: کسی جانور کے سینگ سے دوسرا جانور مارا جائے اگرچہ اس سے گردن کے ذریعے خون بھی نکل جائے تب بھی وہ حرام ہے۔ فائدہ: سابقہ تین الفاظ میں تا برائے تانیث کے لئے ہے وجہ یہ ہے کہ اکثر مؤنث جانوروں کو یعنی بکری، گائے، اونٹنی، دنبی وغیرہ کو ذبح کیا جاتا ہے البتہ النَّطِيحَةُ میں تاء برائے تانیث نہیں ہے اس لئے کہ اس صیغہ میں تا کا استعمال نہیں ہوتا اگرچہ مؤنث ہوتا یہ تا وصفیت سے اسمیت کی طرف منتقل ہونے کے لئے ہے: وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ: درندے سے مراد کتا، شیر، گیدڑ سب مراد ہیں یعنی انکا قتل کیا ہوا اگرچہ اس کی گردن میں زخم لگا اور اس سے خون بھی نکل گیا ہو تب بھی وہ مردار میں داخل ہے: إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ: یہ استثنا وَالْمُنْخَنِقَةُ: اور اس کے بعد والوں سے متصل ہے یعنی مذکورہ اسباب سے زخمی حالت میں پایا جانے والا جانور شرعی طریقہ سے ذبح کیا جائے بشرطیکہ روح باقی ہو حلال ہو جاتا ہے۔ امام شربینی کے بقول استثنا منقطع ہے، بعض مفسرین نے اس استثناء کو: وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ: کے ساتھ خاص کیا ہے مگر یہ تخصیص درست نہیں ہے۔ دور حاضر کے تحریف کرنے والوں نے: وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ: کے ساتھ خاص کیا ہے کہ غیر اللہ کی طرف منسوب جانور ذبح کرنے سے پاک وحلال ہوتا ہے لیکن ان کا یہ قول باطل ہے۔ ابن ابی حاتم نے علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ درندے کا زخمی کیا ہوا جانور ذبح کرنے کے بعد اگر دم یا پنجہ، پاؤں وغیرہ کو حرکت دے تو وہ حلال ہے۔ ابن جریر نے بھی اس طرح فرمایا ہے: وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ: یہ وَمَا أُهِلَّ سے خاص ہے اسلئے کہ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ: میں ذبح شدہ اور زندہ سب شامل ہے جبکہ اس میں اس طرح نہیں ہے اور اسی طرح یہ نُصُبِ کے ساتھ خاص ہے اور وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ: غیر اللہ کو شامل ہے۔ نُصُبِ: بت، قبر سب کے لئے ہے۔

اصنام وہ بت ہیں جن کی شکل وصورت بنائی گئی ہو اور نَصَبْ وہ بت ہیں جن کی شکل وصورت نہیں بنائی گئی ہو۔ البتہ اس کی عبادت ہوئی ہو لوگ اس پر نذرانے چڑھاتے ہوں اس پر ذبح کرتے ہوں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابن جریج اور مجاہد رحمہما اللہ سے نقل کیا ہے کہ مشرکین مکہ نے تین سو ساٹھ (360) پتھر کعبۃ اللہ کے اردگرد نَصَبْ کئے تھے تو دور جہالت میں لوگ اس کے قریب جانور ذبح کرتے اس کا خون بیت اللہ پر ملتے اور گوشت کو تبرک کیلئے نَصَبْ پر ڈال دیتے۔ اس پر اگرچہ ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے تب بھی یہ شرک ہے: وَأَن تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ: استقسام قسمت معلوم کرنا یا اپنا حصہ معلوم کرنا ہے۔ أَزْلَامِ زَلَمْ کی جمع ہے اس تیر کو کہا جاتا ہے جس میں نہ تو پر لگے ہوں اور نہ نوک ہو صرف لکڑی ہو۔ ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ تین یا سات تیر ہبل بت کے پاس رکھتے تھے جو کعبے کے درمیان میں تھا اگر کوئی شخص اپنے لئے معلوم کرنا چاہتا یعنی سفر کرنا ہے یا نہیں فلاں کام کرنا ہے یا نہیں تو ہبل کے مجاور کو ایک سو (100) درہم اور ایک اونٹنی نذرانہ پیش کر لیتے وہ اس کیلئے ایک تیر نکال لیا کرتا ان تیروں پر مختلف تحریریں موجود ہوتیں جسے وہ لوگ اپنی حتمی قسمت مانتے تھے مجاور اس کو کہتا لو یہ ہبل (شہید) بزرگ کا فیصلہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۃ مائدۃ میں فرمایا کہ اس کی منع پر منع ہو جاتے اور اس کے حکم پر ضرور عمل بجالاتے۔ خطیب شربینی نے نقل کیا ہے کہ ایک تیر پر لکھا ہوتا تھا أَمَرَنِي رَبِّي: میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے دوسرے پر لکھا ہوتا تھا نَهَانِي رَبِّي: میرے رب نے مجھے منع کیا ہے اور تیسرے تیر کو خالی چھوڑا تھا جب وہ خالی تیر نکل آتا تو دوبارہ نذرانہ دیتے اور تیر نکلواتے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو صحابہ کرام نے کعبۃ اللہ سے بتوں کو باہر نکالا جب دیکھا تو اس میں ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے بت بنائے ہوئے ہیں اور ان کو ہاتھوں میں تیر تھمائے ہوئے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہلاک کرے ان کو معلوم ہے کہ ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے کبھی تیروں سے اپنی قسمت معلوم نہیں کی۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے روایت نقل کی ہے کہ اس تیر اندازی سے مراد جوا کھیلنا ہے تفسیر سراج المنیر میں بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ موجودہ دور میں اس کی مثال لاٹری کی ہے کہ کئی افراد سے پیسے لے لیے جاتے ہیں اور پھر قرعہ اندازی ہوتی ہے جس کی لاٹری نکل آتی ہے وہ چیز اسی کی ہو جاتی ہے تو یہ قرعہ اندازی بھی اسی تیر کے حکم میں ہے۔ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ: اس میں ماسبقہ حرام شدہ چیزوں کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو حلال تصور کرنا کفر اور شرک ہے ان کو حرام جان کر پھر ارتکاب کرنا کفر نہیں ہے البتہ گناہ کبیرہ ہے۔ بعض مفسرین ذَٰلِكُمْ کا اشارہ اِسْتِقْسَامُ بِالْأَزْلَامِ: کے ساتھ خاص کیا ہے مگر یہ

درست نہیں۔ عموم پر رکھنا زیادہ بہتر ہے۔ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ: اَلْيَوْمَ سے مراد نزول قرآن ہے جس میں ان محرمات کا ذکر ہوا ہے آئندہ زمانے بھی اس میں شامل ہیں۔ (قرطبی، سراج المنیر)۔ مِنْ دِيْنِكُمْ امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مراد یہ ہے کہ کافر اس بات سے ناامید ہو گئے ہیں کہ تم اب پلٹ کر دین مشرکین میں داخل ہو گے۔ خازن وغیرہ میں ہے کہ تمہارے دین کو باطل قرار دینے سے ناامید ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ فتح مکہ سے اسلام کو جو تقویت ملی وہ کافروں کی مغلوبیت کیلئے سبب بنا اور مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ایک امتیاز پیدا ہوا یعنی ان کے رسم ورواج کے مقابلے میں مسلمان اپنے عقیدہ و عمل پر مزید پختہ ہوئے: اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ اَلْيَوْمَ: یہ جمعۃ المبارک کا دن تھا اور میدان عرفات میں جمع صلاتین یعنی ظہر و عصر ادا کرنے کے بعد حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی ہے۔ سعید بن جبیر کی روایت کے مطابق اس آیت کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ اکیاسی (81) دن حیات تھے زاد المسیر 1/513۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی ابن جریج کی روایت سے اسی طرح نقل کیا ہے اور خطیب شربینی کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ ربیع الاول کی تیسری رات فوت ہوئے ہیں۔ اکمال دین کے معنی یہ ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد کوئی نیا حکم حلال وحرام سے متعلق حدود اور فرائض شرعیہ نازل نہیں ہوئے، باقی وحی کا سلسلہ جاری تھا۔ سوال: اس سے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس دن تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ناقص دین پر عمل کرتے رہے نیز جو صحابہ کرام اس دن سے قبل فوت ہوئے وہ ناقص دین پر دنیا سے چلے گئے؟ جواب: نبی کا دین ہر وقت کامل ہوتا ہے ایک وقت مقرر تک البتہ اس میں تبدیلی منسوخ ہوتا یا اضافی حکم نازل ہونے کا امکان باقی رہتا ہے لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ اب اس میں کمی یعنی منسوخ ہونا یا اضافہ یا نئے احکام نازل ہونے کا سلسلہ ختم ہوا۔ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ: خازن نے لکھا ہے کہ اکمال دین اتمام دین ونعمت کیلئے سبب ہے اسلئے کہ دین اسلام سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اکمال اصول اور ذوات میں جبکہ اتمام فروع اور صفات میں استعمال ہوتا ہے اس طرح دین کا لفظ اکثر اصول کے لیے اور نعمت فروع اور صفات کے لیے مستعمل ہے لہٰذا ہر ایک کے ساتھ مناسب لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ دین باعتبار اصول یعنی احکام۔ جیسے روزہ، زکوٰۃ، نماز، حج، جہاد وغیرہ مکمل ہے۔ اور باعتبار فروع وصفات کے احکام میں بھی تام ہے یعنی عبادات کے اوقات، مقدار، کیفیات وغیرہ بھی تمام ہوئی ہیں لہٰذا دین میں اصول وعبادات میں اور ان کی صفات میں اضافہ کرنا گمراہی بدعت اور قبیح عمل ہے علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا جس نے

اسلام میں کوئی بات یا عمل نیا ایجاد کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ اچھا عمل ہے تو اس شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت میں خیانت کا الزام لگایا کہ انہوں نے پیغام رسالت میں خیانت کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ: اس آیت میں تمام اہل بدعت کا جو دین میں نئی ایجادات کرتے ہیں رد ہے۔ شرح فقہ اکبر میں ملا علی قاری کا قول ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد ہم دین کے تکمیل میں قرآن وحدیث کے سوا کسی دوسری چیز کے محتاج نہیں ہیں اس لئے کہ دین ان دونوں میں مکمل ہوا ہے البتہ تشریح میں دیگر علوم وفنون کی ضرورت ہے: وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا :اَلْاِسْلَامُ میں الف ولام عہدی ہے یعنی وہ جو کامل اور تام ہے۔ اسی طرح سورۃ آل عمران آیت 19 اور 85 میں گزرا ہے: فَمَنِ اضْطُرَّ یہ سابقہ حرام شدہ چیزوں کے متعلق ہے یہ درمیان میں جملہ معترضہ ہے جس میں مندرجہ ذیل چار چیزوں کا ذکر ہے۔ (۱) مذکورہ چیزوں کا کھانا نافرمانی ہے۔ (۲) ان کو حرام ماننا دین کامل کا حصہ ہے۔ (۳) اور اسی طرح ماننا کامل نعمت ہے۔ (۴) سب سے پسندیدہ دین ہے فِيْ مَخْمَصَةٍ کا لفظ سورۃ بقرہ آیت 173 انعام آیت 145 اور نحل آیت 115 میں بھی ہے۔ ان آیات میں عام مجبوری کا ذکر ہوا ہے جس میں جبر اور بھوک شامل ہیں ان سورتوں کا نزول اسلام کے غلبہ اور فتح سے پہلے کا ہے اس میں جبر واکراہ کا امکان موجود تھا لیکن یہ سورۃ چونکہ غلبہ اسلام کے بعد نازل ہوئی ہے تو صرف بھوک کا امکان تو ہے جو مخمصہ خاص ذکر کیا گیا ہے مگر جبر واکراہ کے خطرات نہیں ہیں صرف بھوک کا خوف ہے اس لئے خصوصی طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

"وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا چیزیں ان کے لئے حلال کی گئی ہیں۔ فرما دیجئے تمہارے لئے حلال کردی گئی ہیں پاکیزہ چیزیں اور ان کا شکار جو تم نے شکاری جانور سدھائے جنہیں تم شکاری بنانے والے ہو تم ان کو ان میں سے سکھاتے ہو جو تمہیں اللہ نے سکھلایا ہے لہٰذا اس میں سے کھاؤ جو تمہارے لئے وہ روک رکھیں اور اس پر اللہ کا نام ذکر کرو اور تم اللہ سے ڈرو یقیناً اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے"۔ [4]

تفسیر 4 جب سابقہ آیت میں محرمات کا ذکر ہوا تو لازماً سوال پیدا ہوتا تھا اور خصوصاً شکار سے متعلق ہوا کہ ہمارے لئے حلال کیا کیا چیزیں ہیں؟ تو اس آیت اور بعد والی میں حلال کی تفصیل کا ذکر ہے: يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ عربیت کے

قانون کے مطابق لَّهُمْ اور لَنَا دونوں درست ہیں اَلطَّيِّبَاتُ: امام سنانی کا قول ہے کہ اس سے مراد وہ ہے جس کو عرب پسند کرتے ہیں اور مزیدار ہو اور اس کو قرآن وسنت میں حرام قرار نہ دیا گیا ہو۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح ہونے والی چیزیں اور ہر حلال رزق ہے۔ مفسر شربینی کا قول ہے کہ ہر وہ چیز جس کی حرمت قرآن وسنت اور مجتہد کے قیاس سے ثابت نہ ہو، سلیم الطبع اس کو ناپسند نہ کرتا ہو، اس معنی میں یہ لفظ تمام ذبح شدہ حلال چیزیں اور بغیر ذبح یعنی مچھلی اور ٹڈی وغیرہ سب کو شامل ہے: وَمَا عَلَّمْتُمْ یہ اَلطَّيِّبَاتُ پر عطف ہے۔ مضاف الیہ حذف کیا گیا ہے۔ یعنی صَيْدَ مَا عَلَّمْتُمْ، یا مستقل کلام ہے یعنی یہ مبتدأ ہے اور فَكُلُوا اس کی خبر ہے۔ اس کے حلال ہونے کیلئے پانچ شرطوں کا ذکر ہے۔ (۱) جوارح (۲) تکلیب (۳) تعلیم (۴) امساک (۵) ذِكْرَ اسْمِ اللّٰهِ الْجَوَارِحِ: یہ جَارِحَةٌ کی جمع ہے جرح کسب کرنے کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ سورۃ انعام آیت 60 میں ہے اور اس سے مراد کتا باز اور، شاہین وغیرہ ہیں۔۔۔ وہ تمام چیزیں جو تعلیم قبول کرتی ہوں چونکہ جرح زخم کو بھی کہتے ہیں چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک زخم بھی شروط میں سے ہے مُكَلِّبِينَ عَلَّمْتُمْ: کی ضمیر سے حال ہے۔ تکلیب کا معنیٰ بھیجنا تیزی دلانا شکار کرنے پر۔ اس سے معلوم ہوا کہ مالک کے بھیجے بغیر شکار پکڑ لے اور شکار مر جائے تو حرام ہوگا۔ تُعَلِّمُونَهُنَّ الخ سوال: یہ شرط تو عَلَّمْتُمْ سے معلوم ہوئی تو پھر اس کی کیا ضرورت تھی؟ جواب: اس میں اس شرط کی تاکید مقصود ہے معلوم ہوا کہ جانور شکاری بنانے کیلئے تعلیم دینے والا کوئی عالم ہو جو شکار کی شرطوں سے واقف ہو: عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ وہ شرطیں جو قرآن و سنت سے ثابت ہوں یعنی شکار کے پیچھے مالک کے کہنے اور اجازت سے جائے گا بغیر اجازت کے نہ جائے۔ جب مالک اس کو واپس بلائے تو واپس آئے۔ شکار میں سے کچھ بھی نہ کھائے، جس شکار کے پاس بھیجا گیا ہو اسے چھوڑ کر کسی اور کے پیچھے نہ جائے، تو اس کی مثال اس نمائندہ کی ہے جو مالک کی اجازت سے ذبح کرتا ہے: فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ: امساک سے مراد یہ ہے کہ شکار میں سے کچھ بھی خود نہ کھاتا ہو۔ کیونکہ وکیل کا تصرف مؤکل کیلئے ہوتا ہے۔ اہل علم نے لکھا ہے کہ تین مرتبہ شکار روک کے رکھنا اس بات کا ثبوت ہوگا کہ کتا سدھایا ہوا ہے (گویا سدھانے کے بعد تین مرتبہ اس کو آزمایا جائے گا) وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ضمیر مَا عَلَّمْتُمْ: کی طرف راجع ہے یعنی شکار کرنے والے جانور کو بھیجنے سے پہلے بسم اللہ پڑھے کیونکہ اس بسم اللہ کے قائم مقام ہے جو ذبح کرتے وقت پڑھی جاتی ہے۔ کھاتے وقت بسم اللہ بھی اس میں داخل ہے نیز سنت سے صرف بسم اللہ پڑھنا ایسے موقعہ پر ثابت ہے پورا تسمیہ ثابت نہیں ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اشارہ

ہے کہ ان شرطوں کا لحاظ رکھو۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس پر بسم اللہ نہیں پڑھی گئی ہو اس کو حلال مت سمجھو اللہ سے ڈرو۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ Ĉ ع

" آج تمہارے لئے پاک چیزیں حلال ہوئیں اور کتابیوں کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا اُن کے لئے حلال ہے اور پاک دامن عورتیں مسلمان اور پاک دامن عورتیں ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی جب تم انہیں ان کے مہر دو قید میں لاتے ہوئے بدکاری کرنے والی نہ ہوں اور نہ ہی خفیہ دوستی کرنے والے ہوں اور جو کوئی ایمان سے انکار کرے تو یقیناً اس کے عمل برباد ہو گئے اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا "[5]۔

تفسیر 5 اس میں بھی حلال کی تفصیل ہے جو اہل کتاب اور ایمان والوں سے متعلق ہیں۔ اَلْيَوْمَ سے وقت حاضر مراد ہے۔ الطَّيِّبٰتُ : سے سابقہ بیان کردہ طیبات مراد ہیں مگر تکرار میں مقصود یہ ہے کہ دین کی تکمیل کے وقت یہ حکم باقی ہے یا اس سے مراد دوسری قسم کی طیبات ہیں جو ذبائح کی قسموں کے علاوہ پاک اشیاء ہیں: وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ : ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس سے مراد ذبائح ہیں۔ یا عام طعام ہے جس میں ذبح کردہ چیزیں بھی شامل ہیں بشرطیکہ غیر اللہ کے نام پر نہ ہوں۔ مکحول وغیرہ رحمہم اللہ سے منقول ہے کہ اگرچہ غیر اللہ کے نام اس پر لیا گیا ہو تب بھی جائز ہے مگر ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس قول کو رد کیا ہے۔ یہاں پر طعام سے ذبیحہ اس لیئے مراد ہے کہ کھانے کی دیگر چیزیں مثلاً روٹی، پھل، فروٹ وغیرہ تو کتابی کے علاوہ دیگر کفار کا بھی کھانا جائز ہے اور اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیبر کے دن اہل کتاب کی دعوت قبول کرنا ہے۔ جیسا کہ تفصیلی واقعہ حدیث میں مذکور ہے۔

(صحیح بخاری کتاب المغازی حدیث 4428 ابوداود 4511 مسند بزار 7398 ابن حبان 6381 اور دیگر کتب حدیث میں ہے) کہ ایک خاتون نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بکرے کے گوشت میں زہر ملا کر کھلایا کچھ کھانا کھانے کے بعد وحی کے ذریعے آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ رک گئے۔ اہل کتاب کا ذبیحہ کھانے کی اجازت اس لیے ہے کہ ان کے دین میں بھی

غیر اللہ کے لئے ذبیحہ حرام ہے اگرچہ اللہ کا بیٹا ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ مگر ذبیحہ پر صرف اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرتے ہیں خطیب شربینی نے لکھا ہے کہ یہود ونصریٰ اگر غیر اللہ کے نام پر ذبح کر لیتے ہیں یا کسی جانور کا گلہ گھونٹ دیتے ہیں یا کوئی درندہ کھا جاتا ہے تو یہ بھی ہماری شریعت کی طرح حرام ہے۔ اور سرخسی نے مبسوط میں لکھا ہے کہ اہل کتاب چاہے حربی ہو یا ذمی ان کا ذبیحہ حلال ہے اگرچہ ان میں شرک ہے مگر وہ توحید کو دین مانتے ہیں۔ فائدہ: تفسیر معارف القرآن میں لکھا ہے کہ جن یہودیوں اور نصرانیوں کے متعلق معلوم ہو جائے کہ وہ یا تو قیامت کے منکر ہیں یا موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی نبوت کے منکر ہیں یا ذات الٰہی کے منکر ہیں تو انکا ذبیحہ وغیرہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ اہل کتاب کے حکم میں داخل نہیں ہیں، جیسا کہ ہمارے زمانے میں اکثر ایسے ہی ہیں: وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ: سوال: اہل کتاب تو کفر کی حالت میں ہمارے دین ماننے کے مکلف نہیں ہیں اور نہ ہی وہ ہماری بات کو تسلیم کرتے ہیں تو اس جملہ کا مقصد کیا ہے؟ جواب: مومن اگر اپنا ذبیحہ اہل کتاب کو کھلائے تو وہ مجرم نہیں ہے البتہ حدیث میں جو آیا ہے کہ: لَا يَأْكُلُ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ: (صحیح ابن حبان کتاب البر والصلة حدیث 554) تمہارا کھانا نہ کھائیں مگر متقی لوگ تو یہ حکم استحبابی ہے یہ معنیٰ ہوگا کہ تمہارے لئے تمہارا ذبح شدہ جانور حلال ہے اگر تم اہل کتاب کو کھلا دو۔ دوسرا سبب اس جملے کا یہ ہے کہ نکاح میں صرف اہل کتاب کی عورتیں مسلمانوں کے لیے حلال قرار دی گئی ہیں جیسا کہ بعد میں ذکر ہے۔ تو خیال پیدا ہوا کہ شاید ذبح میں بھی اسی طرح ہوگا تو جواب ہوا کہ نہیں تمہارا کھانا ان کیلئے حلال ہے: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ: اس سے مراد آزاد پاکدامن خواتین ہیں یا لونڈی ہے کیونکہ اس کے حلال ہونے کا ذکر سورۃ نساء آیت 25 میں گزرا ہے یہ جملہ بعد والے جملے کیلئے تمہید ہے: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: مُحْصَنٰتُ میں دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ پاکدامنی کی معنیٰ میں ہے خواہ آزاد ہو یا لونڈی۔ حربیہ ہو یا ذمیہ، یہ قول امام ابوحنیفہ رحمہ للہ کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مراد آزاد عورتیں ہیں لہٰذا لونڈی سے نکاح جائز نہیں، یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ یہ حکم حربی عورتوں کیلئے نہیں ہے کیونکہ اُن سے تو جنگ کا حکم ہے: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ تا مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: جمہور علماء کے نزدیک حربیہ اور غیر حربیہ سے نکاح جائز ہے باوجود اس کے کہ پسندیدہ عمل نہیں ہے: اُوْتُوا الْكِتٰبَ: سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں شرک اور کفر کے باوجود ان سے نکاح جائز ہے کیونکہ مومن عورتیں تو پہلی ہی اَلْمُؤْمِنٰتِ میں بیان ہو گئی ہیں، یہ قول جمہور اہلسنت کا ہے۔ اہل تشیع کا کہنا ہے کہ اہل شرک سے نکاح جائز نہیں ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت 221 میں مذکور

ہے جبکہ اہلسنت کا موقف ہے کہ وہ آیت عام ہے اور اہل کتاب کے خواتین اس سے خاص ہوئی ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ سورۃ بقرہ کی آیت اہل کتاب کی خواتین کیلئے نہیں تھی اس لئے کہ عرف عام میں ان پر لفظ مشرکین کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔ اگرچہ ان میں شرک موجود ہے، لیکن بہتر قول پہلا ہے کہ اہل کتاب کے مشرکین پر قرآن مجید میں اشارتا اور صحیح احادیث میں صراحتا مشرکین کا اطلاق ہوا ہے صحیح بخاری کتاب الجزیۃ حدیث 3168۔ سوال: ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اہل الکتاب کے مشرکوں سے نکاح درست نہیں ہے؟ جواب: اس کا منع اس کی والد عمر رضی اللہ عنہما کے منع کی طرح کراہت مع جواز پر مبنی ہے۔ سرخسی کی مبسوط جلد 5 صفحہ 50، فتح القدیر شرح ہدایہ اور کتاب آلاثار میں مذکور ہے۔ اہل کتاب کے مشرک عورتوں سے نکاح میں حکمت یہ ہے کہ اہل کتاب شرک بحیثیت شرک نہیں کرتے بلکہ وہ اس کو توحید کہتے ہیں اور اپنی کتاب پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں پھر وہ خاتون موحد شوہر کے نکاح میں آتی ہے تو وہ با آسانی اس کو توحید سمجھا سکتا ہے اور اس طریقے سے شوہر کے رعب اور محبت میں وہ توحید کو قبول کر لیتی ہے جبکہ مشرک کتابی مرد سے کسی مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ یہ فائدے اس میں نہیں ہیں: مُحْصِنِيْنَ جب عورتوں کے لیے لفظ احصان مُحْصَنٰتُ میں ذکر ہوا تو اب مردوں کے احصان کا ذکر ہے جو نکاح کے معنی میں ہے: غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ: سفاح ظاہر زنا کو کہا جاتا ہے، اَخْدَانٍ، خَدَنٌ کے جمع ہے، عاشق کیلئے خفیہ دوست رکھنا اور اس سے خفیہ زنا کا ارتکاب کرنا۔ خدن مذکر و مؤنث دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے: وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ: یہ سوال کا جواب ہے یعنی جب اہل کتاب کی مشرک عورتوں سے نکاح جائز ہے تو ان کا دین بھی صحیح ہوگا تو جواب ہوا کہ نہیں ان کے دین میں ایمان کے ساتھ کفر کی آمیزش ہے لہٰذا وہ باطل ہے: بِالْاِيْمَانِ سے مراد مُؤْمَنٌ بِهٖ ہے یعنی توحید رسالت اور موت کے بعد حیات وغیرہ۔ اور کفر جحود یعنی انکار کے معنی میں ہے۔ (ابن جریر نیشاپوری) یا مَعَ (با) کے معنی میں ہے یعنی کفر اور ایمان کو باہم خلط ملط کیا ہے جیسا کہ سورۃ یوسف آیت 106 میں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ
اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ
الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ
اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۞

"اے ایمان والو جب تم نماز کا ارادہ کرتے ہو تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھوو اور اگر تم جنبی ہو تو غسل کرو اور اگر تم بیمار یا سفر میں ہو یا تم میں کوئی قضائے حاجت سے آیا یا تم نے عورتوں سے ہمبستری کی ہو اور تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرو تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کا اس سے مسح کرو اللہ تعالیٰ تم پر کوئی تنگی کا ارادہ نہیں کرتا لیکن وہ تو ارادہ کرتا ہے کہ تمہیں خوب پاک کر دے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دے تاکہ تم شکر بجالاؤ" [6]۔

تفسیر 6۔ربط: سابقہ آیت میں نکاح اور کھانے پینے کے مسائل میں طیبات طہارت معنویہ کا حکم بیان ہوا تو اب اس کھانے پینے اور نکاح سے جو نجاست ظاہرہ ثابت ہوتی ہے یعنی حدث اور جنابت اس کی طہارت کا ذکر ہے اور یہ ایمان کے عقود میں سے ایک عقد ہے: اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ: اس سے قیام کا ارادہ مراد ہے مگر لفظ قیام سے اس کو ذکر کیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ فعل ارادہ سے الگ نہیں ہونا چاہیے۔ سوال: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کیلئے وضوء فرض ہے؟ جواب: اس میں مُحْدِثُوْنَ کا لفظ مقدر ہے یعنی جب تم بے وضو ہو تو۔ جس پر حدیث دلیل ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جنگ خندق کے موقع پر چار نمازیں اور فتح مکہ کے موقع پر پانچ نمازیں ایک ہی وضوء سے ادا کی تھیں۔ (خندق کی نمازوں کا ذکر ترمذی کتاب الصلوٰۃ حدیث 179 نسائی کتاب المواقیت امام البانی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے احمد میں ہے جبکہ فتح مکہ والی نمازوں کا ذکر صحیح مسلم حدیث 277، ابو داؤد، ترمذی کتاب الطہارۃ حدیث 61، ابن ماجہ حدیث 510 نسائی حدیث 133 میں ہے)۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض علماء نے اس کو نیند پر محمول کیا ہے کہ جب تم نیند سے بیدار ہو جاؤ تو نماز کیلئے وضو کرو۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ ہر نماز کیلئے تازہ وضو مستحب عمل ہے جس پر حدیث کے مطابق دس نیکیاں ملتی ہیں (ابو داؤد حدیث 62 ترمذی حدیث 59 امام ترمذی نے ضعیف کہا ہے اور شیخ البانی نے بھی مشکوٰۃ کی تخریج میں ضعیف

کہا ہے)۔ چوتھا جواب منسوخ ہونے کا ہے لیکن اس کا بیضاوی نے رد کیا ہے: فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ: قرآن مجید میں ان چار اعضاء کا خصوصی ذکر ہوا ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ غسل، مسح، پاک ہونے کے اعتبار سے یہ چار فرائض ہیں اگر ان کے علاوہ حدیث سے کسی اور چیز کی فرضیت ثابت ہو تو اس کے ساتھ کوئی تضاد نہیں ہوگا۔ جیسے نیت اور ترتیب اور پے درپے کرنا وغیرہ۔ فائدہ 1: ان اعضاء کے دھونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کیلئے سارے بدن کا دھونا تو ضروری ہے مگر بہت تکلیف دہ ہے تو ان اعضاء کا ذکر ہوا جو بدن سے اکثر ظاہر رہتے ہیں یا ان کا ظاہر کرنا کوئی مشکل نہیں ہوتا تو وہ یہ چار ہیں سر پر بھی مسح کرنے کا حکم اس لیئے دیا کہ ہر وقت اسکے دھونے سے سارے بدن پر پانی گرنے کا امکان ہوتا ہے۔ پھر خصوصا جب موسم سردی کا ہو پھر سر پر پگڑی ہوتی ہے اس کو ہٹانا بھی تکلیف دہ ہے اس لئے اس کے مسح پر اکتفا کیا گیا ہے۔ فائدہ 2: باقی جن جگہوں کا ذکر حدیث میں آیا ہے وہ ان چار کے ساتھ منسلک ہیں یعنی منہ اور ناک میں پانی ڈالنا، آنکھیں اور داڑھی چہرے میں سے ہیں حدیث میں مَضْمَضَة، اِسْتِنْشَاق اور اِسْتِنْثَار اور خلال مذکور ہے تو یہ سب مذکورہ بیان کردہ اعضاء میں سے ہیں۔ انگلیوں کے خلال پاؤں دھونے میں داخل ہے اور کانوں کا مسح سر میں داخل ہے لہٰذا ان چار اعضاء کا ذکر سب اعضاء کیلئے اجتماعی سنتوں کا ذکر شمار ہوگا: اِلَى الْمَرَافِقِ اِلٰى مَعَ: کے معنی میں ہے یہ کئی آیتوں میں آیا ہے یعنی سورۃ نساء آیت 2 سورۃ ہود آیت 52 یا مطلب یہ ہے کہ یَدٌ اصل میں کندھے تک ہے تو اِلٰی غایۃ کے اسقاط کیلئے ہے یعنی کہنی کے بعد والا حصہ وضو میں شامل نہیں ہے یا عبارت میں مخفی الفاظ یہ ہیں: اَيْدِيَكُمْ وَاتْرُكُوْهَا اِلَى مَرَافِقِ: کہنیوں کو مرفق فائدہ لینے کی وجہ سے کہتے ہیں یعنی اس پر اٹھتے بیٹھتے انسان سہارا لیتے ہے: وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ (بَا) اِلْصَاق کیلئے ہے یا اضافی ہے۔ یا تَبْعِيْض کے معنی میں ہے۔ پہلے دو توجیہ کی بنیاد پر سارے سر کا مسح مراد ہے جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے اور تیسرے قول اور توجیہہ کی بناء پر سر کے بعض حصہ کا مسح کرنا فرض ہے یعنی ماتھے یا چند دو تین بال جس پر مسح کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ پہلا قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے، دوسرا قول امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے لیکن صرف ماتھے پر مسح کافی سمجھنا یا سر کے بعض حصہ پر بغیر عمامہ کے مسح کرنا حدیث سے ثابت نہیں ہے: وَاَرْجُلَكُمْ اس میں دو قراءتیں ہیں۔ (1) پہلی قراءت لام کے زبر کے ساتھ ہے تو اس میں یہ وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ: پر عطف ہے چنانچہ یہ دلیل ہے کہ پاؤں دھونا فرض ہے۔ (۲) دوسری قراءت لام کے زیر کے ساتھ ہے تو وہ بِرُءُوْسِكُمْ کے قریب ہونے کی وجہ سے زیر دیا گیا ہے اس وقت موزوں کے پہننے کی صورت میں

پاؤں پر مسح ہے۔اہل تشیع کا موقف ہے کہ اَرْجُلَکُمْ میں لام کے زیر کی وجہ سے یہ رُءُوْسِکُمْ احادیث عطف ہونے کی وجہ سے پاؤں پر مسح کرنا فرض ہے اگرچہ پاؤں ننگے ہوں انکا عمل زبر والی قراءت اور متواتر احادیث کے خلاف ہے جس میں پاؤں دھونا نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے اور موزوں پر مسح کی حدیث کے بھی خلاف ہے یعنی راجح قراءت متواتر احادیث اور موزوں پر مسح کی صحیح احادیث ان چاروں سے اہل تشیع کا قول عمل اور فعل کے خلاف ہے۔ سوال: ابن جریر سے بھی پاؤں کا مسح منقول ہے اور اس بارے میں انہوں نے روایتیں نقل کی ہیں؟۔ جواب: امام ابن کثیر اور قرطبی رحمہما اللہ نے اس کی تاویل غسل خفیف کے ساتھ کی ہے یعنی مختصر دھونا: اِلَی الْکَعْبَیْنِ قرطبی رحمہ اللہ کے بقول سنت اور لغت دونوں سے ثابت ہے کہ اس سے مراد وہ ابھری ہوئی ہڈی ہے جو پنڈلی اور پاؤں کے درمیان ہے جس نے پاؤں کی پشت کی ہڈی قرار دی ہے وہ سنت کے خلاف ہے امام اصمعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ کہ یہ لغت کے بھی خلاف ہے فَاطَّهَّرُوْا تُشْلِیْنَ: سے پتا چلتا ہے کہ کامل طہارت مراد ہے۔ مراد سارے بدن کو دھونا ہے یعنی غسل کرنا: وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی الخ وہ بیماری مراد ہے کہ پانی استعمال کرنے سے اس میں اضافہ یا ہلاکت کا خطرہ ہو: مِّنَ الْغَآئِطِ لغت میں نیچے جگہ کو کہا جاتا ہے اور عادتاً لوگ جب صحراؤں میں قضائے حاجت کیلئے نکل جاتے ہیں تو اکثر وہ نظروں سے اوجھل ہونے کے لیے گڑھا یا کوئی نیچے جگہ تلاش کرتے ہیں ایسے جگہوں کو تلاش کرتے ہیں لہٰذا اس میں ذکر محل کا ہے اور مراد حال ہے۔ یعنی چھوٹا یا بڑا پیشاب۔ مفسر شربینی کا قول ہے کہ انسان پر اللہ تعالیٰ نے یہ حال اسلئے رکھا ہے تاکہ وہ تکبر اور گھمنڈ میں نہ آئے: اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ: اس میں اختلاف ہے۔ صحابہ کرام میں سے ابن مسعود رضی اللہ عنہ لَمَسْ سے ہاتھ لگانا یا بوسہ لینا مراد لیتے ہیں جبکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ لَمَسْ سے مراد مباشرت لیتے ہیں: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً: لفظ وجدان میں اشارہ ہے کہ بندہ حتی الوسع پانی تلاش کریگا۔ عدم وجدان عام ہے یعنی پانی نہ پانا دوری کی وجہ سے ہو قدرت نہ ہو یا بیماری کی وجہ سے استعمال نہ کرسکتا ہو۔ صَعِیْدًا روئے زمین کو کہتے ہیں صحیح بخاری کتاب التیمم حدیث 338۔344 سے ثابت ہے کہ مٹی موجود ہو، صاف ستھرے پتھر پر تیمم نہیں ہوگا: مِّنْهُ کی ضمیر صَعِیْدًا کی طرف راجع ہے تو معلوم ہوا کہ زمین کا کچھ حصہ یعنی مٹی کا شامل ہونا ضروری ہے تاکہ ہاتھ کے ساتھ مٹی لگے۔ فائدہ 1: امام بخاری رحمہ اللہ نے بیان کی ہے کہ یہ آیت تیمم کے جواز کے لیے نازل ہوئی ہے حالت سفر میں فجر کی نماز کیلئے پانی کی ضرورت تھی جبکہ پانی میسر نہیں تھا اس کو برکت الٰہیہ قرار دیا گیا ہے کتاب التفسیر حدیث 4607۔ اس طرح سورۃ نساء آیت 43 میں بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آیت اس

کے بعد نازل ہوئی ہے سبب یہ ہے کہ وہ آیت مقید ہے کہ وقت نماز قریب ہو۔ نماز کی جگہ بھی قریب ہو کیونکہ بے وضو ہونا نشے میں ہونا اور جنابت میں ہونا تینوں حالتوں میں نماز پڑھنا درست نہیں ہے۔ تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ نماز کیلئے طہارت شرط ہے۔ غسل، وضو یا تیمم کے ذریعے سے پاکی حاصل کرنی ہوگی۔ فائدہ ۲: اس آیت میں پانی نہ ملنے کے دو اسباب مذکور ہیں یعنی بیماری جس میں پانی نہ ملنے کا معنوی سبب ہے اور سفر جس میں اکثر پانی حقیقی طور پر حاصل نہیں ہوتا کبھی دونوں اسباب جمع ہوتے ہیں یعنی مریض بھی ہے اور مسافر بھی ہے اور پانی میسر نہیں ہے پھر دو اسباب نقض طہارت یعنی بول و براز چھوٹا بڑا پیشاب اور لَمَسْ جو کہ ایک معنیٰ میں سبب وضوء ہے اور دوسرے معنیٰ میں سبب جنابت ہے اس میں بھی مَانِعَةُ الْخُلُوْ ہے اور جمع بھی جائز ہے یعنی قضائے حاجت بھی کی ہو اور مباشرت بھی۔ یعنی جب حدث و جنابت دونوں جمع ہوں پھر پہلے دونوں اسباب کی جمع بعد والے دونوں اسباب کے ساتھ جمع ہونا ضروری ہے یا دونوں آخری اسباب کے ساتھ یا ہر ایک کے ساتھ الگ الگ۔ مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ الخ سورۃ حج آیت 78 میں بھی اسی طرح ہے۔ اس میں اور بعد والے جملے میں غسل تیمم اور وضوء کے جواز کی حکمتوں کے طرف اشارہ ہے پہلا سلبی فائدہ ہے یعنی حرج ختم کرنا۔ دوسرے جملے میں طہارت ظاہری وضوء اور غسل اور طہارت معنوی یعنی گناہوں کی مغفرت اس میں اشارہ ہے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کامل وضوء اور غسل ہے اور تیسرے جملے میں تکمیل نعمت کی طرف اشارہ ہے کہ سابقہ امتوں میں وضوء اور غسل کی جگہ تیمم کی رخصت نہیں تھی یہ صرف آپ کی امت کی فضیلت ہے۔ تَشْكُرُوْنَ ان امور پر عمل کرنا شکر ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

"اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو تم پر کی ہے اور اس سے کیا ہوا پختہ وعدہ (پورا کرو) جب تم نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور پیروی کی اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے سینوں میں ہے" [۷]۔

تفسیر 7 یہ بھی: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ: سے تعلق رکھتی ہے وعدوں کی وفاداری کی طرف تین طریقوں سے ترغیب ہے۔ پہلا طریقہ نعمت کا ذکر بطریقہ شکر ہے اور یہاں جنس نعمت مراد ہے نعمتیں تو بے شمار ہیں مثلاً دین کی ہدایت، زندگی، صحت، عقل، احکام شرعیہ کی طرف ہدایت، آفتوں سے حفاظت، دنیا و آخرت میں خیر سے نوازنا اور جو سابقہ آیت میں ذکر ہوئی ہیں۔ سوال: نعمتوں کو صیغہ جمع نِعَمُ اللّٰہِ کے ساتھ کیوں ذکر نہیں کیا؟ جواب: جو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں وہ تو بے شمار ہیں اگر ان کو

صیغہ جمع کے ساتھ ذکر کرتا تو ہوسکتا ہے کہ انسان کو اندیشہ ہو کہ میں ان کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں لہٰذا یہ تکلیف مالا یطاق ہے یعنی وہ بوجھ جسکے اٹھانے سے اٹھانے والا قاصر ہو: وَمِيْثَاقَهُ یہ ترغیب کا دوسرا طریقہ ہے یعنی یہ عقد تمہارے میثاق وعدہ میں شامل ہے لہٰذا اس کی تکمیل فرض ہے۔ اکثر مفسرین نے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام نے نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت عقد کیا تھا کہ ہر حال میں تنگی یا فراوانی ہو آپ کی اطاعت کرینگے خوشی و ناخوشی میں کوئی تبدیلی نہیں کرینگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیعت حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیعت ہے اس لیے میثاق کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے بعض مفسرین نے اس کو عالم ارواح کا میثاق قرار دیا ہے: الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے توثیق کا مطلب قرآن مجید اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زبانی وعدوں کی پاسداری کی یاددہانی مقصود ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ یہ ترغیب کا تیسرا طریقہ ہے، تقویٰ سے مراد وعدہ خلافی ہے اگر چہ دل میں ہو جیسا کہ بعد میں: اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: کو ذکر کیا کہ وہ باتیں جو صرف دل میں ہوتی ہیں زبان پر جاری نہیں ہوتیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑧

"اے ایمان والو اللہ کے حکم پر قائم ہو جاؤ انصاف کے ساتھ گواہی دیتے ہوئے اور تم کو کسی قوم کی عداوت اس پر نہ ابھارے کہ انصاف نہ کرو انصاف کرو اور یہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ باخبر ہے ان سے وہ جو تم کرتے ہو" [8]۔

تفسیر 8 یہ بھی اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ سے تعلق رکھتی ہے اور وفا کرنے پر ترغیب تین طریقوں (قوام۔ عدل۔ تقویٰ) سے دی گئی ہے۔ تعصب اور دشمنی کی وجہ سے عہد شکنی سے منع کیا گیا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہ احکام ایمان کے تقاضوں میں سے ہیں۔ اس وجہ سے خطاب کے ذریعے بیان کر لیا ہے اور جو کچھ پہلے بیان ہوا ہے اس کا تقاضا عام لوگوں سے ہے كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق میں پوری استقامت اختیار کرنے اور اس میں پوری کوششیں کرنے والے ہو۔ لِلّٰهِ لوگوں کو دکھانے اور شہرت کیلئے نہیں بلکہ فقط اللہ تعالیٰ کیلئے۔ اس استقامت میں عقود پر وفا کرنا بھی داخل ہے۔ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ: اس میں حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے شہادت عام ہے حق کی گواہی اور عدل اور سچائی کے ساتھ گواہی دینا اور ہر قسم کی قرابت اور تعصب اور دشمنی سے بالاتر ہو کر حق کی دعوت دینا۔ اسی طرح سورۃ نساء آیت 135 میں بھی گزرا ہے وہاں

لفظ: قِسْطِ قَوّٰمِیْنَ :کے ساتھ اور لِلّٰهِ کو شُھَدَآءَ: کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ایک وجہ یہ ہے کہ سورۃ نساء کی آیت عہد کے بارے میں ہے جس کا تعلق اپنی ذات ماں باپ اور رشتہ داروں سے ہے تو وہاں عدل سے مراد ہر ایک کو اس کا حصہ دینا پہلی شرط ہے جبکہ یہاں دشمنی ترک کرنے کے لیے لایا گیا ہے اس لیے قیام بالقسط ضروری ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ آیت کفار کے رد میں نازل ہوئی ہے اور یہ آیت یہود کے رد میں ہے چونکہ یہود میں لِلّٰهِیت نہیں تھی چنانچہ یہاں خطاب میں اللہ کو پہلے ذکر کر لیا: وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ :اجرام جرم کیلئے سبب بنتا ہے۔شَنَاٰنُ باطن کی دشمنی اور بغض کو کہا جاتا ہے قَوْمٍ یہ کافروں مشرکوں کے لیے بھی ہے اور جو کفر وشرک کے بعد ایمان لائے ان کے لیے بھی اور جن سے ذاتی دشمنی ہو تو یہ سب باتیں ترک عدل کا سبب نہیں بن سکتیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی واقعات اس پر گواہ ہیں کہ انہوں نے عدل والنصاف کا برتاؤ کیا ہے۔اِعْدِلُوْا عام ہے حقوق العباد میں عدل کرنا جیسا کہ سورۃ نحل آیت 90 میں ہے: اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی: یہ اسم تفضیل فقط فعل کے معنی میں ہے یا اشارہ ہے کہ اسباب تقویٰ تو بہت ہیں مگر قریب ترین سبب عدل ہے لِلتَّقْوٰی یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنا یا جہنم کی آگ سے بچنا۔اس میں اشارہ ہے کہ ظلم وزیادتی انسان کو تقویٰ سے بہت دور کر دیتی ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۹﴾

"اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق کیا ان کیلئے مغفرت اور اجر عظیم ہے"[۹]۔

تفسیر 9 اس آیت میں ان لوگوں کیلئے خوشخبری جو ایمان لائے اور سنت کے مطابق عمل کیے اگر چہ قَوّٰمِیْنَ کے درجہ تک نہ پہنچے ہوں: لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ: یہ جملہ وَعَدَ کیلئے مفعول کے محل میں ہے یا مستقل جملہ ہے جبکہ وَعَدَ کا مفعول محذوف ہے۔ اَجْرٌ عَظِیْمٌ لفظ عظمت اور لفظ اجر کا تنکیر اس اجر پر دلالت کرتا ہے جس کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۱۰﴾

"اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ لوگ جہنم والے ہیں"[۱۰]۔

تفسیر 10 اس آیت میں تخویف اخروی ہے۔ اُولٰٓئِكَ الخ یہ حصر کی دلیل ہے اصحاب میں دلالت ہے ملازمت پر اور ملازمت میں دوام کی دلیل ہے یعنی ہمیشہ کا عذاب کافروں کیلئے خاص ہے۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۱﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو جو تم پر (ہوئیں) جب ایک قوم نے ارادہ کیا کہ تمہاری طرف اپنے ہاتھ دراز کرے تو اس نے تم سے ان کے ہاتھ روک دیئے اور اللہ سے ڈرو اور اللہ پر ہی چاہئے کہ توکل کریں ایمان والے" [۱۱]۔

تفسیر 11 اس میں عقود پر وفاداری سے پابند رہنے کی ترغیب کے بعد دنیا کی خوشخبری ہے اور دشمنان اسلام سے حفاظت کی نعمت کا تذکرہ ہے۔ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ اس میں غزوہ عسفان کا تذکرہ ہے جب مشرکین نے مسلمانوں پر نماز کے وقت حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تو صلوٰۃ خوف کا حکم نازل ہوا اور اعرابی نے جو نبی کریم ﷺ پر تلوار تان لی تھی پھر ایمان لے آیا (صحیح بخاری کتاب المغازی حدیث 4135 صحیح مسلم کتاب الفضائل حدیث 843) بنو نضیر قبیلے والوں نے نبی کو صلح کیلئے بلا کر آپ ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر آپ کو بچا لیا (تفسیر ابن جریر الطبری 11560) چونکہ اس واقعہ میں عموم کی وجہ سے ہر دور میں مسلمانوں کی محفوظیت اور کافروں کی مغلوبیت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں عظیم نعمت ہے۔ وَاتَّقُوا اللَّهَ الخ اس میں اشارہ ہے کہ یہ نعمت تقویٰ اور توکل علی اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۲﴾

"بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے ان میں سے مقرر کیے تھے بارہ سردار اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور میرے رسولوں پر ایمان لے آؤ اور ان کو تقویت پہنچاؤ اور تم اللہ تعالیٰ کو اخلاص کے ساتھ قرض دو تو میں ضرور تم سے تمہاری برائیاں دور کروں گا اور تمہیں ضرور ایسے باغات میں داخل کروں گا جن میں نہریں بہتی ہیں پھر اس کے بعد تم میں سے جس نے بھی کفر کیا تو یقیناً وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا" [۱۲]۔

تفسیر 12 اس آیت اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ: کے ساتھ تعلق ہے اس میں وعدہ وفا نہ کرنے والوں کا حال ذکر ہے جو یہودی ہیں۔ تو یہ پہلی مثال عہد شکنی کرنے والوں کی دنیوی تخویف کے ذریعے بیان ہو رہی ہے۔ پانچ وعدوں کا ذکر اور پھر عہد شکنی پر پانچ عذاب مذکور ہیں: نَقِیْبًا: بنی اسرائیل کے حالات کی تفتیش کرنے والے ان کو کفیل امین اور ضامن بھی کہتے ہیں۔ یہ کل بارہ خاندان ہیں اور ایک ایک نقیب کو ہر خاندان میں مقرر کیا تھا جو ہر وقت ان کی اصلاح کیلئے موجود رہتا تھا تا کہ انکا نظم و نسق سنبھالے ان کے نام ابن کثیر و قرطبی رحمہما اللہ نے ذکر کیے ہیں: اِنِّیْ مَعَكُمْ سلف صالحین نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مَعَ سے مراد خاص معیت ہے جو نصرت اور معاونت کے معنیٰ میں ہے: لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ: پانچ امور کے ساتھ میثاق کی تفصیل بیان کی گئی ہے: وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ تمام رسولوں کو بلا تفریق ماننا اور ان کی تصدیق کرنا۔ سوال: ایمان صلوٰۃ و زکوٰۃ پر مقدم ہے تو یہاں ترتیب کیوں تبدیل کر دی گئی ہے؟ جواب: بنی اسرائیل نماز اور زکوٰۃ کے قائل تھے مگر باپ دادا کی رسمی عبادت کے طور پر کرتے تھے رسولوں کے طریقے پر نہیں چنانچہ ان کو ہر دور کے نبی پر ایمان لانے کا حکم ہوا اور ان پر رسولوں کی اطاعت کی قید لگا دی گئی۔ سوال: ایمان باللہ کیوں ذکر نہیں کیا گیا؟ جواب: اس میثاق کے وقت وہ ایمان باللہ کو مانتے تھے البتہ دیگر امور میں سستی کرتے تھے: وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ: جب یہ لفظ نصرت کے ساتھ ذکر ہو جائے جیسا کہ سورۃ اعراف ۱۵۷ میں ہے تو وہاں فرق ملحوظ ہوتا ہے البتہ جب الگ الگ آجائیں تو پھر ایک دوسرے کے معنیٰ میں ہوتے ہیں یعنی نصرت اور مخالفین کے شبہات سے دین کا دفاع کرنا اشارہ ہے دعوت اور جہاد کی طرف: وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ الخ زکوٰۃ کے بعد قرض سے مراد انفاق فی سبیل اللہ ہے اس لئے کہ دعوت و جہاد کے ساتھ انفاق ضروری ہوتا ہے۔

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ: اس وفاداری پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے دو وعدے ہیں: بَعْدَ ذٰلِكَ الخ سوال: جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا ہے تو وہ بھی گمراہ ہیں تو پھر اس قید لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ جواب: اس میں اشارہ ہے کہ میثاق سے پہلے انسان عذر پیش کر سکتا ہے کہ مجھے علم نہیں تھا اور ان امور کی اہمیت نہیں جانتا تھا اس لئے خلاف ورزی کی لیکن عقد و میثاق کے بعد یہ عذر باقی نہیں رہتا۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ⑬

"اُن کی بدعہدیوں پر ہم نے انہیں لعنت کی اور اُن کے دل سخت کر دیئے اللہ کی باتوں کو ان کے ٹھکانوں سے بدلتے ہیں اور بھول گئے وہ نصیحتیں جو انہیں کئے تھے اور تم ہمیشہ ان کی خیانت پر مطلع ہوتے رہو گے سوا تھوڑے سے لوگوں کے تو انہیں معاف کر دو اور انہیں درگزر کریں بے شک احسان والے اللہ کو محبوب ہیں" [۱۳]۔

تفسیر 13 اس آیت میں ان کی عہد شکنی کے پاداش میں پانچ دنیوی عذابوں کا ذکر ہے: فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ کئی بار انہوں نے اس عہد کو توڑ ڈالا ہے جس کا تذکرہ سورۃ بقرۃ میں گزر چکا ہے: لَعَنّٰهُمْ لعنت تو اللہ تعالیٰ کی رحمت خاصہ سے دوری کو کہا جاتا ہے ان کیلئے شکلیں بگڑنے اور دیگر عذابوں کی صورت میں پیش آئی: قٰسِيَةً جس میں کوئی وعظ نصیحت وغیرہ اثر نہ کرتے ہوں اور اچھائی کو برائی اور برائی کو اچھائی تصور کرتے ہوں جیسا کہ بقرہ آیت 74 سورۃ حدید 14 میں مذکور ہے: يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ : یہ دل سخت ہونے کا اثر ہے اس لیے عطف کے بغیر اس کو ذکر کیا ہے اس سے تحریف معنوی مراد ہے یعنی ایسی تاویلیں کرنا کہ شرک بدعت کفر جیسے بڑے بڑے گناہوں کو ثابت کرتے ہوں۔ جیسا کہ سورۃ بقرۃ 75 سورۃ نساء 46 اور اس سورۃ کی آیت 41 میں ذکر ہوا ہے: عَنْ مَّوَاضِعِهٖ: اس سے مراد ہے معانی مناسبہ یعنی حقیقی معانی ان سے پھیر دیئے تھے اور تحریف معنوی اور تفسیر بالرائے کرتے تھے جو مذموم ہے: وَنَسُوْا حَظًّا الخ تورات و انجیل کا وہ حصہ جو آخری نبی کی صفات اور توحید پر مشتمل تھا اس کو انہوں نے چھوڑ دیا اگرچہ بعض حصہ مانتے ہیں تو اس آیت کی مصداق بنے کہ: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ: یا مطلب یہ ہے کہ تحریف کی وجہ سے ان کے حافظے برباد ہو گئے تو دین الٰہی کا بہت حصہ بھول گئے۔ شربینی نے لکھا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انسان گناہ کی وجہ سے بعض علم کو بھول جاتا ہے انہوں نے اس آیت کو تلاوت کی: خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ یہ مصدر کے معنی میں ہے یعنی خیانت یا

موصوف مقدر ہے: فِرْقَةٌ خَائِنَةٍ یہاں خیانت سے مراد ہے دھوکہ دینا رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے کرنے کا ارادہ کرنا جھوٹ بولنا اور مشرکین سے دوستی تعلقات قائم کرنا یہ امور کتاب الٰہی کو بھلانے سے پیدا ہوتے ہیں: اِلَّا قَلِيْلًا یہ استثناء تَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ: کے ساتھ یا لَعَنّٰهُمْ اور اس کے بعد والی عبارت کے ساتھ متعلق ہے: فَاعْفُ عَنْهُمْ یہ ضمیر قَلِيْلًا کی طرف جو کہ مومنین ہیں راجع ہے یا عہد شکنی کرنے والوں کی طرف راجع ہے اور عفو سے مراد وہ جرم ہے جو انہوں نے آپ کے حق میں کیا ہے کہ ان سے بدلہ مت لو ان کو معاف کردو جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو معاف کیا تھا جس نے آپ کو زہر کھلایا تھا اور سحر کرنے والوں کو بھی معاف کیا تھا صحیح بخاری کتاب الجزیۃ حدیث 3169: وَاصْفَحْ یعنی معاف کرنے کے بعد ان سے درگزر بھی کرو یا معاف کرنے کے بعد ان سے دوستانہ مت بنانا ان سے نظر پھیر دو۔ اس کو اخلاق حسنہ کہا جاتا ہے اور یہ جہاد و قتال کی آیتوں سے منسوخ نہیں ہے کیونکہ قتال کی جگہ اور ہے اور دعوت کا میدان اور ہے جس میں اخلاق حسنہ لازم ہے: يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ: اس میں عفو اور صفح کے بعد تیسری خوبی کی طرف اشارہ ہے (احسان و انعام) یعنی تالیف قلب کیلئے انعام و احسان کرو۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ⑭

"اور وہ جنہوں نے دعویٰ کیا کہ ہم نصاریٰ ہیں ہم نے ان سے عہد لیا تو وہ بھلا بیٹھے بڑا حصہ اُن نصیحتوں کا جو انہیں دی گئیں تو ہم نے اُن کے آپس میں قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا اور عنقریب اللہ انہیں خبر دے گا اس چیز کی جو وہ کرتے تھے" [۱۴]۔

تفسیر 14 اس آیت میں ان کی ایک اور عہد شکنی کا ذکر ہے پہلے یہود کی عہد شکنی اور ایک عذاب کا تذکرہ ہوا تو اب نصاریٰ کی عہد شکنی اور ان کے حال کا ذکر ہے: قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى: قَالُوْٓا میں اشارہ ہے کہ نصاریٰ نام انہوں نے خود اپنے لئے رکھا تھا اور اس کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی تھی کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کے نصرت کرنے والے مددگار ہیں۔ یہ نام ان کو اللہ نے نہیں دیا البتہ مراد اس سے وہ نصاریٰ ہیں جنہوں نے عہد شکنی کی تھی: مِيْثَاقَهُمْ یہاں میثاق کی تفصیل سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ مراد وہ وعدہ ہے جو آیت 12 میں ذکر ہوا ہے یعنی یہودیوں کے میثاق کی طرح ہے: فَنَسُوْا حَظًّا الخ ان کے وعدہ شکنی کو بھول جانے کے طور پر ذکر کیا ہے وجہ یہ ہے کہ ان کی عہد شکنی یہودیوں کی وعدہ خلافی کی طرح واضح نہیں تھی بلکہ جہل

کےطور پر تھی جبکہ یہود کی وعدہ خلافی علم کے باوجود تھی ایک سبب یہ بھی ہے کہ نصاریٰ میں یہود کے برعکس شرک دیگر گناہوں کی نسبت زیادہ تھا: حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا: اس میں مراد مسئلہ توحید ہے: فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ: اَغْرَاءٌ، غِرَاءٌ سے لیا گیا ہے۔ گوند وغیرہ کو کہا جاتا ہے یعنی ان میں دشمنی اس قسم ڈالی گئی کہ گویا آپس میں حسد اور بغض کی وجہ سے چپک گئے یا دشمنی ان کے ساتھ چپک گئی۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہود کی بہ نسبت نصاریٰ میں فرقہ واریت زیادہ تھی۔ پہلے ان میں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یعقوبیہ۔ نسطوریہ ملکانیہ فرقے پیدا ہوئے اور اس فرقہ پرستی کے بعد ان میں بہت ہی جنگ و جدال ہوا جس کا ذکر امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اغاثۃ اللھفان میں تفصیل سے کیا ہے: اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اس سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا زمانہ یعنی دور ہو گا وہ قیامت کے قریب کا زمانہ ہے: وَ سَوْفَ الخ اس میں تخویف اخروی کی طرف اشارہ ہے: يَصْنَعُوْنَ میں اشارہ ہے کہ یہ عمل ان کا معمول تھا کیونکہ صنع اس عمل کو کہا جاتا ہے جسے انسان نے پیشہ بنایا ہو یعنی نصاریٰ اس باطل دین پر بہت جھگڑے کرتے ہیں گویا انہوں نے ان جھگڑوں کو دین بنا لیا ہے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ۬ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۵﴾

"اے اہل کتاب یقیناً تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے وہ بیان کرتا ہے اکثر وہ چیزیں جو تم کتاب میں سے چھپاتے تھے اور بہت ساری باتوں سے درگزر کرتا ہے یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی اور واضح کتاب آئی ہے" [۱۵]۔

اس آیت سے آیت 41 تک اس حصہ کا دوسرا باب ہے اس میں اہل کتاب کی عہد شکنی کا تفصیلی بیان ہے آیت 15 اور 16 میں دو خطاب اہل کتاب اور ایک خطاب ایمان والوں سے ہے اہل کتاب کو دعوت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کتاب یعنی قرآن اور آخری رسول کی اطاعت کرو تا کہ وعدہ شکنی کے بڑے اثرات اس اطاعت سے مٹ جائیں۔ پھر آیت 17 اور 18 میں ان کی وعدہ شکنی کا بیان ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ توحید الوہیت میں عیسیٰ علیہ السلام کو شریک ٹھہرایا اور اپنے نفسوں کا تزکیہ کا تذکرہ کرتے رہے کہ ہم گناہوں سے پاک ہیں پھر آیت 19 میں آخری رسول کی اطاعت کی طرف دعوت کا ذکر ہے پھر آیت 26 میں ان کی عہد شکنی کا ذکر ہے جہاد کو ترک کرنے اور بزدلی کا مظاہرہ کرنے کی صورت میں اس کے بعد ان کے حیران رہنے کا عذاب ذکر ہے اور قابیل و ہابیل کا واقعہ اور دیگر قباحتیں مذکور ہیں جن کی وجہ سے ذلتیں اور ندامتیں ان کا مقدر بن گئیں۔ آیت 31 تک۔ پھر بنی اسرائیل کی قباحتوں اور برائیوں کا تذکرہ ہے مثلاً ناجائز قتل

اللہ ورسول سے جنگ کرنا اور چوریاں کرنا۔ اور ساتھ میں سزاؤں کا ذکر ہے۔ آیت 34، 32 اور 38 پھر ایمان والوں سے خطاب ہے کہ بنی اسرائیل کی عادتوں سے بچنے کیلئے تقویٰ اختیار کرو اور صالح اعمال کے ذریعے قرب الٰہی تلاش کرو آیت 35 اور ساتھ میں تخویف اُخروی کا ذکر ہے آیت 36 اور 37 میں۔ آخر میں رد شرک فی التصرف کے ساتھ توحید کی طرف ترغیب آیت 40 میں ہے۔

تفسیر 15 اس آیت میں قرآن کی عظمت اور رسول ﷺ کی شان بیان کرنے کے ذریعے اہل کتاب کو رسول ﷺ کی اطاعت کی دعوت دی گئی ہے: يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ کتاب سے مراد جنس کتاب ہے خواہ تورات ہو یا انجیل تو دعوت یہود ونصاریٰ دونوں کو ہے: يُبَيِّنُ لَكُمۡ یہ نبی کی صفت ہے اس میں اشارہ ہے کہ حق پرست علماء ان مسائل کو بیان کرینگے جن کو باطل پرست مولویوں نے عوام الناس سے چھپایا ہوا: مِنَ ٱلۡكِتَٰبِ یعنی کتاب میں مسائل موجود ہیں مگر تم نے چھپادیئے ہیں: وَيَعۡفُواْ عَن كَثِيرٖ ان کے بیان سے اعراض مراد ہے اس سے وہ مسائل مراد ہیں جو ہمارے دین میں منسوخ ہیں کیونکہ یہ وہ مسائل ہیں جن کا آخری نبی ﷺ اور اس کے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیز دونوں طرف تو کثرت نہیں ہوسکتی ہے تو مراد اس سے کثرت فی نفسہٖ ہے: قَدۡ جَآءَكُم مِّنَ ٱللَّهِ: اس میں قرآن مجید کی طرف ترغیب ہے اور اس کی دو صفتوں کا بھی ذکر ہے پہلی صفت نور یعنی اس کی روشنی آجانے کے بعد جہالت کے اندھیرے ختم ہوتے ہیں حق واضح ہوتا ہے اور جہالت زائل ہوتی ہے۔ سورۃ نساء آیت 75 اور سورۃ تغابن آیت 8 میں بھی اسی طرح ہے: وَكِتَٰبٞ مُّبِينٞ صفت کو صفت پر عطف کیا ہے جبکہ موصوف ایک ہی ہے: مُّبِينٞ میں لازمی اور متعدی دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ یعنی اس میں احکام شرعیہ واضح موجود ہیں یا احکام ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نور سے اسلام مراد ہے زجاج کا قول یہ ہے کہ نور سے محمد ﷺ مراد ہیں۔ فائدہ: بعض نادانوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ محمد ﷺ بشر نہیں بلکہ نور ہیں۔ جواب: نور کا وصف بشریت اور رجولیت سے تعارض نہیں رکھتا کیونکہ نور سے مراد یہ ہے کہ وہ حق کی روشنی لیکر آئے اس روشنی کے ذریعے مخفی باتیں اہل کتاب کی ظاہر ہوئیں جو انہوں نے چھپائی تھیں اور شرک کے اندھیرے اس نور کے ذریعے ختم ہوئے۔ ابن جریر وغیرہ نے اس معنی کی تائید میں مندرجہ ذیل آیتیں ملاحظہ کریں کہ نبیوں کے بشریت ورجولیت نور، ہدایت سے متصادم نہیں ہے۔ آل عمران آیت 79 انعام آیت 91 ابراہیم آیت 11، کہف آیت 110 الانبیاء آیت 3 مؤمنون آیت 24، 33، 34 اور 37 شعراء آیت 54 یٰسین آیت 15 فصلت 6 تغابن آیت 6 ہود آیت 27 اسراء

آیت 94،93 قمر آیت 24 مذکورہ آیتوں میں انبیاء کی بشریت کا ذکر تھا اب ان آیتوں کا ذکر ہے جن میں نبیوں کے رجولیت یعنی مرد ہونے کا ذکر ہے۔ سورۃ اعراف آیت 43،7 فرقان آیت 8 غافر آیت 28 یوسف آیت 109 نحل آیت 43 انبیاء آیت 7۔ تنبیہ: اگر کوئی شخص یا گروہ صفت نور کی وجہ سے نبی کی بشریت ورجولیت یعنی آدمی ہونا اور بشر ہونا نہیں مانتا تو وہ مذکورہ تمام آیتوں کا منکر ہے۔ سوال: اس قسم کے لوگوں کا خیال ہے کہ حقیقت میں نور ہے لیکن بشری صورت میں متشکل ہوا ہے یعنی بشر کی شکل میں ظاہر ہوا ہے؟ جواب: جہاں نورانی مخلوق (ملائک) کو بشر کی شکل میں بھیجا گیا ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے یا اس کے رسول ﷺ نے وضاحت کی ہے کہ یہ بشر کی شکل میں نوری مخلوق متشکل ہوئی ہے جیسا کہ سورۃ مریم آیت 17 میں مذکور ہے اور احادیث میں بکثرت ذکر ہے کہ جبرئیل انسانی شکل میں حاضر ہوتے ہیں حدیث جبرئیل وغیرہ میں مذکور ہے لیکن کسی نبی کے متعلق قرآن یا کسی صحیح حدیث میں نہیں ہے کہ وہ بشر کی شکل میں نور آیا ہے۔ سوال: نبی کریم ﷺ کا سایہ نہیں تھا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا جسم نہیں تھا لہٰذا آپ خالص نور تھے؟ جواب الزامی: اگر جسم نہیں تھا تو جو کپڑے آپ ﷺ پہنتے تھے ان کپڑوں کا سایہ تو ہونا چاہئے تھا۔ تحقیقی جواب یہ ہے کہ جس روایت سے استدلال کیا جاتا ہے وہ حدیث ضعیف ہے اس کو حکیم ترمذی نے نقل کیا ہے اور محدثین جرح وتعدیل نے اسے ضعیف قرار دیا ہے خصوصاً اس میں عبدالرحمن بن قیس راوی کو تاریخ بغداد ج,10 ص251 اور تہذیب التہذیب ج6 ص258 میں متروک کہا ہے۔ یہ روایت نوادر الاصول میں ہے پھر اس سے سیوطی نے خصائص الکبریٰ میں نقل کیا ہے اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے بستان المحدثین میں لکھا ہے کہ نوادر الاصول میں اکثر غیر معتبر احادیث مذکور ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ حقیقتاً بشر تھے البتہ بطور صفت ہدایت وروشنی لیکر آنے کی وجہ سے نور تھے لہٰذا بشر کا عقیدہ نور کیلئے نقیض (خلاف) نہیں ہے۔

يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝

"اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے اس کے ذریعے اس شخص کو جو اس کی رضامندی کی پیروی کرتا ہے سلامتی کی راہیں اور اس کو اپنے حکم سے اندھیروں سے نکالتا ہے روشنی کی طرف اور سیدھی راہ کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے" [16]۔

تفسیر 16 اس آیت میں آخری نبی یا قرآن مجید کے تین فائدے ذکر کیے ہیں۔ پہلا فائدہ: يَهْدِي بِهِ، بِهِ کی ضمیر قرآن

یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے دونوں میں سے ہر ایک ہدایت الٰہی کا سبب ہے: مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ اس قید کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں یَهْدِیْ سے ہدایت تک پہنچانا اور توفیق دینا مراد ہے: سُبُلَ السَّلٰمِ. السَّلٰمِ اللہ تعالیٰ کا نام ہے یا مراد جہنم کے عذاب یا دیگر تمام آفات سے بچانا اور سلامتی دینا ہے مراد جنت ہے۔ سوال: قرآن مجید میں: صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ: مفرد کے صیغہ سے ذکر ہوتا ہے یعنی صراط اور حبل اللہ لیکن یہاں جمع ذکر کیا ہے ایسا کیوں؟ جواب: جہاں مفرد واحد صیغہ سے ذکر ہوا ہے وہاں مراد ایمان اور عقیدہ ہے اور وہ ایک ہوتا ہے اس لیے مفرد ذکر کیا ہے جبکہ یہاں پر سُبُل سے مراد احکام و اعمال قرآنیہ ہیں چنانچہ وہ زیادہ ہیں اسلئے جمع ذکر ہوا ہے۔ دوسرا فائدہ: وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ الخ ظلمات اور دیگر گناہ مراد ہیں یعنی معنوی اندھیرے، کفر، شرک، بدعات، رسومات اور گناہوں کے اندھیرے قرآن اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے یہ سب اندھیرے ختم ہوئے ہیں: بِاِذْنِهٖ اس میں اشارہ ہے کہ ظلمات کے اخراج کے لیے توفیق الٰہی ضروری ہے اور اس کے لیے اذن الٰہی شرط ہے: یَهْدِیْ کے ساتھ اس شرط کو ذکر نہیں کیا وجہ یہ ہے کہ وہاں بِهٖ سببیت ذکر کیا ہے جیسا کہ سورۃ ابراہیم آیت 1 میں ہے۔ تیسرا فائدہ: وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ: پہلے ہدایت احکام اور اعمال کی تھی اور یہاں ہدایت عقیدے کی مراد ہے۔ یا وہاں مقاصد کی ہدایت مراد تھی اور یہاں دلائل کی ہدایت مراد ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ یَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّهْلِكَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۷﴾

"بے شک کافر ہوئے وہ جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح بن مریم ہی ہے آپ فرما دیجئے کون اختیار رکھتا ہے اللہ تعالیٰ کے مقابل کسی چیز کی اگر وہ چاہے کہ ہلاک کردے مسیح بن مریم اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی جو چاہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے" [17]۔

تفسیر 17 یہ آیت یُبَیِّنُ لَكُمْ كَثِیْرًا سے متعلق ہے اس میں نصاریٰ کے گروہ کا رد ہے کہ ان کو انجیل میں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو بات کہی گئی تھی کہ وہ اللہ کے بندے ہیں انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی عبودیت کا عقیدہ چھپایا اور لوگوں میں عیسیٰ کی الوہیت کو دین قرار دیدیا تو قرآن مجید نے اس قید کو بیان کرتے ہوئے ظاہر کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی

الوہیت کا عقیدہ کفر ہے۔ یعقوبیہ فرقے نے عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ قرار دیا اور اس کیلئے فلسفہ یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ جو کہ الٰہ ہے ناسوتیت کے ساتھ یکجا ہوا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کیا ہے)۔ سوال: نصاریٰ میں ایسے لوگ تو نہیں پائے جاتے جن کا یہ عقیدہ اور قول ہو کہ: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ بلکہ اس کے برعکس کہتے ہیں؟ جواب: یہ بطریقہ الزامی رد ہے یعنی جب یہ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کیا ہے تو لامحالہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مسیح ہی ہے کیونکہ مسند الیہ کا حصر مسند میں ہوا ہے جس کا نتیجتاً معنیٰ یہی بنے گا۔ مفسر شربینی نے (بغیر حلول کے) ایک توجیہ اس طرح کی ہے کہ انہوں نے کہا عیسیٰ علیہ السلام مٹی سے پرندے بناتے ہیں مردوں کو زندہ کر لیتے ہیں سارے عالم کی تدبیر کرتے ہیں تو اس بناء پر لفظ اللہ سے مراد صفت مشہورہ ہے یعنی متصرف و مدبر سارے عالم کا عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ چنانچہ اس عقیدہ کی تردید چار طریقوں سے کی گئی ہے۔ (۱) عالم کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام بھی فنا ہونے والے ہیں اور کوئی بھی عالم کو فنا سے نہیں بچا سکتا اور عیسیٰ علیہ السلام خود کو بھی فنا ہونے سے نہیں بچا سکتے تو پھر وہ کس طرح مدبر متصرف ہوسکتے ہیں: يَمْلِكُ. يَقْدِرُ. يَسْتَطِيْعُ یا يَمْنَعُ کے معنیٰ میں ہے۔ مِنَ اللّٰهِ. مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ. مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ. مِنْ مُرَادَاتِ اللّٰهِ سوال: وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا: کو اس (عیسیٰ علیہ السلام) کے ساتھ کیوں ذکر کیا ہے؟ جواب (1): اس میں اشارہ ہے کہ مرنے اور فنا ہونے کے اعتبار سے عیسیٰ علیہ السلام دیگر مخلوق کے ساتھ برابر ہیں۔ جواب (2): مراد یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ماں اور ساری زمین والے بھی مل کر اس کو موت سے نہیں بچا سکتے۔ (۲) وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: کہ سارے کائنات کا نظام چلانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور عیسیٰ علیہ السلام وَمَا بَيْنَهُمَا میں داخل ہیں یعنی زمین و آسمان کے درمیان ہیں لہٰذا وہ رعیت اور مخلوق ہیں الٰہ نہیں۔ اس لئے کہ: وَمَا بَيْنَهُمَا سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مخلوق ہیں اور انہوں نے مرنا ہے کیونکہ محدود وہ محصور ہیں لہٰذا وہ الٰہ نہیں ہوسکتے۔ سوال: یہاں پر مَا بَيْنَهُنَّ عبارت چاہئے تھی؟ جواب: یہ ضمیر آسمانوں اور زمین کی طرف راجع ہے دو طرفوں یا دو قسموں کے اعتبار سے (۳) يَخْلُقُ یعنی عیسیٰ علیہ السلام ایجاد کے طور پر پیدا نہیں کرسکتے وہ تو صرف پرندے کی شکل و صورت بنالیتے دوسری بات یہ کہ وہ ہر چیز نہیں بنا سکتے تھے۔ (۴) وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اللہ تعالیٰ تو قدرت مطلق کا مالک ہے اصل کے بغیر چیز کو وجود دیتا ہے جیسا کہ آسمانوں اور زمینوں کو بغیر کسی اصل کے وجود میں لایا اور وہ اصل سے بھی تخلیق کرسکتا ہے جیسے وَمَا بَيْنَهُمَا کو پیدا کیا اور غیر جنس سے مخلوق پیدا کرنے پر قادر ہے جیسا کہ آدم علیہ السلام اور ایک

جنس سے پیدا کرتا ہے جیسا کہ حوا علیہا السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور عام انسانوں کو دو جنسوں سے پیدا کر لینا جیسا تمام انسان ہیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؗ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

"یہود و نصاریٰ نے کہا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں فرما دیجئے پھر وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی وجہ سے کیوں عذاب دیتا ہے بلکہ تم بھی انسان ہو ان میں سے جن کو اس نے پیدا کیا ہے وہ بخشتا ہے جسے چاہتا ہے اور عذاب دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ ہی کیلئے ہے آسمان و زمین کی بادشاہت اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور اسی کی طرف پلٹنا ہے"[18]۔

تفسیر 18 اس آیت میں اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے عقیدے کا مزید رد ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جس طرح انہوں نے عیسیٰ اور عزیر علیہما السلام کے بارے میں افراط کیا تھا تو اسی طرح اپنے نفسوں کے بارے میں زیادتی کر رہے تھے یعنی اپنا تزکیہ کر رہے تھے کہ ہم سب لوگوں سے اعلیٰ اور پاک لوگ ہیں تا کہ کسی کو ان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہ ہو اس لئے انہوں نے کہا: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ: اس میں وہ اپنی عصمت ثابت کر رہے تھے۔ اس قول میں علماء کی مختلف توجیہات ہیں (1) یہ دعویٰ تشبیہ پر مبنی ہے یعنی ہم اللہ تعالیٰ کیلئے ایسے ہیں جیسے باپ کیلئے محبوب اولاد ہم اللہ کے مقرب بندے ہیں اور وہ ہم پر بہت ہی مہربان ہے اَحِبَّآؤُهٗ اس کیلئے تفسیر ہے۔ (2) امام سمعانیؒ نے امام نخعیؒ سے نقل کیا ہے کہ یہود نے تورات میں اس طرح عبارت پائی تھی کہ یَا اَبْنَاءَ اَحْبَارِیْ اے میرے علماء کے بیٹو تو اس میں تحریف کرتے ہوئے انہوں نے اس طرح عبارت بنا ڈالی کہ یَا اَبْنَاءَ اَبْکَارِیْ اے میری لڑکیوں کے بیٹو۔ نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف یہ عبارت منسوب کی ہے کہ ایک دن وہ کہنے لگے: اَذْهَبُ اِلٰی اَبِیْ وَاَبِیْکُمْ: میں اپنے اور تمہارے والد کی طرف جاتا ہوں تو انہوں نے کہا اس سے معلوم ہوا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ (3) تیسری توجیہ قرطبی اور شربینی رحمہم اللہ وغیرہ کا قول ہے کہ اس میں مضاف کو حذف کیا گیا ہے یعنی اَبْنَاءُ الرُّسُلِ وَالْاَنْبِیَاءِ اس میں مقصد اپنے بڑوں بزرگوں پر فخر کرنا اور انبیاء و رسل کو قرب الٰہی کا وسیلہ بنانا تھا۔ (4) چوتھی توجیہ۔ مفسر آلوسی رحمہم اللہ نے لکھی ہے کہ تورات و انجیل کی اصطلاح میں ابن فرمان بردار مقرب اور دوست کو کہا جاتا تھا روح المعانی میں آلوسی نے کافی عبارتیں نمونہ کیلئے نقل کی

ہیں:قُلۡ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمۡ بِذُنُوۡبِکُمۡ :اس میں چار طریقوں سے ان کا رد کیا ہے۔(5) پہلا طریقہ یہ ہے کہ کوئی باپ اپنے محبوب بیٹے اور دوست اپنے دوست کو سزا نہیں دیتا جبکہ تمہیں تو اللہ تعالیٰ نے بہت عذاب دیئے کبھی چہرے مسخ کئے، کبھی تمہارے اوپر پہاڑوں کو اٹھایا اور دیگر ذلتوں کے ساتھ تمہیں عذاب دیا ان کے قول کے مقتضٰی کے مطابق لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً یُعَذِّبُ: فعل مضارع ماضی کے معنی میں ہے۔ سوال: اگر دنیا کا عذاب مراد لیا جائے تو اعتراض ہوسکتا ہے کہ اُحد میں 70 صحابہ کی شہادت اور شہادت حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں کہا جائے گا حالانکہ وہ تو اللہ کے ولی تھے! جواب: اس سے وہ مخصوص عذاب مراد ہے جو یہود و نصاریٰ پر مسلط کیا گیا تھا یعنی شکلوں کا بگاڑ، بندر اور خنزیر بنانا، یا مراد وہ آگ ہے جس کا انہوں نے اقرار کیا ہے یعنی:لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً: یا مطلب یہ ہے کہ ان کے دعوے پر بنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کیلئے بیٹے ہونے یا محبوب ہونے کا دعویٰ صحابہ کرام نے نہیں کیا ہے۔ امام نیشاپوری رحمہ اللہ نے یہ سوال و جواب کی ذکر کیا ہے تحقیقی جواب یہ ہے کہ دنیا میں مؤمن کیلئے شہادت کی موت اور قتل یا دیگر مصائب درجات کی بلندی کا سبب ہیں:بَلۡ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ الخ ان کے قول کے رد کیلئے یہ دوسرا طریقہ ہے یعنی جب تم (نعوذ باللہ) اللہ کے بیٹے ہو تو پھر تم بشر نہیں ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ تم بشر ہو پھر ایک اشکال پیدا ہورہا تھا کہ ہوسکتا ہے محبوبیت کی وجہ سے وہ بشریت میں منتقل ہوئے ہوں تو اس وہم کو ختم کرنے کیلئے فرمایا کہ :مِّمَّنۡ خَلَقَ مخلوقیت سے باہر نہیں ہوسکتے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہیں یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ اس کی دلیل ہے:وَلِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ : یہ تیسرا طریقہ ہے جس میں ان کا رد کیا گیا ہے یعنی تم اللہ تعالیٰ کے مملوک ہو اور آسمان و زمین میں محصور ہو:اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ یہ چوتھا طریقہ ہے یعنی آخرت میں تم اس کی ملکیت و مشیت سے کہیں باہر نہیں جاسکتے بلکہ جزا و سزا کیلئے اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے۔

یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ قَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمۡ عَلٰی فَتۡرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِیۡرٍ وَّ لَا نَذِیۡرٍ ۫ فَقَدۡ جَآءَکُمۡ بَشِیۡرٌ وَّ نَذِیۡرٌ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۹﴾ ع

"اے اہل کتاب بے شک تمہارے پاس ہمارے یہ رسول تشریف لائے کہ تم پر ہمارے احکام ظاہر فرماتے ہیں بعد میں تم یہ نہ کہو کہ رسولوں کا آنا مدتوں بند رہا تھا کہ تم کہو ہمارے پاس کوئی خوشخبری اور ڈرانے والا نہیں آیا تو تحقیق تمہارے پاس خوشخبری اور ڈرانے والے تشریف لائے ہیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"[19]۔

تفسیر 19 پھر اہل کتاب سے خطاب ہے کہ اس رسول کی بعثت کا مقصد لوگوں کا عذر ختم کرنا ہے اور اس طرح ایک وہم

کا خاتمہ بھی کرنا ہے کہ یہ کہتے تھے کہ ہم اپنی کتاب میں موجود تشابہات کی بنا پر عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ اور خود کو اللہ کے بیٹے قرار دیتے ہیں۔ تو جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول تمہارے پاس آیا اور اس نے تمہیں محکمات پیش کیے ہیں اور تشابہات پر عمل کا طریقہ سکھایا ہے لہٰذا اب تمہارا کوئی عذر باقی نہیں ہے۔ یُبَیِّنُ لَکُمْ اس کا مفعول حذف ہے اس لئے کہ پہلے گزر چکا ہے کہ کَثِیْرًا مِّمَّا تُخْفُوْنَهٗ یا اَلشَّرَائِعُ وَالْاَحْکَامُ یا کَیْفِیَّةِ رَدِّ الْمُتَشَابِهَاتِ اِلَی الْمُحْکَمَاتِ، عَلٰی فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ، فَتْرَةٌ فتور سے لیا گیا ہے۔ سست ہونا اور سکون وانقطاع کو کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسے دور میں آیا ہے کہ سابقہ نبیوں کی شریعتوں پر عمل نہ ہونے کے برابر ہے اور سلسلہ نبوت رک جانے سے ان کی شریعتوں پر عمل کے آثار بھی ختم ہو گئے ہیں اور سارا عالم ہدایت کیلئے محمد ﷺ کے انتظار میں تھا محتاج تھا تو اللہ تعالیٰ نے ایسے حال اور دور میں بھیجا۔ عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ کے مابین وقفہ میں مختلف اقوال ہیں۔ (1)600 سال صحیح بخاری مناقب الانکار حدیث 3947 (2)560 سال۔ (3)640 سال۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری احادیث الانبیاء حدیث 3442 میں حدیث نقل کی ہے کہ (لَیْسَ بَیْنِیْ بَیْنَهٗ نَبِیٌّ) میرے اور اس کے درمیان کوئی نبی نہیں گزرا یہ ان لوگوں پر سخت رد ہے جو کہتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان تین یا چار نبی اور رسول گزرے ہیں۔ صحیح بخاری کی یہ حدیث ان کا صریح یعنی واضح رد ہے: اَنْ تَقُوْلُوْا، کَرَاهِیَةَ اَنْ تَقُوْلُوْا یا لِئَلَّا تَقُوْلُوْا: پہلا قول بصریوں کا ہے دوسرا قول کوفیوں کا ہے: فَقَدْ جَآءَکُمْ: اس سے قبل عبارت مخفی ہے: فَلَا تَعْتَذِرُوْا بِهٰذَا الْعُذْرِ: یہ بہانہ مت بناؤ۔ قَدِیْرٌ اس بات پر اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ پے در پے رسولوں کو بھیج دے کبھی وقفہ سے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو فَتْرَةٌ یعنی وقفہ کے دور میں گزرے ہیں وہ عذر پیش کر سکتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا ۖ وَّاٰتٰىکُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۝

"اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم یاد کرو اللہ کی نعمت جو تم پر کی ہے جب اس نے تم میں انبیاء مقرر کیے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں دیا وہ کچھ جو عالم میں سے کسی کو نہیں دیا" [20]۔

تفسیر 20 اس کا ربط سابقہ مضمون کے ساتھ بہت سی وجوہ سے ہے (1) یہ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ: سے متعلق ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم جہاد کو ترک کرنے کی اس بات کو چھپا رہی تھی تو قرآن نے اُس کو ظاہر کیا۔

ربط (2) پہلے ان کی بعض بری صفات کا ذکر کیا ہے جو ان کے افراط سے متعلق تھیں تو اب ان کی تفریط کا ذکر آیت 22 اور 24 میں ہے۔ ربط (3) اس میں بنی اسرائیل کی ایک عہد شکنی اور اس پر سزا کا ذکر ہے کہ ترک جہاد کی وجہ سے سرگرداں پھرتے رہے: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی ایک مضمون کو دوسرے مضمون پر عطف کیا گیا ہے۔ یعنی جیسا آپ نے ان کا افراط ذکر کیا ہے تو اب انکو یہ قصہ بھی ذکر کرو: نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: نعمت انعام کے معنی میں ہے اور عَلَيْكُمْ اس کے ساتھ متعلق ہے یا صفت ہے اور: کَائِنَةٌ عَلَیْکُمْ: مقدر ہے ذکر سے مراد جہاد کی حکم کی تکمیل ہے: اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ: یہ نعمت کی تفصیل تین امور کے ساتھ ہے۔ (1) کثرت کے ساتھ بنی اسرائیل میں نبیوں کو بھیجنا یعنی یعقوب علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک اور جعل فعل ماضی استمرار کے معنی میں ہے جو ماضی اور مستقبل دونوں پر مشتمل ہے تو موسیٰ علیہ السلام سے پہلے اور بعد دونوں کیلئے ہے۔ یہ دینی نعمت ہے جو سب نعمتوں پر اعلیٰ و ارفع ہے (2) وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا اس میں عام معنی مراد ہے یعنی فرعونیوں سے آزادی، غلاموں نوکروں کے مالک بنا دینا۔ گھروں بیویوں کے مالک بنا دینا۔ امام سمعانیؒ کا قول ہے کہ بغیر اجازت کوئی بھی تمہارے علاقہ میں نہیں داخل ہو سکے گا۔ یہ نعمت سب میں موجود رہی اس لئے فِيْكُمْ کے بجائے جَعَلَ فرمایا ہے۔ یہ نعمت دنیاوی ظاہری ہے۔ (3) وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ الخ اس میں معجزانہ ظاہری و باطنی دونوں نعمتوں کا ذکر ہے۔ وہ نعمتیں مراد ہیں جو سورۃ بقرہ میں مذکور ہیں یعنی فرعونی لشکر دشمن کی ہلاکت، سمندر میں راستے بنا کر دینا من و سلویٰ کا نزول، پتھر سے چشمے جاری کرنا، بادلوں کا سایہ بنانا: مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ: اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو بنی اسرائیل کے وقت میں یا ان سے پہلے تھے کیونکہ فعل ماضی اس پر دلیل ہے مفسر شربینی کا قول ہے کہ اس زمانہ میں یہ لوگ علماء حق اور اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے دین کے مددگار تھے ان کو یہ کرامات توحید اور موسیٰ علیہ السلام کی سنت کی پیروی کی وجہ سے حاصل ہوئی تھیں۔

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ۝

"اے میری قوم کے لوگو اس پاک زمین میں داخل ہو جاؤ جس کا جہاد تمہارے لئے اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے اور اپنی پیٹھوں کے بل مت پھرو پس تم ہو جاؤ گے نقصان والے" [۲۱]۔

تفسیر 21 پہلے آیت میں تمہید تھی اور اس آیت میں نعمت کا شکر ادا کرنے کا طریقہ مذکور ہے: اُدْخُلُوا اس میں جہاد کے ذریعے سے داخل ہونے کا طریقہ ہے: الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ مبارک اور پاکیزہ کے معنی میں ہے یعنی دنیاوی اور اُخری

برکات اس میں بہت ہیں قتادہ رحمہ اللہ کے بقول یہ شام کی زمین ہے جس میں بیت المقدس، دمشق، فلسطین اور بعض حصے اردن کے داخل ہیں: الَّتِي كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ یعنی تقدیر میں لکھا ہے جو کہ لوح محفوظ ہے یا وہ وعدہ جو کہ یعقوب علیہ السلام کی زبان مبارک سے ہوا تھا۔ پھر اس کی اولاد کو حکم ہوا پھر یوسف علیہ السلام کے ذریعے سے سارے مصر والوں کو یہ حکم منتقل ہوا پھر موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جو انہوں نے مصر سے ہجرت کر لی تو ان کو حکم ہوا اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ انہوں نے حالات معلوم کرنے کیلئے بارہ نقیبوں کو روانہ کیا تو انہوں نے اس مقدس زمین پر قوم عمالقہ جابرہ کو آباد پایا تو اُن کو حکم ہوا کہ قتال کے ذریعے سے اس مقدس زمین کو ان سے آزاد کرو۔ وَلَا تَرْتَدُّوْا ایسے موقعہ پر نبی کو چھوڑ کر جہاد سے انکار مرتد ہونا ہے۔ یا معنیٰ یہ ہے کہ بزدلی کی وجہ سے واپس مت بھاگو: فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ اس میں اشارہ ہے کہ فرضیت جہاد کے بعد ترک جہاد دنیا اور آخرت میں نقصان کا سبب ہے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿22﴾

" کہنے لگے اے موسیٰ (علیہ السلام) یقیناً اس میں ایک بڑی زورآور قوم آباد ہے اور ہم ہرگز اس میں داخل نہیں ہونگے جب تک کہ وہ نکل نہ جائیں اس سے پھر اگر وہ اس سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے"[22]۔

تفسیر 22 اس میں ان کی وعدہ شکنی، بزدلی اور خباثت کا ذکر ہے۔ قَالُوْا یہ بات ان دس نقیبوں سرداروں نے کی اور ان کی تقلید میں باقی بنی اسرائیل نے بھی کی للہذا انہوں نے نبی کی بات کے مقابل کسی اور کی بات مان لی نجَبَّارِيْنَ جباران کو کہا جاتا ہے جو لوگوں کو زبردستی اپنے مقصد کی طرف لے آتے ہیں۔ یہ اجبار سے لیا گیا ہے جو اکراہ یعنی زبردستی کے معنیٰ میں ہے یا جبر سے لیا گیا ہے جس کا معنیٰ اصلاح ہے۔ البتہ اس شخص کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو اپنے لئے فائدے جمع کرتا ہے خواہ جائز ہوں یا ناجائز ہوں۔ زجاج کا قول ہے کہ انسانوں میں جبار سرکش کو کہا جاتا ہے۔ تنبیہ: وہ روایتیں جو اس قوم سے متعلق مفسرین نے نقل کی ہیں کہ ان کے قد بہت لمبے تھے جیسے عوج بن عنق کا قصہ اس کا رد کرتے ہوئے امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس طرح کے بیان کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اور یہ (صحیح بخاری کتاب احادیث انبیاء 3327 صحیح مسلم کتاب الجنۃ حدیث 2841) کی اس حدیث کے خلاف ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام کا قد 60 ذراع تھا پھر اس کی اولاد کے قد اس سے کم ہونا شروع ہوئے تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ عوج بن عنق اور جبارین کے قد آدم علیہ السلام سے زیادہ ہوں۔ للہذا یہ قصہ عقل و نقل ہر اعتبار سے جھوٹا ہے۔ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا

ان کے پہلے سبب ذکر کیا یہ مسبب ہے داخل نہ ہونا عذر کی بنا پر ہے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے قتال سے واضح انکار نہیں کیا۔

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیۡنَ یَخَافُوۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمَا ادۡخُلُوۡا عَلَیۡہِمُ الۡبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلۡتُمُوۡہُ فَاِنَّکُمۡ غٰلِبُوۡنَ ۬ۚ وَعَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوۡۤا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝

"اور ان میں سے دو آدمیوں نے کہا جو (اللہ سے) ڈرتے تھے اللہ نے انعام کیا تھا ان دونوں پر تم دروازے سے داخل ہو جاؤ پھر جب داخل ہو جاؤ گے تو تم غالب ہو گے اور اللہ ہی پر تم بھروسہ کرو اگر تم مؤمن ہو" [۲۳]۔

تفسیر 23 رَجُلٰنِ مشہور قول یہ ہے کہ یہ یوشع اور کالب نام کے دو افراد ہیں: یَخَافُوۡنَ ان لوگوں میں سے تھے جو جبابرہ سے ڈرتے تھے یا ان افراد میں سے تھے جو حکم الٰہی کی مخالفت سے ڈرتے تھے: اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمَا یعنی اس صفت میں یہ اور لوگوں سے ممتاز تھے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے خاص انعام سے نوازا تھا یعنی صبر، استقامت اور اللہ تعالیٰ کی نصرت پر یقین۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اس سے نبوت مراد ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کو دی گئی تھی: اَلۡبَابَ شہر کا ایک دروازہ تھا جس میں داخل ہونے سے ان پر رعب آتا: فَاِنَّکُمۡ غٰلِبُوۡنَ مخالفین کے عدم ایمان اور خود کا نصرت الٰہی پر یقین کی بنا پر ایسا کہا: وَعَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوۡۤا اس میں غلبہ حاصل کرنے کیلئے سبب کا ذکر ہے۔ یعنی ایمان لانے کے بعد ذات الٰہی پر اعتماد اور توکل کرو: اِنۡ بمعنی اِذۡ ہے ان کو برائے تاکید ذکر کیا ہے شک کے لئے نہیں ہے۔

قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَہَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوۡا فِیۡہَا فَاذۡہَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا ہٰہُنَا قٰعِدُوۡنَ ۝

"انہوں نے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام) ہم ہرگز اس (زمین) میں داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ اس میں (آباد) ہوں پس آپ اور آپ کا رب جائیں پس دونوں (ان سے) لڑیں ہم یہاں بیٹھے رہیں گے" [۲۴]۔

تفسیر 24 اس میں بنی اسرائیل کے انکار قتال کے ساتھ ساتھ اللہ ورسول کی بے ادبی کرنے کا ذکر ہے۔ بنی اسرائیل نے ان دونوں افراد کی بات مسترد کی اور کثرت والوں کی بات اپنائی جو شریعت کے خلاف تھی: فَاذۡہَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّکَ ان کا یہ قول رب کی توہین کے بنا پر ہے یا بے سوچے سمجھے منہ سے نکالا ہے۔ ان کا یہ قول مُشَبِّہَۃ کی طرح ہے قرطبی۔ لہٰذا اس کے سبب سے وہ کافر ہوئے یا اس میں مقدر عبارت ہے وَلۡیُعِنۡکَ رَبُّکَ. یا وَرَبُّکَ مَعَکَ: تیرا رب تیری مدد کرے۔ یا تیرا ساتھ دے۔ یا رب سے بڑا بھائی ہارون علیہ السلام مراد ہے۔ بعد والے قول کی بنا پر بنی اسرائیل فاسقین شمار ہوئے جیسا کہ ان کو بعد میں فاسق کہا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقداد بن عمرو نے حدیث بیان کی جس کو (صحیح بخاری کتاب

التفسیر حدیث 4609 صحیح مسلم کتاب الجہاد حدیث 1779) میں ذکر کیا ہے کہ بدر کے دن جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قتال کی ترغیب دی تو مقداد رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ ہم آپ کو وہ بات نہیں کہیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی کہ: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ: ہم تو آپ سے کہتے ہیں کہ آپ جہاں بھی جائیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ہم کو برک الغماد مقام میں سخت ترین سفر پر لیکر جائیں گے تو ہم جانے کیلئے تیار ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۵﴾

"فرمایا موسیٰ (علیہ السلام) نے اے میرے رب یقیناً میں اختیار نہیں رکھتا مگر اپنا اور اپنے بھائی کا لہٰذا جدائی کر دے ہمارے اور نافرمان قوم کے درمیان" [۲۵]۔

تفسیر 25 یہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اس قوم کیلئے بددعا ہے اور فرض جہاد چھوڑنے کا برا اثر ہے: رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ: سوال: حقیقی ملکیت تو انسان کی اپنے نفس پر نہیں ہے نہ تو جان بیچ سکتا ہے نہ قتل کر سکتا ہے؟ جواب (1): اس سے ملک اطاعت مراد ہے یعنی میری اطاعت صرف میرا نفس اور میرا بھائی کرتا ہے۔ جواب (2): یہ مقدر عبادت کے ساتھ مستقل جملہ ہے یعنی: وَاَخِیْ لَا یَمْلِكُ اِلَّا نَفْسَهٗ میرا بھائی اختیار نہیں رکھتا مگر اپنے نفس کا۔ سوال: اس کی اطاعت تو ان دو ساتھیوں نے بھی کی تھی۔ (1) یوشع، (2) اور کالب نے جواب (1): ان پر بھی اس کا ایسا اعتماد نہیں تھا جیسا اپنے بھائی پر تھا۔ جواب (2): علامہ شربینی کا قول ہے کہ اخی کا معنیٰ عام ہے یعنی مَنْ یُّوَاخِیْنِیْ فِی الدِّیْنِ: جو دین میں میرا بھائی ہے اور میری موافقت کرتا ہے: فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ: فرق کا معنیٰ ہے کہ ہر ایک کی حالت کی مناسبت سے اس کا فیصلہ ہو۔ یا ان کی جماعت سے جدائی اختیار کرنا ان کے گناہوں میں دوری اور ان کے عذاب میں شرکت سے بچنا مراد ہے یا آخرت میں جدائی مراد ہے۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ ع

"فرمایا (اللہ نے) یہ زمین حرام کر دی گئی ان پر چالیس برس تک وہ زمین میں سرگرداں پھریں گے لہٰذا تم نافرمان قوم پر غم نہ کھاؤ" [۲۶]۔

تفسیر 26 اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام کی بددعا کی قبولیت اور اس قوم پر دنیاوی عذاب کا ذکر ہے: مُحَرَّمَةٌ اکثر مفسرین کا

قول ہے کہ یہ تحریم منعی ہے یعنی لغوی معنی میں ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو روک لیا تھا لہذا ان کو یہ توفیق ہی حاصل نہیں تھی کہ اس علاقہ سے نکل جاتے اللہ نے ایسے اچھوتے اسباب پیدا کیے تھے کہ وہ اس زمین سے باہر جا ہی نہیں سکتے تھے۔ ابوعلی کا قول ہے کہ یہ منع شرعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا تھا کہ وہ مقدس زمین پر قدم نہیں رکھیں گے لیکن پہلا قول بہتر ہے: اَرْبَعِیْنَ سَنَةً اَرْبَعِیْنَ کے عامل میں دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ مُحَرَّمَۃٌ سے متعلق ہے اور تحریم موقت یعنی مقررہ وقت تک تھی تو 40 سال بعد یوشع علیہ السلام کے دور میں غالب آ گئے۔ (۲) یَتِیْھُوْنَ سے متعلق ہے اور حرمت ابدی مراد ہے لیکن ان کی عمریں اللہ تعالیٰ نے پریشانی کے ساتھ چالیس سال مقرر کی تھیں چالیس سال گزرنے کے بعد بنی اسرائیل کی یہ نسلیں ختم ہو گئیں اور ان کی اولاد یوشع علیہ السلام کے معیت میں جبابرہ کے ساتھ قتال کر کے غالب آ گئی۔ فائدہ: موسیٰ و ہارون علیہما السلام بھی ان کے ساتھ اس زمین میں رہے مگر بطور عذاب نہیں تھے جیسا کہ جہنم میں ملائک بطور چوکیدار ہیں لیکن آگ ان کو نہیں چھوتی۔ پھر وہ دونوں موسیٰ و ہارون علیہما السلام فوت ہو گئے اور یوشع علیہ السلام کو نبوت دی گئی: یَتِیْھُوْنَ، تِیْهٌ سے لیا گیا ہے پریشانی۔ اور حیران ہونے کو کہتے ہیں۔ یہ عذاب ترک جہاد کی وجہ سے ملا اب بھی جہاد چھوڑنے سے مسلمانوں کو پریشانی کا سامنا ہے۔ اس نسبت سے اس ملک کو میدان تیہ سے موسوم کیا گیا: فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ اس میں موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اطمینان دیا ہے۔ اسیٰ غم ہمدردی اور افسوس کیلئے استعمال ہوتا ہے لہذا کافروں فاسقوں کی مصیبتوں اور عذاب پر افسوس کرنا یا ہمدردی اور غم کرنا حرام ہے۔ اسی سورۃ کی آیت 68 اور سورۃ اعراف آیت 93 میں بھی اسی طرح ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝

"آپ بیان کیجئے آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں کی سچی خبر جب ان دونوں نے ایک ایک قربانی پیش کی تو قبول ہوئی ان دونوں میں سے ایک کے اور قبول نہیں ہوئی دوسرے کی اس نے کہا میں تجھے ضرور قتل کرونگا اس نے کہا اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے صرف پرہیزگاروں سے" [۲۷]۔

تفسیر 27 ربط (1) سابقہ آیت میں ترک جہاد بنی اسرائیل کیلئے سبب ذلت و پریشانی بنا تو اس آیت میں مومن بھائی کا ناحق قتل بے عقلی و پریشانی کیلئے سبب قرار دیا گیا۔ ربط (2) پہلے بنی اسرائیل کی خباثتوں کا ذکر ہوا تھا تو اس قصہ میں

ان کی دیگر خباثتوں کا ذکر ہے کہ ان میں حسد ہے جس کی وجہ سے باہم قتل وقتال کرتے ہیں جو کہ قابیل کا ورثہ ہے تو اس میں ان کی مزید خباثت مذکور ہے کہ ناحق قتل، اسراف، اللہ ورسول سے جنگ زمین میں فساد کی کوششیں یہ سب حسد سے پیدا ہوتی ہیں۔ ربط (3) پہلے بنی اسرائیل کی وعدہ خلافی کا ذکر ہوا جو کہ ترک جہاد ہے اور اس کی وجہ سے ان کی ذلت اور عذاب کا تذکرہ کیا گیا تو اس قصہ میں قابیل کی وعدہ خلافی کا ذکر ہے کہ حسد کے سبب تقویٰ چھوڑنا اور اپنے بھائی کو قتل کرنا بغیر کسی قصور وگناہ کے جو کہ اس کیلئے سبب عذاب بنا جس سے اس کی عقل زائل ہوئی اور وہ پریشان وحیران رہا: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ ضمیر بنی اسرائیل یا موجودہ اُمت کی طرف راجع ہے۔ ابنَ آدم صحیح قول یہ ہے کہ یہ دونوں آدم وحوا علیہما السلام کے صلبی بیٹے تھے اور بعض علماء کا قول ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تھے۔ امام ابن کثیر، قرطبی آلوسی رحمہم اللہ نے دوسرے قول کو ضعیف کہا ہے اور یہ ہابیل وقابیل کے نام سے موسوم تھے: إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا: ابن کثیر نے لکھا ہے کہ قربانی کا سبب صرف اللہ تعالیٰ کا امر تھا اور کوئی بات یا سبب نہیں تھا۔ اس میں اشارہ ہے کہ قربانی کرنا سنت قدیم ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ قابیل اور ہابیل کا جھگڑا بہن کی نکاح پر ہوا یعنی قابیل اپنی بہن ہابیل کو نہیں دینا چاہتا تھا جبکہ اس دور میں اس طرح کی اجازت تھی لہٰذا ان دونوں کو قربانی کرنے کا حکم ہوا۔ یہ اسرائیلی روایت ہے جس کی ہم تکذیب وتصدیق نہیں کرتے۔ قُرْبَان کوئی بھی چیز جو تقرب الی اللہ کیلئے پیش کی جائے تو وہ قربانی ہے اکثر مالی صدقہ اور خرچ میں استعمال ہوتا ہے چاہے کوئی جانور اللہ کی راہ میں ذبح کیا جائے یا اناج دیا جائے۔ ہابیل کی قربانی ذبیحہ کی صورت میں اور ہابیل نے کچھ ردی قسم غلہ وغیرہ صدقہ کیا تھا: فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا قبولیت کا طریقہ اس وقت یہ تھا کہ آسمانی آگ کے ذریعے سے اس کو جلادیا جاتا تھا یعنی آسمان سے آگ کا نزول ہوتا تھا جسے وہ جلا ڈالتی تو قبول ہوتا اور جسکو چھوڑ جاتی تو مردود ہوتا۔ اس کی طرف سورۃ آل عمران آیت 183 میں اشارہ ہوا ہے لہٰذا ہابیل کی قربانی قبول ہوئی اور قابیل کی رد کی گئی اور بعد میں لفظ مُتَّقِيْنَ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ قابیل کی قربانی اخلاص کی کمی کی وجہ سے قبول نہیں ہوئی قبولیت کی یہ شرط سورۃ حج آیت 37 میں ذکر ہوئی ہے: قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قابیل کا یہ قول حسد کی بناء پر ہے کیونکہ اس کی قربانی قبول ہوئی تو اس نے اس سے حسد شروع کیا اس لیے کہ اس کی فضیلت ثابت ہوئی جو سبب حسد بنا۔ بعض اہل علم سے منقول ہے کہ پہلا حسد کا گناہ آسمانوں پر شیطان نے کیا ہے آدم علیہ السلام کے مقابل اور زمین پر پہلا گناہ حسد کا قابیل نے کیا ہے اپنے بھائی ہابیل کے ساتھ۔ پھر بنی اسرائیل میں حسد کثرت سے پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ اس اُمت میں بھی منتقل ہوا جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے: قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ

اَلْمُتَّقِيْن: یہ مختصر جواب ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ قبولیت تو تقویٰ کی بناء پر ہے لہٰذا تجھ میں تقویٰ نہیں تھا یہ نقصان تیرے نفس کی جانب سے ہے اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے: اَلْمُتَّقِيْن اس سے مراد موحدین متبعین سنت جن کے عمل میں اخلاص بھی شامل ہو اِنَّمَا میں حصر دلالت کرتا ہے کہ بغیر تقویٰ عمل نامقبول ہے۔ ملا علی قاری نے مشکوٰۃ کی شرح مرقاۃ میں کہا ہے کہ یہ ایک جملہ ہے اور ایک جملہ حدیث میں ہے کہ :لَا يَقْبَلُ اللهُ لِصَاحِبِ الْبِدْعَةِ صَوْمًا وَلَا صَلٰوةً:(یہ روایت موضوع ہے ضعیف ابن ماجہ۔ السلسلۃ الضعیفۃ 1493)۔یعنی اللہ تعالیٰ بدعتی شخص کا روزہ نماز قبول نہیں کرتا لہٰذا ان دونوں جملوں سے پتا چلتا ہے کہ بدعتی شخص متقی نہیں ہوتا۔(اس مفہوم کی حدیث براوایت علی رضی اللہ عنہ صحیح بخاری کتاب الدیات حدیث 6882 میں ہے)(مترجم)۔

لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ۝

’’البتہ اگر تو میری طرف ہاتھ بڑھائے گا تاکہ تو مجھے قتل کرے تو میں تو نہیں بڑھاؤں گا اپنا ہاتھ تیری طرف تاکہ تو جھے قتل کروں یقیناً میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا رب ہے‘‘[۲۸]۔

تفسیر 28 یہ ہابیل کا قول ہے بَسَطْ: ہاتھ دراز کرنا بڑھانا ارادہ قتل کے اظہار سے کنایہ ہے یعنی تیرے قتل کا میں ارادہ نہیں رکھتا اگرچہ تیرا ارادہ میرے قتل کا ہو: لِاَقْتُلَكَ اس میں اشارہ ہے کہ تیرے قتل کا ارادہ نہیں کرتا یہ مقصد نہیں کہ دفاع بھی نہیں کرونگا دفاع کرنا تو فرض عمل ہے ہماری اس امت کو بھی فتنہ کے دور میں حکم ہے کہ اپنا دفاع کرو۔قرطبی نے ابوداؤد کی حدیث جوکہ سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (نبی اکرم ﷺ نے فرمایا!اس سے لڑو۔فرمایا اگر وہ مجھے قتل کرے۔ فرمایا تم شہید ہو۔فرمایا اگر میں اس کو قتل کروں۔فرمایا اس کا خون رائیگاں ہے۔(صحیح مسلم 1/ 87) سعد رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ اگر میرے گھر میں کوئی داخل ہوجائے اور مجھے قتل کرنا چاہے تو میں کیا کرونگا۔فرمایا تم آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے اچھے کی طرح ہوجاؤ۔(كُنْ كَخَيْرِ اِبْنَيْ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ صحیح ابن حبان حدیث 5931 ترمذی 3/ 222 مع التحفۃ۔ الصحیحۃ حدیث 1524)۔پھر اس آیت کی تلاوت کی: اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی کسی مسلمان کے قتل کا ارادہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ضروری ہے تاکہ اس طرح کے جرم کے ارتکاب سے بندہ بچ جائے۔لہٰذا یہ لفظ لِاَقْتُلَكَ: اور ابوداؤد کی حدیث دفاع والی اور اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ یہ سب دلائل ہیں کہ ہابیل نے بزدلی ظاہر نہیں کی اور نہ ہی خاموش بیٹھا رہا بلکہ دفاع کیا ہے اور تفسیر خازن و تفسیر نسفی میں لکھا ہے کہ ہابیل قابیل سے طاقت میں زیادہ قوی تھا

لیکن گناہ سے بچنے کیلئے وہ قاتل کے بجائے مقتول بنا۔ بعض اساتذہ نے اس مقام میں لکھا ہے کہ ہابیل کی طرح مت بنو خاموش مت بیٹھو۔ ان کا یہ قول سابقہ دلائل کی وجہ سے باطل ہے۔ (اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے)۔

إِنِّيٓ أُرِيدُ أَن تَبُوٓأَ بِإِثۡمِي وَإِثۡمِكَ فَتَكُونَ مِنۡ أَصۡحَٰبِ ٱلنَّارِۚ وَذَٰلِكَ جَزَٰٓؤُاْ ٱلظَّٰلِمِينَ ۝٢٩

"میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرا اور تیرا گناہ دونوں تم سے ہی پلے پڑے تو تو دوزخی ہو جائے اور یہ بے انصافوں کی یہی سزا ہے"|۲۹|۔

تفسیر 29 اس قول میں ہابیل نے قابیل کو ناحق قتل سے ڈرایا ہے: إِنِّيٓ أُرِيدُ أَن تَبُوٓأَ: سوال: ارادہ کرنا کہ فلاں شخص گناہ کر کے جہنم میں داخل ہو جائے یہ تو دعوت ہے جو کہ حرام ہے؟ جواب (1): مراد یہ ہے کہ ہابیل نے کہا کہ میں تو اپنا دفاع کرونگا تیرے قتل کرنے سے لیکن اگر کسی سبب سے پھر بھی تو مجھے بے گناہ قتل کرے تو میرا گناہ تجھ پر لادا جائیگا۔ کل عبارت اس طرح ہے: إِنِّي أُرِيدُ مَدَّ اِفِعْتكَ لَا قَتْلَكَ فَإِذَا قَتَلْتَنِي فَتَبُوٓءُ بِإِثْمِي الخ میں تو تیرے قتل کا نہیں صرف دفاع کا ارادہ رکھتا ہوں پھر بھی اگر تو نے مجھے قتل کیا تو میرے قتل کے جرم میں ملوث ہو جائیگا۔ جواب (2): زمخشری کا قول ہے کہ اس کو مجازاً ارادہ کہا ہے۔ جواب (3): سمعانی کا قول ہے کہ اس سے مراد: عِقَابَ إِثْمِي: میرے گناہ کا وبال: بِإِثۡمِي وَإِثۡمِكَ: سوال: پہلے والے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہابیل کا گناہ بھی قابیل پر آئے گا یہ اس آیت کے خلاف ہے کہ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٞ وِزۡرَ أُخۡرَىٰ: جواب: اثمی سے مراد قابیل کا ہابیل کو قتل کرنا مراد ہے اور یہ تو قابیل ہی کا عمل ہے: وَإِثۡمِكَ اس سے قابیل کے دیگر گناہ ہیں تقویٰ نہ اختیار کرنا، بھائی سے حسد، باپ کی مخالفت وغیرہ۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مجاہد سے جو قول منقول ہے کہ إِثْمِي سے ہابیل کے دیگر گناہ مراد ہیں یہ غلط ہے: مِنۡ أَصۡحَٰبِ ٱلنَّارِ: یہ لفظ اکثر کافروں کے متعلق استعمال ہوتا ہے اس لیے مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ قابیل مسلمان نہیں کافر تھا لیکن امام قرطبی نے اس قول کا رد کیا ہے۔ قاتل کے لیے: أَصۡحَٰبُ ٱلنَّارِ استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتل طویل عرصہ جہنم میں رہے گا۔

فَطَوَّعَتۡ لَهُۥ نَفۡسُهُۥ قَتۡلَ أَخِيهِ فَقَتَلَهُۥ فَأَصۡبَحَ مِنَ ٱلۡخَٰسِرِينَ ۝٣٠

"پس مزین کیا اس کو اس کی نفس نے بھائی کا قتل اس نے قتل کر دیا تو ہو گیا وہ نقصان والوں میں سے"|۳۰|۔

تفسیر 30 اشارہ ہے کہ ہابیل کی نصیحت نے قابیل کو فائدہ نہیں دیا: فَطَوَّعَتۡ لَهُۥ خوبصورت مزین کرنا، ابھارنا، آسان

کر کے دکھانا: نَفْسُهٗ اس میں اشارہ ہے نفس اِمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ کی طرف: الْخٰسِرِيْنَ دنیاوی خسران یہ ہے کہ ماں باپ اس سے ناراض ہوئے بھائی سے محروم ہوگیا۔ آخرت کا نقصان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگیا۔ ظالموں میں شمار ہوا جہنم کی آگ اس کیلئے واجب ہوگئی۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء حدیث 3335 و صحیح مسلم کتاب القسامۃ حدیث 1677 کے علاوہ دیگر محدثین نے صحیح حدیث نقل کی ہے کہ ہر بے گناہ قتل میں قابیل کیلئے گناہ کا حصہ مقرر ہے اس لیے کہ اس نے اس جرم کی بنیاد رکھی ہے تو بہت بڑا خسران اور نقصان ہے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۝31

"پھر بھیجا اللہ تعالیٰ نے ایک کوا وہ کھود رہا تھا زمین کو تا کہ دکھائے اس کو کس طرح چھپائے اپنے بھائی کی لاش اس نے کہا ہائے افسوس کیا میں اس سے بھی عاجز ہوں کہ ہو جاؤں مثل اس کوے کی کہ چھپا دیتا میں اپنے بھائی کی لاش تو وہ پچھتانے والوں میں سے ہوگیا" [۳۱]۔

تفسیر 31 اس میں خسران کے آثار میں سے ایک اثر کا ذکر ہے کہ گناہ کی وجہ سے قابیل کا فہم اتنا خراب ہوا کہ تعلیم و تربیت میں کوے کا محتاج ہوا۔ قرآن کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ کوے نے اپنے کھانے کی کوئی چیز مٹی میں چھپا دی (جیسا کہ بعض پرندوں کی عادت ہے) تو اس عمل کو دیکھ کر قابیل نے اس سے عبرت حاصل کر لی اور اپنے بھائی کی لاش کو قبر میں چھپایا یعنی بھائی کیلئے قبر کھودی اور اس میں دفنایا۔ یہ سنت مستمرہ بنی کیونکہ یہ انسانوں میں پہلی میت تھی اس لیے قابیل کو معلوم نہ تھا کہ میت کے ساتھ کیا کرنا ہے؟ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ الخ (لام) فَبَعَثَ اللّٰهُ سے متعلق ہے: سَوْءَةَ بدن کا وہ حصہ جس کے ظاہر ہونے کو انسان ناپسند کرتا ہے۔ زندہ انسان کے ستر کو سَوْءَةٌ کہا جاتا ہے جبکہ مردے کے سارے بدن کو سوءۃ کہا گیا ہے: يٰوَيْلَتٰى اصل میں یاوَیْلَتِیْ ہے (تا) کے زیر سے ہے لیکن حرف ندا کی وجہ سے (تا) پر زبر پڑھا گیا ہے۔ کلام عرب لوگ ہلاکت کے وقت بددعا کے لیے بولتے ہیں افسوس کیلئے بھی آتا ہے: اَعَجَزْتُ استفہام تقریری کوے کی مشابہت کی تمنا کرنا بھی انتہائی بے وقوفی کی دلیل ہے: فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ: سوال: ندامت تو حدیث کی رو سے توبہ ہے: اَلنَّدَامَةُ التَّوْبَةُ: (صحیح ابن ماجہ حدیث 4252 باب الندامۃ والتوبۃ) جواب یہ ندامت بھائی کی لاش اٹھا کر پھرنے کی وجہ سے ہے یا قتل کا نقصان ہونا اور فائدہ حاصل نہ ہونا ہے۔ صرف قتل پر اس نے افسوس اور ندامت نہیں کی

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس زمانہ میں ندامت توبہ نہیں تھی اور مدارک میں نسفی نے لکھا ہے کہ نَادِمِیْنَ مُتَحَیِّرِیْنَ کے معنی میں ہے۔ بعض مفسرین نے آدم علیہ السلام کے اشعار و مرثیہ اپنے بیٹے کی موت پر نقل کیے ہیں لیکن امام زمخشری نے اس کو صریح جھوٹ قرار دیا ہے اور امام رازیؒ نے بھی زمخشری کی تصدیق کی ہے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝۳۲

"اس سبب سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا اور جس نے بچایا کسی نفس کو اس نے گویا سب لوگوں کو بچایا اور بے شک ان کے پاس ہمارے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ آئے پھر بے شک ان میں بہت اس کے بعد زمین میں زیادتی کرنے والے ہیں" [۳۲]۔

تفسیر 32 اس میں قابیل کے واقعہ سے بحث کو بنی اسرائیل کی قباحتوں کی طرف منتقل کر دیا گیا ہے: مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ: قرطبی فرماتے ہیں کہ اَجْلِ جنایت اور جرم کے معنی میں ہے: ذٰلِكَ اشارہ قابیل کی طرف ہے یا اَجْلِ کا وہی مشہور معنی ہے اور ذٰلِكَ میں اشارہ ان مفاسد کو مستلزم ہے یہ قصاص کی مشروعیت کا سبب ہے اور تمام ادیان میں خاص کر بنی اسرائیل کے دین میں قتل عمد کے بارے میں تشدید کا بھی سبب ہے: كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ: بنی اسرائیل کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے عظیم آسمانی کتاب (تورات) ان پر نازل ہوئی یہ مسئلہ اگرچہ پہلے وحی کی صورت میں جاری تھا مگر کتابی صورت میں نہیں تھا (تورات کے اندر نازل کیا گیا)۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں دلوں کی سختی بہت زیادہ تھی اور حسد کی وجہ سے ان میں قتل و قتال اور دیگر مفاسد زیادہ پائے جاتے تھے: اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ بطریق اشارۃ النص معلوم ہوا کہ قصاص شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کا ارتکاب، ارتداد اور قطع الطریق یعنی ڈاکہ مارنے کی صورت میں قتل نفس ضروری ہے اس کے علاوہ اگر کسی نفس کو قتل کیا گیا تو وہ ظلماً اور ناحق قتل کہلائے گا اس کی قباحت اور شدت عبارۃ النص میں بیان کی جارہی ہے (جیسا کہ صحیح بخاری کتاب الدیات حدیث 6878 صحیح مسلم فی الحدود حدیث 1676 میں فرمان نبوی ہے: لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِاِحْدَى ثَلَاثٍ، كُفْرٌ بَعْدَ اِيْمَانٍ، زِنًا بَعْدَ اِحْصَانٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ: مسلم شخص کا خون بہانا حلال نہیں ہے مگر تین میں سے کسی ایک سبب سے (1) ایمان

کے بعد کفر کا ارتکاب کرنے والا۔(2) شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کا ارتکاب کرنے والا۔(3) یا بغیر بدلہ کے کسی نفس کو قتل کرنے والا: فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ: سوال: جس نے زیادہ قتل کیے ہوں اس کی سزا ایک قتل والے سے زیادہ ہے تو یہ تشبیہ کس طرح صحیح ہوگی؟ جواب(1): یہ سزا کیلئے تشبیہ نہیں ہے بلکہ ہتک حرمت اور فساد پیدا ہونے میں ہے اس کی مثال اس طرح ہے کہ دو آدمی قسم کھاتے ہیں کہ اس درخت سے پھل نہیں کھائیں گے پھر ان دونوں میں سے ایک نے صرف ایک دانہ پھل کھایا اور دوسرے نے سارے پھل توڑ کر کھالیے تو قسم توڑنے میں دونوں برابر ہیں۔ یہ ابن عطیہ اور قرطبی رحمہما اللہ کا قول ہے۔ جواب(2): یہاں پر خاص نفس مراد ہے امام عادل کا قتل یا نبی ورسول کا قتل یا اس قسم کے لوگوں کا دفاع مراد ہے اور ان کا بچالینا یا قتل کرلینا گناہ اور سزاء میں تمام انسانوں کے مشابہ ہے۔ ابن جریر، قرطبی رحمہما اللہ: وَمَنْ اَحْيَاهَا احیاء مقابل قتل ہے مقابل موت نہیں ہے اور مقابل قتل کا معنیٰ یہ ہے کہ کسی نفس کو ہلاکت کی جگہ سے یا جلنے یا دشمن کے قتل کے دست برد سے نجات دلانا یا غرق ہونے سے بچانا یہ معنوی حیات کہلاتی ہے جیسا کہ سورۃ انفال آیت 24 اور 42 میں ہے۔ اشارۃ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مرتد کرنا قتل ہے اور مسلمان کرنا قتل سے بچاؤ ہے: وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ اشارہ ہے کہ مذکورہ احکام جاری رکھنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں بہت انبیاء ورسول بھیجے ہیں تاکہ ان کا کوئی عذر باقی نہ ہو۔ لَمُسْرِفُوْنَ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں تجاوز کرنے کو اسراف کہا جاتا ہے جیسا کہ شرک، کفر، بدعت کا ارتکاب اور بندوں کے حقوق میں ظلم، قتل وغیرہ یہ سب اسباب عذاب ہیں۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۗ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٣٣﴾

"یقیناً بدلہ ان لوگوں کا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد کی کوششیں کرتے ہیں یہ ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا وہ سولی دیئے جائیں یا مخالف جانب سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں اس علاقہ سے وہ نکال دیئے جائیں یہ ان کیلئے دنیا میں ذلت ہے اور ان کیلئے آخرت میں عذاب بہت بڑا ہے" [۳۳]۔

تفسیر 33 اس آیت میں ان کے اسراف کی بعض قسموں کا بیان ہے جو دنیا اور آخرت میں سزا کا باعث ہیں۔ یہ خباثتیں بنی اسرائیل میں تورات کے نزول کے بعد واقع ہوئی تھیں۔ اس آیت کے متعلق مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ عکل اور عرینیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام کو انتہائی بے دردی کے ساتھ قتل کیا تھا

اور مرتد ہوکر اونٹوں کو چُرا کر لے گئے تھے۔ (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4610 صحیح مسلم کتاب القسامۃ حدیث 1671) کسی نے کہا کہ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی اس کو امام قرطبی وابن جریر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک سے نقل کیا ہے۔ ابوداؤد، نسائی نے ذکر کیا ہے کہ یہ مشرکین کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ آیت عام ہے جو مشرکین وغیرہ سب کیلئے ہے یعنی جن میں یہ بری صفات ہو ں خواہ وہ مسلمان ہوں اس لیے کہ اُمت کے علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ لوگوں کو لوٹنے والے ڈاکو وغیرہ اگر چہ مرتد نہ بھی ہوں نگران کی سزا یہ ہے: يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرتے ہوں اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں خواہ کفر، مرتد ہونے کی صورت میں ہو یا عام ہو۔ بعض مفسرین نے مضاف مقدر مراد لیا ہے یعنی يُحَارِبُونَ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ وَرَسُوْلَهٗ: البتہ ہر دو صورتوں میں مقصد ایک ہی ہے وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا: یعنی لوگوں کو قتل کرنے، مال چھین لینے یا ڈرانے سے فساد کرتے ہیں: أَنْ يُّقَتَّلُوْٓا الخ اس میں سلف کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ (أو) برائے اختیار ہے یعنی امیر المؤمنین اور قاضی کی مرضی ہے کوئی بھی سزا اس کیلئے منتخب کر لے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ (أو) برائے تنویع (قسم) ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اگر اس نے مسلمان کو صرف قتل کیا ہوتو اس کی سزا صرف قتل ہے اگر قتل کے ساتھ لوٹ بھی لیا ہوتو اس کیلئے قتل و پھانسی دونوں ہیں، اگر صرف مال چھین لیا ہوتو ایک سمت کا پاؤں اور دوسرے سمت کا ہاتھ کاٹ لیا جائے۔ اگر مسلمانوں کو صرف ڈرایا دھمکایا ہوتو اس کو جیل میں ڈال دیا جائے، یا جلاوطن کیا جائے: أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ: سمعانی نے عمر بن عبدالعزیز سے نقل کیا ہے کہ ایسے شخص کو تمام اسلامی ریاستوں سے بیدخل کیا جائے۔ اہل کوفہ نے کہا اس کو جیل میں ڈال دیا جائے۔ ابن جریر نے اس قول کو پسند کیا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ دوسرے شہر کے جیل میں ڈالا جائیگا: ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ الخ چونکہ ڈاکہ زنی سے تجارت کے راستے بند ہوتے ہیں اور عبادت کا سفر کرنا بھی منقطع ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کیلئے سخت ترین سزا مقرر کی ہے۔ مذکورہ سزاؤں میں دنیا کی تذلیل، توہین وشرمندگی ہے: وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: اس آیت سے بعض لوگوں کا استدلال ہے کہ دنیا کی سزاؤں سے آخرت کا عذاب ختم نہیں ہوگا جبکہ اس کے برعکس علماء کا کہنا ہے کہ یہ کافروں سے متعلق ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ آیت عام ہے۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡهِمۡ ۚ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۴﴾

"مگر وہ جنہوں نے توبہ کر لی قبل اس کی کہ تم ان پر (قابو) قدرت حاصل کر لو پس جان لو کہ اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے" [۳۴]۔

تفسیر 34 اگر اس آیت میں کفار مراد ہوں تو پھر معاملہ واضح ہے کیونکہ توبہ کرنے سے کفر، شرک، سب گناہ معاف ہوتے ہیں اور آیت اگر مؤمنین سے متعلق مان لی جائے تو پھر اکثر سلف صالحین کا موقف یہ ہے کہ حقوق اللہ تو توبہ کرنے سے معاف ہوتے ہیں مگر قصاص اور حقوق العباد معاف نہیں ہوتے۔ وہ بھی تب کہ جب گرفتاری سے قبل اس نے توبہ کر لی ہو۔ اگر گرفتاری کے بعد توبہ کر لے تو حدود الٰہیہ بھی معاف نہیں ہوں گے جیسا حقوق العباد معاف نہیں ہیں۔ یہ راجح قول ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡهِ الۡوَسِیۡلَةَ وَجَاهِدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِهٖ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۳۵﴾

"اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اس کا قرب تلاش کرو اور کوششیں (جہاد) کرو اللہ تعالیٰ کے راستے میں تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ" [۳۵]۔

تفسیر 35 ربط (1) سابقہ آیتوں میں بنی اسرائیل کی قولی اور فعلی خباثتیں بیان ہوئیں تو اب ایمان والوں کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے اور یہاں تقویٰ سے مراد بنی اسرائیل کی مذکورہ خباثتوں سے اجتناب کرنا ہے۔ ربط (2) نیشاپوری نے فرمایا ہے کہ یہ آیت سابقہ آیت 18 سے متعلق ہے یعنی یہود و نصریٰ تقرب الی اللہ کیلئے اپنے آباؤ اجداد کے اعمال پر فخر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایمان والوں سے مخاطب ہے کہ اسلاف اور آباؤ اجداد کے اعمال سے تقرب حاصل نہیں ہوتا بلکہ اپنے صالح اعمال کے توسل سے قرب الٰہی حاصل کرو: وَاتَّقُوا اللّٰهَ: احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں۔ (1) ایک منہیات ہیں یعنی وہ اعمال جن سے اجتناب لازم ہے۔ (2) مامورات ہیں جن پر عمل لازم ہے۔ اسی طرح احکام شریعہ کی دو حالتیں ہیں۔ (1) خود عمل پیرا ہونا۔ (2) دوسروں کو اس کی طرف دعوت دینا۔ تو منہیات چھوڑنے کیلئے اتَّقُوا اللّٰهَ میں اشارہ ہے یہ معنیٰ ابن کثیر رحمہ اللہ، خازن وغیرہ نے نقل کیا ہے اور مامورات پر عمل کیلئے اشارہ ہے: وَابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡهِ الۡوَسِیۡلَةَ: اور دعوت و جہاد کی طرف اشارہ ہے جَاهِدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِهٖ: کامیابی کے یہ ارکان سورۃ العصر میں دوسری تعبیر سے مذکور ہیں۔ وسیلہ کے مسئلے پر تفصیلی بحث: اس مسئلہ کو چھ (6) ابحاث پر مشتمل کیا ہے۔ پہلی بحث: لغوی اور اصطلاحی معنیٰ میں ہے، قاموس اور اس کی شرح میں لکھا ہے کہ وسیلہ بادشاہ کی طرف پہنچنے، مرتبہ، قرب، تعلق کو کہا جاتا ہے۔ جوہری

نے صحاح میں فرمایا ہے کہ وَسِیْلَةُ الْغَیْرِ۔وہ چیز جس کے ذریعے سے دوسری چیز کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ابن کثیر نے
لکھا ہے کہ: مَا يَتَوَصَّلُ بِهٖ اِلٰى تَحْصِيْلِ الْمَقْصُوْدِ کہ اسکے ذریعے سے مقصد تک پہنچا ہو تفسیر خازن میں کہا ہے کہ
شاعر نے اس طرح کہا ہے اِنَّ الرِّجَالَ لَهُمْ اِلَيْكَ وَسِيْلَةٌ یعنی قُرْبَةٌ: امام آلوسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وَسِيْلَةٌ
بروزن فَعِيْلَةٌ ہے جس کا معنی ہے: مَا يَتَوَصَّلُ بِهٖ وَيَتَقَرَّبُ بِهٖ اِلَى اللّٰهِ مِنْ فِعْلِ الطَّاعَاتِ وَ تَرْكِ
الْمَعَاصِيْ: یعنی وہ کام جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہو اور ان کاموں کو چھوڑ دینا جو قرب میں رکاوٹ بنیں۔امام
ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد نے ابووائل اور حسن بصری، قتادہ عبداللہ بن کثیر، سدی، ابن زید سے نقل
کیا ہے کہ وسیلہ قرب کے معنی میں ہے پھر انہوں نے کہا کہ اس معنی میں مفسرین میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہوا اور ابن
جریر نے مذکورہ اقوال کے اسانید ذکر کی ہیں۔ابن زید سے وسیلہ کا معنی محبت بھی نقل کیا ہے۔امام راغب نے مفردات
القرآن میں لکھا ہے کہ وسیلہ کسی چیز تک محبت کے ذریعہ پہنچنا ہے: اَلتَّوَصُّلُ اِلَى الشَّيْءِ بِرَغْبَتِهٖ ابن منظور نے لسان
العرب میں لکھا ہے کہ وَسِيْلَةٌ مَنْزِلَةٌ. دَرَجَةٌ. قُرْبَةٌ. وَصَلَةٌ. وَاسِلٌ: ایک مرتبہ منزل اور درجہ ہے۔رسائی کا ذریعہ
ایک شعر میں ہے کہ اَلاَ كُلُّ ذِيْ دَاءٍ اِلَى اللّٰهِ وَاسِلٌ: وسیلہ کا معنی شریعت کی اصطلاح میں: امام راغب نے فرمایا
مَرَاعَاةُ سَبِيْلِهٖ بِالْعِلْمِ وَالْعِبَادَةِ وَتَحَرِّيْ مَكَارِمِ الشَّرِيْعَه (مفردات) اللہ تعالیٰ کے راستہ کا لحاظ رکھنا علم
وعبادت کے ذریعے اور اس علم وعبادت کے ذریعے شریعت کے امور میں کوشش کرنا۔رفاعی نے لکھا ہے وسیلہ شریعت میں
اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا کا اس کی اطاعت وعبادت سے اور اس کے رسولوں کی اطاعت اور ہر عمل صالح سے جو اللہ
تعالیٰ کو محبوب ہو۔(التوصل ص12) دوسری بحث: وسیلہ اور اس کے ہم معنی الفاظ (1) استغاثہ: غوث طلب کرنے کو کہا جاتا
ہے اور غوث پریشانی وتنگی دور کرنے کو کہا جاتا ہے۔(2) اِسْتِنْصَارٌ: نصرت مدد طلب کرنے کو کہتے ہیں لہٰذا اِسْتِنْصَارٌ
واستغاثہ مخلوق سے طلب کرنا جو ان کی قدرت کے ماتحت ہو بغیر کسی اختلاف کے جائز ہے یعنی اس میں اختلاف نہیں ہے
جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی مثال موجود ہے: فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ: پس مدد طلب کی اس شخص نے جو (موسیٰ
علیہ السلام) کے گروہ میں سے تھا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ (انفال آیت72) اگر وہ تم سے
دین کے معاملے میں مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد لازم ہے۔ مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے دین کیلئے کون
میری مدد کریگا البتہ جن کاموں کا اختیار مخلوق کی قدرت میں نہ ہو ان میں استغاثہ واستنصار اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے جیسا

کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ (سورۃ انفال آیت 9) جب تم اپنے رب سے مدد طلب کر رہے تھے۔ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (سورۃ انفال آیت 10) نہیں ہے امداد مگر اللہ ہی کی طرف سے۔ طبرانی کبیر کی حدیث میں واقعہ ہے کہ صحابہ کرام ایک منافق سے بہت تنگ ہوئے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ قُومُوا بِنَا نَسْتَغِيثُ بِرَسُولِ اللهِ ﷺ مِنْ هٰذَا الْمُنَافِقِ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِنَّهُ لَا يُسْتَغَاثُ بِي وَإِنَّمَا يُسْتَغَاثُ بِاللّٰهِ: چلو چلتے ہیں نبی اکرم ﷺ کے پاس ان سے فریاد کرتے ہیں اس منافق کے متعلق تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا فریاد مجھ سے نہیں فریاد تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے کی جاتی ہے۔ (مجمع الزوائد 10/159 رواہ الطبرانی ورجالہ رجال الصحیح غیر ابن لھیعۃ وھو حسن الحدیث) یہاں پر استغاثہ وہ مدد ہے جو نبی کے اختیار میں نہیں ہے۔ **تیسری بحث:** استعانت کی ہے یعنی مدد طلب کرنا اور اس میں بھی وہی تفصیل ہے یعنی جو بندے کی قدرت میں ہو جیسا کہ: فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ (سورۃ کہف 95) اور جو بندوں کی قدرت میں نہیں ہے اس میں صرف اللہ تعالیٰ سے (عون) مدد طلب کرنا ہے جیسا کہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ: (سورۃ فاتحہ)، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں: وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ (سورۃ یوسف آیت 18) اللہ ہی مددگار ہے اس سے جو تم بیان کرتے ہو۔ **چوتھی بحث** استمداد کی ہے: جو بندے کی قدرت میں ہو تو اس سے مدد طلب کی جا سکتی ہے: كُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا: (سورۃ اسراء آیت 20) اور الْاِسْتِشْفَاعُ (شفاعت) جو بندے کی قدرت میں ہو جیسا کہ کسی کیلئے دعا مانگنا یا قیامت میں کسی بندے کا دوسرے کیلئے شفاعت کرنا۔ اس وجہ سے ہمارے نبی کی صفت میں شافع شفیع اور المشفع آیا ہے۔ ابوداؤد کی اس حدیث میں یہ مراد ہے کہ جب ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا تھا: إِنَّا نَسْتَشْفِعُ بِاللّٰهِ عَلَيْكَ وَنَسْتَشْفِعُ بِكَ عَلَى اللّٰهِ فَقَالَ شَأْنُ اللّٰهِ أَعْظَمُ مِنْ ذَالِكَ أَنَّهُ لَا يُسْتَشْفَعُ بِهِ عَلَىٰ أَحَدٍ مِنْ خَلْقِهِ: (ابوداؤد کتاب السنۃ حدیث 4726 شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر تیری شفاعت طلب کرتے ہیں اور تیری ذات پر اللہ تعالیٰ کی شفاعت طلب کرتے ہیں۔ نبی کریم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کی شان بہت ہی اعلیٰ ہے اس بات سے کہ اس سے مخلوق میں سے کسی کی شفاعت طلب کی جائے۔ لہذا یہاں پر شفاعت بِالْاِذْنِ مراد ہے اور ایک شفاعت (سفارش) ان لوگوں کی ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ: هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ: تو وہ شفاعت شرکیہ ہے وسیلہ میں بھی مختلف اقسام ہیں جن کا ذکر بعد میں ہوگا۔ **تنبیہ:** اس بیان سے

معلوم ہوا کہ یہ الفاظ خصوصاً توسل مجمل یا مشترک الفاظ ہیں۔ شیخ الاسلام نے کتاب الوسیلہ میں لکھا ہے کہ یہ مشترک لفظ ہے۔ شرح عقیدۃ الطحاویۃ (مکتبہ السلفیہ ص 263 طبع لاہور) میں ہے کہ فَلَفْظُ التَّوَسُّلِ بِالشَّخْصِ وَالتَّوَجُّهِ بِهِ فِيهِ إِجْمَالٌ غَلِطَ بِسَبَبِهِ مَنْ لَمْ يَفْهَمْ مَعْنَاهُ: لفظ توسل کسی شخص کے ساتھ اس میں اجمال ہے اور اس کے سبب سے وہ لوگ غلطی میں مبتلا ہوئے جو اس کے معنی سے ناواقف ہیں۔ اسی طرح لفظ وسیلہ فلاں شخص کے ساتھ یا وسیلہ بالذوات اور دعا کا وسیلہ یہ سب مجمل الفاظ ہے لہٰذا مناظرہ ومباحثہ کے وقت شرعی وغیر شرعی وسیلہ کا تعین ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص مطلقاً ہر قسم کے وسیلے کا اقرار کرے تو وہ شرک وبدعت میں واقع ہوجائے گا اور اگر کوئی شخص مطلق ہر قسم کے وسیلے سے انکار کرجائے تو دہری کافر شمار ہوجائیگا۔ تیسری بحث: وسیلہ کی اقسام ہیں۔ یاد رہے کہ وسیلہ میں بعض قسمیں شرعی ہیں بعض قسمیں شرکیہ اور بعض قسمیں بدعیہ ہیں پھر توسل کی دو قسمیں ہیں (1) ایک طریقہ یہ ہے کہ اپنے ایمان اور صالح اعمال کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کا قرب طلب کرتا ہے اس میں کسی چیز کا اللہ تعالیٰ سے مطالبہ نہیں کرتا جیسا کہ طلب حاجت ودعا وغیرہ یعنی ایک شخص ایمان لانے کے بعد صالح اعمال اس لئے کرتا ہے کہ اس کے ذریعے اس کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوجائے اس وسیلے کا ذکر اس آیت میں ہے: قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ: (سورۃ آل عمران آیت 31) آپ فرمادیجئے اگر تم اللہ تعالیٰ کا قرب چاہتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریگا اور تمہارے گناہوں کو معاف فرمائے گا۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب ومحبت رسول کی اتباع میں ہے یعنی یہ اتباع اللہ تعالیٰ کا قرب کا ذریعہ ہے یہ وسیلہ ہے جو کہ عین ایمان وتوحید ہے اور جو بھی اللہ تعالیٰ کا قرب غیر اللہ کی بندگی اور عبادت میں طلب کرے تو یہ عین شرک ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ زمر آیت 3 میں فرمایا ہے وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى: وہ لوگ جنہوں نے بنائے ہیں اپنے لئے دوست (مددگار) وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی بندگی وعبادت نہیں کرتے مگر صرف قرب الٰہی کے حصول کیلئے۔

لہٰذا یہ وسیلہ شرکیہ ہے قصیدہ نونیہ میں امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں فَالشِّرْكُ هُوَ التَّوَسُّلُ مَقْصُودُهُ زُلْفَى مِنَ الرَّبِّ الْعَظِيمِ الشَّانِ۔ پس وہ وسیلہ بنانا شرک ہے جس میں عظیم الشان رب کا قرب مقصود ہو: بِعِبَادَةِ الْمَخْلُوقِ مِنْ شَجَرٍ وَمِنْ قَبْرٍ وَمِنْ أَوْثَانٍ مخلوق کی عبادت کے ذریعے خواہ درخت ہو قبر ہو یا بت ہو۔ دوسری قسم توسل حاجت طلب کرنے میں ہے اس کی کئی اقسام ہیں جن کا ذکر بعد میں ہورہا ہے۔ تنبیہ: اس آیت کریمہ میں مقصود پہلا قسم وسیلہ ہے

عبادت کے ذریعے قرب الٰہی طلب کرنا جس کی وضاحت بعد میں ہوگی دعا کے وسیلہ سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے مسائل السلوک بیان القرآن میں تذکرہ کیا ہے کہ اس آیت کا وسیلہ بالذوات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ جب باطل پرست لوگ اس آیت سے غلط استدلال کرتے ہیں تو امام آلوسی نے بھی اور راقم الحروم نے بھی وسیلہ کی یہ تحقیق اس آیت کے ضمن میں تحریر کی ہے۔ چوتھی بحث: شرعی وسیلے کی اقسام اور دلائل: اس وسیلہ سے مراد بیان کردہ قسموں میں سے دوسری قسم ہے یعنی دعا مانگتے وقت اور حاجت کی طلب میں وسیلہ بنانا۔ اس میں شرعی قسمیں چھ (6) ہیں (1) شرعی وسیلہ کی پہلی قسم: اللہ تعالیٰ کے ناموں اور صفات کا وسیلہ لینا جیسا کہ (یا اللہ، یا رحیم، یا ذوالجلال والاکرام، ربنا، اللّٰھم، یا حیی یا قیوم، یا رحمن یا رحیم) اس عمل پر دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا: (سورۃ اعراف آیت 180) اللہ تعالیٰ کے اچھے اچھے نام ہیں ان کے ذریعے سے دُعا مانگو۔ اس آیت کی تفسیر اعراف میں آئے گی ان شاء اللہ۔ اس میں وہ آیتیں بطور مثال ہیں جن کے شروع میں اَللّٰهُمَّ یا رَبَّنَا ذکر ہوا ہے۔ اس طرح سورۃ یوسف آیت، 101 سورۃ ابراہیم آیت 38 اور 39 میں ہے اور وہ احادیث جن میں دعاؤں کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے نام ذکر ہوئے ہیں وہ تو بہت ہیں ان میں سے ایک حدیث بروایت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہے (امام ابن ماجہ حدیث 3858 نسائی حدیث 1300 ابوداؤد حدیث 1495 طبرانی کبیر حدیث 4722 احمد 3712۔12611 شیخ البانی اس حدیث کو صحیح کہا ہے سلسلۃ الصحیحۃ 1/199 صحیح ترغیب باب الدعا حدیث 1641) اس کے الفاظ یہ ہیں: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاسْمِكَ الطَّاهِرِ الطَّيِّبِ الْمُبَارَكِ الْاَحَبِّ اِلَيْكَ: اے اللہ تجھ سے تیرے پاک صاف بابرکت جو تجھے محبوب نام ہے سوال کرتا ہوں۔ انس کی حدیث (جو ابن ماجہ، نسائی حدیث 1300، ابوداؤد حدیث 1495 نے ذکر کیا ہے) اس کے الفاظ یہ ہیں: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاَنَّ لَكَ الْحَمْدُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ یَا مَنَّانُ یَا بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ: اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں یقیناً تیرے لئے حمد ہے نہیں کوئی معبود برحق مگر تیری ہی ذات ہے اے احسان کرنے والے آسمانوں اور زمین کو بغیر کسی نمونہ کے پیدا کرنے والے اے عزت و جلال کے مالک۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اِسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ مَكْنُوْنِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ: (سنن نسائی حاکم صححہ و وافقہ الذہبی، ابوداؤد احمد اسنادہ صحیح کما قال الالبانی الصحیحۃ 1/199) اے اللہ میں تجھ سے تیرے ہر اس نام سے دعا مانگتا ہوں جس پر تو نے اپنے آپ کو مسمّٰی کیا ہے یا اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا

اپنے بندوں میں سے کسی کو اس کا علم دیا ہے یا اپنے پاس اپنے علم غیب میں چھپا رکھا ہے۔ ان دلائل کی بناء پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی قول ہے کہ لَا یَنْبَغِیْ لِأَحدٍ اَنْ یَدْعُوَ اللّٰہَ اِلَّا بِہٖ شامی نے لکھا ہے کہ اَیْ بِذَاتِہٖ وَأَسْمَائِہٖ یعنی کسی کے لیے لائق نہیں یعنی حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو پکارے مگر اس کی ذات وصفات (کے وسیلے) سے شامی نے اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی ذات وصفات سے۔ در مختار نے لکھا ہے کہ لِاَنَّ الدُّعَاءَ الْمَأْذُوْنَ فِیْهَا مَا اسْتُفِیْدُ مِنْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی. وَلِلّٰہِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰی: اس لیے کہ شریعت میں جس دعا کی اجازت مرحمت ہوئی ہے وہ اس آیت سے معلوم ہوئی ہے یہ قول در مختار، شامی، عالمگیری اور صیانۃ الانسان نے ص 291 ،265 ,205 ,201 میں ہے اور شرح مختصر الکرخی اور شرح تنویر، تاتار خانیہ، ابن بلدجی، شیخ الاسلام نے کتاب الوسیلہ، کتاب صراط مستقیم میں ابن قیم نے اغاثۃ اللھفان میں نقل کیا ہے اور اس کی سند کو اس طرح ذکر کیا ہے کہ بشر بن ولید عن ابی یوسف عن ابی حنیفۃ: تنبیہ: احناف کے لیے امام صاحب کے اس قول پر عمل کرنا لازم ہے۔ جو قرآن وسنت کے موافق بھی ہے اور سند کے ساتھ امام صاحب سے ثابت بھی ہے اور کسی کے نام کو بھی اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے ماسوا وسیلہ میں پیش نہ کریں نہ بحرمت، جاہ یا بحق فلاں یا بوسیلہ وطفیل فلاں۔ امام صاحب کے مقلدین کیلئے ان کا یہ قول کافی ہے۔ (2) شرعی وسیلہ کی دوسری قسم: ایمان اور اعمال صالحہ کے ذریعے سے دعا مانگنا ہے یہ بھی قرآن کریم، احادیث صحیحہ اور امت کے اجماع سے ثابت ہے۔ قرآن مجید سے دلائل یہ ہیں: اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ اِیَّاكَ نَعْبُدُ کو اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ: پر مقدم کرنا اسی طرح وَ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (سورۃ بقرہ آیت 45) اس میں بھی ایک تفسیر کی بناء پر یہی ترتیب ذکر ہے۔ اسی طرح سورۃ آل عمران آیت 16، 53 اور 193 میں ایمان اور اتباع رسول بطور وسیلہ ذکر ہوا ہے۔ سورۃ ابراہیم آیت 37 اور سورۃ یونس 85 میں مذکور ہے اس کے علاوہ بھی کئی آیتوں میں یہ مسئلہ مذکور ہے اور حدیث قصہ اصحاب غار مشہور ہے جس کو امام بخاری وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب احادیث انبیاء حدیث 3465 صحیح مسلم حدیث نمبر 2743) (3) شرعی وسیلہ کی تیسری قسم: اپنی عاجزی انکساری کا ہے جیسا کہ آدم وحواء علیہما السلام کی دعا۔ سورۃ اعراف آیت 23 زکریا علیہ السلام کی دعا۔ سورۃ مریم آیت 4 میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعا نماز کی آخری قاعدے میں جو انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے سیکھی تھی: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْرًا وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَۃً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ: (صحیح بخاری کتاب الاذان حدیث 834)۔ اے اللہ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا بہت ظلم اور

نہیں ہے کوئی تیرے سوا گناہوں کو معاف کرنے والا پس مجھے اپنی طرف سے معاف کر اور مجھ پر رحم کر یقیناً تو ہی معاف کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے۔ (4) شرعی وسیلہ کی چوتھی قسم: اس میں اس شرعی وسیلے کا ذکر ہے کسی زندہ انسان نیک سے دعا کروائی جائے خواہ اس سے بالمشافہ ملاقات ہو یا کسی ظاہری اسباب کے تحت اس تک رسائی ہو یعنی زندہ کے ذریعے سے پیغام پہنچانا یا فون، خط وغیرہ کے ذریعے اپنے لیے اس سے دعا کی درخواست کریں۔ قرآن میں اس کی دلیل مندرجہ ذیل آیتوں میں ہے سورۃ بقرہ 61، 68۔ سورۃ نساء آیت 64 سورۃ یوسف آیت 97۔ سورۃ فتح آیت 11۔ سورۃ مومن آیت 7۔ سورۃ حشر آیت 10۔ اور سورۃ نوح آیت 28۔ اس بارے میں احادیث بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں مثلاً۔ پہلی حدیث نبی اکرم ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا جب وہ عمرہ کرنے جارہے تھے لَا تَنْسَانَا یَا أُخَيَّ فِي دُعَائِكَ دوسرے الفاظ اس طرح ہیں کہ اَشْرِكْنَا یَا أُخَيَّ فِي دُعَائِكَ۔ ترمذی (حدیث 3562، ابوداؤد 1948، ابن ماجہ 966، احمد جلد 1 ص 29)۔ اے بھائی ہمیں اپنی دعاء میں نہ بھولنا یا ہمیں اپنی دعاؤں میں شریک کرنا۔ دوسری حدیث عکاشہ بن محصن کی ہے اس نے جب جنت میں بے حساب جانے والوں کی حدیث سنی تو فوراً نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ سے میرے لئے دعا کر دیجئے کہ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔ یہ تفصیلی واقعہ (صحیح بخاری کتاب اللباس حدیث 5811 وصحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 217) اور دیگر کتب میں مذکور ہے: اُدْعُ اللهَ أَنْ يَجْعَلَنِي مِنْهُمْ: نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد دور خلافت عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں عمر رضی اللہ عنہ نے عباس رضی اللہ عنہ سے دعا کیلئے درخواست کی تھی اور انہوں نے بارش کیلئے دعا کی تھی (صحیح بخاری کتاب الاستسقاء حدیث 1010) وغیرہ میں تفصیلی حدیث مذکور ہے۔ (5) شرعی وسیلہ کی پانچویں قسم: اللہ عزوجل کے نام کی صالح بندوں کی طرف اضافت کر کے دعاء طلب کرنا جو کہ حقیقت میں اسماء وصفات کے ساتھ دعاء کی ایک کیفیت ہے۔ صحیح مسلم میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث منقول ہے: اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيلَ وَمِيكَائِيلَ وَإِسْرَافِيلَ مضاف الیہ کی تخصیص کا مقصد مضاف کی عظمت شان ثابت کرنا ہے۔ (نوٹ) اس کو وسیلہ بذوات الصالحین کہنا جہالت ہے اس لیے کہ مضاف تو مضاف الیہ کا غیر ہوتا ہے۔ (6) شرعی وسیلہ کی چھٹی قسم: نبی کریم ﷺ پر درود شرعی پڑھنا جو قبولیت دعاء کیلئے وسیلہ ہے۔ (ترمذی حدیث 3476، ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ حدیث 1481، نسائی حدیث 4544، ترمذی حسن صحیح شیخ البانی نے حسن کہا ہے) ابوداؤد میں فضالہ بن عبیدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا تو اس نے اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي وَارْحَمْنِي: پڑھ لی۔ نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے فرمایا کہ تم نے جلد بازی کی جب نماز میں تشہد کی حالت میں ہو تو پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف (حمد) کرو یعنی التحیات پڑھو، پھر درود پڑھو پھر دعا طلب کرو۔ پھر ایک اور صحابی تشریف لائے اور نماز شروع کی تو پہلے انھوں نے درود پڑھی، نبی اکرم نے ارشاد فرمایا کہ اب دعا مانگو تو قبول ہوگی اس کے علاوہ بھی احادیث ہیں۔ وسیلہ کی یہ قسم بھی عمل صالح کی قسم والے وسیلہ سے ہے کیونکہ درود پڑھنا عمل صالح میں سے ہے۔ وسیلے میں کی یہ قسمیں شرعاً ثابت ہیں اور ان کا انکار قرآن واحادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار ہے۔ پانچویں بحث: اس بحث میں غیر شرعی وسیلہ کی قسموں کا ذکر ہے۔ پہلی قسم غیر شرعی وسیلہ کی یہ ہے کہ بحرمت فلاں، بجاہ فلاں، بحق فلاں، بطفیل وبرکت فلاں۔ اس میں بعض الفاظ تو اس طرح ہیں کہ وہ حدیث سے ثابت ہی نہیں ہیں اور بعض الفاظ اگر وارد ہیں تو وہ روایتیں موضوع ضعیف اور من گھڑت ہیں اور کوئی لفظ صحیح یا کسی حسن حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اس طرح کے الفاظ پڑھنا بدعت ہے۔ امام آلوسیؒ نے روح المعانی ج 1،ص 126 میں لکھا ہے کہ وہ دعائیں جو اہل بیت یا ائمہ سے منقول ہیں ان میں وسیلہ بالذات النبی ثابت نہیں ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ ظاہراً اس کا وجود ہے تو اس میں مضاف مقدر ہے البتہ اگر کوئی نص صریح کا دعویٰ کرے تو اسے وہ نص پیش کرنی چاہیے۔ شرح عقیدۃ الطحاویہ ص 261 میں لکھا ہے کہ دعا مانگنے والا جب یہ کہتا ہے کہ بحق انبیاء اور بحق فلاں تو یہ دو وجوہات کی بناء پر منع ہے پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ غیر اللہ کی قسم ہے جب کہ صریح حدیث میں اس سے منع آیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا حق واجب نہیں ہے سوائے اس حق کے جو اللہ تعالیٰ نے خود مقرر کیا ہو جیسا کہ سورۃ روم آیت 27 میں ذکر ہے کہ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ: تمام فقہاء احناف نے کتاب الکراہیہ میں اسی طرح لکھا ہے لَاحَقَّ لِلْمَخْلُوقِ عَلَى الْخَالِقِ: ہدایہ، کنز، فتاویٰ شامی، عالمگیری، فتح القدیر وغیرہ۔ سوال: اگر کسی شخص کا ارادہ اپنے اس حق کا ہو جو مذکورہ آیت میں ہے یا اس حدیث میں کہ حق العباد علی اللہ صحیح بخاری کتاب اللباس حدیث 5967 صحیح مسلم فی الایمان حدیث 30 میں ہے اور اسی حق کو وسیلہ بنائے تو؟ جواب: حق واجب کا عقیدہ معتزلہ کا ہے تو بحق فلاں کہنے سے اگر چہ دوسرا معنیٰ اس کا مراد ہو لیکن یہ لفظ مبہم اور مشکوک دو معنوں کا محتمل ہے اور یہ بھی ثابت نہیں کہ کسی صحیح حدیث میں اس قسم کے الفاظ سے دعا منقول ہو۔ شرح عقیدۃ الطحاویہ ص 262 میں لکھا ہے کہ یہ الفاظ حق، جاہ، حرمت وغیرہ دعاء میں زیادتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا: إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ سورۃ اعراف آیت 55۔ کیونکہ دعاء تو افضل عبادت ہے اور عبادت کی قبولیت کا مدار اتباع سنت پر ہے خواہش کی اتباع پر نہیں جبکہ لفظ

جاہ کے متعلق امام آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ یہ بھی غیر شرعی اقسام میں سے ہے اس لیے کہ سلف صالحین میں سے کسی سے یہ لفظ اس طرح استعمال کرنا ثابت نہیں ہے ایک صفحہ بعد لکھا ہے کہ لفظ حرمت میں بھی جاہ کی طرح کلام ہے صحابہ کرام میں سے کسی صحابی سے لفظ حرمت، جاہ وغیرہ سے وسیلہ وغیرہ پکڑنا ثابت نہیں ہے۔ **سوال** امام آلوسی نے اس مقام پر لفظ جاہ اور حرمت میں توسل کے جواز کیلئے تاویل کی ہے اور اس قسم کے الفاظ کو توسل کے لیے صفت الٰہی کی طرف راجع کیا ہے؟ **جواب**: صیانۃ الانسان میں امام سہوانی نے اس تاویل کا رد کیا ہے۔ (ص 203)۔ امام آلوسی نے بھی اس تاویل کے بعد لکھا ہے کہ میری اس تاویل کا مطلب یہ نہیں کہ اس طریقے سے دعا مانگنا افضل ہے بلکہ افضل تو وہی ہے جو اللہ و رسول ﷺ نے فرمایا ہے یعنی اللہ و رسول ﷺ کا بتایا ہوا طریقہ تعلیم ہی افضل اور راہ نجات ہے۔ جب امام آلوسی نے خود اقرار کیا ہے کہ اس کی نقل ثابت نہیں ہے تو بغیر دلیل جواز باطل ہے۔ لفظ طفیل اور برکت بھی کسی صحابی سے منقول نہیں ہے تاویلات سے جواز ثابت نہیں ہوتا اور جو لوگ علماء دیوبند کے اقوال دلیل میں پیش کرتے ہیں تو ان کے اقوال بلا دلیل شریعت میں کوئی وقعت نہیں رکھتے اور ان تمام اقوال کی تردید کے لیے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول زیادہ معتبر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے دعا طلب کرنے کا ذکر ہے اور کسی اور کا نام ذکر کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ **{2} غیر شرعی وسیلہ کی دوسری قسم**: کسی خاص قبر اور مزار کے پاس اس عقیدہ کے ساتھ دعا مانگنا کہ وہاں دعا قبول ہوتی ہے یہ بدعت ہے اور اسباب شرک میں سے ہے اس لیے کہ قبولیت دعا کیلئے جو مقامات احادیث صحیحہ میں مذکور ہیں ان میں قبر کا ذکر نہیں ہے۔ دعا کی قبولیت کیلئے چند مقامات احادیث صحیحہ میں مذکور ہے اور جو مشروع ہیں وہ یہ ہیں۔ طواف کے دوران، ملتزم جو حجر اسود اور کعبۃ اللہ کے دروازے کے درمیان تھوڑی سی جگہ ہے، صفا، مروہ، مزدلفہ، عرفات، منیٰ وغیرہ اس میں قبر کا ذکر نہیں ہے بلکہ آلوسی نے ج6 ص125 میں لکھا ہے کہ صحابہ کرام میں سے کسی سے یہ منقول نہیں ہے کہ دعا کے وقت قبر کی طرف منہ کرے بلکہ قبلہ کی جانب رخ کرتا ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ **{3} غیر شرعی وسیلہ کی تیسری قسم**: کسی قبر کے پاس قبر والے سے دعا میں کہا جائے کہ اے فلاں میرے لئے یہ دعا اللہ تعالیٰ سے طلب کرو اور دعا مانگنے والے کا یہ عقیدہ ہو کہ مردے سنتے ہیں تو باتفاق علماء یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔ امام آلوسیؒ نے ج6 ص125 میں لکھا ہے: اِنَّمَا اِذَا کَانَ الْمَطْلُوْبُ مِنْهُ مَیِّتًا اَوْ غَائِبًا فَلَا یَسْتَرِیْبُ عَالِمٌ اَنَّهٗ غَیْرُ جَائِزٍ وَاَنَّهٗ مِنَ الْبِدَعِ الَّتِیْ لَمْ یَفْعَلْهَا اَحَدٌ مِّنَ السَّلَفِ ہر وہ شخص جس سے دعا طلب کی جارہی ہو فوت شدہ ہو یا غائب ہو تو کوئی عالم اس میں شک نہیں کریگا کہ یہ ناجائز ہے۔ یہ ان

بدعات میں سے ہے جو سلف صالحین کے دور میں ثابت نہیں ہوئیں۔ اسی طرح صارم المنکی میں ہے اور علامہ عبدالحیٰ کے مجموعۃ الفتاویٰ ج1 ص338۔ جلاء العینین ص495۔ فتاویٰ رشیدیہ ص59۔ میں بھی ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ مردوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ دعائیں سنتے ہیں یہ اسباب شرک میں سے ہے اور یہ شفاعت بلا اذن ہے کیونکہ کوئی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہے کہ مردے زندوں کیلئے دعا کر سکتے ہیں۔ یہ شفاعت قہریہ بغیر اذن ہے اور یہ امام رازی کی اس عبارت کے مصداق ہے جو انہوں نے تفسیر کبیر میں لکھی ہے جلد 17 ص 60 اور اس کی مثال اس زمانہ میں اکثر کا قبروں میں مشغول ہونا ہے جو قبروں کی تعظیم اس عقیدہ سے کرتے ہیں کہ ان کی قبروں کی تعظیم سے وہ ہماری دعاؤں کی قبولیت کیلئے اللہ تعالیٰ سے سفارش کریں گے شاہ ولی اللہ نے تفہیمات میں لکھا ہے: مَنْ ذَهَبَ اِلٰى بَلْدَةِ اَجْمِيْرَ اَوْ اِلٰى قَبْرِ سَالَارْ مَسْعُوْدٍ اَوْ مَاضَاهَاهَا لِاَجْلِ حَاجَةٍ يَطْلُبُهَا فَاِنَّهُ اِثْمٌ اِنَّمَا اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَالزِّنَا لَيْسَ مِثْلُهُ اِلَّا مِثْلُ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ الْمَصْنُوْعَاتِ اَوْ مِثْلُ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى (تفہیمات الھیہ ج2 ص49 تفہیم ص34)۔ عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو اس عقیدے کے ساتھ اجمیر یا کسی قبر کی طرف اس نیت سے سفر کرے کہ وہاں اپنی حاجتیں طلب کرے تو یہ ایسا گناہ ہے جو قتل و زنا سے بھی بڑھ کر ہے یہاں تک کہ لات وعزّیٰ جیسے بتوں کی پرستش کے مساوی ہے۔ (4) غیر شرعی وسیلہ کی چوتھی قسم: کسی قبر کے پاس قبر والے کو مخاطب کر کے اس سے التجا کرے کہ میری فلاں مصیبت کو رفع کرو یا فلاں حاجت پوری کرو تو یہ شرک حقیقی ہے۔ صیانۃ الانسان ص206 اغاثۃ اللھفان ج1 ص217 لابن قیم امام آلوسی نے بھی ج7 ص128۔ ان تمام کتب میں اس کو علماء کے بقول شرک میں شمار کیا ہے اور اگر صریح شرک نہ ہو تو شرک کے مساوی قریب تو ضرور ہے اس لئے کہ اس قسم کے انسان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ فوت شدہ یا غائب زندہ غیب کا علم و خبر رکھتا ہے اور مصیبت ہٹانے اور دور سے آواز سننے اور نفع و ضرر پر قدرت رکھنے کا اختیار رکھتا ہے اور یہ تو شرک ہے۔

(5) غیر شرعی وسیلہ کی پانچویں قسم: کسی غائب شخص کو بغیر اسباب کے آواز دینا پکارنا یا فوت شدہ شخص کو قبر سے کوسوں دور سے آواز دینا اس عقیدہ کے ساتھ کہ وہ مردہ ہماری پکار سنتا ہے، ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے اور غیب کا علم رکھتا ہے اسی لئے ہمارے حالات سے باخبر ہے اور ہر جگہ سے وہ دعا سن بھی سکتا ہے اور اللہ سے دعا مانگ بھی سکتا ہے تو یہ صریح شرک ہے کیونکہ بغیر اسباب ہر جگہ سے سننا یہ خالص اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو قرآن مجید کی بہت سی آیات اور بہت سی صحیح احادیث سے ثابت ہے جو کتب شرعیہ میں موجود ہے اور خصوصاً فقہ حنفی کی کتابوں میں مذکور ہے کہ اس قسم

کے باطل عقیدہ کو کفر وشرک کہا گیا ہے جیسا کہ سورۃ نحل آیت 65 سورۃ الانعام آیت 50۔ سورۃ اعراف آیت 188۔ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ یعنی جھوٹا واقعہ افک۔ اور واقعہ یوسف علیہ السلام اور بخاری شریف میں أم العلاء الانصاریہ کی حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا: وَاللّٰہِ لَا أَدْرِیْ وَأَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ مَایُفْعَلُ بِیْ اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا حالانکہ میں رسول اللہ ہوں۔ حوض کوثر کی حدیث کہ جب کچھ لوگ پانی پینے کیلئے آئیں گے تو ملائک ان کو روک لینگے اور فرمانے لگیں گے کہ تمہیں نہیں معلوم جو انہوں نے آپ کی (وفات کے) بعد کیا تھا یعنی صحیح دین چھوڑ کر بدعات ایجاد کی تھیں۔ (صحیح بخاری کتاب الشھادۃ حدیث 2687 حدیث حوض صحیح بخاری کتاب الرقاق حدیث 6583 وصحیح مسلم کتاب فضل النبی حدیث 2290 اور 215)، فتاوی ہندیہ ج 3 ص 283 ج 3 ص 412 بحر الرائق جلد 3 ص 88 شرح فقہ اکبر ص 137، فتاوی قاضی خان ج 4 ص 469 جلد 3 ص 576۔ (6) غیر شرعی وسیلہ کی چھٹی قسم: مردے کو قبر کے پاس یا کسی زندہ غائب کو دور سے آواز دینا بغیر اسباب یا فلاں بزرگ یا پیر صاحب میرے مریض کو شفا عطا کر یا میری فلاں حاجت پوری کر یہ صریح شرک ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس میں غیر اللہ کیلئے علم غیب کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ غیر اللہ کیلئے قدرت تسلیم کرنا ثابت ہوتا ہے کہ وہ نفع دینے یا ضرر ہٹانے کی طاقت رکھتا ہے۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ اس عقیدے کے ساتھ دعا عبادت ہے اور غیر اللہ کی عبادت شرک ہے اس مضمون کی بہت ساری آیتیں قرآن مجید میں مذکور ہیں اور احادیث صحیحہ اور فقہاء کرام کے اقوال بھی ہیں جن کو ہم نے التبیان ص 61۔ تنشیط الاذھان ص 35۔ اور ص 36 میں ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ توسل فی الدعاء میں (6) اقسام شرعیہ اور (6) اقسام غیر شرعیہ ہیں۔ چھٹی بحث: اس مسئلے میں مخالفین کے اشکالات اور ان کے جوابات۔ پہلا اشکال: وَابْتَغُوْا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ اس سے دلیل اس طرح لی گئی ہے کہ یہ وسیلہ بالذوات ہے یعنی استدلال اس طرح ہے کہ یہ معطوف ہے اتقوا اللہ پر اور تقویٰ کا معنی ہے خود کو گناہوں سے محفوظ رکھنا اور اللہ تعالیٰ کے حکموں کو بجالانا جبکہ معطوف معطوف علیہ سے جدا یعنی غیر ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ وَابْتَغُوْا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ سے مراد ذوات فاضلہ ہیں۔ جواب: عطف میں مغایرت ہر لحاظ سے نہیں ہوتی بلکہ کبھی خاص کو عام پر بھی عطف کیا جاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ (سورۃ بقرہ آیت 98) لہذا یہاں پر وسیلہ اطاعت کے معنی میں خاص ہے تقویٰ سے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس بحث کے شروع میں ہم نے لکھا ہے کہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ نے یہاں پر

تقویٰ خاص معنی میں لیا ہے یعنی خود کو گناہوں سے بچانا اس معنی میں قرآن مجید کی مختلف آیتیں مذکور ہے جیسا کہ سورۃ بقرۃ
آیت 103 میں ہے وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ اور سورۃ بقرۃ 103 میں اَلْمُتَّقِيْنَ کے تحت
ہم نے تفصیل سے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں تقویٰ (7) معانی میں مستعمل ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ وسیلہ کی یہ تفسیر ذوات فاضلہ
پر کسی مفسر نے بھی ذکر نہیں کی اور تفسیر میں سلف کے خلاف چلنا درست نہیں ہے جیسا کہ مصنف صارم المنکی نے ص 274 پر لکھا
ہے۔ جبکہ مفسرین نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ اعمال صالحہ جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا سبب ہوں اور اللہ تعالیٰ
کا قرب نیک صالح اعمال سے حاصل کرنا اور منکرات سے اجتناب کرنا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ
ابن جریر، معالم التنزیل، بیضاوی، مدارک، روح المعانی، قرطبی اور سمعانی وغیرہ میں اسی طرح تحریر ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے
کہ اس بحث کی ابتداء میں ہم نے نیشاپوری کی تفسیر سے نقل کیا ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ کے رد کیلئے ہے کیونکہ وہ اپنے
بڑوں کے اعمال و ذوات پر تقرب الی اللہ طلب کرتے تھے جس کا اللہ تعالیٰ نے رد کیا ہے۔ تھانویؒ نے لکھا ہے کہ اس آیت کا
وسیلہ بالذوات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شاہ انور شاہ صاحب نے کہا ہے کہ اس آیت میں معروف وسیلہ جو ناموں سے
لیا جاتا ہے کوئی دلیل نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ اس کی حرمت کی قائل ہیں۔ درمختار والے نے بلا دلیل اور سلف صالحین
سے نقل کیے بغیر جواز کا قول نقل کیا ہے۔ (فیض الباری ج 3 ص 435) [illegible] آدم علیہ السلام نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے
وسیلہ سے دعا، مانگی تھی، بیہقی نے دلائل النبوۃ اور مستدرک میں حاکم نے نقل کیا ہے اور اسے صحیح بھی کہا ہے۔ جواب اس
روایت پر تین طریقوں سے کلام ہے۔ پہلا طریقہ، یہ روایت ضعیف بلکہ موضوع اور من گھڑت ہے (التوسل ص 217)۔
اس میں ضعیف راوی موجود ہے یعنی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم۔ (کنز العمال ج 11 ص 455)۔ نیز اس سند میں حماد بن
عمر النصیبی سدی سے اور وہ خالد سے روایت کرتا ہے جبکہ یہ دونوں راوی ضعیف ہیں۔ (کنز العمال ج 2 ص 359)۔
ایک راوی اس میں رافضی (شیعہ) بھی ہے۔ (صیانۃ الانسان 124,129 اور 136 مستدرک پر امام ذہبی کی جو تعلیق ہے
جلد 2 ص 415 اور صیانۃ الانسان ص 276) میں اس روایت کو موضوع اور من گھڑت اور عبدالرحمٰن کو واہی لکھا ہے۔
سوال: امام حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے؟ جواب: امام حاکم کے صحیح کہنے پر علماء نے تنقید کی ہے اور اس کی تصحیح کو
نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔ (صیانۃ الانسان ص 123) اور یہ بھی قابل غور بات ہے کہ حاکم نے کتاب الضعفاء میں
عبدالرحمٰن بن زید پر خود طعن کی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فرمایا ہے کہ حاکم نے مدخل الی معرفۃ الصحیح من السقیم میں فرمایا

ہے کہ عبدالرحمٰن بن زید اپنے والد سے موضوع روایتیں نقل کرتا تھا۔ نیز امام احمد، نسائی، ابو زرعہ، ابو حاتم اور دارقطنی وغیرہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ یہ روایت ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے مضمون کے صریح خلاف ہے کیونکہ سورۃ ذاریات آیت 56 میں اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا کرنے کی علت اپنی عبادت کو قرار دیا ہے۔ سورۃ طلاق آیت 12 میں مخلوق کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی دو صفتوں کے علم کے اظہار کو قرار دیا ہے۔ سورۃ یونس آیت 5 اور دیگر کئی آیتوں میں مخلوق کی پیدائش کو اظہار حق یعنی توحید ثابت کرنے کیلئے قرار دیا ہے جبکہ اس روایت میں الفاظ ہیں لَوْلَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُكَ اگر محمد نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا ہی نہ کرتا۔ جو کہ مذکورہ تمام آیتوں کے خلاف ہے اور یہ اس موضوع روایت کی طرح ہے کہ لَوْلَاكَ لَوْلَاكَ لِمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ یعنی اے نبی ﷺ اگر نہ ہوتے تو میں کائنات میں کسی چیز کو پیدا نہ کرتا لہٰذا ان دونوں روایتوں کا سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ قرآنی مضمون کے یکسر خلاف ہونا موضوع ہونے کی دلیل ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کی دعا کے الفاظ قرآنی دعا کے بھی برعکس ہے قرآن میں صراحت ہے کہ آدم علیہ السلام اور حواعلیہا السلام نے یہ دعا مانگی تھی رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا: (اعراف 23) تنبیہ: عجب ہے تبلیغی جماعت کے رئیس شیخ الحدیث زکریا صاحب پر کہ انہوں نے اس موضوع روایت کو فضائل اعمال میں فضائل ذکر میں نقل کیا (اور عقیدے کے مسائل ہونے کے باوجود عوام الناس کو اس حدیث کی حقیقت جانتے ہوئے بے خبر رکھا جو کہ انتہائی افسوس کی بات ہے (مترجم) حدیث کا کسی کتاب میں نقل ہونا کافی نہیں بلکہ اس کی پوری تحقیق ہونی چاہیے۔ (خصوصاً جو عقیدے سے متعلق ہو)۔ تیسرا اشکال، عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عباس رضی اللہ عنہ کو بارش کی دعا کیلئے وسیلہ بنایا تھا جو صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الاستسقاء حدیث 1010) جواب: اس حدیث میں عباس رضی اللہ عنہ کی دعا کو وسیلہ بنایا ہے اور وسیلہ میں کسی زندہ شخص سے دعا کروانا درست ہے بشرطیکہ وہ زندہ قریب ہو سنتا ہو۔ صحابہ کرام تو کثیر تعداد میں تھے لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم کے چچا کو دعا کیلئے مختص کیا تو وجہ ظاہر ہے کہ نبی کریم کے چچا تھا عم النبی ﷺ اور عباس سے دعا میں منقول ہے کہ لِمَكَانِي مِنْ نَبِيِّكَ تیرے نبی کے چچا ہونے کے سبب۔ اس میں تقدیری معنی واضح ہے یعنی بدعاء عباس اس کی تائید شواہد ہیں کہ: كُنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِيْنَا: ہم تیری طرف اپنے نبی کو وسیلہ بناتے تو ہم پر تو بارش برساتا تھا جبکہ کسی حدیث میں اس طرح کے الفاظ نہیں ہیں کہ صحابہ کرام نے آپ کی ذات کو وسیلہ بنایا ہو لہٰذا مراد واضح ہے کہ آپ سے دعاء کروانا ہی مقصود ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ محدثین نے

اس حدیث کے ساتھ عباس رضی اللہ عنہ کے دعا کی الفاظ دعا ذکر کئے ہیں۔ (صحیح بخاری کتاب الاستسقاء حدیث 1010 فتح الباری، عمدۃ القاری، صیانۃ الانسان ص196 التوسل 256)۔ تیسری بات یہ ہے کہ انور شاہ کاشمیری نے (فیض الباری ج 2 ص379 میں اور ج 3 ص434) میں لکھا ہے کہ اس میں متقدمین کا توسل مراد ہے یعنی دعا کروانا اس میں توسل بالذات نہیں ہے، ورنہ عباس کو لیجانے کی کیا ضرورت تھی۔ شرح عقیدۃ الطحاویہ میں بھی ہے کہ بدعاء عباس، صیانۃ الانسان ص278۔ نیز یہ حدیث صریح دلیل ہے کہ نبی کریم کی وفات کے بعد آپ کی ذات کا وسیلہ بنانا جائز نہیں ہے ورنہ صحابہ کرام عباس رضی اللہ عنہ کو لیجانے کی زحمت نہ کرتے اور نہ آپ مدینہ سے باہر میدان میں جاتے جبکہ آپ ﷺ کی قبر مدینہ طیبہ میں ہی ہے۔

چوتھا اشکال: عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو کہ ایک نابینا صحابی تھے نبی ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے دعا کی درخواست کی آپ ﷺ نے اس کو یہ دعاء سکھائی: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ يَا مُحَمَّدُ اِنِّيْ اَتَوَجَّهُ بِكَ اِلٰى رَبِّيْ اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور اس کو صحیح بھی کہا ہے۔ جواب: صیانۃ الانسان ص125، 186، 199، 204، 369 اور التوسل 228 تا 232 اور شاہ ولی اللہ کے بلاغ المبین اور روح المعانی ج 6 ص 126 اور ملا علی قاری نے شرح مشکوۃ میں تفصیل سے ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس کی سند میں ابوجعفر راوی ہے اگر وہ عیسیٰ بن ابی عیسیٰ ہو تو تقریب میں ہے کہ اکثر محدثین نے اس کو ضعیف کہا ہے یعنی امام احمد، نسائی، علی ابن مدینی، فلاس، ابن حبان، ابوزرعہ وغیرہ۔ (میزان الاعتدال، الکاشف)۔ اگر یہ راوی ابوجعفر مدنی ہو تو یہ مجہول راوی ہے البتہ یہ سوال کہ امام ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب سند میں ضعیف یا مجہول راوی موجود ہوں تو امام ترمذی کی تصحیح کی وقعت باقی نہیں رہتی صیانۃ الانسان ص104 اور 326 میں تفصیلی بحث ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ حدیث صحیح بھی تسلیم کی جائے تو بھی اس سے وسیلہ ذات ثابت نہیں ہوتا بلکہ نبی کی دعا کا وسیلہ ثابت ہوتا ہے جو کہ مشروع ہے آلوسی نے کہا ہے کہ اس کے الفاظ میں دعا مقدر ہے جس پر حدیث کے الفاظ دلیل ہیں (1) اس نے آ کر نبی کریم ﷺ سے دعا کی اپیل کی۔ (2) نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ صبر کرو تو بہتر ہے ورنہ میں دعا کر لیتا ہوں۔ (3) اَللّٰهُمَّ شَفِّعْهُ فِيَّ: اے اللہ نبی کی دعا میرے حق میں قبول فرما۔ (4) اگر نبی کی ذات سے دعا طلب کرنا مقصد ہوتا تو نبی کے پاس آنے اور آپ سے دعا کروانے کی ضرورت ہی نہیں تھی

گھر بیٹھے بیٹھے دعا مانگتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے اس کیلئے دعا مانگی تھی مگر اس کو بھی تعلیم دی کہ اس طرح دعا کرو کہ " اے اللہ نبی ﷺ کی دعا میرے حق میں قبول فرمالیجئے یعنی نبی کی دعا تیرے آگے پیش کرتا ہوں۔ اس کی مکمل تفصیل شیخ البانی نے الوسیلۃ وانواعہ میں ذکر کی ہے۔ [redacted] ایک دیہاتی شخص نے نبی ﷺ کی وفات کے تین دن بعد قبر پر حاضری دے کر نبی ﷺ سے دعا طلب کی تو قبر سے آواز آئی کہ تیری مغفرت ہوگئی۔ اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان ج 1 ص 109۔ طبع ہندی میں ذکر کیا ہے۔ بعض مفسرین نے اسے سورۃ نساء آیت 64 کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

جواب: کنز العمال میں ج 2 ص 286 میں لکھا ہے کہ اس کی سند میں ہیثم بن عدی الطائی ہے جو محدثین کے نزدیک متروک الحدیث ہے التوصل الی حقیقۃ التوسل ص 265 تا 286 اس کو تفصیل سے بطور رد ذکر کیا ہے۔ صیانۃ الانسان ص 247 پر اس کی تردید کی ہے۔ سورۃ نساء آیت 64 کی تفسیر میں 16 وجوہات مذکور ہیں ص 23 سے ص 41 تک اور الصارم المنکی فی رد السبکی میں اس کا تفصیلی جواب ص 212 تا 273 و 286 تک مذکور ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے کہ یہ روایت منکر اور موضوع ہے اس اثر کی سند میں اندھیروں پر اندھیرے ہیں۔ ہیثم احمد کے دادا ہیں جس کو متروک کذاب کہا گیا ہے۔ ابن معین نے بھی کذاب کہا ہے، ابن عدی، دولابی، ابوحاتم رازی، نسائی اور ابن حبان وغیرہ نے متروک وغیرہ قرار دیا ہے میزان میں امام ذہبی نے مذکورہ محدثین کا بعض کلام ذکر کیا ہے اور خود بھی یہی فیصلہ دیا ہے۔ بعض راویوں نے یہ حکایت عتبی سے بغیر سند نقل کیا ہے بیہقی نے شعب الایمان میں اندھیروں والی سند سے نقل کیا ہے۔ بعض جھوٹوں نے علی رضی اللہ عنہ تک اس کو سنداً نقل کیا ہے لیکن اس قسم کی بے سروپا روایتوں سے (دین کے مسائل عموماً اور عقائد خصوصاً) ثابت نہیں ہوتے۔ [redacted]

حدیث عام الفتق مدینہ میں قحط سالی آئی تو لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے شکایت کی تو ام المومنین نے فرمایا کہ قبر نبوی ﷺ کی چھت میں آسمان کی طرف سوراخ کرو انہوں نے ایسا کیا جس پر بارش کا سلسلہ شروع ہوا یہاں تک کہ ہر طرف ہریالی ہوگئی اور جانور اس طرح سیراب ہوئے کہ اونٹوں کی چربیوں سے بدن پھٹ گئے اس کو اسی لئے عام الفتق کہا گیا ہے۔ دارمی مشکوٰۃ؟ (فتق کا معنیٰ ہے پھٹنا)۔ [redacted] اس پر صیانۃ الانسان ص 245 تا 246 تک تفصیلی کلام کیا گیا ہے اور رفاعی نے التوسل میں اسکے متن پر (9 نو طریقوں سے اور سند پر آٹھ طریقوں سے کلام کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت سنداً ضعیف، منقطع موقوف ہے اور استسقاء کیلئے جو طریقہ مسنونہ صحیح حدیث سے ثابت ہے یہ اس کے خلاف ہے۔ نیز اس کی سند میں محمد بن فضل السدوسی ہے اس کا حافظہ آخری عمر میں خراب ہوگیا تھا۔ دوسرا راوی اس میں سعید

بن زید ہے جس پر امام ذہبی اور ابن حجر نے محدثین سے جرح نقل کی ہے کہ وہ ضعیف ہے۔ تیسرا راوی عمر بن مالک ہے تقریب میں ابن حجر نے اس کو صاحب اوہام کہا ہے۔ چوتھا راوی ابو الجوزاء ہے جس پر یحیی بن سعید اور امام بخاری نے جرح کی ہے لہذا یہ روایت سنداً و متناً ضعیف ہے اور اگر یہ بات حقیقت پر مبنی ہوتی تو عرب دنیا خصوصاً اور عام مسلمانانِ عالم عموماً بارش کے محتاج ہوتے ہیں فصلیں جل جاتی ہیں اور بہت پریشانی ہوتی ہے چاہیے تو یہ تھا کہ چھت ہٹادی جاتی حالانکہ ان پر گنبد بنایا گیا ہے اگرچہ قبروں پر یہ گنبدیں شریعت میں ممنوع و حرام ہیں۔ **ساتواں اشکال:** ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ جو شخص نماز کے لیے نکلے تو یہ دعا پڑھ لے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَسْئَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْكَ وَبِحَقِّ مَمْشَائِيْ هَذَا إِلَيْكَ: اے اللہ میں تجھ سے سائلین کے حق اور اپنی نماز کے لیے نکلنے کے حق سے جو تجھ پر ہے دعا کرتا ہوں؟ جواب: روح المعانی ج 6 ص 127 میں فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں عوفی ہے جو کہ ضعیف ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ یہ فرمان نبوی ہے تو حق سے مراد دعا کی قبولیت ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں کی طرف ہوئی ہے اور حق جب اللہ پر کسی کا نہیں ہے بلکہ حق تفضّلی ہے جس کا ذکر کئی بار گزرا ہے لیکن یہ تحریر میں گزر گئی ہے کہ احناف علماء فقہاء سوال بحق فلاں کو مطلقاً مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ یہ لفظ مُبْهَمْ ہے جبکہ صیانۃ الانسان ص 96 تا ص 104 تک اس پر تفصیلی رد لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس روایت کی سند میں عطیہ عوفی ہے جس کے متعلق اختلاف ہے مگر راجح قول یہ ہے کہ یہ ضعیف ہے امام ذہبی نے میزان اور الکاشف میں ابن حجر نے تہذیب میں اور ابن القیم نے زاد المعاد باب سنت جمعہ میں اور ہیثمی نے مجمع الزوائد میں اس پر جرح کی ہے۔ **آٹھواں اشکال:** امام طبرانی نے کبیر اور اوسط میں ابن حبان، اور حاکم نے حدیث نقل کی ہے جس میں لفظ ہے بِحَقِّ نَبِيِّكَ وَالْأَنْبِيَاءِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِيْ: **جواب:** اس کی سند میں روح بن الصلاح المصری ہے جس کو ابن عدی نے ضعیف قرار دیا ہے اگرچہ حاکم اور ابن حبان نے اس کی توثیق کی ہے مگر محدثین نے ان دونوں کی توثیق رد کی ہے تفصیل کیلئے دیکھیے صیانۃ الانسان ص 123 ص 386 ص 276۔ **نواں اشکال:** ایک روایت میں ہے کہ ضرورت کے وقت اس طرح دعا کرو: فَاسْئَلُوْا اللهَ بِجَاهِيْ فَإِنَّ جَاهِيْ عِنْدَ اللهِ تَعَالٰى عَظِيْمٌ: میرے مرتبہ پر اللہ تعالیٰ سے مانگا کرو یقیناً میرا مرتبہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا ہے۔ **جواب:** امام آلوسیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ عام لوگوں کا قول ہے اہل علم میں سے کسی نے اسے نقل نہیں کیا (روح المعانی ص 127) صیانۃ الانسان ص 357 میں ہے کہ لفظ جاہ کے وسیلے پر دعا مانگنا بدعت مذمومہ ہے اسلئے کہ اس پر کوئی دلیل شریعت میں نہیں ہے۔ **دسواں اشکال:** امام بخاری رحمہ

اللہ نے ابن عمر سے نقل کیا ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جب وہ بارش کی دعا مانگ رہے تھے اور پرنالوں سے پانی کا سلسلہ جاری تھا تو مجھے ابوطالب کا یہ شعر یاد آیا جو انہوں نے رسول ﷺ کی مدح میں پڑھی تھی۔ وَاَبْيَضُ يُسْتَسْقَى بِوَجْهِهِ ثِمَالُ الْيَتَامٰى عِصْمَةٌ لِلْاَرَامِلِ (حسین) ہے اس کا چہرہ کہ بادلوں سے پانی اس کے چہرے پر طلب کیا جاتا ہے۔ بیواؤں کا محافظ اور یتیموں کا غمخوار ہے صحیح بخاری کتاب الاستسقاء حدیث 1008۔ اس میں نبی کے چہرے سے وسیلہ لینا ثابت ہوا ہے؟ **جواب** ابن عمر رضی اللہ عنہما کے الفاظ واضح ہیں کہ مجھے یہ شعر یاد آیا یہ تو واضح ہوا کہ صحابہ کرام نے دعاء میں نبی کی ذات اور چہرہ وغیرہ کا کوئی لفظ پیش نہیں کیا۔ نیز ابوطالب کا شعر بھی اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کی ذات کی موجودگی سبب برکت اور دافع عذاب ہے جیسا کہ قرآن میں سورۃ انفال آیت 33 میں ارشاد ربانی ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ: تو مراد یہ ہوا کہ جب ذات طیبہ حیات د حاضر تھی تو لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی تھی۔ تنبیہ: اس کے علاوہ بھی بعض روایتیں ہیں جو موضوع اور ضعیف ہیں اور بعض ایسے لوگوں کے اقوال ہیں جو شریعت میں دلیل نہیں ہیں اس مسئلہ میں ہم نے قدرے تفصیل بیان کی ہے وجہ یہ ہے کہ بعض لاعلم اور بعض متجاہل لوگوں میں اس سلسلے میں بہت اشکالات ہیں اور عوام کو شکوک میں مبتلا کرتے ہیں اور چونکہ یہ مقام تفسیر بیان کرنے کا ہے تو میں مزید تفصیل میں نہیں جاؤں گا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب مسلمانوں کو کتاب اور سنت صحیحہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق اور اس پر استقامت عطا فرمائے۔ آمین

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳۶﴾

"یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے اگر ہو ان کیلئے جو زمین میں ہے اور اس جتنا اس کے ساتھ مزید ہوتا کہ قیامت والے دن کے عذاب سے (بچنے) کیلئے فدیہ (بدلہ) میں دیں تو قبول نہیں کیا جائے گا ان سے اور ان کیلئے دردناک عذاب ہوگا" [۳۶]۔

تفسیر 36 اس آیت میں تخویف اخروی ہے۔ اور اشارہ ہے کہ نجات کیلئے مذکورہ تین کام ضروری ہیں اور جس کے پاس یہ تین چیزیں نہ ہوں تو وہ کسی قسم کا بدلہ دینے سے عذاب الٰہی سے بچ نہیں سکے گا۔ كَفَرُوْا یہ وہ لوگ ہیں جو مذکورہ تین صفتوں سے محروم ہیں۔ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مفرد کی ضمیر مذکورہ دو کاموں میں سے ایک کی طرف راجع ہے۔ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ

اس کی تفسیر میں (صحیح بخاری کتاب احادیث انبیاء حدیث 3334 وصحیح مسلم فی صفات المنافقین حدیث 2805) کی، حدیث ہے کہ قیامت کے دن کافر سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اگر تجھے زمین سونے کی بھری ہوئی دی جائے عذاب باری تعالیٰ سے نجات کیلئے تو بطور فدیہ ادا کرے گا تو وہ جواب دے گا کہ جی ہاں اللہ تعالیٰ فرمائے گا تجھ سے تو اس سے کم چیز میں نے دنیا میں طلب کی تھی مگر تو نہیں مانتا تھا یعنی شرک مت کر۔ اس طرح آیت سورۃ آل عمران آیت 91 میں سورۃ بقرۃ آیت 28 اور 123 میں سورۃ انعام آیت 70 میں بھی ہے: عَذَابٌ اَلِيْمٌ اَلَمٌ درد اس وجہ سے زیادہ ہوگا کہ دل میں حسرت ہوگی۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝

"وہ چاہیں گے کہ اس (عذاب) آگ سے نکل جائیں اور نہیں ہونگے وہ اس (آگ) سے نکلنے والے اور ان کیلئے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے" [۳۷]۔

تفسیر 37 پہلے فرمایا کہ فدیہ دیے پر عذاب سے نہیں بچ سکتے تو اب مزید اضافہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بھاگنے سے بھی چھٹکارا نہیں ہوسکتا۔ يُرِيْدُوْنَ سمعانی نے فرمایا کہ یہاں ارادہ تمنا کے معنی میں ہے۔ سورۃ حج میں آیت 22 میں ہے چونکہ آیت کے آغاز سے معلوم ہوگیا ہے کہ کفار کا موضوع جاری ہے تو اس شفاعت میں مومنوں کا جہنم سے نکل آنے کی منافات نہیں ہے (کیونکہ کفار ہمیشہ رہیں گے اور ایمان والے سزا کے بعد آگ سے نکل آئیں گے): مُّقِيْمٌ وہ عذاب جس میں کوئی تبدیلی اور کمی نہیں ہوگی مستقل ہمیشہ ایک ہی حال میں البتہ اضافہ ہوگا۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

"چور مرد اور چور عورت پس تم ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو اس کے بدلہ میں جو انہوں نے کمایا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرتناک سزا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت غالب اور خوب حکمت والا ہے"۔ [۳۸]۔

تفسیر 38 ربط: اس میں ایک اشکال کا ازالہ ہے یعنی اگر کہا جائے کہ زمین بھرا سونا قابل قبول نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں دنیاوی مال کی کوئی حیثیت اور احترام نہیں ہے؟ تو جواب ہوا کہ شریعت میں مال کا احترام تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ نیز اسکا تعلق اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ الخ سے ہے یعنی وہ حکم ڈاکو کیلئے تھا جو اعلانیہ مال لوٹتا ہے جبکہ چوروں کا الگ حکم ہے یعنی جو چوری یا حیلہ سازی سے لوگوں کا مال لوٹتا ہے: وَالسَّارِقُ آیت تو

عام اور مطلق ہے لیکن صحیح احادیث میں اس کی تشریح وتقیید کی گئی ہے یعنی مال کا نصاب مقرر ہوا ہے جو ڈھائی کے برابر ہو صحیح بخاری کتاب الحدود حدیث 6795 صحیح مسلم کتاب السرقۃ حدیث 1686۔ اگرچہ فقہاء کرام کا اس میں اختلاف ہے جبکہ خوارج (انکاحدیث) کی وجہ سے چوری کے نصاب کو نہیں مانتے۔ سوال: وَالسَّارِقُ فرما کر مذکر کو مقدم کیوں کیا ہے؟ جواب: چوری کی عادت بہ نسبت عورتوں کے مردوں میں زیادہ ہوتی ہے: فَاقْطَعُوٓا اس سے مراد ایسا کاٹنا ہے کہ بدن سے الگ ہو جائے۔ سوال: سورۃ یوسف میں آیا ہے فَقَطَّعْنَ وہاں معنی زخمی کرنا ہے جبکہ الفاظ قریب قریب ہیں؟ تو یہاں کاٹ کر الگ کرنا کیسے صحیح ہوگا؟ جواب: سورۃ یوسف میں مجازی معنی مراد لیا گیا ہے جو بعض مفسرین نے ایک قرینہ کی وجہ سے مراد لیا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ دوسری جگہ بھی وہی معنی مراد ہو بلکہ جہاں حقیقی معنی امکان رکھتا ہو وہاں مجازی معنی درست نہیں جب تک کوئی قرینہ مجازی معنی لینے کیلئے نہ ہو۔ آیت سرقہ میں مجاز کیلئے کوئی قرینہ بھی نہیں ہے اور سلف صالحین میں کسی نے یہاں پر مجازی معنی بھی نہیں لیا ہے اور اس کے متعلق واضح احادیث موجود ہیں جیسا کہ (صحیح بخاری 6795 وصحیح مسلم 1685 ابوداؤد ابن ماجہ 2586 احمد 24079 مستدرک حاکم میں ج4 ص38 نصب الرایہ ج3 ص371 ایک روایت دارقطنی ج3 ص181 میں نقل کی ہے) لفظ قطع قرآن مجید میں مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ تفصیل کیلئے لغت کی کتاب لسان العرب ج 11 ص 320 ملاحظہ کریں: أَيْدِيَهُمَا: سوال: جمع ایدی کیوں ذکر کیا ہے؟ جواب(1): وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ: میں جنس مراد ہے جو جمع پر دلالت کرتا ہے اور ضمیر تثنیہ ظاہر الفاظ کے اعتبار سے ہے۔ جواب(2): زجاج اور فراء کا قول ہے کہ انسان کے بدن کا جو بھی حصہ دو ذکر ہوتا ہے تو جمع ذکر ہوتا ہے۔ جیسا کہ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا لہٰذا یمین دایاں ہاتھ تو ہر ایک انسان کا ایک ایک ہے تو جب دو بندوں مرد وعورت کے ہاتھ ذکر ہونگے تو جمع کو تثنیہ کی طرف مضاف کرنا پڑے گا اور ہاتھوں سے مراد پہلی مرتبہ دائیں ہاتھ ہونگے بسبب حدیث اور قرأۃ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فَاقْطَعُوٓا أَيْمَانَهُمَا فتح الباری 15، 362 اور خلفاء راشدین کے عمل سے بھی یہی ثابت ہے۔ سوال: چوری کا آلہ یعنی ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے مگر زنا میں آلہ تناسل کاٹنے کا حکم نہیں ہے؟ جواب(1): دونوں حکم شریعت نے دیئے ہیں اس لیے اس کی حکمت معلوم کرنا ضروری نہیں ہے۔ جواب(2): امام سمعانیؒ اور امام قرطبیؒ نے یہ حکمت بیان کی ہے کہ ہاتھ کاٹنے سے انسان کسب کرنے سے مکمل محروم نہیں ہوتا جبکہ آلہ تناسل سے مردانگی مکمل ختم ہوگی اور سزا کا فائدہ جو نصیحت ہے اس کیلئے باقی نہیں رہے گا: جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا عمل کے ساتھ بدلہ مناسب ہے چوری کا عمل چونکہ ہاتھوں نے کیا

ہے تو سزا بھی ان ہی کو ملنی چاہئے جیسا کہ ابولہب نے ہاتھوں سے ہمارے نبی کو ایذا ئیں دی تھیں تو فرمایا گیا کہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ، نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ۔ نکال وہ سزا ہے جس کی وجہ سے آئندہ زمانے میں انسان ایسا عمل نہ کر سکے اور اسی طرح دیکھنے والوں کیلئے عبرت بنے: وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. اَصْمَعِی کی روایت میں ہے کہ انہوں نے غلطی سے اس مقام میں غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ تلاوت کیا تو ایک دیہاتی نے پوچھا کہ یہ کس کا کلام ہے میں نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہو سکتا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں نے جلدی عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ پڑھا تو اس نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس لئے کہ سزا کے ساتھ مناسب عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ صفت ہے۔

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٣٩

"پھر جس نے اپنے ظلم کے بعد توبہ کرلی اور نیک عمل اختیار کیا تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس پر توجہ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ خوب بخشنے والا نہایت رحم کرنیوالا ہے" [۳۹]۔

تفسیر 39 اس آیت میں توبہ کی ترغیب ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ صرف سزا سے گناہ ختم نہیں ہوتا بلکہ توبہ بھی ضروری ہے: مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ یہاں ظلم سے چوری مراد ہے: وَاَصْلَحَ یعنی چوری سے توبہ کی تو اسی طرح ہر گناہ سے توبہ کرنی چاہئے تاکہ اس جرم کی جگہ مزید کوئی اور جرم نہ کر بیٹھے: فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ: توبہ سے حد ختم نہیں ہوتی توبہ بھی کریں اور عبرت کیلئے حد بھی لگائی جائے گی یعنی ہاتھ کاٹا جائے گا۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٤٠

"کیا آپ نہیں جانتے کہ یقیناً اللہ ہی کیلئے بادشاہی ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے وہ عذاب دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور مغفرت کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر خوب قادر ہے" [۴۰]۔

تفسیر 40 یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے مگر عام لوگوں کو تنبیہ ہے کہ سابقہ حدود یہ مجرم پر جاری ہوں گے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ مطلق بادشاہ ہے اور اختیار اسی کے پاس ہے کسی کی محبت یا مجبوری یا ڈر سے متاثر نہیں ہوتا اور جب وہ مطلق بادشاہ اور اختیار والا ہے تو اس کی مرضی ہے کہ کس جرم پر سولی کی سزا دے اور کس جرم پر ہاتھ کاٹنے کی۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ لَا يَحْزُنكَ ٱلَّذِينَ يُسَٰرِعُونَ فِى ٱلْكُفْرِ مِنَ ٱلَّذِينَ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا بِأَفْوَٰهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِن
قُلُوبُهُمْ ۛ وَمِنَ ٱلَّذِينَ هَادُوا۟ ۛ سَمَّٰعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّٰعُونَ لِقَوْمٍ ءَاخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ يُحَرِّفُونَ ٱلْكَلِمَ مِنۢ
بَعْدِ مَوَاضِعِهِۦ ۖ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِن لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَٱحْذَرُوا۟ ۚ وَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ فِتْنَتَهُۥ فَلَن
تَمْلِكَ لَهُۥ مِنَ ٱللَّهِ شَيْـًٔا ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ لَمْ يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا خِزْىٌ ۖ وَلَهُمْ فِى
ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٤١﴾

"اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو غمگین نہ کریں وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جو منہ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل ایمان نہیں لائے اور ان لوگوں میں سے جو یہودی ہوئے وہ جھوٹ کو (آپ پر باندھنے) کیلئے کان لگاتے ہیں اور کان لگاتے ہیں اور قوم کیلئے جو آپ کے پاس نہیں آئے وہ بدل ڈالتے ہیں باتوں کو اپنی جگہوں سے (ثابت ہونے کے) بعد وہ کہتے ہیں کہ اگر تم دیئے جاؤ یہ (حکم) تو لے لو اور اگر نہ دیئے جاؤ تم یہ (حکم) تو نہ لو اور جس شخص کے ساتھ اللہ ارادہ گمراہ کرنے کا کرے تو آپ ہرگز کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے اس کیلئے اللہ تعالیٰ کے پاس یہ وہ لوگ ہیں کہ نہیں ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے کہ ان کے دلوں کو پاک کرے ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے"[۴۱]۔

تفسیر41اس آیت سے آیت 65 تک سورۃ کا دوسرا حصہ ہے۔اس میں دو باب ہیں پہلا باب آیت 50 تک ہے۔اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور طمیتان دیا گیا ہے اور یہودیوں کا رد کیا ہے اور ان کو تنبیہ دی گئی ہے اور ان کی (10) دس صفتیں بیان کی ہیں پھر تین کتب کا ذکر ہے یعنی (قرآن، تورات، انجیل) ان کتابوں میں اللہ کے عقود کا ذکر ہے اور ان کو چھوڑ دینا کفر، شرک اور فسق کا سبب ہے۔ ربط سابقہ آیت سے یہ ہے کہ جو حدود بیان ہوئے ان کا معاشرے میں جاری کرنا نبی پر لازم ہے منافقین اور یہود کی باتوں کی کوئی پروہ نہیں کرنی: يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ : اس صفت کے ساتھ ترغیب ہمت اور ڈھارس دینا مقصود ہے: لَا يَحْزُنكَ سوال: شفقت کرنے والا انسان تو لازمی کفر اور نافرمانی پر غمگین ہوتا ہے؟ [redacted] اس سے کافروں کا عمل مراد ہے کہ وہ آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ سوال: حَزَن تو غیر اختیاری چیز ہے اس سے منع تو صحیح نہیں ہے؟ جواب: اس سے مراد اظہار حَزَن ہے یعنی (غم) کی وجہ سے دعوت چھوڑ دینا سستی کرنا: يُسَٰرِعُونَ

مسارعت سے مراد بے فکر اور بے دلیل ہو کر خوشی سے کفر اور کفر کے کام کرنا: فِي الْكُفْرِ حرف فِي سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کفر میں پختہ ہیں: مِنَ الَّذِينَ قَالُوا اس میں عجلت کرنے والوں کا بیان ہے پہلا گروہ منافقین کا ہے اور دوسرا یہود کا ہے: وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا: یہ دوسرا فریق ہے: سَمّٰعُونَ الخ یہ صفات یہود میں راسخ تھیں اور منافقین میں کبھی کبھی ظاہر ہوتی تھیں۔ یہاں سمع قبولیت کے معنی میں ہے جیسا کہ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ: میں ہے: لِلْكَذِبِ وہ جو ان کے علماء نے اپنی طرف سے مسئلے گھڑے ہیں یہ ان کو خوب سنتے ہیں، بلا دلیل ان کو قبول کرتے ہیں اور بیان بھی کرتے ہیں یہ خالص تقلید ہے: سَمّٰعُونَ لِقَوْمٍ اٰخَرِينَ یہ جاسوسی کی صفت ہے منافقین یہود کیلئے جاسوسی کرتے تھے اور یہود چھوٹے مولوی بڑے علماء اور احبار کیلئے جاسوسی کرتے تھے۔ لَمْ يَاْتُوكَ وہ تکبر کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی مجلس میں حاضر نہیں ہوتے۔ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ یہ قوم کی صفت ہے بڑے علماء کا کام تھا تحریف کرنا وہ اپنی خواہش اور رائے سے مسائل میں تاویلیں کرتے تھے: مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ یہاں پر مِنْ بَعْدِ لفظ ذکر کیا ہے یعنی تحریف لفظی اور معنوی دونوں کرتے تھے۔ سورۃ نساء آیت 46 اور اس سورۃ کی آیت 13 میں مِنْ بَعْدِ لفظ نہیں ہے وہاں معنوی تحریف کی طرف اشارہ ہے لفظ بعد میں اشارہ ہے کہ ان کی تحریف کا مقصد اللہ تعالیٰ کے کلام سے دوری اختیار کرنا تھا یعنی ایسی تاویل و تحریف کرتے کہ کلام الٰہی کا اس سے دور کا تعلق نہیں ہوتا مثلاً (رجم کی جگہ منہ) کالا کر کے گدھے پر بٹھانا یہ تو لفظ رجم کی بہت دور کی تاویل ہے۔ يَقُولُونَ یہ بڑے یہود علماء کی چھوٹے یہودیوں یعنی عوام کو وصیت ہے جو کبھی کبھار نبی کریم کی مجلس میں جاتے تھے: اِنْ اُوتِيتُمْ هٰذَا اس میں اسی تحریف بدل شدہ حکم رجم کی جگہ منہ کالا کرنے کی طرف اشارہ ہے: وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ تحریف کرنے والوں کو اس میں ڈانٹ ہے: فِتْنَتَهٗ دنیا میں عذاب دینا گمراہ کرنا رسوا کرنا اسی طرح آخرت میں بھی۔ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ یہ لَا تَقْدِرُ یا لَا تَسْتَطِيعُ کے معنی میں ہے یعنی تمہیں طاقت اور قدرت ان ہدایت حاصل کرنے پر نہیں ہے لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ اس میں کفر اور منافقت سے پاکی مراد ہے معلوم ہوا کہ بغیر اذن الٰہی کے ہدایت حاصل نہیں ہوتی۔ گمراہی اور ہدایت دونوں ارادہ و مشیت الٰہی کے ساتھ ہیں۔ اس آیت میں ان کی سات صفات کا ذکر ہے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ

یَّضُرُّوْكَ شَیْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝۴۲

"وہ جھوٹ کو بہت سننے والے ہیں اور بہت حرام کھانے والے ہیں پھر اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں یا ان سے منہ پھیر لیں اگر آپ ان سے منہ پھیر لیں گے تو وہ آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے اور آپ اگر فیصلہ کریں تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کریں یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے" [۴۲]۔

تفسیر 42 اس آیت میں یہودیوں کے مزید حالات کا ذکر ہے: سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ: پہلا سَمّٰعُوْنَ جھوٹی باتیں قبول کرنے کیلئے تھا دوسرا سَمّٰعُوْنَ جاسوسی کیلئے تھا یہ تیسرا سَمّٰعُوْنَ نبی کی باتیں سن کر آپ پر جھوٹ باندھنے کیلئے ہے یا تکرار میں تاکید مراد ہے: اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ: مبالغہ کا صیغہ ہے اس گناہ پر کثرت کیلئے اور ہمیشگی اختیار کرنے کیلئے: سُحْتٌ اصل میں کسی چیز کی جڑ کاٹنے کو کہا جاتا ہے اور حرام کو سحت اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے ذریعے برکت کی بنیادیں ختم ہوتی ہیں۔ ہلاکت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے امام قرطبی رحمہ اللہ نے سُحْتٌ کے بہت معانی بیان کیے ہیں۔ رشوت لینا، ضرورت پوری کرنے پر تحفہ ہدیہ لینا، اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر زبردستی اپنی عزت کروانا یا چیزیں لینا۔ بقول نیشا پوری سُحْتٌ وہ حرام ہے جس کے لینے سے شرم محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً رشوت، زنا کی اجرت، نر کا مادہ کے ساتھ استعمال کرنے پر اجرت، پچھنے لگانے کا پیسہ، مردار، شراب اور کتے کی قیمت، کاہن کی اجرت یہ سب وہ حرام کام ہیں جو لوگ شرم کی وجہ سے چھپ کر کرتے ہیں، اس قسم مال میں کوئی برکت نہیں ہے۔ امام آلوسی نے وہ مال بھی اس میں شامل کیا ہے جو دین کی وجہ سے کمایا جاتا ہے یعنی اس کی وجہ سے دین کو چھوڑا جائے یا دین میں خرابی آگئی ہو۔ [redacted] ان دونوں کو اکٹھا ذکر کیا اشارہ ہے کہ یہ مال رشوت وغیرہ جھوٹ کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا: فَاِنْ جَآءُوْكَ اس آیت کے متعلق مفسرین کے دو قول ہیں۔

(1) پہلا قول یہ ہے کہ یہ آیت وَاَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے منسوخ ہے۔ یعنی مسلمان حکمران پر لازم ہے کہ کافروں کے درمیان بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے فیصلہ کرے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سورۃ مائدہ میں منسوخ آیتیں نہیں ہیں لہٰذا ذمی کافر جب فیصلہ کروانے آجائے تو حکمران کو اختیار ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کرے یا چھوڑ دے اس قول کو اکثر اہل علم نے پسند کیا ہے اس کی مزید تفصیل قرطبی نے ذکر کی ہے: بِالْقِسْطِ: کافروں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے کرنا ہے یعنی قرآن وسنت ہی سے کرنا ہے۔ قسط حصہ کو کہا جاتا ہے اور انصاف یہ ہے کہ ہر فریق کو اس کا حصہ مل جائے۔ فائدہ اس آیت

میں یہودیوں کی ایک صفت ذکر ہوئی ہے۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِندَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٣﴾

"وہ کیونکر آپ ﷺ سے فیصلہ کروائیں گے جبکہ تورات انکے پاس موجود ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے پھر وہ اس کے بعد پھر جاتے ہیں اور وہ مؤمن نہیں ہیں" [۴۳]۔

تفسیر 43 اس میں بھی یہودیوں کیلئے ڈانٹ ہے اور ان کی مزید قبیح صفات کا ذکر ہے اس میں اشارہ ہے کہ یہودیوں کا محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی شریعت کے پاس فیصلہ لانا مقصد نہیں تھا بلکہ وہ اپنے لئے آسانیاں تلاش کرتے تھے: فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ اس سے مراد وہ حکم ہے جو قرآن کے ذریعے سے منسوخ نہیں ہوا جیسا کہ قصاص اور رجم وغیرہ ہے۔ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ یہ يُحَكِّمُونَكَ پر عطف ہے یعنی آپ کے حکم پر عمل نہیں کرتے: وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ: امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے قانون پر راضی نہ ہو اور دوسرے قانون کی طرف اپنے فیصلے لیکر جائے وہ مسلمان نہیں ہے بلکہ کافر ہے اور یہی یہودیوں کا حال تھا۔

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴿٤٤﴾

"یقیناً ہم نے تورات نازل کی اس میں (عقیدہ کی) ہدایت اور (اعمال کی) روشنی ہے۔ فیصلہ کرتے تھے اس کے ساتھ انبیاء اور جو فرمانبردار تھے ان لوگوں کے لئے جو یہودی ہوئے اور (فیصلہ کرتے تھے) اللہ والے اور علماء اس لیے کہ وہ نگران بنائے گئے تھے اللہ تعالیٰ کی کتاب کے اور تھے وہ اس پر خبر رکھنے والے پس تم لوگوں سے مت ڈرو مجھ ہی سے ڈرو اور نہ تم بیچو میری آیتوں کو تھوڑے مال پر اور جو شخص فیصلہ نہیں کرتا اس پر جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں" [۴۴]۔

تفسیر 44 اس آیت میں یہودیوں کیلئے ڈانٹ ہے کہ وہ اپنی کتاب سے اعراض کر رہے تھے تو ان کے پاس کوئی عذر نہیں ہے بلکہ اس قسم کی روش سے اپنے بڑوں کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔ اور ترغیب ہے کہ تورات پر اپنے بڑوں کے طریقہ پر

عمل کرو۔ یہاں سے آیت 48 تک تین کتابوں کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ یہ تینوں کتابیں صرف تلاوت اور ختم کیلئے نہیں بلکہ فیصلوں کیلئے اُتاری گئی ہیں اور زبور جو داؤد علیہ السلام کو دی گئی تھی اس میں فضائل اور اذکار تھے احکام اس میں نہیں تھے۔ وہ تورات کے احکام پر عمل پیرا ہونے کے مکلّف تھے۔ اسی وجہ سے یہاں زبور کا ذکر نہیں کیا: فِيهَا هُدًى وَّنُورٌ اس میں فرق یہ ہے کہ هُدًى سے عقیدہ اور اعمال مراد ہیں اور نُورٌ سے دلائل کے ساتھ شبہات کے ازالے یعنی جوابات مراد ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اَلْهُدٰى سے احکام اور شرائع مراد ہیں اور نور سے توحید اور عقیدت کا بیان مراد ہے: يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ اشارہ ہے کہ تورات کے نزول کا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام اور دیگر انبیاء کی شریعتوں کے موافق فیصلے تھے: الَّذِينَ أَسْلَمُوا یہ صفت تعریف کیلئے ہے البتہ یہودیوں پر تنقید ہے کہ سارے انبیاء آپس میں ایک ہی دین پر قائم اور متحد تھے اور تم سب سے الگ ہو: لِلَّذِينَ هَادُوا اس میں اشارہ ہے کہ تورات ان کیلئے خاص تھی ہمارے لیے عام نہیں ہے لام عَلٰى کے معنیٰ میں ہے یا هُدًى اور نُورٌ سے متعلق ہے: وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ اس میں دو طریقوں سے فرق ہے۔ (1) الرَّبَّانِيُّونَ وہ علماء ہیں جن پر زہد اور عبادت کا اثر غالب رہتا ہے بہ نسبت علم کے اور الْأَحْبَارُ وہ علماء ہیں جن پر عبادت کے بجائے علم کی صفت غالب رہتی ہے اور یہ دونوں علم و عمل جمع کرنے کی صفات ہیں: رَبَّانِيُّونَ کی شرح سورۃ آل عمران آیت 79 میں گزری ہے۔ فرق کی دوسری وجہ یہ ہے کہ: رَبَّانِيُّونَ وہ ہیں جو اجتہاد کے مرتبہ تک رسائی حاصل کر چکے ہیں اور احبار عام علماء ہیں لیکن یہ دونوں اس صفت سے مزین ہیں کہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کی کتاب پر کرتے ہیں۔ أَحْبَارٌ حِبْرٌ یا حَبْرٌ کی جمع ہے حِبْرٌ پڑھنا افضل ہے: حَبْر نام اس لیے رکھا ہے کہ وہ معانی کے ساتھ ساتھ عبارت کو خوبصورت بنانا جانتا ہو: بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ اس سے ماقبل يَحْكُمُ کے لیے دو اسباب کا بیان مقصود ہے۔ (1) پہلا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذمہ کتاب کی حفاظت لگائی تھی، حفاظت عام ہے الفاظ، معنی اور اس کا درس و تدریس، تحریف و تغیر سے حفاظت اور قانون کی حیثیت سے لوگوں پر جاری کرنا: وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ یہ دوسرا سبب ہے شہادت علم کے معنیٰ میں ہے کہ کتاب کی سچائی تصدیق اور حقانیت کو تسلیم کرتے ہوئے شہادت دے۔ مفسر خازن نے لکھا ہے کہ یہ وعدہ سارے علماء سے قرآن مجید کے متعلق لیا گیا ہے۔ [redacted] خصوصیت قرآن مجید یہ ہے کہ، اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے جیسا کہ سورۃ حجر آیت 9 میں ہے جبکہ تورات کی حفاظت کی ذمہ داری انبیاء کے بعد ربانیوں و احبار پر ڈال دی گئی تھی: فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ یہ حق کیلئے دو صفتوں کا ذکر ہے۔ [redacted] پہلا حق کتاب اللہ کا

یہ ہے کہ اس کی دعوت اور بیان عام کرنے میں صرف اللہ تعالیٰ کا خوف کرے۔ مخلوق کے خوف سے کتمان حق چھپانے سے گریز کرے اور سستی و مداہنت سے اجتناب کرے۔ (2) دوسری صفت: وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا یعنی دنیا کی حرص کی وجہ سے حق چھپانا یا سستی کرنا یا حق کو تحریف سے بدلنا ان تمام صفتوں سے اجتناب کرنا ہے: ثَمَنًا قَلِيْلًا: خازن اور نسفی کا قول ہے کہ رشوت، طلب کرنا دنیاوی مرتبہ میں عزت اور مخلوق کی رضا حاصل کرنا سب کو شامل ہے۔ اس کی مکمل تشریح سورۃ بقرہ آیت 41 میں گزری ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ: خوارج نے اس آیت سے دلیل لی ہے کہ جس نے کسی حکم الٰہی کو چھوڑا اور گناہ کبیرہ کا مستحق بنا تو وہ انسان کافر ہے دائرہ اسلام سے خارج ہے جبکہ اہل سنت والجماعت کا موقف ہے کہ گناہ کبیرہ سے خارج عن الاسلام نہیں ہے بشرطیکہ عمداً انکار نہ ہو اور اسلام کے کسی حکم کی توہین نہ کی ہو۔ اہل سنت والجماعت کا اس آیت کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت یہود کے ساتھ خاص ہے مگر یہ قول ضعیف ہے۔ دوسرا قول عکرمہ کا ہے کہ یہ منکر کے متعلق ہے انکار کے حکم میں توہین بھی شامل ہے دیگر دلائل اور نصوص کی وجہ سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہ کبیرہ کی وجہ سے کفر لازم نہیں آتا۔ تیسرا طاؤس کا قول ہے کہ آیت ظاہر معنی پر محمول ہے یعنی کافر ہے مگر کفر دون کفر کے تحت ہے یعنی ملت اسلامیہ سے خارج نہیں ہوتا۔ اس قول کو ابن عباس رضی اللہ عنہما، طاؤس اور عطاء سے ابن قیم رحمہ اللہ نے بدائع التفسیر میں نقل کر کے پسند کیا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے: مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سب وحی ہے جو عقیدہ توحید، نبوت وغیرہ پر فیصلہ کرنا اور عمل کرنا چھوڑ دے تو وہ انسان کافر ہے مگر اس توجیہ کو ابن قیم رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے مَا عام ہے جمیع کو شامل ہے اس کو خاص کرنا درست نہیں ہے۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿45﴾

"ہم نے ان پر (تورات) میں فرض کیا تھا کہ یقیناً جان کے بدلے جان (قصاص) ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا قصاص ہے پھر جو شخص معاف کر دے اس کو تو وہ اس کا کفارہ ہوگا اور جو شخص فیصلہ نہیں کرے گا اس پر جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہ لوگ ظالم ہیں" [۴۵]۔

تفسیر 45 یہ آیت یہودیوں کیلئے بطور زجر اور ڈانٹ کے ہے کہ مذکورہ صفتوں سے مزین کتاب تورات کو انہوں نے نظر

انکار کیا تھا اور قصاص میں بھی انہوں نے ایسی ہی مخالفت کی تھی جیسے شادی شدہ زانی اور زانیہ کے رجم میں مخالفت کی تھی۔ قصاص میں انہوں نے مخالفت دو طریقوں سے کی۔(1) انہوں نے بنو نضیر کو بنی قریظہ والوں پر فضیلت دی تھی اگر نضیری مارا جاتا تو قریظی سے قصاص لیا جاتا اور اگر نضیری قتل کرتا تو قریظی کا قصاص نہیں لیا جاتا اور ایک نضیری کے بدلے میں دو قریظیوں کو قصاص کیا جاتا۔ انہوں نے دیت کا حکم جاری کیا تھا جبکہ دیت کا حکم ان میں نہیں تھا۔ اس آیت کا حکم اس امت پر جاری ہے کیونکہ شریعت کا یہ حکم نسخ بھی ہوا ہے جو قرآن مجید میں آیا ہے کیونکہ اس آیت کی سابقہ لوگوں کیلئے کوئی تخصیص نہیں ہے: أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ اس لفظ میں مرد عورت دونوں شامل ہیں، مالدار غریب کا اور، اعلیٰ و ادنیٰ خاندان میں فرق نہیں ہوگا، اگر قاتل ایک ہو تو مقتول کے بدلے میں مال یا اعلیٰ خاندان ہونے کی وجہ سے بدلے میں دو بندے قتل نہیں ہونگے: وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ اس کو قصاص الاطراف کہا جاتا ہے جس میں حواس انسانی میں چار کا ذکر ہوا ہے۔(1) ایک قصاص قوت باصرہ دیکھنے میں۔(2) دوسرا قصاص قوت شامہ سونگھنے میں۔(3) تیسرا قصاص قوت سامعہ کان میں ہے۔(4) چوتھا قصاص قوت ذائقہ دانت میں ہے: وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ اس میں بدن کے باقی اعضاء کاٹنا یا زخمی کرنا شامل ہے البتہ اس میں شرط یہ ہے کہ قصاص لینے کا اس میں امکان ہو لہٰذا تخصیص کے بعد اس میں تعمیم کا ذکر ہے اور یہ سارا حکم اس وقت ہوگا جب قصداً جرم صادر ہو جائے خطا میں قصاص نہیں ہے ان احکام کی تفصیل احادیث نبوی میں ہے اور ان مفسرین نے بھی وہ روایتیں نقل کی ہیں جو تفاسیر احکام القرآن کے نام سے موسوم ہیں: فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ تصدق اس لیے فرمایا کہ اس میں معافی کی طرف ترغیب ہے: كَفَّارَةٌ لَّهُ یہ ضمیر یا تو زخمی اور اس کے ولی کی طرف راجع ہے۔ یا قاتل و جارح کی طرف راجع ہے یعنی روز قیامت تک اس کا گناہ ساقط ہوا: فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ جس نے قانون قصاص میں تبدیلی کی اور اس سے اعراض کیا، منہ پھیرا جیسا کہ یہود نے کیا تھا تو یہ بہت سارے ظلموں کا سبب ہے۔ لفظ ظلم کفر سمیت تمام گناہوں کو شامل ہے۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾

"اور ہم نے اس کے نقش قدم پر بھیجا عیسیٰ ابن مریم کو تصدیق کرنے والا جو اس سے پہلے تھی تورات اور ہم نے اس کو انجیل دی اس میں ہدایت اور روشنی تھی اور تصدیق کرنے والی تھی جو اس سے پہلے تورات تھی اور متقیوں کیلئے ہدایت و نصیحت ہے"[۴۶]۔

تفسیر 46 اس آیت میں بنی اسرائیل کی دوسری کتاب انجیل کا ذکر ہے جس کا نزول عیسیٰ علیہ السلام پر ہوا ہے: وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ یہ ضمیر النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا 441 کی طرف راجع ہے لفظ قَفَّيْنَا میں اشارہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اور دیگر نبیوں کو ایک جیسا دین دیا گیا تھا: مُصَدِّقًا یعنی عیسیٰ علیہ السلام انجیل کے اترنے نازل ہونے سے قبل تورات کا درس دیتے رہے اس کو لوگوں تک پہنچاتے تھے: مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مصدق صفت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسری صفت انجیل کی ہے اور بعض احکام کا منسوخ ہونا تصدیق کے منافی نہیں ہیں۔ پہلی ہدایت سے احکام مراد ہیں جو بعض انجیل میں ہیں اس لیے فِيْهِ ذکر ہوا ہے اس ہدایت سے مراد حق تک رسائی ہے اس میں باطل اور غلط بات نہیں: مَوْعِظَةً اس سے مراد باطل راستوں سے روکنا ہے۔

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

"اور (ہم نے کہا) چاہئے کہ انجیل والے فیصلے کریں اس حکم پر جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور جس نے فیصلہ نہیں کیا اس پر جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے تو وہی لوگ نافرمان ہیں"[۴۷]۔

تفسیر 47 پہلے صرف کتاب کی صفات بیان ہوئیں اب کتاب کا مقصد ذکر ہو رہا ہے اور وہ ہے کتاب پر فیصلے کرنا۔ وَلْيَحْكُمْ یہاں پر (قُلْنَا) مقدر ہے یعنی ہم نے کہا تھا یعنی اس وقت یہ بات ہم نے بتائی تھی۔ یا پھر یہ جملہ مستقل ہے اور مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے توحید اور آخری نبی کی نبوت و رسالت مراد ہے تو مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کی تخصیص سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں اصول مراد ہیں (یعنی عقیدہ کے مسائل): الْفٰسِقُوْنَ اشارہ ہے کہ انجیل کی ہدایات سے روگردانی فسق ہے۔ خواہ عقیدہ کا فسق ہو جو کہ کفر ہے یا اعمال کا فسق۔ ربط آیات الْكٰفِرُوْنَ وَ الظّٰلِمُوْنَ وَ الْفٰسِقُوْنَ: اس میں اشارہ ہے کہ احکام الٰہی کو چھوڑ دینے سے بندہ ان صفات سے متصف ہوتا ہے جو کہ کفر ظلم اور فسق ہے (1) پہلی آیت

میں ایمانیات کا ذکر ہے اس کے مقابل کفر ہے (2) دوسری میں قصاص و دیت یعنی عدل کا ذکر ہے۔ اس کے مقابل ظلم ہے (3) تیسری آیت میں تقویٰ کا ذکر ہے جس کے مقابل فسق ہے۔ فائدہ (2): اسی طرح معصیت کی بھی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم انکار کے طور پر ہوتی ہے تو وہ کفر ہے اور دوسرا طریقہ اعتداء کا ہے یعنی حد شرعی سے تجاوز کرنا تو وہ ظلم ہے اور تیسری قسم کی شریعت کے اعمال میں تقصیر کرنا جو کہ فسق ہے۔ فائدہ (3): کفر کا ارتکاب یہود اور نصاریٰ نے کیا تھا تو اس کو پہلے ذکر کیا ہے پھر چونکہ یہودیوں میں ظلم بہت زیادہ ہے وہ اپنے مخالف پر ہر قسم ظلم روا رکھتے ہیں تو تورات والوں کو اس ظلم کی صفت سے یاد کیا اور چونکہ نصاریٰ میں ظلم کے جواز کا عقیدہ نہیں تھا تو انجیل والوں کے ساتھ صفت فسق ذکر کی۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٤٨﴾

"اور ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب (قرآن) اتاری تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو اس سے پہلے کتابیں تھیں اور یہ ان پر نگہبان ہے لہٰذا آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں جو اللہ نے نازل کیا اور آپ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں (اس سے صرف نظر کرتے ہوئے) جو آپ کے پاس حق آیا ہے ہم نے بنایا تم میں سے ہر ایک کیلئے دستور اور ایک طریقہ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم کو ایک امت کر دیتا لیکن تاکہ تمہیں اس کتاب میں آزمائے جو اس نے تمہیں دی ہے لہٰذا تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو تم سب کا لوٹنا اللہ ہی کی طرف ہے پھر وہ تمہیں خبر دے گا اس چیز کے متعلق جس میں تم اختلاف کرتے تھے" [۴۸]۔

تفسیر 48 تورات اور انجیل کا ذکر کرنے کے بعد اب قرآن مجید کا ذکر ہو رہا ہے: بِالْحَقِّ سے مراد سچائی ہے یعنی اس کتاب قرآن کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے میں کوئی شک نہیں ہے (با) ملابست کیلئے ہے یا پھر سببیہ ہے بسبب اثبات اور اظہار حق: مِنَ الْكِتٰبِ مفرد بمعنی جنس ہے یعنی وہ تمام کتابیں جو قرآن سے قبل اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہیں اور تصدیق سے مراد موافقت ہے یعنی توحید، رسالت اور دیگر اصول و عقائد کے مضامین میں موافقت ہے اسی طرح سابقہ کتابوں میں اس کا ذکر موجود تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کو آخری نبی پر نازل کرے گا۔ جب نازل ہوئی تو اس خبر کی تصدیق ہوگئی۔ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ امین، شاہد، حاکم کے معنی میں ہے ان سب معنوں کا مقصد ایک ہے یعنی سابقہ کتابوں میں جو اصول و

عقائد قرآن مجید کے مطابق ہیں وہ حق اور درست ہیں اور جو مخالف ہیں وہ اہل باطل نے اپنی طرف سے تحریف کی ہوگی اور
باطل ہوگی۔ امام سمعانی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ہر وہ کتاب جس پر قرآن نے شہادت دی ہو وہ کتاب اللہ ہے معلوم ہوا کہ
ہندوؤں، مجوسیوں اور سکھوں وغیرہ کی جو کتابیں ہیں وہ کتاب اللہ کہلانے کی حقدار نہیں ہیں کیونکہ ان کی تصدیق قرآن مجید 6
نے نہیں کی۔ معلوم ہوا کہ قرآن مجید سابقہ کتابوں کا محافظ ہے ان میں تحریف وتغیر آنے نہیں دیتا اور جب آسمانی کتابوں پر
امین ومحافظ ہے تو انسانوں کی کتابوں پر تو بدرجہ اولیٰ محافظ وامین ہے۔ دیگر کتابوں میں قرآن مجید کے خلاف جو بات ہوگی تو
وہ باطل ومردود ہوگی: مُصَدِّقًا اور مُهَيْمِنًا میں اشارہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کو چاہیئے کہ ضرور اس کتاب پر ایمان لائیں
کیونکہ مُصَدِّق کا انکار مُصَدَّق کے انکار کو مستلزم ہے: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ یہ ماقبل کی قرآن کی صفات پر
تفریع ہے یعنی جب یہ مُهَيْمِنٌ، مُصَدِّقٌ، مُنَزَّلٌ ہے تو فیصلہ بھی لازماً اسی پر ہونا چاہیئے۔ بَيْنَهُمْ عام ہے یہود،
نصاریٰ اور اس امت کے لوگ سب اس میں شامل ہیں: وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ : اھواء میں وہ مسائل واحکام داخل ہیں جو
اہل کتاب نے اپنی جانب سے بنا کر تورات وانجیل میں داخل کیے ہیں: عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ: اس سے اعراض نتیجتاً آتا
ہے کیونکہ جب خواہش کی پیروی ہوگی حق سے اعراض لازم آتا ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا: اس میں
دو تفسیر منقول ہیں۔ پہلی تفسیر یہ ہے کہ اس میں ایک اشکال ختم کیا گیا ہے اشکال یہ ہے کہ اہل کتاب نے کہا کہ ہماری
کتابوں میں تو اس کے خلاف مسائل موجود ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ میں تعداد کا فرق ہے تو پھر یہ کیسے مصدق ومھیمن
ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اصول اور عقائد میں تمام کتابیں متحد ومتفق ہیں اور جزئیات اور فروع میں جو مخالفت ہے تو وہ
ہر ملت کیلئے الگ الگ ہے وہ مخالفت سبب تکذیب نہیں ہے۔ اس کی تائید میں وہ صحیح حدیث ہے: اَلْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ
لِعَلَّاتٍ أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّى وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ (احمد 4/288-336 حاکم امام حاکم نے علی شرط شرطین کہا ہے امام ذھبی
نے اس کی موافقت کی ہے شیخ البانی نے السلسلۃ الصحیحۃ 2182 میں بھی تصحیح کی ہے) انبیاء کرام سوتیلے بھائی ہیں جن کی
مائیں الگ اور دین ایک ہے۔ یعنی اصول دین انکا ایک ہے جبکہ فروع الگ الگ ہیں لہٰذا اس تفسیر کی بناء پر شِرْعَةً وَّ
مِنْهَاجًا سے مراد احکام فرعیہ ہیں۔ شِرْعَةً اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور شریعت مقرر کیے ہیں اور مِنْهَاجًا اس
لئے فرمایا کہ ان پر چل کر زندگی گزارنا ضروری ہے۔ دوسرا قول مجاہد سے منقول ہے کہ جَعَلْنَا کیلئے مفعول اول حذف
ہے یعنی لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا الْقُرْآنَ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا تمام امتوں کیلئے قرآن کریم کو شریعت ومنہاج مقرر کیا گیا

ہے۔اس تفسیر سے وہ اشکال ختم ہوا کہ اہل کتاب کی اپنی اپنی کتابیں ہیں لہٰذا وہ اپنی کتابوں پر عمل پیرا ہونگے۔اب **سوال** یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں پر عمل کر سکتے ہیں؟۔ **جواب** ہوا کہ نہیں بلکہ وہ کتابیں قرآن کے ذریعے منسوخ کی گئی ہیں۔اس تفسیر کی بناء پر شِرْعَةً سے مراد اصول وایمانیات ہیں۔منہاج شرائع واحکام کو کہا جاتا ہے قرآن مجید ان دونوں پر مشتمل ہے۔ فائدہ: شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا میں فرق کے اعتبار سے مختلف اقوال ہیں۔(1) مبرد کا قول ہے کہ شِرْعَةً راستے کی ابتداء کو کہتے ہیں اور مِنْهَاجًا اس پر مستقل چلنے کو کہتے ہیں۔(2) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ شِرْعَةً سنت کو اور مِنْهَاجًا راستے کو کہا جاتا ہے۔(3) شِرْعَةً مطلق راستے کو مِنْهَاجًا پوری طرح واضح ہونے کو کہا جاتا ہے: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ. اس جملہ میں شرائع کے مختلف ہونے کی حکمت کا ذکر ہے جو تورات، انجیل اور قرآن مجید میں الگ الگ ہے: وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ یعنی ہر امت کے لوگ ان شریعتوں کی پابندی کے مکلّف ہیں جو ان کیلئے مقرر کی گئی ہیں۔یہ تفسیر پہلے قول پر بنا ہے جو: لِكُلٍّ جَعَلْنَا میں گزرا ہے۔اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ قرآن مجید کے نزول کے بعد بھی لوگ مختلف نظریات کے حامل ہیں کچھ ایمان لاتے ہیں اور کوئی کفر کرتے ہیں یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کے ساتھ ہے اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ بندوں کا ابتلاء وامتحان ہو جائے اور اس قول کی بناء پر یہ سورۃ بقرۃ آیت 253 جیسی ہے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ: ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا اس سے مراد اللہ ورسول کی اطاعت اور تصدیق قرآن ہے اور تفسیر مدارک میں ہے کہ اس سے مراد وہ سب کچھ ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔یعنی جب لوگوں میں اختلاف ہو تو تم قرآن مجید اور دین اسلام کے تابع ہو جاؤ: فَاسْتَبِقُوا: بوقت مقابلہ واختلاف استعمال ہوتا ہے: اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ یہ فَاسْتَبِقُوا کیلئے علت ہے اور تخویف اخروی ہے: فَيُنَبِّئُكُمْ: وہاں حق وباطل کا واضح امتیاز ہو جائیگا خبر سے جزا وسزا مراد ہے۔

وَاَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ‌ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّصِيۡبَهُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِهِمۡ‌ ؕ وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۹﴾

"اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ) ان کے درمیان فیصلہ کرو اس (کتاب) کے ساتھ جو اللہ نے نازل کی ہے اور ان کی خواہش کی پیروی مت کرو اور ان سے بچو یہ کہ آپ کو بعض اس (وحی) سے جو آپ کی طرف اللہ نے نازل کی ہے پھیر دینگے پھر اگر وہ روگردانی کریں تو آپ جان لیں کہ اللہ تو صرف ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے ان کو سزا دینا چاہتا ہے اور یقیناً ان میں اکثریت نافرمانوں کی ہے"[۴۹]۔

تفسیر 49 اس آیت میں قرآن کا حکم ماننے کی تاکید ہے: وَاَنِ احۡكُمۡ یہ بِالۡحَقِّ پر عطف ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ نزول کتاب (قرآن) کا مقصد اس کا حکم جاری کرنا ہے جیسا کہ سورۃ نساء آیت 105 میں ہے لہٰذا یہ تکرار نہیں ہے یعنی پہلی آیت میں صرف کتاب پر عمل کرنے کا حکم تھا جبکہ اس آیت میں نزول کا مقصد بیان ہوا ہے: وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ پہلی آیت میں عام لوگوں کی خواہشات کی پیروی مراد تھی جبکہ اس آیت میں علماء سوء کی خواہش کی پیروی مراد ہے۔ مفسر خازن کا قول ہے کہ پہلی آیت میں خواہش کی اتباع سے منع رجم کے مسئلہ میں تھا اور اس آیت میں قتل کے مسئلہ پر ہے مگر اس تخصیص کا کوئی سبب معلوم نہیں ہے: وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور امتیوں کو خاص تنبیہ کی ہے کہ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ کے متعلق یہود و نصریٰ (منافقین) اور علماء سوء کی چالوں، مکروں اور لفاظیوں سے ہوشیار رہو۔ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ یہ ضمیر هُمۡ سے بدل اشتمال ہے اور فتنہ سے مراد حق دین سے پھیرنا ہے جیسا کہ سورۃ اسراء آیت 73 میں ہے: عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اس میں دو قول ہیں (1) ایک قول یہ ہے کہ بعض کل کے معنی میں ہے جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت 50 میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بعض اپنے معنی پر ہے اس میں اشارہ ہے کہ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ کے ایک حکم سے اعراض گناہ کبیرہ ہے تو پوری کتاب کو چھوڑنا تو بہت بڑا گناہ ہے، یہ قول بہتر ہے: فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اس میں وضاحت ہے کہ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ سے اعراض دنیا میں عذاب کا سبب ہے: بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِهِمۡ اس میں اشارہ ہے کہ دنیا کا عذاب سارے گناہوں پر نہیں ہے وہ تو آخرت میں ہوگا: لَفٰسِقُوۡنَ یہاں پر ایک خاص حکم کی طرف اشارہ ہے جو آیت 47 میں گزرا ہے یعنی قرآن مجید کے حکم سے اعراض کرنا۔

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿٥٠﴾ ع

"کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور فیصلہ کرنے میں کون زیادہ اچھا ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ سے اس قوم کیلئے جو یقین رکھتی ہو" [۵۰]۔

تفسیر 50 یہ تَوَلَّوْا کے ساتھ یا اَلْفَاسِقُوْنَ کے ساتھ یا پھر مقدر عبارت کے ساتھ متعلق ہے یعنی أَيَتَوَلَّوْنَ عَنْ حُكْمِ اللهِ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ: کیا حکم الٰہی سے منہ پھیرتے ہیں تو پھر جاہلیت کے حکم کے متلاشی ہیں۔(فا) کے ساتھ اس لیے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اعراض حکم جاہلیت ماننے کے مترادف ہے۔حکم جاہلیت ہر اس حکم کو کہا جاتا ہے جو قرآن وسنت کے خلاف ہو۔ یہود میں مالدار اور غریب کے لیے حکم جاری کرنے میں فرق تھا کیونکہ مالدار پر حدود جاری نہیں کرتے اور غریبوں پر جاری کرتے تھے۔ امام قرطبی نے اولاد میں فرق کرنے والے کو بھی اس میں شمار کیا ہے کہ بعض اولاد کو مال میں سے دیتا ہے بعض کو محروم کرتا ہے جس کو حدیث میں ظلم کہا گیا ہے۔(صحیح بخاری کتاب الشھادات حدیث 2650 صحیح مسلم فی البیوع حدیث 1623 ابوداؤد حدیث 3543 ونسائی وغیرہ میں نعمان بن بشیر کے حوالے سے مشہور ہے)۔امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تشریح میں تاتاریوں کا حال ذکر کیا ہے کہ چنگیز خان نے اپنا قانون بنایا تھا جس کو اس نے یساق نام دیا تھا جس میں اس نے بعض چیزیں یہودیت بعض نصرانیت اور بعض اسلام سے داخل کی تھیں۔(جیسا کہ آج پاکستانی قانون ہے) اور کچھ چیزیں اپنی خواہش سے شامل کی تھیں اور اپنی کو اہش والی باتوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر مقدم کرتا تھا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا جو ایسا کریگا وہ کافر ہے اس کے خلاف قتال فرض ہے:وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللهِ حُكْمًا اس میں استفہام انکاری ہے اور حَسَنٌ عَدْلٌ وَأَحْكَمُ کو کہا جاتا ہے۔ لِقَوْمٍ :لام اپنے معنی پر ہے اور اس کی تخصیص فائدے کی وجہ سے ہے یا لام (علیٰ) کے معنی میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٥١﴾

"اے ایمان والو دوست مت بناؤ یہود ونصاریٰ کو وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں (کفر کے کاموں میں برابر) ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان سے دوستی رکھے گا تو یقیناً وہ ان ہی میں سے ہے یقیناً اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا" [۵۱]۔

تفسیر 51 اس آیت سے دوسرے حصے کا دوسرا باب ہے آیت 66 تک جس میں یہود ونصاریٰ کے ساتھ دوستی سے منع کیا

گیا ہے اور مؤمنین کے عقود میں سے ساتواں عقد ہے پھر اس عقد کی مخالفت کرنے پر منافقین کیلئے زجر وتوبیخ ہے۔ آیت 52 اور 53 میں پھر ترغیب دینے کیلئے صحابہ کرام کی صفات کا ذکر ہوا ہے۔ آیت 54 میں آٹھواں عقد ہے پھر متصل ان لوگوں کا ذکر ہے جو دوستی کے حقدار ہیں آیت 55 اور 56 میں پھر دس وجوہات ان سے ترک دوستی کیلئے بیان فرمائی ہیں آیت 57، 58، 59، 60، 61، 62، 63، 64 اور آخری آیت میں نواں (9) عقد مذکور ہے۔ آخری آیت 65 میں آخرت کی بشارت ہے اور آیت 66 میں وعدوں کی پاسداری پر دنیاوی خوشخبری ہے۔ ربط: سابقہ آیت میں نبی کریم ﷺ کو بچنے کا حکم تھا کہ یہود ونصاریٰ آپ کو فتنہ میں ڈال دیں گے تو عوام کیلئے بھی بچانے کے اسباب بیان کرنا ضروری ہے تاکہ وہ بھی ان کی گمراہی کے فتنوں سے بچ سکیں۔ نیز یہود ونصاریٰ جاہلیت کا حکم طلب کرتے ہیں تو ان سے لاتعلقی کا حکم ضروری ہے۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اس ایمانی صفت کا تقاضا ہے کہ یہود ونصاریٰ سے دوستی نہ کرنا: أَوْلِيَاءَ اس طرح حکم عام کافروں کے متعلق سورۃ آل عمران آیت 28 میں سورۃ نساء آیت 139 اور 144 سورۃ ممتحنہ آیت 1 میں بھی ہے۔ دوستی کے تین درجے ہیں۔ (1) ان کے ساتھ مکمل دوستی کرنا جو ان کے عقیدے کے موافق ہو یا کفر اور شرک کے کاموں میں ہو تو عین کفر ہے۔ (2) ان کے ساتھ مالی جانی تعاون کرنا یہ بھی کبیرہ گناہ ہے۔ (3) ان کا اکرام کرنا ان کو عزت دینا یہ بھی منع ہے جیسا کہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو حساب کتاب لکھنے کیلئے رکھا تھا جس پر عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے ان کی سرزنش کی تھی کہ یہ اکرام ہے اور منع کیا تھا۔ تفسیر درمنثور 3/100 تفسیر ابن ابی حاتم 4/1156 ابن کثیر کی محققین نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ سمعانی، ابن کثیر، مزید تفسیر سورۃ آل عمران آیت 28 میں گزری ہے: بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ یہ پہلے کیلئے علت ہے یعنی ان کے آپس میں دوستی ہے مسلمانوں کے خلاف ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہے اور کفر کے کاموں میں بھی آپس میں مشابہ ہیں اگرچہ آپس میں ان کی دشمنیاں بھی ہیں۔ سورۃ بقرۃ آیت 113 اور اس سورۃ آیت 14 میں گزرا ہے اور اس آیت سے یہ قول لیا گیا ہے کہ اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ. وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ اور یہ حدیث بھی اس کا حاصل ہے کہ وَمَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (ابوداؤد 1/172 حدیث 4031 احمد 2/50 مشکل الاثار قال البانی وسندہ حسن۔ ارواء الغلیل حدیث 2384 الصحیحہ 2030)۔ اس سے مراد ان کے دین میں مشابہت ہے یعنی ان کے تہواروں اور عیدوں میں حاضری دینا ان کی صلیب گلے میں یا کسی عزت کی جگہ استعمال کرنا ان کی طرح قبروں پر مزارات بنانا یہ حب دوستی میں داخل ہے: الظَّالِمِينَ وہ لوگ مراد ہیں جو مؤمنوں کے بجائے کافروں سے دوستیاں کرتے ہیں۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ
بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ؕ﴿۵۲﴾

"پس آپ دیکھیں گے ان لوگوں کو جن کے دلوں میں (نفاق) کا مرض ہے وہ دوڑتے ہیں ان میں کہتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں اس سے کہ ہمیں کوئی مصیبت پہنچے پس قریب ہے کہ لے آئے اللہ تعالیٰ فتح یا اپنی طرف سے کوئی اور حکم پھر وہ ہو جائیں گے اس پر نادم جو انہوں نے چھپائی اپنے نفسوں میں (کافروں کی دوستی)" [۵۲]۔

[تفسیر 52] اس آیت میں منافقین کیلئے تنبیہ ہے کیونکہ انہوں نے سابقہ بیان کردہ عقد کی مخالفت کی تھی اور ان کے بہانے کا ذکر اور پھر اس کا جواب ہے: مَّرَضٌ شک، نفاق اور کافروں سے محبت مراد ہے: يُسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ یعنی فِيْ مُوَالَاتِهِمْ: ان کی دوستی میں جلدی کرتے ہیں اس کو جلد بازی اس لئے کہا کہ اس دوستی کے نتیجے پر غور و فکر نہیں کرتے اور بغیر سوچ و فکر ان میں جا گھستے ہیں: يَقُوْلُوْنَ یہ منافقین کا ایک بہانہ ہے۔ دَآئِرَةٌ ہر وہ مصیبت جو زمانے کی گردش سے پیدا ہوتی ہے یعنی کافروں کا غلبہ مسلمانوں کی کمزوری شکست قحط سالی یعنی کفار ہمارے ایسے موقعوں پر مدد کرینگے آج پورے عالم میں عموماً اور اس ملک میں خصوصاً یہ حالات ہیں کہ یہود و نصاریٰ امریکہ وغیرہ سے اس بنیاد پر دوستی کرتے ہیں کہ کل ہماری مشکلوں میں کام آئیں گے: وَاِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى: ہم اللہ ہی سے شکایت کرتے ہیں: فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ عَسٰى اُمید کے قرب کیلئے ہے۔ فتح سے کافروں پر مسلمانوں کا غلبہ مراد ہے: اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ: مومنوں پر رزق کی فراوانی یا منافقین کے رازوں کو افشاء کرنا مراد ہے: فَيُصْبِحُوْا: اصباح کے ساتھ اس لیے تعبیر کیا گیا کہ پہلے منافقین کے جو حالات ذکر ہوئے ہیں وہ مثل رات کے ہیں یا مثل اندھیرے کے ہیں اور اندھیرے کے بعد روشنی آتی ہے اس کو صباح یعنی صبح کی روشنی سے مشابہت دی ہے اور وہ روشنی میں اپنا نقصان دیکھ لیں گے تو یہود و نصاریٰ کی دوستی پر ندامت و افسوس کرینگے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

"اور وہ لوگ کہیں گے جو ایمان لائے کیا یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھائی تھیں پختہ قسمیں اپنی تاکید کے ساتھ کہ یقیناً وہ تمہارے ساتھ ہیں برباد ہو گئے ان کے اعمال اور ہو گئے وہ خسارہ اُٹھانے والے" [۵۳]۔

[تفسیر 53] یہ ایمان والوں کا قول ہے ان پر منافقین کا حال ظاہر ہوا تو بطور تعجب انہوں نے یہ بات کی: جَهْدَ

اَیۡمَانِہِمۡ مشرکین اور منافقین کی بھی اللہ تعالیٰ پر قسم پختہ ہوتی ہے جبکہ غیر اللہ کی قسم عادتاً کھاتے ہیں یا قسم کی پختگی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دیگر صفتوں کو بطور قسم ذکر کرتے ہیں: خٰسِرِیۡنَ یہ ندامت سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس میں تو دنیاوی فائدے کے فوت ہونے کا مسئلہ تھا اور اس میں دنیا و آخرت دونوں میں نقصان کا سامنا ہے دنیا میں ذلت بھی اور اعمال کی بربادی بھی یہ رسوائی پر رسوائی ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّہُمۡ وَ یُحِبُّوۡنَہٗۤ ۙ اَذِلَّۃٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ۫ یُجَاہِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ لَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَۃَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۴﴾

"اے لوگو جو ایمان لاتے ہو تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو عنقریب اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہونگے مومنوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہونگے اللہ تعالیٰ کے راستے میں وہ جہاد کرینگے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے وہ نہ ڈریں گے یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ دیتا ہے جسے وہ چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسیع فضل والا اور خوب جاننے والا ہے" [۵۴]۔

تفسیر 54 اس آیت میں ایمان والوں کو تسلی و اطمینان دلایا جا رہا ہے۔ جب منافقین کا نفاق اور کافروں سے ان کی دوستی ظاہر ہو جائے اس میں اشارہ ہے کہ زمانے کی گردش اور مصائب پہنچنے سے ایمان والوں کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا اور نہ ہی دین اسلام کا نقصان ہوگا۔ تو اسی طرح اگر کوئی شخص مرتد ہو جائے تو اس کے مرتد ہونے سے دین اور دینداروں کا نقصان نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ اور لوگوں کو دین کی نصرت و مدد کیلئے پیدا کر دے گا: مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ یعنی یہود و نصاریٰ کی دوستی سے یا کسی اور سبب سے جو دین سے مرتد ہو جائے جبکہ وہ ایمان کا اظہار کر چکا ہو مراد یہ ہے کہ جس نے دین کو چھوڑا تو وہ یہ خیال نہ کرے کہ دین اسلام کا نقصان ہوگا نہیں بلکہ اس کی جگہ اللہ تعالیٰ کسی اور کو دین کی نصرت و مدد کیلئے لے آئے گا۔ اس طرح سورۃ محمد آیت 38 سورۃ نساء آیت 133 اور سورۃ ابراہیم آیت 19 اور 20 میں مذکور ہے ہمَنۡ یَّرۡتَدَّ کی جزا مقدر ہے: فَلَا یَضُرُّ اِلَّا نَفۡسَہٗ یعنی اپنے نفس کے علاوہ کسی اور کا نقصان نہیں کر سکتا اور فَسَوۡفَ میں (ف) علت کے معنی میں ہے۔ سوال: جب یہ خطاب صحابہ کرام سے ہو اور فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ الخ سے کوئی اور مراد ہو جائے تو اس طرح بعد میں آنے والوں کی صحابہ پر فضیلت ثابت ہو گئی؟ جواب: اس خطاب میں منافقین مراد ہیں جیسا کہ سابقہ دو آیتوں

سے معلوم ہوتا ہے اور فَسَوْفَ يَأْتِي اللهُ بِقَوْمٍ صحابہ کرام مراد ہیں جس کیلئے قرینہ سورۃ توبہ آیت 100 سورۃ فتح آیت 29 ہے۔ يَأْتِي مضارع ماضی کے معنی میں ہے اور یہ حال ماضیہ کی حکایت ہے اور اس مقصد کیلئے ہے کہ ہر زمانہ کیلئے شامل ہو جائے۔ سوال: بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت میں نبی ﷺ کی واضح اور صحیح پیشگوئی ہے ان لوگوں کے بارے میں جو مرتد ہو گئے تھے؟ جواب: جن تین آدمیوں کا ذکر ہے جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا نبی ﷺ کی حیات طیبہ میں وہ اسود عنسی اور اس کی قوم بنی مدلج، اور مُسَيْلَمَةُ الْكَذَّابُ اور اس کی قوم بنو حنیفہ، اور طلیحہ بن خویلد اور اسکی قوم بنو اسد ہے۔ ان کا ایمان لانا نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں ثابت نہیں ہے لہٰذا ان کے متعلق یہ کہنا کہ یہ صحابہ تھے بعد میں مرتد ہوئے غلط ہے بلکہ ان کا ایمان لانا ثابت نہیں ہے ابتداء سے وہ کافر ہی تھے اور وہ سات قبیلے اور فرقے جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ایک فرقہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مرتد ہوئے تھے وہ صحابہ نہیں تھے لہٰذا یہ استدلال غلط ہے کہ صحابہ کرام مرتد ہو گئے تھے۔ حسن بصری سے روایت مفسرین نے نقل کی ہے کہ وہ حلفاً کہا کرتے تھے کہ بِقَوْمٍ سے مراد ابو بکر اور اس کے ساتھی ہیں۔ تنبیہ: خطابی نے لکھا ہے کہ مرتد کی دو قسمیں تھیں ایک وہ قسم کہ دین اسلام سے انکار کر کے جاہلیت کے طور طریقے اور عقیدے اختیار کر لیتے تھے یہ وہ لوگ تھے جو اسود عنسی اور مُسَيْلَمَةُ الْكَذَّابُ پر ایمان لائے تھے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جنہوں نے زکوۃ اور نماز میں فرق کیا تھا اور امام کو زکوۃ دینے سے انکار کیا تھا یہ بنو حنیفہ میں بعض لوگ تھے امام شوکانی نے لکھا ہے کہ ان کو باغی کہتے ہیں۔ مرتدین ان کو مشابہۃً کہا گیا ہے۔ (نیل الاوطار کتاب الزکوۃ للامام شوکانی) يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ سلف صالحین کا موقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے صفت محبت حقیقیہ ثابت ہے جو بلا تاویل و بلا تشبیہ۔ بلا تمثیل ہے البتہ زمخشری اور اس کے پیروکاروں کے نزدیک مراد ثواب، تعظیم اور ثناء ہے لیکن یہ سلف کے خلاف ہے: أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ یہ ذَلَّ کے مقابل ہے اور عزت سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ ذِلَّةٌ نرمی شفقت، رحم وغیرہ کے معنی میں ہے کیونکہ بعد میں ان کیلئے عزت کا ذکر ہوا ہے اور یہ سورۃ محمد آیت 29 کی طرح ہے۔ لفظ عَلَى میں دو فائدے ہیں۔ (1) معنیٰ شفقت ضمناً ثابت ہوتا ہے۔ (2) اگرچہ ان کے اپنے درجات بلند ہیں مگر پھر بھی مؤمنوں پر رحم کرتے ہیں: أَعِزَّةٍ اس میں شدت کے ساتھ عزت کا معنیٰ ہے: وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ یہ يُجَاهِدُونَ کی ضمیر سے حال ہے۔ واؤ حالیہ ہے یعنی جہاد قولی یا عملی ہو کسی کے لعن طعن کی پرواہ نہیں کرتے یا واؤ برائے عطف ہے تو پھر مستقل صفت ہے لیکن واؤ ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مجاہدہ کے وقت اس صفت کی اشد ضرورت ہوتی ہے: لَوْمَةَ لَائِمٍ اس کو نکرہ ذکر کرنے میں

اشارہ ہے کہ کسی قسم کا لعن طعن ہو اور کسی کی طرف سے ہو تو اس کی پروا نہیں کرتے بڑوں کی جانب سے یا چھوٹوں کی، والدین کی جانب یا اساتذہ کی جانب سے ہو، عورتوں کی جانب سے ہو یا مردوں کی جانب سے ہو: ذَٰلِكَ الخ۔ اس میں سابقہ صفتوں کی طرف اشارہ ہے۔

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ۝٥٥

"یقیناً تمہاری دوستی کا حقدار تو اللہ اور رسول اور ایمان والے ہیں اور وہ لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے اور وہ رکوع کرتے ہیں" [۵۵]۔

تفسیر 55 جب یہود و نصاریٰ کی دوستی سے منع کیا گیا اور براءت کرنے والوں کی صفات بیان ہو گئیں تو اب اس آیت میں ان کا ذکر ہو رہا ہے جو دوستی کے لائق اور مستحق ہیں اور بطریق حصر ذکر کیا ہے کہ إِنَّمَا: دوستی صرف اور صرف ان ہی سے کرنی ہے کسی اور سے نہیں: وَلِيُّكُمُ دینی دوستی مراد ہے۔ سوال: یہاں تو أَوْلِيَاءُكُمْ جمع کا صیغہ لانا چاہیے تھا؟ جواب: اشارہ ہے کہ اصل ولایت تو اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کی ہے اور ایمان والوں کیلئے تبعاً ہے: الَّذِينَ يُقِيمُونَ الخ ایمان کے ساتھ تین صفتوں کا ذکر ہوا ہے اشارہ ہے کہ جس میں یہ ساری یا بعض صفات موجود نہ ہوں تو وہ دوستی کا حقدار نہیں ہے لہٰذا اس سے بچ جاؤ: وَهُمْ رَاكِعُونَ اس صفت کو جملہ اسمیہ کے ساتھ اس لیے ذکر کیا ہے کہ یہ صفت ہمیشہ اور دائمی ہے تنبیہ: بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ يُؤْتُونَ کی ضمیر سے حال بنا ہے اور اس کی تائید میں علی رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کرتے ہیں لیکن امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس پر رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علماء میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دینا افضل ہے اور اس پر مزید احکام مرتب کرنا بے فائدہ بحث ہے۔ اور ابن کثیر نے مزید کہا ہے کہ ان آثار میں سے کوئی اثر صحیح سند سے منقول نہیں ہے مجہول راویوں سے منقول ہے یہ واقعہ موسیٰ بن قیس راوی کی وجہ سے ضعیف ہے یہ آیتیں عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہیں مگر یہ روایت مرسل بھی ضعیف بھی ہے۔ امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں اہل تشیع کا خوب رد کیا ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ ع

"اور جس نے اللہ اور اس کے رسول سے دوستی کی اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی جماعت ہی غالب ہے" [۵۶]۔

تفسیر 56 سابقہ آیت میں ذکر کردہ لوگوں کیلئے خوشخبری ہے: يَّتَوَلَّ اللّٰهَ، تَوَلّٰى سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر قائم رہنا اور اس کے رسول اور ایمان والوں کی نصرت کرنا: فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ . حِزْبٌ حقیقت میں اس قوم کو کہا جاتا ہے جو کسی واقعے میں جمع ہو جاتی ہے اور مضبوط جماعت کو کہا جاتا ہے لہٰذا یہ جماعت اور قوم سے خاص ہے۔ اس طرح سورۃ مجادلہ آیت 22 میں بھی ہے۔ سوال: یہاں پر غَالِبُوْنَ اور مجادلہ میں مُفْلِحُوْنَ فرمایا ہے؟ جواب: یہاں پر یہود و نصاریٰ کے ساتھ دنیا میں مقابلہ مراد ہے اور مقابلے کے وقت مقصد غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اور مجادلہ میں شیطان کی جماعت کیلئے خَاسِرُوْنَ فرمایا ہے تو اس کے مقابل مُفْلِحُوْنَ مناسب ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم دوست نہ بناؤ ان لوگوں کو جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنایا ہے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور کافروں کو بھی اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو" [۵۷]۔

تفسیر 57 اس آیت سے کافروں کے متعلق ان اسباب کا ذکر ہے جو ان سے دوستی کرنے کیلئے رکاوٹ ہیں اس آیت میں پہلا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ دین کے ساتھ مذاق اور استہزا کرتے ہیں اور اس کو کھیل قرار دیتے ہیں: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اس میں ایمان کی حفاظت کیلئے عقد ہے: هُزُوًا وَّلَعِبًا. هُزْءٌ اصل میں (خفت) حقارت کو کہتے ہیں جو بطور مذاق و ہنسی ہو۔ اور لَعِبًا یعنی اس کو بے فائدہ عمل تصور کرتے ہیں یعنی کھیل سمجھتے ہیں تو مراد اس مجموعہ کلام سے سارے دین اسلام کو کھیل اور استہزاء بنانا ہے یا مراد یہ ہے کہ ایمان والوں کے ایمان و عقائد کے ساتھ استہزا کرتے ہیں اور ان کے عمل کو کھیل سمجھتے ہیں جیسا کہ کمیونسٹ اور دیگر کافر مسلمانوں کی عبادات نماز حج وغیرہ کو کھیل قرار دیتے ہیں: مِنَ الَّذِيْنَ یہ سابقہ الَّذِيْنَ کیلئے بیان ہے جس میں کافروں کے دو گروہوں کا بیان ہے: وَالْكُفَّارَ اس میں تعمیم بعد التخصیص ہے تاکہ مشرکین بھی شامل ہوں: اُوْتُوا الْكِتٰبَ اس نام سے معروف تھے اس لیے انہیں کفار سے الگ ذکر کیا ہے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. اِنْ

بمعنی اِذ ہے یعنی ایمان کا تقاضا تقوی ہے۔

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

"اور جب تم پکارتے ہو نماز کیلئے تو وہ بنالیتے ہیں اس کو ہنسی اور کھیل یہ اس لیے کہ وہ بے عقل قوم ہے"[۵۸]۔

تفسیر 58 یہ اِتَّخَذُوْا پر عطف ہے۔ یہ دوسری علت کا ذکر ہے۔ یہ پہلے والی سے خاص ہے: وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ نماز کیلئے ندا مجمل ہے البتہ اس کی تفصیل احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے جو لفظ اذان سے معروف ہے لہٰذا یہ آیت اذان کی مشروعیت پر پانچ نمازوں کیلئے دلیل ہے: اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا کوئی اس (اذان) کو حیوانوں کی آواز سے تشبیہ دیتا ہے۔ کوئی اس سے مثل شیطان بھاگتا ہے کوئی اس پر عمل پیرا نہیں ہے یعنی جماعت میں حاضر نہیں ہوتا: لَّا يَعْقِلُوْنَ ان کلمات کے مقصد کو نہیں جانتے۔ اذان کے کلمات اللہ تعالیٰ کی کبریائی توحید ذات، توحید خالقیت، توحید اسماء، صفات، توحید حکم و تشریع پر مشتمل ہیں یہ چار اقسام چار تکبیروں میں داخل ہیں پھر توحید الوہیت پھر رسول کی صداقت کی شہادت ہے اور چونکہ شہادت دو بندوں کی ہونی چاہئے تو کلمات اذان بھی دو دو ہیں پھر صلوٰۃ کی طرف دعوت ہے جو کہ یہ عملی توحید کی ادائیگی کے لیے اہم عمل ہے پھر فلاح کے وصف کے ساتھ صلوٰۃ کی طرف ترغیب ہے اور اس کی اہمیت بھی اُجاگر کرنا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی کبریائی کیلئے دو شہادتیں ہیں تاکہ وہ شرکیات اور مشاغل ترک کیے جائیں جو توحید سے غافل کرتے ہیں اور پھر آخر میں خلاصہ و نتیجہ کلمات لا الٰہ الا اللہ ذکر ہوا ہے لہٰذا جو اس مقصد کو نہیں جانتے۔ تو وہ جاہل ہیں اور یہ جہالت سبب استہزا ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ: اَلنَّاسُ اَعْدَاءٌ لِمَا جَهِلُوْا: یعنی کسی چیز کی حقیقت سے بے خبری سبب مخالفت ہوتی ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾

"فرمادیجئے اے اہل کتاب نہیں تم ہم سے ناراض ہوتے ہو مگر اس وجہ سے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ ہماری طرف نازل کی گئی ہے اور وہ چیز جو نازل کیا گیا ہے اس سے پہلے اور یہ کہ تم میں سے اکثریت فاسق ہے"[۵۹]۔

تفسیر 59 اس آیت میں تیسری علت اور سبب مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ تمہاری دشمنی ہمارے ساتھ صرف اور صرف دین الٰہی کی وجہ سے ہے کہ ہم ایمان لائے ہیں لہٰذا تمہارے ساتھ ہماری دوستی نہیں ہوسکتی۔ نیز یہ آیت ماقبل آیت کیلئے بھی علت ہے یعنی اذان کا مذاق اور استہزا تو حقیقت میں توحید کے ساتھ دشمنی ہے کیونکہ اذان میں اعلان توحید ہے: هَلْ تَنْقِمُوْنَ

مِمَّا اِلَّا اَنْ الخ نَقَمُ اظہار ناراضی، نفرت، عیب جوئی، ناپسندیدگی وغیرہ کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں انتقام کا سبب صرف ایمان ذکر ہوا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ مشرکین اور کفار کی اصل دشمنی توحید سے ہے جیسا کہ آیت 126۔ سورۃ اعراف، سورۃ حج آیت 40 سورۃ بروج آیت 8 میں بھی ذکر ہوا ہے: وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ یہ سابقہ اَنْ پر عطف ہے یعنی ہمارا ایمان اور تمہاری بے ایمانی جنگ وجدال کا سبب ہے۔ فسق سے مراد کفر اور شرک ہے جو اہل کتاب میں عملی طور پر موجود تھا۔ یا لام مقدر ہے یعنی لِاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾

"آپ فرما دیجئے کیا میں تمہیں خبر نہ دوں جزا کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک اس سے بدتر کے۔ وہ شخص جس پر اللہ تعالیٰ غصہ ہوا اور اس پر لعنت کی اور ان میں سے بعض کو بندر اور بعض کو خنزیر اور شیطان کی عبادت کرنے والے بنائے یہ لوگ مرتبے کے اعتبار سے بدترین اور گمراہی کے اعتبار سے حق کے راستے سے بہت دور ہیں" [۶۰]۔

تفسیر 60 اس آیت میں دوستی نہ کرنے کی چوتھی علت کا ذکر ہے یعنی دین اور توحید والوں کو شر پسند قرار دینا حالانکہ یہ خود بدترین شر پسند ہیں۔ پہلی علت بے ٹھمت ناپسندیدگی باطنی تھی اور یہ ظاہری ہے۔ یہ اہل کتاب کافروں کا جواب ہے کیونکہ انہوں نے: لَا نَعْلَمُ دِيْنًا شَرًّا مِنْ دِيْنِكُمْ تمہارے دین سے زیادہ برا دین ہمیں معلوم نہیں ہے: بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ اس ذٰلِكَ میں دین توحید کی طرف اشارہ ہے جو اذان میں موجود ہے۔ سوال: لفظ مِن میں اشارہ ہے کہ شَرّ صیغہ تفضیل ہے اور اسم تفضیل کے صیغے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ شر و فساد دین اسلام و توحید میں بھی ہے؟ جواب: یہ کلام ان کے اعتقاد پر بنا ہے تو معنی یہ ہے کہ فرض کرو اگر ہمارے دین میں بقول تمہارے کچھ شر ہے لیکن تمہارے دین میں تو شر ہی شر ہے لیکن اس کو تم شر والا دین نہیں کہتے اور ہمارے دین کو شر قرار دیتے ہو: مَثُوْبَةً مَثُوْبَ تو خیر میں استعمال ہوتا ہے یہاں پر شر میں کیوں استعمال ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تَهَكُّمْ کے طور پر استعمال ہوا ہے اس میں کافروں کی تذلیل اور استہزاء ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ. مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ یہ مِنْ ذٰلِكَ سے بدل ہے۔ اس میں مضاف مقدر ہے یعنی دِيْنُ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ الخ۔ کیونکہ گفتگو دین کے متعلق ہو رہی ہے اور اس اضافت میں سببیت کی طرف اشارہ ہے یعنی ان کا دین جن پر لعنت کی گئی ہے اس میں وہ گناہ مراد ہے جو سبب لعنت بنا ہے جیسا کہ

قرآن مجید میں اس کا تذکرہ ہے حق چھپانا سورۃ بقرۃ آیت 159 یہ یہود کی عادت تھی: وَغَضِبَ عَلَيْهِ: وہ دین جو غضب الٰہی کا سبب بنا۔ جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت 61۔ اور 90۔ یہ بھی یہود کی عادت ہے۔ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ یعنی وہ دین جو ان کے چہروں کے بدلنے برباد ہونے اور بگاڑنے کا سبب بنا۔ اس میں مفسرین کے دو اقوال ہیں ایک قول یہ ہے کہ اصحاب السبت میں بندروں کی شکل میں چہروں کا بگاڑ ہوا تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ میں خنازیر کی شکل میں چہرے بگڑ گئے تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اصحاب السبت میں نوجوانوں کو بندروں کی شکل میں بدل گیا تھا اور بڑوں کو خنازیر کی شکل میں اس کا سبب سورۃ بقرۃ آیت 65 میں ہے: وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ اس قراءت میں عَبَدَ فعل ماضی ہے اور طاغوت مفعول ہے اور لفظ دین میں مَنْ مقدر ہے یعنی: دِيْنَ مَنْ عَبَدَ الطَّاغُوتَ: امام قرطبیؒ نے اس مقام میں بارہ قراءتوں کا ذکر کیا ہے۔ طاغوت میں بچھڑے کی عبادت، کاہنوں کی اطاعت اور ہر وہ اطاعت جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ہو وہ سب اس لفظ طاغوت میں شامل ہیں اور یہ تمام کام بنی اسرائیل میں عملاً موجود تھے: شَرٌّ مَّكَانًا ان کا ٹھکانا آخرت میں جہنم کی آگ ہے یا مکان مکانت کے معنی میں ہے یعنی ان کا حال خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں ہو: وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ: دنیاوی نتیجہ ہے اور شَرٌّ اور وَّ اَضَلُّ یہ اسم تفضیل ان کی سوچ و خیال کے اعتبار سے فرمایا ہے یا اسم تفضیل اصل فعل کے معنی میں ہے۔

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ۝۶۱

"اور جب وہ آتے ہیں تمہارے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ وہ کفر کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور اسی کے ساتھ نکل گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو وہ چھپاتے ہیں" [۶۱]۔

تفسیر 61 اس آیت میں پانچویں علت کا ذکر ہے اور شَرٌّ اور وَّ اَضَلُّ کی تفصیل ہے۔ اس میں وہ یہود مراد ہیں جو مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے اس طرح تلبیس کرتے تھے جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت 72 میں ذکر ہے: وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ اس میں اشارہ ہے کہ ان کے دلوں میں اتنا شر اور گمراہی ہے کہ وہ تمہارے علم سے باہر ہے جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت 118 میں گزرا ہے۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

"اور آپ دیکھتے ہیں بہت سارے ان میں سے جو جلدی کرتے ہیں گناہ اور ظلم کے کاموں اور حرام کھانے میں البتہ بہت برا ہے جو وہ اعمال کرتے ہیں" [۶۲]۔

تفسیر 62 یہ بھی ان کے شر اور ضلال کی دلیل ہے۔ اس میں چھٹی علت کا ذکر ہے: وَتَرٰى یہ دلیل ہے کہ ان کی گمراہی سب پر عیاں ہے: كَثِيْرًا بعض ایمان لائے تھے۔ اَلْاِثْمِ سے مراد گناہ پر مبنی ان کے اقوال ہیں جیسے اللہ کی طرف اولاد کی نسبت کرنا کہ اس کا بیٹا ہے، حُلُوْل اور تَثْلِيْث کا عقیدہ: وَالْعُدْوَانِ ظلم کے اعمال یعنی نبیوں کا قتل اسی طرح حق پرست علماء اور اہل توحید کا قتل اور تحریف کرنا: اَلسُّحْتَ عوام کا مال کھانا دین کے بدلے دنیا خریدنا: يُسَارِعُوْنَ مراد یہ ہے کہ انجام کے بارے میں سوچے بغیر اعمال بجالاتے ہیں: فِي الْاِثْمِ (فی) دلیل ہے کہ یہ لوگ ان کاموں میں منہمک اور مگن اور ان میں خوب غرق ہوئے ہیں۔

لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝

"کیوں منع نہیں کرتے ان کو گناہ کی بات اور حرام کھانے سے اللہ والے اور علماء البتہ برا تھا وہ جو کچھ کرتے تھے" [۶۳]۔

تفسیر 63 اس آیت میں ساتویں علت کا ذکر ہے یہ الگ قسم کی گمراہی صرف بڑے علماء کا جرم ہے اس لیے بغیر عطف کے ذکر کیا ہے: اَلرَّبّٰنِيُّوْنَ یہاں نصاریٰ کے رھبان مراد ہیں یا وہ لوگ جو دینداری کا پورہ دعویٰ کرتے ہیں یہودی ہوں یا نصاری۔ احبار بڑے علماء کو کہتے ہیں۔ اگر چہ وہ گناہوں سے خود اجتناب کرتے تھے مگر دوسروں کو منع نہیں کرتے تھے اسی طرح حرام خود نہیں کھاتے تھے مگر دوسروں کو منع نہیں کرتے تھے۔ سوال: یہاں عُدْوَانَ کا ذکر نہیں کیا؟۔ جواب ۱: اِثْمَ میں عُدْوَانَ: داخل ہے مگر کلام میں اختصار کیا گیا ہے یعنی کلام محذوف ہے۔ جواب ۲: یہ رَبّٰنِيُّوْنَ اور اَحْبَار ان گناہوں میں شریک تھے کیونکہ عدوان بدعات ہیں اور یہ توان کے علماء میں بڑے پیمانہ پر موجود تھیں۔ جواب ۳: عوام کا عدوان ان سے پوشیدہ تھا: لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ: امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ منکر سے منع نہ کرنے والا مرتکب کا شریک ہے جس کیلئے یہ آیت دلیل ہے اور یہ بھی دلیل ہے کہ نہی عن المنکر ایک مستقل فریضہ ہے جیسا: اَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ ہے بہذا ایک کی جگہ دوسرا کافی نہیں ہوسکتا۔ سوال: پہلی آیت میں يَعْمَلُوْنَ فرمایا اور اس آیت میں يَصْنَعُوْنَ: جواب: صناعت اس عمل کو کہا جاتا ہے جو ہمیشہ کیلئے معمول بنایا ہوا ہو اور اس میں اس کو تجربہ حاصل ہو جائے اور اس کو جائز سمجھتا ہو تو جب وہ نہی عن

المنکر نہیں کرتے تھے تو معلوم ہوا کہ اس کو اچھا تصور کرتے تھے اسی لیے ہمیشہ یہ روش جاری رکھی تھی۔ ابن جریر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قرآن مجید میں اس آیت سے بڑھ کر سخت اور آیت میرے نزدیک نہیں ہے اس لئے کہ ہم بھی نہی عن المنکر نہیں کرتے۔(استغفر اللہ العظیم)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٦٤﴾

"یہودیوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ بند کئے گئے ہیں ان کے ہاتھ اور وہ لعنت کئے گئے ہیں بسبب ان کی اس بات کے بلکہ اس (اللہ) کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے اور یقیناً زیادہ کریگا سرکشی اور کفر میں ان میں سے بہت سوں کو وہ (قرآن) جو اتارا گیا ہے آپ کی جانب آپ کے رب کی طرف سے اور ہم نے ڈال دی ہے ان کے درمیان عداوت اور بغض قیامت کے دن تک وہ جب کبھی لڑائی کیلئے آگ جلاتے ہیں تو اس کو اللہ تعالیٰ بجھاتا ہے اور وہ زمین میں فساد کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا" [۶۴]۔

تفسیر 64 اس آیت میں آٹھویں، نویں اور دسویں علت کا بیان ہے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ الخ علت 8، كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا: علت 9، وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ علت 10: يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ: یہ کنجوسی سے کنایہ ہے جیسا کہ سورۃ اسراء آیت 29 میں ہے اس قول میں ان کی جانب سے سخت ترین گالی گلوچ ہے اللہ تعالیٰ کی نسبت (نعوذ باللہ) اس کا سبب ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہود کے علماء اور عوام بہت مالدار تھے اس لیے کہ علماء دین کے نام سے خوب مال بٹورتے تھے اور عوام بھی حلال و حرام کے امتیاز کیے بغیر خوب کمائیاں کرتے۔ تو جب نبی اکرم ﷺ مدینہ کی طرف ہجرت کرکے تشریف لے آئے تو وہاں دین اسلام پھیل گیا اور غالب ہوا تو ان کی یہ آمدنی کم ہوگئی۔ اسلئے کہ اکثر لوگ ان سے الگ ہوکر مسلمان ہوئے تو انہوں نے یہ بات کہی حالانکہ کہنا یوں چاہئے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے ہاتھ روک لیا ہے اور ہم پر بخل شروع کی ہے جیسا کہ وہ بخل کی نسبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے تھے (سورۃ آل عمران آیت 181) اب بھی بہت سارے جاہل دنیا میں ہیں جب ان پر حرام کے دروازے بند ہوتے ہیں تو رزق کی تنگی میں اللہ تعالیٰ کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں: غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ: یہ جملہ دعائیہ ہے اور نیک بندوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ جب ان کی اس طرح کی باتیں سنیں تو یہ

کہا کریں اور یہ دعا قیامت میں مقبول ہوگی جیسا کہ سورۃ یٰسین آیت 8 میں ان کی ہاتھ ایک تفسیر کے مطابق گردنوں کے ساتھ باندھنے کا ذکر ہے اور سورۃ مؤمن آیت 71 میں بھی ہے۔ دنیا میں ظاہری معنی پر بھی کبھار جب مسلمان ان پر غالب آتے ہیں تو ان کے ہاتھ باندھ لیتے ہیں۔ مفسر نیشاپوری نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ یہودیوں کے ایک وزیر جو سعد الدولہ کے نام سے مشہور تھا دورے پر بغداد آئے اور مدرسہ مستنصریہ گئے اور قرآن مجید طلب کیا ان کو جب قرآن پیش کیا گیا تو اس نے کہا یہ آیت کہاں ہے (غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ) انہوں نے آیت دکھائی تو فوری انہوں نے منائی کچھ عرصہ گزرنے کے بعد کسی بات پر بادشاہ سے اختلاف ہوا جس کی وجہ سے بادشاہ نے پولیس کے ذریعے اس کے ہاتھ گردن اور گدی کے ساتھ باندھ کر قتل کیلئے طلب کیا اور بندھی ہوئی حالت میں اس کو قتل کروادیا اور اس طرح قرآن مجید کا اعجاز ثابت ہوا۔ دنیا میں بطور کنایہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی یہ بخل میں مبتلا ہوں یہی وجہ ہے کہ یہودیوں سے زیادہ دنیا میں کوئی بخیل قوم نہیں ہے: وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا: یہودیوں پر لعنت کے آثار تو بہت ظاہر ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونگے قول سے مراد لفظ مَغْلُولَةٌ ہے۔ جس نے کہا کہ قول سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے انہوں نے ہاتھ ثابت کیا ہے یہ قول باطل ہے اس لیے کہ يَدَانِ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے خود ثابت کیا ہے۔ امام سمعانی نے تفسیر میں لکھا ہے کہ اہل علم نے کہا ہے کہ یہودیوں کا رد اس لیے نہیں ہوا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کیلئے ہاتھ ثابت کیا ہے بلکہ ان کا رد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخل کی نسبت کرنے سے ہوا ہے۔ باقی رہا اللہ تعالیٰ کیلئے صفت ید تو وہ اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات کی طرح بِلَا كَيْفٍ ثابت ہے جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دونوں ہاتھ دائیں ہیں: كِلْتَا يَدَيْهِ يَمِينٌ: صحیح مسلم کتاب الامارۃ حدیث 1827۔ نسائی، احمد کیفیت اور مراد پر اللہ ہی عالم ہے (ہم تو ظاہری نص پر ایمان لانے کے مکلف ہیں) تفسیر روح المعانی جلد 2 ص 51: بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ، مَبْسُوطَةٌ بمقابل مَغْلُولَةٌ ہے یہ ان کے باطل قول کا رد ہے۔ اللہ تعالیٰ کیلئے صفت يَدَيَّ سورۃ ص آیت 75 اور دیگر مقامات میں بھی ہے حدیث میں بہت جگہ مذکور ہے بلکہ صیغہ جمع میں بھی سورۃ یٰسین آیت 71 میں مذکور ہے امام ابن عبد البر نے شرح موطا تمہید میں لکھا ہے کہ سلف صالحین کا اس بات پر اجماع ہے کہ صفات کی آیات و احادیث پر ایمان لانا اور ان کی حقیقت کا اقرار کرنا اور حقیقت پر محمول کرنا بلا کیفیت تاویل و تشبیہ قبول کرنا لازم ہے اور ان میں تاویل و تشبیہ اہل بدعت معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ کی روش ہے۔ امام ابو الحسن اشعری نے اپنی کتاب الابانۃ میں لکھا ہے کہ سلف صالحین نے صفات کے متعلق مذکور بیان کردہ موقف اختیار کیا ہے اور خود بھی امام ابو الحسن نے

پسند کیا ہے نیز شرح فقہ اکبر میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف ذکر کیا ہے کہ یَدٌ کی تاویل قدرت سے کرنا درست نہیں ہے۔ تفسیر خازن میں آیت ھٰذا کے تحت اچھا تفصیلی کلام ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جمہور سلف اور اہل سنت اور بعض متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ ید (ہاتھ) اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے جیسا کہ سمع (سننا)، بصر (دیکھنا) وجہ (چہرہ) ہے لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ اس پر ایمان لے آئیں اور جیسا قرآن وسنت میں ہے ویسا مانیں بغیر تشبیہ، کیفیت اور تعطیل۔ دوسرا قول جمہور متکلمین اور اہل تاویل کا ہے کہ ید کی تاویل قدرت اور نعمت سے کی جائے گی اور اس بات میں بہت سوال جواب انہوں نے نقل کیے ہیں اور بحث کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ بات ثابت ہوئی کہ ید اللہ تعالیٰ کی باقی صفتوں کی طرح صفت ہے جیسا اللہ ذوالجلال کیلئے لائق وثابت ہے اور مجسمہ کی طرح انسان کے ساتھ تشبیہ نہیں دے سکتے: یُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ: یہ تائید ہے اس مقصد کیلئے جو مَبْسُوْطَتٰنِ: میں مذکور ہے اور اشارہ ہے کہ وہ اپنی حکمت کے مطابق خرچ کرتا ہے لہٰذا اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا: وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا: اس میں قرآن کی طرف نسبت سببیہ ہے جیسا کہ آیت 125 سورۃ توبہ اور سورۃ اسراء آیت 82 میں ہے۔ یعنی سرکشی اور طغیان میں تو پہلے سے ہیں مگر جب قرآن مجید کی آیت کا یا سورۃ کا نزول ہوتا ہے تو اس سے انکار وسرکشی سے ان کی طغیانی اور گمراہی میں اضافہ ہوتا ہے یعنی کفر پر اصرار کرنا اور ایمان سے انکار کرنا یہ ان کی سرکشی میں اضافہ کے اسباب ہیں طُغْيَانًا حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں جو کفر تک رسائی کا سبب ہے اس لیے بعد میں کفر ذکر کیا ہے یا مراد یہ ہے کہ ان کے مولویوں میں سرکشی بڑھ جاتی ہے اور عوام میں کفر۔ سابقہ جملہ کی مناسبت سے اشارہ ہے کہ ان کے دیگر کفریہ کاموں کے ساتھ جو کہ گذشتہ آیتوں میں بیان ہوئے ہیں اس میں مزید اضافہ کیلئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بے ادبی کی ہے: وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: یعنی یہود ونصاریٰ کے درمیان بغض ودشمنی ہے اسی طرح نصاریٰ اور یہود کے جو فرقے ہیں ان کے آپس میں اختلافات بہت زیادہ ہیں اور سب ان کا دین میں اختلاف ہے۔ سوال: آیت 51 میں گزرا ہے کہ ان میں دوستیاں ہیں۔ جواب: وہاں کفر کے کاموں میں مشابہت اور مسلمانوں کے مقابل ایک دوسرے کا تعاون مراد ہے اگرچہ آپس میں بغض، عداوت اور دشمنی ہے۔ سوال: اس قسم کی گروہ بندی اور دشمنیاں تو اس امت میں بھی ہیں تو پھر صرف ان کا تذکرہ کیوں کیا گیا ہے؟۔ جواب ا: ان کا ذکر بطور عبرت ہوا ہے کہ اے ایمان والو ان کی طرح مت ہونا لہٰذا جن ایمان والوں نے قرآن وسنت پر پورا عمل کیا ہے یا کرتے ہیں وہ تفرقات اور گروہ بندی سے اجتناب کرتے

ہیں۔ جواب ۲: خازن نے لکھا ہے کہ انہوں نے دشمنی تو نزول کتاب کے وقت کی ہے جبکہ ہماری امت میں نزول قرآن کے وقت صحابہ کرام میں کوئی دشمنی نہیں تھی پھر تابعین اور تبع تابعین کے ادوار میں کوئی اختلافی فرقے نہیں تھے: عَدَاوَةً ظاہر دشمنی اور بغضاء دل کا حسد مخفی دشمنی ہے: يَوْمِ الْقِيٰمَةِ سے مراد قرب قیامت ہے جو نزول عیسٰی علیہ السلام کا زمانہ ہے كُلَّمَا اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ: اس میں اشارہ ہے جیسا ان کی آپس میں دشمنی ہے تو اس سے بڑھ کر ایمان والوں سے دشمنی ہے: نَارًا لِّلْحَرْبِ: مراد اسباب جنگ اور مختلف چال وفریب ہے: اَطْفَاَهَا اللّٰهُ: اس میں اشارہ ہے کہ ان کا شر کسی نہ کسی طریقے سے مٹاتا ہے کبھی ایمان کو غلبہ دیتا ہے اور ان پر ان مومنوں کا رعب غالب کرتا ہے جیسا کہ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ: عنقریب ان لوگوں کے دلوں میں ہم خوف ڈال دینگے جنہوں نے کفر کیا ہے یہ اشارہ ہے کہ انہوں نے احد، احزاب، غزوہ بنو قریظہ، بنو نضیر میں ہر قسم کی سازشیں کی تھیں مگر سب رائیگاں گئیں اور وہ ذلیل ہوئے: وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا: قرآن وسنت اور دین اسلام سے لوگوں کو منع کرتے رہنا اور اس کے مقابل یہودیت ونصرانیت کا پرچار اور اشاعت کرتے ہیں یہ سب زمین میں فساد ہے اس لیے کہ یہ غلبہ کفر کیلئے اسباب ہیں جبکہ کفر پوری عالم کیلئے خرابی کا سبب ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾

"اور یقیناً اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں اور تقوی اختیار کرلیں تو یقیناً ہم دور کردینگے ان سے ان کے گناہ اور ضرور ہم ان کو نعمتوں والی جنت میں داخل کرینگے" [۶۵]۔

تفسیر 65 ان سے دوستانہ تعلق نہ رکھنے اور اس کے اسباب بیان کرنے کے بعد اب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ حق دین کو قبول کرو تقوی اختیار کرو۔ ساتھ میں آخرت کی بشارت بھی دی ہے: اٰمَنُوْا سے صحیح ایمان مراد ہے یعنی اللہ تعالی اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کما حقہ ایمان لائیں: وَاتَّقَوْا: جو کفریات و بداعمالیاں سابقہ آیتوں میں گزر گئیں ان سے بچو: سَيِّاٰتِهِمْ اس سے تمام گناہ مراد ہیں کبیرہ وصغیرہ اور بری صفات وغیرہ اس لیے کہ قبولیت اسلام سے سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں: لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ: عذاب سے بچانے کی طرف اشارہ ہے اور: وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ میں ثواب واجر کے حصول کی طرف اشارہ ہے۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ

مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿٦٦﴾ ع

''اور اگر وہ (عملاً) قائم کرتے تورات اور انجیل کو اور جو کچھ نازل کیا گیا ہے ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے تو ضرور وہ کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے ان میں سے ایک گروہ حق پرست ہے اور اکثر ان میں سے برا عمل کرنے والے ہیں''[٦٦]۔

تفسیر 66 یہ دعوت دنیاوی بشارت کے طور پر ہے اس آیت میں تقویٰ کی تعبیر کتب آسمانی کی اقامت کیساتھ ذکر کیا ہے کیونکہ کتب الہیہ کے قیام میں ایمان وتقویٰ داخل ہیں۔ اس کے ساتھ دعوت اور قانون الٰہی کو جاری کرنا بھی مراد ہے اور جب یہ آخری سابقہ سے مل جائے یعنی دعوت اور نفاذ شریعت تو پھر دنیاوی انعامات بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح سورۃ اعراف آیت 96، سورۃ ہود آیت 3، آیت 52، سورۃ نوح آیت 11 اور 12، سورۃ جن آیت 16 میں بھی یہی مضمون ہے۔ أَقَامُوا الخ اقامت سے مراد تصدیق وعمل کرنا اور اس کو نافذ کرنا ہے یعنی لوگوں میں دعوت و جہاد اور تحکّم کے ذریعے جاری کرنا ہے۔ سوال: تورات وانجیل تو منسوخ ہیں تو پھر کیوں ان کے نافذ کرنے کا حکم ہوتا ہے؟۔ جواب ۱: مراد یہ ہے کہ اس زمانے میں جاری کرنا مقصود تھا جب ان کا دور تھا جبکہ قرآن نازل ہونے کے بعد کسی اور کتاب کی اقامت کی بات نہیں ہوتی۔ جواب ۲: اس سے مراد اصول وایمانیات ہیں جو تمام کتابوں میں یکساں ہیں لہٰذا وہ منسوخ نہیں ہیں کیونکہ تورات وانجیل میں آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے کا حکم موجود ہے: لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ: فَوْق سے مراد ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً بارشیں ہیں وہ سب خیر و برکت ہیں اور تحت سے فصلیں پھل میوہ جات مراد ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ فوق سے میوہ جات مراد ہیں جو درختوں میں لگے ہوتے ہے جیسے آم، امرود وغیرہ اور تحت سے زمین پر پیدا ہونے والے جیسے زمین پر بیلوں میں پڑے ہوئے ہوتے ہیں: مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ: اس طرح سورۃ اعراف آیت 159 اور سورۃ حدید آیت 27 میں بھی ہے۔ اقتصاد (میانہ روی اور اعتدال ہے) یعنی عقیدہ وعمل میں افراط وتفریط نہیں کرتے جیسا کہ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تفریط اور نصاریٰ نے افراط کیا تھا اور اس میں غلو بھی نہ ہو جیسا کہ مذکورہ دونوں گروہوں نے اعمال وعقائد میں غلو کیا تھا۔ لہٰذا اقتصاد سے مراد کامل توحید اور کامل سنت پر عمل کرنا مراد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ؀

"اے رسول ﷺ پہنچا دیں جو آپ پر نازل کیا گیا آپ کی جانب آپ کے رب کی طرف سے اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ نے نہیں پہنچایا اس کا پیغام اور اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت کرے گا لوگوں سے بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا آپ سے آگے پر کافر قوم کو" [67]۔

اس آیت سے سورۃ کا تیسرا حصہ سورۃ کے اختتام تک ہے اس میں دو باب ہیں پہلا باب آیت 67 تک ہے۔ اس حصہ میں پہلے نبی کریم ﷺ کو دعوت و تبلیغ پر ترغیب اور جرأت دینے کیلئے خطاب ہے اور خطاب کیلئے مخاطب تبلیغ ہے پھر اہل کتاب کیلئے توبیخ تنبیہ ہے اس بات پر کہ انہوں نے آسمانی کتابوں کو چھوڑ دیا قرآن پر فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ آیت 70 اور 71 میں پھر دوسرا مسئلہ آیت 72 میں اور تیسرا مسئلہ آیت 73 میں خصوصی پر شرک کا حکم دیا گیا ہے پھر آیت 74 میں توبہ کی ترغیب ہے اور آیت 75 میں عیسیٰ و مریم علیہا السلام کی عبودیت بیان ہے پھر چوتھا مسئلہ شرک کی حرمت و حقیقت کا ہے آیت 76 پھر تین آیتوں میں دنیاوی اور اخروی عذاب سے تخویف کا ذکر ہے اور ان کے ساتھ سب عذاب مذکور ہیں پھر قرآن کی خوشخبری ہے آیت 82 سے 85 تک۔

تفسیر 67 اس آیت میں نبی کریم ﷺ سے تین طریقوں سے خطاب ہے اور تاکید ہے دعوت و تبلیغ کی۔ پہلا طریقہ امر بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ: اس میں اشارہ ہے کہ خطاب تبلیغ قرآن و سنت ہے۔ اس سے مراد تمام دین کی تبلیغ ہے اور دعوت دینے اور بہادری کی راہ پر چلنے کا حکم ہے اور یہ دعوت کسی کے خوف و حزن سے بے پرواہ ہو کر دینی ہے، جیسا کہ سورۃ حجر آیت 94 میں بھی یہ مقصد ہے۔ نبی پر تبلیغ فرض عین ہوتی ہے اور امت پر مختلف مراتب میں ہے۔ دوسرا طریقہ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ: مراد یہ ہے کہ اگر آپ نے تبلیغ میں کسی کی رعایت کی یا جرأت مندی سے دعوت نہیں دی یا جزا نہیں دی یا بعض لوگوں کو خاص کیا تو: فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ: یعنی آپ کی رسالت قبول نہیں ہے آپ نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔ مفسر سمعانی نے لکھا ہے کہ یہ دلیل ہے کہ بالفرض اگر نبی کوئی مسئلہ چھوڑ دیتا تو اس کے چھوڑنے اور سارے دین کو چھوڑنے کا جرم برابر ہے۔ قرطبی نے فرمایا یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مبلغین کیلئے تادیب ہے کہ مَآ اُنْزِلَ شریعت اسے کوئی بات نہیں چھپائیں گے۔ (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4612 صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 177 ترمذی کتاب التفسیر حدیث

3068) روایت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے کہ جس نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے مَا اُنْزِلَ سے کچھ چھپایا ہے تو اس شخص نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا جھوٹ بولا ہے جس کی دلیل یہ آیت ہے اور امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ یہ روافض (شیعہ) کا رد ہے (اللہ تعالیٰ ان کو رسوا کرے) کبھی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (تقیہ) وحی کا ایک حصہ مخفی رکھا ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کو نبی نے خاص علوم سکھائے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے دس پارے علی کی خلافت کے بارے میں تھے وہ اس نبی ﷺ نے چھپائے ہیں (لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ) مبتدعین کا بھی رد ہے انکا خیال ہے کہ نبی نے پورا دین نہیں پہنچایا ہے اس لیے وہ آئے دن مسائل گھڑتے رہتے ہیں اور بدعات ایجاد کرتے ہیں۔ (سوال): وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ: فعل سے تبلیغ مراد ہے۔ سوال: اس میں شرط اور جزا دونوں ایک ہی چیز ہے؟۔ جواب: یہ بات پہلے معلوم ہوئی کہ تبلیغ سے مراد مقید چیز ہے یعنی وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ: میں نفی مقید تبلیغ کی مراد ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر آپ نے مکمل وحی نہیں پہنچائی دلیری سے نہیں پہنچائی کسی کا لحاظ کئے بغیر نہیں پہنچائی تو نفی خاص سے عام کی نفی ہوسکتی ہے تو معنی یہ ہوگا کہ اگر آپ ﷺ نے دین کا کچھ حصہ نہیں پہنچایا تو بقیہ نہ پہنچایا ہوا شمار ہوگا گویا آپ ﷺ نے تبلیغ کی ہی نہیں: وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ: تاکید کا یہ تیسرا طریقہ ہے یعنی دعوت دینے میں آپ کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ سوال: نبی اکرم ﷺ کو جنگ احد اور مکی زندگی اور دیگر اوقات میں بہت تکلیفیں و اذیتیں ملی ہیں تو یہ کیسی حفاظت ہے؟۔ جواب ا: اس سے مراد قتل ہے یعنی آپ کو ہر قسم تکلیفیں دعوت میں پہنچائی گئی ہیں اس میں اشارہ ہے کہ دعوت کے ساتھ یہ چیزیں منسلک ہیں البتہ قتل سے نبی کو اللہ تعالیٰ نے بچایا ہے اس میں اشارہ ہے کہ داعی اپنی دعوت میں اذیتیں برداشت کرے مگر خود کو قتل ہونے سے بچاتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ: اس میں داعی کیلئے اشارہ ہے کہ وہ دعوت کو خوش اسلوبی کے ساتھ پہنچائے جبکہ ہدایت دینے کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔ کافر سے ضدی عنادی کافر مراد ہیں جیسے یہود و نصاریٰ یا ہدایت سے مراد نبی کے قتل پر طاقت دینا ہے اور کٰفِرِيْنَ سے عام کافر مراد ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کافروں کو نبی کے قتل کی طاقت نہیں دیتا ہے۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

"فرما دیجئے اے اہل کتاب تم کسی دین پر نہیں ہو جب تک عمل نہ کرو تورات، انجیل اور اس پر جو نازل کیا گیا تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اور یقیناً زیادہ کریگا ان میں سے بہت سارے لوگوں کو وہ (قرآن) جو نازل کیا گیا تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے کفر و سرکشی میں لہذا آپ کافر لوگوں پر غم نہ کھائیں" [۶۸]۔

تفسیر 68 دعوت و تبلیغ کے مسائل میں سے یہ پہلا مسئلہ ہے اور بَلِّغْ کی تشریح ہے: لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ: وہ چیز مراد ہے جس کا دین میں اعتبار ہو اور فائدے والی ہو کثرت مبالغہ کی وجہ سے مطلق شیئیت سے ہی اس کو نکال دیا ہے یعنی تم جس کو دین کہتے ہو اس کو تو کوئی چیز تک نہیں کہا جاسکتا چیز کا لفظ اس پر نہیں بولا جا سکتا: حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ: پہلے اقامت دین کا فائدہ ذکر ہوا ہے اور اب دین قائم نہ کرنے کی توبیخ اور ڈانٹ کا بیان ہے۔ تمام کتابوں کو قائم کرنے میں توحید آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانا داخل ہے۔ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں سفیان رحمہ اللہ کا قول ہے کہ مجھ پر قرآن میں اس سے سخت آیت نہیں ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اس خطاب میں امت کے علماء بھی داخل ہیں: وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ: آیت 64 میں کثیر یہود کے علماء مراد تھے جبکہ یہاں سب اہل کتاب مراد ہیں۔ وہاں کفر اور طغیان سے اللہ تعالیٰ کی بے ادبی مراد تھی جبکہ یہاں کفر اور طغیان سے تحریف مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے حق دین کو قائم کرنے کے بجائے لوگوں سے چھپاتے تبدیل کرتے اور کتمان تحریف اور تغیر کرتے ہیں: فَلَا تَاْسَ: حق بیان کرنے کے باوجود لوگ نہیں مانتے بلکہ مزید کفر و سرکشی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں تو ایسے لوگوں پر آپ غم نہ کریں یعنی اس کفر کی وجہ سے ان پر عذاب آئیگا آپ ان کی ہلاکت کی پرواہ مت کریں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

''بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور جو بے دین ہوئے اور جو نصاریٰ ہوئے ان میں سے جو بھی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت والے دن پر اور صالح اعمال کئے تو نہ ہی ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمزدہ ہونگے'' [۶۹]۔

تفسیر 69 ربط: سابقہ آیت میں إِقَامَةُ الْكِتَابِ کی عظمت اور شان ذکر ہوئی تو اب اس کی تفسیر ایمان اور صالح اعمال کے ساتھ کی جارہی ہے تو فرمایا کہ یہ نجات کا سبب ہے۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ کتب الہیہ کا قیام صرف نسبتوں تک نہیں ہے کہ کوئی خود کو موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرے تو کوئی یحییٰ علیہ السلام کی طرف تو بعض عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اور آخری امت خود کو محمد ﷺ کی طرف منسوب کرے ان نسبتوں میں فائدہ ہے مگر جب اس کے ساتھ ایمان اطاعت رسول اور عمل صالح شامل ہو۔ سوال: چاہیے تو یہ تھا کہ صابئین بھی فرمادیتا اس لیے کہ اس کو الَّذِينَ آمَنُوا پر عطف کیا ہے جو کہ إِنَّ کا اسم ہے اور إِنَّ کا اسم نصب کے محل میں ہے؟۔ جواب ۱: یہ اسم کے محل بعیدہ پر عطف ہے اور وہ رفع ہے اس لیے کہ درمیان میں: وَالَّذِينَ هَادُوا: کے ذریعے فاصلہ آیا ہے یہ کوفیوں کے نزدیک اور امام کسائی کا قول ہے۔ جواب ۲: یہ پہلے جملے کے درمیان محذوف مبتداء کی خبر ہے یعنی وَالصَّابِئُونَ كَذَٰلِكَ: اور اس عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے یعنی ان کی خبر کے بعد یہ جملہ ہے۔ (سوال) اس لفظ کی تبدیلی یعنی رفع میں لانے کی کیا حکمت ہے؟۔ جواب: وجہ یہ ہے کہ صَابِئُونَ ان سب سے کفر اور بے دینی میں سخت تھے کیونکہ انہوں نے ساری آسمانی دینوں اور کتابوں کو چھوڑ دیا تھا لہٰذا ان کو ایمان اور عمل صالح کی شرط سے معافی دینے کا وعدہ کیا تھا تو ظاہر بات ہے کہ یہودیوں کے لیے بدرجہ اولیٰ معافی کا وعدہ ہوگا۔ سوال: سورۃ بقرہ آیت 62 میں اس لفظ کو بعد میں ذکر کیا ہے اور یہاں پہلے ذکر کیا ہے؟۔ جواب: چونکہ صَابِئُونَ یہود ونصاریٰ کے درمیان پیدا ہوئے ہیں اور اپنی نسبت زبور کی طرف کرتے ہیں تو سورۃ بقرۃ میں پہلے طرفین کا ذکر کیا گیا ہے پھر درمیان والوں کا ذکر ہوا اور یہاں پر بالترتیب ذکر ہوا ہے۔ سوال: سورۃ حج آیت 16 میں اس کے ساتھ: الْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا: بھی ذکر ہوا ہے جبکہ ان دو مقامات میں مجوس ساتھ نہیں ہیں؟۔ جواب: ان دونوں سورتوں میں ان جماعتوں کی نجات کا راستہ بتایا ہے جو اپنی نسبت آسمانی کتابوں کی طرف کرتے ہیں اور سورۃ حج میں صرف فرقوں کا ذکر

ہے۔ جو ایمان والوں کے مقابل ہیں اور مقصد صرف ان کی قسموں کو ذکر کرنا ہے: صَابِئِیْنَ کی تفسیر سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے: مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ: اس میں اعراب کے لحاظ سے دو اقوال ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ اِنَّ کیلئے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: اسم ہے اور وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا عطف ہے اور مَنْ اٰمَنَ الخ تک خبر ہے اور ضمیر مِنْھُمْ کی صورت میں مقدر ہے دوسرا قول یہ ہے کہ مَنْ اٰمَنَ آخر تک وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا: سے بدل ہے اور اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ خبر ہے۔ پہلے قول کی بناء پر اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: میں صرف ایمان کا دعوی کرنے والے مراد ہے یعنی منافقین اور دوسرے قول کی بناء پر مطلق ایمان والے مراد ہیں: فَلَا خَوْفٌ جنت میں مراد ہے یعنی عذاب کا خوف نہیں اور دنیا کا غم نہیں۔ یا مراد یہ ہے کہ سابقہ گناہوں کا خوف نہیں ہوگا اور نہ ہی حالت کفر میں نیکیوں کے ضائع ہونے کا افسوس کرینگے کہ ان کے گناہ نیکیوں میں بدل گئے ہونگے اس قول کی تفسیر مھائمی نے تبصیر الرحمان میں کی ہے۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝

"یقیناً ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ وعدہ لیا تھا اور بھیجے ان کی طرف کئی رسول جب بھی کوئی رسول ان کے پاس ایسی چیز لایا جو ان کے نفس نہیں چاہتے تھے تو بعض کو تو انہوں نے جھٹلایا اور بعض کو قتل کر ڈالتے" [۷۰]۔

تفسیر 70 یہ ایک سوال کا جواب ہے یعنی اہل کتاب نے دعوی کیا کہ ہم نے کتاب کو عملاً نافذ کیا ہے کیونکہ ایمان اور عمل صالح ہمارے پاس ہے تو اس آیت میں اشارہ ہے کہ تمھارا: اِقَامَۃُ الْکِتَابِ کا دعوی درست نہیں ہے نہ تمہارا ایمان صحیح ہے اور نہ ہی اعمال صالح بلکہ تم نے تو میثاق توڑ ڈالا ہے اور نبیوں کی تکذیب کی ہے اور انہیں قتل کر چکے ہو تم ایمان کا دعوی کرتے ہو جبکہ ایمان وعمل صالح اور نبیوں کی تکذیب اور ان کا قتل یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں نبیوں کو جھٹلانا اور قتل کرنا کفر ہے۔ میثاق بنی اسرائیل جس کا ذکر سورۃ بقرہ آیت 63، 83 اور 84 میں گزرا ہے: وَاَرْسَلْنَآ اِلَیْھِمْ رُسُلًا: رسولوں کو ارسال کرنے کا مقصد ان کو وعدے کی یاددہانی تھی: کُلَّمَا جَآءَھُمْ رَسُوْلٌ: اس میں نبی کی وعدہ خلافی پر زجر اور ڈانٹ ہے: بِمَا لَا تَھْوٰٓی اَنْفُسُھُمْ: احکام شرعیہ ہمیشہ خواہشات نفسانی کے خلاف اور توحید وسنت پر مشتمل ہوئے ہیں یَقْتُلُوْنَ یہ واضح دلیل ہے کہ بنی اسرائیل نے بہت سارے نبیوں کو قتل کیا ہے۔ فعل مضارع اس لئے ذکر کیا ہے کہ آخری نبی کے قتل کے درپے تھے: فَرِیْقًا دو جگہ فعل سے مفعول کو مقدم کیا ہے اس طرح آیت سورۃ بقرہ آیت 87 میں بھی ہے۔ سورۃ بقرہ

میں یہودیوں کی خباثتوں کو ذکر کرنا مقصود تھا تو وہاں تاکید کیلئے قَفَّيْنَا فرمایا ہے اور یہاں أَرْسَلْنَا فرمایا ہے اور ان کی خباثتوں کی تفصیل بیان کرنے کے لیے عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ذکر ہوا ہے یہاں پر تاکید مقصود نہیں ہے صرف ان کی وعدہ خلافی بیان کرنا مقصود ہے۔

وَحَسِبُوٓا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِّنْهُمْ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝

"اور انہوں نے گمان کیا کہ (اس گناہ کی وجہ سے ہم پر) کوئی عذاب نہیں ہوگا تو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے پھر ان پر اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی پھر زیادہ لوگ ان میں سے اندھے اور بہرے ہو گئے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ خوب دیکھنے والا ہے" [۷۱]۔

تفسیر 71 سابقہ آیت سے ربط اور تعلق یہ ہے کہ یہ تکذیب کی بیماری ان میں مستقل باقی رہی اور اس کا سبب ان کا یہ خیال یا خوش فہمی تھی کہ ان پر کوئی عذاب نہیں ہوگا: أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ: عذاب اور امتحان کے معنی میں ہے اور تَكُونُ كَانَ وجودی کے معنی میں ہے جو صرف فاعل چاہتا ہے۔ ان کے خیال کے بہت اسباب تھے۔ (1) انکا کہنا تھا کہ: نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ: جو اس سورۃ میں گزرا ہے۔ (2) انکا یہ عقیدہ تھا کہ کوئی رسول اگر ان کے دین کے خلاف ذرہ بھی مخالف پیغام لیکر آجائے تو وہ واجب القتل ہے۔ (3) انکا یہ عقیدہ تھا کہ ہمارے آباؤ اجداد ہم سے عذاب ہٹا لینگے۔ تفسیر خازن عَمُوا وَصَمُّوا: حق سے اندھے اور بہرے ہونا مراد ہے یعنی انہوں نے خود کو جنتی تصور کیا تو حق کو سننا یا دیکھنا چھوڑ دیا کیونکہ جو کوئی اپنے خود کو بخشا بخشایا سمجھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو نہیں سنتا: ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ: تفسیر ابو سعود میں ہے کہ اس توبہ کی نسبت ان کی طرف نہیں کی اس میں اشارہ ہے کہ انہوں نے توبہ نہیں کی بلکہ اللہ تعالیٰ نے دین کی تجدید کیلئے اور رسولوں کو بھیجا تھا۔ انکا توبہ کرنا یا نہ کرنا برابر تھا: ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِّنْهُمْ: بعض آخری نبی پر ایمان لائے تھے اس لیے کثیر کہا ہے لفظ کثیر عَمُوا وَصَمُّوا سے بدل ہے یا مقدر مبتداء کیلئے خبر ہے اور یہ ترکیب سورۃ انبیاء آیت 3 وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا: کی طرح ہے بعض علماء نے پہلے والے: صَمُّوا وَعَمُوا سے بچھڑے کی عبادت مراد لی ہے اور دوسرے سے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ مراد لیا ہے لیکن یہ قول درست نہیں ہے بلکہ اس میں بنی اسرائیل کی اس تاریخ کی طرف اشارہ ہے جو پچھلی آیت میں گزرا ہے کہ ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیجا تو انہوں نے جھٹلا کر قتل کیا پھر اللہ تعالیٰ نے اور رسول روانہ کئے پھر انہوں نے قتل کیئے یعنی مسلسل اللہ تعالیٰ رسولوں کو ارسال فرماتا اور بنی اسرائیل ان کو قتل کرتے

یا انکار کرتے ۔ مفسر قفال کا قول ہے کہ اس آیت کی تفسیر سورۃ بنی اسرائیل میں آیت 4 سے 7 تک ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّى وَرَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُۥ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَىٰهُ النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّٰلِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿٧٢﴾

"البتہ تحقیق وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے اور مسیح نے کہا اے بنی اسرائیل تم اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے جو بھی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے تو اللہ تعالی نے اس پر جنت حرام کی ہے اور اسکا ٹھکانہ آگ ہے اور نہیں ہے ظالموں کیلئے کوئی مددگار" [۷۲]۔

تفسیر 72 یہ تبلیغ کے اعتبار سے دوسرا مسئلہ ہے جس میں نصاریٰ کا کفر واضح کیا ہے اور ان کو بزبان عیسیٰ علیہ السلام توحید کی دعوت دی ہے اس میں انکا اندھا و بہراپن آخری نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے کا ہے: إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ آیت 17 میں بھی اس طرح ذکر گزرا ہے وہاں عقیدہ شرک فی التصرف کا رد ہے اور یہاں شرک فی العبادۃ کا رد ہے اسی لیے بعد میں عیسیٰ علیہ السلام کا قول رد شرک فی العبادۃ ذکر ہوا ہے۔ یہ قول فرقہ یعقوبیہ اور ملکانیہ کا تھا یہ نصاریٰ میں سے دو گروہ تھے جن کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالی نے عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کیا ہے لہذا عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت اللہ ہی کی عبادت ہے چونکہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام مستقل الہ ہے ورنہ پھر کلام اس طرح ہوتا: إِنَّ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ هُوَ اللَّهُ: کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے۔ یہ عیسیٰ علیہ السلام سے رد شرک میں منقول دلیل ہے: رَبِّي وَرَبَّكُمْ: اس عطف میں عقیدہ حلول کے رد کی طرف اشارہ ہے: إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ: یہ بھی عیسیٰ علیہ السلام کے کلام میں داخل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ شرک جیسا بھی ہو ہر قسم کا شرک جنت حرام ہونے اور جہنم واجب ہونے کیلئے ابدی سبب ہے اور نصاریٰ اس میں مبتلاء تھے: وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ: اس میں شفاعت قہریہ (شرکیہ) کا رد ہے۔ ظالمین سے مراد مشرکین ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّآ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ وَإِن لَّمْ يَنتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

"یقیناً کافر ہوئے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین میں سے تیسرا ہے اور نہیں ہے بندگی کا حقدار مگر ایک (اللہ) اور اگر یہ اس سے باز نہ آئے جو وہ کہتے ہیں تو ضرور پہنچے گا ان میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا ہے دردناک عذاب" [۷۳]۔

تفسیر 73 یہ تبلیغ کا تیسرا مسئلہ ہے اس میں نصاریٰ کے ایک اور کفریہ عقیدہ کا رد ہے یہ عقیدہ نسطوریہ گروہ کا تھا امام ابن جریر رحمہ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ نصاریٰ کے سب فرقے ملکانیہ، یعقوبیہ اور نسطوریہ اس عقیدے کے قائل ہیں۔ تفسیر قاسمی میں جمال الدین نے لکھا ہے کہ یہ گروہ (کولی ری ڈیس) نام سے موسوم تھا وہ کہتے ہیں کہ الٰہ تین ہیں یعنی اللہ عزوجل، مریم اور عیسیٰ علیہ السلام ایک گروہ کو مریمین کہا جاتا ہے ایک اور گروہ ہے جس کو بربرانیطس کہتے ہیں نجران کے نصاریٰ بھی تثلیث کے قائل تھے تثلیث کے عقیدہ سے متعلق تعبیرات میں اختلاف ہے ایک تعبیر یہ ہے کہ باپ الٰہ ہے ابن بھی الٰہ ہے اور روح بھی اللہ ہے اور مجموعاً ایک الٰہ ہے جیسا کہ سورج میں تین صفات ہیں شعاع، حرارت اور ٹکیہ۔ دوسری تعبیر یہ ہے کہ الٰہ جوہر واحد ہے اس میں تین اقانیم ہیں ایک اقنیم اب کا ہے دوسرا اقنیم ابن کا ہے اور تیسرا اقنیم اس کلمہ کا ہے جو باپ سے بیٹے میں منتقل ہوا ہے۔ تیسری تعبیر: اب، ابن، روح۔ چوتھی تعبیر: اللہ، مریم، عیسیٰ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ قول قرآن مجید کے ظاہر سے موافق ہے۔ اس دلیل سے جو آیت 116 میں ہے۔ امام قرطبی نے کہا کہ وہ یہ تعبیر نہیں کرتے کہ الٰہ تین ہیں لیکن ان کے اقوال اور مذہب سے یہ معنیٰ حاصل ہوتا ہے اور وہ اس کا التزام کرتے ہیں: ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ نحویوں کا اتفاق ہے کہ اس لفظ میں دلالت ہے کہ جب تین کا عدد ہو تو ان میں سے ایک کو: ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ کہتے ہیں اس میں ثالث اور رابع کی وصفیت مقصد نہیں ہوتی اور ملا جامی نے کافیہ کی شرح میں وصفیت کے معنیٰ کا اعتبار ذکر کیا ہے لیکن اس کو علامہ عبدالحکیم نے رد کیا ہے لہٰذا جب دو افراد ہوں تو تیسرا تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے تو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ثالث ثلاثہ جیسا کہ حدیث بخاری میں ہے کہ: مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا: (صحیح بخاری کتاب مناقب الانصار حدیث 3922 صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابۃ حدیث 2381 ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3096) یعنی ان دو افراد کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہو تو (سوال) یہ ہے کہ اس کو کفر کا کلمہ کیوں کہا گیا؟۔ (جواب) تفسیر نیشاپوری اور خازن میں لکھا ہے کہ اس قول سے مراد ہے: ثَالِثُ اٰلِهَةٍ ثَلَاثَةٍ: کیونکہ ان کا عقیدہ اس پر شاہد ہے وہ ہر ایک کو الٰہ کہتے تھے صرف گنتی

اور تعداد کی بات نہیں: وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: یہ ان کے قول کا واضح رد ہے کہ وہ اللہ تو ایک کو مانتے تھے مگر دیگر میں الوہیت کی صفت تسلیم کرتے تھے: وَ اِنْ لَّمْ یَنْتَهُوْا: اس میں آخرت کیلئے وعید ہے: لَیَمَسَّنَّ: مَسّ اَصَابَتْ کے معنی میں ہے اور الصاق کے معنی میں بھی ہے یعنی چمٹ جانا: مِنْهُمْ میں مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس عقیدہ سے توبہ نہیں کی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ ان میں سے بعض اس عقیدہ سے تائب ہونگے۔

اَفَلَا یَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

"کیا وہ (دل سے) اللہ کی طرف توبہ نہیں کرتے اور (زبان سے) مغفرت طلب نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ تو بخشنے اور رحم کرنے والا ہے" [۷۴]۔

تفسیر 74 اس آیت میں دونوں عقیدوں سے تائب ہونے کی ترغیب ہے اور ترغیب بھی بطور زجر اور توبیخ ہے۔ بقول خازن استفہام امر کے معنی میں ہے توبہ سے توحید کی طرف رجوع اور استغفار سے ترک شرک مراد ہے توبہ دل سے اور استغفار زبان سے ہوتا ہے۔

مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ ؕ كَانَا یَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَیْفَ نُبَیِّنُ لَهُمُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ ۝

"نہیں ہے مسیح ابن مریم مگر ایک رسول ہی تو ہے یقیناً گزر چکے ہیں اس سے پہلے بہت سارے رسول اور اس کی ماں صدیقہ تھی وہ دونوں کھانا کھاتے تھے دیکھئے کیسے ہم بیان کرتے ہیں ان کیلئے نشانیاں پھر دیکھئے وہ کہاں پھیرے جاتے ہیں" ۔[۷۵]۔

تفسیر 75 یہ عیسیٰ و مریم علیہما السلام کی الوہیت کی نفی کی دلیل ہے۔ اور یہ توبہ کے لئے علت ہے اور اس میں بہت سے دلائل ہیں (۱) یہ کہ ابن ہونا اور ماں ہونا تو الوہیت کے منافی ہے (۲) یہ کہ وہ رسول ہے اور رسالت بھی الوہیت کے منافی ہے اس کو حصر اضافی کہتے ہیں یعنی اس میں صرف صفت رسالت تو ہے صفت الوہیت نہیں ہے: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ: یہ دو توجیہات کے ساتھ تیسری دلیل ہے۔ پہلی توجیہ یہ ہے کہ اس سے قبل انبیاء گزرے ہیں اور ان سے بھی معجزات و عجائبات ظاہر ہوئے ہیں لہٰذا اگر معجزات و عجائبات الوہیت کیلئے دلیل ہوں تو پھر وہ سارے رسول الٰہ کہلائیں

گے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ سابقہ انبیاء فوت ہوئے ہیں اور یہ عیسیٰ علیہ السلام بھی فوت ہونگے لہٰذا یہ الٰہ نہیں ہوسکتا: وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ: یہ مریم کی الوہیت سے نفی کی دلیل ہے کہ وہ الٰہ نہیں ہے کیونکہ صدیقین تو بہت سارے لوگ ہیں لیکن ان کو الٰہ نہیں کہا جاتا لہٰذا مریم صدیقہ ہے مگر الٰہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے صَادِقَةٌ نہیں فرمایا کیونکہ صدق اللہ کی خصوصیت ہوسکتی ہے اور صدیقیت عبودیت کی صفت ہے۔ تنبیہ: صِدِّيْقَةٌ: کی تفسیر سورہ تحریم کی آیت 12 میں ہے۔ تصدیق میں مبالغہ ہے یعنی اس نے رسولوں اور کلمات الٰہیہ کی تصدیق علماً قولاً فعلاً کی ہے۔ انسانوں میں صدیقیت سے اوپر مقام صرف نبوت کا ہے اس وجہ سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ مریم رسول نہیں۔ ابن حزم کے برعکس کہ اس نے کہا ہے کہ عورت درجہ نبوت پر فائز ہوسکتی ہے۔ لیکن ابوالحسن اشعری نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ عورت مرتبہ نبوت نہیں پاسکتی ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اعلیٰ مرتبہ دیا ہے تاکہ اس سے الوہیت کی نفی کی جائے چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ رسالت کا ذکر کیا ہے اگر مریم کا مرتبہ بھی رسالت کا ہوتا تو وہ بھی ذکر کرتا۔ نبی کیلئے جہاں صدیقیت کی صفت کا ذکر ہے وہاں لفظ نبیا بھی ساتھ ہے جیسے سورۃ مریم میں ابراہیم اور ادریس علیہما السلام کیلئے آیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مریم سے خطاب کیا ہے لهذا یہ نبوت کی دلیل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبوت کا شرعی معنیٰ صرف خطاب نہیں ہے بلکہ قتال اور دعوت وتبلیغ ہے جو کہ خاتون کی شان سے بعید ہے: كَانَا يَأْكُلٰنِ الطَّعَامَ: یہ پانچویں اور مشترک دلیل ہے عیسیٰ اور مریم دونوں کے لیے کہ جو کھانے کا محتاج ضرورتمند ہوتا ہے وہ ہر چیز کا محتاج اور ضرورتمند ہوتا ہے اور محتاج ضرورتمند الٰہ نہیں ہوسکتا ہے یہ دلیل تمام انسانوں جنوں یعنی انبیاء کرام، اولیاء کرام سب کو شامل ہے سب کھانے کی ضرورت رکھتے ہیں چنانچہ ان میں الوہیت کی صفت نہیں ہوسکتی۔ تنبیہ: استدلال میں رسالت اور صدیقیت سے انتقال طعام کی طرف کیا گیا ہے یہ واضح دلیل سے اوضح کی طرف انتقال ہوا ہے یہ طریقہ دلائل ذکر کرتے میں اختیار کیا جاتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے ان کی عظمت شان کا ذکر ہوا ہے اور پھر صفت بشریت کا لہٰذا اس میں اشارہ ہے کہ بشریت رسالت اور صدیقیت کے منافی نہیں ہے: اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ: اس میں اشارہ ہے کہ اس آیت میں توحید کے بہت دلائل ہیں اور آخری دلیل بہت سارے دلائل پر مشتمل ہے: ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ: دو مرتبہ انظر کہا گیا ہے اس میں غور فکر کرنے کیلئے مبالغہ کیا گیا ہے اور لفظ ثُمَّ اس لیے لایا ہے کہ دونوں تعجب میں فرق ہے ایک طرف عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت کے واضح دلائل ہیں دوسری طرف شکوک وشبہات کی بنیاد پر حق سے اعراض کیا جارہا ہے یہ تو عقل سے بہت بعید طریقہ ہے۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۷۶﴾

"فرما دیجئے کیا تم اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی بندگی کرتے ہو جو تمہارے لئے نفع ونقصان کے مالک ہی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سننے اور خوب جاننے والا ہے" [۷۶]۔

تفسیر 76 یہ دعوت وتبلیغ کا چوتھا مسئلہ ہے اس میں شرک فی العبادت کا رد ہے اور یہ رد شرک فی الالوہیت پر جو عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کی الوہیت کی رو پر تفریع ہے۔ اگرچہ یہ خطاب تمام مشرکین کو عام ہے مگر اس میں نصاریٰ کا رد کیا گیا ہے: مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا: ضرر اس لیے مقدم کیا ہے کہ پہلے ضرر سے نجات یا بچاؤ ہوتا ہے پھر فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا: دونوں نکرہ ہیں اور سیاق نفی میں واقع ہیں جو بہت زیادہ عموم کی دلیل ہے۔ یہ رد شرک فی التصرف کی دلیل ہے (مَا) سے مراد عیسیٰ ومریم علیہما السلام ہیں۔ سوال: یہ تو دونوں ذوی العقول ہیں جبکہ حرف (مَا) غیر ذوی العقول کیلئے استعمال ہوتا ہے؟۔ جواب ۱: امام شعرانی نے سیبویہ سے نقل کیا ہے کہ حرف (مَا) ذوی العقول وغیر ذوی العقول کے درمیان مشترک ہے۔ جواب ۲: اس میں اشارہ ہے کہ نفع وضرر کے لحاظ سے ذوی العقول بھی غیر ذوی العقول کی طرح ہیں: وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ: امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایسے اوقات آئے ہیں کہ نہ تو سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ نفع وضرر دے سکتے ہیں تو وہ الہ کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ یہ صفات کامل طور پر اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہیں۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ ﴿۷۷﴾ ع

"فرما دیجئے اے اہل کتاب تم اپنے دین میں ناحق غلو مت کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی مت کرو جو گمراہ ہوئے ہیں (تم) سے پہلے اور انہوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور خود بھی (علم کے باوجود) سیدھی راہ سے گمراہ ہوئے" [۷۷]۔

تفسیر 77 اس آیت میں تبلیغ کیلئے پانچواں مسئلہ مذکور ہے یعنی نصاریٰ کا شرک وبدعت میں غلو کرنا: قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ: خطاب اگرچہ عام ہے لیکن حقیقی مخاطب نصاریٰ تھے: لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ: سورۃ بقرہ آیت 171 میں بھی گزرا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں خطاب یہود ونصاریٰ دونوں سے ہے اور یہاں پر صرف نصاریٰ سے خطاب ہے: غُلُو: اصل میں

حد شرعی سے تجاوز کو کہا جاتا ہے یہ لفظ دو طریقوں سے استعمال ہے۔ (۱) عام، (۲) خاص۔ عام یہ ہے کہ حد سے تجاوز زیادتی کے ساتھ ہو یا کمی کے ساتھ یعنی افراط وتفریط۔ اس معنی میں سورۃ نساء آیت 171 میں ہے وہاں بعد میں عیسیٰ علیہ السلام کی شان ذکر کی ہے۔ خاص یہ ہے کہ تجاوز صرف زیادتی کے معنی میں ہو اس مقام پر یہ معنی مراد ہے اور خطاب نصاریٰ سے ہے۔ اس لیے مفسرین نے یہاں بدعات سے ممانعت ذکر کی ہے۔ فتح البیان۔ نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو کیا تھا اس کو بشریت سے نکال کر الوہیت کے درجہ پر اور اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا تھا۔ اس طرح انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں بہت ساری چیزیں اپنی طرف سے حرام وحلال بنائی تھیں: فِيْ دِيْنِكُمْ : اس میں اشارہ ہے کہ غلو کی دو قسمیں ہیں: غُلُوْ فِي الدِّيْنِ اور غُلُوْ لِلدِّيْنِ: صاحب الکشاف اور نیشاپوری نے اس کو غلو اور باطل سے تعبیر کیا ہے اس سے یہ مراد لیا جا سکتا ہے کہ بِدْعَتْ فِي الدِّيْنِ اور بِدْعَتْ لِلدِّيْنِ یا بدعت فِي الْوَسَائِلِ اور بِدْعَتْ فِي الْمَقَاصِدِ پہلی قسم میں دین کی ترقی کیلئے جو وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں انہیں دین نہیں کہا جاتا مثلاً صرف نحو کی کتابیں یا طریقہ تعلیم وتعمیرات مدارس تصنیف وتالیف مساجد کے محراب۔ (بشرطیکہ اس طریقہ یا عمل سے سنت کو نقصان نہ پہنچتا ہو اور اس کا التزام بھی نہ ہو۔ دوسری قسم کو شریعت کی اصطلاح میں بدعت کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی چیز کو خواہ عقیدہ سے متعلق ہو یا اعمال سے شریعت میں داخل کیا جائے یا اس کی کیفیت کو بدلنا یا مقدار میں اضافہ کرنا یا وقت متعین کرنا اور اس کو دین قرار دینا یہ گمراہی ہے جس کو شریعت نے بدعت ضلالت سے تعبیر کیا ہے اس آیت میں یہ مراد ہے جس کیلئے قرینہ فِيْ دِيْنِكُمْ ہے۔ غَيْرَ الْحَقِّ یہ مقدر موصوف کیلئے صفت ہے اور تقیید کیلئے مفعول مطلق ہے۔ (غُلُوًّا غَيْرَ الْحَقِّ یعنی اَلْبَاطِلِ) اس کے ذریعے غلو حق سے احتراز کیا ہے کہ وہ جائز ہے جیسا کہ گزر چکا ہے یا فعل کی ضمیر سے حال ہے یعنی مُتَجَاوِزِيْنَ وَمُغَايِرِيْنَ عَنِ الْحَقِّ: اس کا مقصد وہی ہے جو گزر را ہے: وَلَا تَتَّبِعُوْا اَهْوَاءَ قَوْمٍ: مفسر مہائمی نے تبصیر الرحمٰن میں لکھا ہے بغیر دلیل کے اتباع تقلید ہے: اَهْوَاءَ هَوٰى کی جمع ہے یعنی وہ چیز جس کی طرف نفس مائل ہوتا ہے اور وہ شریعت کی منافی ہو۔ امام شعبی کا قول ہے کہ جنت کے ماسوا جہاں بھی قرآن مجید میں ہواء کا ذکر ہے وہ مذمت کیلئے ہے: قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ: زاد المسیر اور خازن میں لکھا ہے یعنی: اِبْتَدَعُوْا: بطریقہ بدعت گمراہ ہوئے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور مریم کی کرامات سے دلیل لیتے تھے لفظ ضلو میں اشارہ ہے کہ ان کا بڑی عمر والا ہونا یا مقدم ہونا کوئی فائدہ نہیں دے گا: وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا : اس میں اشارہ ہے کہ پیروکاروں کی کثرت کا اعتبار نہیں ہے: وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ

السَّبِیْلِ: یہ متشابہات کی پیروی سے ایسا ہوا۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ پہلے ضلال شرک کو اختیار کیا تھا اس کی دعوت پھیلاتے رہے اور تیسری ضلال اس عمل و عقیدہ پر مستقل قائم رہنے سے ہوا یا دوسرا ضلال اس لیے ہوا ہے کہ پہلے والے کو انہوں نے دین قرار دیا تھا۔ یعنی بدعت کو حسنہ قرار دیا تھا۔

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ۝

"وہ لوگ لعنت کیے گئے جنہوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا تھا زبان داؤد اور عیسیٰ ابن مریم علیہم السلام۔ یہ اس سبب سے کہ انہوں نے نافرمانی کی تھی اور تھے وہ حد سے گزرنے والے" [۷۸]۔

تفسیر 78 اس آیت میں دنیاوی عذاب اور بنی اسرائیل پر مستقل لعنت کا ذکر ہے۔ اس لعنت کیلئے ان گناہوں کو سبب قرار دیا گیا ہے پہلے ذکر ہو چکے ہے اور ان کے اس وہم کا بھی جواب ہے کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں گناہوں سے ہم کو نقصان نہیں پہنچتا تو جواب ہوا کہ لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا: امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ کافر اگرچہ نبی کا بیٹا یا نسبی قریبی رشتہ دار ہو تو اس پر لعنت بھیجنا جائز ہے خواہ کسی بھی اعلیٰ نسب سے منسلک ہو: عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ: اس سے مراد داؤد علیہ السلام کی کتاب زبور اور عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب انجیل ہیں۔ ان دونوں میں کفر کرنے پر لعنت موجود ہے یا اس سے ان دونوں کی بددعا مراد ہے۔ پہلے کی بددعا اَصْحٰبُ السَّبْتِ پر ہے اور دوسرے کی بددعا مائدہ نازل ہونے کے بعد ہے۔ اس لعنت کے دو اسباب اس جملہ میں مذکور ہیں کہ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ: عصیان سے مراد عام گناہ ہیں اور اعتدا سے مراد بدعات یا مظالم ہیں جو انہوں نے انسانوں پر ڈھائے تھے۔ یا اعتداء کی تعبیر: وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ہے اس لیے حرف عطف ذکر کیا۔

کَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝

"نہیں وہ ایک دوسرے کو منع کرتے برائیوں سے جو انہوں نے کی ہوتیں البتہ برا ہے جو وہ کرتے" [۷۹]۔

تفسیر 79 اس آیت میں لعنت کا تیسرا سبب مذکور ہے: کَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ: یعنی ایک دوسرے کی برائیاں دیکھ کر منع نہیں کرتے گناہ کرتے اور گناہوں سے منع نہ کرنے میں شریک تھے تو یہ دو گناہ ہیں۔ امام قرطبی نے فرمایا اس میں اشارہ ہے کہ منکر سے منع فرض ہے ہاتھ سے زبان یا دل کی نفرت سے ہو بقدر استطاعت۔ یہ بات بھی ثابت ہوئی کے گناہ کا مرتکب بھی نہی عن المنکر کرے گا۔ تیسری بات یہ ہے کہ برائی سے منع نہ کرنا سخت عذاب کا سبب ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں

مفسرین نے ابوداؤد و ترمذی کتاب الفتن حدیث 2129 احمد 5/391 سلسلۃ الصحیحۃ احمد ابن ماجہ وغیرہ میں کثیر روایتیں ذکر کی ہیں جن میں اکثر ضعیف ہیں البتہ کتب حدیث میں نَہِی عَنِ الْمُنْکَرِ اور أَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ پر صحیح احادیث بھی کثرت سے 8
موجود ہیں ایک حدیث نقل کی ہے کہ بنی اسرائیل میں جب کوئی گناہ کا ارتکاب کرتا تو علماء ان کو ابتدا میں منع کرتے مگر باز نہ آنے پر ان کے ساتھ مجالس میں برابر شریک ہوتے یہاں تک کہ منع کرنا چھوڑ کر خاموشی اختیار کر لیتے اور ان کے ساتھ کھانے پینے میں شریک رہتے تو یہ عمل ان کے لعنت کا سبب بنا: لَبِئْسَ مَا کَانُوْا: معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص گناہ نہیں بھی کرتا۔ لیکن برائیوں سے منع نہیں کرتا تو وہ بھی مجرم ہے۔ تنبیہ: أَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ چھوڑنا گناہ ہے لیکن یہ بات معلوم ہوئی کہ اس سے بڑھ کر گناہ نَہِی عَنِ الْمُنْکَرِ چھوڑنا ہے تو ان لوگوں کے حال پر افسوس ہے کہ أَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ کے دعویدار ہیں اور نَہِی عَنِ الْمُنْکَرِ نہیں کرتے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ گناہ سے منع کرنے پر توڑ پیدا ہوتا ہے ان کو اس آیت پر غور کرنا چاہیے۔

تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَ فِی الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾

”آپ ان میں سے بہت سوں کو دیکھیں گے کہ وہ ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا ہے دوستیاں کرتے ہیں البتہ برا ہے جو آگے بھیجا ان کیلئے ان کے نفسوں نے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے غضب بھیجا ہے ان پر اور وہ عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہونگے“[۸۰]۔

تفسیر 80 ان کے بڑوں کی خباثتیں ذکر کرنے کے بعد اب اس میں ان کے بعد والی نسلوں کی خباثتوں کا ذکر ہے اور یہ اس لیے کہ ان میں لعنت برقرار رہے۔ یہ چوتھا سبب ہے نیز چونکہ یہ ان کی نسل در نسل مستقل لعنت تھی اس لیے بغیر حرف عطف اس کو ذکر کیا ہے: تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْهُمْ: یعنی پہلی خباثت تو صرف نَہِی عَنِ الْمُنْکَرِ چھوڑنا تھا یہ بدتر عمل ہے کہ برائی سے منع کرنا تو کجا برے لوگوں سے دوستیاں قائم کر بیٹھے۔ اگر کثیرا سے منافقین مراد ہو تو یہ کثرت فی نفسہ ہے۔ اور الَّذِیْنَ کَفَرُوْا: سے اہل کتاب کے بڑے مراد ہیں: اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ محل رفع میں ہے جو محذوف مبتدأ کی خبر ہے یا حروف (مَا) سے بدل ہے یا نصب کے محل میں اور لام مقدر ہے یعنی لِاَنْ سَخِطَ اللہ سخط تختی میں غضب سے زیادہ ہے اس لیے کہ اس میں غصہ اور ناراضگی دونوں ہیں اس سے معلوم ہوا کہ کافروں سے دوستی میں دو عذاب آتے ہیں (۱) اللہ

تعالیٰ کی ناراضگی اور (۳) عذاب میں داخل ہونا۔

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝٨١

"اگر وہ ایمان لانے والے ہوتے اللہ تعالیٰ پر اور نبی پر اور جو اس کی طرف نازل کیا گیا ہے تو وہ ان کافروں کو دوست نہ بناتے لیکن زیادہ لوگ ان میں سے نافرمان ہیں" [۸۱]۔

تفسیر 81 اس آیت میں کافروں کے دوستی کا رد ہے اس میں بھی سابقہ آیت کی طرح دو توجیہات ہیں (۱) اس سے منافقین مراد ہیں نبی سے آخری رسول مراد ہے مَآ اُنْزِلَ سے قرآن مجید مراد ہے۔ (۲) اگر مراد اہل کتاب کافر ہیں تو نبی سے موسیٰ علیہ السلام اور کتاب سے تورات مراد ہے۔ مراد یہ ہے کہ کافروں سے دوستیاں اللہ و رسول اور قرآن پر ایمان لانے کے منافی ہیں۔ سوال: امام سمعانی نے لکھا ہے کہ یہ تو کافر ہیں تو ان کو فٰسِقُوْنَ کیوں کہا ہے؟۔ جواب ۱: اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے کلی طور پر نکل چکے ہیں اور یہ کافر ہیں۔ جواب ۲: اس سے مراد سرکش لوگ ہیں۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝٨٢

"یقیناً آپ پائیں گے دشمنی میں سخت ترین ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے یہود اور ان لوگوں کو جنہوں نے شرک کیا اور یقیناً آپ پائیں گے قریب ترین ان سب سے ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے ان کو جنہوں نے کہا یقیناً ہم نصاریٰ ہیں یہ اسلئے کہ کچھ تو ان میں پڑھے ہوئے ہیں اور کچھ ان میں زاہد ہیں اور یقیناً وہ تکبر نہیں کرتے" [۸۲]۔

تفسیر 82 یہ سابقہ بیان کی تشریح ہے اور یہود و نصاریٰ میں فرق ذکر کیا ہے اور اشارہ ہے کہ ماقبل بیان شدہ عیوب یہودیوں اور ان کے ہمنوا مشرکین میں زیادہ ہیں اور ان کی بنسبت نصاریٰ میں کم ہیں: لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ: یہ آیت ان کی دشمنی پر واضح اور ظاہر دلیل ہے: اَلْيَهُوْدَ سبب یہ ہے کہ مسلمان عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں جبکہ یہود ان دونوں کے منکر اور دشمن ہیں: وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا: یہ اس لیے دشمن ہیں کہ مؤمن توحید پر قائم ہیں اور شرک سے نفرت کرتے ہیں: وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى: اس میں مفسرین کے دو اقوال ہیں۔ (۱) اس سے مراد وہ نصاریٰ ہیں جنہوں نے مدینہ اور حبشہ میں قرآن سنا اور ایمان لے آئے قرآن سننے پر روئے تھے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کیلئے مؤمنین کی دوستی ثابت کی ہے اور بعد میں ان کی اچھی صفات بھی ذکر کی ہیں اس قول کو

امام سمعانی اور خازن نے بہتر قرار دیا ہے۔ (۲) اس سے مراد عام نصاریٰ ہیں اگر چہ کافر ہی کیوں نہ ہوں مفسرین نے فرق کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ یہودیوں کا مذہب یہ ہے کہ مخالف رسول کو شر اور اذیت پہنچانا واجب ہے خواہ قتل اور مال قبض کرنا ڈاکہ وغیرہ یا دیگر حیلے بہانے ہوں۔ جبکہ نصاریٰ کا مذہب یہ ہے کہ مخالف کو ایذا تکلیف نہیں دینا ہے ان کے مذہب میں یہ امور جائز نہیں ہیں اس طرح یہود میں دنیا کی حرص لالچ تکبر اور منصب کی طلب اور خواہش کی عادت ہے جبکہ نصاریٰ میں یہ صفات کم ہیں مفسر شربینی نے لکھا ہے کہ نبی اکرم کے خطوط جب نصاریٰ کو پہنچے ہیں تو وہ ایمان لائے ہیں یا نرم ہوگئے ہیں جیسا کہ ہرقل، مقوقس، ہودہ بن علی وغیرہ جبکہ نصاریٰ کی علاوہ لوگوں نے خطوط نبوی کی بہت بے احترامی کی ہے جیسا کہ کسریٰ فارس والے نے خط نبوی کو پھاڑ دیا تھا۔ بقاعی نے لکھا ہے کہ اس میں راز یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی امت اس امت کے قریب ہے تو اس لحاظ سے دوستی میں بھی قریب ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنۡهُمۡ: سے تعمیم کے بعد تخصیص کی ہے جو ان میں سے خاص مؤمن ہیں۔ سوال: نصاریٰ تو اس وقت یہود کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں تو یہ فرق کس طرح صحیح ہوسکتا ہے؟ جواب ا: یہاں بعض نصاریٰ مراد ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ جواب ۲: اقرب مودۃ سے حق کی طرف انابت مراد ہے یعنی یہود میں حسد اور ضد وعناد زیادہ ہے جبکہ نصاریٰ میں انابت زیادہ ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنۡهُمۡ سببیت کی وجہ یہ ہے کہ جب قوم میں حق اور داعیان حق موجود ہوں تو اس قوم میں حق کی طرف انابت پیدا ہوتی ہے کیونکہ اپنی قوم میں ان کو عملی کام نظر آتا ہے۔ سوال: اِنَّا نَصٰرٰی: فرمایا ہے: هُمۡ نَصَارٰی نہیں فرمایا؟۔ جواب: اس سورۃ کی آیت 41 میں اس طرح ذکر ہوا اور سورۃ آل عمران کی آیت 52 میں اس طرح گزرا ہے لہٰذا اس کے ساتھ موافقت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دوسرے قول کی بناء پر یہاں عام نصرٰیٰ کا ذکر ہے تو: قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰی: اس لیے فرمایا تا کہ حقیقی نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کے متبع اور صرف دعویدار سب کیلئے عام ہوجائے تو بعد میں صحیح نصاریٰ کیلئے تخصیص کی جو ایمان لائے تھے جنہوں نے ایمان لایا تیسری بات یہ ہے کہ موجودہ نصاریٰ اپنے آپ کو صلیبی، مسیحی، عیسائی۔ مریمی کہتے ہیں خود کو نصاریٰ نہیں کہتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان میں اب مسلمانوں کے ساتھ دوستی کی رمق بھی نہیں ہے: قِسِّيۡسِيۡنَ یہ قسیس کی جمع ہے جو قس سے لیا گیا ہے جو کسی چیز کے تَتَبُّع طلب کے معنی میں ہے مطلق عالم کو بھی یا علماء کے تابعدار کو بھی کہا جاتا ہے۔ قرطبی اور نیشاپوری نے عروہ بن زبیر سے روایت نقل کی ہے کہ نصاریٰ نے جب اپنی کتاب انجیل کو ضائع کیا اور اس میں تحریف کی تو ایک عالم حق پر قائم رہا جو قسیس کے نام سے معروف تھے تو جو نصاریٰ میں ان کے ساتھ حق دین پر وابستہ

ر ہے ان کو قسیس کہتے حق دین میں قسیس کے پیروکار۔ رہبان وہ عبادت گزار شخص جو اللہ تعالیٰ کی عبادت خوف کے ساتھ کرتا ہے اور دنیا کے مال و جاہ کا طالب نہ ہو۔ وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ اشارہ ہے کہ ان میں علم نے اتنا اثر کیا ہے کہ کسی قسم کا تکبر نہیں کرتے بلکہ تواضع کرتے ہیں۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾

"اور جب وہ سنتے ہیں جو نازل کیا گیا ہے رسول کی طرف تو آپ دیکھتے ہیں ان کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اس وجہ سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا اور وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے تو ہمیں لکھ لے شہادت دینے والوں کے ساتھ" [۸۳]۔

تفسیر 83 یہ بھی ماقبل صفات پر عطف ہے وہ صفات ان میں قرآن مجید سننے سے پہلے موجود تھیں اور یہ صفت قرآن مجید سننے کے بعد ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ سابقہ تین صفات کی تکمیل اس آخری صفت سے ہے۔ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ سوال: اس میں بہنے کی صفت تو آنکھوں کی ذکر ہوئی ہے جبکہ یہ تو آنسوؤں کی صفت ہے۔ جواب: اس میں مبالغہ ہے اصل تو اس طرح ہے کہ ان کی آنکھیں آنسوں سے بھر جاتی ہیں پھر ان سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔ یا مِنْ (بَا) کے معنی میں ہے: مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ پہلا مِنْ اجلیہ ہے اور مِنْ برائے تبعیض ہے یعنی بعض حق جاننے سے رونے لگے تو جب پورا حق جان لیں گے پھر اور زیادہ آنسو بہائیں گے: يَقُوْلُوْنَ یہ تکبر نہ ہونے کی دلیل ہے: فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ: اس سے مراد محمد ﷺ کی امت ہے اس لیے کہ یہ صفات ان میں ہیں جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت 143، سورۃ حج آیت 78 اس طرح کی دعاء نصاریٰ کے بڑوں نے طلب کی تھی جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت 53 میں مذکور ہے۔ تنبیہ: امام قرطبی نے کہا ہے کہ یہ صفت حق پرست علماء کی ہے کہ قرآن سننے پر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتے ہیں لیکن ان پر بے ہوشی نہیں آتی اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں طلب کرتے ہیں مگر چیختے نہیں ہیں۔ غم کا اظہار کرتے ہیں مگر موت کے آثار ظاہر نہیں کرتے جیسا یہ دیگر کام صوفی لوگ کرتے ہیں مثلاً چیخنا، چلانا اور رقص کرنا بے ہوش ہو کر گرنا یہ کیفیات اہل حق کی نہیں ہوتی ہیں۔

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾

"اور ہمارے پاس کونسا عذر ہے کہ ہم اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور جو ہمارے پاس حق آیا ہے اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح قوم کے ساتھ داخل کرے گا" [۸۴]۔

تفسیر 84 یہ ان کی طرف سے لعن طعن ملامت کرنے والوں کو جواب ہے جب انہوں نے ان ایمان لانے والوں سے کہا کہ تم لوگوں نے دین بدل لیا ماں باپ کا دین چھوڑ بیٹھے: وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ: یہ استفہام انکاری ہے مراد یہ ہے کہ ایمان سے کوئی چیز ہمارے لیے رکاوٹ نہیں ہے: وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ: اس سے مراد قرآن ہے یہ اسم اللہ پر عطف ہے یا پھر یہ جملہ حالیہ ہے: وَنَطْمَعُ یہ نُؤْمِنُ پر عطف ہے یا مقدر عبارت اس طرح ہے: وَنَحْنُ نَطْمَعُ: اور یہ حال ہے یعنی جب ایمان لانے کیلئے سبب موجود ہے جو کہ خواہش ہے یعنی جنت میں جانے کی خواہش یعنی ایمان لانے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے تو پھر کیوں ایمان نہیں لاتے یعنی ایمان کیلئے سبب موجود ہو اور رکاوٹ نہ ہو تو پھر ایمان لانا واجب ہو جاتا ہے: مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ: سورۃ انبیاء آیت 105 سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے: مَعَ فِی کے معنی میں ہے یعنی: فِی الْقَوْمِ الصَّالِحِیْنَ: یا مقدر عبارت اس طرح ہے: فِی الْجَنَّةِ مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِیْنَ

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

"پس بدلہ دیا ان کو اللہ تعالیٰ نے بسبب اس کے جو انہوں نے کہا ایسے باغات جس کے نیچے نہریں جاری ہیں ہمیشہ رہیں گے ان میں اور یہ نیکی کرنے والوں کا بدلہ ہے" [۸۵]۔

تفسیر 85 یہ آخرت کی خوشخبری ہے: بِمَا قَالُوْا سوال: اس سے معلوم ہوا کہ صرف زبانی اقرار سے جنت مل جاتی ہے جیسا کہ کرامیہ فرقے کا نظریہ ہے صرف اقرار کا نام ایمان ہے؟۔ جواب: تفسیر خازن اور تفسیر کبیر میں ہے کہ پہلے ان کے اخلاص کی دو صفتوں کا ذکر ہوا ہے۔ (۱) رونا، (۲) حق کی معرفت کا اقرار لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پورے دل سے تصدیق کی ہے اس لیے بعد میں قول ذکر کیا ہے اور ان کو صفت محسنین سے موصوف کیا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہاں پر قول عقیدہ کے معنی میں ہے قرآن میں دیگر بہت سے مقام تک جہاں قول سے عقیدہ مراد ہے۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۸۶﴾ ع

"اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ جہنم والے ہیں" [۸۶]۔

تفسیر 86 یہ ان لوگوں کیلئے آخرت کی تخویف ہے جو سابقہ گروہ کے مخالف صفات رکھنے والے ہیں: كَفَرُوْا یہ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ اور عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ: کے مقابل ہے: كَذَّبُوْا یہ اِسْمَعُوْا اور یَقُوْلُوْنَ: کے مقابل صفات ہیں تو معلوم ہوا کہ کفر دل کی صفت ہے اور تکذیب زبان اور ظاہری وجود کی صفت ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۸۷﴾

"اے ایمان والو حرام مت ٹھہراؤ ان پاک چیزوں کو جن کو اللہ نے تمہارے لئے حلال کیا ہے اور تم حد سے مت گزرو یقیناً اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے" [۸۷]۔

(خلاصہ) یہاں سے سورۃ کے آخر تک دوسرا باب ہے اس میں: شِرْكٌ فِي التَّحْلِيْلِ وَالتَّحْرِيْمِ: کا رد ہے پھر قسم (حلف) کے مسئلہ کا ذکر ہے جس میں حلال کو حرام کرنے طریقہ ذکر ہے پھر تحریمات کا ذکر ہے جس میں غیر اللہ کی نذر بھی شامل ہے۔ پھر ایک اشکال کا جواب ہے پھر خاص حرام کردہ چیزوں کا ذکر ہے اور اس کا تفصیلی حکم مذکور ہے۔ پھر حلال چیزوں کا ذکر ہے پھر اشکالات کے جوابات ہیں۔ آیت 99 تک پھر آیت 101 میں تادیب ہے اور تحریم غیر اللہ کی نذر سے متعلق مشرکین کی دلیل کا تفصیل سے رد کیا گیا ہے۔ آیت 104 پھر ایک اور تادیب ہے آیت 105۔ پھر جھوٹی قسم پر رد ہے جس کے ذریعے سے حرام کو حلال کرتے ہیں۔ 108 پھر آخر میں نبیوں سے دلیل نقلی اجمالی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام سے تفصیلی ذکر ہے جس میں ان کی غیب دانی کا رد کیا گیا ہے اور آخر میں توحید کا دعویٰ مذکور ہے اس باب میں سات عقود والیہ مذکور ہیں جو: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: کے عنوان سے ہیں۔

تفسیر 87 (ربط) جب قِسِّیْسِیْنَ اور رہبان کی تعریفیں کی گئیں تو ایک اعتراض اور سوال پیدا ہوا کہ ان میں تو رہبانیت کی وجہ سے پاکیزہ چیزوں کی حرمت بھی آ گئی تھی، تو جواب ہوا کہ اس سے بچ جاؤ: لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ: غیر اللہ کی تحریم میں چار قسمیں ہیں پہلی یہ ہے کہ (۱) انکار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حلال کو حرام اور اس کے حرام کردہ کو حلال قرار دیئے۔ (۲) عقیدہ شرکیہ کی وجہ سے غیر اللہ سے ڈرتے ہوئے کسی حلال چیز کو خود پر حرام قرار دے۔ یہ عقیدہ رکھ کر کہ اگر یہ چیز میں نے استعمال کی تو معبود ہم کو نقصان پہنچا دیگا۔ جیسا بحیرہ اور سائبہ وغیرہ۔ (۳) شریعت میں کوئی چیز

حلال ہو مگر علماء سوء کی تقلید سے اس کو بے دلیل حرام تصور کیا گیا ہے۔ (۴) رہبانیت کی وجہ سے یعنی خود پر بعض چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں بعض جائز لباس گوشت، گھی، پھل، نکاح وغیرہ ناجائز قرار دیتے ہیں: لَا تُحَرِّمُوْا: کی یہ نہی تمام قسموں کیلئے ہے اور خصوصاً آخری کا رد ہے جیسا امام قرطبی نے لکھا ہے کہ اس میں غالی باطل پرست زاہدوں صوفیوں کا رد ہے۔ مفسر نیشاپوری نے لکھا ہے کہ: لَا تُحَرِّمُوْا: سے مراد یہ ہے کہ ان چیزوں کی حرمت کا عقیدہ مت رکھو اور زبان سے اس کی حرمت بیان مت کرو اور عملی طور پر اس سے اس طرح اجتناب مت کرو: وَلَا تَعْتَدُوْا: اس میں حدود شرعیہ حلال و حرام سے تجاوز کرنا مراد ہے اور یہ تجاوز حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرانے کی صورت میں سرکشی ہے۔

وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝

"اور کھاؤ اس میں سے جو تمہیں اللہ تعالیٰ نے حلال اور پاکیزہ رزق دیا ہے اور اس اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو"۔ [۸۸]

تفسیر 88 اس آیت میں: لَا تُحَرِّمُوْا: کیلئے مزید تاکید ہے اور کھانے کیلئے شرائط ہیں کہ وہ: حَلٰلٌ وَ طَيِّبٌ ہونا چاہئے اور: كُلُوْا سے مراد یہ ہے کہ حلال اشیاء کھانے پینے لباس سواری وغیرہ سے فائدے حاصل کرو۔ کھانا چونکہ بڑا مقصد ہے تو اس کو خاص ذکر کیا ہے: مِمَّا: میں اشارہ ہے کہ ان میں سے بعض صدقہ میں دیتے ہوں نیز لفظ رزق کا اطلاق حرام پر بھی ہوتا ہے اس لیے بعض کو خاص کیا: حَلٰلًا طَيِّبًا: جن کیلئے حرمت کی شرعی دلیل نہ ہو وہ سب حلال ہیں اور طَيِّبًا وہ ہیں جس میں شبہ بھی حرمت کا نہ ہو۔ ابن مبارک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ حلال وہ ہے جو شرعی کے طریقے سے حاصل کیا جائے اور طیب وہ جس میں جسم کے لیے غذائیت اور طاقت ہو مضر صحت بھی نہ ہو اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز صحت کیلئے مضر ہو وہ استعمال کرنا ناجائز ہے: وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ: اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ (۱) ایمان باللہ تقویٰ کا سبب ہے۔ (۲) حرام سے اجتناب اور حلال کا استعمال کرنا بھی تقویٰ ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ
مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ
ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٨٩﴾

"تمہیں مواخذہ (پکڑ) کریگا اللہ تعالیٰ تمہاری عادتی (بے ارادہ قسموں پر لیکن وہ تمہارا مواخذہ کریگا ان قسموں پر جو تم نے مضبوط باندھی ہوں۔ تو اس کا کفارہ دس (۱۰) مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اوسط درجہ جو تم اپنے اہل کو کھلاتے ہو یا انہیں کپڑے پہنانا ہے یا ایک (غلام) کی گردن آزاد کرنا ہے پھر اگر نہ پائے تو تین روزے رکھنے ہیں یہ کفارہ تمہاری قسموں کا ہے جب تم قسم کھا بیٹھو اور تم اپنی قسموں کی حفاظت کرو اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیتیں تاکہ تم شکر کرو"[۸۹]۔

تفسیر 89 (ربط) امام قرطبی اور امام سمعانی نے لکھا ہے کہ جن صحابہ کرام نے رہبانیت کا ارادہ کیا تھا تو انہوں نے ساتھ قسمیں بھی کھائی تھیں تو جب سابقہ آیت نازل ہوئی: لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ : تو انہوں نے سوال کیا کہ ہم نے تو قسمیں کھائی ہے ان کا کیا ہوگا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی طرح جب کہا گیا کہ حلال چیزوں کو حرام قرار دینا حد سے تجاوز ہے تو سوال پیدا ہوا کہ کبھی تو صالح انسان کسی حلال چیز کو خود حرام قرار دیتا ہے جیسا کہ سورۃ تحریم کی ابتداء میں (نبی اکرم ﷺ کا واقعہ ہے) تو جواب ہوا کہ اس میں حرمت شرعی مقصد نہیں ہوتا بلکہ کسی چیز سے پرہیز کرنا مراد ہوتا ہے اس کو حرمت لغوی کہتے ہیں: لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ : سورۃ بقرہ آیت 225 میں اس طرح گزرا ہے مواخذہ دو قسم کا ہے (۱) دنیاوی یعنی قسم کا کفارہ دینا۔ (۲) اخروی یعنی عذاب الٰہی تو یہاں پر دونوں قسم کی نفی مراد ہے: بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ لغو اصل میں وہ چیز ہے جو بے پرواہ ہو کر پھینکی جائے۔ لغو دو قسم کا ہے (۱) بغیر نیت و ارادہ کے جو زبان سے قسم کے الفاظ نکل جائیں جیسا کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ قسم سے واللہ باللہ۔ (۲) کسی گزرے ہوئے کام پر بطور انکار قسم کھا لینا جس کا کرنا اور نہ کرنا وہ بھول چکا ہو۔ پہلا قول امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے دوسرا قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ و امام احمد رحمہ اللہ کا ہے اور راجح بات یہ ہے کہ یہ دونوں حکم میں داخل ہیں۔ پہلے والے کا سبب یہ ہے کہ اس میں قسم کی نیت نہیں ہے جبکہ: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (صحیح بخاری کی حدیث واضح ہے) اور دوسرے والے کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے خیال میں سچا ہے اور حدیث میں ہے کہ: رُفِعَ عَنْ اُمَّتِيْ اَلْخَطَاءُ: میری امت کی بھول و خطا سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ (ابن ماجہ کتاب الطلاق

حدیث 2043 بیہقی 7/356 شیخ البانی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے ارواء الغلیل 820) ۔ایمان یمین کی جمع ہے اور یمین قوت پر دلالت کرتا ہے اور چونکہ قسم پر بات کو تقویت ملتی ہے اس لیے اس کو یمین کہا جاتا ہے: بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْأَيْمَانَ عقد اصل میں باندھنے کو کہا جاتا ہے تو قسم کے ساتھ کسی عمل کو مستقبل میں کرنے یا نہ کرنے کے ساتھ مربوط یا باندھ لیا جاتا ہے اور اس کو یمین منعقد کہا جاتا ہے۔اس میں بالاتفاق بوقت قسم توڑنے کا کفارہ دینا فرض ہے۔ سوال: آیت کے لفظوں سے تو معلوم ہوا کہ صرف عقد کرنے (یَمِیْنِ مُنْعَقِدْ) سے کفارہ دینا فرض ہوتا ہے۔ جواب: عبادت میں مخفی الفاظ مراد ہیں یعنی بِنَكْثِ مَا عَقَدْتُّمْ ۔ یا إِذَا حَنَثْتُمْ یعنی اس قسم کو توڑنے سے کفارہ لازم ہوتا ہے: فَكَفَّارَتُهٗ يُؤَاخِذُكُمْ: کیلئے یہ تفصیل ہے اس کو کفارہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے قسم توڑنے والے کا گناہ چھپ جاتا ہے یعنی معاف ہوتا ہے: إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ: کھانے کی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ صبح وشام دو وقت کھانا دینا ہے۔حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ایک وقت گوشت اور روٹی سے ایک بندے کو سیر کرنا کافی ہے جبکہ اکثر اہل علم کا قول یہ ہے کہ گندم میں سے آدھا صاع جو تقریبا سوا کلو بنتا ہے۔ان میں سے کسی پر بھی عمل کیا جائے تو جائز ہے: مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ: یعنی نہ تو بہت اعلیٰ قسم اور نہ ہی انتہائی ادنیٰ بلکہ درمیانہ کھانا جو عام اوقات میں اہل و عیال کو کھلاتے ہو: أَوْ كِسْوَتُهُمْ: آیت میں اس کیلئے بھی حد مقرر نہیں ہے۔امام شافعی کا قول ہے کہ شلوار قمیص یا تہبند اور پگڑی قمیص کے ساتھ۔امام مالک وامام احمد کا قول یہ ہے کہ وہ لباس جس میں مرد کیلئے نماز درست ہو یا خواتین کیلئے۔حنفی مذہب کا فتویٰ یہ ہے کہ عرف عام میں جو لباس پہنتا ہے وہ دینا ہوگا۔نیز یہ بطور ملکیت دیا جائیگا یعنی عارضی نہیں: أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ: گردن سے مراد انسان کو غلامی سے آزادی دلانا ہے خواہ مرد ہو یا عورت یعنی غلام ہو یا لونڈی۔احناف کے نزدیک مؤمن ہونا شرط نہیں جبکہ دیگر ائمہ کے نزدیک مؤمن ہونا شرط ہے۔امام شعرانی نے لکھا ہے کہ کافر کو فدیہ میں آزاد کرنا مشکل بات ہے اس لیے کہ آزادی کا شرعی مقصد یہ ہے کہ دین کے کام کے لیے آزاد ہو جائے تو اس لحاظ سے ایمان کی شرط لازم ہونی چاہیے۔امام رازی نے لکھا ہے کہ عرب لوگوں میں یہ طریقہ تھا کہ قیدی کے ہاتھ کو گردن کے ساتھ باندھتے تھے جب ان کو آزاد کرتے تو اس کے ہاتھ کھول دیتے اس مناسبت سے: فَكُّ رَقَبَةٍ: گردن آزاد کرنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔تنبیہ: اہل علم نے بالاتفاق حرف أو کو برائے تخییر قرار دیا ہے یعنی کفارہ دینے والے کو اختیار ہے کہ ان تینوں میں سے جو اس کو ادا کرنا ہے وہ ادا کرے۔ان تینوں میں حکمت یہ ہے کہ انسان اپنی شہوات پر قابو پالینے کیلئے دس دن خود کو بھوکا رکھے۔لباس

پہنانے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے گناہ چھپ جائیں اور گردن کی آزادی کا مقصد یہ ہے کہ گناہ سے آزاد ہو جائے۔ **فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ** : سابقہ جملے میں اشارہ تھا کہ دس دن کھانے میں کمی کرے اور اس میں اشارہ ہے کہ تین دن مکمل بھوکا رہے۔ تو عَشَرَةِ میں جمع قلت کی انتہا اور جمع کثرت کی ابتداء ہے اور تین روزے رکھنے میں جمع قلت کی ابتداء مذکور ہے جو جمع کثرت کی ابتداء اطعام کے ساتھ برابر ہے۔ یہ تین روزے مسلسل رکھنا احناف کے نزدیک شرط ہے جو قراءت ابن مسعود و ابی بن کعب رضی اللہ عنہما سے استدلال ہے جبکہ دیگر آئمہ کے نزدیک پے در پے رکھنا سنت ہے شرط نہیں ہے: **ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ** : اس سے قسم توڑنا مراد ہے لیکن چونکہ کفارہ کیلئے اصل سبب قسم ہے اس لیے اس کو ذکر کیا ہے لہٰذا یہ دلیل ہے کہ قسم سے قبل کفارہ دینا جائز نہیں ہے۔ قسم توڑنے پر مقدم کرنے میں اختلاف ہے حدیث سے جواز پر اشارہ ملتا ہے مگر یہ صرف نیکی کے کاموں میں ہو۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان والنذ ورحدیث 6623 صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 1649) **وَاحْفَظُوْا اَيْمَانَكُمْ** : اس میں تین توجیہات ہیں۔ (۱) خازن نے لکھا ہے کہ کثرت سے اجتناب کرو۔ (۲) قرطبی نے لکھا ہے کہ قسم توڑنے کے بعد کفارہ ادا کرنے میں جلدی کرو۔ (۳) قسموں کو توڑنے سے قسموں کی حفاظت کرو۔ مگر یہ اس صورت میں ہے کہ قسم کسی شرعی کام کرنے سے رکنے یا کسی غیر شرعی کام کرنے کا نہ ہو: **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ** : اس میں اشارہ ہے کہ شرعی امور کی تفصیل نعمت ہے اس کا شکر ادا کرو جو کہ تمہارے ذمہ لازم ہے شکر ادا کرنا عمل سے ہوتا ہے لہٰذا ان امور پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو یقیناً شراب نوشی جوا اور درگاہوں کی عبادت اور تیروں کے ذریعے سے قسمت معلوم کرنا شیطانی عمل میں سے ہے تو اس سے اجتناب کرو تاکہ تم فلاح پاؤ" [۹۰]۔

تفسیر 90 (ربط) جب فرمایا گیا کہ: **لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ** : تو بعض لوگوں کے خیال میں خمر اور میسر طیبات میں سے تھے تو اس میں ان کا رد ہو رہا ہے کہ یہ **طَيِّبَات** میں سے نہیں ہیں: **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا** : امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ جاہلیت میں لوگ مذکورہ اعمال کے عادی تھے تو ایمان لانے کے بعد بھی بعض لوگوں میں وہ آثار باقی تھے اس لیے خطاب میں ایمان کی صفت سے ان کو مخاطب کیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ ایمان اور مذکورہ کام دو متضاد چیزیں ہیں۔ ابن عطیہ کا قول ہے کہ دور جہالت میں لوگ کتابوں اور پرندوں کے ذریعے سے فال نکالتے تھے اب بھی بہت لوگ اس مرض

میں مبتلاء ہیں: اِنَّمَا الْخَمْرُ سورۃ بقرہ آیت 214 میں اس کی تفسیر گزری ہے۔ مسند احمد میں مذکور ہے کہ حکم شراب بلحاظ تین مرحلوں میں نازل ہوا ہے فتح الربانی ج18 ص87۔ (۱) پہلی سورۃ بقرہ آیت 219 میں نازل ہوا تو بعض صحابہ کرام نے چھوڑ دی اور بعض پھر بھی پیتے رہے پھر سورۃ نساء آیت 43 میں حکم ہوا کہ نماز کے وقت شراب نوشی سے اجتناب کرو۔ اس سے بھی ترک شراب میں کوئی حد تک فائدہ ہوا لیکن پھر کچھ افراد اپنی عادت پر قائم تھے لیکن مائدہ کی اس آیت کے بعد تمام صحابہ کرام رک گئے اور جتنی شراب لوگوں نے گھروں میں ذخیرہ کر رکھی تھی مدینہ کی گلیوں میں برتن انڈیل دیئے اور برتنوں کو توڑ ڈالا تو یہ آیت تین الفاظ کی بنا پر شراب کی حرمت پر واضح دلیل ہے۔ (۱) رِجْسٌ مِّنْ (۲) عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اور (۳) فَاجْتَنِبُوْهُ (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4619 صحیح مسلم کتاب التفسیر حدیث 3032) میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس وقت شراب پانچ چیزوں کی بنائی جاتی تھی انگور، کھجور، شہد، گندم اور جو۔ خمر ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو عقل کو ڈھانپ لے یعنی اس کے پینے سے انسان ہوش کھو بیٹھتا ہے اور احمد (4/227 مجمع الزوائد 4/88 شیخ زبیر علی صاحب نے اس روایت کو صحیح مسلم حدیث 1579 کی تائید کی وجہ سے صحیح کہا ہے) حدیث میں ہے کہ شراب بیچنا اور اس کی قیمت لینا بھی حرام ہے اور امام ابن کثیر نے اس مسئلہ میں اس مقام پر بہت احادیث جمع کی ہیں ان کا مطالعہ کرنا چاہیے: وَالْمَيْسِرُ ہر قسم کا جوا کھیلنا مراد ہے اور چونکہ جوے کے ذریعے سے آسانی سے مال حاصل کیا جاتا ہے اس لیے اس کا نام میسر رکھا گیا ہے۔ امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ بچے جو گولیاں کھیلتے ہیں اور ایک دوسرے سے گولیاں جیتتے ہیں تو وہ بھی جوا میں داخل ہے: وَالْاَنْصَابُ نُصُبٌ یا نَصَبٌ کی جمع ہے اصل میں مفعول کے معنی میں ہے کھڑا کیا گیا منصوب ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں ہر وہ چیز جسکو مقرر کیا جائے لوگ اس کو سجدے کریں طواف ذبیحہ نذر و غیرہ چڑھاوے اس کے نام پر ہوں مجالس الابرار ص 121۔ مجلس 18 میں لکھا ہے کہ اس میں درخت، پتھر، قبر وغیرہ سب شامل ہیں جنکو اپنی طاقت کے موافق ڈھانا واجب ہے۔ یہاں پر مراد انصاب بنانا یا ان کی عبادت کرنا ہے: وَالْاَزْلَامُ اس سورۃ کی ابتداء میں: وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ: کی تفسیر گزری ہے۔ فائدہ: مفسر مہائمی نے تبصیر الرحمٰن میں لکھا ہے کہ شراب پینے میں عقل کی بربادی ہے اور جوا کھیلنے میں مال کی بربادی ہے کبھی کبھی فائدہ بھی ہوتا ہے اور انصاب میں انسان کی عزت کی بربادی ہے کیونکہ مخلوق کے سامنے تذلل عاجزی و انکساری کرتا ہے اور ازلام میں علم کی بربادی ہے کیونکہ اس عمل سے انسان جہالت کی تمام حدود کو عبور کر لیتا ہے۔ رِجْسٌ لغت میں ہر اس بری چیز کو کہا جاتا ہے جو عقل اور شریعت میں ناپسند سمجھی جاتی

ہو اور ان چیزوں کا رجس ہونا تفسیر الرحمٰن کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔ اس لفظ کا اطلاق اکثر ایسی جگہ میں ہوتا ہے یا چیز جس کی گندگی مخفی ہو اور عام لوگ اس کی حقیقت سے واقف نہ ہوں اس وجہ سے منافقین کو سورۃ توبہ آیت 95 میں رِجْسٌ کہا گیا ہے اور نَجَسٌ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ظاہراً اور باطناً نجس پلید ہو جیسا کہ مشرکین کو سورۃ توبہ آیت 28 میں کہا گیا ہے۔ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ: یعنی شیطان انسی وجنی یہ کام کرتے ہیں اور کرواتے ہیں اور لوگوں کیلئے مزین کرتے ہیں: فَاجْتَنِبُوْهُ ضمیر سب کی طرف راجع ہے تاویل مذکور کے ساتھ یا رِجْسٌ کی طرف راجع ہے۔ اس لفظ میں حرمت کے لیے نحرّمہ کی بنسبت زیادہ تاکید ہے: لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: اس میں اشارہ ہے کہ اس کے خلاف کرنے میں خسران وفساد ہے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝

"یقیناً شیطان چاہتا ہے کہ ڈال دے تمہارے درمیان بغض اور عداوت شراب نوشی اور جوا بازی کے ذریعے سے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے روک دے تو کیا تم رک جاؤ گے؟" [91]۔

تفسیر 91 اس آیت میں جوا اور شراب کی حرمت کی تاکید ہے کہ یہ دنیاوی اور اخروی فساد کا سبب ہیں چونکہ انصاب وازلام کی قباحتیں اس سورۃ کی ابتداء میں تفصیل سے ذکر ہوئی ہیں تو اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی صرف خمر اور میسر کی برائی و قباحت بیان کی: الْعَدَاوَةَ: گالی لڑائی جھگڑا مار پیٹ مراد ہے کیونکہ شراب پینے کے بعد فحش کلام منہ سے جاری ہوتا ہے جو دشمنی کا سبب بنتا ہے۔ میسر جوے میں مال ہارنے سے بلکہ بعض اوقات اولاد کو اہل کو داؤ پر لگا کر گروی کر لیتے ہیں پھر جب کسی کے پاس اپنی چیزیں مال دولت یا اہل وعیال دیکھتے ہیں تو یہ اس کیلئے دشمنی کا سبب بن جاتا ہے: وَالْبَغْضَآءَ: بغض سینہ میں رکھنے والے حسد کو کہا جاتا ہے۔ یہ سبب بنتا ہے قطع تعلق کا اور وہ زندگی میں فساد پیدا کرتا ہے: وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ: اس جملہ میں شراب نوشی اور جوا بازی کے دینی نقصانات بیان ہوئے ہیں اس لیے کہ خمر سے دل کو سرور ملتا ہے اور لذت جسمانی میں مستغرق ہو کر مزے میں ڈوب جاتا ہے تو ذکر الٰہی سے غافل ہوتا ہے۔ (میسر) جوا سے اگر کمائی کر لیتا ہے تو خوشی غرور تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور شکست کی صورت میں مال دوبارہ حاصل کرنے کیلئے مکر وفریب تلاش کرنے لگ جاتا ہے۔ مذکورہ حالتوں میں ذکر الٰہی سے بندہ غافل ہوتا ہے: وَعَنِ الصَّلٰوةِ۔ تخصيص بعد التعميم یعنی عام ذکر کے بعد خاص ذکر کو بیان فرمایا اس لیے کہ نماز میں جسم کے تمام اعضاء ذکر الٰہی کرتے ہیں: فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ:

اس سے مراد منع ہے مگر مبالغہ کے ساتھ اور یہی وجہ ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جواب میں اِنْتَهَيْنَا ہم منع ہو گئے فرمایا تھا جیسا کہ (ابوداؤد کتاب الاشربہ حدیث 3670 نسائی حدیث 5542 ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3049) میں ہے تو معلوم ہوا کہ اس میں بہت مبالغہ ہے۔امام رازی نے لکھا ہے کہ جب شراب دنیاوی اور اخروی فساد کی وجہ سے حرام قرار دیا گیا تو معلوم ہوا کہ دیگر نشہ آور چیزیں بھی حرام ہیں۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا ۚ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿٩٢﴾

"اور تم اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول اللہ ﷺ اور (ان کی مخالفت سے) ڈرو اگر تم پھر گئے تو جان لو کہ ہمارے رسول کی ذمہ داری تو پہنچا دینا ہے" [۹۲]۔

تفسیر 92 یہ آیت بھی خمر اور میسر سے متعلق ہے اس میں تین طریقوں سے تاکید ہے (۱) اطاعت کا حکم، (۲) مخالفت سے ڈرو، (۳) عذر کا خاتمہ اور عذاب کا مستحق ہونا: وَ أَطِيعُوا اللهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ: مراد تمام کاموں میں ہے البتہ شراب نوشی اور جوابازی اس میں خاص ہے: أَطِيعُوا الرَّسُولَ: میں اشارہ ہے کہ شراب اور جوا میں احادیث کی تشریح کی اشد ضرورت ہے اور ان کی طرف رجوع کرنا بہت ضروری ہے: وَاحْذَرُوا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت سے بچ جاؤ یعنی کسی چیز کے خوف سے اس کو چھوڑ نہ دینا: فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ اس کی جزاء مقدر ہے یعنی تم عذاب کے حقدار ہو تمہارا عذر ختم ہو چکا ہے اس حوالہ سے رسول پر کوئی ذمہ داری یا ملامت نہیں ہے: فَاعْلَمُوا بمعنی جزا کی دلیل ہے۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوا وَّآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوا وَّآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوا وَّأَحْسَنُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿٩٣﴾

"ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں ہے جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کیئے ہیں اس میں جو وہ چک چکے ہیں جب وہ شرک سے بچتے رہے اور ایمان رکھتے ہوں اور عمل صالح کیے پھر اپنے آپ کو حرام سے بچاتے رہے اور ایمان رکھیں اور پھر (شکوک و شبہات سے) بچتے رہے اور صالح عمل کریں اور اللہ تعالیٰ صالح عمل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے" [۹۳]۔

تفسیر 93 اس آیت میں ایک سوال کا جواب ہے (جس کو امام بخاری نے صحیح بخاری کتاب المظالم حدیث 2464 / 4620 صحیح مسلم حدیث 1980 وامام ترمذی نے ذکر کیا ہے) کہ شراب وجوا کی حرمت نازل ہونے کے بعد بعض صحابہ کرام نے سوال کیا کہ ان صحابہ کرام کا کیا حال ہوگا جو احد میں شہید ہو گئے اور ان کے پیٹوں میں شراب اور جوا کی

کمائی موجود تھی۔ تو اس آیت میں انکا جواب دیا گیا۔ سوال: اس آیت میں دو اشکال ہیں (۱) ایسے حال میں تو کسی کافر پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے جو حالت کفر میں مباح بلکہ حرام چیز کھائی ہو تو ایمان لانے اور توبہ کرنے کے بعد اس پر کوئی گناہ نہیں ہے تو پھر مومنین کی تخصیص کیوں کی ہے؟۔ جواب: کافر سے اس طرح خطاب نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اس صفت سے متصف ہوتا ہے کہ فلاں کام میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اس لیے کہ کفر تو ویسے ہی گناہوں کا مجموعہ ہے اور مومن کے بارے میں اندیشہ رہتا ہے ان چیزوں کے متعلق جو بعد میں حرام ہوئیں ہوسکتا ہے کہ تحریم سے پہلے کا گناہ ہو۔ سوال: مباح چیز کے متعلق گناہ کا نہ ہونا تو مومن کیلئے مشروع نہیں ہوتا تو پھر تین (۳) مرتبہ تقویٰ، تین (۳) مرتبہ ایمان، دو (۲) مرتبہ عمل صالح، اور ایک مرتبہ احسان ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟۔ جواب ۱: یہ مدح کے طور پر ہے یعنی صحابہ کرام ان چیزوں (خمر و میسر) کے مباح ہونے کے وقت ان دیگر صفات سے متصف تھے اور پھر ان چیزوں کی حرمت کے بعد بھی ان (تقویٰ۔ ایمان۔ عمل صالح) صفتوں سے متصف ہیں۔ (جواب ۲) اس میں ان اُمور کی نفی کی طرف اشارہ ہے جو ایمان و اعمال کی بربادی کے اسباب میں سے ہیں یعنی کفر شرک سے بچنا ریاکاری بدعات سے بچنا ریاکاری اور شہرت سے بچنا کیونکہ یہ تینوں درجے جب تقویٰ کے موجود نہ ہوں تو دیگر اعمال ضائع ہو جاتے ہیں تو مباح چیز سے منع کرنا مفید نہیں ہے۔

تنبیہ: تقویٰ تین مرتبہ ذکر ہونے میں مختلف اقوال ہیں۔ (۱) پہلا قول: پہلا تقویٰ ان چیزوں سے بچنا جو شراب نوشی اور جوا بازی کے مباح ہونے کے وقت بھی حرام تھیں۔ (۲) دوسرا تقویٰ ریاکاری شہرت سے بچنا۔ (۳) تیسرا تقویٰ تکبر اور خود پسندی کی طور پر نیک اعمال کی نسبت اپنی طرف کرنے سے اجتناب۔ (۲) دوسرا قول (۱) پہلا تقویٰ کفر و شرک سے بچنا۔ (۲) دوسرا تقویٰ کبائر (بڑے گناہوں) سے بچنا۔ (۳) تیسرا تقویٰ صغائر (چھوٹے گناہوں) اور شبہات سے بچنا۔ (۳) تیسرا قول (۱) پہلا تقویٰ بندے اور اس کی نفس کے درمیان ہے اور (۲) دوسرا تقویٰ اس بندے اور دیگر لوگوں کے درمیان ہے تیسرا تقویٰ اس بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے اور اس کے ساتھ احسان اس لیے ذکر کیا ہے جس کا معنی حدیث بخاری وغیرہ میں واضح ہے: اَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنۡ لَمۡ تَكُنۡ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (صحیح بخاری کتاب الایمان حدیث 50 صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 8) یعنی عبادت الٰہی میں اتنا اخلاص پیدا کرو گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اگر اتنا اخلاص نہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔ چوتھے قول کا ذکر جواب ۲ کے ضمن میں ہوا ہے ایمان کو بھی بار بار ذکر کیا ہے لہٰذا اس میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ (۱) پہلا قول پہلا ایمان سے اصول اور دوسرا

زیادت ایمان اور تیسرا موت تک قائم رہنا مراد ہے۔ دوسرا قول پہلے سے توحید مراد ہے دوسرے سے خمر و میسر کی حرمت پر ایمان اور تیسرے سے اس پر استقامت مراد ہے لہٰذا ہر قسم کے تقویٰ کے ساتھ ایمان کی ضرورت ہے تو جس طرح تقویٰ میں تین قسمیں ہیں اسی طرح ایمان میں بھی ہیں اور عمل صالح کی تکرار میں دو قسمیں ہیں پہلے میں فرائض واجبات کی طرف دوسری میں سنن و مستحبات کی طرف اشارہ ہے۔ باقی رہا احسان تو وہ اخلاص ہے اور وہ ان تمام مراتب تقویٰ ایمان اور صالح اعمال میں رکن اصلی کی حیثیت سے ہے اور سب میں یکساں ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللَّهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَخَافُهُ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٩٤﴾

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو البتہ ضرور تمہیں اللہ تعالیٰ آزمائے گا کچھ شکار میں سے کہ پہنچ سکتے ہے اس تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے تا کہ ظاہر کرے اللہ تعالیٰ کہ کون بن دیکھے اس سے ڈرتا ہے پھر جو حد سے گزر جائے تو اس کیلئے دردناک عذاب ہے" [۹۴]۔

تفسیر 94 جب آیت 87 میں ان چیزوں کا ذکر ہوا جو ہمیشہ کے لیے حلال ہیں اور آیت 90 میں ان چیزوں کا ذکر ہوا جو ہمیشہ کے لیے حرام ہیں تو اب اس آیت میں ان چیزوں کا ذکر ہے جو ایک خاص جگہ یا حالت میں حرام ہے اور دوسرے جگہ یا حالت میں حلال ہوتی ہیں جس کی تعبیر تحریمات الٰہیہ سے کی جا سکتی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللَّهُ: وہ تمام احکام الٰہی جن کا انسانوں کو مکلف بنایا گیا ہے ان کو ابتلاء کہا گیا ہے پھر جب نافرمانی کا سبب قریب ہو اور اطاعت کرنے میں مشقت ہو تو یہ ابتلاء سخت ہوتا ہے جیسا کہ یہاں تَنَالُهُ لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شکار کرنا آسان ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام اور منع ہے۔ یہ امتحان بنی اسرائیل کے امتحان کی طرح ہے (مچھلیاں ہفتہ کے دن پانی میں قریب اور کثرت سے ہوتیں لیکن ان کیلئے ہفتہ کو شکار حرام تھا وہ امتحان میں ناکام ہوئے اور یہ امت کامیاب ہے (الا ماشاء اللہ) یہ خطاب ان ایمان والوں سے ہے جو حرم میں یا احرام میں ہوں: بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ: من برائے تبعیض ہے یعنی خشکی کا شکار۔ بِشَيْءٍ: بتفسیر خازن و زمخشری نے لکھا ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ یہ ابتلاء دوسرے بڑے فتنوں کے مقابل آسان اور کم ہے جن میں اکثر لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ اس طرح لفظ بِشَيْءٍ سورۃ بقرہ آیت 155 میں بھی دلیل ہے کہ بنسبت دوسرے امتحانات اور فتنوں کے یہ آسان اور کم امتحان ہے: تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ: یعنی شکار ہونے والے جانوروں کے بچے انڈے یا

کم رفتار والے یا معذور جانوروں کا شکار جو بندہ ہاتھ سے پکڑ سکتا ہے: اَيْدِيْكُمْ : میں ہاتھ سے جال بچھانا ہے جس میں شکار پھنس جاتا ہے: وَرِمَاحُكُمْ بڑے جانور جو شکار ہونے سے بھاگتے ہیں اور بدن بھی ان کا بڑا ہو تو نیزہ کے بغیر ان کو شکار کرنا ممکن نہیں ہوتا: لِيَعْلَمَ اللّٰهُ : یہ ابتلاء کے لیے علت غائی ہے: يَعْلَمَ سے مراد لوگوں کے علم میں امتیاز کرنا مراد ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہے۔ اس کو علم: بَعْدَ الْوُجُوْدِ کہتے ہیں علم قَبْلَ الْوُجُوْدِ سے مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ: یہ ایمانی خوف ہے جو اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کی وجہ سے مؤمن پر آتا ہے اس لیے وہ حرام شکار سے بچ جاتا ہے: بِالْغَيْبِ یہ حال کے محل میں ہے یعنی بغیر اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کے ایسا ڈرتا ہے اور یہ قوی ایمان ہے بہ نسبت اس کی کہ بالفرض اللہ تعالیٰ کو دیکھ لے پھر اس سے ڈرے۔ جیسا کہ سورۃ انبیاء آیت ۴۹ میں ہے یا غیب سے مراد دل کا اخلاص ہے: فَمَنِ اعْتَدٰى اس سے حرم یا حالت احرام میں شکار کرنا مراد ہے: فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : دنیاوی سزا مراد ہے جو بعد والی آیت میں مذکور ہے یا آخرت کا عذاب ہے بشرطیکہ توبہ نہ کی ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ۭ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۹۵

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ تم شکار کو مارو جب کہ تم حالت احرام میں ہو اور جو کوئی تم میں جان بوجھ کر ماریگا تو اس پر بدلہ ہے مثل اسی کی جو اس نے قتل کیا ہے چوپائے میں سے تم میں سے دو انصاف والے اس کا فیصلہ کریں گے بطور قربانی کعبہ میں پہنچنے والی یا کفارہ ہے کچھ مسکینوں کو کھانا کھلانا یا اس کے برابر روزے رکھنے ہیں تاکہ وہ اپنے کام کی سزا چکھے جو گزرا اسے اللہ نے معاف کیا جو کوئی پھر کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لے گا اور اللہ تعالیٰ خوب غالب انتقام لینے والا ہے"[۹۵]۔

تفسیر 95 اس آیت میں حالت احرام میں شکار سے متعلق تفصیلی مذکور ہے۔ یہ دنیاوی سزا اور عذاب ہے: لَا تَقْتُلُوْا یہ نہی کی صورت میں ابتلاء کا بیان ہے۔ قتل عام ہے ذبح کے ذریعہ سے ہو یا گلا گھونٹنے سے ہو یا پتھر مارنے سے جانور بھی عام ہے زندہ ہو چاہے شرعاً اس کا کھانا حلال ہو یا حرام نیز اس میں سے (صحیح بخاری کتاب بدء الوحی حدیث 3314 وکتاب الصید حدیث 1826 صحیح مسلم کتاب الحج حدیث 1198، 119 میں) پانچ چیزیں مستثنی کی گئی ہیں۔ کوا، چیل، بچھو، چوہا اور باؤلا کتا۔ ایک روایت میں بچھو کی جگہ سانپ کا ذکر ہے: وَاَنْتُمْ حُرُمٌ : عام حکم ہے مرد ہو یا عورت۔ حرم میں ہو یا حرم

سے باہر ہو: مُّتَعَمِّدًا: مراد یہ ہے کہ اس کو یہ بھی یاد ہے کہ حالت احرام میں ہے اور نیت بھی شکار کی کرے تو یہ مُتَعَمِّدًا ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں۔ غلطی کرنے والا اور بھول جانے والے کا حکم حدیث سے ثابت ہے سنن ابوداؤد کتاب الحدود حدیث 4400 لہٰذا جمہور علماء کا یہی موقف ہے فَجَزَآءٌ: عبارت مقدر ہے یعنی: فَعَلَيْهِ جَزَاءٌ، مِثْلُ یہ جزاء سے بدل ہے خبر ہے مقدر مبتداء کیلئے یعنی: هُوَ مِثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ، مِنَ بیان ہے (مَا) کیلئے یعنی قتل کیا گیا چوپایہ جس سے ہو۔ یا مثل کیلئے بیان ہے: مماثلت کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) شکل وجسم میں (۲) قیمت میں۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ جن جانوروں میں ظاہری شکل وصورت میں مماثلت ہو وہی فدیہ کرنا لازم ہے اور جب مماثلت صوری ظاہری شکل میں نہ ہو تو پھر قیمت کی برابری لی جائیگی۔ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ قیمت میں برابری لازم ہے لیکن جمہور کا قول ہی درست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بارے میں صحابہ کرام سے روایتیں منقول ہیں جن میں صورت کی برابری ثابت ہے قیمت کی نہیں: النَّعَمِ یہ لفظ جانوروں اور پرندوں سب کیلئے مشترک ہے: يَحْكُمُ بِهِ: اس میں ضمیر مِثْلُ یا جَزَاءٌ کی طرف راجع ہے یعنی قیمت یا صوری مماثلت کا فیصلہ دو عادلوں کے حکم سے ہوگا مگر شرط یہ ہے کہ وہ دونوں اس بارے میں ماہر تجربہ کار ہوں: هَدْيًا یعنی جس جانور پر دو عادل بندے فیصلہ کریں تو وہ بطور قربانی حرم میں لایا جائے گا یعنی وہ قلادہ ڈالنے یا اشعار (نشان) لگانے میں قربانی ھدی کے حکم میں ہے: بٰلِغَ الْكَعْبَةِ مراد حرم ہے پہنچنے سے وہاں ذبح کرنا مراد ہے۔ یہ اگرچہ ہدیہ ہے مگر یہ مساکین کے ساتھ خاص ہے: اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ یہ جَزَاءٌ پر عطف ہے اور عَلَيْهِ مقدر ہے۔ یہ کفارہ ھدیہ نہ ملنے کی صورت میں اس قیمت پر غلہ خریدے اور مساکین میں عدل سے تقسیم کردے ہر مسکین کو گندم کا آدھا صاع دیا جائیگا: اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا: یعنی ہر آدھے صاع کی جگہ ایک روزہ رکھ لے۔ تنبیہ: اکثر اہل علم کا موقف یہ ہے کہ اس میں اَوْ برائے تخییر ہے کہ هَدْيٌ مثل صید سے بنائے اور حرم میں ذبح کرنے یا اس پر غلہ خرید کر حرم کے مساکین میں ہر ایک مسکین کو آدھا صاع دیدے یا ہر نصف صاع کے بدلے ایک روزہ رکھ لے بعض سلف نے اَوْ کو برائے ترتیب قرار دیا ہے: لِيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ: یہ اس جزاء کیلئے علت ہے یا الفاظ شَرَعَ مقدر ہے۔ وَبَالَ اصل میں بوجھ اور وزن کو کہا جاتا ہے مراد جرم کی سزا ہے: اَمْرِهٖ: جرم کی بے حرمتی اور اللہ تعالیٰ کے حکم توڑنے کی سزا ہے: عَمَّا سَلَفَ مراد یہ ہے کہ جہالت میں یا اس آیت کے نزول سے قبل جو کچھ ہو چکا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے معاف کیا ہے: فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ: دنیاوی یا اخروی عذاب کی طرف اشارہ ہے۔ اکثر اہل علم کا موقف ہے کہ جزاء بھی دیگا اور اس میں

اشارہ ہے کہ گناہوں پر ہمیشگی غضب الٰہی کا سبب ہے۔

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٩٦﴾

"حلال کیا گیا ہے تمہارے لئے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا تمہارے اور مسافروں کیلئے فائدہ ہے اور حرام کیا گیا ہے تم پر خشکی کا شکار جب تک تم حالت احرام میں ہو اور ڈرو اس ذات سے تم جس کی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے" [۹۶]۔

تفسیر 96 پہلے حالت احرام میں ابتلاء اور اس کی سزا کا ذکر ہوا تو اب حالت احرام میں شکار کی تقسیم کا ذکر بطور ابتلاء ہو رہا ہے: أُحِلَّ لَكُمْ: میں خطاب مسلمانوں سے ہے خواہ عام حالت میں ہوں یا حالت احرام میں: صَيْدُ الْبَحْرِ سے مراد وہ شکار اور حلال چیز ہے جو صرف سمندر میں بسنے والی ہو اور خشکی میں بغیر پانی زندگی نہیں گزار سکتی ہو: وَطَعَامُهُ فرق یہ ہے کہ صید تازہ شکار اور طعام جو ذخیرہ بنایا گیا ہو نمک وغیرہ لگا کر محفوظ کیا گیا ہو۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ صید وہ ہے جو شکار کر کے کسی آلہ وغیرہ سے سمندر میں پکڑ کر نکالا گیا ہو اور طعام وہ ہے جو سمندر میں مرا ہوا خود باہر پھینکا ہو۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے کہ صحابہ کرام کیلئے سمندر نے ایک مچھلی باہر پھینکی جسے صحابہ کرام اٹھارہ دن تک کھاتے رہے اور کچھ حصہ گوشت کا اپنے ساتھ نبی کریم ﷺ کیلئے لیکر گئے تھے (صحیح بخاری کتاب الشرکۃ حدیث 2483 صحیح مسلم کتاب الصید حدیث 1935)۔ نیز جس حدیث میں سمک طافی سے منع وارد ہوا ہے وہ روایت محدثین کے نزدیک ضعیف ہے امام قرطبی نے اس پر مفصل بحث کی ہے (ابوداؤد کتاب الاطعمۃ حدیث 3815 ابن ماجہ حدیث 3247 اس حدیث کو شیخ البانی شیخ علی احمد شیخ مصطفیٰ سید اور دیگر محققین نے ضعیف کہا ہے)۔ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ: پہلی قسم حالت حضر میں اور دوسری قسم حالت سفر میں کام آتی ہے: وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ: شکار کرنا یا ذبح کرنا یا کھانا تینوں منع اور حرام ہیں لیکن اس شرط پر کہ اس محرم نے شکار کا حکم دیا ہو یا اس کیلئے شکار ہوا ہو یہ سب حرام ہیں۔ اس سورۃ میں یہ حرمت تین دفعہ ذکر ہوئی ہے۔ (۱) آیت 95 میں اس آیت میں بھی ان آیتوں میں بہت تاکید کیلئے ہے: وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي: یہ بھی حرمت کی تاکید کیلئے ہے۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ۭ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

"اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو حرمت والا گھر بنایا ہے لوگوں کیلئے قیام کا سبب اور حرمت والے مہینوں کو اور حرم والی قربانی کو اور پٹیوں والے (جانوروں) کو اور یہ اس لیے کہ تم جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور یقینا اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے" [97]۔

تفسیر 97 یہ ماقبل کیلئے بمنزلہ علت ہے یعنی خشکی کے شکار کی حرمت احترام کعبے کیلئے ہے: جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ یہ جَعَلَ تکوینی اور تشریعی ہے۔ اَلْكَعْبَةَ کعبہ بلند جگہ کو کہا جاتا ہے چونکہ کعبہ وادی مکہ میں بلند جگہ پر واقع ہے اسی طرح بلند مرتبے والا بھی ہے: اَلْبَيْتَ الْحَرَامَ: یہ کعبہ کیلئے عطف بیان ہے مدح کے لیے ہے وضاحت کے لیے نہیں ہے اس لیے کہ لفظ کعبہ اس سے زیادہ واضح ہے: قِيٰمًا لِّلنَّاسِ: یعنی نظام زندگی اور دین اس کے ذریعے سے قائم ہوتا ہے۔ یعنی وہاں قائم ہے اور وہاں دنیا کے مختلف حصوں سے رزق پھل وغیرہ آتے ہیں لہٰذا رزق کی فراوانی اور امن کا قیام حیات طیبہ ہے۔ دوسرا قیام دین کا ہے اس لیے حج وعمرہ سے دین کا قیام ہوتا ہے۔ اس لفظ میں اشارہ ہے کہ جب تک زمین پر کعبہ ہے تو دنیا فنا نہیں ہوگی۔ بخاری کی حدیث میں ہے کہ قیامت سے پہلے ایک حبشی موٹی پنڈلیوں والا یمن سے اُٹھے گا اور کعبہ پر حملہ کر کے ڈھا دیگا پھر قیامت قائم ہوگی۔ (صحیح بخاری کتاب الحج حدیث 1596 صحیح مسلم حدیث 2909): وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ یہ اسم جنس ہے جس سے مراد حرمت کی چار مہینے ہیں یعنی محرم، ذوالحجہ، ذوالقعدہ اور رجب جو مشرکین کی زبان پر رجب مضر کے نام سے موسوم تھا۔ یہ بھی قیام ہے جو اس میں ایک دوسرے کو امن دیتے اور حرمت قتال کیلئے سبب بنا تھا وَالْهَدْيَ وہ جانور جو حرم مکہ کی طرف روانہ کئے جاتے ہیں ان کے پہلو پر شعار ہوگی یعنی زخم لگا کر خون کی نشانی ہوگی جیسا کہ سنت سے ثابت ہے اس علامت کی وجہ سے پتہ چلے گا کہ ان کا راستہ روکنا منع اور حرام ہے لہٰذا اس کے ذریعے سفر کرنے والوں کو حرم کی طرف جانے کیلئے امن حاصل ہوگا: وَالْقَلَآئِدَ: وہ چوپائے جو حرم کی طرف روانہ کیے گئے ہوں اور ان کے گلوں میں پٹے ڈال دیے گئے ہوں۔ ان کو الگ اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان کا اجر وثواب عام قربانیوں سے زیادہ ہے۔ یہ بھی امن کا سبب ہے ان چوپایوں اور سفر کرنے والوں کیلئے جو حرم کی طرف محو سفر ہوں۔ بعض لوگ بھی اس طرح پٹے گلوں میں ڈالتے تھے جب حرم کی طرف سفر کرتے لیکن یہ رسم جاہلیت والوں کی تھی اسلام میں یہ صرف جانوروں کے ساتھ خاص ہے۔ ان تین لفظوں کے

بعد قِيَامًا مراد ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب دنیا کے اطراف سے کعبہ کا احترام حج وعمرہ سمیت ان تین چیزوں کے ساتھ جاری ہوتو دنیا میں امن قائم ہوگا اور دنیا آباد ہوگی لہذا یہ عام انسانوں کے ساتھ ساتھ مکہ والوں کیلئے بھی سبب امن ہے۔ (سوال) سورة نساء آیت 5 میں اموال یعنی مال کو قیام کہا ہے تو یہ دونوں یکساں ہیں؟۔ (جواب) وہاں پر: لَكُمْ قِيَامًا: فرمایا ہے یعنی مال تو ہر شخص کی زندگی گزارنے کا ذریعہ ہے جبکہ کعبہ ساری دنیا کی آبادی کا ذریعہ ہے چنانچہ مال کا فائدہ انفرادی اور کعبہ کا اجتماعی ہے ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا: یہ ماقبل کا فائدہ ہے اس سے مراد توحید فی العلم کا اثبات اور شرک فی العلم کا رد ہے اور اشارہ ہے کہ حج وعمرہ کرنے والوں کو بالخصوص یہ عقیدہ رکھنا چاہئے اور عبرت ضرور حاصل کرنی چاہئے: وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے پہلے جملہ میں علم کی عمومیت کا ذکر تھا اور اس جملہ میں علم کا احاطہ مذکور ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾

"جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے (اعراض کرنے والوں کو) اور یقیناً (ماننے والوں کو) اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے" [۹۸]۔

تفسیر 98 اس آیت میں گزشتہ احکام پر عمل کرنے کی تاکید ہے جو ماننے والوں کیلئے خوشخبری اور انکار واعراض کرنے والوں کیلئے تخویف ہے اور اشارہ ہے کہ ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾

"نہیں رسول کے ذمہ مگر پہنچانا اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو" [۹۹]۔

تفسیر 99 اس آیت میں سابقہ اعمال کرنے کی دو طریقوں سے تاکید ہے پہلا طریقہ یہ ہے کہ: مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ: نبی کا پہنچانا تم پر حجت ہے تمہاری کوتاہی اور کاہلی عذر نہیں ہے اور اِلَّا الْبَلٰغُ: حصر اضافی ہے یعنی ہدایت کی توفیق یا ثواب وعذاب نبی کے ذمہ نہیں ہے۔ دوسرا طریقہ: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ: یعنی ظاہری اور باطنی احوال اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور تمہاری موافقت بھی اسی کے علم میں ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جزاء وسزا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٠٠﴾

"فرما دیجئے پاک اور ناپاک برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاک کی تعداد تمہیں تعجب میں ڈالے عقل والو تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو تا کہ تم کامیابی حاصل کرو" [۱۰۰]۔

تفسیر 100 تاکیدات کے بعد صحیح عقائد، صالح اعمال اور اچھے اخلاق کی طرف ترغیب دی جا رہی ہے اور ناپاک سے بچنے کی تحذیر اور ایک اشکال کا جواب بھی ہے۔ اشکال یہ ہے کہ عام چیزوں میں کثرت کا اعتبار ہے خصوصاً ہمارے اس زمانہ میں جیسے جمہوریت ہے۔ تو جواب دیا گیا کہ پاک اور ناپاک کی تمیز ضروری ہے کثرت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۃ انعام آیت 117 میں ہے: لَّا يَسْتَوِي: یہ برابری نہ ہونے سے مراد اصطلاح شریعت اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے: الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ خبیث کو کثرت کی وجہ سے مقدم لایا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہم کرنے والے طیب کو خبیث کے ساتھ برابر تصور کرتے ہیں تو اس میں ان کی تردید مقصود ہے۔ امام قرطبی کا قول ہے کہ یہ دونوں لفظ عام ہے اور مندرجہ ذیل امور و اشیاء کو شامل ہیں۔ انسان، عقائد، علوم، حلال و حرام، مسلم و کافر، مخلص و منافق، صالح و فاسق وغیرہ اس طرح مضمون سورۃ اعراف آیت 58، سورۃ ص آیت 28، سورۃ جاثیہ آیت 21، سورۃ قلم آیت 35 میں ہے: وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ: یہ تعجب بے اختیار مراد ہے تو اس اعتبار سے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور جب تکبر اور دنیا کی خوشی مراد لی جائے تو پھر خطاب عام ہے جس میں ہر وہ شخص شامل ہے جو پاک اور ناپاک میں فرق نہیں کرتا: فَاتَّقُوا اللَّهَ: تقویٰ یہ ہے کہ طیب کو اپناؤ اگرچہ کم ہو اور خبیث سے بچ جاؤ اگرچہ وہ کثیر ہو: يَا أُولِي الْأَلْبَابِ: اشارہ ہے کہ پاک اور ناپاک میں امتیاز کیلئے خالص عقل چاہیے جو چیزوں کی حقیقت میں فکر کرتی ہے اور طیب و خبیث کو مساوی نہیں کرتی بلکہ اس میں فرق کرتی ہے: لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ یہاں پر فلاح سے مراد وہ درجات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے طَيِّبِينَ کیلئے خاص کیے ہیں۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَسْـَٔلُوا۟ عَنْ أَشْيَآءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۖ وَإِن تَسْـَٔلُوا۟ عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ ٱلْقُرْءَانُ

تُبْدَ لَكُمْ ۖ عَفَا ٱللَّهُ عَنْهَا ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٠١﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے تم سوال مت کرو ایسی چیزوں کی بابت کہ اگر وہ تمہارے لئے ظاہر کر دی جائیں (جواب کی صورت میں) تو تمہیں ناگوار گزریں اور اگر تم اس کی بابت پوچھو گے جب قرآن اتارا جارہا ہو تو ظاہر کر دی جائیں گی تمہارے لئے (اس کا جواب) اللہ تعالیٰ نے ان سے درگزر کیا اور اللہ بہت ہی بخشنے والا انتہائی صبرناک ہے" [١٠١]۔

تفسیر 101 (ربط ۱) جب پاک اور ناپاک میں امتیاز پر زور دیا گیا تو سامعین کی طرف سے کثرت سے سوالات شروع ہوئے انہیں سوال کا ادب سکھایا جارہا ہے۔ مضمون کے اعتبار سے ربط یہ ہے کہ جب معاشرے میں حرام کھانا پینا عقائد و اعمال غیر اللہ کے نذرانے وغیرہ کثرت سے ہوں تو ایسے حالات میں بلاضرورت اور بے جا اختلافی مسائل میں الجھنے کے بجائے توحید و سنت کی عام دعوت دینی چاہئے اور ان بحثوں میں نہیں پڑنا چاہئے کیونکہ ایسی صورت میں کہ جب اہل توحید ان امور کی روک تھام نہیں کریں گے اور اپنی اس قسم کی بحثوں میں مشغول ہونگے تو نتیجہ یہ نکلے گا شرک اور بدعت کو قوت حاصل ہوگی۔ تنبیہ: ایسے لوگوں پر افسوس ہے کہ علاقے میں کفر اور شرک زوروں میں ہو اور یہ لوگ عملی اختلافی مسائل میں باہم دست و گریبان اور وہ بھی غیر ضروری باتوں میں الجھ کر مخالف کیلئے میدان خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ مناظروں کو ترجیح دیتے ہیں اور شرک اور کفر کا مقابلہ نہیں کرتے: يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟: ایمان کا تقاضا ہے کہ ضروری اور غیر ضروری مسائل میں فرق کیا جائے: لَا تَسْـَٔلُوا۟ عَنْ أَشْيَآءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ: ان سوالات میں عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کا سوال بھی داخل ہے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا کہ: مَنْ أَبِي: میرا والد کون ہے؟ ایک شخص نے سوال کیا کہ أَيْنَ أَنَا: میں کہاں ہوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: فِي النَّارِ: جہنم میں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ: أَيْنَ أَبِي: میرا والد کہاں ہے فرمایا: فِي النَّارِ (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4621 صحیح مسلم کتاب الفضائل حدیث 2359)۔ اس روایت کو ابن جریر نے بھی نقل کیا ہے اور ابن کثیر نے اس کی سند کو درست قرار دیا ہے۔ ایک شخص نے سوال کیا: أَيْنَ نَاقَتِي: میری اونٹنی کہاں ہے۔ (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4622)۔ نبی کریم ﷺ نے فرضیت حج بیان فرمائی تو ایک شخص نے سوال کیا کہ: أَفِي كُلِّ عَامٍ: (ابوداؤد کتاب الحج حدیث 1721) یعنی ہر سال فرض ہے یہ سوال نزول وحی کے وقت کیا گیا تھا جو اس آیت کے ضمن میں یقیناً داخل ہے۔ بعد میں ذکر ہونیوالے سوالات عموم آیت کی وجہ سے داخل ہیں جیسا کہ

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ سوالات بھی داخل ہیں جو بطور استہزاء۔ یا ہٹ دھرمی کی بنیاد پر یا بطور امتحان ہوں امام ابن قیم نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ اس قسم کے سوالات اب بھی ہو سکتے ہیں لہٰذا اس آیت کا حکم اب بھی جاری ہے جیسا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حوض والے سے کہا تھا کہ ہمیں خبر نہ دینا جب اس کے ایک ساتھی نے حالت سفر میں مالک حوض سے سوال کیا تھا کہ تمہارے اس حوض پر درندے آتے ہیں مشکوٰۃ حدیث 465 اس حدیث کو شیخ البانی صحیح کہا ہے: اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ: یعنی جب جواب دیا جاتا ہے تو سائل ناراض ہو جاتا ہے یہ جملہ اشیاء کیلئے صفت مقیدہ ہے اور یہ احترازی قید ہے تو معلوم ہوا کہ صحیح سوال تو کرنا چاہئے جیسا کہ حکم الٰہی ہے کہ: فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ سورۃ انبیاء آیت 7 اور سورۃ نحل آیت 43۔ لہٰذا ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے اور اس قید لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہے جو بعض مفسرین نے لگائی ہے یعنی: بِمَا لَا تَدْعُوْا اِلَيْهِ حَاجَةٌ: کیونکہ یہ فائدہ اس جملہ میں معلوم ہوا ہے کہ: اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ: لہٰذا مذکورہ قول کی ضرورت نہیں ہے: وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ: اس کے متعلق مفسرین کے تین اقوال ہیں۔ (۱) اس میں سوالات پر زجر ہے یعنی قرآن مجید کا نزول جاری ہے اور تم اس قسم کے بلا ضرورت سوالات کرتے ہو تو ضرور قرآن میں جواب نازل ہوگا اور پھر اس جواب پر تم ناراضگی گی کا اظہار کرو گے۔ (۲) پہلے جملے میں ابداء کو ناپسندیدگی کا سبب قرار دیا تو اس جملہ میں ابداء کا طریقہ ذکر ہوتا ہے جو سوال کے متعلق وحی کا نزول ہے۔ (۳) اگر تم لوگوں نے صبر کیا کہ قرآن میں کوئی حکم نازل ہوا اور اس کی مزید تشریح کی ضرورت ہو تو سوال کر و اس کا جواب مل جائیگا۔ اس تفسیر کی بنا پر سوالات کرنے کی ترغیب دی گئی ہے: عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا: اس میں دو توجیہات ہیں (۱) یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ وحی کے نزول سے پہلے یہ سوالات اللہ تعالیٰ نے (ممانعت کے نزول سے قبل اگرچہ وہ گناہ کا کام تھا) تمہیں معاف کیے ہیں۔ (۲) یہ اشیاء کیلئے دوسری صفت ہے یعنی ایسی چیزیں جن کے متعلق قرآن میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا اور وسعت رحمت کی وجہ سے وہ تم پر لازم بھی نہیں ہیں یا اس لیے اس کا بیان چھوڑ رکھا ہے کہ اس کے بیان سے تمہاری ناراضگی نہ ہو۔ یہ توجیہ ترکیب کے اعتبار سے بہت بعید ہے: وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ: یعنی گناہوں کو معاف کرتا ہے: حَلِيْمٌ عذاب کے مستحق سے بھی عذاب موخر کرتا ہے اور اس کو تادیب بھی دیتا ہے۔

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ۝

"پوچھا تھا ان کے متعلق تم سے پہلے ایک قوم نے پھر ہو گئے وہ ان کے ساتھ کفر کرنے والے"[۱۰۲]۔

تفسیر 102 اس آیت میں ممانعت کی وجہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب اس طرح سوالوں کے جواب نازل ہوتے ہیں تو ناپسند ہونے کی وجہ سے سامعین انکار کر لیتے ہیں جو کفر کا سبب بنتا ہے۔ قوم سے مراد بنی اسرائیل اور دیگر جھٹلانے والے ہیں۔ جیسے صالح علیہ السلام کی قوم نے اونٹنی کا مطالبہ کیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی قوم نے دسترخوان کا مطالبہ کیا تھا: قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ یعنی قَدْ سَاَلَهَا مِثْلَهَا: یعنی ایسے ہی سوال ان کے بھی تھے جو بے فائدے اور سبب ناراضگی اور وبال تھے۔ فائدہ: تفسیر قاسمی میں لکھا ہے کہ اس میں وہ تفریعات داخل ہیں جو کسی ایسے مسئلے پر ہوں جو قرآن وسنت اور اجماع سے ثابت نہ ہو اور اس کا وجود بھی نادر ہو بے ضرورت اس پر وقت خرچ کیا جائے۔ اس بحث میں وہ بھی داخل ہے جو غیبی امور سے متعلق ہے جبکہ ان امور پر ایمان اجمالاً لانا لازم ہے جیسا کہ صفات باری تعالیٰ ہیں عذاب قبر کا مسئلہ ہے یعنی اس کی کیفیتوں پر بحث تو کرتے ہیں مگر ان کے پاس نہ قرآنی آیت اور نہ حدیث رسول ہوتی ہے۔ امام شافعی نے موافقات میں سوالات کی کراہیت کے حوالے سے دس صورتیں ذکر کی ہیں۔ (۱) وہ سوال جو دینی امور میں فائدہ نہیں دیتا ہو۔ (۲) جس کا تفصیلی بیان ہو چکا ہو۔ (۳) ایسی چیز کے متعلق سوال جس کی ضرورت فی الحال نہ ہو۔ (۴) ایسے غلط سوال جن کا جواب ہی نہیں ہوتا۔ (۵) ایسے سوالات جن میں دینی مسائل کی ان علتوں سے متعلق سوال جو شریعت نے نہیں بتائیں۔ (۶) ان امور سے متعلق سوالات جو تکلف پیدا کریں (۷) اپنی رائے سے قرآن وسنت کے معارض سوالات بنانا۔ (۸) متشابہات میں سوالات کرنا۔ (۹) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اختلافات کے متعلق سوالات کرنا۔ (۱۰) کسی عالم سے بطور ضد وعناد ایسے سوالات کرنا جس میں اس کی ذلت ہو یا چپ کرانا مقصد ہو۔ ان سوالوں کی ترتیب وار مثالیں حسب ذیل ہیں حذیفہ رضی اللہ عنہ کا سوال کہ میرا والد کون ہے؟ صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4621 صحیح مسلم کتاب الفضائل حدیث 2359 یا چاند کا بڑا چھوٹا ہونا تفسیر ابن جریر 554،32۔ ہر سال حج فرض ہے؟ صحیح ابن حبان حدیث 2106 عبدالرزاق 20372 بزار 7505 (صحیح) حائضہ عورت پر نماز کی قضا کیوں نہیں ہے؟ صحیح بخاری حدیث 321 صحیح مسلم حدیث 335 حوض والے سے سوال کہ اس حوض پر پانی پینے کیلئے درندے آتے ہیں؟ جس کو عمر رضی اللہ عنہ نے منع کیا کہ ہمیں مت بتاؤ۔ موطا امام

مالک حدیث 14 شیخ البانی نے اس روایت کی تخریج مشکوۃ حدیث 465 میں کی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے اس کے علاوہ بہت ساری مثالیں موجود ہیں لہٰذا یہ سب لَا تَسْئَلُوا میں داخل ہیں۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِيْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ ۙ وَّ لٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

"جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کان چیرا ہوا اور نہ ہی آزاد چھوڑا گیا اور نہ ہی جوڑا گیا اور نہ ہی سواری سے بچایا گیا لیکن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے باندھتے ہیں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ اور ان میں اکثریت بے عقلوں کی ہے" [۱۰۳]۔

تفسیر 103 (ربط) سابقہ آیت میں اس قسم کے سوالوں سے منع کیا گیا جن میں بعض چیزیں حرام ٹھہرائی جائیں تو اب اس آیت میں اپنی جانب سے حرمت کے فیصلوں سے منع کیا جا رہا ہے اس میں اشارہ ہے کہ بے ضرورت بحث مت کرو البتہ بدعات و رسومات کا رد کیا کرو کیونکہ یہ ضروری ہے۔ چنانچہ اس آیت میں غیر اللہ کے نام حرام کی ہوئی چیزوں کا رد ہے: مَا جَعَلَ اللّٰهُ : کہ سابقہ آیت 97 میں مذکور جَعَلَ کے مقابل ہے یہاں بھی جعل سے مراد حکم اور شریعت بنانا ہے یعنی یہ: مَا اٰمَرَ، مَا حَكَمَ، مَا شَرَعَ: کے معنی میں ہے: مِنْ بَحِيْرَةٍ مِنْ: برائے استغراق اور تاکید ہے۔ امام قرطبیؒ نے سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے کہ بحیرہ وہ مادہ ہے یعنی گائے، بکری، بھینس اونٹنی وغیرہ جس کا دودھ اپنے معبودوں کیلئے مختص کیا گیا ہو یعنی اس کو عام لوگ استعمال نہیں کر سکتے اور بطور نشان اس کا کان چیرا ہو۔ امام شافعی اور ابن عزیز سے منقول ہے کہ اس سے مراد وہ اونٹنی ہے جو چھٹی مرتبہ نر بچہ جن لیتی تو مشرکین کہتے کہ یہ ہمارے مرد و زن سب کیلئے حلال ہے اور اگر وہ اونٹنی مادہ جن لیتی تو وہ کہتے کہ اس کا دودھ اور گوشت ہماری خواتین کیلئے درست نہیں ہے اور بطور علامت اس کا کان چیر لیتے۔ عکرمہ فرماتے ہیں کہ اس کی تمام چیزیں یعنی گوشت، دودھ، اون وغیرہ خواتین کیلئے حرام قرار دیتے البتہ مردار ہونے کی صورت میں ان کیلئے جائز قرار دیتے۔ امام بخاری نے کتاب التفسیر حدیث 2623 صحیح مسلم کتاب الجنۃ حدیث 2856 نے سعید بن مسیب کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اس کا دودھ اپنے مقرر کئے ہوئے طواغیت معبودوں کیلئے خاص کر لیتے: وَّ لَا سَآئِبَةٍ: قرطبی، خازن اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ دور جہالت میں اگر کوئی بیمار ہو جاتا یا کوئی رشتہ دار گم ہو جاتا تو وہ اللہ تعالیٰ کے نام پر اونٹنی کا نذرانہ مان لیتے اور اس کو مستثنیٰ قرار دیتے کہ اس پر سواری کرنا یا وزن لادنا حرام تصور کرتے اور اس کو اپنی فصلوں اور باغوں سے منع کرنا اپنے لئے نقصان تصور کرتے۔ امام بخاری نے سعید کی روایت میں یہ

ذکر کیا ہے کہ ان جانوروں کو معبودوں کے نام پر آزاد کر لیتے۔امام رازی نے بھی لکھا ہے کہ اس کے اختیارات صرف مجاوروں کے پاس ہوتے: وَّلَا وَصِيْلَةٍ :مفسر خازن نے لکھا ہے کہ بکری کے متعلق تھی یعنی سات مرتبہ بچے جن لینے کی صورت میں آخری مرتبہ اگر نر پیدا ہوتا تو ذبح کرتے گوشت مرد وزن کھا لیتے اور اگر مونث بکری پیدا ہوتی تو اس کو ریوڑ میں چھوڑ کر پالتے اور اگر جوڑا پیدا ہوتا تو اس کیلئے یہ الفاظ استعمال کرتے :وَصَلَتْ اَخَاهَا :یعنی یہ بکری بھی اپنے بھائی کے حکم میں ہوگئی تو دونوں کو زندہ چھوڑ دیتے۔ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ یہ وہ بکری تھی جو دس (۱۰) مرتبہ مؤنث (مادہ) بچوں کو پے در پے جن لیتی تو یہ لوگ اس لفظ کو استعمال کرتے کہ وصلت تو اس کے بعد وہ جو بھی بچے جنتی تو وہ مردوں کیلئے حلال اور عورتوں کیلئے حرام کا حکم لگاتے۔صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4623 صحیح مسلم کتاب الجنۃ حدیث 2856 میں ہے کہ یہ سب معبودوں کے نام پر کرتے: وَّلَا حَامٍ :قرطبی نے فرمایا اس سے مراد وہ اونٹ ہے جس کے ملاپ سے دس اونٹیاں گابھن ہوجاتیں تو اس اونٹ کی کمر پر شتر مرغ کا پر لگادیتے یعنی کھڑا کر لیتے اور اس پر سواری کرنا یا وزن اُٹھانا منع کرتے اور کسی بھی چیز گھاس اور پانی وغیرہ سے اس کیلئے کوئی روک نہیں ہوتی تھی وہ آزاد پھرتا تھا۔اس کے متعلق بھی امام بخاری نے لکھا ہے کہ طواغیت کے نام پر چھوڑ دیتے۔ تنبیہ: امام ابن کثیر نے لکھا ہے کہ عمرو بن لحی بن قمعہ جو خزاعہ قبیلے کا سردار تھا اور بنی جرہم کے بعد بیت اللہ کا متولی تھا یہ پہلا شخص تھا جس نے ابراہیم علیہ السلام کے دین کو بدل ڈالا اور ملک شام سے بت پرستی عرب میں منتقل کی اور یہ سمیت یعنی بحیرہ سائبہ وغیرہ عرب میں رائج کیں۔امام بخاری نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے عمرو بن لحی کو جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹتے ہوئے دیکھا ہے۔صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4663 صحیح مسلم کتاب الجنۃ حدیث 2856: وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ :یہ اس وہم اور اشکال کا جواب ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا ہے تو وہ لوگ یہ کام کیوں کرتے تھے؟ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹی نسبت کی تھی کہ ہمیں یہ حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور یہ دین ابراہیم علیہ السلام میں سے ہے جیسا کہ سورۃ اعراف آیت 28 میں ہے یعنی انکا دعویٰ یہ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کا حکم مانتے ہوئے یہ اعمال بجالاتے ہیں جبکہ ان کا یہ دعویٰ جھوٹا تھا: وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ: سوال دیگر آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر سارے بے عقل ہیں تو یہاں اکثر کہنے کا مقصد کیا ہے؟ جواب: امام ابن جوزی نے امام شعبی سے نقل کیا ہے کہ یہاں مراد عوام ہیں جو بڑوں کی تقلید کرتے ہیں اور ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے بڑوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا ہے لہٰذا یہ

ان کی تقلید میں گمراہ ہو گئے۔ فائدہ: اہل علم کا بَحِيْرَةٍ، سَآئِبَةٍ، وَصِيْلَةٍ :اور حَامٍ کے متعلق حکم شرعی میں اختلاف ہے۔ اکثر اہل علم کا قول ہے کہ یہ شرعاً حلال ہیں اور لوگوں کے حرام کرنے سے حرام نہیں ہونگے جیسا کہ باقی تحریمات لغیر اللہ ہیں اور بعض علماء کا قول ہے کہ یہ سب حرام ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ مَا جَعَلَ: کا معنی ہے مَآ اَحَلَّ یعنی حلال نہیں کیا ہے۔ لیکن صحیح موقف یہ ہے کہ اس میں تفصیل کی ضرورت ہے۔ اگر مشرکین نے مذکورہ چیزوں کے متعلق اپنے معبودوں کے نام مختص کیے ہوں جیسا کہ ہم نے صحیح بخاری کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ مشرکین ان چاروں کو اپنے معبودوں کے نام پر مقرر کرتے تھے تو ایسی صورت میں یہ حرام ہیں کیونکہ یہ غیر اللہ کی نذر تحریم کے ساتھ خلط ملط ہو گئی ہے جبکہ غیر اللہ کی نذر کا حکم یہ ہے کہ وہ حرام ہے جیسا کہ: مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ: میں یہ تفسیر گزر چکی ہے۔ اگر ان چیزوں میں صرف تحریم ہو اور غیر اللہ کی نذر اس میں شامل نہ ہو تو پھر جیسے بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حلال ہے جیسے دیگر تحریمات لغیر اللہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مَا جَعَلَ فرمایا ہے جو کہ عام ہے تو مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے بارے میں حکم نہیں دیا ہے کہ حلال ہے یا حرام۔ لہٰذا یہاں پر یہ نہیں فرمایا: لَا تُحَرِّمُوْا یا اَحَلَّ لَكُمْ: جیسا کہ دیگر تحریمات لغیر اللہ میں ذکر کیا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿١٠٤﴾

"اور جب ان سے کہا جائے آؤ تم اس چیز کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں کافی ہے ہمارے لئے وہ جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا اگرچہ ہوں ان کے آباء اجداد نہ کچھ جانتے ہوں اور نہ ہی وہ ہدایت یافتہ ہوں" [۱۰۴]

تفسیر 104 اس آیت میں جہالت کے مرتکب تقلید کے پیروکاروں کو تنبیہ دی جارہی ہے اور ان کے دلائل کو باطل قرار دیا جارہا ہے کہ وہ دلائل نہیں ہیں بلکہ وہ آباء کے توہمات کی پیروی ہے جو شرک انہوں نے مرتب کیا یعنی سَآئِبَةٌ وَصِيْلَةٌ حَامٍ: وغیرہ پر ان کے پاس کوئی دلیل شرعی نہیں ہے بلکہ آباء واجداد کی پیروی ہے: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مجہول صیغہ اس لیے ذکر کیا ہے کہ عام ہو جائے یعنی جب بھی جہاں بھی سوال کرو تو جواب یہ ملتا ہے یا جب ان کو دعوت دی جائے: تَعَالَوْا: یہ لفظ اپنے مادہ علو کے اعتبار سے اس آواز میں استعمال کیا جاتا ہے جہاں ترقی کی طرف جانے کی دعوت ہو: اِلٰى

مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ : اشارہ ہے کہ قرآن وسنت مستقل شرعی دلائل ہیں اور یہی سبب ہے کہ لفظ اِلٰی کو مکرر ذکر کیا ہے اور اس طرح سورۃ نساء آیت 61 میں بھی ذکر ہوا ہے تو معلوم ہوا شریعت میں حُجّت صرف قرآن وحدیث ہے باقی رہا اجماع اور قیاس یہ انہی دونوں پر بنا ہے اگر اجماع وقیاس ان دونوں سے لیا گیا ہو تو مقبول ہے اگر ان دونوں سے ثابت نہ ہو تو مسترد ہے تو معلوم ہوا کہ دلائل اصلیہ شرعیہ دو ہی ہیں: قَالُوۡا حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا: حَسۡبُنَا: کا لفظ ان کی جہالت کی انتہا کی طرف اشارہ ہے یعنی قرآن وسنت ان کے نزدیک قابل التفات ہی نہیں ہیں کیونکہ بڑوں کا طریقہ کافی سمجھتے ہیں۔ لازماً ایسی صورت میں قرآن وحدیث سے اعراض ہی کریں گے: اٰبَآءَنَا: امام راغب نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد ان کے مسلکی اکابر ہیں صرف عمر کے لحاظ سے بڑے اکابر مراد نہیں ہیں۔ المفردات القرآن: اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ: ہمزہ استفہام انکاری ہے واؤ صرف عطف ہے ماقبل معطوف علیہ مقدر ہے یعنی: اَحَسۡبُهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا يا يَتَّبِعُوۡنَهُمۡ: لَوۡ وصلیہ ہے شرطیہ نہیں ہے تو ماقبل میں مقدر اعلیٰ درجہ کے مراد ہے خلاصہ یہ ہے کہ جب شرکیہ کاموں اور بے دلیل باتوں میں اعلیٰ درجہ کی ہدایت یافتہ اور علماء آباء واجداد کی پیروی تقلید جائز نہیں ہے تو بے علم اور غیر ہدایت یافتہ بڑوں کی تقلید تو بدرجہ اولیٰ ناجائز ہے۔ اس میں ان کے قول: حَسۡبُنَا: کا سخت رد ہے الخ: لَا يَعۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا: شَيۡـًٔا: سے مراد حق اور دلیل ہے یعنی مبالغہ کیلئے علم اور حق مطلقاً کی نفی کی گئی ہے: وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ: ہدایت سے مراد دلیل شرعی پر عمل کرنا ہے یعنی یہ عالم بھی نہیں ہیں اور ہدایت پر بھی نہیں ہیں تو مراد یہ ہے کہ جاہل بھی ہیں اور گمراہ بھی ہیں۔ تفسیر خازن، رازی، ونسفی میں ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ عالم ہدایت یافتہ کی اقتداء صحیح ہے اس شرط پر کہ اس کا قول دلیل، حجت اور برہان پر مبنی ہو لیکن اس کے بے دلیل قول کی تقلید جائز نہیں ہے۔ لہٰذا یہ آیت رد تقلید پر دلیل ہے کیونکہ تقلید کا معنی کسی شخص (اُمتی) کے قول کو بلا دلیل ماننا ہے ہر ایک صورت میں یعنی اس قول کی دلیل موجود ہی نہیں ہے یا دلیل موجود ہے مگر تقلید کرنے والوں کو معلوم نہیں ہے اس کی تفصیلی بحث سورۃ بقرہ آیت 170 میں گزر چکی ہے۔ سوال: اس آیت میں مشرکین کی اس تقلید کا رد ہے جو انہوں نے اپنے گمراہ اکابرین کی اختیار کی تھی تو ائمہ کرام جو کہ متقی پرہیزگار لوگ تھے ان کی تقلید اس پر کس طرح قیاس ہوگی۔ جواب: امام ابن قیم نے اعلام الموقعین اور امام ابن ابی العز حنفی نے اپنے رسالہ الاتباع میں اس سوال کا جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مقیس علیہ مشبہ بہ میں یہ لازم نہیں ہے کہ تمام صفات میں دونوں برابر ہوں بلکہ ایک سبب یعنی علت مشترکہ یا شبہ جو کہ مشہور ہو کافی ہے جو تشبیہ یا قیاس کیلئے سبب بنے اور وہ

یہاں پر موجود ہے جو کہ بے دلیل قول یعنی بات و عمل کو دیکھ کر یا سن کر قبول کرنا ہے۔ اس میں یہ لازم نہیں ہے کہ وہ مقتداء علماء ہوں یا جہلاء شرکیہ امور میں تقلید عین شرک ہے اور بدعت کے امور میں تقلید عین بدعت ہے جبکہ دیگر امور شرعیہ میں تفصیل کی ضرورت ہے اس مقام میں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ فائدہ: اس مضمون سے متعلق مندرجہ ذیل مقامات میں آیتیں موجود ہیں۔ سورۃ بقرہ آیت 170، سورۃ لقمان آیت 21، سورۃ زخرف آیت 22 اور 23 میں ہے البتہ بعض تعبیرات میں فرق ہے: وَجَدْنَا: اور أَلْفَيْنَا: میں فرق یہ ہے کہ أَلْفَاء: اکثر وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں پر مسائل کا تعلق عقل اور علم سے ہو جبکہ وجدان عام ہے جس کا تعلق ان مسائل سے بھی ہے جو عقل اور حس دونوں سے متعلق ہوں لہٰذا سورۃ بقرہ میں غیر اللہ سے محبت اور خواہشات کی پیروی کا تذکرہ ہے تو وہاں: أَلْفَيْنَا: ذکر ہوا ہے کیونکہ یہ امور معقولہ علمیہ ہے دیگر حوالہ جات کے مقامات میں: وَجَدْنَا: استعمال ہوا ہے اور سورۃ مائدہ میں وصیلہ بحیرہ سائبہ وغیرہ امور ہیں جو محسوس ہوتے ہیں اور سورۃ لقمان و زخرف میں امور عقلیہ اور محسوسہ دونوں مذکور ہیں اس لیے ان مقامات میں وَجَدْنَا: ذکر کیا گیا ہے۔ [illegible]

: حَسْبُنَا اور بَلْ نَتَّبِعُ: میں یہ وجہ یہ ہے کہ سورۃ مائدہ میں مشرکین کی رسموں اور رواجوں کا رد تھا شرکیات و عبادات پر مشرکین سخت ہوتے ہیں اس کیلئے: حَسْبُنَا: استعمال ہوا ہے جبکہ دیگر مقامات میں عقیدہ شرکیہ کا رد ہے اور وہ ایمان لانے یا نفاق اختیار کرنے کی وجہ سے چھوڑ دینا مشکل نہیں ہے اس لیے وہاں صرف لفظ: وَجَدْنَا: استعمال ہوا ہے۔ [illegible]

: سورۃ بقرہ میں: لَا يَعْقِلُونَ: اور سورۃ مائدہ میں: لَا يَعْلَمُونَ: ہے تو فرق یہ ہے کہ: لَا يَعْقِلُونَ: عقلی امور میں استعمال ہوتا ہے اور سورۃ بقرہ میں محبت کا ذکر تھا تو جو امور عقلیہ باطنیہ ہیں اور علم امور باطنیہ عقلیہ دونوں میں استعمال ہوتا ہے تو سورۃ مائدہ میں امور محسوسہ کا ذکر تھا تو لفظ عَلَيْهِمْ: اس کے ساتھ زیادہ مناسب تھا سورۃ لقمان میں (مجادلہ) جھگڑے کا ذکر تھا اور اس کے ساتھ علم کی بھی نفی تھی تو اس لئے دوبارہ علم اور عقل کی نفی کی ضرورت نہیں تھی اور مجادلہ شیطان کے وسوسہ سے ہوتا ہے تو وہاں اس کا وسوسہ ذکر کیا ہے درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی اپنے کلام کے رازوں کو خوب جانتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''ایمان والو تم اپنے آپ کے ذمہ دار ہو جو شخص گمراہ ہو وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا جب کہ تم خود ہدایت پر ہو تم سب کی واپسی اللہ ہی کی طرف ہے پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو'' [۱۰۵]۔

تفسیر 105 (ربط ۱) امام قرطبی نے جابر بن زید سے نقل کیا ہے کہ جب کوئی شخص مسلمان ہوجاتا تو مشرکین اس سے کہتے کہ تم نے اپنے بڑوں کو کم عقل اور گمراہ سمجھا ہے؟ اگر ہمارے بڑے کم عقل و گمراہ تھے کیا تمہارے بھی اسی طرح تھے۔ تو اس آیت میں جواب ہوا۔ (ربط ۲) جب تم مشرکین کو دعوت دو اور وہ کتاب وسنت کی دعوت ٹھکرا دیں تو تم ان کے اس عمل پر پریشان مت ہو اس لیے کہ دعوت دیئے گئے بعد ان کی گمراہی تمہیں کوئی ضرر نہیں دے گی: عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ عَلَيْكُمْ: اسم فعل ہے جو اَلْزِمُوْا کے معنی میں ہے یعنی اپنی اصلاح کو لازمی اختیار کرو قرآن وسنت کی پیروی اور اطاعت اختیار کرتے ہوئے ایسے حال میں کہ لوگوں نے اس کی پیروی سے انکار کیا ہو: لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ: یعنی ان کے گناہوں کا وبال تم پر نہیں ہے خواہ وہ ضد وعناد کی وجہ سے: حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا: کہتے ہوں زبان وعمل سے عناد کا اظہار کرتے ہوں۔ نیز جو تمہارے اکابر گمراہ دنیا سے چلے گئے ہیں تو ان کی گمراہی کا اثر یا عیب تم پر نہیں ہے۔ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ: جب تک تم قرآن وسنت کی پیروی کرتے رہو اور حسب توفیق دعوت بھی دیتے رہو گے: اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا: یہ عام خطاب ہے جس میں ہدایت والے اور گمراہ لوگ سب شامل ہیں۔ اس میں خوشخبری اور وعید دونوں کی طرف اشارہ ہے: فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: نَبَأٌ سے مراد جزا وسزا دینا ہے۔ مفسر شربینی نے لکھا ہے کہ یہ دلیل ہے کہ کوئی کسی کے جرم میں گرفتار نہیں ہوگا۔ سوال: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ کی ضرورت نہیں صرف انسان اپنی ذات کا ذمہ دار ہے جبکہ بہت ساری آیتوں اور احادیث سے دعوت دین کی فرضیت ثابت ہوتی ہے؟۔ جواب ۱: اس آیت میں ایمان والوں کو تسلی دی جارہی ہے کہ تمہارے فوت شدہ آباء واجداد کی گمراہی کا تم پر وبال نہیں ہے اور نہ ہی زندہ کافروں کا ہے بشرطیکہ تم دین پر قائم ہو اور نہ ہی قیامت کے دن تمہارے ان بڑوں اور نہ ہی موجودہ مشرکین کے متعلق تم سے کوئی باز پرس ہوگی۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ: سورۃ فاطر آیت 8 خود کو ان کی (برائیوں کی وجہ سے) افسوس میں مت ڈالو۔ زمخشری کا قول ہے کہ ایسا حال اس مؤمن کا ہوتا ہے کہ معاشرے کے فاسق وفاجر لوگوں کے اعمال دیکھ کر وہ

افسوس کرتا ہے تو ایسے لوگوں کو آیت میں تسلی دی گئی ہے۔ آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ کسی کی گمراہی فرمانبرداری کرنے والے شخص کیلئے ضرر کا سبب نہیں ہے۔ آیت میں دعوت دینے یا چھوڑنے کا کوئی ذکر نہیں ہے یہ جواب زمخشری، قرطبی اور قاسمی نے پہلے ذکر کیا ہے۔ جواب ۲: اس آیت میں متعدد صورتوں سے دعوت کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ (۱) عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ: مفسر مہائمی نے لکھا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تمہارے ذمے اپنے نفسوں کی اصلاح لازم ہے کہ تم قرآن وسنت کی اطاعت کرتے رہو اس کی دعوت عام کرو اور برائیوں سے لوگوں کو منع کرو اور اس میں سستی وکاہلی سے کام مت لو تو اس سمجھانے کے بعد اگر کوئی گمراہ ہوتا ہے تو اس کے تم ذمہ دار نہیں ہو۔ (۲) دوسری توجیہ جیسا کہ ربط میں مراد ہے کہ یہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ: کے بعد نازل ہوئی ہے یعنی پہلے تم ان کو قرآن وسنت کی دعوت پیش کرو پھر بھی اگر وہ کہتے ہیں: حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا: یعنی ہمارے لئے باپ دادا کا طریقہ کافی ہے اور تمہاری دعوت کو ٹھکرا دیں تو پھر بھی تم پر کوئی گناہ باقی نہیں رہیگا۔ (۳) تیسری توجیہ امام ابن کثیر، قرطبی اور رازی وغیرہ نے ابن مبارک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس آیت کے متعلق فرمایا ہے کہ اَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ: اور نَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ کے متعلق یہ بہت ہی تاکیدی آیت ہے کیونکہ اس میں اس طرح فرمایا ہے کہ تمہارے ذمہ اپنے نفسوں کو بچانا ہے نفس سے مراد: اَهْلِ دِيْنِكُمْ: اور اہل جنس مراد ہیں جیسا کہ: فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ: سورۃ بقرہ آیت 54 میں یہ معنی گزرا ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور احمد وغیرہ میں حدیث ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا کہ تم اس کی بے جا تاویل کرتے ہو اور تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے معنی کیا ہیں پھر متصل مرفوع حدیث نبی کریم ﷺ سے نقل کی ہے جس میں دعوت کی تاکید ہے۔ (احمد جلد5 صحیح ابن حبان 304، 305 سنن کبریٰ للبیھقی 10/91 ابوداؤد کتاب الملاحم باب الامر والنھی حدیث نمبر 4338) امام ترمذی نے ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے دعوت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ہاں جب حالات بدل جائیں (جیسا کہ بعد میں مذکور ہے) تو پھر صرف بنی فکر کرو، وہ ایام صبر ہیں۔ اس روایت کو قرطبی، ابن کثیر اور شربینی وغیرہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ (جواب ۳) ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایت ھذا کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ قرآن مجید میں مختلف آیتیں ہیں بعض تو وہ ہیں جن کی تاویل گزر چکی ہے (۲) بعض وہ ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے زمانہ حیات میں ان کی تاویل ہوگئی ہے (۳) اور بعض وہ ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے زمانہ کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کی تاویل واقع ہوئی ہے (۴) بعض وہ آیتیں

لہٰذا جن کی تاویل قیامت کے دن واقع ہوگی۔ پھر فرمایا کہ جب دلوں اور خواہشات کے اختلاف کی بنا پر تم میں کئی گروہ بن جائیں تو اس وقت صرف اپنی فکر کرو دیگر لوگوں کو چھوڑ دو اس طرح کی حدیث ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی منقول ہے ان دونوں روایتوں کو سند کے ساتھ ابن جریر نے نقل کیا ہے۔ (نتیجہ) تمام بحث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس آیت کا محمل اور مصداق قرب قیامت کا زمانہ ہے۔ ثعلبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ کہ جب حرص اور خواہش کی پیروی شروع ہو جائیگی اور دنیا کے مال و دولت کو اہم سمجھا جائیگا اور ہر شخص اپنی رائے کو ترجیح اور برتری دیگا تو ایسی صورت میں اپنی فکر کرو عوام کو دعوت دینا چھوڑ دو یعنی اس آیت کی وجہ سے أَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ ترک نہ کرو بلکہ اس وقت کے آنے تک جاری رکھو۔ (ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3058، ابو داؤد کتاب الملاحم حدیث 4341، ابن ماجہ کتاب الفتن حدیث 4014 ابن حبان 385 شیخ البانی نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے سلسلة الضعيفة 1025)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُونَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ ﴿١٠٦﴾

"اے ایمان والو تمہاری آپس کی گواہی جب تم میں سے کسی کو موت آئے وصیت کرتے وقت تم میں سے دو معتبر شخص ہو یا غیروں میں سے دو شخص ہو جب تم سفر پر نکلے ہو تمہیں موت کے مصیبت پہونچے ان دونوں کو نماز کے بعد روکو وہ اللہ کا قسم کھائیں اگر تمہیں کچھ شک پڑے کہ ہم قسم کے بدلے کچھ مال نہ خریدیں گے اگرچہ قر۔ قرابت دار ہو اور اللہ کی گواہی نہیں چھپائیں گے اگر ایسا کریں تو ہم ضرور گنہگاروں میں ہیں" [۱۰۶]۔

تفسیر 106 (ربط) سابقہ آیت میں نفسوں کی حفاظت کا ذکر تھا اس آیت میں قسم اور وصیت کے ذریعے مالوں کی حفاظت کا ذکر ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اعراب، نظم اور حکم کے لحاظ سے یہ مشکل آیت ہے۔ واحدی نے بسیط میں عمر رضی اللہ عنہ کا قول اس طرح نقل کیا ہے۔ ابن عطیہ نے لکھا ہے کہ یہ قول ان لوگوں کا ہے جن کا دل آیت خدا کی تفسیر سے سیراب نہ

ہوا ہو: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا: اشارہ ہے کہ اموال کے معاملات شریعت کے مطابق حل کرنا ایمان کا تقاضا ہے۔ شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ: شہادت سے مراد وصیت کے موقعے پر یعنی حاضر کرنا ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یہاں پر شہادت سے قسم کھانا مراد ہے کیونکہ شہادت کے کئی معنی ہیں ان میں قسم بھی ہے۔ امام قرطبی نے ان معنوں میں سے بعض یہاں ذکر کیے ہیں: بَيْنِكُمْ اصل مَا بَيْنِكُمْ تھا تو کلام مختصر کرنے کیلئے (مَا) کو حذف کیا گیا ہے: إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ: إِذَا ظرفیہ ہے اور حضر قرب کی معنی میں ہے یا مراد یہ ہے کہ اسباب موت جب حاضر ہو جائیں۔ اس تاویل کی وجہ یہ ہے کہ جب موت حاضر ہو جائے تو پھر باتیں نہیں ہو سکتیں: حِينَ الْوَصِيَّةِ: یہ لفظ إِذَا سے بدل ہے اور اس میں وصیت کرنے پر تنبیہ وتاکید ہے۔ یہاں مال کی وصیت کرنا مراد نہیں ہے بلکہ مال کے لیے وصی بنانا مراد ہے: اثْنَانِ: یہ شہادت کی خبر ہے لیکن لفظ شہادت مقدر ہے: ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ: یعنی مسلمان بھی ہوں اور عادل بھی عادل فاسق کے مقابل ہے: أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ: اہل علم نے اس میں اختلاف کیا ہے اکثر کا قول یہ ہے کہ مراد اس سے غیر مسلم ہیں اور بعض علماء نے کہا ہے کہ مِنكُمْ: سے اقرباء مراد ہیں اور: غَيْرِكُمْ: سے غیر رشتہ دار مراد ہیں۔ پہلے قول کی بناء پر کافر کی شہادت مسلمان پر ثابت ہوتی ہے۔ تو پھر اس میں اختلاف ہے کہ بقول بعض علماء یہ آیت منسوخ ہے۔

اور اس کیلئے ناسخ آیت: وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا: ہے جبکہ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ سورۃ مائدہ میں منسوخ آیت نہیں ہے لہذا شریح اور اوزاعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ کافروں کی شہادت وصیت اور سفر کے ساتھ خاص ہے۔ ابن قیم نے اعلام الموقعین اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں منسوخ والوں کے قول اور: غَيْرِكُمْ: میں غیر رشتہ دار کے معنی کا سخت رد کیا ہے: إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ: اس میں اشارہ ہے کہ سفر کے وقت اس طرح ضرورت پیش آسکتی ہے: تَحْبِسُونَهُمَا: اس میں اشارہ ہے کہ مدعا علیہما یعنی جن پر دعویٰ کیا گیا ہے فرار کی کوشش کریں گے اس لیے رکھنے کا حکم دیا گیا: مِن بَعْدِ الصَّلَاةِ: مطلق نماز یا عصر کی نماز مراد ہے اس میں قسم کو وقت معین کے ساتھ خاص کیا جس میں مقصد تاکید ہے اور علماء کا اتفاق ہے کہ ایسا کرنا صحیح ہے دوسرا یہ بھی ہے کہ نماز کا وقت معلوم ہوگا کہ جن کو وصیت کی گئی ہے وہ مسلم ہے یا ذمی غیر مسلم ہے: فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ: یعنی جب ان پر خیانت کا دعویٰ کیا جائے تو وصیت ادا کرنے میں وہ انکار کر بیٹھیں اور مدعی کے پاس اور کوئی گواہ بھی نہ ہو تو منکر کیلئے شریعت میں قسم ہے لہذا وہ دونوں قسم کھائیں گے: بِاللَّهِ: یہ دلیل ہے کہ قسم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے ذمی کافر کو بھی اللہ تعالیٰ کی ذات پر قسم دی جائیگی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو

بھی مانتے ہیں اور اس پر قسم بھی مانتے ہیں: اِنِ ارْتَبْتُمْ: شک کی بنا پر ان پر دعویٰ کرنا اور اس کی بنیاد پر قسم دلانا اور یہ بھی اشارہ ہے کہ بغیر دعویٰ مدعا علیہ کو قسم نہیں دی جاسکتی: لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا: یہ جواب قسم ہے: اِشْتِرٰی حصول عوض کی معنی میں ہے بِهٖ ضمیر لفظ اللہ یا قسم کی طرف راجع ہے اور ثَمَنًا دنیاوی مال ومتاع ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے نام ذکر کرنے میں ہمارا مقصد دنیا حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ ہم تو حق کو واضح اور قائم کرنا چاہتے ہیں: وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى كَانَ: کی ضمیر اس شخص کی طرف راجع ہے جس کیلئے قسم کھانے کا حکم ہو یعنی: مُقْسَمٌ لَهٗ: یا جس پر گواہی دی جارہی ہو اس جملہ میں قسم کیلئے تاکید مقصود ہے کہ ہماری قسم جھوٹ سے پاک ہے: وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ: وہ شہادت جس کا علم اللہ نے ہمیں دیا ہے۔ یہ بھی شہادت کیلئے تاکید ہے۔

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

"پھر اگر پتہ چلے کہ وہ کسی گناہ کے سزاوار ہوئے تو ان کی جگہ دو اور کھڑے ہوں ان میں سے کہ اس گناہ یعنی جھوٹی گواہی نے ان کا حق لے کر ان کو نقصان پہونچایا جو میت سے زیادہ قریب ہوں تو اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی زیادہ سچی ہے ان دو کی گواہی سے اور ہم حد سے نہ بڑھے ایسا ہو تو ہم ظالموں میں ہوں" [۱۰۷]۔

تفسیر 107 یہ ماقبل کیلئے تکملہ ہے یعنی قسم میں جھوٹ ظاہر ہونے کے بعد کا حکم: فَاِنْ عُثِرَ: عَثْرَةٌ: کسی چیز پر گر جانے کو کہا جاتا ہے یہ اطلاع کے معنی میں ہے جیسا کہ سورۃ کہف میں ہے کہ: اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ: ہم ان پر مطلع ہوگئے: عُثِرَ کا نائب الفاعل: اس فعل کا مادہ ہے: حَصَلَتِ الْعُثْرَةُ: اطلاع حاصل ہوئی ہے: عَلٰٓى اَنَّهُمَا: یہ ضمیر وصیت والوں کی طرف راجع ہے: اِسْتَحَقَّآ اِثْمًا: استحقاق کا معنی یہ ہے کہ وہ عمل کرنا جو کسی کام کا سبب بنے: اِثْمًا: سے مال کے حصول میں خیانت کا گناہ ہے یا جھوٹی قسم کا۔ منکرین کی قسم کے فیصلے کے بعد پتہ چلے کہ ان کی قسمیں جھوٹ پر مبنی ہیں تو اس فیصلے کو رد کیا جائیگا: فَاٰخَرٰنِ: یہ صفت ہے جس کا موصوف مقدر ہے یعنی: رَجُلَانِ آخَرَانِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا: هُمَا: ضمیر اثنان کی طرف راجع ہے یعنی جنہوں نے پہلے جھوٹی قسمیں کھائیں جب انہوں نے اس چیز کی ملکیت کا دعویٰ کیا ہو اور میت کے وارث اس کا انکار کریں تو انکار کی وجہ سے وارثوں کیلئے قسم کا حق ثابت ہوگیا: مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ: فَاٰخَرٰنِ: کیلئے بیان ہے یہ ثَبَتَ الْحَقُّ عَلَيْهِمْ کے معنی میں ہے ان پر حق ثابت ہوا ہے۔ فعل کا مادہ فاعل بنا ہے یا فاعل کو حذف کروایا گیا ہے (یہ

حذف جائز ہے) جو کہ یمین ہے۔حق سے ملکیت کا دعویٰ مراد ہے جو قسم کا سبب ہے یعنی دونوں نے قسم جو کھائی کہ یہ ہمارا ملکیت ہے تو اس کی وجہ سے وارثوں کیلئے قسم کھانے کا حق ثابت ہو گیا۔ الْأَوْلَيٰنِ یہ اولیٰ کا تثنیہ ہے اور اولیٰ اقرب کے معنی میں ہے یعنی وہ رشتہ دار جو دوسروں کی بنسبت میت سے زیادہ قریب ہیں یہ: اِسْتَحَقَّ: کیلئے فاعل نہیں ہوسکتا ہے یہ محذوف مبتداء کی خبر ہے یعنی: هُمَا اَوْلَيَانِ: یا پھر: اٰخَرٰنِ: سے بدل ہے یا پھر: يَقُوْمٰنِ: کی ضمیر سے بدل ہے: لَشَهَادَتُنَا اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا: یہ ان کی قسم کا مضمون ہے شہادت یہاں قسم کے معنی میں ہے: اَحَقُّ ،صَدَقَ: اور حقدار کے معنی میں ہے: أَحَقُّ میں تَفْضِيلِي: معنی مراد نہیں ہے۔ فقط صدق اور قبولیت کا مستحق ہونا مراد ہے: اِنَّا اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ: پہلی قسموں کے رد کرنے کی وجہ سے دوسری قسموں میں زیادہ تاکید ہونی چاہیے تھی اس لیے ان کے ساتھ: الْاٰثِمِيْنَ: گناہگار اور اس کے ساتھ: الظّٰلِمِيْنَ: فرمایا ہے۔ دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ نکل آیا کہ جب کوئی مسافر ہو اور اس پر موت کے آثار ظاہر ہو جائیں اور اس کے پاس مال ہو تو دو آدمیوں کو وصی بنائے یہ گواہ کے مرتبہ میں بھی ہونگے اور وصی بھی مرنے والا یہ کہے کہ میرا یہ مال میرے ورثاء تک پہنچا دو جب وہ مال پہنچا دیں اور وارث ان پر خیانت کا دعویٰ کریں تو ان پر قسم کھانا لازم ہوگا بشرطیکہ یہ خیانت سے منکر ہوں۔ پھر اگر اس فیصلے کے کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہو جائے کہ انہوں نے جھوٹی قسمیں کھائی تھیں اب خیانت معلوم ہونے کے بعد خیانت کے الزام سے بچنے کے لیے اس چیز کی ملکیت کا دعویٰ کیا ہو اور وارث اس دعوے کا انکار کریں تو ورثاء قسم کھائیں گے ان کے قسم کھانے کی صورت میں اس وصیت اور قسموں کو باطل اور سابقہ فیصلے کو کالعدم قرار دیا جائیگا اور اگر وارثوں نے قسم کھانے سے انکار کیا تو ایسی صورت میں سابقہ فیصلہ برقرار رہے گا۔ (تفہیم) اس آیت کی تفسیر جاننے کیلئے سبب نزول جاننے سے بہت مدد حاصل ہوگی جس کا جاننا ضروری ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الوصایا (حدیث 2780) اور امام ترمذی نے کتاب التفسیر حدیث 3060، ابوداؤد کتاب القضاء حدیث 3606) میں ذکر کیا ہے کہ بدیل بن ورقاء اسہمی تجارت کی غرض سے شام کی طرف تمیم داری اور عدی بن بدا کے ساتھ سفر پر نکلے اور اس وقت یہ دونوں نصاریٰ کے دین پر تھے سفر سے واپسی پر بدیل کو حالت سفر میں موت آئی لیکن اپنی کیفیت موت سے قبل اس نے اپنے سامان کی ایک فہرست بنا کر سامان میں چھپا کر رکھ لی اور ان دونوں کو وصیت کی کہ میرا یہ سامان میرے وارثوں تک پہنچا دو۔ انہوں نے اس سامان سے چاندی کا ایک پیالہ چوری کر لیا جس میں سونے کی کیل لگی ہوئی تھی اور بقیہ سامان وارثوں تک پہنچا دیا اور پیالہ مکہ مکرمہ میں فروخت کر دیا اور تمیم کی روایت میں ہے کہ پیالہ ہم نے ایک ہزار روپے میں بیچا تھا رقم

دونوں نے آپس میں تقسیم کر دی تھی جب اس کے ورثاء نے سامان کی فہرست پڑھ لی تو اس میں اس پیالے کا ذکر تھا لیکن سامان میں موجود نہیں تھا تو انہوں نے ان دونوں پر خیانت کا دعویٰ کیا جبکہ ان دونوں نے اس خیانت سے انکار کیا جب ان کو قسم کا کہا گیا تو انہوں نے قسمیں کھائیں کچھ عرصہ بعد ان کو پتہ چلا کہ وہ پیالہ انہوں نے مکہ مکرمہ میں کسی شخص کو فروخت کیا ہے تو اس وجہ سے وارثوں نے پھر دعویٰ کیا انہوں نے سامان سے چوری (خیانت) کی ہے انہوں نے جواب میں کہا کہ یہ پیالہ بدیل سے اس کی حیات میں ہم نے قیمتاً خریدا تھا لیکن ہمارے پاس کوئی گواہ نہیں تھا اس لئے ہم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا تھا تو یہ ان کی ملکیت کا دعویٰ تھا لیکن ورثاء نے اس دعوے سے انکار کر دیا وارثوں کو قسم دلائی گئی اور وارثوں کے حق میں فیصلہ ہوا اور اس واقعے پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ یَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌۢ بَعْدَ اَیْمَانِهِمْؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اسْمَعُوْاؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ۠﴿۱۰۸﴾ ع

"یہ (طریقہ) بہت ہی قریب ہے اس کے کہ وہ ٹھیک طریقہ پر شہادت دیں یا وہ (اللہ تعالیٰ سے) ڈریں اس سے کہ ان کی قسمیں رد کر دی جائیں گے ان (وارثوں) کی قسموں کے بعد اور تم ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور تم سنو اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا" [۱۰۸]۔

تفسیر 108 اس آیت میں گزشتہ طریقے کا فائدہ ذکر ہو رہا ہے یعنی قسم اور شہادت میں جھوٹ سے بچنے کیلئے یہ طریقہ ہے۔ ذٰلِكَ فیصلے کی طرف اشارہ ہے: اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ: یَاْتُوْ: کی ضمیر: مُوْصٰی لَهُمَا: کی طرف راجع ہے جو اِثْنَانِ میں مذکور تھے یا ان تمام لوگوں کی طرف راجع ہے جو کسی فیصلے میں شامل ہوں جو قسم کھاتے ہوں یا شہادت دیتے ہوں: عَلٰى وَجْهِهَا: وجہ اصلی طریقہ اور حقیقت کو کہا جاتا ہے: اَوْ یَخَافُوْا: سوال: اَوْ تخییر تردید اور تنویع کیلئے آتا ہے یہاں تو ماقبل کے لحاظ سے کوئی معنیٰ صحیح نہیں ہے؟۔ جواب: او برائے تنویع ہے اور معطوف علیہ مقدر ہے: یعنی: اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَا لِخَوْفِ اللّٰهِ اَوْ یَخَافُوْا: یعنی سچی اور حقیقی شہادت اللہ تعالیٰ کے خوف سے دینگے اور اس کے عذاب کے خوف سے (یہ متقیوں کا حال ہے) یا اس بات سے ڈرینگے کہ ان کی سابقہ قسمیں رد کی جائیں گی تو لوگوں میں بدنام ہو کر شرمندہ ہو جائینگے اور وہ جھوٹ ثابت ہوگا (یہ عام لوگوں کی حالت ہے): اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌ: رد قبول کی ضد ہے ایمان سے ان: مُوْصٰی اِلَیْهِمْ: کی قسمیں مراد ہیں جنہوں نے خیانت کی ہو یا پھر رد پیش کرنے کے معنیٰ میں ہے تو اول ایمان سے وارثوں

کی قسمیں مراد ہیں اور دوسرے سے: مُّوْصِی اِلَیْهِمْ: کی قسمیں مراد ہیں: وَ اتَّقُوا اللّٰهَ: اس تقویٰ سے مراد خیانت اور قسموں میں جھوٹ سے بچنا ہے: وَ اسْمَعُوْا: سماع سے قبولیت کا سماع مراد ہے شرعی احکام پر عمل کرنے میں سماع اور قبولیت کی بڑی اہمیت ہے اس لیے سماع کا حکم دیا ہے: وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ: اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے انسان نافرمانیوں فسق و فجور کی وجہ سے محروم ہو جاتا ہے یہاں فسق سے تقویٰ اور سمع چھوڑ نا مراد ہے اور ہدایت سے جنت کی ہدایت مراد ہے یا آخرت میں فائدے یعنی جنت اور اس تک رسائی مراد ہے۔

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۝۱۰۹

"جس دن اللہ تعالیٰ رسولوں کو جمع کریگا پھر ان سے فرمائیگا تم کیا جواب دیے گئے تھے وہ کہیں گے ہمیں علم نہیں تو ہی غیب کے باتوں کا علم رکھتا ہے" [۱۰۹]۔

تفسیر 109 (ربط ۱) سابقہ بیان کردہ احکام و شرائع کو منوانے کیلئے تخویف اخروی برائے تاکید ہے۔ (ربط ۲) پہلے بعض احکام کا ذکر کیا تو اب عقیدہ توحید کا ذکر ہے کہ ان احکام کے ساتھ یہ عقیدہ بھی ضروری ہے کہ علم غیب اللہ کے ساتھ خاص ہے انبیاء علیہم السلام کے پاس علم غیب نہیں ہوتا۔ شرک فی العلم کے لیے اس کو دلیل نقلی اجمالی کہتے ہیں۔ (ربط ۳) امام قرطبی نے لکھا ہے کہ بعض لوگ شہادت اور وصیت میں اس قسم کے امور کا اظہار کرتے ہیں جو ان کے باطن کے خلاف ہوتے ہیں تو اس آیت میں خوف دلایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے: یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ: حقیقت میں تو تمام انبیاء اور رسل امتوں کے ساتھ اکٹھے ہونگے مگر انبیاء کی عزت و اکرام کی وجہ سے ان کا سوال جواب الگ ذکر ہوا ہے اور اس سے آخری نبی سمیت تمام انبیاء و رسل مراد ہیں: فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ: اس میں اشارہ ہے کہ ان سے دعوت و تبلیغ کا سوال نہیں ہے بلکہ امت کا حال معلوم کیا جا رہا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ تم نے دعوت دی ہے انہوں نے قبول کی ہے یا رد کی ہے کیونکہ دعوت کی قبولیت تب ہوگی جب رسولوں نے دی ہوگی۔ دعوت توحید اور دین کو انہوں نے مانا ہے یا امتوں نے نفی میں جواب دیا ہے تمہاری دعوت کہاں تک انہوں نے قبول کی ہے: اُجِبْتُمْ: عام ہے زبان سے اور عمل سے قبول کرنا دونوں کیلئے ہے: قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا: سوال: نبیوں سے سوال کا کیا فائدہ ہے؟۔ جواب: اس میں یہ عظیم فائدہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ انبیاء علم غیب نہیں جانتے اور اس قسم کا عقیدہ رکھنے والوں کو تنبیہ بھی ہے۔ سوال: انبیاء کو معلوم تھا کہ دعوت دین کس نے مانی ہے اور کس نے نہیں مانی ہے تو سوال کی کیا ضرورت تھی؟۔ جواب ا: امام رازی نے

لکھا ہے کہ ظاہری اسباب پر جو علم حاصل ہوتا ہے وہ درحقیقت ظن ہے (جبکہ اصل علم تو اللہ کے پاس ہے اجابت کرنے والوں کے دلوں کی حقیقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ جواب ۲: قیامت کی معیت بے قراری کی وجہ سے وہ اس طرح کہیں گے لیکن اس جواب کا امام قرطبی، رازی اور خازن وغیرہ نے رد کیا ہے کیونکہ قیامت کے دن انبیاء کرام اس قسم کی کیفیت سے مبرا ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ: آیت 89 سورۃ نمل: لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ سورۃ انبیاء آیت 103۔ جواب ۳: الکا یہ قول انکساری وعاجزی ہے اور تواضع ہے اور یہ تواضع حقیقت میں ہے جھوٹ نہیں ہے اس لیے کہ انبیاء کرام جھوٹ سے پاک ہیں اور معصوم عن الخطاء ہیں۔ ان دونوں جوابات سے بریلوی طبقہ نے استدلال کیا ہے کہ انبیاء غیب کا علم رکھتے ہیں مگر ہیبت اور تواضع کی وجہ سے جواب نہیں دیا اور: لَا عِلْمَ لَنَا: کہا ہے لیکن ان کے یہ دونوں جواب درست نہیں ہیں جیسا کہ ہم نے عرض کر دیا ہے۔ جواب ۴: ابن جریج سے ابن جریر نے اور ابن کثیر اور قرطبی وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ یہ سوال نبیوں کی وفات کے بعد امتیوں کی قبولیت دین کے حوالہ سے ہے۔ تو معنی مَاذَا اُجِبْتُمْ: کا یہ ہے کہ: مَاذَا عَمِلُوْا بَعْدَكُمْ: یعنی تمہارے بعد امتیوں نے کیا اعمال کئے تھے تو انبیاء کرام جواب دینگے: لَا عِلْمَ لَنَا بِمَا اَحْدَثُوْا بَعْدَنَا: کہ ہمیں معلوم نہیں ہے جو انہوں نے ہمارے بعد بدعات ایجاد کی تھیں اور اس کی تاکید حوض کوثر والی روایت ہے کہ ملائکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں گے کہ اِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ (صحیح بخاری کتاب الانبیاء و کتاب التفسیر حدیث 4625 صحیح مسلم کتاب الجنۃ حدیث 2860)۔ آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کتنی بدعات ایجاد کی تھیں۔ جواب ۵: زاد المسیر میں ابن الانباری سے روایت ہے کہ: لَا عِلْمَ لَنَا بِجَمِيْعِ اَفْعَالِهِمْ: ان کے سارے اعمال کا ہمیں علم نہیں ہے: اِذْ كُنَّا نَعْلَمُ بَعْضَهَا فِيْ حَيَاتِنَا: ہمیں ان اعمال میں سے بعض کا علم ہے جو ہماری زندگی کے دور کے ہیں: وَلَا نَعْلَمُ مَا كَانَ بَعْدَ وَفَاتِنَا: اور ان کاموں کا ہمیں علم نہیں ہے جو انہوں نے ہماری وفات کے بعد کیے ہیں یہ قول بھی ابن جریج کے قول کے قریب ہے اور دونوں قولوں کے صحیح ہونے کیلئے یہ جملہ دلیل ہے: اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ: اس دلیل کو لفظ انّ سے آغاز کیا ہے مقصد یہ ہے کہ تمام خبروں اور کاموں کا علم اور ہمارے مرنے کے بعد جو کام امتیوں نے کیے یہ سب علم غیب ہے اور یہ علم صرف تیرا ہی خاصہ ہے اس میں تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ فائدہ: یہ آیت واضح دلیل ہے کہ انبیاء کرام موت تک بھی عالم الغیب نہیں اور جو کام امتیں کرتے رہیں ان سے بے خبر تھے جن احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فوت

ہونے کے بعد ان پر اعمال پیش ہونے کا تذکرہ ہے وہ روایتیں روافض شیعہ کی گھڑی ہوئی ہیں لہٰذا جب نبی کو مرنے کے بعد امت کی خبر نہیں ہے تو بزرگان دین اور اولیاء کرام کو فوت ہونے کے بعد کیسے علم غیب یعنی قبروں میں لوگوں کے حالات کا علم و خبر ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ فتاوی بزازیہ حنفیہ میں لکھا ہے کہ مَنْ قَالَ اَنَّ اَرْوَاحَ الْمَشَائِخِ حَاضِرَةٌ تَعْلَمُ يُكَفَّرُ جس کا یہ نظریہ ہو کہ بزرگوں کی روحیں حاضر اور باخبر ہیں تو ایسا شخص کافر ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾

”جس وقت کہے گا اللہ تعالیٰ اے عیسیٰ بن مریم یاد کر میری نعمت جو تجھ پر اور تیری والدہ پر ہوئی جب میں نے روح القدس کے ذریعے تیری تائید کی تو کلام کرتا تھا لوگوں سے گود اور پختہ عمر میں اور جب میں نے تجھے کتاب حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی جب تو بناتا تھا گارے سے پرندے کی شکل کی مانند میرے حکم سے پھر تو اس میں پھونک مارتا اس میں تو وہ پرندہ زندہ ہو جاتا میرے حکم سے اور تو میرے حکم سے پیدائشی نابینا اور ابرص والے کو ٹھیک کرتا اور جب تو (زندہ) نکالتا تھا مردوں کو میرے حکم سے اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک لیا تھا جب تو واضح دلیلیں لیکر آیا تھا ان کے پاس تو ان میں کفر کرنے والوں نے کہا تھا کہ یہ تو کھلا جادو ہے“[۱۱۰]۔

تفسیر 110 اس آیت میں دلیل عقلی اجمالی کے بعد (خاص) دلیل کا تفصیلی ذکر ہو رہا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام سے علم غیب سے متعلق کی نفی ہے۔ اِذْ قَالَ یہ يَوْمَ يَجْمَعُ سے بدل ہے چونکہ اس سورۃ میں یہود و نصاریٰ دونوں کا رد کیا گیا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق دونوں نے کفر کیا تھا اس وجہ سے اس کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔ تنبیہ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر دو رکوع میں کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے رکوع میں عیسیٰ علیہ السلام کے محتاج ہونے ضرورتمند اور بے اختیار ہونے خصوصا پانچ چیزوں میں تذکرہ ہوا ہے۔ (۱) پہلا محتاج ہونا نعمتوں کے دینے میں۔ (۲) دوسرا محتاج ہونا تصرفات (معجزات) میں ہے۔ (۳) تیسری محتاجی اور ضرورت بنی اسرائیل کے شر سے حفاظت ہے۔ (۴) چوتھی محتاجی ساتھیوں کے پیدا کرنے اور نصرت کیلئے آمادہ کرنے میں ہے۔ (۵) پانچواں محتاج ہونا مائدہ نازل کرنے میں ہے۔ ان ضرورتوں کے

بیان میں نصرانیوں کا رد ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ یا ابن اللہ قرار دیا تھا اور نعمتوں کے ذکر کرنے کے بعد ان سے سوالات کیے ہیں جو قیامت کے دن یہ سوالات ہو نگے: أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ: کہ محتاج ہونے اور ضرور تمند ہونے کے باوجود تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ میں الٰہ ہوں میری بندگی کرو۔ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے (۱) پہلا قول یہ ہے کہ یہ مکالمہ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اُٹھانے کے بعد ہے اور قَالَ اپنے معنی ماضی پر ہے اور فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي پورے روح اور جسم قبضہ کرنے کے معنی میں ہے اور آسمانوں کی طرف اُٹھالے کے معنی میں ہے اور (۲) دوسرا یہ ہے کہ یہ گفتگو قیامت والے دن ہوگی اور: قَالَ يَقُولُ: کے معنی میں ہے اور فعل ماضی یقین کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس قول کو اکثر مفسرین نے پسند کیا ہے: يَوْمَ يَجْمَعُ: کے بعد اس کا ذکر بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مکالمہ قیامت والے دن ہوگا اور اس قول کے مطابق تَوَفَّيْتَنِي: کا معنی آسمانوں پر اُٹھانے اور اترنے اور قیامت کے قیام کے بعد وہ کہیں گے کہ كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ: اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ: امام قرطبی نے فرمایا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اپنی امت کے سامنے بیان کرو ماں بیٹا یعنی مریم وعیسیٰ علیہما السلام کی عزت واکرام ثابت کرنے کیلئے اور حجت کی تاکید کیلئے: نِعْمَتِي مفرد بمعنی جنس ہے جس میں اس کی نبوت اور رسالت بھی داخل ہے: وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ: اس کو پاکدامن اور باعصمت رکھا اور دیگر خواتین پر اس کو فضیلت دی گئی تھی: إِذْ أَيَّدتُّكَ یہ نِعْمَتِي: سے بدل بعض ہے یعنی نعمتیں تو بہت ہیں مگر یہ بعد والی نعمتیں بہت اہم ہیں۔ سوال: یہ بعد والی نعمتیں تو صرف عیسیٰ علیہ السلام پر کی گئی تھیں تو ماں کا تذکرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔ جواب: اولاد پر نعمتیں ماں پر بھی ہوتی ہیں اس پر وہ خوش ہوتی ہے اور اس میں تو مریم کی تائید بھی ہوتی ہے۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام نے ماں کی پاکدامنی بیان کی تھی تو یہ نعمت اس کی ماں پر ہے: بِرُوحِ الْقُدُسِ: اس اضافت اور اس کے مصداق میں دو قول ہیں۔ (۱) پہلا قول یہ ہے کہ موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے معنیٰ یہ ہوگا کہ ایسی روح جو پاک ہے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ اضافت مِنْ کے ساتھ ہے: رُوحٌ مِّنَ الْقُدُسِ اور قُدُسٌ: اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ یہ مفسر خازن کا قول ہے اور اس کا مصداق جبرائیل علیہ السلام ہیں جو ہر وقت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہتے تھے یا اس سے عیسیٰ علیہ السلام کا نفس اور روح مراد ہیں جو ہر قسم کے گناہوں سے پاک تھے: تُكَلِّمُ النَّاسَ: یہ اس تائید کا بیان ہے اور خاص حالت کے ذکر کرنے سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ (اللہ) ہر حالت میں قوت ناطقہ گویائی کا قوت عطا کر سکتا ہے اس میں ایک مثال کی تائید ہے: فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا: اسی طرح سورۃ آل عمران آیت 46 میں گزرا ہے۔ کلام سے دعوت

الی اللہ مراد ہے اور مہد میں کلام سورۃ مریم آیت 30 میں ہے۔ سوال: ادھیڑ عمر میں تو ہر شخص باتیں کر سکتا ہے تو اس کے بیان کرنے میں کیا فائدہ ہے؟۔ جواب: اس میں بہت فائدے ہیں۔ (۱) پہلا فائدہ: یہ ہے کہ اس کے گود کی عمر گفتگو اور بڑی عمر کی گفتگو میں کوئی فرق نہیں ہے۔ (۲) دوسرا فائدہ: یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر وہ حالات آئیں گے جو عام بشر پر آتے ہیں یعنی بچپن اور بڑھاپا وغیرہ۔ (۳) تیسرا فائدہ: یہ ہے کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور پھر آسمانوں پر اٹھایا جانا بڑی عمر سے پہلے ہوا ہے تو بڑی عمر میں آسمان سے اتریں گے اور کلام کریں گے: وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ یہ: إِذْ أَيَّدتُّكَ: پر عطف ہے پہلی نعمت دعوت وتبلیغ کیلئے تائید ہے اور یہ نعمت علم کے بارے میں ہے جو دعوت کیلئے شرط ہے: اَلْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ: میں دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ کتاب سے مراد ظاہری علم ہے جو لکھا جاتا ہے اور حکمت سے مراد وہ علمی رموز اسرار اور باطنی علم ہے جو بغیر کتاب کے ہوتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ نعمت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ہوگی اور اس سے مراد قرآن اور سنت ہے: وَالتَّوْرٰىةَ وَالْإِنجِيلَ: یہ تعلیم آسمانوں کے جانے سے پہلی دی گئی ہے پہلے تورات کی دعوت دینے کے پابند تھے پھر انجیل بھی دی گئی جیسا کہ آیت ۴۶ میں گزر گیا ہے: وَإِذْ تَخْلُقُ: اس میں اور نعمتوں کی تفصیل ہے اور اس کے محتاج ہونے کا ذکر ہے یعنی معجزات وتصرفات میں اللہ تعالیٰ کے محتاج تھے جس پر لفظ إِذْنِي: دلیل ہے: كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ: کاف مُمَاثَلَت کے معنی میں ہے اور فَتَنفُخُ فِيهَا: اور تَكُونُ میں ضمیر کاف کی طرف راجع ہے کیونکہ اس میں تانیث کا معنی موجود ہے: بِإِذْنِي: اذن کا مکرر ذکر ہے اس میں اشارہ ہے کہ تصویر بنانا اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہے پرندے بنانا بھی اذن الٰہی ہے اور اس کو اذن شرعی کہتے ہیں۔ یہ دوسرا اذن تکوینی کہلاتا ہے اور سورۃ آل عمران میں اذن ایک مرتبہ ذکر ہوا ہے جبکہ یہاں پر دو مرتبہ ذکر ہوا ہے فرق یہ ہے کہ اس سورۃ میں عیسیٰ علیہ السلام کی حاجتوں کی تفصیل بیان کرنا مقصود ہے: وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ: وہ مادرزاد اندھا جو پیدائشی طور پر آنکھوں سے معذور ہو یعنی آنکھیں اس کی بند ہوں جس کے علاج سے حکیم وڈاکٹر عاجز ہوں: وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي: یہ بھی عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے فعل کا صیغہ دوام اور استمرار پر دلالت نہیں کرتا بعض مردوں کو زندہ قبروں سے نکالتے تھے۔ یہ معجزہ انسانوں کو فائدہ دینے کیلئے انہیں دیا گیا تھا: وَإِذْ كَفَفْتُ: اس میں ضرر سے بچانے کی نعمت کا ذکر ہے اور یہ اس کی حفاظت کیلئے تیسری محتاجگی کا ذکر ہے یعنی عیسیٰ علیہ السلام مذکورہ معجزات لانے اور بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے کے بعد بعض لوگوں نے ان معجزات سے انکار کیا اور جادو قرار دیتے ہوئے عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی کوششیں کیں جیسا کہ سورۃ

آل عمران آیت 54 میں ذکر ہے تو ان کے شر سے بچانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمانوں پر اٹھایا جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت 55 میں ذکر ہوا ہے: اِنْ هٰذَآ اس میں: بَيِّنٰتُ وَبِيْلِ مَا جَآءَ: تمام معجزات کی طرف اشارہ ہے۔ سوال: یہ تو نعمتوں کے بیان کا مقام ہے تو اس میں کافروں کا عیب ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟۔ جواب ۱: اس میں: كَفَفْتُ: نعمت ہے اور اِنْ هٰذَآ: کو بطور ان کی دشمنی ذکر کیا ہے۔ جواب ۲: امام نیشاپوری نے لکھا ہے کہ بغیر کسی دلیل کے دشمنوں کا طعن کرنا (مطعون کے) رفعت شان کی دلیل ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے: وَاِذَا اَتَتْكَ مَذَمَّتِيْ مِنْ نَاقِصٍ فَهِيَ شَهَادَةٌ لِيْ بِاَنِّيْ كَامِلٌ: جب کسی گھٹیے کی زبان سے میری برائی سنو تو جان لو کہ میں کامل ہوں اور یہ مقولہ بھی معروف ہے کہ: كُلُّ ذِيْ نِعْمَةٍ مَحْسُوْدٌ: یعنی ہر صاحب نعمت سے حسد کیا جاتا ہے۔ (تنبیہ) مرزا غلام احمد قادیانی نبوت کا جھوٹا دعویدار کذاب دجال کئی وجوہات کی وجہ سے کافر ہے ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو جادو اور شعبدہ بازی کہتا تھا (ضمیمہ انجام آتھم ص5، 6) جبکہ اس آیت میں صراحت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو جادو کہنا کفر ہے۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

"جب میں نے حواریوں کے دلوں میں یہ بات ڈال دی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے ہیں اور تو گواہ رہ کہ یقیناً ہم ماننے والے ہیں" [۱۱۱]۔

تفسیر 111 لازم نعمتوں کے بعد اب متعدی نعمتوں کا ذکر ہے اور اس میں عیسیٰ علیہ السلام کے چوتھے احتیاج کا ذکر ہے یعنی حواریین کو ان کا ساتھی بنانا جیسا کہ ہمارے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اور تائید کیلئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تھا سورۃ انفال آیت 62 میں ہے: اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ: لغت میں وحی خفیہ اشارہ کو کہا جاتا ہے تو کبھی وسوسہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے سورۃ انعام آیت 113 کبھی الہام پر سورۃ قصص آیت 7۔ اور کبھی فطری تعلیم کو بھی کہا جاتا ہے سورۃ نحل آیت 68۔ تو یہاں پر الہام یا حکم کے معنی میں ہے: اَلْحَوَارِيّٖنَ: حواری کی جمع ہے اور لفظ حور سے لیا گیا ہے جس کا معنی سفید ہے۔ حواری ایسے دوست اور ساتھی کو کہا جاتا ہے جو مخلص اور رازدار ہو اور دل سے پاک ہو منافقت سے خالی ہو: قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ: قاعدہ یہ ہے کہ جب ایمان اور اسلام اکٹھے ذکر کئے جائیں تو ان میں فرق مقصود ہوتا ہے یعنی اسلام سے ظاہری اعمال مراد ہوتے ہیں اور ایمان دل کی صفت ہے اس لیے ایمان

کو اسلام پر مقدم کیا ہے۔

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

”جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم کیا طاقت رکھتا ہے تیرا رب کہ نازل کرے ہم پر آسمان سے دسترخوان اس (عیسیٰ علیہ السلام) نے کہا اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو“ [۱۱۲]۔

تفسیر 112 اس آیت میں اور اس کے بعد والی میں نزول مائدہ کیلئے دعا اور اس کے نزول کیلئے تمہید ہے اور چونکہ یہ نعمت نہیں ہے اس لیے ماقبل پر اس کو عطف نہیں کیا اس واقعہ میں پانچواں احتیاج کا ذکر ہے جو کہ مائدہ سے متعلق ہے: یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ: مفسر حقانی نے تفسیر الرحمٰن میں لکھا ہے کہ اس خطاب میں اشارہ ہے کہ ہم آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ مانتے ہیں ہم آپ کو الٰہ یا ابن اللہ نہیں کہتے اس لیے آپ سے مائدہ کے لیے دعا کروا رہے ہیں مائدہ نازل کرنا آپ کے اختیار میں نہیں ہے: هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ: سوال: حوارین تو پختہ مؤمنین تھے اور اللہ تعالیٰ کی صفتوں کو مانتے تھے اور جانتے تھے تو پھر اس کلام کو: هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ: کیوں فرمایا؟۔ جواب: اس کو استفہام تقریری کہتے ہیں ھل بمعنی قد ہے یعنی یقیناً آپ کا رب قادر ہے مائدہ کے نزول پر یا پھر يَسْتَطِيْعُ دعاء کی قبولیت کیلئے ہے اس قسم کی تاویلات خازن کے قول کی وجہ سے ہیں کہ انہوں نے کہا ہے کہ حوارین کے متعلق یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ وہ قدرت الٰہی میں شک کرینگے بعض علماء کا قول ہے کہ یہ انہوں نے اس وقت کہا تھا جب ان کے دلوں میں ایمان پختہ نہیں ہوا تھا لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے: مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ: مائدہ میں دو قول ہیں پہلا قول یہ ہے کہ تیار کھانے کو مائدہ کہا جاتا ہے (یہ لسان العرب میں امام اخفش نحوی سے نقل کیا ہے)۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ایسا دسترخوان جس پر تیار کھانا لگا ہوا ہو یہ قول بعض اہل لغت کا ہے۔ امام قرطبی نے کہا ہے کہ میز کو کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میز پر کبھی بھی کھانا نہیں کھایا بلکہ میز پر کھانا بادشاہ کھاتے ہیں اور دسترخوان پر عرب کھاتے ہیں (صحیح بخاری کتاب الاطعمۃ حدیث 5386) قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: پہلے قول کی بناء پر تقویٰ سے مراد کثرت سوال اور معجزات طلب کرنا ہے گناہوں سے اجتناب۔ اِنْ بمعنی اِذْ ہے۔ جبکہ دوسری توجیہ کی بنا پر ان اپنے معنیٰ پر ہے اور تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ قدرت الٰہی میں شک کرنے سے گریز کرو۔

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

"انہوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور یہ ہم جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ فرمایا تھا اور ہم اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہو جائیں" [۱۱۳]۔

تفسیر 113 اس آیت میں دستر خوان طلب کرنے میں انکا عذر اور سبب ذکر ہوا ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ دوسری توجیہ یعنی شک کرنا صحیح نہیں ہے: نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا: چار مقاصد مذکور ہیں پہلا مقصد اس سے کھانا۔ قرطبی نے ماوردی سے نقل کیا ہے کہ یہاں پر کھانا برکت کے لیے ہے یعنی: نَاْكُلُ مِنْهَا: کی بعد معطوف علیہ مقدر ہے یعنی: لِنَنَالَ بَرَكَتَهَا: تا کہ ہم برکت حاصل کریں اور بعد والے جملے اس پر عطف ہیں: وَتَطْمَىِٕنَّ: کو نَّاْكُلَ: پر عطف کیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ بعد میں ذکر ہونیوالے فائدے کھانے کے ساتھ خاص نہیں ہیں صرف مائدہ دیکھنے سے یہ تین فائدے حاصل ہوئے ہیں: وَتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا: اطمینان سے قدرت الٰہی کے دیکھنے پر یقین میں اضافہ مراد ہے کیونکہ علم استدلالی کے ساتھ جب علم مشاہدہ جمع ہو جائے تو یقین میں اضافہ ہوتا ہے یا اس بات پر اطمینان کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو دعوت دین کیلئے منتخب کیا ہے: وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا: یہاں علم سے مراد یہ ہے کہ رسالت کی صداقت پر ہمارے علم میں مزید اضافہ ہو جائے: وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ: شہادت سے اللہ تعالیٰ کی توحید رسول کی رسالت پر گواہی مراد ہے یا مراد یہ ہے کہ توحید کی صداقت اور اس معجزے کو پہنچانے کی گواہی غائب لوگوں تک پہنچانا ہوگا۔

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

"فرمایا عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے اے اللہ اے ہمارے رب نازل فرما ہم پر آسمان سے دستر خوان کہ وہ بن جائے ہمارے پہلوں کیلئے اور ہمارے بعد والوں کیلئے عید تیری طرف سے نشانی اور ہمیں رزق دے اور تو بہترین رزق دینے والا ہے" [۱۱۴]۔

تفسیر 114 جب عیسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ ان کا مقصد صحیح ہے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا طلب کی اس واقعہ میں بھی عیسیٰ علیہ السلام کے احتیاج کا ذکر ہے اور یہ مسئلہ بھی ثابت ہوا کہ انبیاء کرام معجزات میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا: زیادہ عاجزی اور انکساری کیلئے وسیلہ دعاء میں اللہ تعالیٰ کے سامنے صفت الوہیت اور صفت ربوبیت دونوں ذکر کی ہیں: مَآىِٕدَةً: کوفی نحویوں کا کہنا ہے کہ اس میں فاعلیت کا معنی ہے یعنی کھانے والوں کے ہاتھ اپنی طرف مائل کرتا ہے

اور بصرہ کے نحویوں کا کہنا ہے کہ اس میں مفعولیت کا معنی ہے یعنی کھانے والوں کے ہاتھ اس کی طرف مائل ہوتے ہیں: مِّنَ السَّمَآءِ: اس میں مقصد کے تعین کی صراحت ہے: تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا. تَكُوْنُ: کی ضمیر مائدہ کی طرف راجع ہے تو مراد مائدے کا نازل ہونا ہے یا اس کے نازل ہونے کے دن کی طرف راجع ہے۔ عید کو عود سے لیا گیا ہے جو ہر سال میں خوشیوں کو لیکر دو مرتبہ آتی ہے تو یہاں عرفی معنیٰ یا لغوی معنی مراد ہے یعنی (بار بار خوشی) یہ معنی بہتر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دستر خوان اتوار کے دن اترا تھا اس لیے انہوں نے اتوار کو عید کے طور پر بنایا لیکن یہ کہنا صحیح حدیث کے خلاف ہے جس میں ہے کہ نصاریٰ نے اتوار اور یہود نے ہفتہ والے دن کو اپنایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں یعنی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جمعہ مبارک کی ہدایت دی (صحیح بخاری کتاب الجمعۃ حدیث 786 صحیح مسلم حدیث 855)۔ اس سے معلوم ہوا کہ اتوار کے دن کو خوشی کیلئے عید کے طور پر منتخب کرنا اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے خلاف ہے: لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا: یعنی جو اس وقت حاضرین تھے اور بعد میں آنیوالوں سے مراد وہ جو بعد میں آئینگے تو معنی یہ ہوا کہ اے اللہ اس دستر خوان کو جاری رکھنا۔ عیکا معنی یہ ہے کہ آئندہ آنیوالے اس میں سے کھائیں گے۔ یا بعد والے لوگ اس خبر کو سن کر دین میں قوت حاصل کرینگے: وَ اٰيَةً مِّنْكَ: یعنی تیری طرف سے توحید کے لیے اور اتباع رسول کے لیے دلیل ہوگی: وَ ارْزُقْنَا: یعنی اس مائدہ کو ہمارے لئے رزق کا سبب بنادے۔ یا ہمیں شکر ادا کرنے کی توفیق عطاء کردے: وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ: رزق کے اسباب بنانے والے اور کمانے والے کسی پیشہ کو اختیار کرنیوالے کو بھی مجازاً رازق کہا جاتا ہے اس وجہ سے رازقین جمع ذکر کیا ہے اور خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ: تو اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لیے کہ رزق وہ پیدا کرتا ہے اور تقسیم بھی صرف اسی کے اختیار میں ہے۔

قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ ع

"فرمایا اللہ تعالیٰ نے میں اسے تم پر نازل کردونگا پھر تم میں سے جس نے کفر کی اس کے نازل کرنے کے بعد تو میں اسے لازماً ایسا عذاب دونگا کہ ویسا عذاب عالم میں سے کسی اور کو نہیں دونگا" [۱۱۵]۔

تفسیر 115 اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کی دعاء کی قبولیت کا ذکر ہے اور ساتھ میں تخویف کے ذریعے ادب کا ذکر ہے: فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا: اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی قوم معجزہ طلب کرے پھر اس کو نصیحت بھی کی جائے اور اسکے باوجود وہ اس معجزہ سے انکار کرے اور اس کی بے ادبی کرے تو وہ لوگ سخت ترین عذاب کے مستحق ہیں۔ فائدہ: مائدہ کے نزول میں اختلاف ہے حسن بصری اور مجاہد سے ابن کثیر وابن جریر نے صحیح سند سے نقل کیا ہے کہ جب انہوں نے یہ سخت وعید سن لی تو

مائدہ نازل کرنے کا مطالبہ چھوڑ دیا اور مائدے کا نزول رک گیا۔ اس قول کو اس سبب سے تقویت حاصل ہوتی ہے کہ مائدے کا نزول نصاریٰ کی کتابوں میں بھی نہیں ہے اور ان کے نزدیک مشہور بھی نہیں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جو جمہور علماء کا ہے کہ مائدہ نازل ہوا ہے ابن جریر نے اس کو فوقیت دی ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ: **إِنِّي مُنَزِّلُهَا**: اور اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔ اس پر سلف کے بہت اقوال ہیں اس میں ایک مرفوع سند سے کتاب التفسیر میں امام ترمذی نے حدیث 3061 نقل کی ہے کہ مائدہ نازل کیا گیا تھا اور ان سے کہا گیا تھا اس میں سے کھانا ہے وہ صرف اس وقت کھائیں اور دوسرے وقت یا دن کیلئے ذخیرہ نہ بنائیں مگر انہوں نے خیانت کی اور آئندہ کل کے لئے کھانا ذخیرہ کیا۔ تو ان کے چہرے بگڑ گئے اور بندروں اور سوروں کی شکلیں بن گئیں۔ امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ روایت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً و موقوفاً دونوں طریقوں سے منقول ہے البتہ موقوف سند زیادہ قوی ہے اس سلسلہ میں بہت زیادہ اسناد مفسرین نے نقل کیے ہیں مگر ان میں ایک بھی مرفوع نہیں ہے اور ان میں نکارت بھی ہے یعنی منکر روایتیں ہیں (اس حدیث کو شیخ البانی نے ضعیف کہا ہے اور اسی طرح شیخ زبیر علی زئی نے بھی ضعیف کہا ہے)۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مذکور ترمذی کی روایت اگرچہ موقوف ہے مگر اس مقام پر بہتر ہے اور فیصلہ یہ ہے کہ مائدہ نازل ہوا ہے اور اس سے لوگوں نے کھایا ہے لیکن مکمل تفصیل اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے نیز جن لوگوں نے کہا ہے کہ نصاریٰ کی کتاب میں نہیں ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے اکابر کی شکلوں کا مسخ اور ذلت اس میں ذکر ہوئی ہے اسلئے انہوں نے اس کو چھپایا ہے اور اپنی کتابوں میں اس کو اس لیے ذکر نہیں کیا جیسا کہ یہودیوں نے یوم السبت کا واقعہ چھپایا تھا اور امام احمد نے مسند میں اور مستدرک میں امام حاکم نے روایت نقل کی ہے مشرکین مکہ نے نبی کریم ﷺ سے مطالبہ کیا کہ تم اپنے رب سے دعا کرو کہ صفا پہاڑی سونے کی بنادے تو ہم ایمان لے آئیں گے آپ نے دعا مانگی جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ اے محمد ﷺ آپ کا رب آپ کو سلام عرض کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو میں صفا پہاڑی کو سونے کا بنادونگا مگر پھر جو کفر کریگا تو ان کو وہ سزا دونگا جو پورے عالم میں کسی کو نہیں دی ہوگی اور اگر آپ چاہو تو ان کیلئے رحمت اور توبہ کا دروازہ کھول دونگا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ رحمت اور توبہ کا دروازہ دینا بہتر ہے۔ (مسند احمد 1/242 مستدرک حاکم 1/53 طبرانی کبیر 12736 شیخ شعیب ارناووط نے اس روایت کو شرط مسلم پر قرار دیا ہے جبکہ شیخ البانی نے صحیح کہا ہے ترغیب حدیث 3142 سلسلۃ الصحیحۃ 3388)

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؔ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۝

"جب فرمائے گا اللہ تعالیٰ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ تعالیٰ کے سوا معبود بنا لو وہ (عیسیٰ علیہ السلام) کہیں گے تو (شرک سے) پاک ہے لائق نہیں تھا میرے لیے کہ میں کہوں وہ جو میرے لئے حق نہ ہو اگر میں نے کوئی بات کہی ہو (جو میرے لئے حق نہیں) تو یقیناً تو اس کو جانتا ہے تو جانتا ہے جو میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے نفس میں ہے یقیناً تو ہی چھپی ہوئی چیزوں کو خوب جانتا ہے" [۱۱۶]۔

تفسیر 116 یا س: اِذْ قَالَ: کو پھر لایا گیا ہے جو آیت 110 میں گزرا ہے اور اس کو اعادہ بعد عہد کہا جاتا ہے یعنی ماقبل مضمون اور اس مضمون کا وقت ایک ہی ہے اس گفتگو کے وقت کے متعلق اختلاف ہے امام سدی اور قرطبی نے لکھا ہے کہ یہ کلام عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھانے کے بعد ہوا ہے۔ امام ابن جریر نے اس قول کو دو وجوہات کی بناء پر ترجیح دی ہے پہلا سبب یہ ہے کہ صیغہ ماضی کا استعمال ہوا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اِذْ: کے ساتھ ہے اور یہ قول کہ: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ: اس میں گناہوں کی مغفرت کا ذکر ہے اور یہ معاملہ دنیا میں ہی ہو سکتا ہے۔ دوسرا قول جو اکثر مفسرین کا ہے وہ یہ ہے کہ یہ گفتگو آخرت میں ہوگی۔ امام ابن جریر کے اعتراضات کے امام ابن کثیر نے دلائل سے جوابات دیے ہیں۔ پہلا جواب قرآن مجید میں بہت مقامات پر قیامت کیلئے ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے جو برائے یقین وتاکید ہوتا ہے۔ جیسا وَنَادٰۤی اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ: سورۃ اعراف اور اِذْ بھی: اِذَا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے: وَاِنْ تُعَذِّبْهُمْ: یہ شفاعت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے حوالے کرنا ہے یعنی تفویض کے معنی میں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کا تعلق: یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ: سے ہے اور: یَوْمَ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ: بھی اس پر دلیل ہے جو بعد میں مذکور ہے۔ سوال: اللہ تعالیٰ کو تو عیسیٰ علیہ السلام کا حال معلوم ہے تو پھر ان سوالات و جوابات کا کیا فائدہ ہے؟۔ جواب: پہلا فائدہ یہ ہے کہ نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف یہ بات منسوب کی تھی کہ انہوں نے ہم سے کہا ہے کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ تعالیٰ کے سوا الہ مانو لہٰذا اس میں اس الزام کا جواب ملا۔ اس کا ایک جواب سورۃ آل عمران آیت 79 میں گزرا ہے اور یہاں پر بھی نصاریٰ کی تکذیب پر یہ جواب عیسیٰ علیہ السلام کے کلام سے دیا گیا ہے۔ دوسرا فائدہ: یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو

معلوم ہو جائے کہ نصاریٰ نے ان کا لایا ہوا دین تبدیل کیا ہے۔ تیسرا فائدہ: یہ ہے کہ یہ واضح دلیل ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام امت کے حالات سے بے خبر ہیں آسمانوں پر اُٹھانے اور موت کے بعد لہٰذا یہ ان کے علم غیب سے بے خبری کی دلیل ہے جیسا کہ تمام نبیوں کیلئے یہ بات آیت 109 میں گزر چکی ہے۔ وَأُمِّيَ مریم کی جگہ اُمّی اس لیے فرمایا تا کہ عیسیٰ علیہ السلام اور مریم کی الوہیت کی نفی کی دلیل بن جائے اس لیے کہ تو الد کی نسبت الوہیت کی منافی ہے: مِنْ دُوْنِ اللہِ دُوْنِ غیر کے معنی میں ہے یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی الوہیت کو چھوڑا ہے بلکہ یہ شراکت کے لیے استعمال ہوتا ہے: قَالَ سُبْحٰنَكَ: امام ترمذی نے یہ روایت نقل کیا ہے اور اس کو حسن صحیح بھی قرار دیا ہے جس میں مذکور ہے کہ یہ حجت اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو تلقین کی ہے کتاب التفسیر حدیث 3073: سُبْحٰنَكَ: یہ تحقیقی جواب ہے اس میں عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے متعلق اپنے عقیدے کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے عیوب سے پاک ہے نہ تو اس کا کوئی شریک ہے نہ ہی اولاد اس کیلئے ثابت ہے لہٰذا اس کے شریک کا کوئی امکان ہی نہیں ہے: مَا يَكُوْنُ لِيْ: یہ سُبْحٰنَكَ کیلئے تشریح اور دوسرا جواب بھی ہے: مَا يَكُوْنُ بمعنی: مَا يَتَصَوَّرُ وَمَا يَنْبَغِيْ مَا يُمْكِنُ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کیلئے لائق ہی نہیں ممکن ہی نہیں تصور میں نہیں آ سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور الہ ہو سکتا ہے: مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ: یہ استحقاق کے معنی میں ہے یعنی اپنی الوہیت کی طرف دعوت دینا کسی بھی صورت میں میرا حق نہیں: اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ: جب یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ ہو سکتا ہے عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بات کہی ہو لیکن اب اس سے انکار کر رہے ہوں تو اس احتمال و اشکال کا جواب اس طریقے سے دیا ہے جو دلیل برہانی کے طور پر ہے یعنی اگر یہ عمل ثابت ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوگا تو جب اللہ تعالیٰ کے علم میں اس طرح کی کوئی بات عیسیٰ علیہ السلام سے ثابت نہیں تو یقیناً انہوں نے ایسی بات کہی نہیں ہے اس لیے کہا اس طرح کے قول کا صدور مستلزم ہے اللہ کے علم کو چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام سے اس قول کے صدور کا اللہ کے علم سے انتفا مستلزم ہے اس قول کے انتفا کو اس لیے کہ لازم کا انتفا مستلزم ہے ملزوم کے انتفا کے ساتھ: تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ: یہ گزشتہ ملازمت کی دلیل ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہر چیز پر عالم ہے تو عیسیٰ علیہ السلام کے نفس پر بھی عالم ہے۔ اس جملے میں ایک اور اشکال کو ختم کیا گیا ہے معنی یہ ہے کہ احتمال ہو سکتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی نفس میں یہ خیال گزرا ہو تو رد ہوا کہ اگر میرے نفس میں کوئی خیال بھی گزرتا تو اللہ تعالیٰ اس پر عالم ہے اور جب میرے نفس میں نہیں ہے تو زبان پر کس طرح آ سکتا ہے: وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ: اس میں اس حقیقت کا بیان اور اپنے علم کی کمزوری بیان کرنا ہے نفس ذات کو کہا جاتا ہے اور لفظ نفس اللہ تعالیٰ کیلئے

بطور صفت ثابت ہے جس میں تمثیل اور تشبیہ مخلوق کے ساتھ دینا جائز نہیں ہے جیسا کہ کسی نے علم ،غیب اور ہز وغیرہ مراد لیا ہے تو وہ سلف صالحین کے منہج کے خلاف ہے: اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ: اس میں بھی گزشتہ کلام کیلئے دلیل ذکر کی ہے یعنی: اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ:

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾

"میں نے ان سے نہیں کہا مگر وہی کہ تو نے مجھے جس کا حکم دیا تھا یہ کہ تم عبادت خالص کرو اللہ تعالیٰ کی جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی اور میں ان پر نگران تھا جب تک ان میں تھا پھر جب مجھے تو نے اُٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر باخبر ہے" [۱۱۷]۔

تفسیر 117 یہ بھی بطریقہ ادب اس سوال کا جواب ہے جو: اَنْتَ قُلْتَ: میں ہے۔ سوال: اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ: یہ استثنیٰ تو ماقبل کی جنس سے نہیں ہے جو کہ :مَا قُلْتَ: ہے تو پھر متصل نہیں ہوسکتا ہے؟۔ جواب: مَا قُلْتُ: اصل مَا اُمِرْتُ کی معنی میں ہے مگر ادب اور :قُلْتَ لِلنَّاسِ: کی مناسبت سے انہوں نے :قُلْتُ: سے تعبیر کیا: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ: اَنْ ماموربہ کا حرف تفسیر ہے (ماموربہ) اس میں توحید الوہیت وربوبیت دونوں داخل ہیں عیسیٰ علیہ السلام سے اس قول کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران آیت 51، سورۃ مریم آیت 36 اور سورۃ زخرف آیت 64 میں نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کلام انتہائی سچائی پر مبنی ہے اور اس میں کسی قسم کے جھوٹ نہیں ہے: وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ : اس میں بعد میں نصاریٰ کے ایجاد کردہ اعمال سے عیسیٰ علیہ السلام کی بیزاری کا ذکر ہے۔ یعنی جب تک میں ان میں موجود تھا تو دعوت وتبلیغ کے ذریعے میں ان کی تربیت کرتا رہا اور اب بھی ان اعمال کی شہادت دے سکتا ہوں: مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ عام ہے: حَيًّا: اس لیے نہیں فرمایا کہ آسمانوں پر زندہ رہے مگر پھر بھی اپنی امت کے حالات سے بے خبر تھے کیونکہ ایک تو امت سے دور اور جدا تھے اور دوسرا یہ کہ خبر لینے کے اسباب نہیں تھے: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ یہاں پر: توفّی: عام معنی میں ہے یعنی آسمانوں پر روح وبدن سمیت اُٹھالینا یا آسمان سے نزول کے بعد فوت کر لینے کے معنی میں ہے دونوں کو شامل ہے نزول عیسیٰ علیہ السلام قرب قیامت میں یقینی دلائل سے ثابت ہے احادیث متواتر اس سلسلے میں وارد ہیں تفصیل آل عمران آیت 55 میں پڑھیے: الرَّقِيْبَ: تمام اعمال واحوال کا علم رکھنے والا اور نگہبان: وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ

شَيْءٍ شَهِيْدٌ، كُلِّ شَيْءٍ : میں عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال و اعمال اور ان کی قوم کی ہر مطیع ہر نافرمان اور ہر چیز شامل ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ بندہ اور اللہ تعالیٰ کے شہید ہونے میں فرق ہے یعنی اللہ تعالیٰ شہید ہے ہر چیز پر اس کا علم و نظر ہے جبکہ بندے کی صفت میں یہ معنی نہیں ہوسکتا کہ وہ ہر چیز پر نظر و علم رکھتا ہے۔ (تنبیہ) شہید سے حاضر و ناظر کی تعبیر ہوسکتی ہے کیونکہ یہ مشاہدے اور شہادت بمعنی علم سے لیا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ کو حاضر باعتبار علم کہا جاسکتا ہے۔ فائدہ: امام بخاری نے تفسیر سورۃ مائدہ اور کتاب الانبیاء حدیث 4625 میں اور امام مسلم نے صحیح مسلم کتاب الجنہ باب فناء الدنیا و بیان الحشر حدیث 2860 میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے نقل کیا ہے جس میں ذکر ہے کہ میری امت میں سے بعض افراد کو جہنم کیطرف روانہ کیا جائیگا میں کہونگا اے اللہ انہوں نے تو میری اطاعت کی ہے یعنی میرے ساتھی ہیں تو کہا جائیگا اِنَّكَ لَا تَدْرِيْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَكَ : آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کی (وفات) کے بعد کیا کیا نئی چیزیں پیدا کیں یعنی بدعات و رسومات کو دین میں شامل کیا تھا تو میں اس وقت اسی طرح کہونگا جیسا کہ ایک اور صالح بندے نے کہا تھا وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ : یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی وفات کے بعد اُمت کی اعمال اور احوال سے بے خبر ہیں۔ نیز اُمت کے اعمال نبی پر پیش ہونے کی کوئی صحیح روایت نہیں ہے۔ سوال: اس حدیث سے قادیانی مرزائی ملعون نے دلیل پکڑی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام فوت ہوئے ہیں اس آیت میں: فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ : موت کے بارے میں ہے اور دلیل بنانے کا طریقہ اس نے یہ اختیار کیا ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فوت ہونے کی وفات کے بعد یہ الفاظ کہے ہیں تو معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بھی وفات کے بعد اس طرح کہا ہے لہٰذا وہ فوت ہوچکے ہیں اور: تَوَفَّيْتَنِيْ : میں موت کے معنی مراد ہے۔ جواب ۱: یہ بات گزر گئی کہ توفی یہاں پر عام معنی میں ہے جس میں روح اور جسم کے ساتھ پورا لینا مراد ہے اور فوت کرنا بھی مراد ہے تو تشبیہ ایک معنی کے اعتبار سے ہے۔ جواب ۲: اگر یہاں: تَوَفَّيْتَنِيْ : موت کے معنی میں بھی استعمال ہوجائے تو تب بھی کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام یہ گفتگو موت کے بعد قیامت والے دن کریں گے اور قیامت سے قبل دنیا پر ان کا نزول اور اس کے بعد وفات ہے اس میں آسمانوں پر جانے کی نفی لازم نہیں آتی۔ جواب ۳: عام مفسرین نے: تَوَفَّيْتَنِيْ : کا معنی: رَفَعَ اِلَى السَّمَآءِ : پر کیا ہے تو وہ بھی درست ہے۔ اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ حدیث میں تشبیہ صرف اس جملے میں ہو کہ: وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

"اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اگر تو ان کو بخش دے تو یقینا تو ہی زبردست اور خوب حکمت والا ہے" [۱۱۸]۔

تفسیر 118 قرطبی اور سدی کے قول کی بناء پر یہ بھی عیسیٰ علیہ السلام کے کلام میں شامل ہے اور یہ قول دنیا میں ہے تو معنی یہ ہوگا کہ: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ: اگر ان کو دنیا میں کفر پر چھوڑ کر پھر آخرت میں عذاب دیدے تو تیری ذات پر کوئی اعتراض نہیں کیونکہ: فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ: وہ تیرے بندے ہیں: وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ: یا ان کو توبہ کی توفیق دے اور وہ دنیا میں توبہ کرلیں اور ان کو توبہ کے سبب تو انہیں معاف کردے تو اس سے عاجز نہیں ہے اس لیے کہ: فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ: لیکن یہ بات گزری ہے کہ سدی کا قول ضعیف ہے تو عام مفسرین کے بقول یہ سب کچھ قیامت میں ہوگا۔ سوال: جب نصاریٰ کا کفر شرک اور جھوٹ ثابت ہوا تو پھر ان کیلئے شفاعت کیوں کی جارہی ہے۔ جواب: ابن کثیر اور خازن وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ سفارش نہیں ہے یہ اللہ کی مشیت کے سپرد کرنا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے نصاریٰ سے براءت کی ہے دلیل یہ ہے کہ: اِنْ تَغْفِرْ: کے بعد: غَفُوْرُ الرَّحِيْمِ: نہیں فرمایا کیونکہ اس میں مغفرت طلب کرنا مقصد ہی نہیں ہے۔ سوال: شرط اور جزا کے دونوں جملوں میں کیا مناسبت ہے؟ جواب: اس میں مقدر عبارت ہے۔ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكَ اِعْتِرَاضٌ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاَنْتَ الْمَالِكُ الْمُطْلَقُ یا اس طرح عِبَادُكَ وَهُمْ عَبَدُوْا غَيْرَكَ یعنی اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور تو ان کا مالک مطلق ہے لہذا تجھ پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا یا وہ بندے تیرے ہیں مگر انہوں نے غیروں کی بندگی کی ہے۔ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ يَا يَلْحَقُكَ عَجْزٌ بِذٰلِكَ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اگر ان کو شرک اور کفر کے باوجود تو معاف کرتا ہے تو تو اس سے عاجز نہیں ہے کیونکہ ہر چیز پر تیرا غلبہ ہے اور تو حکمت والا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ اللہ تعالیٰ کسی قسم کے شرک کو معاف نہیں کرتا۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

''اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ دن ہے کہ فائدہ دے گی سچوں کو ان کی سچائی ان کیلئے ایسے باغات ہیں کہ بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے راضی ہوا ان سے اللہ تعالیٰ اور وہ راضی ہوئے اللہ تعالیٰ سے یہی بہت بڑی کامیابی ہے''[۱۱۹]۔

تفسیر 119 یہ خوشخبری ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے حال سے متعلق ہے: هٰذَا يَوْمُ: اس سے قیامت کا دن مراد ہے اور اس کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ اس دن انسانوں کو پورا بدلہ دیا جائیگا: يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ: دنیا میں سچ بولنا اور اس پر عمل پیرا ہونا ہے اس لیے کہ دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور: اَلصّٰادِقِيْنَ: سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ سچ بولتے ہیں صادقین میں توحید شامل ہے اس لیے امام ابن کثیر نے صادقین کی تعبیر: اَلْمُوَحِّدِيْنَ: سے کی ہے اس میں حق کی دعوت دینے والے بھی شامل ہیں سب سے پہلے اس میں انبیاء ہیں جیسا کہ سورۃ احزاب آیت 8 میں ہے نفع سے مراد آخرت کا اجر و ثواب ہے یا صدق سے مراد آخرت میں سچ بولنا ہے جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا قول۔ یہ سچائی دنیا کی سچائی کے موافق ہو تو نفع سے مراد لوگوں کی ملامت سے اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچ جائیں گے اور ثواب حاصل کر لینگے اور ابلیس کی سچائی کا وعدہ وغیرہ جو قیامت کا مذکور ہے وہ اس کو فائدہ نہیں دے گا اس لیے کہ اس کے دنیاوی عمل کے ساتھ موافق نہیں ہے اسی طرح کفار جو اپنے اوپر کفر، شرک اور انکار وغیرہ کا اقرار کریں تو ان کیلئے بھی صدق کوئی فائدہ مند نہیں ہے کیونکہ یہی اقرار انہوں نے دنیا میں نہیں کیا تھا تو بے فائدے ہے: لَهُمْ جَنّٰتٌ: یہ فائدے کا بیان ہے اس لیے اس کو عطف نہیں کیا ہے: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ: ان کی اطاعت گزاری اور سچائی کی وجہ سے جو دنیا میں اختیار کی تھی: وَرَضُوْا عَنْهُ: دنیا میں ان کی رضا اللہ تعالیٰ کی قضا پر تھی یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر خوش تھے تو اس رضامندی کی وجہ سے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں ان کے لیے کثیر نعمتیں۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''اللہ تعالیٰ ہی کیلئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''[۱۲۰]۔

تفسیر 120 سورۃ کا اختتام نصاریٰ پر رد کرنے کے لیے توحید کے دعویٰ پر کیا اس میں یہ اشارہ ہے کہ عیسیٰ و مریم علیہما السلام

ہر چیز پر قادر اختیار والے نہیں ہیں تو پھر الٰہ بھی نہیں ہوسکتے ۔امام قرطبی اور خازن نے بھی یہی مضمون لکھا ہے اس میں اشکال کا جواب بھی ہے پہلے کہا گیا کہ لَهُمْ جَنّٰتٌ الخ تو سوال پیدا ہو رہا تھا کہ کون یہ جنت عطا فرمائے گا تو جواب ہوا کہ یہ کام قدرت والا ہی کرسکتا ہے جو کہ فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔وَ مَا فِیْهِنَّ وہ مخلوق جو آسمان و زمین میں ہے انسان، جنات، ملائک، حیوانات، نباتات جمادات وغیرہ۔اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سورۃ مائدہ کی تفسیر تکمیل تک پہنچ گئی۔اے اللہ اپنے فضل وکرم سے ہمیں دنیا و آخرت کے فائدے عنایت فرما۔(آمین)

سورۃ مائدہ کے امتیازات:

۱۔ غیر اللہ کی وجہ سے حرام کی گئی اشیاء پر تفصیلی رد کیا گیا ہے۔
۲۔ اللہ کی حلال کی گئی اشیاء کی تفصیل
۳۔ وعدہ خلافی کرنے والوں کے متعلق سخت وعید
۴۔ وعدہ شکنی کرنے والوں کے قبائح کا تفصیل سے ذکر۔
۵۔ دعوت و تبلیغ سے متعلق پانچ مسائل کا ذکر۔
۶۔ شراب نوشی اور جوابازی کی حرمت کا ذکر۔
۷۔ حرم اور احرام میں اللہ تعالیٰ کی حرام کی گئی اشیاء کا ذکر۔
۸۔ حالت احرام اور حرم میں حرام کی گئی چیزوں کا ذکر۔
۹۔ قسم کے کفارے کا ذکر۔
۱۰۔ انبیاء سے علم غیب کی نفی کا ذکر
۱۱۔ ایسے اُمور میں بحث کرنے سے گریز جن میں مشغول ہونے سے اہم اُمور رہ جاتے ہیں۔
۱۲۔ ایمان والوں سے (16) مرتبہ یا ایھا الذین اٰمنو سے خطاب ہوا ہے جو اس سورۃ کے امتیازات میں سے ہے۔

سورہ مائدہ کی تفسیر مکمل ہوگئی

آیاتہا ۱۶۵ ۶ سورۃ الانعام مکیۃ ۵۵ رکوعاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"(خاص اللہ کے نام کی مدد چاہتا ہوں شروع کرتے ہوئے جو رحمٰن و رحیم ہے)"

سابقہ سورۃ سے تعلق (ربط ۱) پہلی سورۃ میں وعدوں کے پاسداری کا حکم تھا یعنی حلال اور حرام میں (اللہ سے کئے ہوئے) وعدے پورے کرو اور نصاریٰ کی شرک کا رد تھا تو اس سورۃ میں دلائل کے ساتھ اصل مقصد کی تفصیل ہے دلائل کے ساتھ یعنی توحید۔ (ربط ۲) پہلی سورۃ میں توحید کا دعویٰ اور شرک کا رد کیا گیا ہے تو اس سورۃ میں عقلی نقلی دلائل اور دعوت کے میدانوں میں آنیوالی مشکلات کا ذکر ہے۔ اس سورت کا دعویٰ: توحید کو دلائل عقلیہ نقلیہ سے ثابت کرنا ہے اور تمام اقسام شرک اور مشرکین کا رد کرنا ہے اور ساتھ میں طریقہ تعلیم بھی بتانا ہے۔ دلائل کی چار اقسام ہیں۔ (دلیل ۱) چیزوں میں اختیارات و تصرف سے استدلال۔ (۲) چیزوں کے احوال سے استدلال علم محیط کا اثبات۔ (۳) حالات میں انقلاب سے استدلال۔ (۴) کھانے کی چیزوں سے استدلال۔ تعلیم کا طریقہ بھی چار قسم کا ہے (۱) توحید پر پختگی، (۲) اہل حق و اہل باطل کے طریقوں میں فرق، (۳) مافوق البشریہ صفات کی نفی، (۴) صحیح عقیدہ کی تفصیل اور دعوت توحید پر امتحانات نتائج جو کہ چھ (۶) ہیں آیت 53، 55، 105، 113، 123 اور 129۔ خلاصہ: اس سورۃ کے دو حصے ہیں پہلا حصہ آیت ۱۱۷ تک ہے اس میں شرک اعتقادی کا رد ہے اس میں چھ باب ہیں پہلا باب آیت ۱۱ تک ہے اس میں توحید کا دعویٰ اور اس پر تین عقلی دلائل ہیں اور ہر دلیل میں تین تین امور ہیں پھر تین طریقوں پر زجر توبیخ ہے۔ پھر دنیاوی تخویف ہے تین طریقوں سے۔ پھر تین سوالوں کے جوابات ہیں اور آخر میں تین طریقوں سے تسلی دی گئی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۬ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ①

"(الوہیت کی) تمام صفات خاص اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین اور اندھیرے اور روشنی بنائے پھر وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اپنے رب کے ساتھ اوروں کو برابر ٹھہراتے ہیں"۔[1]۔

تفسیر 1 اس آیت میں پہلے توحید کا دعویٰ مذکور ہے اس پر پہلی عقلی دلیل ہے اور وہ تین قسم کی ہے علوی سفلی اور وسطی وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۥ: مراد عام ہے یعنی محسوسی ہو جیسا کہ رات اور دن یا معنوی ہو یعنی علم و جہل توحید و شرک

ثُمَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ : یہ منکرین کیلئے توبیخ ہے ثُمَّ تعقیب ذکری یا برائے استبعاد ہے: يَعْدِلُونَ: یہ عدل سے ہے یعنی برابری اور: بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ: سے متعلق ہے یعنی اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ برابر کرتے ہیں یعنی شرک کرتے ہیں یا پھر یہ عدول سے لیا گیا ہے تو پھر: بِرَبِّهِمْ : سے متعلق ہے تو معنی یہ ہے کہ وہ حق سے منہ پھیرتے ہیں۔ ظُلُمٰتِ : کو جمع ذکر کیا ہے کیونکہ اس کی اقسام اور افراد زیادہ ہیں یعنی شرکیات بدعات رسومات وغیرہ جبکہ نور ایک ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا ۖ وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِندَهُ ۖ ثُمَّ أَنتُمْ تَمْتَرُونَ ۝

"وہی تو ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر اس نے ایک وقت مقرر کیا موت کا اور اس کے علم میں (قیامت کا) ایک وقت معین ہے پھر بھی تم شک کرتے ہو"۔[2]۔

تفسیر 2 یہ دوسری دلیل عقلی ہے۔پہلی اجل سے موت اور دوسری سے قیامت مراد ہے اس میں بھی تین امور کا ذکر ہے مِّن طِينٍ : تمام انسانوں کا اصل مادہ یہ ہے یا مراد خَلَقَ آبَائَكُمْ : تمہارے والد کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔لفظ طین میں اشارہ ہے کہ انسان میں علم وکمالات کے جواہر ہیں جیسا کہ محنت کرنے سے مٹی سے بہت اچھی اچھی چیزیں بنائی جاتی ہیں: قَضَىٰ أَجَلًا : یہ پیدا ہونے سے موت تک مدت ہے: وَأَجَلٌ مُّسَمًّى : یہ مرنے کے بعد قیامت تک کیلئے ہے۔یہ ایک قول ہے دوسرا قول یہ ہے کہ پہلی اجل سے فقط موت کا وقت مقرر کرنا ہے اور دوسری سے مراد قیامت کا دن یہ قول بہتر ہے: تَمْتَرُونَ مِرْيَةٌ : سے لیا گیا ہے جس کا معنی شک ہے یا مراء سے لیا گیا ہے جھگڑے کے معنی میں ہے اور ثُمَّ : استبعاد کیلئے ہے۔

وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ ۖ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ ۝

"اور اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین میں (تصرف) کرنے والا ہے اور وہ جانتا ہے تمہارا پوشیدہ اور تمہارا ظاہر اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم کماتے ہو"۔[3]۔

تفسیر 3 یہ تیسری دلیل ہے پہلے تین دلائل اللہ تعالیٰ کی کارساز ہونے کے ذکر ہوئے اس میں تین امور کا ذکر ہے کہ پوشیدہ قول ظاہر اقوال اور اعمال۔

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝

"ان کے پاس نہیں آتی ان کے رب کی آیتوں میں سے کوئی آیت مگر یہ لوگ اس سے اعراض کرتے ہیں [4]۔ پس یقیناً انہوں نے جھٹلایا حق کو جب ان کے پاس آیا چنانچہ ان کے پاس عنقریب خبریں آئیں گی اس چیز (عذاب) کی کہ وہ اس کے ساتھ استہزا کرتے تھے" [5]۔

تفسیر 4۔5 یہ وعید ہے جس میں تین چیزوں کو ذکر کیا ہے۔ (۱) اعراض، (۲) تکذیب، (۳) استہزا۔ مِّنْ آيَةٍ: اس سے مراد دلیل معجزہ یا قرآن کی آیت ہے پہلا مِنْ برائے استغراق اور دوسرا مِنْ برائے تبعیض ہے: فَقَدْ (فا) برائے تعقیب ہے یعنی اعراض کرنے کے بعد حق کو جھٹلایا اور استہزا کیا: أَنْبَاءُ: عواقب یعنی سزائیں: يَسْتَهْزِئُونَ: یعنی انہوں نے جھٹلانے کے ساتھ استہزا بھی کیا ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ۝

"کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کیں ان سے پہلے کہ ہم نے ان کو زمین میں وہ طاقت دی جو تمہیں نہیں دی اور ان پر موسلا دھار بارش (ضرورت کے مطابق) بھیجی اور ہم نے نہریں بنائیں جو بہتی تھیں ان کے (بنگلوں) کے نیچے پھر ہم نے ان کو بسبب ان کے گناہوں کے ہلاک کیا اور ہم نے ان کے بعد دوسری امتیں پیدا کیں" [6]۔

تفسیر 6 یہ دنیاوی تخویف ہے۔ اس میں تین انعامات کا ذکر ہے۔ رہائش، بارشیں، نہریں۔ اور دو احوال کا ذکر ہے دو مرتبہ ہلاکت اور تیسری ان کی ہلاکت کے بعد دوسری قوم کو آباد کرنا: قَرْنٍ: اس گروہ اور جماعت کو کہا جاتا ہے جو ایک زمانہ میں آباد ہو اور سو سال کی مدت کو بھی: قَرْنٍ کہا جاتا ہے: مَكَّنَّاهُمْ: تمکین سے مراد بنگلے، مکانات، بادشاہت اور مالداری وغیرہ ہے: وَأَرْسَلْنَا: اشارہ ہے کہ وہ سرمایہ دار تھے جاگیردار بھی تھے تو ان کی بنجر زمینوں کو بارشوں سے آباد کیا: مِدْرَارًا: اس بارش کو کہتے ہیں جو پے در پے موسلا دھار ہو مگر ضرورت کے مطابق ہو: مِنْ تَحْتِهِمْ: یعنی وہ نہریں ان کی بستیوں اور گھروں میں ان کے اختیارات کے تحت جاری تھیں اس لیے: تَحْتِهِمْ: فرمایا ہے: فَأَهْلَكْنَاهُمْ: پہلی مرتبہ أَهْلَكْنَا:

بطور ارادہ ہے یا پہلی ہلاکت شرک کی وجہ سے ہے اور دوسری ہلاکت دیگر گناہوں کی وجہ سے ہے۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

"اگر ہم آپ پر کتاب یکبارگی کاغذوں میں (لپٹی ہوئی) نازل کرتے تو ضرور اس کو اپنے ہاتھوں سے چھوتے پھر بھی کافر لوگ کہتے کہ نہیں ہے یہ مگر کھلا جادو" [7]۔

تفسیر 7 اس میں تین سوالات اور جوابات ہیں پہلا سوال کتاب اکٹھی نازل کرنے کا تھا تو جواب اس آیت میں دیا گیا ہے: قِرْطَاسٍ: لکھے ہوئی کاغذ کو قرطاس کہتے ہیں۔ کتاب سے مراد مکتوب ہے یا: كِتٰبًا مَّلْفُوْفًا: لپٹی ہوئی کتاب۔ سوال: فَرَءَوْهُ بِاَعْيُنِهِمْ: کیوں نہیں فرمایا۔ جواب: مفسر سمعانیؒ نے لکھا ہے کہ حصول علم میں لَمَسُّ: بہت ہی ابلغ ہے یعنی آنکھوں سے دیکھنے پر جادو کا اثر ہوتا ہے اور ہاتھوں سے چھونے پر نہیں ہوتا ہے اور یہ بھی وجہ ہے کہ لَمَسُّ: تو اندھے بھی کر سکتے ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝

"انہوں نے کہا کہ اس پر ملائک کیوں نازل نہیں کیا گیا اور اگر ہم کوئی ملائک نازل کرتے تو معاملے کا فیصلہ کیا جاتا پھر وہ مہلت نہیں دیئے جاتے" [8]۔

تفسیر 8 یہ دوسرا سوال ہے کہ اس پر ملائک کیوں نہیں اتارا گیا جیسا کہ سورۃ فرقان آیت 7 میں ہے۔ تو جواب دیا گیا: لَقُضِيَ الْأَمْرُ: اس سے عذاب نازل ہونا مراد ہے جیسا کہ سورۃ فرقان آیت 22 اور حجر 8 میں ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝

"اگر ہم اس کو ملائک بناتے تو ضرور اس کو آدمی بناتے (آدمی کی صورت میں بھیجتے) اور ضرور ڈالتے ہم ان پر وہی شبہ جس میں یہ اب مبتلا ہیں" [9]۔

تفسیر 9 یہ تیسرے سوال کا جواب ہے سوال یہ تھا کہ رسول (بشر) کے بجائے ملائک کیوں نہیں بھیجا؟۔ جواب ہوا کہ ملائک بھی اگر نبی بن کر آئے گا تو وہ بھی آدمی کی صورت میں ہوگا تو جس شک وشبہ کا تم اب شکار ہوئے ہو پھر اس وقت بھی ہوتے۔ سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ ہر ایک طبقے کو ان میں سے ہادی ورہنما بھیجا ہے تا کہ وہ لوگ اس سے پورا پورا فائدہ

حاصل کر سکیں: وَّ لَلَبَسۡنَا: یعنی ابھی جس شک میں ہیں کہ رسول بشر ہے تو اس وقت اسی شک میں ہونگے کہ یہ رسول انسانی صورت میں کیوں ہے۔

وَلَقَدِ اسۡتُهۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُونَ ﴿١٠﴾ ع

"اور البتہ تحقیق استہزا کیا گیا تھا آپ سے پہلے رسولوں کے ساتھ پھر گھیر لیا ان کو جنہوں نے استہزا کیا تھا اس (عذاب) نے جس کے ساتھ وہ استہزاء کرتے تھے" [10]۔

تفسیر 10 اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ سے پہلے جتنے انبیاء گزرے ہیں سب کے ساتھ استہزاء کیا گیا ہے استہزاء سے مذکورہ سوالات مراد ہیں اور اس جیسے اور بھی استہزا کے ساتھ تمسخر لازم ہے اس لیے متصل اس کو ذکر کیا ہے اور مراد اس سے حقارت وذلت ہے: فَحَاقَ: نازل ہونے واقع اور احاطہ کرلے کے معنی میں ہے۔

قُلۡ سِيرُوا فِي الۡاَرۡضِ ثُمَّ انۡظُرُوا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِينَ ﴿١١﴾

"فرما دیجئے کہ تم زمین میں گھوم پھر کر دیکھو کہ کس طرح انجام ہوا (حق) جھٹلانے والوں کا" [11]۔

تفسیر 11 یہ سابقہ آیت سے متعلق ہے: سِيرُوا: سے قدموں یعنی چلنے پھرنے کی سیر مراد ہے اس میں مطالعے کی سیر بھی داخل ہے: ثُمَّ انۡظُرُوا: نظر سے عام مراد ہے یعنی دیکھنا اور فکر کرنا۔

قُلۡ لِّمَنۡ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ قُلۡ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ؕ لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيهِ ؕ اَلَّذِينَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿١٢﴾

"فرما دیجئے کس کیلئے اختیار ہے اس کا جو آسمانوں اور زمین میں ہے؟ فرما دیجئے صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اس نے اپنی ذات پر مہربانی لازمی کی ہے یقیناً تمہیں ضرور جمع کریگا قیامت والے دن جس میں شک نہیں ہے جن لوگوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا وہ ایمان نہیں لاتے" [12]۔

تفسیر 12 یہاں سے دوسرا باب شروع ہو رہا ہے جو آیت 37 تک ہے اس میں لفظ قُلۡ: کے ساتھ چار عقلی دلائل اور چار تعلیم کے طریقے ذکر ہیں چار زجر ہیں اور چار مرتبہ تسلی دی گئی ہے اور چار مرتبہ تخویف اخروی ہے اور ایک مرتبہ دنیا سے بے رغبتی دی گئی ہے اور ایک سوال وجواب مذکور ہے۔ یہ آیت دلیل عقلی اعترافی سکوتی ہے کہ اوپر نیچے کائنات کا اختیار صرف

اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور اس نے اپنی ذات پر ایمان لانے والوں کیلئے رحم لازم کیا ہے اس طرح اس سورۃ کی آیۃ 55 اور سورۃ اعراف کی آیت 156 میں بھی ہے اور کافروں پر رحم یہ ہے کہ قیامت تک ان سے عذاب موخر کیا ہے لیکن جن لوگوں نے خود کو نقصان میں مبتلا کیا ہے وہ توحید کے منکر ہیں اور وہ دلائل آنے کے باوجود ایمان نہیں لاتے۔ سوال: ایمان نہ لانا سبب خسران ہے جبکہ اس عبارت میں برعکس ہے۔ جواب: یہاں پر خسران سے مراد عقل اور علم والے کام کو چھوڑنا ہے۔ قرآنی دلائل سننے کیلئے تیار نہیں ہیں اور تقلید میں مبتلاء ہیں تو ایمان سے رکاوٹ کا یہ سبب ہے لہٰذا اس آیت میں پہلے دلیل عقلی اعترافی ہے پھر ایمان کی طرف ترغیب ہے پھر تخویف اور ڈانٹ ہے۔

وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣﴾

"اسی کے اختیار میں جو رات کو سکون اور دن میں (حرکت کرتے پھیلتے ہیں) اور وہ خوب سننے اور خوب جاننے والا ہے" [13]۔

تفسیر 13 یہ ایک اور دلیل ہے: سَكَنَ: رات کو سکون آرام کرتے ہیں اور: وَالنَّهَارِ: دن کو پھیل جاتے ہیں لفظ تَحَرَّكَ: یہاں مقدر ہے جس کی دلیل سورۃ فرقان آیت 47 میں ہے۔ سکون کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ رحمت اور نعمت سکون میں زیادہ ہے نسبت حرکت کی جنسیت۔ نیز سابقہ دلیل مکانات سے متعلق تھی اور یہ دلیل زمانیات سے متعلق ہے اگر سکن کا معنی صرف رہنا لیا جائے تو پھر: تَحَرَّكَ: کی ضرورت نہیں ہے۔

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۗ قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ أَوَّلَ
مَنْ أَسْلَمَ ۖ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٤﴾ قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾ مَنْ
يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿١٦﴾ وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ
وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٧﴾

"فرما دیجئے کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو مددگار بنالوں جو کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنیوالا ہے اور وہ (سب کو) کھلاتا ہے اور اُسے نہیں کھلایا جاتا فرما دیجئے مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں سب سے پہلا (توحید) ماننے والا اور آپ ہرگز مشرکین میں سے نہ ہونا [14]۔ فرما دیجئے میں ڈرتا ہوں اپنے رب سے اگر میں نے نافرمانی کی اس بڑے دن کے عذاب سے [15]۔ جس شخص سے ہٹالیا گیا اس دن کا عذاب تو یقیناً رحم کیا اللہ تعالیٰ نے اس پر اور یہی واضح کامیابی ہے [16]۔ اگر اللہ تعالیٰ تجھے تکلیف پہنچائے تو اسے کوئی دور کرنے والا نہیں مگر وہی اور اگر وہ پہنچائے تجھے کوئی بھلائی تو وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے" [17]۔

تفسیر 14 یہ تعلیم کے طریقے اور سوالوں کے جوابات ہیں اور یہ پہلی قسم ہے یعنی سب سے پہلے توحید کا عقیدہ مضبوط کرتا ہے پہلا سوال ہمارے معبودوں کو مددگار تسلیم کرو پہلے قُلْ کے ساتھ جواب دیا گیا۔ دوسرا سوال توحید ماننا کوئی لازمی حکم نہیں ہے دوسرے قُلْ: کے ساتھ جواب ہوا کہ یہ تو حکم الٰہی ہے اور اس کی اہمیت تو اتنی ہے کہ اس پر مشرکین سے تعلقات توڑنے کا حکم ہے یعنی: وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ. وَلِيًّا: رب معبود اور مددگار کو کہتے ہیں: فَاطِرِ: میں اشارہ ہے کہ ان دونوں کو الگ الگ مادوں سے پہلی بار نکال کر بنایا ہے: وَهُوَ يُطْعِمُ: روزی رساں صرف وہی ہے: وَلَا يُطْعَمُ: ایک اشکال کو دور کیا گیا ہے یعنی والدین بھی اولاد کو روزی دیتے ہیں بعض پیر بھی مریدوں کو لنگر سے کھانا دیتے ہیں؟۔ جواب: اللہ تعالیٰ خود طعام کا محتاج نہیں ہے جبکہ باقی سب لوگ کھانے کے محتاج ہیں۔ سورۃ مائدہ آیت 75، سورۃ ذاریات آیت 57 اور 58: أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ: اس لیے فرمایا کہ نبی اپنی امت میں سب سے پہلا مسلمان ہوتا ہے جیسا کہ اس سورۃ کی آیت 163 میں ہے۔

تفسیر 15 اس آیت میں تیسرے سوال کا جواب ہے سوال یہ تھا کہ توحید کے انکار سے کیا فرق پڑیگا؟ تو تیسرے قُلْ سے

جواب ہوا کہ بہت بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے: عَصَيْتُ رَبِّيْ: یہاں پر عصیان سے شرک مراد ہے اور عذاب عظیم کا خوف کبیرہ گناہ ہونے کی دلیل ہے: يَوْمٍ عَظِيْمٍ: قیامت کے ناموں میں سے ہے۔

تفسیر 16 اس آیت میں اس عذاب کی عظمت کا ذکر ہے اور بتایا گیا کہ اس عذاب سے بچنا اللہ کا رحم ہے جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت 185 اور سورۃ مومن آیت 9 میں ہے۔

تفسیر 17 یہ ایک اور عقلی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا فقر ضرر وغیرہ دور کرنے والا کوئی نہیں ہے اور خیر دینے والا مال دولت صحت وغیرہ دینے والا کوئی نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے اس میں واضح رد ہے ان لوگوں کا جو اولیاء کرام مردہ ہوں یا زندہ ان کو مدد کیلئے پکارتے ہوں اور نفع نقصان میں دہائی دیتے تو یہ پکار کفر اور شرک ہے اس میں شرک فی التصرف کا رد ہے جیسا کہ سورۃ یونس آیت 107 میں اور سورۃ فاطر آیت 2 میں ہے: يَّمْسَسْكَ. مَسّ: اور ضرر کو نکرہ ذکر کیا ہے کہ ضرر تھوڑا ہو یا زیادہ اور نہ مَسّ: کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے کیونکہ مشرکین مصیبت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں: وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ: اس میں مقدر عبارت ہے یعنی: وَاَنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَيَقْدِرُ عَلٰى اِتْمَامِهٖ وَاِنْ اَرَادَ الْغَيْرُ قَطْعَهٗ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ فَيَقْدِرُ عَلٰى مَنْعِهٖ: یعنی اگر آپ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ خیر پہنچائے تو وہ مکمل کرنے پر قدرت رکھتا ہے اگر چہ اس کے سوا کسی غیر نے روکنے کا قصد کیا ہو لیکن وہ روکنے پر قادر ہے اور سورۃ یونس میں: وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فرمایا ہے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فعل: مَسّ: سے پہلے اس کا ارادہ ذکر ہوتا ہے چونکہ اس سورۃ میں اصل مقصد رد شرک فی التصرف ہے تو لفظ: مَسّ: تصرف کے ساتھ زیادہ مناسب ہے اور سورۃ یونس میں اصلاح اور عقیدہ کی پختگی مراد تھی تو اس کے ساتھ ارادہ زیادہ مناسب ہے۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾

"اور وہ غالب ہے بندوں کے اوپر ہے اور وہ حکمتوں والا خبر دار ہے" [18]۔

تفسیر 18 یہ اور دلیل عقلی ہے اَلْقَاهِرُ: امام سمعانی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ وہ ذات جو ہمیشہ غالب رہتی ہے کبھی مغلوب نہیں ہوتی اور نظام اکیلے چلاتی ہے اسی طرح اس سورۃ آیت 61 میں بھی ہے۔ لفظ فوق متشابہات میں سے ہے سلف صالحین کا اس میں عقیدہ یہ ہے کہ ظاہری حقیقی معنی پر ایمان لائیں گے اور حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کے حوالے کریں گے تشبیہ اور تمثیل مخلوق کے ساتھ نہیں دیں گے اور اس صفت کا انکار بھی نہیں کریں گے۔ یعنی ایسی بلندی ورفعت جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ موافق اور لائق ہو

دیگر نصوص سے ثابت ہے کہ وہ عرش پر مستوی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی فوقیت اس سورۃ کی آیت 61 اور سورۃ نحل آیت 50 میں بھی مذکور ہے۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۚ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۚ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۚ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ۚ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾

"فرما دیجئے کونسی چیز جبت بڑی ہے شہادت کے اعتبار سے؟ فرما دیجئے اللہ تعالیٰ ہی میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف وحی کی گئی ہے یہ قرآن تاکہ اس کے ذریعے سے میں تمہیں ڈراؤں اور جس کو یہ (قرآن) پہنچے تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور بندگی کا حقدار (معبود) ہے؟ فرما دیجئے میں تو ایسے معبودوں کو (نہیں مانتا) فرما دیجئے وہ تو ایک ہی اللہ ہے بندگی کا حقدار ہے اور یقیناً میں اس سے بری ہوں جسکو تم (اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو" [19]۔

تفسیر 19 اس میں بھی تعلیم کا طریقہ اور سوال جواب ہے۔ سوال یہ تھا کہ توحید پر کوئی بڑی دلیل تم لوگوں نے پیش نہیں کی تو جواب ہوا کہ سب سے بڑی شہادت اللہ تعالیٰ کی ہے اور اس کیلئے قرآن مجید کو نازل کیا ہے: قُلِ اللّٰهُ: اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ لفظ شَیْءٍ: کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر ہوسکتا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر قرآن وحدیث میں: شَیْئًا: کا اطلاق صراحت کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ صرف منطقی قانون اس کیلئے کافی نہیں ہے: شَهِيْدٌ بَيْنِيْ: اللہ تعالیٰ کی شہادت توحید ثابت کرنے اور معبودان سے براءت کیلئے ہے۔ (تفسیر نیشاپوری): وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ: اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شہادت قرآن میں مذکور ہے: لِاُنْذِرَكُمْ: منکرین کیلئے وحی کے ذریعے انذار ہے اس لیے ساتھ خوشخبری نہیں دی: وَمَنْۢ بَلَغَ: اس آیت میں آخری نبی کی نبوت کا قیامت تک ہونے کیلئے دلیل ہے کیونکہ جس کو قرآن مجید پہنچا اس کو آخری نبی کی دعوت پہنچی اس میں دلیل ہے کہ احکام قرآن سب مخاطبین کے لیے ہیں جو اس وقت موجود تھے اور جو بعد میں آئے سب کیلئے خطاب ہے اس آیت میں ختم نبوت کی واضح دلیل ہے: اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ: استفہام برائے زجر ہے: قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: پہلے جملہ میں توحید ہے اور دوسرے میں شرک سے بیزاری ہے آیت میں سابقہ دلائل کے ساتھ توحید پر نتیجہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿20﴾ ع

"وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے (توحید کی سچائی میں) پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا تو وہ ایمان نہیں لاتے" [20]۔

تفسیر 20 اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی گواہی کے بعد علماء کی گواہی کا ذکر ہے لہٰذا یہ سابقہ کتاب ماننے والوں کی طرف سے دلیل نقلی ہے: اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ: یہ لفظ اہل کتاب میں سے صالحین لوگوں کیلئے استعمال ہوتا ہے: يَعْرِفُوْنَهٗ: یہ ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف آپ کی صفات سمیت راجع ہے یا قرآن کی طرف راجع ہے۔ یہ امام سمعانیؒ کا قول ہے یا ان چیزوں کی طرف راجع ہے جو محمد ﷺ لیکر آئے ہیں (ابن کثیر): اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا: آیت 12 میں منکرین قیامت مراد تھے جبکہ یہاں اس سے رسول اور قرآن کے منکر مراد ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۗ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿21﴾

"اور کون زیادہ ظالم ہوسکتا ہے اس شخص سے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے یا اس کے آیتوں کو جھٹلائے یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے" [21]۔

تفسیر 21 یہ مشرکین کیلئے زجر اور خسران کے سبب کا بیان ہے: اِفْتَرٰى: یعنی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا اس کے ساتھ مخلوق کو شریک ٹھہرانا ہے یا نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنا: اَوْ كَذَّبَ: یعنی توحید کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں یا قرآن کی آیتوں کو نہیں مانتے توحید کی ہوں یا دیگر مسائل کی یہ دونوں گروہ ظالم ہیں۔ اس سورۃ میں اس طرح آیت 93، 144، سورۃ کہف آیت 15، سورۃ عنکبوت آیت 68، سورۃ صف آیت 7 میں ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿22﴾

"جس دن ان سب کو ہم اکٹھا کریں گے پھر ہم ان لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے شریک ٹھہرائے کہاں ہیں تمہارے وہ شریک جنہیں تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک سمجھا تھا؟" [22]۔

تفسیر 22 اس آیت میں ان مشرکین کیلئے خوف آخرت کا ذکر ہے جنہوں نے صالحین کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرایا تھا لہٰذا وہ قیامت کے دن ان سے غائب ہونگے اور یہ بھی شرک سے انکار کریں گے: لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا: امام شربینی نے کہا ہے کہ یہ عام ہے جنہوں نے بتوں کی پرستش کی ہے یا عزیر و عیسیٰ علیہما السلام (عیسائی یہودی) یا کسی اندھیرے اور روشنی وغیرہ

کی عبادت کی ہے: شُرَكَآؤُكُمْ: اس میں ان کی طرف اضافت اس لیے کی گئی ہے کہ ان کو انہوں نے اپنا سفارشی قرار دیا تھا: تَزْعُمُوْنَ: زعم اکثر باطل قول اور عقیدے کو کہا جاتا ہے۔

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾

"پھر نہیں ہوگا ان کا کوئی بہانہ مگر یہ کہ وہ کہیں گے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی جو ہمارا رب ہے ہم مشرک نہیں تھے" [23]۔

تفسیر 23 وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ: پہلا معنیٰ یہ ہے کہ قسم ہے ہمارے رب کی کہ ہم نے شرک نہیں کیا ہے یہ لوگ شرک سے انکار کریں گے پھر اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں کو بند کردینگے اور دیگر اعضاء اقرار اور گواہی دینگے پھر وہ اقرار کرلینگے۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ قسم ہے جو کچھ ہم نے کیا ہے وہ شرک نہیں وہ تو وسیلہ اور بزرگوں سے محبت تھی۔ پہلے معنیٰ کی تائید سورۃ مومن آیت 74 میں ہے اور دوسرے معنیٰ کی تائید سورۃ نحل آیت 28 میں ہے: فِتْنَتُهُمْ: بات، عذر اور دلیل کے معنیٰ میں ہے۔ امام سمعانیؒ کا قول ہے کہ جب انسان کسی محبوب چیز کی وجہ سے فتنے میں مبتلاء ہوجاتا ہے پھر اس میں اس کو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اس محبوب چیز سے بیزاری اور براءت کرلیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ نہیں تھا اس کا فتنہ مگر یہی تھا۔

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

"دیکھیں کس طرح وہ اپنے اوپر جھوٹ بولیں گے اور ان سے گم ہوجائے گا وہ جو وہ جھوٹ باندھتے" [24]۔

تفسیر 24 انہوں نے جو جھوٹے قصے بنائے تھے وہ سارے بھول جائینگے یا وہ معبود باطل جن کی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی تھی وہ ان سے غائب ہوجائینگے۔

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ‌ ۚ وَجَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَفِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا‌ ؕ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا
يُؤۡمِنُوۡا بِهَا‌ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوۡكَ يُجَادِلُوۡنَكَ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝۲۵

"اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو سننے کیلئے کان لگاتے ہیں (مگر سمجھتے نہیں) اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے تاکہ وہ سمجھ ہی نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ ہے اور اگر وہ دیکھ لیں ساری نشانیاں تو ان پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے جھگڑتے ہوئے کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے نہیں ہے یہ مگر پہلے لوگوں کی داستانیں" [25]۔

تفسیر 25 اس آیت میں زجر اور ڈانٹ ہے ان لوگوں کے لیے جو قرآن کو جھٹلانے کے لئے اور استہزا کی نیت سے سنتے ہیں تو ایسے لوگوں کو توحید کی بات سمجھ نہیں آتی کیونکہ ضد و عناد کی وجہ سے ان کے دل کان اور آنکھیں حق سے بند ہوگئی ہیں قرآن بیان کرنے والے سے جھگڑتے ہیں اور قرآن مجید کی پروا نہیں کرتے اسے جھوٹے قصے قرار دیتے ہیں: وَ جَعَلۡنَا اشارہ ہے کہ ان کے حواس کی یہ بندش اللہ تعالیٰ نے کی ہے اسے کوئی کھول نہیں سکتا اس کو جعل تکوینی (تقدیری) کہتے ہیں۔ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ: اس میں اشارہ ہے کہ حق سے اندھاپن آنکھوں کی آفت ہے اس طرح سورۃ کہف آیت 57 میں بھی ہے: حَتّٰٓى اِذَا: یعنی پہلے دور سے سنتے ہیں پھر عناد کی وجہ سے جدال کیلئے قریب آتے ہیں: يُجَادِلُوۡنَكَ: مجادلہ بحث مباحثہ اور مناظرہ کو کہتے ہیں: اَسَاطِيۡرُ اِسۡطُوۡرَةٌ: کی جمع ہے تحریر شدہ کو کہا جاتا ہے۔ آج منکرین قرآن اس کو قصوں کہانیوں کی کتاب تصور کرتے ہیں اور بعض منکرین کا کہنا ہے کہ قرآن کے نزول کیلئے الگ الگ قصے ہیں لہٰذا یہ انہیں قصوں پر چسپاں ہے دوسری چیز پر منطبق نہیں ہوسکتا۔

وَهُمۡ يَنۡهَوۡنَ عَنۡهُ وَيَنۡـئَوۡنَ عَنۡهُ‌ ۚ وَاِنۡ يُّهۡلِكُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ۝۲۶

"وہ روکتے ہیں اس سے (اوروں کو) اور (خود بھی) دور رہتے ہیں اس سے اور نہیں ہلاک کرتے مگر اپنے آپ کو اور وہ شعور نہیں رکھتے" [26]۔

تفسیر 26 اس میں بھی ڈانٹ ہے اور ماقبل پر عطف ہے اس کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ لوگوں کو بھی قرآن سے روکتے ہیں اور خود بھی قرآن سے دور رہتے ہیں دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ اس نبی سے اور لوگوں کو تکلیف دینے سے منع کرتے ہیں مگر خود اس کو نہیں مانتے جیسا کہ ابوطالب تھا۔ اس کے اشعار امام سمعانی اور شربینی رحمہم اللہ نے نقل کیے ہیں۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾

"اور اگر آپ دیکھیں جب وہ آگ پر کھڑے کیئے جائیں گے تو کہیں گے اے کاش ہم لوٹا دیئے جائیں (دنیا میں) تو نہ جھٹلائیں گے ہم اپنے رب کی آیات اور ہم مومنوں میں سے ہونگے" [27]۔

تفسیر 27 یہ آخرت کا خوف اور قرآن وتوحید نہ ماننے کے بعد کی حسرت ہے: وَلَوْ تَرٰٓى : اس کی جزا مقدر ہے یعنی ضرور دیکھوں گے انکا برا حال: عَلَى النَّارِ :لفظ: عَلٰى : میں اشارہ ہے کہ ان کو آگ کے بہت ہی قریب کھڑا ہونا ہے اور وُقِفُوْا : اس طرح کا پیش ہونا ہے کہ جس میں حقیقت حال سے باخبر رہنا بھی ہو: يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ : اس میں دنیا کی طرف واپسی کی حسرت ہے جو کئی آیتوں میں مذکور ہے مثلاً سورۃ الم سجدہ آیت 12 ، سورۃ فاطر آیت 37، سورۃ مومنون آیت 99 وَلَا نُكَذِّبَ : باء پر زبر اَنْ مقدر کی وجہ سے ہے یہ تمنا کا جواب ہے اور اس طرح لفظ : نَكُوْنَ : میں بھی ہے یعنی : اِذَا نُرَدُّ فَلَا نُكَذِّبَ : جب واپس ہونگے تو نہیں جھٹلائیں گے۔

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾

"بلکہ ان کیلئے ظاہر ہوجائیگا جو وہ اس سے پہلے چھپاتے تھے اور اگر وہ لوٹا دیئے جائیں تب وہ وہی کرینگے جس سے انہیں روکا گیا تھا اور یقیناً وہ جھوٹے ہیں" [28]۔

تفسیر 28 اس کا تعلق سابقہ آیت سے ہے کہ انکا افسوس دل کے یقین کی وجہ سے نہیں ہے: بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ : معنی یہ ہے کہ ظاہر ہوجائیگا ان پر وہ شرک جس کو وہ اس بات کے ذریعے چھپا رہے تھے: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ : یعنی ان کے اعضاء کی گواہی سے ظاہر ہوا۔ دوسرا معنی یہ بھی ہے کہ ظاہر ہوا پیروکاروں کو وہ حق جو چھپایا تھا ان کے سرکش بڑوں نے یہ امام زجاج کا قول ہے تیسرا معنی یہ ہے کہ ظاہر ہوا ان پر وہ عذاب جو ان سے پہلے مخفی تھا یہ علامہ مبرد کا قول ہے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾

"اور وہ کہتے ہیں نہیں یہ (زندگی) مگر ہماری دنیا کی زندگی اور ہم اٹھائے نہیں جائیں گے" [29]۔

تفسیر 29 یہ منکرین قیامت کیلئے زجر و انٹ ہے اور: لَكٰذِبُوْنَ : کیلئے علت ہے: هِىَ : ضمیر معروف حیات کی طرف راجع ہے۔

وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع

"کاش کہ آپ دیکھیں جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے وہ فرمائیگا کیا یہ (زندگی) حق نہیں ہے وہ کہیں گے کیوں نہیں قسم ہے ہمارے رب کی تو وہ فرمائیگا پس چکھو تم عذاب بوجہ اس کے کہ تم کفر کرتے تھے" [30]۔

تفسیر 30 بعد والی دو آیتیں اس سے متعلق ہیں جن میں تخویف کے ساتھ ساتھ اثبات قیامت بھی ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾

"یقیناً خسارے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا اپنے رب کی ملاقات کو یہاں تک کہ جب آئے گی ان کے پاس اچانک قیامت تو وہ کہیں گے ہائے افسوس اس پر کہ ہم نے کوتاہی کی اس (قیامت) کے متعلق اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہونگے خبردار بہت برا ہے جو وہ اٹھائیں گے" [31]۔

تفسیر 31 قیامت کو: سَاعَةً: اس لیے فرمایا ہے کہ اس میں حساب جلدی ہوگا یہ بھی آخرت کا اور قیام قیامت کا ثبوت ہے بَغْتَةً: وہ ہے جس کا وقت مقرر معلوم نہیں البتہ علامات اس کے ہوں یٰحَسْرَتَنَا: حسرت ضائع ہونیوالی چیز کے بعد کے افسوس اور سخت تکلیف کو کہتے ہیں یا حَسْرَتَنَا: میں: اَنَا مُتَحَسِّرٌ: سے زیادہ مبالغہ ہے: مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا: فی ظرفیہ ہے اور ضمیر دنیا کی طرف راجع ہے یا سَاعَةً: کی طرف راجع ہے اور فی شانیہ ہے: وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ: چونکہ وہ اپنی تفریط کی نسبت گمراہ سرداروں کی طرف کرتے تھے کہ ہمارے گناہ کے وہ ذمہ دار ہیں تو اللہ تعالی نے ان کے اس اشکال وگمان کو ختم کر دیا اس میں اشارہ ہے کہ ان کے گناہ ان کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔

وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

"نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر کھیل تماشا ہے البتہ آخرت کا گھر بہت اچھا ہے ان لوگوں کیلئے جو ڈرتے ہیں پھر بھی تمہیں عقل نہیں" [32]۔

تفسیر 32 اس میں دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی ترغیب ہے اس جملہ میں تین توجیہات ہیں۔ (1) جیسے کھیل کا وقت مختصر

ہوتا ہے اسی طرح دنیا کی زندگی مختصر ہے۔ (۲) دنیا کا وہ ساز وسامان جس پر آخرت طلب نہیں کی جاتی وہ اس کھیل کی طرح ہے جس کا کوئی نتیجہ فائدہ نہ ہو۔ (۳) لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ: باطل اور دھوکے کو کہا جاتا ہے یعنی دنیا انسان کو آخرت سے غافل کر دیتی ہے: لَعِبٌ: اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کوئی فائدہ نہ ہو اور: لَهْوٌ: اس چیز کو کہتے ہیں جو دل کو (اللہ تعالیٰ) سے غافل کر دے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ لَعِبٌ: وہ بے فائدہ چیز ہے جس میں جلد دل خوش کرنا مقصود ہو وہ جبکہ لَهْوٌ: وہ چیز ہے جس میں صرف دل کا بہلاوا ہو خوشی کا حصول نہ ہو: خَيْرٌ: اس لئے بہتر ہے کہ باقی بھی ہے اور ہمیشہ ہے۔

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٣٣﴾

"بلاشبہ ہم جانتے ہیں کہ غمگین کرتی ہے آپ کو وہ بات جو وہ کہتے ہیں پس وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ وہ ظالم اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں" [33]۔

تفسیر 33 اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے یعنی پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں یعنی توحید کا انکار کرتے ہیں: قَدْ نَعْلَمُ: یہ محبت اور تسلی کا عنوان ہے: الَّذِي يَقُولُونَ: اس سے منکرین کی وہ باتیں جو آیت 8، 28 اور 29 میں گزر گئیں اور اسی طرح نبی کریم ﷺ کو (سب وشتم) گالی گلوچ مراد ہے فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ: اس کی ایک توجیہ یہ ہے کہ یہ لوگ حقیقت میں دل سے آپ کو نہیں جھٹلاتے صرف زبان سے ضد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ آپ کو کاذب نہیں کہتے بلکہ آپ کو صادق وامین کہتے ہیں لیکن قرآن سے انکار کرتے ہیں جیسا کہ ابوجہل سے نقل ہے کہ اللہ کی قسم ہم آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ اس چیز کی تکذیب کرتے ہیں جو آپ لیکر آئے ہیں: بِآيَاتِ اللَّهِ: اس سے مراد توحید کی آیتیں ہیں جیسا کہ سورۃ یونس آیت 15۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٤﴾

"یقیناً آپ سے قبل رسول جھٹلائے گئے تو انہوں نے اس پر صبر کیا جو وہ جھٹلائے گئے اور ایذا دیئے گئے یہاں تک کہ آگئی ان کے پاس ہماری مدد اور اللہ تعالیٰ کی کلمات کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں اور یقیناً رسولوں کے کچھ خبریں آپ کے پاس آچکی ہیں" [34]۔

تفسیر 34 یہ دوسری تسلی ہے کہ یہ لوگ جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں اس پر آپ پریشان مت ہونا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ آپ

کی مدد کریگا جیسا کہ سابقہ نبیوں کے ساتھ کی تھی: عَلٰی مَا كُذِّبُوْا: عَلٰی اپنے معنی میں یا مَعَ: کی معنی میں ہے اور مَا مصدریہ ہے: اُوْذُوْا اِيْذَاءً: عام ہے جھٹلانا زبان سے، قول اور عمل سے تکلیف سب کو شامل ہے: لِكَلِمٰتِ اللهِ: جیسا کہ سورۃ یونس آیت 103، سورت صافات آیت 172 میں ہے: وَلَقَدْ جَآءَكَ: یعنی رسولوں کے ساتھ جو میں نے امداد کی اس میں تفصیل دیکھ لو۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝

"اگر ناگوار گزرتا ہے آپ پر ان کا منہ پھیرنا تو اگر آپ طاقت رکھتے ہیں یہ کہ آپ زمین میں سرنگ تلاش کریں یا آسمان میں کوئی سیڑھی پھر لے آئیں انکے پاس کوئی نشانی (تو کر کے دکھائیں) اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو ہدایت پر جمع کر لیتا لہذا آپ ہرگز نادانوں میں سے نہ ہوں" [35]۔

تفسیر 35 اس آیت میں تیسری تسلی ہے اور اس آیت میں دلیل ہے کہ معجزات پیش کرنے میں نبی کا کوئی اختیار و قدرت نہیں ہے۔ اگر نبی ﷺ کو طاقت و قدرت حاصل ہوتی تو وہ امت میں سے گمراہوں کو ہدایت پر انتہائی فکر مند تھے سرنگ بنانے یا سیڑھی لگانے سے بھی آپ کو معجزہ حاصل نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کام پر آپ کو قدرت حاصل تھی: نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا: منکرین جو معجزات طلب کرتے وہ یا زمین سے متعلق ہوتے یا آسمان سے جیسا کہ سورۃ اسراء آیت 90 تا 91 اور 92 میں ہے: فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ: اس کے بعد: فَافْعَلْ: مقدر ہے: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ: یہ نبی کی تسلی میں داخل ہے یعنی اے محمد ﷺ ہدایت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے آپ ہدایت نہیں دے سکتے لہذا آپ ناراضگی کا اظہار مت کریں لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى: یعنی ان سب کو ہدایت کی توفیق عطا کر دیتا: مِنَ الْجٰهِلِيْنَ: یعنی جو لوگ ہدایت کو اللہ تعالیٰ کی مشیت چاہت و اختیار میں نہیں مانتے اور لوگوں کی تکذیب اور انکار کی وجہ سے بے صبری کر لیتے ہیں یہ جاہلوں کا عمل ہے فَلَا تَكُوْنَنَّ: میں مقصد رسولوں کو جاہلوں کے حال سے بچانا ہے۔

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝

"یقیناً وہ لوگ (حق کو) قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور (کافر جو مثل) مردے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ اٹھائے گا پھر وہ اس کی طرف لوٹائے جائینگے" [36]۔

تفسیر 36 اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کو ہدایت نہ ملنے کا سبب یہ ہے کہ وہ ضدی عنادی ہیں حق کو نہیں سنتے :وَالْمَوْتٰى: مراد وہ عنادی کافر ہیں جو نہ سننے میں مردوں کے ساتھ مشابہ ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ مردے نہیں سنتے۔(تفسیر خازن، نیشا پوری، سراج المنیر وغیرہ :يَسْتَجِيْبُ: کا مفعول مقدر ہے یعنی: دَعْوَةَ الْاِيْمَانِ يَسْمَعُوْنَ: اس سماع سے فہم اور انابت کا حصول مراد ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

"انہوں نے کہا کیوں نہیں اتاری گئی اس پر کوئی (بڑی) نشانی اپنے رب کی طرف سے فرما دیجئے یقیناً اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ نازل فرمائے کوئی (بڑی) نشانی لیکن انکے اکثر علم نہیں رکھتے" [37]۔

تفسیر 37 اس آیت میں زجر اور سوال و جواب ہے اٰيَةٌ :اس سے وہ معجزات مراد ہیں جو کافروں نے طلب کیے تھے یہ ماقبل پر عطف ہے یعنی جو مثل کافر مردوں کے ہیں وہ سنتے نہیں بلکہ معجزات طلب کرتے ہیں :لَا يَعْلَمُوْنَ: یعنی ان معجزات کا انکار ہلاکت کا سبب ہے لیکن یہ لوگ انجام کا علم نہیں رکھتے :لَا يَعْلَمُوْنَ اختیارات اور معجزات کے مالک کو نہیں جانتے۔

وَمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰۗىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ۭ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝

"اور نہیں ہے کوئی چلنے والا زمین پر اور نہ ہی کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دونوں پروں کے ساتھ مگر وہ تمہاری ہی طرح اُمتیں ہیں ہم نے اس کتاب میں (ان) کی کوئی ضروری چیز نہیں چھوڑی پھر وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کئے جائینگے" [38]۔

اس آیت سے 73 تک تیسرا باب ہے اس میں دس عقلی دلائل ہیں اور دس (۱۰) آداب ہیں جس میں بعض تعلیم کے طریقے ہیں۔50، 51، 52، 54، 56، 57، 58 اور 62 میں تخویف دنیوی ہے۔آیت 42 میں دعوت کے دو عقبات ہیں آیت

52 اور 55 اور چار تخویف اخروی اور پھر دلائل کا نتیجہ ہے۔

تفسیر 38 اس آیت میں عقلی دلیل ہے جو قدرت الٰہی کی دلیل ہے: اِنَّ اللّٰہَ قَادِرٌ : سے متعلق ہے یا اشارہ ہے کہ دیگر معجزات کی ضرورت نہیں ہے صرف جانوروں کے اور پرندوں کے حالات اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت پر کامل دلیل ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ : لفظ فِی الْاَرْضِ اور بِجَنَاحَیْہِ : برائے تاکید ہے مجازی معانی کی تردید کیلئے ہے کیونکہ دَآبَّةٍ : کبھی صرف انسان کو بھی کہا جاتا ہے اسی طرح: طٰٓئِرٍ : کبھی قاصد کو کہا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ معانی مراد نہیں ہیں اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ : برابری کئی چیزوں کے اعتبار سے ہے یعنی معرفت الٰہی تسبیح، توحید، خلق، رزق، موت، ضروریات، علم، نفع اور ضرر۔ ہلاکت کی جگہوں اور دشمن سے بچنے کی کوششیں اور دشمن کی پہچان، بچوں کی پیدائش تربیت، نسل وغیرہ: فِی الْکِتٰبِ: اس سے مراد لوح محفوظ (تقدیر) ہے اس میں ہر چیز کی تقدیر کی طرف اشارہ ہے یا مراد قرآن مجید ہے۔

سوال: قرآن مجید میں تو ہر چیز کا بیان نہیں ہے؟ جواب: امام نیشاپوری کا قول ہے کہ ہر علم کا اصل قرآن میں ہے یا مراد وہ چیزیں ہیں کہ دین میں جن کی ضرورت ہے چونکہ سنت بھی قرآن کی طرف راجع ہے تو دونوں سے مشترکہ دین کے پورے اور کامل احکام ثابت ہیں یا پھر اس سے مراد ایمانیات کا ذکر ہے: اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ: وہ پیدا ہونے میں ضرورت رزق میں اور دیگر تمام حاجتوں میں تمہاری مثل ہیں: مَا فَرَّطْنَا: یعنی قرآن مجید میں ایمانیات تفصیل سے بیان ہوگئے۔ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ: اس کی ایک توجیہ یہ ہے کہ ان سب کو قیامت کے دن اٹھایا جائیگا دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ حیوان اور پرندے وغیرہ قیامت کے دن حساب وقصاص کیلئے اٹھائیے جائیں گے اور ایک دوسرے کے حقوق قصاص وغیرہ دیکر پھر سب مرکر مٹی بن جائینگے اس سلسلہ میں ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہت احادیث جمع کی ہیں۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ چوپائے اور پرندے وغیرہ سب مرجائینگے اور حشر سے انکا فنا ہونا مراد ہے۔

وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّبُکْمٌ فِی الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۳۹﴾

"اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں اندھیروں میں ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے سیدھی راہ پر پختہ کرلیتا ہے" [39]۔

تفسیر 39 اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں کیلئے توبیخ ہے کہ حیوانات اور پرندے اپنی مصلحتوں کیلئے ہدایت پاتے ہیں مگر کافروں کو ہدایت نہیں ملتی۔ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کی عمومیت کا ذکر تھا تو اس آیت میں مشیت کی عمومیت کا

ذکر ہے :فِي الظُّلُمٰتِ: اس کوعطف نہیں کیا اشارہ ہے کہ صرف :صُمٌّ: اور: بُكْمٌ :ہدایت کیلئے رکاوٹ نہیں ہے بلکہ بہت سارے اندھیرے گمراہی کے اور بھی ہیں۔

قُلْ أَرَءَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللَّهِ تَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

"فرمادیجئے بتلاؤ مجھے اگر آجائے اللہ تعالیٰ کا عذاب تم پر یا آجائے تم پر قیامت تو کیا اللہ تعالیٰ کے ماسوا کو تم پکاروگے اگر (تم ان کی مددگار ماننے میں) سچے ہو" [40]۔

تفسیر 40 اس آیت میں شرک فی الدعا کے رد میں دلیل عقلی ہے اور مشرکین کی جہالت کا ذکر بھی ہے کہ اپنے اہم موقعوں پر خالص اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہو اور پھر راحت آنے اور مصیبت ٹلنے پر شرک کا ارتکاب کرتے ہو جیسا کہ سورۃ یونس آیت 22 میں اور سورۃ اسراء آیت 67 میں ہے :أَرَءَيْتَكُمْ: میں ہمزہ استفہام تعجبی ہے اور رَأَيْتَ :کا معنی عَرَفْتَ وَأَبْصَرْتَ :ہے اور اس کا مفعول مقدر ہے اور تا ضمیر فاعل ہے: كُمْ: حرف خطاب ہے اور یہ اعراب نہیں چاہتا یہ صرف حال بیان کرتا ہے تو خلاصہ معنی یہ ہوا کہ: أَبْصَرْتَ أَوْ عَرَفْتَ الْحَالَةَ الْعَجِيبَةَ فَأَخْبِرْنِي عَنْهَا: اگر تمہیں اس تعجب خیز حال کا علم ہو تو مجھے خبر دیدو:صٰدِقِيْنَ: اگر اس بات میں سچے ہو کہ یہ معبود ہے۔

بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ ۝ ع

"بلکہ صرف اس کو تم پکاروگے پھر وہ دور کردیگا وہ جس کیلئے تم اس کو پکاروگے اگر وہ چاہے گا اور تم فراموش کردوگے جن کو تم شریک ٹھہراتے تھے" [41]۔

تفسیر 41 اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین بعض اوقات خالص اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے اور مدد طلب کرتے ہیں۔ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ :یعنی دعا میں اس کو خاص کرتے ہو جیسا کہ دوسرے مقام سورۃ یونس آیت 22 میں اس کیلئے :مُخْلِصِيْنَ لفظ استعمال ہوا ہے: فَيَكْشِفُ :اس میں اشارہ ہے کہ کبھی کبھار مشرک کی دعا کو اللہ تعالیٰ اس کے عجز اور تضرع کی وجہ سے بطور امتحان قبول کرلیتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾

"بلاشبہ یقیناً ہم نے بھیجا رسولوں کو آپ سے پہلے امتوں کی طرف پھر ہم نے ان کو تنگی اور تکلیف سے پکڑا تا کہ وہ عاجزی کریں" [42]۔

تفسیر 42 اس آیت میں دنیاوی عذاب کے لئے تخویف ہے اور نعمتوں اور عذاب کے ذریعے امتحان کا ذکر ہے، سابقہ آیت سے تعلق یہ ہے کہ لوگ صرف مشکلات میں اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ جرم و گناہ میں برابر ہیں جو کبھی اور کسی حال میں اللہ تعالیٰ کو نہیں پکارتے: اَرْسَلْنَا: اس جگہ رُسُلاً: مقدر ہے: مِّنْ قَبْلِكَ: یہاں پر: فَكَذَّبُوْا: مقدر ہے: بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ: دونوں میں فرق یہ ہے کہ بِالْبَاْسَآءِ: مالی تنگی، فقر، قحط، بھوک وغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ اور وَالضَّرَّآءِ: بیماری وغیرہ جسمانی تکلیف کو کہا جاتا ہے اور قرطبی نے کہا کہ کبھی کبھار ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں: يَتَضَرَّعُوْنَ: تضرع یعنی تذلل عاجزی اور انکساری سے سوال کرتے ہیں جس میں شرک سے توبہ بھی شامل ہوتی ہے۔

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

"پھر کیوں انہوں نے عاجزی نہیں کی جب آیا ہمارا عذاب لیکن ان کے دل سخت ہو گئے اور خوبصورت (مزین) کیا ان کیلئے شیطان نے وہ جو عمل کرتے تھے" [43]۔

تفسیر 43 اس آیت میں ان کے برے حال کا ذکر ہے کہ ان پر سختی نے کوئی اثر نہیں کیا، اس کی دو موانع ذکر کئے ہیں فَلَوْلَا: توبیخ کیلئے ہے اور معنی نفی ہے جس کا محل: تَضَرَّعُوْا: ہے نیشاپوری نے لکھا ہے کہ لفظ: فَلَوْلَا: سے پتا چلتا ہے کہ ان کا کوئی عذر نہیں تھا سوائے ضد و عناد کے: قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ: قَسْوَةً: دل کی سختی سے مراد یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی نصیحت اور دلائل ان پر اثر نہیں کرتے: وَزَيَّنَ: یعنی شرک ان کو توحید اور بدعت ان کو سنت کی شکل میں دکھاتا ہے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿٤٤﴾

''پھر جب بھلا دیا انہوں نے اس کو جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ وہ اس چیز کے ساتھ تکبر کرنے لگے جو وہ دیئے گئے تھے تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا تب وہ نا اُمید ہو گئے'' [44]۔

تفسیر 44 یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ شرک اور فسق کے ساتھ دنیا وی آسائیشے اور آمدنی وغیرہ میں اضافہ ہو جائے تو استدراج اور مہلت ہے عزت نہیں ہے: نَسُوْا : اس سے مراد جان بوجھ کر ایسے طریقے سے چھوڑ دینا ہے گویا انہوں نے بھلا دیا ہے: مَا ذُكِّرُوْا : اس سے توحید اور ایمان مراد ہے: فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ : اس میں اشارہ ہے کہ پہلے ان پر رحمت کے دروازے بند ہوئے تھے اس لئے فرمایا تھا: بِالْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ: اس کے برعکس مومنوں پر جب رحمت کے دروازے ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے کھول دے جاتے ہیں تو وہ رحمتیں و برکتیں ہوتی ہیں جیسا کہ سورۃ اعراف آیت 94 میں ہے: اِذَا فَرِحُوْا : اس سے فرح بطر مراد ہے یعنی قارون جیسے حق قبول کرنے سے انکار و تکبر کرتے رہنا ہے۔ سورۃ قصص آیت 76 میں ہے اور اس کو: اِبْتِلَاءٌ بِالنِّعَمِ : نعمتوں کے ذریعے آزمائش کہتے ہیں: مُّبْلِسُوْنَ اَبْلَاسٌ: کے تین معانی ہیں افسوس، حزن، نا اُمیدی۔ امام راغب نے فرمایا کہ یہاں پر ایک معنی یہ ہے کہ ہر خیر سے نا اُمید ہو جاتے ہیں دوسرا معنی یہ ہے کہ پشیمان اور غمگین ہوتے ہیں۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٥﴾

''کاٹ دی گئیں اس قوم کی جڑیں جنہوں نے ظلم کیا تھا اور ہر قسم حمد اللہ رب العالمین ہی کیلئے ہے'' [45]۔

تفسیر 45 اس آیت میں دلیل ہے کہ کافروں ظالموں کی ہلاکت پر اللہ تعالیٰ کی تعریف اور حمد کرنا چاہئے۔ دَابِرُ سے مراد آخر اور نسل ہے یعنی اللہ تعالیٰ ظالموں کی نسل ختم کرتا ہے: وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ: اس قسم کے کافروں اور ظالموں کی ہلاکت ایمان والوں کیلئے عظیم انعام و رحمت ہے اس لئے اس پر الحمد للہ پڑھنا چاہئے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝

"فرما دیجئے بتلاؤ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے کان چھین لے اور تمہاری آنکھیں اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے تو کون ہے وہ معبود اللہ کے سوا جو تمہیں یہ چیزیں دے سکے دیکھیں کس طرح ہم پھیر کر آیتیں بیان کرتے ہیں پھر بھی وہ اعراض کرتے ہیں" [46]۔

تفسیر 46 یہ ایک اور دلیل عقلی ہے پہلے عام تکلیفوں کا ذکر تھا اور یہاں خاص مصیبتوں کا ذکر ہے مطلب یہ ہے کہ گونگا، بہرا، پاگل بنانا یہ سب اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہی ہے اور دیوانوں کو شفایاب کرنے کا بھی وہی اختیار رکھتا ہے کوئی اور ان تکلیفوں کو دور نہیں کرسکتا اور اس پر یہ آیت دلیل ہے کہ اِلٰهٌ: بگڑی بنانے اور حاجت روا کے معنیٰ میں ہے: قُلُوْبِكُمْ سے مراد یہاں عقل ہے یعنی ان کی عقلوں کو بند کیا ان کو پاگل دیوانہ بنا دیا: اَرَءَيْتُمْ : یہ لفظ کم تعجب جبکہ: اَرَءَيْتَكُمْ زیادہ تعجب کیلئے استعمال ہوتا ہے لہٰذا: اَرَءَيْتَكُمْ: کے ساتھ عام عذاب کا ذکر ہوا ہے جبکہ یہاں خاص مصیبتوں کا ذکر ہے: يَاْتِيْكُمْ بِهٖ: اس جملہ میں الٰہ کا معنیٰ و تعریف مذکور ہے اسی طرح سورۃ نحل آیت 60 سے 64 تک اور سورۃ قصص آیت 71 سے 74 تک ہے: بِهٖ ضمیر کو بتاویل ماخوذ اور مختوم کے ساتھ یا ہر واحد کو راجع ہے: نُصَرِّفُ: مختلف قسموں طریقوں پر آیتوں کو بیان کرنا قرآن میں توحید و رسالت کا ذکر عقلی اور منقولہ دلائل مع زجر و تخویف کے کیا گیا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

"فرما دیجئے مجھے خبر دو اگر تمہیں اللہ تعالیٰ کا عذاب اچانک یا کھلم کھلا آ جائے ہلاک نہیں کیے جائیں گے مگر ظالم لوگ" [47]۔

تفسیر 47 یہ بھی دلیل عقلی ہے کہ عذاب کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے آیت 40 میں عذاب کی دو قسموں کا ذکر تھا ایک دنیاوی دوسرا اُخروی اور یہاں مزید اور دو قسموں کا ذکر ہے۔ اچانک یا نشانیوں کے ساتھ یا پھر رات دن کو آنا، عبارت میں مقدر الفاظ یہ ہیں کہ: فَمَنْ يُّهْلِكُ بِهٖ : اس کا جواب ہے کہ: هَلْ يُهْلَكُ: مشرکین کی ہلاکت خاص ہے اور جو مشرکین سے براءت نہیں کرتے تو وہ بھی عذاب کی لپیٹ میں آتے ہیں جو ان کے پیروکار ہیں وہ عذاب میں ہونگے۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿48﴾

"ہم نہیں بھیجتے رسول مگر ڈرانے والے اور خوشخبری دینے والے پھر جو ایمان لے آئے اور اپنی اصلاح کر لیے تو ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے" [48]۔

تفسیر 48 یہ اس سوال کا جواب ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ ہم آپ کی بات نہیں مانتے تو آپ عذاب یا معجزہ لے آئیں تو جواب ہوا کہ معجزات اور عذاب نبیوں کے اختیار میں نہیں ہیں ان کا کام صرف ثواب و عذاب بیان کرنا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ایمان کی خوشخبری دی ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿49﴾

"اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا انہیں عذاب پہنچے گا بوجہ اس کے کہ جو وہ نافرمانی کرتے ہیں" [49]۔

تفسیر 49 اس آیت میں اخروی عذاب کا ڈراوا ہے: كَذَّبُوْا: مقابلہ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ آیا ہے: يَمَسُّهُمْ: یہاں پر مَسّ اِلحاق اور اِصَابَت: کے معنی میں ہے یعنی ان کو عذاب پہنچے گا۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۗ
قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۗ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿50﴾ ع

"آپ فرما دیجئے میں نہیں کہتا کہ میرے اختیار میں اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ ہی غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے کہتا ہوں کہ میں ملائک ہوں میں پیروی نہیں کرتا مگر اس چیز کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے فرما دیجئے کیا برابر ہو سکتے ہیں بینا اور نابینا؟ کیا پھر بھی تم غور اور فکر نہیں کرتے" [50]۔

تفسیر 50 سابقہ آیت میں انبیاء کرام کی صفات ثبوتیہ کا ذکر تھا کہ وہ ڈرانے اور خوشخبری دینے والے ہیں تو اب ان کی صفات سلبیہ کا ذکر ہے اس میں آداب اور طریقہ تعلیم نیز سوالات و جوابات مذکور ہیں۔ **پہلا سوال** یہ ہے کہ آپ نبی ہیں تو اپنے ساتھیوں کو مالدار بنا ئیں **دوسرا سوال** یہ ہے کہ آپ اگر نبی ہیں تو ہمیں خزانوں کی جگہیں دکھا دیں اور غیب کی خبریں سنا دیں۔ **تیسرا سوال** یہ ہے کہ اگر آپ نبی ہیں تو کھاتے پیتے کیوں ہیں۔ **چوتھا سوال** یہ ہے کہ اگر آپ یہ کام نہیں کر سکتے تو پھر ہم اور آپ برابر ہیں۔ جواب ترتیب سے دیا گیا ہے سورۃ ہود آیت 31 میں بھی اسی طرح ہے جواب کا خلاصہ اس طرح ہے کہ میں نہ تو الوہیت کا دعوی کرتا ہوں اور نہ ملائک ہونے کا بلکہ میں دعوی کرتا ہوں جو بشریت کے ساتھ موافق ہے

یعنی وحی اور رسالت۔ فائدہ: الوہیت کی دو جامع صفات ہیں ایک تصرف اور اختیار اور آسمانی و زمینی خزانوں کی قدرت دوسری صفت علم غیب ہے یعنی بغیر اسباب ہر چیز کا علم جبکہ یہ نبی سے منتفی ہے۔ پہلا پہلے جملے میں اور دوسرا دوسرے میں منتفی ہوا ہے: وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ عِنْدِيْ: کے محل پر عطف ہے اور لام تاکید کیلئے مکرر لایا گیا ہے: وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ یا لَآ اَقُوْلُ: پر عطف ہے۔ سوال: پہلے اور تیسرے سوال کے ساتھ: لَآ اَقُوْلُ: ذکر کیا ہے اور علم کے ساتھ ذکر نہیں کیا؟ جواب: پہلا وصف ہے اور تیسرا بشر کی شان سے بالکل منع ہے وہ صرف دعاء سے ہو سکتا ہے دوسرا وصف بوجہ امکان ہو سکتا ہے یعنی بعض مغیبات کا علم سوال: وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ: سے دلیل لی جا سکتی ہے کہ ملائکہ کو انبیاء پر فضیلت حاصل ہے؟۔ جواب: اس میں بعض صفتوں کی نفی ہے کہ میں ان کی طرح قدرت نہیں رکھتا یعنی بغیر کھانے پینے اور نکاح زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس کو جزوی فضیلت کہتے ہیں اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ملائکہ کو انبیاء پر کلی فضیلت حاصل ہے: اِنْ اَتَّبِعُ: اس میں دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مجتہد تھے؟۔ جواب: بوقت ضرورت اجتہادات کرتے تھے لیکن بغیر وحی اس کی اتباع نہیں کرتے تھے: اَلْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ: وحی کا متبع بینا ہے اور اس کی مخالفت کرنے والا اندھا ہے اور اسی طرح جاہل اور عالم، گمراہ اور ہدایت یافتہ۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝

"ان لوگوں کو اس کے ذریعے سے ڈرائیں جو اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کئے جائیں گے اس کے سوا نہیں ہوگا ان کا کوئی دوست اور نہ ہی کوئی سفارشی تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں" [51]۔

تفسیر 51 اس میں تبلیغی آداب کا بیان ہے یعنی ان کی ضد اور عناد کی پرواہ مت کرو قرآن بیان کرتے رہو اس کا فائدہ ہے: اَلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ: اعتقادی خوف مراد ہے اس سے مراد اہل کتاب اور بعض مشرکین جو قیامت کو مانتے تھے اشارہ ہے کہ قرآن سے وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو قیامت پر ایمان رکھتے ہیں: لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ: اشارہ ہے کہ مشرک اور کافر قیامت کے خوف کے باوجود شفاعت سے محروم ہیں: لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ: اس میں قرآن کے ذریعے ڈرانے کا فائدہ مذکور ہے: بِهٖ: یہ دلیل ہے کہ ڈرانا وحی کے ساتھ خاص ہے۔

وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ‌ ؕ مَا عَلَيۡكَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ وَّمَا مِنۡ حِسَابِكَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ فَتَطۡرُدَهُمۡ فَتَكُوۡنَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ‏ ﴿۵۲﴾

"اور آپ (مجلس سے) دور مت کریں ان لوگوں کو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں وہ چاہتے ہیں اس کی رضا آپ کے ذمہ نہیں ہے ان کے حساب میں سے کچھ بھی اور نہ ہی ان کے ذمہ ہے آپ کے حساب میں سے کچھ بھی پس اگر آپ نے ان کو دور کیا تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے" [52]۔

تفسیر 52 اس میں بھی آداب کا ذکر ہے اور سوال کا جواب ہے یعنی آپ کی پیروی ہم اس وقت کریں گے جب آپ اپنے پاس سے غریبوں کو دور کر دیں جواب ہوا کہ غریبوں کو دور مت کرنا یہ ظلم ہے سابقہ آیت سے ربط یہ ہے کہ پہلے تقویٰ حاصل کرنے کیلئے طریقہ ذکر کیا اب متقیوں کا اکرام ذکر ہو رہا ہے: يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ: ذکر دعاء کا ہے مراد ساری عبادات ہیں دعا اس میں اہم عبادت ہے اس میں اشارہ ہے کہ جب بندے میں توحید فی الدعاء والاستعانۃ موجود ہو تو اس کا سارا ایمان قوی اور مضبوط ہوتا ہے یا پکارنے سے مراد اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے: بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ: اس سے مراد دن اور رات ہیں یعنی ذکر جز مراد کل ہے: يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ: امام سمعانی نے فرمایا کہ: وَجۡهَهٗ: اللہ تعالیٰ کی صفت ہے بلا کیفیت اور تاویل و تمثیل۔ نیز محاورہ بھی ہے کہ میں نے تیرے چہرے کا لحاظ کیا تیرے منہ کو دیکھا وغیرہ: مَا عَلَيۡكَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ یہ مشرکین کے قول کا جواب ہے انہوں نے یہ کہا کہ یہ منافق ہیں آپ پر خالص ایمان نہیں لائے جواب ہوا کہ ان کے ظاہری اعمال اخلاص پر مبنی ہیں جبکہ باطن کا حساب آپ کے نہیں اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے دوسرا جملہ: وَّمَا مِنۡ حِسَابِكَ یہ صرف تاکید کیلئے لایا گیا ہے یا حساب سے مراد مواخذہ یعنی پکڑ ہے اور چونکہ دونوں جانب سے مواخذہ نہیں ہے اس لیے دونوں جملوں کو ذکر کیا ہے: فَتَكُوۡنَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ سوال ۱: اس سے معلوم ہوا کہ نبی نے ظلم کیا؟۔ جواب ۱: نبی کریم ﷺ نے ان کو نہ تو خود سے دور کیا اور نہ ہی ارادہ کیا معنی تعلیق کے طور پر ہے یعنی اگر آپ ان کو ہٹائیں گے تو ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔ جواب ۲: بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ آپ نے دعوتی حرص کی وجہ سے لوگوں کو ہٹایا تھا اس لیے تاکہ کافر اسلام میں داخل ہو جائیں لہٰذا یہ گناہ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ اجتہادی خطاء ہے اور امام رازی نے فرمایا ہے کہ انبیاء کے متعلق جہاں لفظ ظلم استعمال ہوا ہے وہاں مراد خطاء اجتہادی ہے یا خلاف اولیٰ ہے وہ کسی بھی قسم کا گناہ نہیں ہے۔

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝

"اسی طرح ہم نے امتحان میں ڈالا ان کے بعض کو بعضوں کے ذریعے سے تاکہ کہیں کہ کیا یہی ہیں وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان احسان کیا ہے کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو خوب جاننے والا" [53]۔

تفسیر 53 یہ تبلیغ کے مشکلات میں سے پہلی مشکل ہے یعنی مشرکین اور موحدین ایک دوسرے کیلئے امتحان ہیں۔ موحدین پر پہلا امتحان یہ ہے کہ مشرکین ان کو تمسخر کے طور پر کہتے ہیں کہ کیا حق پرستی کا احسان صرف تم پر ہوا ہے۔ جواب ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے: شَاكِرِيْنَ: سے مراد حق بیان کرنے والے ہیں: وَكَذٰلِكَ: اس میں کاف برائے تشبیہ ہے یعنی جیسے مکہ مکرمہ میں مالدار مشرکین نے غریب ایمان والوں کو حقیر جانا تو اسی طرح اور زمانوں میں ہوگا جیسا کہ پہلے نوح علیہ السلام کی امت نے کیا تھا۔ سورۃ ہود 29 اور سورۃ فرقان آیت 20: كَذٰلِكَ: لفظ اس عمل کے ہمیشہ رہنے کی دلیل ہے۔ دور حاضر میں بھی موحدین کو مشکلات درپیش ہیں: لِّيَقُوْلُوْٓا: لام برائے عاقبت ہے: اَهٰٓؤُلَآءِ: مراد استفہام انکاری ہے یعنی ان مشرکین کا کہنا تھا کہ کیا ایمان لانا کوئی احسان ہے اگر یہ احسان ہوتا تو سب سے زیادہ حقدار ہم ہیں جیسے کہ سورۃ احقاف آیت 11 میں ہے: اَلشّٰكِرِيْنَ: یعنی وہ لوگ جن میں اسلام کی اہلیت ہے تو ان کو ایمان لانے کی توفیق دیتا ہے۔

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ فرما دیجئے تم پر سلام ہو تمہارے رب نے اپنے نفس پر سلامتی (مہربانی) لازم کی ہے بیشک وہ شخص جو تم میں سے لاعلمی کی وجہ سے برا عمل کرے پھر اس کے بعد توبہ کرلے اور اصلاح کرلے تو یقیناً وہ (اللہ) بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے" [54]۔

تفسیر 54 اس میں بھی ادب کا بیان ہے کہ جب آپ کے ساتھی دعوت حق سے تھکے ماندے آجائیں تو آپ ان کو خوشخبری سنادیں مخالفین نے ان پر اعتراض کیا تھا کہ ابھی تک تم لوگ کفر اور شرک میں مبتلا تھے اب ہمیں مسئلے سناتے ہو؟ تو ان لفظوں سے انکا جواب ہوا: كَتَبَ رَبُّكُمْ: الخ مشرکین کا جواب ہے: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ: اس سلام سے تحیہ مراد نہیں بلکہ آنے والوں کو خوش آمدید کہنا اور دین و دنیا کی سلامتی کی دعا مراد ہے: اَنَّهٗ: یہ رحمت کی تفسیر ہے یعنی توبہ کے بعد بخشش اللہ

تعالیٰ کی رحمت ہے۔ سوال: سنت طریقہ تو یہ ہے کہ آنیوالے حاضرین کو سلام کریں گے جبکہ یہاں پر معاملہ برعکس ہے۔ جواب: یہاں پر ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام پہنچانا مراد ہے یا پھر بمعنی دعا ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ سلامتی عطا کرے یا پھر ان کی خصوصیت ہے یا مَرْحَباً بِکُمْ: کی معنی میں ہے قرآن مجید میں سلام مختلف معنوں میں مستعمل ہے۔ (۱) معروف سلام سورۃ نور آیت 61، (۲) اجازت کا سلام سورۃ نور آیت 27۔ (۳) اعراف والوں کا سلام جنت والوں پر سورۃ اعراف آیت 46۔ (۴) جنتیوں کو بطور مبارکباد سلام سورۃ یونس آیت 10۔ (۵) تعلق ختم کرنے کیلئے بطور بیزاری سلام سورۃ مریم آیت 47۔ (۷) کافروں کو سلام سورۃ طٰہٰ آیت 47۔ (۸) سالم ہونے کے معنی میں لفظ سلام سورۃ انبیاء آیت 69۔ (۹) سلامتی کا کلمہ سورۃ فرقان آیت 63۔ (۱۰) اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام سورۃ حشر آیت ۲۳۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾

"اور اسی طرح ہم تفصیل سے آیتیں بیان کرتے ہیں تا کہ مجرمین کا راستہ واضح ہوجائے" [55]۔

تفسیر 55 یہ تبلیغ کی دوسری شکل ہے یعنی انکا اعتراض ہے کہ آپ کو اور کوئی مسئلہ نہیں آتا صرف توحید ہی بیان کرتے رہتے ہیں یعنی آپ جاہل ہیں؟ جواب میں یہ فرمایا کہ مسائل بار بار بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شرک اور توحید کے راستے الگ الگ ہوجائیں: وَلِتَسْتَبِيْنَ: اس سے پہلے معطوف علیہ مقدر ہے یعنی لِيُظْهِرَ لَكَ الْحَقَّ وَلِتَسْتَبِيْنَ۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَاۗءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

"فرمادیجئے میں روک دیا گیا ہوں اس سے کہ میں اس کی عبادت کروں جن کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو فرمادیجئے میں نہیں پیچھے چلوں گا تمہاری خواہشات کے ورنہ میں اس وقت گمراہ ہوجاؤں گا ہدایت پانیوالوں میں سے نہیں ہونگا" [56]۔

تفسیر 56 یہ بھی ادب اور سوالات جوابات ہیں۔ پہلا سوال: آپ غیر اللہ کی بندگی جائز کیوں نہیں کرتے؟۔ جواب ہوا کہ میں منع کیا گیا ہوں۔ دوسرا سوال: آپ ہمارے دین کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟۔ جواب یہ تو خواہشات کی پیروی ہے جو کہ گمراہی ہے اور ہدایت سے دوری کا سبب ہے اس آیت میں: سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ: مذکور ہے اس سے مراد غیر اللہ کی عبادت ہے نُهِيْتُ بقرآن مجید کی آیتوں میں صریح منع ہے اور دلائل عقلیہ ونقلیہ سے منع واضح ہے اس طرح سورۃ مومن آیت 66 میں بھی ہے۔

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ
الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝ ٥٧

"آپ فرما دیجئے میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلاتے ہو۔ میرے پاس وہ چیز نہیں ہے جو
جلدی طلب کر رہے ہو اختیارات صرف اللہ ہی کے پاس ہیں وہ حق بیان کرنے والا اور بہترین فیصلہ کرنیوالا ہے" [57]۔

تفسیر 57 یہ تیسرے سوال کا جواب ہے تیسری بات پر کیا دلیل ہے۔ جواب یہ ہے کہ دلیل ہے مگر اس کو تم نہیں مانتے یہ
ثُبُوت : کا بیان ہے بَیِّنَةٌ کے ذریعے منع ہوا ہے جبکہ بَیِّنَةٍ : سے قرآن مراد ہے: مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ: اس سے ایسا
عذاب مراد ہے جیسے سورۃ انفال آیت 32 میں ہے یا مراد قیامت ہے جو سورۃ شوریٰ آیت 28 میں ہے: اِنِ الْحُكْمُ
: تکوینی اور تشریعی دونوں حکم مراد ہیں اس طرح سورۃ یوسف آیت 40 اور 67 میں بھی مذکور ہے: یَقُصُّ الْحَقَّ تفصیلی بیان
کو قص کہتے ہیں یا یقض ایک قراءت کے مطابق فیصلے کو کہتے ہیں حکم اور قضا۔ فیصلے کو مستلزم ہے اس لیے: وَ هُوَ خَیْرُ
الْفٰصِلِیْنَ: فرمایا۔

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝ ٥٨

"فرما دیجئے اگر ہوتی میرے پاس وہ چیز جسے تم جلدی طلب کر رہے ہو تو اس کا معاملہ کب کا میرے اور تمہارے درمیان
فیصلہ کی صورت میں ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے" [58]۔

تفسیر 58 یہ چوتھے سوال کا جواب ہے سوال یہ تھا کہ اگر ہم باطل طریقے پر گامزن ہیں تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا
؟ ہوسکتا ہے آپ کے پاس عذاب کا اختیار ہو؟ جواب ہوا کہ اگر میرے پاس عذاب کا اختیار ہوتا تو میں کب کا فیصلہ کر چکا
ہوتا۔ (سوال) (صحیح بخاری کتاب بدء الخلق حدیث 3231 صحیح مسلم کتاب الجهاد حدیث 1795
میں ہے) کہ جب طائف سے آپ ﷺ واپس آرہے تھے تو ملک الجبال (پہاڑوں کے ملائکہ) نے آپ سے ظاہر
ہوکر یہ بات کہی تھی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان کو دو پہاڑوں کے درمیان کچل دوں آپ نے اجازت نہیں دی معلوم
ہوا کہ عذاب کا اختیار آپ کے پاس تھا؟۔ جواب منکرین نے جب عذاب طلب کیا تھا تو اس وقت آپ کے اختیار میں
عذاب نہیں تھا اور حدیث میں یہ بھی الفاظ نہیں ہیں کہ طائف والوں نے عذاب طلب کیا تھا بلکہ یہ تو صرف ملک الجبال نے
پیشکش کی تھی۔ ابن کثیر

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا

حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝٥٩

"اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں نہیں جانتا کوئی بھی مگر وہی اور وہ جانتا ہے جو خشکی اور تری میں ہے اور نہیں گرتا کوئی پتا بھی مگر اس کے علم میں ہے اور نہ کوئی دانہ گرتا ہے زمین کے اندھیروں میں اور نہ ہی تر اور نہ ہی خشک چیز مگر سب واضح کتاب میں ہیں" [59]۔

تفسیر 59 جب کہا گیا کہ نبی کے پاس عذاب کا اختیار نہیں ہے تو سوال ہوا کہ اختیار نہیں ہے مگر عذاب آنے کا علم تو ہوگا؟ تو پہلے آیت میں ان کا جواب ہوا آیت میں پہلا جملہ علم کلی مغیبات کے متعلق ہے اور اجمالی طور پر ذکر ہے پھر تفصیلی ذکر ہوا کہ موجودات دو قسم کی ہیں یعنی اعیان و اعراض پھر اعیان دو قسم کے ہیں (۱) بری (۲) بحری اعراض بھی دو قسم کے ہیں اوصاف اور حرکات پھر اوصاف بھی دو قسم کے ہیں تر خشک پھر حرکات بھی دو قسم کی ہیں۔ (۱) اوپر سے زمین کی جانب حرکت اور زمین کی سطح سے زمین کے اندر کی جانب تو اس میں تمام موجودات داخل ہو گئے: مَفَاتِحُ مَفْتَحٌ: کی جمع ہے خزانوں کو کہا جاتا ہے اور: مِفْتَح: کی جمع ہو تو چابیوں کو کہا جاتا ہے صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4627 میں جو حدیث میں مذکور ہے کہ: مَفَاتِحُ الْغَيْبِ: غیب کی چابیاں پانچ ہیں وہ حصر کیلئے نہیں ہے کہ بس اسی میں صرف علم غیب منحصر ہے بلکہ وہاں سوال پانچ چیزوں کا ہوا تو یہ انکا جواب تھا: اَلْبَرِّ چونکہ خشکی میں انسان کے فائدے بھی زیادہ ہیں اور انسان کا علم بھی اس کے متعلق زیادہ ہے اس لیے اس کو پہلے ذکر کیا ہے: وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ: اس میں بہت عموم ہے کہ صرف پتے کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس نہیں ہے بلکہ اس کی حرکت کا علم بھی اسی کے پاس ہے: وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ: ہر زندہ و مردہ انس و جن بلکہ تمام چیزوں کو شامل ہے: فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ: اس میں دو قول ہیں (۱) اللہ تعالیٰ کا علم (۲) لوح محفوظ۔ اس آیت میں دلیل عقلی ہے۔ اس میں غیر اللہ سے علم غیب کی نفی ہے اس آیت میں دلیل ہے کہ تمام کلیات اور جزئیات کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٦٠﴾

"اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جو تمہیں فوت کرتا ہے رات کو اور جو کچھ تم دن کو کرتے ہو اس کو وہ جانتا ہے پھر وہ تمہیں اٹھاتا ہے اس میں تاکہ وقت معین پورا کیا جائے پھر اسی کی طرف تمہارا لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تمہیں خبر دیگا اس کی جو تم عمل کرتے تھے" [60]۔

تفسیر 60 یہ دلیل عقلی ہے سوجانا اور بیدار ہونا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے پہلے علم کے عموم کا ذکر تھا اب اس کی قدرت کے عموم کا ذکر ہے: يَتَوَفَّاكُمْ : توفی کسی چیز کا پورا لینا ہے جس کا اطلاق نیند اور موت دونوں پر ہوتا ہے۔ جیسے سورۃ زمر آیت 42 میں ہے۔ امام سمعانیؒ کا قول ہے کہ یہاں مراد نفس: مُتَمَيِّزَةٌ مُتَصَرِّفَةٌ : قبض کرنا ہے۔ بِالنَّهَارِ : اس سے گزرے ہوئے دن مراد ہیں اور فِيهِ کی ضمیر سے آنے والے دن مراد ہے: أَجَلٌ مُّسَمًّى : اس سے ہر انسان کی موت کا وقت مقررہ مراد ہے۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ ۖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ ﴿٦١﴾

"اور وہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر غالب ہے اپنے بندوں کے اوپر ہے اور وہ بھیجتا ہے تم پر محافظ (ملائکہ) یہاں تک کہ تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو فوت کرتے ہیں اس کو ہمارے رسول (ملائکہ) اور وہ کوتاہی نہیں کرتے" [61]۔

تفسیر 61 یہ بھی عقلی دلیل ہے کہ غالب ذات اللہ تعالیٰ کی ہے وہ موت لاتا ہے لہٰذا تم موت سے بچ نہیں سکتے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ موت کے ملائکہ بہت ہیں ملک الموت تو بعض مقام پر جاتا ہے بعض لوگوں کی روح نکالنے کیلئے وہ ہر جگہ حاضر و ناظر نہیں ہے۔ سابقہ آیت میں نیند کی تَوَفِّیْ : کا ذکر ہوا اس آیت میں موت کی تَوَفِّیْ : کا ذکر ہے: وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ قَهْرٌ : کسی چیز پر غلبہ حاصل کرنے کو کہا جاتا ہے اور غلبہ کسی چیز پر بلندی کو مستلزم ہے اس لئے: قَهْرٌ : کے ساتھ فوق ذکر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قہر مختلف طریقوں سے ہے۔ غیر موجود کو موجود کرنے پر قادر ہے موجود کو فنا کرنے پر قہر نور کا ظلمات پر اور اسی طرح برعکس رات کا دن پر اور دن کا رات پر غلبہ یعنی تصرفات اور انقلابات کو قہر و غلبہ کہتے ہیں اسی طرح آیت 18 میں گزر رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہاں پر نفع و نقصان کا ذکر تھا تو اس کے بعد ذکر ہوا کہ یہ اثر اللہ تعالیٰ کے قہر و غلبہ کا ہے اور یہاں

پر سلانے جگانے کا ذکر ہوا پھر اللہ تعالیٰ کے قہر و غلبہ ذکر ہوا: وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً: یہ بھی اللہ تعالیٰ کے قہر کی ایک صورت ہے یعنی حفاظت کرنے پر غالب ہے۔ اس سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو سورۃ رعد آیت 11 اور سورۃ انفطار آیت 10 میں مذکور ہیں: تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا: اس طرح سورۃ اعراف آیت 37 میں اور سورۃ نساء آیت 97 میں بھی مذکور ہیں۔ سوال: ان آیتوں میں موت کی نسبت ملائکہ کی طرف کی گئی ہے اور سورۃ الم سجدہ آیت ۱۱ میں ملک الموت کی طرف نسبت ہوئی ہے اور سورۃ زمر آیت 42 میں اللہ کی طرف نسبت ہوئی ہے۔ جواب: اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت باعتبار اختیار اُمر اذن ہوئی ہے زیادہ ملائکہ کی طرف نسبت میں دو توجیہات ہیں: (۱) یہ ملک الموت کے ساتھ معاون ہوتے ہیں ملک الموت روح نکال کر ان کو دیدیتا ہے اور وہ لیکر اٹھالیتے ہیں یا ملک الموت کے حکم سے لوگوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ [۲] دوسری توجیہ یہ ہے کہ رُسُلُ: جمع ہے مگر مفرد کے معنی میں ہے اور ملک الموت میں بھی توجیہات ہیں۔ پہلی توجیہ یہ ہے کہ ملک الموت لوگوں پر مقرر کیا گیا ہے جو عزرائیل کے نام سے مشہور ہے جبکہ یہ نام کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے اس کے حکم سے باقی ملائکہ موت کا کام انجام دیتے ہیں۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہ اسم جنس ہے یعنی مراد کئی ملک الموت ہیں پھر اس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۟ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾

"پھر وہ لوٹائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف جو ان کا سچا مالک ہے خبردار اسی کیلئے ہے فیصلہ کرنا اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے" [62]۔

تفسیر 62 اس آیت میں قیامت کا اثبات اور اللہ تعالیٰ کی تین صفات کا ذکر ہے: مَوْلٰىهُمْ: یہاں مولا مالک (متصرف) باختیار کے معنی میں ہے تو یہ نسبت کافروں کیلئے بھی ہوسکتی ہے کیونکہ ان کا بھی مولا ہے سورۃ محمد آیت 11 میں مولا ناصر کے معنی میں ہے تو اس معنی میں کافروں سے نفی ہے: اَلْحَقِّ: اس کی ولایت یقینی یقنی اور ہمیشہ ہے: اَلَا لَهُ الْحُكْمُ عنیان کا رد کرنے کے بعد فرماتے ہے کہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے کسی اور کو یہ اختیار اس نے نہیں دیا۔ آیت 57 میں دنیاوی احکام مراد ہیں اور یہاں حکم آخرت مراد ہے فیصلے میں حساب بھی شامل ہے اس لیے بطور عطف ذکر کیا ہے۔ اَسْرَعُ مسند احمد اور ابو یعلی کی روایت میں فرض نماز کی مقدار، سورج کی غروب کی وقت کی مقدار رواہ ابو یعلی، طبرانی کبیر کی روایت کی مطابق یہ مقدار ون کا ایک لمحہ ہوگا یہ روایتیں صحیح وحسن ہے مجمع

الزوائدج 10 ص 337 حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اتنی جلدی حساب کریگا جیسے دنیا کے حساب سے صبح سے ظہر تک۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝

"فرما دیجئے کون تمہیں خشکی اور تری کے اندھیروں سے نجات دیتا ہے تم اسے عاجزی سے اور چپکے چپکے پکارتے ہو (یہ کہتے ہوئے) کہ اگر وہ ہمیں اس سے نجات دے تو ضرور ہم شکر گزاروں میں سے ہو جائینگے" [63]۔

تفسیر 63 یہ بھی دلیل عقلی ہے کہ جب تم سخت تکلیف میں ہوتے ہو تم اللہ تعالیٰ کو مدد کیلئے پکارتے ہو تو اس طرح تمام تکلیفوں میں پکارو اور اس کے لئے بندگی اور عبادت خالص کرو۔ سابقہ آیت سے ربط اور تعلق یہ ہے کہ کافر بھی اللہ تعالیٰ کو معبود برحق مانتے ہیں اسی لیے مصیبت میں اسکو پکارتے ہیں اور یہی اس کو مولا تسلیم کرنے کی دلیل ہے۔ ظلمت سے مراد حقیقی اندھیرے ہیں جو صحراؤں اور جنگلوں میں رات کو ہوتے ہیں سمندروں میں رات ہو یا دن بادل ہوں یا طوفان ہوں پانی کی لہریں اور موجیں ہوں یا ظلمت سے تکلیفیں اور پریشانیاں مراد ہیں۔ انسان پر ان تکلیفوں سے پریشانی آتی ہے کہ اس کی نظر بھی کام چھوڑ دیتی ہے تو وہ اندھیروں کے مثل ہوتے ہیں۔ خواہ خشکی ہو یا سمندر: تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً: تضرع سے مشہور معنٰی مراد ہے پھر علانیہ کے معنی میں ہے جہر زبان سے اور خفیہ دل سے مراد دونوں طریقے ظاہر اور مخفی یا ایک ہی وقت میں زبان سے تضرع اور دل سے اخلاص ہے: الشّٰكِرِيْنَ: امام سمعانی اور شربینی نے لکھا ہے کہ شکر کا معنی ہے نعمت کو پہچاننا اور منعم کا حق ادا کرنا۔ یا نعمت کی نسبت منعم حقیقی کی طرف کرنا ہے اس کے ساتھ منعم کی رضا کے لیے نعمتوں کا خرچ کرنا بھی ہے۔

قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝

"فرما دیجئے اللہ ہی تمہیں اس سے نجات دیتا ہے اور ہر غم سے پھر تم شریک ٹھہراتے ہو" [64]۔

تفسیر 64 یہ سابقہ سوال کا جواب ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مصیبت سے نجات دینے والا ہے تو تم کیوں اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو۔ کرب اس غم کو کہتے ہیں جس سے سانس گھٹ جائے یعنی نہایت غم۔ ان آیتوں کی طرح سورۃ یونس کی آیت 22 اور سورۃ بنی اسرائیل آیت 67 اور سورۃ عنکبوت آیت 65 سورۃ روم آیت 33 اور سورۃ نحل آیت 54

میں ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

" آپ فرما دیجئے کہ وہ قادر ہے اس پر کہ بھیجے تم پر تمہارے اوپر سے عذاب یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا وہ تمہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کر دے اور چکھائے تم میں سے بعض کو بعض کی لڑائی کا مزہ آپ دیکھیں کس طرح ہم پھیر پھیر کر آیات بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں" |65|۔

تفسیر 65: اس آیت میں یہ دلیل عقلی ہے کہ عذاب کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور یہ دنیاوی تخویف بھی ہے۔ ربط یہ ہے کہ جب تمہیں اللہ تعالیٰ عذاب و مصیبت سے نجات دیتا ہے پھر بھی تم شرک کرتے ہو تو وہ اس پر قادر ہے کہ کسی اور طریقے سے تمہیں عذاب دیدے: اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ: حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ خطاب مشرکین اور کفار سے ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اس سے مراد امت محمد ﷺ ہے لیکن اس قول کی بناء پر پہلے والے دونوں عذاب محمد ﷺ کی دعا کی وجہ سے اس امت کیلئے معاف ہیں اس سلسلے میں امام ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں سترہ (۱۷) احادیث نقل کی ہیں جو سب مذکورہ مضمون پر مبنی ہیں۔ ایک حدیث کا مضمون یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس آیت کے نزول پر اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے لیے آسمانی اور زمینی عذاب سے پناہ طلب کی: اَعُوْذُ بِوَجْهِكَ: میں تیری ذات کی پناہ طلب کرتا ہوں اور یہ دعا قبول ہوئی پھر آپ نے آپس کے اختلاف سے پناہ طلب کی مگر یہ دعا قبول نہیں ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ: هٰذَا اَهْوَنُ اَوْهٰذَا اَيْسَرُ: (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4628 صحیح ابن حبان حدیث 7220 ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3065)۔ یعنی یہ آسان ہے: مِّنْ فَوْقِكُمْ: تیز و تند ہوا، ملائکہ کی چیخ پتھروں کی بارش، طوفان یعنی قوم نوح علیہ السلام، عاد ثمود، قوم لوط اصحاب فیل وغیرہ کا عذاب: اَرْجُلِكُمْ: سے مراد غرق ہونا زمین میں دھنسا جیسا کہ فرعون قارون کے ساتھ ہوا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما مجاہد رحمہ اللہ سے مفسرین نے نقل کیا کہ پہلے والے عذاب سے مراد برے حکمران ہیں اور دوسرے والے سے مراد نافرمان خدمتگار نوکر اور اولاد ہے۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ اوپر سے بارش کی بندش ہے اور نیچے سے فصلوں اور پودوں کی بندش ہے: شِيَعًا: وہ مختلف گروہ جو خواہشات کے پیروکار ہونگے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ میری امت میں 73 فرقے بنیں گے اور ایک کے علاوہ باقی

خواہشات کے پیروکار ہونگے (جامع ترمذی کتاب الایمان حدیث 2650 صحیح ابن حبان 6747 صحیح ابن ماجہ کتاب الفتن حدیث 3991) یہ مستقل عذاب ہے اور یہ دوسرے عذاب کیلئے سبب ہے یعنی: يُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ: اس سے آپس میں قتل وقتال مراد ہے: لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ: معلوم ہوا کہ قرآن کی مختلف آیتوں اور دلائل سے فقاہت حاصل ہوتی ہے۔

وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۚ قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ﴿٦٦﴾

"جھٹلایا اس (قرآن) کو آپ کی قوم نے حالانکہ وہ حق ہے فرما دیجئے میں تم پر نگہبان نہیں ہوں" [66]۔

تفسیر 66 اس آیت میں نہ ماننے والوں کو وعید سنادی گئی ہے اور بہ کی ضمیر قرآن یا عذاب یا آیات کی تصدیق کی طرف راجع ہے: بِوَكِيلٍ: وہ ذات جو کام کا مختار ہو اور وہ کام اس کے سپرد کیا گیا ہو تو ظاہر بات ہے کہ وہ جھٹلانے سے روک سکتی ہے۔

لِكُلِّ نَبَإٍ مُسْتَقَرٌّ ۚ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٦٧﴾

"ہر ایک خبر کا وقت مقرر ہے عنقریب تم جان لوگے" [67]۔

تفسیر 67 اس آیت میں اس سوال کا جواب ہے کہ جب یہ لوگ حق سے اعراض کرتے ہیں تو ان پر عذاب کیوں نہیں آتا جواب ہوا کہ عذاب کیلئے وقت مقرر ہے۔ نَبَإٍ: وہ خبر جو قرآن میں ہو دنیا کا عذاب یا آخرت کا عذاب یا قرآن کا عام کرنا۔

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٦٨﴾

"اور جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیتوں میں (بے جا) مشغول ہوتے ہیں تو آپ ان سے اعراض کریں یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر آپ کو (یہ بات) شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد آپ نہ بیٹھیں ظالم قوم کے ساتھ" [68]۔

تفسیر 68 یہ ادب ہے کہ جس مجلس میں شرک وبدعت اور فسق وفجور کی باتیں ہو رہی ہوں تو ایسی مجلس میں ہرگز نہ بیٹھیں البتہ اصلاح ودعوت کیلئے جا سکتے ہیں۔ (ربط) یہ ہے کہ پہلی آیت میں عذاب کا حقدار جھٹلانے والوں کو قرار دیا تو اس آیت میں

ان لوگوں کا ذکر ہے جو جھٹلانے کے ساتھ استہزاء اور طعن بھی کرتے ہیں۔ بعض جھٹلانے والے وہ ہیں جو طعن و تشنیع (برا بھلا) کہتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں انکا ذکر اس آیت میں ہے جبکہ بعض آیتوں کو لہو لعب (کھیل تماشا) تصور کرتے ہیں انکا ذکر آیت 70 میں ہے: وَ اِذَا رَاَيْتَ: اس سے مراد آنکھوں اور علم سے جاننا دونوں مراد ہیں: الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ: خوض لغت میں پانی کے اندر غوطا لگانے کو کہتے ہیں پھر اس کا استعمال بے مقصد باتوں میں مشغول رہنے کے لئے ہوا۔ قرطبی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق خلط ملط کرنے کو خوض کہتے ہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ سے امام قرطبی نے نقل کیا ہے کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو قرآن کا مذاق اڑاتے ہیں یعنی قرآن مجید کا استہزاء کرنے والے۔ ابن عربی کا قول ہے گناہ کبیرہ کے مرتکب اس میں داخل ہیں۔ امام سمعانی نے فرمایا کہ ہر بحث جو آیتوں سے متعلق ہو اور قرآن و سنت کے خلاف ہو وہ اس میں داخل ہے۔ امام ابن کثیر کا قول ہے کہ اس خطاب میں امت کے سارے لوگ مراد ہیں کہ وہ تحریف کرنے والوں غلط تفسیر کرنے والوں کی مجالس میں نہیں بیٹھیں گے۔ امام قرطبی نے سارے بدعتیوں کو اس میں شامل کیا ہے اور ان کے خلاف اس مقام میں کئی احادیث جمع کی ہیں: فِيْٓ اٰيٰتِنَا: اس سے مراد قرآن اور تمام دینی مسائل جو اس میں شامل ہیں۔ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ: مذکر کی ضمیر قرآن کی وجہ سے آیتوں کی طرف راجع ہے یعنی اس قسم کا کلام اور گفتگو کرتے ہیں جس میں قرآن یا دینی امور کی توہین نہ ہو استہزا طعن و تشنیع تحریف غلط تاویلات وغیرہ نہ ہوں تو پھر ایسی مجلس میں بیٹھا جا سکتا ہے اور خوض کی تفسیر سورۃ نساء آیت 140 میں گزر چکی ہے: وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ: یعنی جب تم کو فَاَعْرِضْ: اور: فَلَا تَقْعُدْ: شیطان نے بھلا دیا ہو۔ اس میں دلیل ہے کہ نبی کو بھول ہو سکتی ہے۔ اس مسئلے کو امام قرطبی نے تفصیل سے لکھا ہے: بَعْدَ الذِّكْرٰى: ذِكْرٰى: یاد آوری کے بعد یعنی اللہ تعالیٰ کا اعراض والا فرمان یاد آیا کہ یا نصیحت کیلئے ان کے ساتھ بیٹھنا (خوض فی الآیات) آیتوں کی استہزا نہیں ہے۔

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۶۹﴾

"اور نہیں ہے ان لوگوں کے ذمہ ان کے حساب میں سے کچھ بھی جو ڈرتے ہیں لیکن ان کے ذمہ نصیحت کرنا ہے تاکہ وہ بچ جائیں" [69]۔

تفسیر 69 یہ سابقہ آیت سے متعلق ہے کہ مومنین جب مشرکین اور فاسقین کی مجالس میں کسی وجہ سے شریک ہو جائیں تو ان کے ذمہ دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینا ہے اس آیت میں دو توجیہات ہیں۔ (۱) جب مشرکین تمہاری مجالس میں آ جائیں تو

ان سے خوض کرنے میں تم پر گناہ نہیں ہے۔ (۲) یَتَّقُوْنَ: سے مراد ان کے شرک کی مجالس سے اجتناب ہے تو پھر ان کے گناہوں کا تم پر ذمہ نہیں ہے البتہ تمہارے ذمہ ان کو نصیحت کرنا ہے۔

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۞ ع

''اور چھوڑ دیں ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنالیا ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالا ہے ان کو آپ اس قرآن کے ذریعے نصیحت کریں تاکہ نہ ہلاک کیا جائے کوئی نفس اس کے بدلہ جو اس نے کمایا ہے نہیں ہوگا اس کیلئے کوئی دوست اور نہ کوئی سفارشی اور اگر وہ بدلہ دے ہر قسم بدلہ تو نہ لیا جائیگا اس سے یہی ہیں وہ لوگ جو ہلاک کئے گئے بسبب اس کے جو انہوں نے کمایا انہیں گرم پانی پینا ہوگا اور بوجہ ان کے جو وہ کفر کرتے تھے دردناک عذاب ہوگا'' [70]۔

تفسیر 70 اس آیت میں ایک اور قسم کے لوگوں کے متعلق ادب کا ذکر ہے جنہوں نے دنیا کو آخرت پر ترجیح دی ہے یہ دوسری قسم کے لوگ ہیں جو دین کو کھیل کود سمجھتے ہیں یہ آیت بھی سابقہ آیت کی طرح ہے کہ اس قسم کے لوگوں سے تعلق ختم کرو صرف ان کو دعوت تبلیغ کرو پھر تخویف اخروی کا ذکر ہے: اِتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا: ایک معنٰی یہ ہے کہ دین توحید سنت کے ساتھ استہزا کرتے ہیں اور اس کو عبث بیکار سمجھتے ہیں جیسے کھیل کود ہوتا ہے دل بہلانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں یا جیسا کہ کمیونسٹ دھری کہتے ہیں کہ دین افیون اور نشہ ہے۔ دوسرا معنٰی یہ ہے کہ انہوں نے اس چیز کو دین بنایا ہے جو کھیل ہے یعنی عرس اور میلوں میں مزاروں پر قوالیاں کرتے ہیں اور اس میں ناچتے ہیں یہ صوفیوں اور ملنگوں کا دین ہے۔ تیسرا معنٰی یہ ہے کہ لہو اور لعب دنیا کا مال و متاع ہے انہوں نے دین کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنایا ہے جیسا کہ سیاسی مولوی قرآن اور دین کے نام پر کرسی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح اجرتی مولوی جو دنیاوی اغراض کے لیے قرآن خوانیاں وغیرہ کرتے ہیں۔ چوتھا معنٰی یہ ہے کہ عید کو دین کہتے ہیں اور اسے لہو لعب میں گزارتے ہیں اور سنت طریقوں سے غافل رہتے ہیں اس طرح سورۃ اعراف آیت 51 میں ہے یہ معانی امام نیشاپوریؒ نے اپنی تفسیر میں درج کیے ہیں۔ لفظ لعب چار آیتوں میں لھو سے پہلے لایا گیا ہے اس سورۃ میں آیت 32، سورۃ محمد آیت 36، سورۃ حدید آیت 20 اور اس آیت میں بھی جبکہ دو آیتوں میں لھو مقدم کیا گیا ہے سورۃ عنکبوت آیت 64، سورۃ اعراف آیت 51۔ فرق یہ ہے کہ سابقہ آیت 32 کی موافقت

کی وجہ سے اس آیت میں بھی لہو کو مقدم کیا ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ یہاں پر تیسرا معنٰی بہتر ہے جبکہ سورۃ اعراف میں پہلے ان لوگوں کا رد ہے جو برہنہ طواف کو دین سمجھتے تھے اس لئے اعراف آیت 51 میں لہو مقدم کیا ہے اور یہاں تیسری معنی کہ لوگوں نے دین کو دنیاوی مقاصد کیلئے استعمال کیا ہے اس لیے اس کے بعد فرمایا کہ: وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ذکر کیا ہے: وَذَكِّرْ بِهٖ: ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے اور اشارہ ہے کہ: ذَرِ الَّذِيْنَ: میں دعوت چھوڑنا مراد نہیں ہے بلکہ بے پرواہ ہونا عذاب آخرت کا انتظار کرنا مراد ہے: اَنْ تُبْسَلَ: اس کے معنی میں مختلف تعبیرات ہیں۔ (۱) بند ہونا، گھیر لینا، بہرہ ہونا۔ (۲) فضیحت، رسوائی۔ (۳) ثواب سے محروم ہونا۔ (۴) جل جانا۔ اصل میں کلام اس طرح ہے کہ كَرَاهِيَةَ یا لِئَلَّا تُبْسَلَ ہے: شَفِيْعٌ: یہ مشرک کافر کے ساتھ خاص ہے یا مراد یہ ہے کہ اذن الٰہی کے بغیر سفارش نہیں ہوگی تو پھر عام ہے: وَاِنْ تَعْدِلْ: اس طرح سورۃ بقرہ آیت 48، 123، سورۃ آل عمران آیت 19 اور سورۃ مائدہ آیت 36۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰۤى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾

"فرما دیجئے کیا ہم اللہ کے سوا ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکیں اور نہ نقصان پہنچا سکیں اور ہم پھیر دیئے جائیں اپنی ایڑیوں کے بل اس کے بعد کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اس شخص کی طرح کہ شیطانوں نے اسے بہکا دیا زمین میں حیران پھرتا ہے اس کے کچھ ساتھی ہیں جو اسے سیدھی راہ کی طرف بلاتے ہیں کہ آ جا ہمارے پاس۔ فرما دیجئے صحیح ہدایت اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت ہے اور ہم حکم دیئے گئے ہیں کہ رب العالمین کے مطیع ہو جائیں" [71]۔

تفسیر 71 یہ سابقہ دلائل کا نتیجہ ہے اور شرک فی الدعاء کا رد ہے اور تعلیم کے طریقے اور سوال کا جواب ہے یعنی اگر دنیا پرست مشرک یہ بات کہہ دیں کہ دنیا پرستی اس کو نقصان دے گی جس کا اللہ کے سوا کوئی ولی اور شفیع نہ ہو یعنی موحد ہو لہٰذا آؤ اپنے لئے ولی اور سفارشی بنا لو تو کامیاب ہو جاؤ گے تو اس کا جواب ہے اس آیت میں اور (مَا) موصولہ سے ولی اور سفارشی مراد ہے: وَنُرَدُّ: یہ عطف مسبب ہے سبب پر یعنی غیر اللہ سے مدد طلب کرنا تو مرتد ہونا ہے: كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ: یہ حال ہے یعنی اس حال میں تو ہم اس شخص کی طرح ہو جائینگے: اِسْتَهْوَتْهُ هَوَيَةٌ سے لیا گیا ہے یعنی شیطانوں نے اس کو ایسی گہری کھائی میں ڈالا ہو کہ ساتھی اس کو بلاتے ہیں لیکن وہ نکل نہیں سکتا۔ یا ھویٰ سے لیا گیا ہے یعنی شیطانوں نے اس کو

خواہش کا تابع بنایا ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گمراہ کیا ہو اس کو شیطانوں نے حَیْرَانَ یہ حال ہے لفظ
حیران ہونے کا یہ عالم ہو کہ صحیح راستے کا انتخاب نہ کر سکتا ہو: لَهٗۤ اَصْحٰبٌ: یعنی صحیح ساتھیوں کی بات بھی نہیں مانتا ہو۔ مثال کا
خلاصہ یہ ہے کہ کوئی شخص ساتھیوں کے ساتھ صحرا میں گیا ہو شیطان جنوں نے ساتھیوں سے الگ کر دیا تو راستہ بھول گیا
ساتھی اس کو سیدھی راہ کی طرف بلاتے ہیں مگر وہ شیطانوں کے بہکاوے میں سیدھے راستے کا تعین نہیں کر سکتا ہے سیدھی راہ
سے بچھڑ گیا ہے تو اسی طرح وہ شخص ہے جس نے اپنے اللہ کے علاوہ ولی اور سفارشی بنا رکھے ہیں وہ مصیبتوں میں ان کو پکارتا
ہے اور ان سے مدد طلب کرتا ہے اس شرکیہ عقیدے سے نجات کیلئے موحد ساتھی اس کو دعوت دیتے ہیں مگر ان باطل پرست
مولویوں اور پیروں نے اس کے دماغ میں وہ غلط تصورات شرکیہ قصے کہانیاں ڈال دی ہیں کہ وہ توحید کے عقیدہ کو ماننے کیلئے
تیار نہیں ہے۔ قُلْ: یہ سوال کا جواب ہے سوال یہ تھا کہ مشرک کہتا ہے کہ میرا راستہ ہدایت کا ہے میں کسی اور کی بات نہیں
مانتا تو جواب یہ ہے کہ: قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ: الخ پھر فرمایا: وَ اُمِرْنَا: یہ بھی ان کے دعوے کا جواب ہے ان کا کہنا تھا کہ
پیروں نے ہمیں راستہ دکھایا ہے ہم ان کے تابع ہیں جواب: اُمِرْنَا: سے ہوا ہے۔ نیز اس آیت سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کو
پکارنا مرتد ہونا ہے مشرک حاجت میں پریشان رہتا ہے کبھی ایک دربار پر حاضری دیتا ہے تو کبھی دوسرے پر جبکہ موحد کا تو
دربار ہی ایک ہے وہ ہر حال میں صرف اللہ ہی کو پکارتا ہے اور اسی سے تمام امیدیں وابستہ رکھتا ہے۔

وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ۚ وَهُوَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۝

"اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تم نماز قائم کرو اور اسی اللہ سے ڈرو وہی ہے جس کی طرف تم اکٹھے کئے جاؤ گے"[72]۔

تفسیر 72 اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے حق کا ذکر ہے جو کہ توحید ہے اور یہ: نُسْلِمَ: پر تاویل کے ساتھ عطف ہے یعنی
وَلِنُقِيْمَ الصَّلٰوةَ: یا اس طرح ہے کہ: وَ اُمِرْنَا اَنْ اَسْلِمُوْا: اور وَ اَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: یہ بھی دونوں گروہوں میں
عملی فرق ہے یعنی توحید والے نمازوں کے پابند ہوتے ہیں اور اس کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ تقویٰ پر قائم ہیں قیامت پر
ایمان رکھتے ہیں اور غیر اللہ کو پکارنے والوں میں یہ حقوق الٰہیہ ادا کرنے کا جذبہ نہیں ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۷۳﴾

"اور اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو (اظہار) حق کیلئے پیدا کیا اور اختیار رکھتا ہے اس دن کا جب کہے گا ہو جا تو قیامت قائم ہوگی اسی کا قول حق ہے اور اسی کی بادشاہت ہوگی جس دن صور پھونکا جائیگا غیب وحاضر کا جاننے والا ہے اور وہی خوب حکمت والا نہایت خبردار ہے" [73]۔

تفسیر 73 یہ توحید کیلئے دلیل عقلی ہے کہ دنیا پیدا کرنا اور فنا کرنا دونوں اسی کی اختیار میں ہیں کارساز بھی ہے اور غیب دان بھی ہے: وَهُوَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ وَهُوَ الَّذِيْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ: پر عطف ہے: بِالْحَقِّ: امام سمعانیؒ نے فرمایا کہ یہ اظہار حق کے معنی میں ہے۔ یعنی توحید کی دلیل ہے یا کلام حق کے معنی میں ہے۔ (امام شربینیؒ) اور یہ دلیل ہے کہ کلام اللہ تعالیٰ کا مخلوق نہیں ہے بلکہ مخلوق پیدا کرنے کا سبب ہے: وَيَوْمَ عطف ہے: اَلسَّمٰوٰتِ: پر یعنی قیامت کے دن کو مقدر کیا ہے یا لفظ: اُذْكُرْ: مقدر ہے: كُنْ فَيَكُوْنُ: مراد ہے کہ کلمہ کن سے ان کو زندہ کرنا مارنا پھر اٹھانا۔ فائدہ: اس آیت میں قراءت کا اختلاف ہے بعض قراء: فَيَكُوْنُ: پر وقف آیت کے قائل ہیں اور بعض کے نزدیک اس طرح نہیں ہے: قَوْلُهُ الْحَقُّ فَيَكُوْنُ: کیلئے فاعل ہے یا مبتدا اور خبر ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ یہ جملہ اور بعد والا اللہ تعالیٰ رب العلمین کی صفات ہیں 71 میں قول سے مراد کلمہ کن ہے یا سارا کلام اللہ مراد ہے: وَلَهُ الْمُلْكُ: ایک توجیہ یہ ہے کہ یہ مستقل کلام ہے اور قَوْلُهُ الْحَقُّ: پر عطف ہے اور: وَيَوْمَ يَقُوْلُ سے: يَوْمَ يُنْفَخُ: بدل ہے یا ظرف متعلق ہے: اَلْمَلِكُ: کے ساتھ مَلِكُ کی تخصیص اس دن کے ساتھ سورۃ مومن آیت 16 کی ترتیب کی طرح ہے: يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ: قرآن کریم میں نَفَخَ فِي الصُّوْرِ: دس (۱۰) مرتبہ مذکور ہے جس میں سے یہ پہلا مقام ہے چونکہ یہ سورت عقیدہ کی تفصیل کی پہلی سورۃ ہے اس لیے پہلی مرتبہ اس میں ذکر ہوا ہے۔ صور میں پھونکنا اہل تحقیق کے نزدیک دو مرتبہ ہے پہلا دنیا ختم کرنے کیلئے اور دوسرا پیدا کرنے کیلئے: بَعْثَ بَعْدَ الْمَوْتِ: اس آیت میں دونوں کیلئے عام ہے: صُوْر: اصل میں سینگ کو کہتے ہیں اور اس سے مراد وہ صور ہے جو اسرافیل علیہ السلام کے ذمہ ہے کہ وہ قیامت برپا کرنے کیلئے پھونکیں گے۔ پہلی مرتبہ دنیا ختم کرنے کے لیے اور دوسری مرتبہ قبروں سے اٹھانے اور حساب وکتاب یعنی حشر کے لیے ہے۔ اس کے متعلق صحیح احادیث کثرت سے وارد ہیں ان احادیث کو ابن کثیر نے جمع کیا ہے اور جس نے کہا ہے کہ صور صورۃ کی جمع ہے اور معنی یہ ہے کہ

روحوں کو صورتوں اور بدنوں میں پھونکا جائیگا اور اس طریقے سے زندہ ہو جائینگے اس کا امام ابن کثیر، قرطبی اور شربینی رحمہ اللہ وغیرہ نے رد کیا ہے کہ یہ تفسیر قرآن وسنت اور اجماع کے بھی خلاف ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ لِأَبِيهِ ءَازَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا ءَالِهَةً ۖ إِنِّىٓ أَرَىٰكَ وَقَوْمَكَ فِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ۝

"اور جب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اپنے والد آزر سے کیا تم بتوں کو (بندگی کا حقدار) معبود ٹھہراتے ہو یقیناً میں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں" [74]۔

تفسیر 74 اس آیت سے آیت 90 تک چوتھا باب ہے اس میں ابراہیم علیہ السلام سے منقول دلیل تفصیلا اور سترہ انبیاء علیہم السلام سے اجمالا مذکور ہے جس طرح مسئلہ توحید عقلی دلائل سے ثابت ہے اسی طرح گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی زبان سے بھی ثابت ہے اور چونکہ مشرکین مکہ کا دعویٰ تھا کہ ہم دین ابراہیم علیہ السلام پر ہیں تو ابراہیم علیہ السلام کا دین بیان ہوا أَصْنَامًا: ستاروں کی شکلیں اور نیک صالحین لوگوں کی صورتیں بنا ڈالی تھیں اور ان کی روحوں کو مددگار سمجھتے تھے۔ أَصْنَامًا: صنم کی جمع ہے ابن جریر نے کہا کہ ہر وہ شکل وصورت جو لکڑی یا پتھر سے بنائی جائے خواہ انسان کی ہو یا حیوان کی جو شکل دیواروں پر بنائی گئی ہو اس کو بھی کہا جاتا ہے اور ہر معبود مِنْ دُونِ اللهِ کو بھی کہا جاتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے ستاروں کے بت بنائے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ جب ہم ان کی عبادت کرتے ہیں تو ان کے ستارے خوش ہوتے ہیں اور ہماری حاجتیں ضرور تمیں پورا کرتے ہیں وہ دن کو بتوں کے عبادت اور رات کو ستاروں کی کرتے تھے: لِأَبِيهِ ءَازَرَ: قرآن مجید کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر تھا جبکہ تاریخ میں ہے کہ اس کا نام تارخ تھا لیکن قرآن مجید کے مقابل تاریخی باتوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آزر اس کا نام ہو اور تارخ اس کا لقب ہو اور کسی نے کہا ہے کہ یہ معبود کا نام ہے اور عبارت میں: عَابِدَ ءَازَرَ: کا لفظ مخفی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ آزر اسکے چچا کا نام تھا اور چچا کو اب یعنی باپ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ تمام اقوال قرآن کے ظاہر کے مخالف ہیں: أَتَتَّخِذُ: یہ دلیل ہے کہ بت اور تصویر بنانا حرام ہے اور خصوصا جب اس کی عبادت اور تعظیم ہو جائے تو وہ عین شرک اور حرام ہے: فِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ: سوال: یہ تو سخت الفاظ ہیں جبکہ دعوت میں تو نرم لہجہ اور الفاظ ہونے چاہئیں؟۔ جواب: امام نیشاپوریؒ نے لکھا ہے کہ اس کا نرم لہجہ وخطاب سورۃ مریم میں مذکور ہے جبکہ دعوت قبول نہ کرنے پر انہوں نے سخت الفاظ استعمال کیے اور ان کو دلائل پیش کیے اور دعوت میں والد کو مقدم رکھا ہے کیونکہ یہ شرعی حق ہے جو پہلے ادا کرنا چاہئے اور یہ بھی وجہ ہے کہ آزر

مشرکین کا بڑا تھا اور شرک کا داعی تھا اس لیے اس کو مقدم کیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝

"اور اسی طرح ہم دکھاتے تھے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کے (دلائل) بادشاہت کے تاکہ (اس سے دلیل پکڑے) اور یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے" [75]۔

تفسیر 75 اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام دلائل سے دعوت دیتے تھے: وَ كَذٰلِكَ: کاف برائے تشبیہ ہے یعنی جیسا کہ ہم نے ان کو شرک کی گمراہی دکھائی تھی یا علت کا معنی ہے یعنی شرک کی وجہ سے ہم نے ان کو توحید کے دلائل دکھائے۔ نُرِيْٓ: اس سے علمی رُؤْيَةٌ: مراد ہے جیسا کہ سورۃ سباء آیت 9، سورۃ یونس آیت 101 اور سورۃ اعراف آیت 185 میں ہے: مَلَكُوْتَ: مبالغہ ہے: مِلْكٌ: سے شربینی نے مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد آیات اور دلائل ہیں جو آسمانوں اور زمین میں توحید کے آفاقی عقلی دلائل ہیں: وَلِيَكُوْنَ: اس سے قبل معطوف علیہ مقدر ہے یعنی: يَسْتَدِلَّ: تاکہ مشرکین کا رد کرنے کے لیے اس کو دلیل بنائے: الْمُوْقِنِيْنَ: یقین اس علم کو کہا جاتا ہے کہ بندے کو دلیل سے حاصل ہو جائے اور اس میں کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝

"پھر جب اس پر رات چھا گئی تو اس نے دیکھا ایک تارا فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے یہ میرا رب ہے جب وہ غروب ہوا تو فرمایا میں محبت نہیں کرتا غروب ہونے والوں سے" [76]۔

تفسیر 76 جس تارے کی عبادت وہ کر رہے تھے وہ نمودار ہوا: هٰذَا رَبِّيْ: یہ سوال بطور انکار ہے کہ کیا یہ رب ہو سکتا ہے؟ یہ امام قرطبی کا قول ہے جیسا کہ سورۃ انبیاء آیت 34 میں ہے یا پھر یہ معنی ہے کہ یہ رب ہے تمہارے عقیدے کے لحاظ سے جیسا کہ سورۃ حم سجدۃ آیت 47 میں ہے اور جو یہ کہا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے عقیدۃً یہ بات کہی تھی پھر ان کو توحید کے دلائل ظاہر ہو گئے یا بطریقہ شک انھوں نے کہا تھا تو یہ دونوں قول غلط ہیں اس لیے کہ انبیاء کرام توحید پر ہمیشہ قائم ہوتے ہیں اور شرک سے ہمیشہ پاک ہوتے ہیں۔ اس بات کو ابن کثیر، قرطبی اور شربینی نے تفصیلاً تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ نبی توحید سے کبھی خالی نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ طریقہ بطور دلیل سمجھانے کیلئے اپنایا تھا۔ اس پر فَلَمَّا: میں حرف فاء دلالت کرتا ہے کہ انھوں نے دلائل دیئے اور شرک کو رد کرنے کے بعد یہ استدلال کیا ہے نیز اس پر یہ

بھی دلیل ہے کہ: وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ اور وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ: سورۃ انبیاء آیت 51 میں بھی ہے البتہ جو قصے کہانیاں بعض مفسرین نے اس مقام پر ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے تحریر کی ہیں وہ اسرائیلیات ہیں: أَفَلَ : چھپنا اور ظاہر ہونا عوارض ہیں اور جن پر عوارض آتے ہیں وہ الٰہ نہیں ہوسکتے ہیں اسی طرح جس پر موت آئے اور قبر میں دفن ہوجائے وہ معبود اور مددگار نہیں ہوسکتا: أَفَلَ : سے خاص لوگوں اوسط درمیانہ اور عوام کیلئے دلیل بنانا مفید ہے خواص لوگ اس سے امکان معلوم کرتے ہیں اور امکان سے پتا چلتا ہے کہ ہر ممکن محتاج ہوتا ہے اور محتاج معبود نہیں ہوسکتا اوسط لوگ اس سے حرکت معلوم کرتے ہیں اور متحرک حادث ہوتا ہے اور حادث الٰہ نہیں ہوسکتا ہے اور عام لوگ اس سے فہم حاصل کرتے ہیں کہ اس سے چھپنا ثابت ہوتا ہے اور چھپنے سے نور چلا جاتا ہے اور تبدیلی آجاتی ہے اور اللہ کے ایسے حالات نہیں ہوتے اور یہ استدلال تمام ممکنات اور حوادث کیلئے عام ہے جس میں تمام انسان تمام جنات اور تمام ملائک خواہ زندہ ہوں یا مردے بت ہو حجر شجر سب شامل ہیں اس اٰفِلِیْنَ ذکر کی ذوی العقول کی جمع ہے۔

فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ﴿٧٧﴾

"پھر جب اس نے ابھرتا ہوا چاند دیکھا تو اس نے کہا یہ میرا رب ہے پھر جب وہ غروب ہوا تو فرمایا مجھے اگر میرے رب نے ہدایت نہ دی تو میں گمراہ قوم میں سے ہوجاؤں گا" [77]۔

تفسیر 77 اس آیت میں چاند کی حالت وکیفیت سے دلیل پکڑنے کا ذکر ہے اور یہ اس رات کا چاند ہے جب ستاروں کے فوراً بعد نمودار ہوا ہو: بَازِغًا : بَزَغَ : اصل میں شق یعنی پھٹ جانے کو کہتے ہیں تو چاند سورج جب نکلتے ہیں تو اندھیرے پھٹ جاتے ہیں یعنی اس کی روشنی اندھیروں کو چیرتی ہے تو مراد طلوع ہوتا ہے: لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي: أُفُوْل کی دلیل تو پہلے ذکر ہوئی ہے تو اب اس جملہ میں تاروں اور چاند کی عبادت کا ذکر ہے کہ وہ ضلال (گمراہی) ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نہ تردد میں تھے اور نہ ہی گمراہ تھے بلکہ ہدایت پر قائم تھے اس میں اشارہ ہے کہ انبیاء کرام ہدایت میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

"پھر جب ابراہیم علیہ السلام نے سورج کو طلوع ہوتے دیکھا تو فرمایا یہ میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے پھر جب وہ غروب ہوا تو اس نے کہا اے میری قوم میں ان سے بیزار ہوں جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو" [78]۔

تفسیر 78 بَازِغَةً: سورج مؤنث ہے اس لئے مؤنث کا صیغہ ذکر کیا ہے۔ سوال: جب شمس مؤنث ہے تو ھذا مذکر کا صیغہ کیوں ذکر کیا ہے؟۔ جواب ۱: مؤنث سماعی میں قانون یہ ہے کہ اس میں مؤنث و مذکر صیغہ دونوں استعمال کرنا درست ہے۔ جواب ۲: امام کسائی نحوی کا قول ہے کہ: ھٰذَا الطَّالِعُ: کی تاویل سے پڑھا گیا ہے۔ جواب ۳: یہ ھٰذَا الضَّوْءُ کی تاویل سے ہوا ہے جواب ۴: یہ خبر کی رعایت سے ہوا ہے: ھٰذَآ اَكْبَرُ: جسم اور روشنی کے اعتبار سے بڑا ہے کیونکہ علمائے کرام نے عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ سورج زمین سے ایک سو چھیاسٹھ (166) گنا بڑا ہے، مشرکین کے نزدیک بھی الوہیت کے اعتبار سے بڑا تھا: یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ: یہاں پر بھی اَفُوْلْ: (پناہ ہونا) کی دلیل مقدم ذکر کی ہے۔ شرک سے براءت اور مشرکین سے بھی اس دلیل کی بناء پر اور تفریع ہے۔ فائدہ ۱: چونکہ چاند اور ستاروں کی عبادت رات کو کی جاتی ہے اس لئے وہاں شرک ظاہر نہیں ہوتا تو وہاں صرف: لَآ اُحِبُّ: فرمایا ہے اور: لَئِنْ لَّمْ یَھْدِنِیْ: پر اکتفا کیا ہے اور چونکہ سورج کی عبادت دن کو ہوتا ہے اس لئے اس کے ساتھ شرک سے بیزاری کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ فائدہ ۲: امام نیشاپوریؒ نے کہا ہے کہ کوکب میں عالم اجسام کی طرف اور قمر میں عالم نفوس کی طرف اور شمس میں عالم عقول مجردہ کی طرف اشارہ ہے یہ سب الوہیت کے قابل نہیں ہو سکتے ہیں۔

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝

"میں نے اپنا چہرہ اس کیلئے متوجہ کیا جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور توحید پر قائم اور پختہ ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں" [79]۔

تفسیر 79 شرک سے براءت کے بعد توحید کا ذکر ہے جیسا کہ کلمہ توحید: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ: میں ہے اس میں عقیدہ توحید کا اقرار اور شرک سے براءت ہے: اِنِّیْ وَجَّھْتُ: وجھی امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد: قَصَدْتُ بِعِبَادَتِیْ وَ تَوْحِیْدِیْ ہے یعنی اپنی عبادت اور توحید سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ارادہ کیا ہے: وَجْهٌ: سے مراد سارا بدن اور روح ہے: فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: اس میں تارے چاند اور سورج سب شامل ہیں کہ وہ سب مخلوق ہیں شریک کہتے ہیں کہ

حَنِيفًا: اصل میں میلان اور استقامت دونوں کو کہا جاتا ہے یعنی ہر باطل دین سے اعراض کرنے والا اور دین توحید پر پختگی سے قائم رہنے والا: مِنَ الْمُشْرِكِينَ: اس میں شرکی براءت کے بعد مشرکین کے گروہ سے اعلان براءت ہے

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ۚ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَن يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا ۗ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ۝

"اور اس سے اس کی قوم نے جھگڑا کیا تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم مجھ سے جھگڑتے ہو اللہ تعالیٰ کے بارے میں حالانکہ اس نے مجھ کو ہدایت دی اور میں نہیں ڈرتا ان سے جو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو مگر یہ کہ میرا رب کچھ چاہے میرے رب نے ہر چیز کو اپنے علم کے احاطے میں گھیر رکھا ہے کیا پھر بھی تم نصیحت حاصل نہیں کرتے" [80]۔

تفسیر 80 معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے قوم کے ساتھ شرک کی رد پر مناظرہ کیا تھا اور اس طرح کا مناظرہ کرنا جائز ہے۔وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ: ان کی طرف سے صرف مجادلہ یعنی جھگڑا تھا ان کے پاس کوئی حجت نہیں تھی اور ان کے جھگڑے کو مُحَاجَّةٌ: با اعتبار ظاہر کہا گیا ہے ان کا جھگڑا توحید میں تھا۔وَقَدْ هَدَانِ: اس سے مراد وہ دلائل ہیں جن کی طرف مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ: میں اشارہ ہوا تھا۔وَلَا أَخَافُ: یہ ان کے ایک قول کا جواب ہے انہوں نے کہا کہ ہمارے ان معبودوں سے ذرا ڈرو ایسا نہ ہو کہ تمہیں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے تمہیں پاگل بنا دیں یا پریشانیوں میں مبتلا کر دیں جیسے سورۃ زمر آیت 36 اور سورۃ ہود آیت 54 میں ہے۔إِلَّا أَن يَشَاءَ رَبِّي: یہ استثنیٰ منقطع ہے یعنی میرا رب اگر کوئی مصیبت مجھے پہنچائے تو وہ قادر ہے اس جملے کو اس لئے ذکر کیا کہ انسان کو زندگی میں کبھی کوئی مصیبت یا تکلیف پہنچے تو مشرکین اس کی نسبت اپنے باطل معبودوں کی طرف کرتے ہیں اس لئے یہ استثنیٰ کیا گیا تاکہ مومن کا عقیدہ پختہ رہے کہ یہ مصائب میرے رب کی جانب سے ہیں مشرکین کے اس خیال کو ختم کرنے کیلئے استثنیٰ کیا گیا ہے۔سورۃ اعراف آیت 79 میں بھی ہے۔وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا: اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں مخفی ہیں۔

وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا ۚ فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨١﴾

"اور میں کیونکر ڈروں ان سے جوتم نے شریک ٹھہرائے ہوئے ہیں جبکہ تم نہیں ڈرتے اس بات سے کہ تم شریک ٹھہراتے ہو اس کو کہ نہیں اس نے نازل کی اس پر کوئی دلیل لہٰذا دونوں گروہوں میں کون امن کا حقدار ہے اگر تم جانتے تو بتاؤ" [81]۔

تفسیر 81 ظاہر کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارے معبودوں کی توہین سے رک جاؤ ورنہ تمہیں نقصان پہنچا دینگے تو انہوں نے کہا کہ تم قادر ذات سے نہیں ڈرتے تو میں تمہارے بے جان بتوں سے کیوں ڈروں۔ أَشْرَكْتُمْ: امام سمعانیؒ نے اشراک کا معنیٰ اس طرح کیا ہے کہ غیر اللہ کو اس چیز میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرنا کہ اس میں کسی کا کوئی حق نہ ہو یعنی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہو: مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ: یہ قید مزید قباحت کے لئے ہے یعنی اس پر کوئی دلیل نہیں ہے تو کیسے نازل کریگا اور یہ دلیل ہے کہ توحید کے مسئلہ میں قیاس نہیں چلتا بلکہ اس میں دلیل منزل چاہیے اس کے بغیر کوئی دلیل نہیں چلے گی اس طرح قید سورۃ آل عمران 151، سورۃ یوسف آیت 40، سورۃ نجم آیت 23، سورۃ اعراف آیت 33، سورۃ حج آیت 31، سورۃ روم آیت 35 میں بھی ہے: اَلْفَرِيقَيْنِ: مراد مشرکین اور موحدین ہیں: اَمْن: سے مطلق: اَمْن: مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا عذاب دنیاوی ہو یا اخروی: اَمْن: اس جگہ بے فکری کو نہیں کہا جا سکتا۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ ﴿٨٢﴾ ع

"وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور خلط ملط نہیں کیا ظلم (شرک) کے ساتھ یہی لوگ ہیں ان کیلئے (عذاب سے) امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں" [82]۔

تفسیر 82 یہ اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے سابقہ آیت کا جواب ہے۔ اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے جیسے صحیح بخاری کتاب الایمان حدیث 32 / 4629 کتاب الایمان صحیح مسلم حدیث 124 میں ہے اور سورۃ لقمان آیت 13 میں ہے اس آیت سے معلوم ہوا کہ بعض لوگ ایمان لانے کے بعد اس کے ساتھ شرک بھی ملا لیتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کو ماننے رسول اور قرآن کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن نبی اور ولی وغیرہ کو حاجت روائی کیلئے پکارتے ہیں اس کو غیب دان عالم الغیب مختار کل مشکل کشا مانتے ہیں تو اس شخص کے ایمان کا اعتبار نہیں ہے بلکہ یہ مشرک ہے جیسا کہ سورۃ یوسف آیت 106 میں ہے۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾

"اور یہ ہے ہماری دلیل دی تھی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کی قوم کے مقابلے میں ہم درجات بلند کرتے ہیں جس کو ہم چاہتے ہیں یقیناً آپ کا رب حکمت والا خوب جاننے والا ہے" [83]۔

تفسیر 83 یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ سابقہ کلام جو: قَالَ هٰذَا رَبِّيْ: سے مُّهْتَدُوْنَ: تک ہے یہ قوم کے مقابل بطور حجت ابراہیم علیہ السلام کا ہے: اٰتَيْنٰهَآ: بطریقہ وحی ہے: عَلٰى قَوْمِهٖ: ابراہیم علیہ السلام کے سمجھانے کیلئے نہیں بلکہ قوم کے خلاف حجت قائم کرلے کے لئے ہے: نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ: اس طرح سورۃ یوسف آیت 76 میں ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ سورۃ یوسف میں درجات کی بلندی، علم تدبیر وسیاست اور دنیا کی تکالیف دور کرنے کا سبب تھا جبکہ اس سورۃ میں دلائل کا علم برائے حجت و استدلال اور آخرت کی تکالیف سے نجات کیلئے سبب اور رفع حاجت کا سبب بنا ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾

"اور عطاء کیے ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب علیہما السلام ہر ایک کو ہم نے سکھائی تھی (توحید) اور اس سے پہلے ہم نے نوح علیہ السلام کو سکھایا تھا اور اس کی اولاد میں سے داؤد علیہ السلام کو اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں احسان کرنے والوں کو" [84]۔

تفسیر 84 اس آیت میں (17) سترہ انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر خیر ہے کہ ان سب کا توحید پر عقیدہ تھا اور اسی عقیدے کی تبلیغ کیلئے وہ چن لئے گئے تھے لہٰذا یہ اجماعی اور متفقہ عقیدہ اور مسئلہ ہے یہ دلیل نقلی ہے پھر ان کے الگ الگ صفات تھیں۔ (۱) ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور نوح علیہم السلام انبیاء کرام کے آباء ہیں۔ (۲) داؤد اور سلیمان علیہما السلام بادشاہ تھے۔ (۳) ایوب اور یوسف علیہما السلام پر بہت تکلیفیں گزری ہیں۔ (۴) موسیٰ وہارون علیہما السلام نے کثرت سے معجزات پیش کئے تھے۔ (۵) زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس علیہم السلام بہت ہی زاہد تھے۔ (۶) اسماعیل، یسع، یونس اور لوط علیہم السلام کے ایمان لانے والے ساتھی اور امتی بہت کم تھے البتہ یونس علیہ السلام پر بعد میں کثیر تعداد میں لوگ ایمان لائے تھے۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ انبیاء کرام سرداری اور سربراہی اور بادشاہت کے حالات میں مصیبتوں کے حالات میں تنگی وسختی

کے حالات میں حالات زہد میں اور ساتھیوں کے کم ہونے کے حالات میں عقیدہ توحید پر مضبوطی سے قائم رہے اور اس عقیدے کو ہمیشہ تھامے رکھا: هَدَيْنَا: اس سے توحید کی وحی اور اس پر قائم رہنا مراد ہے: ذُرِّيَّتِهٖ: یہ ضمیر نوح علیہ السلام کی طرف راجع ہے کیونکہ یونس اور لوط علیہما السلام اولاد ابراہیم میں سے نہیں تھے: اَيُّوْبَ: اس پر صرف امتحانات آئے تھے۔ یوسف پر امتحانات اور نعمتیں دونوں جمع ہوگئی تھی: وَكَذٰلِكَ: جس طرح ابراہیم علیہ السلام کو توحید پر مضبوط ہونے کی وجہ سے جزا ملی یعنی درجات کی بلندی اور امامت وغیرہ تو ہر توحید والے کو اسی طرح اللہ تعالیٰ نعمتوں سے نوازتا ہے نَجْزِي: سے نبوت مراد نہیں ہے کیونکہ نبوت کسب سے نہیں ملتی۔

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿85﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿86﴾

"اور زکریا یحییٰ عیسیٰ والیاس علیہم السلام سب صالحین میں سے تھے [85]۔ اور اسماعیل اور یسع اور لوط اور یونس علیہم السلام کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے لوگوں پر فضیلت دی تھی" [86]۔

تفسیر 86,85 ان چار نبیوں کی فضیلت سے لوگ بے خبر تھے اس لئے کہ وہ غیر معروف تھے اس لئے ان کی فضیلت ذکر کی گئی اور اس سے انبیاء کی ملائکہ پر یہ فضیلت کی دلیل لی گئی ہے۔ فائدہ ۱: عیسیٰ علیہ السلام کو نوح یا ابراہیم علیہما السلام کی اولاد میں شمار کیا گیا ہے حالانکہ ان کا باپ ہی نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ بیٹیوں کی اولاد بھی اقارب میں شامل ہے۔ امام قرطبی نے اس میں اختلاف کی تفصیل ذکر کی ہے۔ فائدہ ۲: الیسع الیاس کے ساتھی ہیں اور زکریا علیہ السلام سے قبل گزرے ہیں اور ان کو ابن اخطوب بن العجوز کہا گیا ہے۔ ان کے دیگر احوال معلوم نہیں ہیں۔

وَمِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿87﴾

"اور ان کے آباء و اجداد میں سے کچھ کو، اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے، اور ہم نے ان کو چن لیا، اور ہم نے ان کو سیدھی راہ کی ہدایت دی" [87]۔

تفسیر 87 اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سب نبیوں کے باپ بیٹے اور بھائی تھے بلکہ جن کے تھے تو ان میں سے بعضوں کو یہ مقام دیا گیا ہے اس لیے کہ من برائے تبعیض ہے اور یہ: وَكُلًّا فَضَّلْنَا: پر یا وَنُوْحًا: پر عطف ہے انسان کی قرابت کے اس میں تین شعبے مذکور ہیں جن کو عصبات کہتے ہیں: وَاجْتَبَيْنٰهُمْ جبی: اصل میں جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ اس سے

مراد چنا و انتخاب ہے انسان بہترین چیز اپنے پاس جمع کرتا ہے لہٰذا اجتباء میں ان کی صفات ذاتیہ لازمہ کی طرف اشارہ ہے اور: وَهَدَيْنٰهُمْ: میں نبوت کے علوم اور معجزہ کی صفات کی طرف اشارہ ہے۔ معلوم ہوا کہ انبیاء کرام کا راستہ صراط مستقیم ہے۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ؀

”یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے وہ اس کی ہدایت دیتا ہے جسے وہ چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو ضرور وہ سب کچھ برباد ہو جاتا جو کچھ وہ کرتے تھے“ [88]۔

تفسیر 88 اس آیت سے معلوم ہوا کہ شرک سے نبی کے اعمال بھی برباد ہو جاتے ہیں تو کسی اور کے عمل کی کیا حیثیت ہوگی: ذٰلِكَ: میں ہدایت کی طرف اشارہ ہے جو هَدَيْنَا: اور وَهَدَيْنٰهُمْ: میں مذکور ہے اور یہ بھی اشارہ ہے کہ انبیاء ہدایت میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں: وَلَوْ اَشْرَكُوْا: اس میں شرک کی قباحت کا ذکر ہے معلوم ہوا کہ سابقہ ذکر شدہ ہدایت توحید پر مضبوطی کے معنی میں ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہدایت کی بنیاد توحید ہے: وَلَوْ: یہ شرط ہے اور شرط میں قانون یہ ہے کہ اس کا واقع ہونا لازم نہیں ہوتا۔ اس طرح سورۃ زمر آیت 65 میں بھی ہے۔

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ؀

”یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتابیں دیں اور مضبوط دین اور نبوت دی اگر اس مسئلہ سے لوگ انکار کریں تو یقیناً ہم نے اس کی توفیق ایسی قوم کو دی ہے جو اس سے انکار کرنے والے نہیں ہیں“ [89]۔

تفسیر 89 اس میں: هُدَى اللّٰهِ: کی تفصیل ہے۔ کتاب سے جنس کتب مراد ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب کو کتابیں دی گئی ہوں بلکہ ایک نبی سے دوسرے نبی کو ورثہ میں جو کتاب ملتی ہے اس کو بھی: اٰتَيْنٰهُمُ: شامل ہے: وَالْحُكْمَ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی اور رسول کو کتاب کے علاوہ بھی وحی کی ہے جس کو حکمت و سنت کہا گیا ہے: فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا: اس میں اشارہ ہے کہ جو دین اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے وہ حفاظت میں کسی کا محتاج نہیں ہے: هٰٓؤُلَاۗءِ: سے مراد قرآن کے مخاطب کافر ہیں اور: قَوْمًا: سے مراد سابقہ انبیاء، ملائکہ، انصار، مہاجرین اور ہر زمانہ کے موحدین مراد ہیں یہ اقوال امام قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کیے ہے۔

أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ هَدَى ٱللَّهُ ۖ فَبِهُدَىٰهُمُ ٱقْتَدِهْ ۗ قُل لَّآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَٰلَمِينَ ﴿٩٠﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے لہٰذا آپ ان کے طریقہ کی اقتداء کریں فرما دیجئے میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا یہ تو صرف جہانوالوں کیلئے نصیحت ہے" [90]۔

تفسیر 90 یہ آیت دلیل ہے کہ تمام نبیوں کا دین ایک ہی ہے صرف بعض فروع میں فرق ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ دین پر اجرت نہ لینا سب نبیوں کا طریقہ تھا: أُولَٰٓئِكَ: یہ آیت دلیل ہے کہ انبیاء کرام گناہوں سے پاک ہیں خصوصاً گمراہی سے مبرا ہیں اور یہ بھی اشارہ ہے کہ ہدایت انبیاء کے طریقہ میں منحصر ہے: فَبِهُدَىٰهُمُ: اس سے مراد تمام اصول، عقائد، اخلاق اور دعوتی طریقے ہیں جو انبیاء کرام میں متفق ہیں اور فروع میں وہ مراد ہیں جو ان کے دین کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ سابقہ انبیاء کرام کے جملہ فضائل اخلاق وکمالات ہمارے نبی میں مجتمع ہیں یعنی: هُدَىٰهُمُ: میں نوح علیہ السلام کا صبر اور دعوت میں ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ بطور استدلال اور حجت اسحاق اور یعقوب کا مصیبتوں پر صبر، داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا نعمتوں پر شکر۔ ایوب علیہ السلام کا بیماریوں پر صبر، یوسف علیہ السلام کا حاسدین کے حسد پر صبر اور موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی کثرت معجزات اور بڑے سرکش (فرعون) سے مقابلہ کرنا اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس علیہم السلام کا دنیا سے بے رغبتی یعنی زہد۔ اسماعیل علیہ السلام کا صدق اور بوقت سختی و پریشانی یونس علیہ السلام کی عاجزی ان تمام امور کو هُدَىٰهُمُ: کہا ہے یہ تمام فضائل وخوبیاں آخری نبی میں موجود تھیں لہٰذا یہ آپ ﷺ کیلئے تمام نبیوں پر فضیلت کی دلیل ہے۔ اقتداء سابقہ شخص کی پیروی بعد والے شخص کیلئے اقتداء کہلاتی ہے یہ قول فعل میں ہو اور اس پر دلیل مستقل بھی ہو اور اتباع فقط عمل میں دلیل کے ساتھ موافقت اور مطابقت ہے جبکہ تقلید بغیر دلیل کسی کے پیچھے چلنے کو کہتے ہیں جو کہ مذموم ہے۔ سوال: ان کی اقتداء کرنے پر حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نبی افضل نہیں ہیں۔ جواب: اقتداء کا جو معنیٰ گزر گیا ہے اس سے صرف متوخر ہونا ثابت ہوتا ہے سابق کی افضلیت پر دلالت نہیں کرتا ہے جیسا کہ نبی کریم نے ابوبکر کی نماز میں اقتداء کی یا صحابہ کرام کی نماز میں اقتداء یا تابعین کے پیچھے۔ فائدہ: یہ دلیل ہے کہ سابقہ شریعت ہمارے لیے حجت ہے جب تک ہماری شریعت میں کوئی تخصیص یا ملسوخیت ثابت نہ ہو یہی وجہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۃ ص میں سجدہ کرتے ہوئے اس آیت کو دلیل بنایا تھا جیسا کہ (صحیح بخاری کتاب سجود القرآن حدیث 1069 میں ہے: قُل لَّآ أَسْـَٔلُكُمْ جب: هُدَىٰهُمُ: میں بڑا مقصد دعوت کا طریقہ ہے تو ان دونوں جملوں میں دعوت کے دو ارکان کا ذکر

ہے۔

(1) اخلاص، (۲) امانت جیسا کہ انبیاء کی صفت دعوت میں ناصح امین آیا ہے: قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ: انبیاء کرام پر دعوت وتبلیغ فرض عین ہے اس لیے ان پر اجرت لینا حرام ہے اور جن پر دعوت فرض عین نہ ہو ان کے لینے میں اختلاف ہے یہ حکم تو نبیوں کی دعوت میں مذکور ہے جیسے سورۃ شعراء 109، 127، 145، 163 اور 180: ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ: عالمین سے مراد قیامت تک آنے والے انس وجن ہیں تو معلوم ہوا کہ ہمارے نبی کی رسالت قیامت تک ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰي نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿91﴾

"اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر اس طرح نہیں کی جیسے قدر کرنے کا اس کا حق ہے جب انہوں نے کہا نازل نہیں کی اللہ تعالیٰ نے بشر پر کوئی چیز فرما دیجئے کس نے نازل کی کتاب وہ جو موسیٰ علیہ السلام لیکر آئے کہ وہ نور و ہدایت تھی لوگوں کے لیے اس کو ٹکڑے ٹکڑے اس سے ظاہر کرتے ہو کچھ اور چھپاتے ہو زیادہ اور تمہیں وہ کچھ سکھایا گیا جو تم نہیں جانتے تھے فرما دیجئے اللہ تعالیٰ نے نازل کی پھر ان کو اپنی مشغولیت میں رہنے دو تاکہ کھیلتے رہیں" [91]۔

تفسیر 91 اس آیت سے آیت 104 تک پانچواں باب ہے اس میں تین زجر ہیں 91، 93 اور 100 اور آیت 92 میں قرآن کی طرف ترغیب ہے آیت 94 میں تخویف اخروی ہے پانچ عقلی دلائل ہیں اور توحید کے بیان پر تفریع (14) جملوں میں ذکر ہوا ہے: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ: ربط: منکرین نے کہا کہ آپ انبیاء کی اقتداء کرتے ہیں تو مشرکین اور اکابرین اہل کتاب کی اقتداء کیوں نہیں کرتے؟ تو جواب ہوا کہ یہ اللہ کی قدر نہیں کرتے لہٰذا یہ اقتداء کے قابل نہیں ہیں اور اس آیت میں ان لوگوں کیلئے وعید ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب سے انکار کرتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی بے قدری اور توہین اور رحمت الٰہی سے انکار ہے جو کتاب کے نزول اور نبی کی بعثت سے انکار کرتے ہیں۔ اس طرح سورۃ حج آیت 74 میں بھی ہے وہاں بے قدری سے مراد اللہ تعالیٰ کی ہر چیز پر قدرت رکھنے والی ذات کے ساتھ کمزور بے بس مخلوق کو شریک بنانے کے معنی میں ہے۔ سورۃ زمر آیت 67 میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت سے انکار کے معنی میں ہے: وَمَا قَدَرُوْا: معرفت تعظیم اور توصیف کے معنی میں ہے: حَقَّ قَدْرِهٖ: فعل سابق کے مصدر کی طرف کامل معنی کیلئے حق کے اضافت کی گئی ہے: اِذْ قَالُوْا: اس

میں بے قدری کی تفصیل کا ذکر ہے اس طرح سورۃ یٰسین آیت 15 میں بھی ہے :مَنۡ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ: انہوں نے سلب کلی کیا تو جواب میں ایجاب جزئی کیا گیا جو کہ کافی ہے یہ الزامی جواب ان کے قول کا توڑ ہے:نُوۡرًا: دلائل ہیں: وَّھُدًی: حکمتیں ہیں :تُبۡدُوۡنَھَا: جو بات اور مسئلہ ان کی خواہش کے مطابق ہوتا تو اس کو بیان کرتے اور جو خلاف ہوتا اس کو چھپا لیتے اس آیت سے معلوم ہوا کہ بلاضرورت اللہ تعالیٰ کی کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا منع ہے جیسے کہ امام قرطبیؒ نے لکھا ہے :وَعُلِّمۡتُمۡ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے وہ علوم حاصل ہوتے ہیں جو انسان کے دسترس سے دور ہوتے تھا:نُوۡرًا: پر عطف ہے :اَللّٰہُ: مفرد مراد نہیں ہے بلکہ :اَنۡزَلَ اللّٰہُ: فعل مقدر ہے ابن کثیر نے مفرد ذکر کرنے کا رد کیا ہے: ثُمَّ ذَرۡھُمۡ :یہ قُلِ پر عطف ہے یہ منکرین پر الزام کے بعد زجر ہے:یَلۡعَبُوۡنَ: یہ امر کے طور پر نہیں ہے بلکہ ان کا حال ذکر ہوا ہے یا اس میں مراد استہزاء اور تمسخر ہے۔ سوال: اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے مالک بن سیف کا واقعہ ذکر کیا ہے وہ یہودیوں کے امام تھے حالانکہ یہ سورۃ مکی ہے؟۔ جواب: بعض علماء کا قول ہے کہ یہ آیت مدنی ہے جبکہ بعض نے کہا ہے کہ مالک بن سیف مکہ گئے تھے تو یہ واقعہ پیش آیا جیسا کہ امام سمعانی نے ذکر کیا ہے اور یہ :یَجۡعَلُوۡنَ: میں خطاب پر بنا ہے یا جواب یہ ہے کہ :وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ: میں مشرکین مکہ مراد ہیں اور چونکہ وہ یہود کے علماء کی تقلید کرتے تھے اس لیے ان سے خطاب ہوا کہ قُلۡ فَاسۡئَلُوۡا اَھۡلَ الۡکِتَابِ یہ غائب کی قراءت پر بنا ہے۔

وَھٰذَا کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ مُبٰرَکٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ لِتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَ مَنۡ حَوۡلَھَا ؕ وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ وَ ھُمۡ عَلٰی صَلَاتِھِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ﴿۹۲﴾

"اور یہ کتاب ہم نے اسے اتارا بابرکت تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے تھیں اور تاکہ آپ مکہ والوں اور اس کے آس پاس والوں کو ڈرائیں اور وہ لوگ جو آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں اور اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں"[92]۔

تفسیر 92 تورات کے ذکر کے بعد اس آیت میں پانچ صفات کے ذریعے قرآن کی ترغیب دی گئی ہے یعنی تورات کو منزل کتاب مانتے ہو تو پھر اس قرآن کو منزل مانو :مُبٰرَکٌ: امام نیشاپوری کا قول ہے کہ اس کا خیر اور فائدہ بہت زیادہ ہے اور اچھے کاموں کا سبب ہے اور منکرات سے منع کرنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ جاری وساری ہے کہ جو قرآن کا علم حاصل کرتا ہے اور اس پر عمل کرنا شروع کرتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ عزت دیتا ہے وہ دنیاوی زندگی اور آخرت میں سعادت

حاصل کریگا یہ بات آزمائی گئی ہے جو صحیح ثابت ہوئی ہے۔ مصدق اس لیے کہ توحید اور اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے، خوشخبری اور وعید پر مشتمل ہے اور یہی عنوان سابقہ کتب سماوی میں ہے۔ وَلِتُنْذِرَ: یہ مبارک کے معنی پر عطف ہے۔ اُمَّ الْقُرٰی مفسر شربینی نے کہا ہے کہ یہ ساری بستیوں کا قبلہ ہے اور یہ عظمت اور شان والا ہے یا پھر یہ ساری زمین اس کے گرد ہے یا لوگوں کی عبادت کیلئے سب سے پہلا گھر ہے۔ وَالَّذِیْنَ: وجہ یہ ہے کہ جب بندہ آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو نجات کیلئے غور وفکر کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہ نبی اور قرآن پر ایمان لاتا ہے: وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ: اس کو خاص ذکر کیا ہے اس لیے کہ یہ ایمان کی علامت ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾

"اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے یا وہ کہے کہ میری طرف وحی کی گئی حالانکہ اس کی طرف کچھ بھی وحی نہیں کی گئی ہے اور جس نے کہا کہ میں بھی ابھی اتار لاؤنگا اس کی مثل جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اور کاش اگر آپ دیکھیں جب ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوتے ہیں اور ملائکہ اپنے ہاتھ ان کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھاتے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں آج تم ذلت کے عذاب کا بدلہ دیئے جاؤ گے بوجہ اس کے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ناحق باتیں کہتے تھے اور اللہ کی آیاتوں سے تکبر کرتے تھے" [93]۔

تفسیر 93 قرآن مجید کی سچائی بیان کرنے کے بعد تین قسم کے ظلموں پر توبیخ کی گئی ہے۔ (۱) اِفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: اللہ تعالیٰ کی کتاب میں لفظی اور معنوی تحریف کرنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف شرک کی نسبت کرنے کے ذریعے۔ (۲) اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کے ساتھ نبوت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں:۔ (۳) قرآن جیسی کتاب اتارنے کا دعویٰ کرتے ہیں جو الوہیت اور قدرت کاملہ کا دعویٰ ہے اور ذات رب العلمین کا خاصہ ہے۔ سورۃ انفال آیت 31 میں بھی اس طرح ہے۔ الظّٰلِمُوْنَ: یہ مذکورہ تینوں ظلموں پر مشتمل ہے۔ امام قرطبی نے ارشاد فرمایا کہ اس میں وہ صوفیا بھی شامل ہیں جو کتاب وسنت اور سلف صالحین کے طریقے سے اعراض کرتے ہیں اور احکام کے علم سے دل کی پاکی مراد لیتے ہیں اور دلیل کے طور پر خضر علیہ السلام کا علم پیش کرتے ہیں تو یہ زندیقیت اور کفر ہے: غَمَرٰتِ الْمَوْتِ: برزخ اور قیامت کی راحت سے قبل سکرات الموت کے وقت

کا حال بیان ہو رہا ہے: بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ: ان کی ارواح قبض کرنے کیلئے انہوں نے ہاتھ بڑھائے ہونگے: اَخْرِجُوْٓا:
یہ بطور ڈانٹ ہے کہ جلدی کرو روح نکالو حالانکہ خود وہ اپنی روح نکالنے پر قادر نہیں ہونگے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ان کو
مارنے کیلئے انہوں نے ہاتھ بڑھائے ہونگے: اَخْرِجُوْٓا: اپنی جانوں کو عذاب سے بچاؤ۔ اَلْيَوْمَ: اس سے برزخ یا
قیامت کا عذاب مراد ہے: غَيْرَ الْحَقِّ: پہلی دونوں قسموں کی طرف راجع ہے: وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ: یہ تیسری قسم کی
طرف راجع ہے: اَلْهُوْنِ: جب وہ تینوں دعوے تکبر کی وجہ سے ہیں تو سزا بھی سخت ذلت اور اہانت کے ساتھ ہے۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ
شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۗ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿94﴾ ع

"بے شک تم ہمارے پاس آئے اکیلے جس طرح کہ ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا پیٹھ پیچھے
چھوڑ آئے ہو اور ہم تمہارے ساتھ نہیں دیکھتے تمہارے وہ سفارشی جن کے متعلق تم گمان کرتے تھے کہ وہ تمہارے معاملات
میں شریک (حصہ دار) ہیں تمہارے درمیان تعلق ٹوٹ گیا اور تم سے گم ہوگئے وہ (معبود) جن کے متعلق تم گمان
کرتے تھے" [94]۔

تفسیر 94 اس آیت میں تکبر کے اسباب کے زوال کا ذکر ہے جو کہ تین ہیں پہلا (۱) گروہ پیر و کار مرید وغیرہ۔
(۲) دوسرا مال جائیداد تعریفیں وغیرہ۔ (۳) پیر مددگار: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا: یہ اس پہلا اس یہ: اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: پر عطف
ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کا مستقل کلام ہے برزخ میں یہ گفتگو ہوگی یا آخرت کا خوف مراد ہے جسمیں پانچ حالتوں کا ذکر ہے۔
فرادیٰ اکیلے یعنی مال دولت، اولاد، پیروکار، مرید، مقلدین، شاگرد وغیرہ کے بغیر: مَّا خَوَّلْنٰكُمْ: دنیا کی وہ نعمتیں کہ اس
نے بندوں کو ان سے نوازا ہے۔ غلام اولاد، مال، جائیداد، بادشاہت کارخانے وغیرہ: وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ: یعنی جو چیز پیچھے
رہ جاتی ہے اس سے فائدہ نہیں لیا جاسکتا بلکہ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے سے بھی گردن رک جاتی ہے: شُفَعَآءَكُمْ: اس
سے وہ پیر بزرگ مراد ہیں جن سے وہ دنیا میں مدد اور حاجتیں طلب کرتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ صفات میں اللہ
تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں شریک ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ حصہ دار بنایا ہے: فِيْكُمْ: یعنی وہ تمہارے مال اور
اولاد میں حصہ دار تھے یعنی ان کے نذرانے اور چڑھاوے کرتے تھے نیز اس آیت میں بزرگوں سے متعلق شفاعت
شرکیہ کا رد ہے: بَيْنَكُمْ: آپس کی محبت پیری مریدی کا تعلق منقطع ہوجائیگا اور یہ ان کے خیال و گمان کے خلاف ہوگا:

بَيۡنَكُمۡ: یہ اضداد میں سے ہے جو فصل وصل دونوں پر منطبق ہوتا ہے یہاں حالت نصب میں ہے یعنی: وَمَا بَيۡنَكُمۡ مِنَ الۡوَصۡلِ جیسے سورۃ بقرہ آیت 196 میں ہے جبکہ رفع کے ساتھ: تَّقَطَّعَ: کا فاعل ہوگا: وَضَلَّ: یہ ماقبل سے تزا ہے۔ مراد یہ ہے کہ انکی جدائی علیحدگی نہ بھی ہو تب بھی ان کا مقصد حاصل نہ ہوگا: ضَلَّ: برباد ضائع ہونے کے معنی میں ہے اور: مَا كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ: سے مراد شرک اور شفاعت کا عقیدہ ہے یا معنی غائب ہوتا ہے یا: مَا كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ: سے مراد شرکاء ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَالنَّوٰى ‌ؕ يُخۡرِجُ الۡحَـىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَمُخۡرِجُ الۡمَيِّتِ مِنَ الۡحَـىِّ‌ ؕ ذٰ لِكُمُ اللّٰهُ‌ فَاَنّٰى تُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۹۵﴾

"یقینا اللہ تعالی پھاڑنے والا ہے دانے اور گٹھلی کو وہ نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور وہ نکالنے والا ہے مردہ کو زندہ سے یہ ہے اللہ تعالی پھر تم کہاں پھرے جاتے ہو" [95]۔

تفسیر 95 یہ توحید اور بعث بعد الموت کے اثبات پر دلیل عقلی ہے: حَبّ: غلہ جات کے دانے کو اور: النَّوٰى پھلوں کے (گٹھلی) بیج کو کہتے ہیں حبۃ کی جمع حب ہے اور نواۃ کی جمع نوی ہے ہر دانے اور بیج کو شامل ہے اور فالق سے مراد یہ ہے کہ اس کو زمین میں پھاڑ کر اس سے کونپل نکالتا ہے یا دانے اور گٹھلی کو بنانے کے بعد اس کے درمیان چیر لگایا ہے: يُخۡرِجُ: یہ ماقبل کی تفسیر ہے اس لیے عطف نہیں کیا ہے اس لیے کہ حی اور میت سے مراد خشک دانوں اور گٹھلیوں سے سبز پودے نکالنا ہے اسی طرح سبز پھلوں اور درختوں سے خشک دانے اور بیج نکالنا مراد ہے عالم سے جاہل اور جاہل سے عالم پیدا کرنا موحد سے مشرک اور مشرک سے موحد پیدا کرنا زندہ انسان یا حیوان سے نطفہ انڈہ جو مردہ ہے اور پھر اس سے بچہ پیدا کرنا جو کہ زندہ ہے یہ سب اس میں داخل ہیں: وَمُخۡرِجُ: یہ فالق پر عطف ہے اس لیے کہ: يُخۡرِجُ الۡحَـىَّ فَالِقُ کیلئے تفسیر تھی جبکہ: وَمُخۡرِجُ الۡمَيِّتِ۔ فَالِقُ: کیلئے تفسیر نہیں ہے اس لیے اس کو اسم فاعل ذکر کیا اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کو یخرج پر عطف کر لیا جائے کیونکہ یہ اسم مشابہ ہے فعل کے ساتھ پھر حی (زندہ) اشرف ہے میت سے تو اس کو فعل کے ساتھ ذکر کیا ہے دلالت کرتا ہے کہ اس فعل پر فاعل کی توجہ ہے: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ: یہ دلیل کا نتیجہ ہے یعنی یہ تصرف نہ تو طبعی (نیچرل) ہے نہ زمانے کی وجہ سے ہے اور نہ ہی مادہ یا کسی ولی اور بزرگ میں یہ قوت ہے بلکہ صرف اللہ تعالی ہی یہ تصرفات کرتا ہے۔

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٩٦﴾

"صبح کی (سفیدی) روشنی نمودار کرنے والا ہے اور اس نے رات کو سکون کا ذریعہ بنایا اور چاند اور سورج کو حساب کا ذریعہ بنایا یہ سب اندازہ ہے نہایت غالب اور خوب جاننے والے کا" [96]۔

تفسیر 96 زمین کے احوال اور دلائل ذکر کرنے کے بعد اب آسمانی احوال اور دلائل کا ذکر ہے: فَالِقُ الْاِصْبَاحِ یعنی رات کو چیرتا ہے اور اس سے دن کی روشنی لے آتا ہے۔ یعنی فَالِقُ ظُلْمَةُ اللَّيْلِ بِالْاِصْبَاحِ. اِصْبَاحٌ: مصدر ہے یا اصباح صبح کے معنی میں ہے امام نیشاپوری کے بقول فالق مظہر کے معنی میں ہے: وَجَعَلَ: چونکہ سابقہ اسم فاعل میں فعلی معنی مراد تھا تو اس پر عطف صحیح ہے: سَكَنًا: یعنی وقت السکون: حُسْبَانًا: کو مقرر حساب کے ساتھ چلتے اور گھومتے ہیں یا مہینوں سالوں اور دنوں کے حساب کے لیے یا مارنے کے معنی میں ہے: تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ: اس میں اشارہ ہے کہ تقدیر کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٩٧﴾

"اور وہی ہے جس نے بنائے تمہارے لیے تارے تاکہ تم ان کے ذریعے راہ پاؤ خشکی اور تری میں بیشک ہم نے کھول کر بیان کیں آیتیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں" [97]۔

تفسیر 97 یہ بھی عقلی دلیل ہے اس کو چاند اور سورج سے الگ ذکر کیا ہے کیونکہ اس کے فائدے اس سے الگ ہیں۔ لِتَهْتَدُوْا: اس میں ایک فائدے کا ذکر ہے اور مزید دو فائدے سورۃ ملک آیت 5 میں ہیں یعنی آسمانوں کی زینت اور شیاطین کو مارنا: قَدْ فَصَّلْنَا: اس میں تفصیل یعنی الگ الگ وضاحت مراد ہے: يَّعْلَمُوْنَ: یعنی جو طریقہ استدلال جانتا ہو اور چونکہ یہ مستقل علم ہے اس لیے: يَعْلَمُوْنَ: فرمایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿٩٨﴾

"اور وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا پس تمہارے لئے ایک قرارگاہ اور ایک سونپنے کی جگہ ہے اور تحقیق ہم نے مفصل بیان کیں آیتیں ان لوگوں کیلئے جو سمجھتے ہیں" [98]۔

تفسیر 98 یہ بھی دلیل عقلی نفسی ہے: فَلَكُمْ فَمُسْتَقَرٌّ (۱) والد کی پیٹھ، (۲) دن کو پھیرنا، (۳) دنیاوی زندگی۔ مستودع۔ (۱) ماں کا رحم (۲) رات کی آرام گاہ (۳) برزخ میں جگہ یہ الفاظ ان سب معنوں میں مشترک ہیں اور اس

کے لیے چونکہ گہرے علم کی ضرورت ہے اس لیے: یَّفْقَهُوْنَ: فرمایا کیونکہ سارے انسانوں کی پیدائش ایک باپ آدم علیہ السلام سے ہے اور استقرار اور استیداع کے احوال باریک گہرے علم کا تقاضہ کرتے ہیں جس کو فقہ کہتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿99﴾

"اور وہی ہے جس نے اتارا آسمان سے پانی پھر ہم نے نکالے اس کے ذریعے ہر قسم کے نباتات پھر اس سے نکالا ہم نے سبزہ ہم نکالتے ہیں اس سے باہم جڑے ہوئے دانے اور کھجوروں سے ان کے شگوفے جھکے ہوئے گچھے اور انگوروں کے گچھوں اور زیتوں کے باغات نکالے اور انار کہ ملتے جلتے ہیں اور نہیں ملتے دیکھو اس کے پھل کو جب وہ پھل لائے اور اس کے پکنے کو بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو ایمان لاتی ہے" [99]۔

تفسیر 99 یہ بھی دلیل عقلی وحسی ہے اس میں انسان کی تربیت کی پانچ چیزوں کا ذکر ہے (حَبّ)۔(۱) غذا کیلئے اناج (۲) کھجور غذا اور پھل بھی ہے اس میں دونوں فائدے ہیں۔(۳) (اَعْنَاب: انگور) پھل حلال مشروبات کیلئے، (۴) زیتون تیل کیلئے اور پھل بھی ہے، (۵) انار پھل اور دوا ہے یہ تربیت کے اصول ہیں: مِنَ السَّمَآءِ: سماء سے بادل مراد ہے اور مِنْ ابتدائیہ ہے یا سماء اپنے معنی میں ہے اور مِنْ: بمعنی جانب ہے۔ بہ میں (بَا) سببیہ ہے اور یہ عالم اسباب میں سے ایک سبب ہے اور مسببات مختلف پودے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت کی دلیل ہے: كُلِّ شَيْءٍ: زمین سے اگنے والی تمام نباتات مراد ہیں مِنْهُ: کی ضمیر نباتات یا مَآءً: کی طرف راجع ہے: خَضِرًا: تمام سبز پودے: مُتَرَاكِبًا اس سے گندم مکئی اور جو وغیرہ کی بالیاں مراد ہیں: وَمِنَ النَّخْلِ: خبر مقدم ہے: مِنْ طَلْعِهَا: اس سے بدل ہے: قِنْوَانٌ مبتداء موخر ہے: طَلْع: کھجور کے پھل کی ابتدائی شکل اس کو کفری بھی کہتے ہیں: قِنْوَانٌ: تثنیہ کی صورت میں قِنْوَةٌ: کی جمع ہے: دَانِيَةٌ: ایک دوسرے کے قریب یا توڑنے والوں کیلئے قریب ہیں اور بعض دور ہیں اس کا ذکر: مُتَفَاوِتًا چھوڑ دیا گیا ہے یعنی دَانِيَةٌ: وغیرہ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ: یہ نَبَاتَ پر عطف ہے: اَعْنَابٍ: میں بہت سے قسمیں ہیں اس لیے جمع ذکر کیا ہے: مُشْتَبِهًا: وَّالزَّيْتُوْنَ: اور وَّالرُّمَّانَ: پتوں میں برابر ہیں دیکھنے والوں کو شبہ ہوتا ہے جبکہ پھل میں برابر نہیں ہیں اس طرح اس سورۃ کی آیت 141 میں ہے وہاں مشابہت ذکر کی ہے اس میں اشارہ ہے زمین اور پانی

کے اشتراک کی طرف: اُنْظُرُوْا: اس سے استدلال اور عبرت کی نظر مراد ہے: ثَمَرِہٖ: ثَمَرَۃٌ کی جمع ثَمَرٌ ہے اور ضمیر تمام پھلوں میں سے ہر ایک کی طرف راجع ہے اور ثمر سے اس کے ابتدائی احوال مراد ہیں: وَیَنْعِہٖ: یہ مصدر ہے یا پھر یَانِعٌ کی جمع ہے۔ لَاٰیٰتٍ: توحید اور بعث بعد الموت کے ثبوت کے دلائل ہیں: یُّؤْمِنُوْنَ: انابت کرنے والے یا اللہ تعالیٰ کی خالقیت پر ایمان لانے والے مراد ہیں۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

"انہوں نے جنوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرایا حالانکہ اس نے انکو پیدا کیا ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کیلئے بیٹے اور بیٹیاں بغیر علم گھڑلی ہیں وہ پاک اور بلند ہے ان باتوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں" [100]۔

تفسیر 100 یہ ان لوگوں کے لیے زجر ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملائکہ، جنات اور اولیاء کو شریک ٹھہرایا ہے یہ مقدر فعل پر عطف ہے یعنی: اَقَرُّوْا اللهَ بِمَا تَقَدَّمَ ذِکْرُہٗ وَ جَعَلُوْا: اللہ تعالیٰ کیلئے سابقہ کاموں پر اقرار کرتے ہیں پھر اس کے ساتھ شریک بھی ٹھہراتے ہیں اس میں مشرکین: بِالْاِنْسِ وَالْجِنِّ وَالْمَلَآئِکَۃِ: کا رد ہے: شُرَکَآءَ: یہ مفعول ثانی ہے اور اَلْجِنَّ: مفعول اول ہے مگر ثانی کو مقدم کرنے میں اس کی تقبیح مقصود ہے یا شُرَکَآءَ: مفعول مبدل منہ ہے اور اَلْجِنَّ: بدل ہے اور جنوں کا یہ شرک کئی قسم کا ہے۔ زنادقہ کا قول ہے کہ شیطان شر کا خالق ہے اور اللہ تعالیٰ کا بھائی ہے اور طائفیہ معتزلہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کیا پھر عالم کی تدبیر اس کے حوالے کی اور جنات کا قول سورۃ جن میں ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں نے جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے: وَخَرَقُوْا: جھوٹ بولنے کے معنی میں ہے یہ تعبیر اس لیے ذکر کی ہے کہ اولاد کا پیدا ہونا لڑکی ہو یا لڑکا تجزی کا تقاضا کرتا ہے: وَخَلَقَهُمْ: ضمیر جنات یا مشرکین کی طرف راجع ہے سُبْحٰنَہٗ: غیر اشراک کی طرف راجع ہے اور تَعٰلٰی: بَنِیْنَ وَبَنٰتٍ کی طرف راجع ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

"وہی آسمانوں اور زمین کا موجد ہے کس طرح ہوگی اس کی اولاد جبکہ اس کی تو کوئی بیوی نہیں ہے اور اسی نے پیدا کیا ہر چیز کو اور ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے" [101]۔

تفسیر 101 یہ توحید کے کلمات ہیں۔ یعنی سُبْحَانَہٗ: کے لیے علت ہے اس میں توحید کے پانچ کلمات ہیں: بَدِیْعُ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں کسی مثال کا محتاج نہیں ہے لہٰذا شریک اور اولاد کی بھی ضرورت

نہیں رکھتا اور اس آیت میں پانچوں جملے عقیدہ ولدیت کے رد میں ہیں: وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ: اس میں اشارہ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے ولدیت کا عقیدہ رکھا ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے زوجیت کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ كُلَّ شَيْءٍ: اور خالق کا ولد مخلوق نہیں ہوسکتا کیونکہ ولد اور والد کا ہم جنس ہونا ضروری ہے ماں باپ اور اولاد میں مجانست لازم ہے: كُلَّ شَيْءٍ: سے مراد یہ ہے کہ اس میں مخلوقیت کی صفت ہو اس میں اللہ کی ذات صفات اور کلام داخل نہیں ہے: وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: ہر چیز پر محیط علم صرف اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ اگر اس کا (ولد) بیٹا ہوتا تو وہ مجانست کی وجہ سے ضرور اس صفت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہوتا۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾

"یہ ہے اللہ جو تمہارا رب ہے نہیں ہے کوئی معبود برحق مگر وہی ہے ہر چیز کا خالق ہے لہٰذا اسی کی بندگی کرو وہ ہر چیز پر خوب نگران ہے" [102]۔

تفسیر 102 اس آیت میں بھی توحید کے پانچ کلمات ہیں اور یہ نتیجہ ہے توحید کے گذشتہ دلائل اور کلمات کا اس آیت میں توحید ربوبیت، الوہیت خالقیت اور تصرف کا اثبات ہے یہ خَالِقُ: سابقہ آیت میں علت کا مقصد بیان کرنا تھا جو صفت فعلیہ (خَلَقَ) کے ساتھ ذکر کرنا مناسب تھا اور چونکہ اس آیت میں تفریع اور نتیجہ بیان کرنا مقصود تھا تو اس کو اسم فاعل (خَالِقُ) اسمیت کے ساتھ ذکر کرنا مناسب تھا: فَاعْبُدُوْهُ: چونکہ ماقبل کے لیے مابعد سبب ہے اس لیے اس کو (فَا) کے ساتھ ذکر کیا ہے: وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ: وہ حفاظت اور تدبیر کا متولی ہے لہٰذا توکل بھی اسی پر ہونا چاہیے۔ انسان عبادت میں اللہ تعالیٰ کی مدد اور توکل کا محتاج ہے جیسا کہ: اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کو اِيَّاكَ نَعْبُدُ: کے بعد لایا گیا ہے۔ تو یہاں توکل کا جملہ عبادت کے بعد ذکر کیا ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾

"(دنیا کی) آنکھیں اس کو پا نہیں سکتیں اور وہ آنکھوں کو پالیتا ہے اور وہ بڑا باریک بین خوب خبردار ہے" [103]۔

تفسیر 103 اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی چار صفات مذکور ہیں۔ ادراک اور رویت میں فرق یہ ہے کہ ادراک خاص ہے اور رویت عام ہے۔ خاص کی نفی سے عام کی نفی نہیں ہوگی۔ لہٰذا اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ کا دیدار نہیں ہوسکتا جو کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دیدار دنیا میں ہے اور ایک آخرت میں دنیاوی دیدار میں اہل حق

کے درمیان اختلاف ہے۔ اکثر اہل علم کا قول ہے کہ ممکن ہے دلیل موسیٰ علیہ السلام کا دیدار کیلئے اللہ تعالیٰ سے مطالبہ کرنا ہے جو سورۃ اعراف آیت 143 میں ان شاء اللہ ذکر ہوگا۔ پھر جو علماء مانتے ہیں ان کا یہ بھی اختلاف ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات دیدار ہوا ہے یا نہیں۔ اس میں عائشہ، ابن مسعود، ابو ہریرہ وغیرہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے دیدار نہیں کیا ہے سورۃ نجم میں جس دیدار کا ذکر ہے وہ جبرائیل کا ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا اور عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت سے رؤیت الٰہی کی نفی میں دلیل پیش کی تھی۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 176 ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3068)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما، انس، عکرمہ، ربیع اور حسن بصری رحمھم اللہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات اپنی آنکھوں سے دیدار الٰہی کیا ہے۔ باقی رہا قیامت میں مؤمنین کے لیے دیدار الٰہی تو اس کا کچھ ذکر میں نے سورۃ قیامۃ اور کچھ مُطَفِّفِیْن میں تفصیل سے کیا ہے۔ قرآن احادیث متواترہ اور اجماع سے ثابت ہے کہ آخرت میں مؤمنین رب کریم کا دیدار کریں گے جبکہ معتزلہ جھمیہ، مرجیہ اور دیگر گمراہ گروہ اس کے بھی قائل نہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ آخرت میں بھی ممکن نہیں ہے انہوں نے اس آیت سے دلیل لی ہے اور طریقہ استدلال جصاص نے اور زمخشری نے کشاف میں ذکر کیا ہے کیونکہ عقیدہ میں یہ دونوں معتزلی ہیں۔ اہلسنت نے ان کے جوابات اس طرح دیئے ہیں۔ جواب (۱) ادراک کا معنیٰ ہے کسی چیز کی حقیقت کا علم ہونا چنانچہ اللہ تعالیٰ کا تفصیلی حقیقت بصر اور بصیرت کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتی ہے اور یہ رؤیت کے منافی نہیں ہے یہ جواب امام سمعانی اور شربینی نے دیا ہے اور انہوں نے دلیل میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ذکر کیا ہے: فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ قَالَ كَلَّا: (سورۃ شعراء آیت 61) اس میں رویت کو ثابت اور ادراک کی نفی کی ہے۔ جواب ۲: ادراک احاطے کے معنی میں ہے جیسا کہ سورۃ یونس آیت 90 ہے احاطے کی نفی سے رویت کی نفی نہیں ہوتی اس لیے کہ خاص کی نفی سے عام کی نفی نہیں ہوتی۔ اس کو ابن کثیر اور دیگر بہت سے اہلسنّت مفسرین نے ذکر کیا ہے۔ جواب ۳: اس سے دنیاوی روایت کی نفی ہوتی ہے جو عائشہ رضی اللہ عنہا کے استدلال کا مطلب تھا جبکہ آخرت کی رویت نصوص سے ثابت ہے۔ جواب ۴: الْاَبْصَارُ: سے تمام نظریں مراد ہیں یعنی سارے لوگوں کی نظروں سے اللہ تعالیٰ نظر نہیں آتا مگر اس سے ایمان والوں کی تخصیص ہوئی ہے: وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ: ابصار کا ذکر تجانس کلام کی وجہ سے ہوا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا ادراک ہے: اللَّطِيْفُ: بندوں کے ساتھ نرمی کرنے والا ہے باریک چیزیں نکالنے اور ان کی حقیقت کو ظاہر کرنے والا ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ﴿۱۰۴﴾

"یقیناً آ چکے ہیں تمہارے پاس (سمجھنے کیلئے) دلائل پھر جس نے بصیرت سے کام لیا تو اپنے ہی فائدہ کے لئے ہے اور جو (سمجھنے سے) اندھا رہا تو وبال اسی پر ہوگا اور نہیں ہوں میں تم پر محافظ" [104]۔

تفسیر 104 اس روایت میں قرآن کی طرف ترغیب ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا ذکر ہے نیز یہ بھی مقصود ہے کہ قرآن کی بیان بادلیل اور پرمغز ہونے کی وجہ سے دلوں میں بصیرت اور روشنی پیدا کرتا ہے اور یہ بھی اس آیت سے حاصل ہوتا ہے کہ یہ نبی امت کو پریشانیوں اور مصیبتوں سے نکال نہیں سکتا ہے کیونکہ بِحَفِیْظٍ: کا ایک معنی یہ بھی ہے: عذاب اور ھلاکت سے بچانے والا اور دوسرا معنی اپنی علم وقدرت میں اعمال کو احاطے گیرے میں لینے والا (ابن کثیر)۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَیِّنَهٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

"اور اسی طرح ہم پھیرتے ہیں آیتوں کو تاکہ وہ (کافر) یہ کہیں کہ تو نے (کسی سے) پڑھ لیا ہے اور جو علم رکھتے ہے ان پر ہم اس (حقیقت) کو واضح کر دیں۔

تفسیر 105 اس آیت سے آیت 117 تک چھٹا باب ہے اس میں عقوبات تبلیغ کی تکالیف میں سے دو طریقوں کا ذکر ہے بآیت 105 آیت 112 اور دعوت کے تین آداب کا ذکر ہے آیت 106 اور 108 تین آیتوں میں زجر ہے۔ 109، 110، 111 اور قرآن پر فیصلوں کی طرف ترغیب اور جہالت کے فیصلوں سے اجتناب اور ان کا رد ہے۔ 105 میں دعوت وتبلیغ کی ایک تکلیف یہ بھی ہے کہ جب ہر وقت توحید کی تبلیغ ہوتی ہے۔ تو مخالفین پروپیگنڈے شروع کر دیتے ہیں کہ یہ فلاں وہابی کا شاگرد ہے یا اس پر مزرائیت پرویزیت اور اعتزال کا اثر ہوا ہے ان تمام الزامات کا جواب توحید بیان کرنے میں ہے بدنامیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے مسئلہ حق بیان کرتے رہیں البتہ ان کے معبودان باطلہ کو برا بھلا کہنے سے گریز کریں: وَكَذٰلِكَ: جس طرح پہلے ہم نے آیتیں بیان کیں اسی طرح آئندہ بھی بیان کریں گے: نُصَرِّفُ: ایک مضمون جب مختلف طریقوں سے بیان ہوتا ہو اس کو تصریف کہتے ہیں تو قرآن مجید نے مسئلہ توحید کو مختلف عنوانات، دلائل اور زجر وغیرہ کے ساتھ بیان کیا ہے: وَلِیَقُوْلُوْا: اس کا معطوف علیہ مقدر ہے لِتَقُوْمَ الْحُجَّةُ عَلَیْهِمْ: تاکہ ان پر حجت قائم ہو وَلِنُظْهِرَهٗ: لام عاقبت اور صیرورت کیلئے ہے۔ اس میں امام قرطبی نے سات قرائتیں نقل کی ہیں اس قرأت کے مطابق معنی تَعَلَّمْتَ: ہے جیسا سورۃ نحل آیت 103 اور سورۃ حج آیت 4 میں ہے یعنی ایک بدنام شخص کی طرف قرآن

مجید نقل کرنے کی نسبت کرتے ہیں یا دَرَسْتَ مَحْو: سابقہ کے دین کو مٹانے کے معنی میں ہے؛ وَلِنُبَيِّنَهُ: ضمیر بتاویل قرآن یا قول آیات کی طرف راجع ہے۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٦﴾

"آپ اس کی پیروی کریں جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے بندگی کا حقدار اس کے سوا کوئی نہیں ہے اور آپ مشرکین سے اعراض کیجئے" [106]۔

تفسیر 106 اس میں دو آداب کا ذکر ہے۔ اور مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ: کا خلاصہ یہ ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: حق بیان کرنا اور اس پر ہمیشہ عمل کرنا مراد ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: یہ اِتَّبِعْ: کیلئے علت ہے یا مِنْ رَّبِّكَ: کے لئے حال مُؤَكِّدَہ ہے یا مَآ اُوْحِيَ: کے لیے بدل ہے: وَاَعْرِضْ: مراد یہ ہے کہ ان کی مجالس سے دوستانہ تعلقات اور ان کے وسوسوں سے بچنا ہے اور ان کی مخالفت کی پرواہ کئے بغیر حق بیان کرنا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۗ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٧﴾

"اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے اور نہیں بنایا ہم نے آپ کو ان کا محافظ اور نہ ہی آپ ان کے ذمہ دار ہیں" [107]۔

تفسیر 107 اس آیت میں اَعْرِضْ: کی علتیں تین طریقوں سے ذکر ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے اور اسی طرح مبلغ حق وتوحید کے لیے بھی کہ تمہارے ذمہ صرف دعوت حق ہے باقی رہی ہدایت تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے لہٰذا حق بیان کرنے کے بعد تم اور پرواہ مت کرو نہ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کا چوکیدار بنایا ہے اور نہ آپ خود سے ان کے ضامن ہیں آیت ۱۰۴ میں نبی کی زبان سے حفیظ ہونے کی نفی کی گئی تھی اور اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نفی ہے۔ وکیل وہ شخص ہوتا ہے جس کی طرف نفع ونقصان راجع ہو اور اس کو موکل کی جانب سے اختیار دیا گیا ہو یہاں پر حَفِيْظًا اور وَكِيْلٍ: کا فرق یہ ہے کہ حفیظ تکالیف اور مصیبتوں سے بچاتا ہے اور وکیل وہ ہے جو فائدے اور نفع دیتا ہے لہٰذا ان کے متعلق تم سے سوال نہیں کیا جائیگا۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٠٨﴾

"اور جنہیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو تم گالی نہ دو ورنہ وہ دشمنی اور ناسمجھی میں اللہ تعالیٰ کو گالی دینگے۔ اسی طرح ہم نے ہر امت کیلئے ان کا عمل خوبصورت کیا پھر ان کا لوٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے پھر وہ انہیں خبر دیگا اس کی جو وہ عمل کرتے تھے" [108]۔

تفسیر 108 یہ بھی دعوت کے آداب میں سے ہے سب کسی چیز کا ذکر تحقیر آمیز اور توہین آمیز انداز سے کرنے کو سب کہا جاتا ہے تو اس قسم کی گفتگو باطل معبودوں کے متعلق منع ہے البتہ ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بندگی کے حقدار نہیں ہیں غیب دان نہیں عالم مشکل کشا حاجت روا اور غریب نواز نہیں ہیں یہ بیان تو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بار بار کیا ہے اور کرنے کا حکم دیا ہے: وَلَا تَسُبُّوا: نبی کریم ﷺ نے کبھی ان کے معبودوں کو برا بھلا نہیں کہا لیکن اس میں آداب بیان کرنا مقصود ہے سب کی دو قسمیں ہیں (۱) ایک وہ جس میں توہین اور جھوٹ ہو وہ تو منع ہے۔ (۲) دوسرا وہ ہے جس میں عیوب نقصانات بیان کرنا مقصود ہو تو یہ جائز ہے لیکن یہ اللہ و رسول کو گالی دینے کیلئے اسی کو بہانہ بنائیں گے تو اس لیے اس قسم کے کلام سے منع کیا ہے کیونکہ حرام کا ذریعہ بھی حرام ہوتا ہے اس آیت میں مسئلہ: سَدَّ الذَّرَائِعِ: کا ہے لہذا جب کسی عمل یا قول سے فتنہ پیدا ہوتا ہو تو اس مباح قول اور عمل کو بھی چھوڑنا چاہئے: فَيَسُبُّوا اللهَ: سوال: مشرکین تو اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے اور اس کی عظمت بھی تسلیم کرتے تھے تو کس طرح وہ اللہ تعالیٰ کو گالی دینگے؟۔ جواب ۱: ضد اور غصہ سے اس طرح کرینگے لفظ عَدْوًا: سے ثابت ہوتا ہے۔ جواب ۲: امام راغب نے کہا ہے کہ باطل طریقے سے توحید کا مقابلہ کرنا جھگڑنا وغیرہ مراد ہے۔ جواب ۳: اس سے اللہ کے رسول کو برا بھلا کہنا مراد ہے: بِغَيْرِ عِلْمٍ: یہ عَدْوًا: کیلئے سبب ہے یا يَسُبُّوا اللهَ کے لیے علت ہے: كَذَٰلِكَ: یہ سابقہ عنوان کیلئے علت ہے یعنی لازم ہے کہ وہ اپنے باطل معبودوں کے خلاف بولنے کو برداشت نہیں کرینگے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے برے اعمال ان کے لئے مزین کئے گئے ہیں یا ان کو ان کا دفاع ثواب یا غیرت نظر آتا ہے: لِكُلِّ أُمَّةٍ: امت عام ہے کافر ہو مؤمن ہو کفر شرک اور بدعت والے ہوں سب مراد ہیں۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

"انہوں نے اللہ تعالیٰ پر پختہ قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس (مخصوص) معجزہ آجائے تو وہ ضرور اس پر ایمان لائینگے فرما دیجئے نشانی (معجزات) صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اور تمہیں یہ بات کون سمجھائے کہ نشانی آجائے تو وہ ایمان نہیں لائینگے" [109]۔

تفسیر 109 اس میں سوال کا جواب ہے کہ اگر کوئی سوچے کہ شاید وہ برا بھلا اس وجہ سے کہتے ہونگے کہ ان کا معجزے کا مطالبہ پورا نہیں کیا جاتا تو جواب دیا گیا کہ: وَاَقْسَمُوْا: اس آیت میں دلیل ہے کہ مشرکین کبھی کبھار عظمت الٰہی کی قسم کھاتے ہیں: جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ: امام قرطبی نے لکھا ہے کہ اس دور کے مشرکین کبھی کبھار عظمت الٰہی کی قسم کھاتے تھے مگر اللہ پر قسم قوی اور سخت سمجھتے تھے جبکہ ہمارے زمانہ کے مشرکین غیر اللہ پر قسم قوی اور سخت سمجھتے ہیں اور اللہ کی قسم کی پروا نہیں کرتے اس اعتبار سے یہ مشرکین ان سے دو قدم آگے ہیں: اٰيَةٌ: اس سے وہ معجزات مراد ہیں جو مشرکین دنیا پرستی اور جہالت کی وجہ سے طلب کررہے تھے جیسا کہ سورۃ اسراء آیت 90، 91 اور سورۃ فاطر آیت 47: قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ: یہ دلیل ہے کہ معجزات انبیاء کرام کے اختیار میں نہیں ہیں اس طرح سورۃ رعد آیت 38 سورۃ ابراھیم آیت 11، سورۃ عنکبوت آیت 50، سورۃ اسراء آیت 93 میں ہے: وَمَا يُشْعِرُكُمْ: اشعار اور شعور سمجھ کے معنی میں ہے اور (مَا) استفہامیہ انکاریہ ہے اور ایمان والوں سے خطاب ہے مومنین معجزات کا مطالبہ اس امید پر کرتے تھے کہ شاید مشرکین ایمان لے آئیں۔ سوال: اس معنی میں تو یُؤْمِنُوْنَ چاہئے؟۔ جواب ا: یہاں پر لام استفہام انکاری ہیں انکار کی تاکید کے لیے لام مُقْحَمْ: لایا ہے۔ جواب ۲: دوسرا مفعول مقدر ہے یعنی: وَمَا يُشْعِرُكُمْ مَا فِي الْوَاقِعِ وَفِي عِلْمِ اللّٰهِ اِنَّهَا الخ تمہیں حقیقت کا کیا علم اور کس نے بتایا ہے کہ وہ معجزات دیکھ کر ایمان لائینگے جبکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ ایمان نہیں لائینگے۔ جواب ۳: مفعول ثانی مقدر ہے اور: اِنَّهَا لَعَلَّهَا: کے معنی میں ہے یہ خلیل اور کسائی کا قول ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے: وَمَا يُشْعِرُكُمْ اِتْيَانَهُمْ لَعَلَّهَا: بعض علماء کا قول ہے کہ یہ خطاب کفار سے ہے تو عبارت میں تقدیری عبارت اس طرح ہے: وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّكُمْ اٰمَنْتُمْ عِنْدَ مَجِيْئِ الْاٰيَاتِ: اور اِنَّهَا سے نیا کلام شروع ہے یعنی لِاَنَّهَا: دوسری قراءت میں اِنَّهَا الف کے زیر اور تُؤْمِنُوْنَ لِاَنَّهَا: کی تقدیر کے ساتھ خطاب کا صیغہ

ہے اور اس میں زجر ہے کہ نبی سے معجزات طلب کرتے ہو اور اس کو اختیار کا مالک تصور کرتے ہو اور اس میں دلیل ہے کہ نبی کا معجزات لانے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے۔

وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝

"اور (اس لیے) ہم پھیر دینگے ان کے دل اور آنکھیں (حق) سے جیسے کہ نہیں ایمان لائے اس (حق) پر پہلی مرتبہ اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں سرگرداں پھرتے ہوئے چھوڑ دینگے [110]۔

تفسیر 110 یہ لَا يُؤْمِنُونَ کیلئے علت اور وجہ ہے۔ واؤ علت کے معنی میں ہے اور کَمَا: میں کاف بھی علت کے معنی میں ہے ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے وہ ایمان نہیں لائے اس لیے ان کے دل اور آنکھیں حق سے پھر گئی ہیں اسی وجہ سے معجزات کے ذریعے ایمان سے بھی محروم ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے سرکشی میں رہ گئے۔ سوال یہاں اِسْمَاعْ: نہیں فرمایا؟۔ جواب یہاں پر ان محسوس شدہ معجزات کی بحث ہو رہی ہے جن کا وہ مطالبہ کر رہے تھے اس قسم کے معجزات کیلئے دل اور آنکھیں چاہئیں اس میں کانوں کا استعمال نہیں ہوتا۔

وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ ۝

"اور اگر ہم ان کی طرف نازل کرتے ملائکہ اور ان سے مردے کلام کرتے اور ہم اکٹھا کر لیتے ہر چیز ان پر سامنے (تب بھی) نہیں تھے کہ وہ ایمان لے آتے مگر یہ کہ چاہتا اللہ تعالیٰ لیکن ان کی اکثریت جہالت سے کام لیتی ہے [111]۔

تفسیر 111 اس آیت میں ان کے اس قول کا مزید جواب ہے کہ لَئِن جَاءَتْهُمْ: یعنی یہ مطلوب معجزات بھی ان کے سامنے آجائیں تب بھی وہ ضد و عناد کی وجہ سے ایمان نہیں لائینگے۔ انہوں نے جو معجزات طلب کیے تھے ان کا ذکر سورۃ اسراء آیت 92، سورۃ فرقان آیت 21 اور سورۃ انعام آیت 124 میں ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دیکھنے اور ملائکہ کے آنے کا مطالبہ کیا تھا اور سورۃ دخان آیت 36 اور سورۃ جاثیہ آیت 25 میں ہے کہ انہوں نے آباء و اجداد زندہ کرنے کا مطالبہ کیا تھا: قُبُلًا: قبیل کی جمع ہے یعنی گروہ گروہ یا مقابلۃ کے معنی میں ہے یعنی آمنے سامنے :إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ: معلوم ہوا کہ ایمان بھی مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔ سورۃ یونس آیت 10 میں بھی ہے: يَجْهَلُونَ: عنادی اور غیر عنادی دونوں جہل مراد ہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

"اسی طرح ہم نے بنائے ہر نبی کے لئے شیطان دشمن انسانوں اور جنوں میں سے ڈالتے ہے وہ ایک دوسرے کی طرف (جھوٹی) باتیں دھوکا دینے کے لیے اور اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ یہ (عمل) نہ کرتے لہٰذا آپ ان کو اور ان کے جھوٹ کو چھوڑ دیں [112]۔

تفسیر 112 یہ دعوتی امتحانات میں سے چوتھا مرحلہ ہے یعنی جب حق کے داعی کی بات اور تبلیغ اثر کرنے لگتی ہے تو اس کے خلاف انسی شیاطین (علمائے سو) لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور لوگوں کے سامنے شرک اور بدعت کے امور خوبصورت کر کے دکھاتے ہیں جسے (زُخْرُفَ الْقَوْلِ) کہا گیا ہے۔ حق پرستوں کے ساتھ مناظروں کے نام پر شور شغب کرتے ہیں۔ ربط: پہلی آیت سے تعلق یہ ہے کہ اس میں منکرین کا ذکر تھا کہ معجزات آنے کے باوجود حق کو قبول نہیں کرتے تو اب ظاہری رکاوٹیں جو انسانوں اور شیطانوں کی طرف سے آتی ہیں ان کا ذکر ہے اور وہ شیطانی وسوسے ہیں اور اس آیت میں نبی کریم کو تسلی بھی دی گئی ہے۔ امام قرطبی اور سمعانی رحمہم اللہ نے مالک بن دینار رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ مجھے جن شیاطین کی بنسبت انسانی شیاطین سے زیادہ خوف آتا ہے۔ اسی طرح سورۃ فرقان آیت 31 میں بھی ہے۔ یُوْحِیْ: وحی مخفی القاء کو کہتے ہیں اس لیے وسوسہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس وسوسہ میں نکتہ یہ ہے کہ وسوسہ والا شخص بھی دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے وحی ہوئی ہے یا وحی کی طرح سمجھتا ہے: وَزُخْرُفَ الْقَوْلِ: یہ بطور تشبیہ ہے جیسے لوہے یا تانبے پر سونے کا پانی چڑھایا جاتا ہے جس سے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اسی طرح باطل قول جو شرک و بدعت پر مبنی ہوتا ہے اس کو بدعت حسنہ وغیرہ قرار دیکر خوبصورت کر کے دکھاتے ہیں اس کو زُخْرُفَ الْقَوْلِ کہتے ہیں: غُرُوْرًا: یہ مفعول لہ ہے یعنی بعض لوگوں کو دھوکا دینے کیلئے اس طرح کرتے ہیں: فَذَرْهُمْ: اس سے مراد عذاب الٰہی تک مہلت دینا ہے۔

وَلِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

"اور تاکہ مائل ہو جائیں اس کی طرف ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور تاکہ وہ اسے (جھوٹ کو) پسند کریں اور تاکہ وہ (برے کام) کرتے رہیں جو وہ کر رہے ہیں [113]۔

تفسیر 113 یہ غُرُورًا پر عطف ہے اور یہ تین وسوسہ کے مقاصد کا ذکر ہے: وَلِتَصْغٰى: قوی میلان کو اِصْغَاء کہتے ہیں: اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: آخرت پر ایمان ہر قسم کی باطل پرستی سے رکاوٹ بنتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ جاہل انسان زُخْرُفَ الْقَوْلِ: سے دھوکا کھاتا ہے پھر اس کی توجہ اس پر مرکوز ہوتی ہے پھر اس سے خوش ہوتا ہے پھر باطل اعمال ونظریات پر ہمیشگی کرتا ہے مُّقْتَرِفُوْنَ: اس سے بدعات اور شرکیہ اعمال مراد ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

"کیا پھر اللہ تعالیٰ کے سوا میں حاکم تلاش کروں وہی ہے جس نے تمہاری طرف یہ مفصل کتاب اُتاری ہے اور وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ قرآن حق کے ساتھ آپ کے رب کی طرف سے نازل شدہ ہے لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا [114]۔

تفسیر 114 اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مناظرہ کا فیصلہ کتاب اللہ پر ہوگا۔ صالح لوگ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ آیت میں لفظ قُلْ شروع میں مقدر ہے اور استفہام انکاری ہے۔ فیصلہ کے وقت قرآن کتاب اللہ کے حکم کے علاوہ کوئی اور حکم نہیں مانا جائے گا۔ سورۃ شوریٰ آیت ۱۰ میں بھی اس طرح ہے: وَهُوَ الَّذِيْٓ الخ اس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا ذکر ہے یعنی اللہ کا قرآن حاکم ہے۔ تفسیر معانی میں ہے کہ مشرکین نے نبی اکرم سے مطالبہ کیا کہ: اِجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ حَكَمًا اپنے اور ہمارے درمیان فیصل مقرر کرو تو جواب ہوا کہ: اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا. قرآن میں ایمانیات اور اعتقادیات مکمل موجود ہیں اس لیے اسے مُفَصَّلًا: کہا گیا: وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ: ان سے مراد نیک اور صالح اہل کتاب ہیں یہاں کتاب اللہ کی حاکمیت پر ان کی گواہی اور دلیل نقلی پیش کی جارہی ہے۔ اس سورۃ کی آیت 20 اور سورۃ بقرہ آیت 146 میں بھی اس طرح ہے: فَلَا تَكُوْنَنَّ: مخاطب نبی ہے مگر مراد امت ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١١٥﴾

"اور آپ کے رب کی بات سچائی اور عدل و انصاف میں مکمل ہے اس کی بات کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور خوب سننے اور خوب جاننے والا ہے [115]۔

تفسیر: 115 یہ کتاب اللہ پر فیصلہ کرنے کا سبب ہے کہ وہ عدل و انصاف اور سچائی میں کامل ہے اور اس میں کوئی ردو بدل بھی نہیں کر سکتا اور اس طرح کوئی کتاب بھی نہیں ہے لہٰذا اس وجہ سے حاکمیت صرف قرآن کا حق ہے: صِدْقًا خبریں دینے میں عَدْلًا: اوامر اور نواھی میں: كَلِمَتُ رَبِّكَ: یہ قرآن کے ناموں میں سے ایک نام ہے مفرد باعتبار جنس اور مجموعہ کے یعنی پوری کتاب صدق وعدل میں یکساں ہے: لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ: یہاں پر جمع فرمایا ہے معلوم ہوا کہ ایک کلمہ میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور اس طرح سورۃ کہف آیت 27 اور سورۃ یونس آیت 64 میں ہے۔

وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿١١٦﴾

"اور اگر آپ زمین میں رہنے والی) اکثریت کی پیروی کریں تو آپ کو اللہ کے راستے سے پھیر دیں گے وہ پیروی نہیں کرتے مگر اپنے گمان کی اور نہیں وہ مگر اندازے اور تخمینے لگانے والے [116]۔

تفسیر116 اہل حق کی دلیل بیان کرنے کے بعد فریق مخالف کے دلائل کا ذکر اور ان کا رد ہے۔ کہ اہل باطل کی دلیل اکثریت کی پیروی خیالات کی اتباع اور اندازوں کے پیچھے چلنا ہے۔ عقائد میں ظن اور خیالات کی اتباع اور اعمال میں اندازے اور تخمینے پر گامزن ہیں ظن کا اتباع گمراہ علماء اور اندازے یعنی بلا دلیل بات کی پیروی مقلدین کا وطیرہ ہے۔
فائدہ: اس وقت اقتدار ووٹ کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے جو اکثریت پر بنا ہے اگرچہ وہ جاہل ہو اور یہ باطل طریقہ ہے یہ دور حاضر کی سیاستدانوں کا طریقہ ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١١٧﴾

"یقیناً آپ کا رب اس کو خوب جانتا ہے جو اس کے راستے سے بھٹک گیا اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے [117]۔

تفسیر117 پہلے استدلال کے اعتبار سے نیک اور گمراہ لوگوں کا تقابل بیان کیا گیا تو اب ان کا وہ فرق بیان کیا جارہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے فریقین کے بارے میں اللہ کا علم جزاء وسزا کو مستلزم ہے۔

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿١١٨﴾

"پس اس میں سے کھاؤ جس پر اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کیا گیا ہے اگر تم اللہ تعالیٰ کے احکام پر ایمان رکھتے ہو[118]۔

تفسیر 118 یہاں سے سورۃ کے آخر تک دوسرا حصہ ہے جس میں تین ابواب ہیں۔ پہلا باب آیت 135 تک ہے۔اس میں غیر اللہ کے نام کی نذر و نیاز اور اس کی وجہ سے چیزوں کو حرام کرنے کا رد ہے۔ دعوت کے کام میں امتحانات کے دو مرحلوں کا اور دو گروہوں کے مقابلے کا ذکر ہے آیت 122 اور 125 میں اور تخویف اخروی ہے۔ سابقہ آیت کے ساتھ ربط اور تعلق یہ ہے کہ جاہلوں کے باطل دلائل کا رد کیا گیا تھا تو اب ان کے باطل تحریم و تحلیل (فعلی شرک) کا رد کیا جا رہا ہے فَكُلُوا: سے کھانا اس چیز کا واجب کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس چیز کو حلال سمجھنا جیسے مشرکین نے بلا دلیل خود پر حرام کی ہو۔ جن چیزوں پر ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو یا نذر کرتے ہوئے اس کا نام لیا گیا اسی کو حلال مان لو۔ غیر اللہ کی تحریم کا اس آیت میں رد ہے: ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ: امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ذبح کرتے وقت جس چیز پر کسی اور کا نام لیا جائے تو اس آیت کی رو سے وہ چیز حرام ہے: مُؤْمِنِينَ: یعنی ایمان بالآیات کا تقاضا ہے کہ حلال اور حرام کرنا اللہ کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ﴿١١٩﴾

"اور تمہیں کیا عذر ہے کہ اس چیز سے نہیں کھاتے ہو جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو حالانکہ اس نے تفصیل سے بیان کیا جو تم پر اس نے حرام کیا ہے مگر یہ کہ اس کے کھانے کیلئے تم مجبور کئے جاؤ یقیناً بہت سارے لوگ گمراہ کرتے ہیں لوگوں کو خواہشات سے بغیر علم کے یقیناً آپ کا رب حد سے نکلنے والوں کو خوب جانتا ہے[119]۔

تفسیر 119 یہ ماقبل حکم فَكُلُوا: کے لیے تاکید ہے یہ بھی غیر اللہ کی تحریم کا رد ہے: وَقَدْ فَصَّلَ: [redacted] فَصَّلَ: تو فعل ماضی ہے تو معنی یہ ہوا کہ اس سورۃ سے پہلے حلال اور حرام کی تفصیل نازل ہوئی ہے حالانکہ اس سورۃ سے پہلے جو مکی سورتیں ہیں ان میں حلال اور حرام کی تفصیل نہیں ہے سورہ بقرہ اور مائدہ میں تفصیل ہے مگر وہ اس سورۃ کے بعد نازل ہوئی ہیں؟ جواب: فَصَّلَ سے مراد يُفَصِّلُ ہے جس کا معنی ہے تفصیل بیان کرے گا: إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ: اس استثنیٰ میں اشارہ ہے کہ خنزیر، غیر اللہ کی طرف منسوب چیز اور مردار چیز حالت اضطرار میں حرام نہیں ہیں تو حالت مجبوری میں موت سے

اپنے کیلئے بھی یہی حکم رہے گا: وَاِنَّ كَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ: اس میں عمرو بن لحی اور اس کے مقلدین مراد ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ۝۱۲۰

"اور تم چھوڑ دو ظاہری اور باطنی پوشیدہ گناہ یقیناً جو لوگ گناہ کرتے ہیں عنقریب وہ بدلہ دیئے جائیں گے اس کا جو وہ گناہ کرتے تھے۔[120]

تفسیر 120 ظَاهِرَ الْاِثْمِ: وہ گناہ ہے جو بدن کے ظاہر سے صادر ہوتے ہیں یا وہ گناہ جو ظاہر ہو شرک فعلی اس میں داخل ہے: وَبَاطِنَهٗ: وہ گناہ جو عقیدہ اور دل سے متعلق ہو یا مخفی طور پر کیئے جاتے ہو اس میں شرک اعتقادی داخل ہے۔ سَیُجْزَوْنَ: میں آیات توبہ اور مغفرت کی وجہ سے تخصیص ہے یعنی انسان نے توبہ نہ کی ہو اور اللہ تعالیٰ نے معاف نہ کیا ہو تو سزا لازم ہے نیز اس میں وعید ہے وجوب کے لئے مستلزم نہیں ہے لہذا معتزلہ اس آیت سے استدلال نہیں کر سکتے۔

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓئِهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۝۱۲۱ ع

"اور تم اس (جانور) میں سے مت کھاؤ کہ نہیں ذکر کیا گیا ہو اس پر اللہ تعالیٰ کا نام یہ کھانا فسق ہے اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کی طرف وسوسہ (شبہات) ڈالتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو البتہ تم بھی مشرک ہو گے[121]۔

تفسیر 121 عطاء رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اس میں غیر اللہ کی نذر کا رد ہے اس میں مردار بھی داخل ہے، ان مسلمانوں کا ذبیحہ جو قصداً بسم اللہ نہیں پڑھتے اس میں اختلاف ہے: وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ: ضمیر نذر اور ذبح لغیر اللہ کیلئے ہے، فسق سے مراد اعتقادی فسق ہے جیسا کہ اس سورۃ کی آیت 145 میں ہے یا اَکْل کی طرف راجع ہے اور یہ عملی فسق ہے: وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ: اس سے مراد علماء سوء ہیں جو عوام کو وسوسے ڈالتے رہتے ہیں، زجاج کا قول ہے کہ جو لوگ حلال کو حرام اور حرام کو حلال مانتے ہیں اور غیر اللہ کی نذر کو حلال قرار دیتے ہیں تو یہ آیت ان کے مشرک ہونے کی دلیل ہے اسی طرح یہ بھی دلیل ہے کہ اس امت میں جو لوگ شرک کریں اگرچہ شِرْكٌ فِی الْحُكْمِ وَالتَّشْرِیْعِ ہو تو انہیں مشرک کہہ سکتے ہیں۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

"کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور ہم نے اس کیلئے نور بنا دیا وہ اس کے ذریعے سے لوگوں میں چلتا ہے اس شخص جیسے ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں ہو جیسے وہ نکلتا ان سے اسی طرح کافروں کیلئے ان کے اعمال مزین کئے گئے ہیں |122|۔"

تفسیر 122 یہ دو گروہوں کا تقابل اور توحید و قرآن کی طرف ترغیب ہے۔ مَيْتًا: سے مراد وہ مشرک ہے جو شرک کی گذشتہ اقسام کا مرتکب ہو اور حیات مراد توحید ہے اس طرح مَيْتًا: سے جاہل اور أَحْيَاءٌ: سے مراد علم دینا ہے: فَاَحْيَيْنٰهُ: یہ حیات معرفت الٰہی اور توحید کی روح کے ساتھ حیات دینا ہے۔ روح کی حیات اس کے ساتھ حاصل ہوتی ہے لہٰذا ایک طرف حیات اور نور ہے اور دوسری جانب موت (شرک/ جہل) اور ظلمت ہے۔ اس آیت میں سیکولرازم کا رد ہے کیونکہ وہ کفر اور اسلام کا فرق نہیں مانتے اور ان جاہلوں کا رد ہے کہ جب کوئی انسان شرک بدعت اور جہل سے نکل جائے اور توحید و سنت کی طرف منتقل ہو جائے تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں: نُوْرًا: اس سے مراد قرآن ہے: يَّمْشِيْ: سے مراد توحید و سنت کی دعوت کے لئے مختلف علاقوں میں پھرنا اور قرآن پر عمل مراد ہے: كَذٰلِكَ: جس طرح مومن کو ایمان خوبصورت لگتا ہے تو کافر کیلئے کفر مزین کیا گیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

"اور اس طرح ہم نے بنایا ہر بستی میں بڑے لوگوں کو اس بستی کے جرائم پیشہ تاکہ وہ (حق کے خلاف) مکر کریں اس میں اور نہیں مکر کرتے مگر اپنے آپ سے اور وہ شعور نہیں رکھتے [123]۔"

تفسیر 123 دعوت و تبلیغ کی مشکلات میں سے یہ پانچواں مرحلہ ہے جب علمائے سوء حق پرست علماء کے مقابلے سے بے بس ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اکابرین علاقہ کے پاس شکایات لیجاتے ہیں برسراقتدار حکمرانوں کو اکساتے ہیں کہ یہ علاقہ میں فساد کرتے ہیں یعنی مختلف الزامات لگا کر موحدین کے خلاف برسراقتدار حکمرانوں کو رپورٹیں دیکر آخرکار اہل حق کو تھانوں اور جیلوں میں بند کرواتے ہیں یا علاقہ اور ملک سے نکال دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے مکر کا برا اثر ان ہی پر

ہوگا: وَ كَذٰلِكَ: یہ تشبیہ آیت 53، 55، 105 اور 118 میں بیان کردہ کی طرف راجع ہے: اَكٰبِرَ: اس لئے مقدم کیا ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ ان لوگوں کے جرائم پیشہ بننے کا سبب تکبر ہے: لِيَمْكُرُوْا: لام برائے انجام ہے جیسے کہ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 16، سورۃ نوح آیت 22 میں ہے مقابلے میں موحدین ہمیشہ خاندانی اعتبار اور مالی اعتبار سے کمزور لوگ ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن سے اور ہرقل والی حدیث اور دیگر احادیث سے ثابت ہے جو امام بخاری اور دیگر محدثین نے ذکر کئے ہیں۔ نیز ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ مکر سے مراد گمراہی کی دعوت ہے۔ سفیان سے منقول ہے کہ قرآن مجید میں جو لفظ مکر ذکر ہوا ہے اس سے مراد موحدین کو ایذا دینے والے اعمال ہیں اس طرح سورۃ فاطر آیت 43 میں بھی ہے۔

وَإِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۗ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿١٢٤﴾

"اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ ہم دیے جائیں جو اللہ تعالیٰ کے رسول دیے گئے تھے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے عنقریب پہنچے گی ان لوگوں کو جنہوں نے جرم کئے ہیں اللہ تعالیٰ کے پاس ذلت اور سخت ترین عذاب بسبب اسکے کہ وہ مکر کرتے تھے [124]۔

تفسیر 124 اس آیت میں اکابر کی چالوں اور تکبر کا ذکر ہے اس میں بڑے لوگوں کو ڈانٹ اور توبیخ ہے کہ جو مالداری اور تکبر کی وجہ سے رسولوں کے ساتھ برابری اور ملائک کا نزول چاہتے ہیں یعنی ان اسباب کی وجہ سے رسالت کے منتظر ہیں (حالانکہ رسالت کوئی کسبی چیز نہیں ہے) تو انکا جواب ان الفاظ میں دیا گیا کہ اَللّٰهُ اَعْلَمُ الخ۔ مراد یہ ہے کہ اس نبی ﷺ کو اخلاق و کردار کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ رسالت کا حقدار ہے اور اس کے مثل کوئی نہیں ہے: عِنْدَ اللّٰهِ: امام فراء اور بغوی کا قول ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے یا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ: کے معنی میں ہے تو پھر دنیا بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اس آیت میں واضح دلیل ہے کہ تکبر اور چال کا بدلہ ذلت کا عذاب اور رسوائی ہے ان اکابر کی سزا یہ ہے کہ: سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ یعنی بڑا ہونے کے بجائے حقیر اور ذلیل ہونگے: حَتّٰى نُؤْتٰى: مثل اس سے رسالت بھی مراد ہے مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے علماء بھی ہم کو اسی طرح کے مسائل بیان کریں جو رسول اور حق پرست علماء بیان کرتے ہیں۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۚ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

" جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتا ہے تو اسلام کیلئے اس کا سینہ کھول دیتا ہے اور جسے وہ چاہتا ہے کہ اس کو گمراہ کردے تو بنا دیتا ہے اس کا سینہ انتہائی تنگ گویا کہ وہ آسمان میں چڑھ رہا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ناپاکی مسلط کردیتا ہے ان پر جو ایمان نہیں لاتے [125]۔

تفسیر 125 یہ رسالت حقہ کا فائدہ ہے اور یہ تقابل ہے اکابر کے دو گروہوں کے درمیان یعنی اللہ تعالیٰ جن کو ہدایت دینا چاہتا ہے تو اس میں اچھی صفات پیدا کرتا ہے حدیث میں تین علامتوں کا ذکر ہے۔ (۱) جنت کی طرف انابت، (۲) دنیا سے بے رغبتی، (۳) موت کے آنے سے پہلے اس کے لئے تیاری اس روایت کو امام بیہقی نے الاسماء والصفات میں ابن جریر نے تفسیر میں نقل کیا ہے مگر جعفر مدائنی راوی کی سب سے محققین علماء نے ضعیف قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس کو توحید و سنت کی سمجھ عطا کرتا ہے اور اس کے دل سے شکوک وشبہات دور کردیتا ہے اور دینی مشکلات اللہ تعالیٰ اس کیلئے آسان کردیتا ہے ان تین صفات کو شرح صدر کہا جاتا ہے اور جن کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تو وہ توحید و سنت سننے سے بہت تنگ ہوتا اور غصہ کرنے پر اُتر آتا ہے اور توحید و سنت قبول کرنا تو اس کو اتنا مشکل لگتا ہے جیسے مشکل ترین پہاڑ یا بلندی پر چڑھنا ہوتا ہے۔ یاضَیِّقًا بطور تشبیہ ہے یعنی اس میں ایمان داخل نہیں ہوتا: حَرَجًا: راء کے زبر سے معنی ہوگا: ذَا حَرَجٍ: تنگی والا اور راء کی زیر سے ہو تو سخت تنگ کے معنی میں ہے: كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ: ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ بھی ایک مثال ہے کہ جس طرح انسان آسمان پر نہیں چڑھ سکتا اسی طرح اس کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوسکتا: كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ: یعنی جس طرح ان کا سینہ تنگ کیا ہے اسی طرح ان پر گندگی بھی ڈالی ہے۔ زجاج نے کہا کہ رِجْسٌ: دنیا میں لعنت اور آخرت میں عذاب ہے۔ یا رِجْسٌ: بمعنی شیطان ہے جس کو اللہ تعالیٰ بے ایمان لوگوں پر مسلط کرتا ہے، مجاہد کے قول کے مطابق ہر وہ چیز رِجْسٌ: ہے جس میں خیر نہیں ہے۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (126)

"اور یہ ہے آپ کے رب کا سیدھا راستہ یقیناً ہم نے تفصیل سے آیات کو بیان کیا ہے ان لوگوں کیلئے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں [126]۔"

تفسیر 126 گمراہ لوگوں کے طریقے کے بیان کے بعد اب اس آیت میں قرآن کی طرف ترغیب ہے پہلے يَشْرَحْ صَدْرَهٗ کا ذکر ہوا تو اب سینہ کھول دینے والے اسباب کا بیان ہے اور وَهٰذَا یعنی مضمون قرآن کی طرف اشارہ ہے۔ مُسْتَقِيْمًا: بطریق حال برائے تاکید ہے: الْاٰيٰتِ: قرآنی آیتیں مراد ہیں جو الگ الگ مضمون کیلئے آتی ہیں۔

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (127)

"ان کیلئے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور وہی ان کا دوست ہے بوجہ ان کے اعمال کے جو وہ عمل کرتے تھے [127]۔"

تفسیر 127 پیروی کرنے والوں کیلئے خوشخبری ہے: دَارُ السَّلٰمِ: حسن کا قول ہے کہ سلام اللہ تعالیٰ کا نام ہے زجاج کا قول ہے کہ سلام مصدر ہے جو تمام آفتوں سے سلامتی کے معنی میں ہے یا سلام سے دعا مراد ہے یعنی تحیۃ السلام ہے جو ہر جانب سے داخل ہونے والے سلام پیش کریں گے: عِنْدَ رَبِّهِمْ: اشارہ ہے کہ اس کی نعمتوں کا تفصیلی علم اللہ ہی کے پاس ہے: وَلِيُّهُمْ: ابن کثیر نے فرمایا کہ وَلِيُّهُمْ بمعنی ناصر و مؤید کے معنی میں ہے ان کے کاموں کا ذمہ دار ہے کسی اور کے حوالے نہیں کرتے۔ (تفسیر شربینی)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰۗؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (128)

"اور جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کریگا تو (فرمائے گا) اے جنوں کے گروہ یقیناً تم نے زیادہ گمراہ کئے تھے انسانوں میں سے اور ان کے دوست انسانوں میں سے کہیں گے فائدہ اٹھایا ہمارے بعض نے بعض سے اور ہم اپنی اس مدت کو پہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لیے مقرر فرمائی تھی (اللہ) فرمائے گا آگ تمہارا ٹھکانا ہے تم ہمیشہ اس میں رہو گے مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے یقیناً آپ کا رب بڑی حکمت والا خوب جاننے والا ہے [128]۔"

تفسیر 128 اس آیت میں انکار کرنے والوں کے لئے تخویف اخروی ہے: اِسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ: اس میں اعتراف جرم ہے بڑے بڑے جنات جنگلات میں انسانوں کو چھوٹے جنوں سے بچاتے تھے اسی طرح بعض عاملین جنوں سے بعض کام کرواتے ہیں اسی طرح کسی پر جن آتے ہیں تو دھوکا دیتے ہوئے جھوٹے پروپیگنڈوں کے ذریعے سے لوگوں سے مال بٹورتے ہیں یہ جنات کے ذریعے سے انسانوں کے حاصل کردہ فائدے ہیں اور انسانوں نے جنوں کے نام پر نذرانے دیئے ہیں ان کی پیروی کرتے ہیں اور غائبانہ طور پر ان سے خوف کھاتے ہیں ان کو غالب مانتے ہیں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تفسیر میں اس کی بہت سی صورتیں ذکر کرتے ہوئے اس میں تفصیل بیان کی ہے یہاں تک کہ جنات انسانوں سے زنا کرتے ہیں تو یہ انسانوں سے جنوں کے فائدے ہیں: اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ: اس سے دیگر عذاب مراد ہیں یعنی زمہریر: کھانے پینے کی جگہیں اور استعمال ہے یا مؤمن گناہگار مراد ہیں۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن پر احوال شیطانیہ کشف شیطانی آتے ہیں جنات کے ذریعے بعض غیب کی باتوں کی خبریں دیتے ہیں تو لوگ انہیں اولیاء الرحمٰن سمجھتے ہیں حالانکہ یہ اولیاء الشیطان ہیں، یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ انسان اور جن احکام شریعہ کے پابند ہیں۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٢٩﴾ ع

"اور اسی طرح ہم بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں بسبب اس کے جو وہ کماتے تھے [129]۔

تفسیر 129 اس آیت میں تبلیغ و دعوت کا چھٹا اور آخری امتحانی مرحلہ ہے یعنی حق پرست اس مرحلے تک پہنچ جاتا ہے کہ مخالفین جو داعیان شرک و بدعت ہیں وہ اس کے خلاف اکٹھے ہو جاتے ہیں اور سب مل کر اس سے تعلقات منقطع کر لیتے ہیں اس آیت کا دوسرا معنی یہ ہے کہ ظالموں پر دوسرے ظالموں کا حاکم بنا کر ان کو دنیاوی عذاب دیتے ہیں پہلے قول کی بناء پر نُوَلِّيْ: ولی کے معنی میں ہے یعنی باطل پرست لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اہل حق کے خلاف ہوتا ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے تولی ولایت سے حکومت کے معنی میں ہے لہذا پہلے معنی کے اعتبار سے یہ آخری عقبہ یعنی دعوتی امتحان ہے اور آخری معنی کے اعتبار سے تخویف دنیوی ہے۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝

"اے جنوں اور انسانوں کی جماعت کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے تھے کہ بیان کرتے تم پر میری آیتیں اور تمہیں تمہارے اس دن کی ملاقات سے اس دن کا خوف دلاتے تو وہ کہیں گے کہ ہم گواہی دیتے ہیں اپنے آپ پر اور ان کو دھوکے میں ڈال رکھا تھا دنیا کی زندگی نے اور وہ گواہی دینگے اپنے آپ پر کہ یقیناً وہ کفر کرنے والے تھے [130]۔

تفسیر 130 اس آیت میں بھی تخویف اخروی ہے۔ جنات میں آدم علیہ السلام کے بعد اور محمد ﷺ سے پہلے رسولوں کے آنے میں علماء کا اختلاف ہے البتہ داعیان حق ان میں کثرت سے تھے اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ جنات میں انبیاء ورسول نہیں آئے البتہ داعیان حق ان میں کثرت سے آئے ہیں اس قول کو ابن جریر وابن کثیر نے بہتر کہا ہے۔ اس کی تائید سورۃ نساء آیت 163، سورۃ یوسف آیت 109 اور سورۃ فرقان آیت آیت 20 سے ہوتی ہے: مِّنْكُمْ: خطاب میں مختلف اقوال ہیں: (۱) پہلا یہ ہے کہ یہ خطاب مجموعہ کے اعتبار سے ہے اور انسانوں کو جنوں پر غلبہ دیا ہے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ نذیر کے معنی میں ہے۔ (۳) تیسرا قول: یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی جانب سے جنات کی طرف مبلغین بھیجے گئے تھے اور خطاب ان کے اعتبار سے ہے: يَقُصُّوْنَ: بہت بڑا مقصد رسولوں کا اللہ تعالیٰ کی توحید اور احوال قیامت بیان کرنا ہے: شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا: یہ اعضا کی گواہی کے بعد ہے: وَغَرَّتْهُمْ: یہ تکذیب کیلئے علت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جملہ معترضہ ہے: اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ: پہلے رسولوں کے اقرار کی شہادت ہے اور دوسرا کفر کا اقرار ہے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝

"یہ (رسول بھیجنا اس لئے ہے) کہ نہیں ہے آپ کا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا (ان کے) ظلم (شرک) کی وجہ سے جبکہ ان کے باشندے بے خبر ہوں [131]۔

تفسیر 131 اس آیت میں رسول بھیجنے کا مقصد ذکر ہو رہا ہے جیسے سابقہ آیت میں: اِرْسَالِ الرُّسُوْلِ: کا مقصد بیان ہوا کہ جب لوگ شرک میں مبتلا ہوں مگر رسول ان کے پاس نہ آئے ہو اور ان کو توحید اور بیان حق نہ کیا گیا ہو تو دنیا میں ان کو عذاب نہیں دیتا: بِظُلْمٍ: لوگوں کے شرک، کفر اور بدعت کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا جب تک کہ رسول نہ بھیج دے۔ جیسے

سورۃ بنی اسرائیل آیت 15 میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ رسول بھیج دینے سے قبل عذاب دینا ظلم ہے۔ پہلا قول بہتر ہے کیونکہ رسول بھیجنا اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں ہے۔ غٰفِلُوْنَ: مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس رسول نہیں آئے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٢﴾

"اور ہر ایک کیلئے بسبب اس کے جو انہوں نے عمل کیئے مختلف درجے ہیں اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر اس سے جو وہ کرتے ہیں [132]۔

تفسیر 132 یعنی انسانوں اور جنوں میں سے ہر ایک کے لئے خواہ جنتی ہو یا جہنمی مختلف درجے ہیں ہر ایک کا مرتبہ اس کے عمل کے مطابق ہے دنیا میں ہو یا آخرت میں، اس میں اشارہ ہے کہ دارو مدار جزا و سزا کا عمل پر ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿١٣٣﴾ؕ

"آپ کا رب بے نیاز رحمت والا ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور جانشین بنا دے تمہارے بعد جن کو وہ چاہے جس طرح اس نے تمہیں دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا ہے [133]۔

تفسیر 133 یہ انکار کرنے والوں کے لئے ڈراوا ہے یعنی اللہ تعالیٰ تو بے نیاز اور رحم والا ہے لیکن غضب والا بھی ہے اگر چاہے تو منکرین کو فنا کر کے اور لوگوں کو لے آئے۔ اِنْ يَّشَاْ: اس میں بیان کردہ چیز کے مخالف چیز کا ذکر ہے یعنی رحمت کا ضد غضب اور عذاب ہے۔

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿١٣٤﴾

"جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ آنے والی ہے اور تم نہیں ہو عاجز کرنے والے [134]۔

تفسیر 134 اس آیت میں بھی منکرین کیلئے عذاب کا ڈراوا ہے: مَا تُوْعَدُوْنَ: میں دنیاوی اور اخروی کا عذاب دونوں مراد ہیں۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

"فرما دیجئے اے میری قوم کے لوگو تم عمل کرو اپنے مقام پر اور میں عمل کرنے والا ہوں اپنے مقام پر عنقریب تم جان لوگے اس شخص کو کہ اس کے لئے آخرت کا اچھا انجام ہے یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے [135]۔

تفسیر 135 اس آیت میں منکرین سے اعلان براءت ہے اور ان کے لئے سخت زجر ہے: مَكَانَتِكُمْ: اس سے مراد طاقت واختیارات طریقہ اور حالات ہیں سورۃ ھود آیت 121 میں بھی ہے مَنْ موصولہ ہے جو تَعْلَمُوْنَ: کے لئے مفعول ہے: عَاقِبَةُ الدَّارِ: آخرت کا اچھا انجام مراد ہے اِنَّهٗ: اس میں اجمالاً فریقین کے فیصلے کا ذکر ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

"اور وہ ٹھہراتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے اس میں سے جو اس نے پیدا کیئے ہے کھیتی اور چوپائے کا ایک حصہ پھر وہ کہتے ہیں یہ اللہ کے لئے ہے ان کے خیال کے مطابق اور یہ ان کے معبودوں کے لئے ہے تو جو حصہ ان کے معبودوں کیلئے ہے وہ نہیں پہنچتا اللہ تعالیٰ کی طرف اور جو حصہ اللہ کا ہے تو وہ پہنچ جاتا ہے ان کے معبودوں کی طرف۔ بہت برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں [136]۔

تفسیر 136 اس آیت سے آیت 150 تک دوسرا باب ہے جس میں دور جاہلیت کے تحلیل وتحریم کی رسموں کا رد ہے۔ پہلے غیر اللہ کی نذر کا رد ہے پھر غیر اللہ کے نام سے حرام کرنے کا رد ہے پھر فعلی شرک کے رد پر تین عقلی دلائل ہیں پھر مشرکین کی دلیل کا رد ہے اور اس میں مشرکین کے لئے ڈانٹ ہے کہ وہ فصلوں اور جانوروں میں حصے بناتے ہیں کچھ اللہ تعالیٰ کیلئے اور کچھ اپنے بنائے ہوئے معبودوں کیلئے جن کو عموماً ہمارے معاشرے میں نذر ونیاز جیسے گیارہویں وغیرہ سے موسوم کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ عرب کی جہالت کو دیکھ لو تو سورۃ انعام آیت 130 سے آگے پڑھ لو۔ (صحیح بخاری کتاب المناقب حدیث 3024)

لِلّٰهِ: اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے نام پر صدقہ اور زکوۃ وغیرہ دیا کرتے تھے: بِزَعْمِهِمْ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حصہ شرعی اصول اور تقسیم کے مطابق نہیں بلکہ اپنی خواہش کے مطابق کرتے تھے۔ شرکاء کا حصہ اللہ تعالیٰ کے

گھر نہیں پہنچتا اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ غیر اللہ کی نذر غریب مسکین لوگوں کو نہیں دیتے تھے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ غیر اللہ کی نذر کردہ غلہ اگر اللہ تعالیٰ کے حصہ کے ساتھ مل جاتا تو فوراً اس کو الگ کر دیتے۔ تیسرا معنیٰ یہ ہے کہ جو چیز غیر اللہ کی نذر کرتے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیتے۔ چوتھا معنیٰ یہ ہے کہ زکوٰۃ وغیرہ کی مد میں جب پیسہ کم پڑ جائے تو غیر اللہ کے نام نذر کردہ چیز سے اس کو پورا نہیں کرتے اور ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر کوئی چیز ذبح کرتے تو اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ غیر اللہ کا نام ضرور لیتے اور جب غیر اللہ کے نام پر کوئی چیز ذبح کرتے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیتے۔ امام ابن کثیر نے یہ توجیہات ذکر کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حصہ شرکاء کے حصہ سے مل سکتا ہے اس میں بھی وہی چار طریقے ہیں مگر برعکس۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَاۗؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝

"اور اسی طرح خوبصورت کر دکھایا بہت سارے مشرکین کو ان کے دیوتاؤں نے قتل کرنا اپنی اولاد کا تاکہ وہ انہیں ہلاک کر دیں اور تاکہ ان پر ان کا دین خلط ملط کر دیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے لہٰذا ان کو چھوڑ دو اور جو وہ افتراء باندھتے ہیں [137]۔

تفسیر 137 اس میں غیر اللہ کی نذر کا رد ہے کہ مشرکین اپنی اولاد کو غیر اللہ کے نام پر وقف کر کے ملنگوں اور مجاوروں کے حوالے کر دیتے ہیں یہ تو قتل حکمی ہے جبکہ کبھی غیر اللہ کے نام پر اولاد حقیقی قتل کرتے ہوئے ذبح کر لیتے ہیں جیسے ہندوؤں اور شیعہ لوگوں میں یہ عمل آج بھی موجود ہے۔ بابا کے مجاورین اور ملنگوں کو اپنی بیٹیاں نذر کرتے ہوئے چھوڑ جاتے ہیں پھر بزرگ یہ لڑکیاں اپنے پوتوں کو دے دیتے ہیں یا ان کو برائے نام نکاح میں دیتے ہیں یہ سب شرک اور ارتکاب جرم ہے یہ نکاح فاسد ہے: شُرَكَاۗؤُهُمْ: اس سے باطل معبودوں کی محبت یا مجاوروں اور پیروں کی باطل امامت مراد ہے: وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ: اس میں بیٹیوں اور بیٹوں کو زندہ درگور کرنا بھی داخل ہے۔ لِيُرْدُوْهُمْ اس میں اشارہ ہے کہ غیر اللہ کی بندگی جہنم میں جانے کا سبب ہے: دِيْنَهُمْ: اس سے مراد دین اسلام اور دین فطرت ہے جس پر لوگ پیدا ہوئے ہیں یا دین ابراہیم و اسماعیل علیہم السلام ہے جس کا عرب لوگ دعویٰ کرتے تھے: وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ: اس کا مفعول مقدر ہے یعنی لوگوں کو شرک سے محفوظ کرنا۔

وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا
يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

"اور انہوں نے کہا کہ یہ فصلیں اور چوپائے ممنوع ہیں ان کو نہیں کھا سکتا مگر وہ جسے ہم چاہیں (انہوں نے یہ) اپنے خیال کے مطابق کیا اور بعض چوپائے ہیں کہ حرام کردی گئی ہیں ان کی پیٹھیں اور بعض چوپائے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے عنقریب وہ انہیں سزا دیگا بوجہ اس کے جو وہ جھوٹ باندھتے تھے [138]۔

تفسیر 138 اس میں غیر اللہ کے نام پر چیزیں حرام کرنے کا رد اور اس کی تین قسموں کا ذکر ہے: اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ اس سے مراد مجاورین ہیں: هٰذِهٖ: آیت 136 میں جن کا ذکر ہوا ہے: هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا: فصلیں اور جانور جن کا وہ تعین کر لیتے ہیں: حِجْرٌ: اس لفظ میں مذکر و مؤنث برابر ہوتے ہیں: حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا: جن پر سواری کرنا اور وزن لادنا انہوں نے منع کیا ہے جیسے بحیرہ سائبہ حام وغیرہ: لَّا يَذْكُرُوْنَ: ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیتے یا ذکر اللہ سے مراد دین کے کاموں کیلئے استعمال کرنا ہے: اِفْتِرَآءً: یہ تینوں قسموں سے متعلق ہے۔

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ
شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾

"اور انہوں نے کہا جو بچہ ان چوپائیوں کے پیٹوں میں ہے وہ خالص ہے صرف ہمارے مردوں کیلئے اور ہماری بیویوں پر حرام ہے اور اگر وہ مردہ ہو تو پھر عورت مرد سب اس میں شریک ہیں عنقریب وہ ان کو اس بیان کی سزا دے گا یقیناً وہ بڑی حکمت والا اور خوب جاننے والا ہے [139]۔

تفسیر 139 اس آیت میں بھی غیر اللہ کے نام پر حرام کردہ چیزوں کا رد ہے ان کا یہ عقیدہ تھا کہ زندہ پیدا ہونے والے بچے میں سے عورتیں نہیں کھائیں گی اس لئے کہ اس میں ان کے لئے ضرر ہے اور مردہ پیدا ہو جائے تو پھر عورتیں بھی اس کے کھانے میں شریک ہونگی: مَا فِيْ بُطُوْنِ: یہ عام ہے جانور کا دودھ ہو یا پیدا ہونے والا زندہ بچہ: خَالِصَةٌ، وَمُحَرَّمٌ یہ تانیث کیلئے نہیں ہے بلکہ مبالغہ کیلئے ہے اس لئے اصل پر بنا کر کے مُحَرَّمٌ: کو مذکر ذکر کیا ہے لہٰذا خَالِصَةٌ: حلال کے معنی میں ہے خصوصیات کے ساتھ: وَصْفَهُمْ: بیان کرنے کے معنی میں ہے اور جزاء لفظ مقدر مراد ہے: وَصْفَهُمْ: کی تفصیل

سورۃ نحل آیت 114 میں مذکور ہے چونکہ اس آیت میں جانوروں کی قسموں کا ذکر تھا تو اس کے لئے وصف مناسب ہے اور گزشتہ آیت میں چوپایوں کی ذوات کا ذکر تھا تو اس کے ساتھ لفظ افتراء ذکر کیا تھا۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۚ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

"یقیناً وہ لوگ خسارے میں ہیں جنھوں نے بے وقوفی سے بغیر علم اپنی اولاد کو قتل کر ڈالا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو رزق عطا کیا ہے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے اس کو انہوں نے حرام ٹھہرایا، یقیناً وہ گمراہ ہوئے اور ہدایت یافتہ نہیں ہوئے [140]۔

تفسیر 140 اس آیت کا تعلق غیر اللہ کی نذر اور ان کے نام کی حرمت دونوں کے لئے ہے اور اس کے تین طریقوں سے ذکر کیا ہے یعنی :سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ :اور افتراء اور ان پر تین حکم مرتب کئے ہیں۔ خسران، ضلال ہدایت سے محرومی، خسران تو اس لئے کہ اولاد عظیم نعمت ہے اور اس کے قتل کرنے سے بہت بڑا نقصان ہوتا ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں ہے۔ گمراہی اس لئے ہے کہ بغیر علم و دلیل کے ہے اور ہدایت سے محرومی اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ڮ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

"اور وہی اللہ ہے جس نے پیدا کیے باغات، چوپائے اور چڑھائے ہوئے اور بغیر چڑھائے ہوئے اور پیدا فرمائی ہے کھجور اور کھیتی جو مختلف ہیں اس کے پھل اور زیتون اور انار (پتوں) میں ملتے جلتے اور (پھلوں میں) نہ ملتے جلتے تم کھاؤ اس کا پھل جب وہ پھل لائے اور اس کے کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو اور تم اسراف مت کرو یقیناً اللہ تعالیٰ فضول خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے [141]۔

تفسیر 141 اس آیت میں شرک نقلی پر دلائل عقلیہ سے رد کر کیے ہیں، یہ شرک اکثر فصلوں اور جانوروں میں ہوتا ہے تو ان دونوں سے متعلق دلائل ذکر کیے ہیں :مَعْرُوْشٰتٍ: سے مراد وہ پھل ہے جس کی بیل پھیلی ہوئی ہے جیسے تربوز یا انگور غَيْرَ

مَعْرُوْشَاتٍ: اپنے تنے اور جڑ پر قائم یعنی درختوں کی صورت میں ہو اس کی بہت قسمیں ہیں: مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ: (ہ) کی ضمیر راجع ہے: وَالزَّرْعَ: کی طرف بتاویل: كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا، وَالزَّيْتُوْنَ: اس سے تیل نکالا جاتا ہے: وَالرُّمَّانَ ان کا استعمال اکثر دوائیوں میں ہوتا ہے: مُتَشَابِهًا: یہ لفظ: زَيْتُوْن اور رُمَّانَ: سے ترکیباً حال ہے یا مراد یہ ہے کہ ایک ہی پودے یا درخت کے مختلف پھل ہوں جیسے کھجور میں کئی قسمیں ہیں اسی طرح فصل میں بھی ہیں: كُلُوْا: اس سے مراد یہ ہے کہ اس کو حرام مت سمجھو: ثَمَرِهٖ: ضمیر بتاویل مذکور اور: كُلِّ وَاحِدٍ: راجع ہے: وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ: جب پھل وغیرہ حاصل کرتے ہو تو اس میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرو اس میں اشارہ ہے کہ وہ فصل جو مالک حاصل کر لیتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے: وَلَا تُسْرِفُوْا: اسراف سے مراد یہ ہے کہ ان پھلوں اور فصلوں کو غیر اللہ کی نذر مت کرو اور اپنی طرف سے اس میں حرمت کے فیصلے مت کرو۔ ابن جریرؒ نے ایاس رحمہ اللہ سے ذکر کیا ہے کہ جو بھی حکم الٰہی کے مخالف ہو تو وہ اسراف ہے۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۴۲﴾

"اور چوپایوں میں سے بوجھ اٹھانے والے اور زمین سے لگے ہوئے اس لیں سے کھاؤ جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں رزق دیا ہے اور تم شیطان کے نقش قدم کی پیروی مت کرو یقیناً وہ تمہارا ظاہر دشمن ہے [142]۔

تفسیر 142 اس آیت میں دوسری دلیل عقلی ہے جس میں شرک فعلی کا رد کیا گیا ہے اور لفظ: اَنْشَاَ: مقدر ہے۔ حَمُوْلَةً: وہ جانور جن پر وزن لادا جاتا ہے اور زمین سے بلند ہوں جیسے اونٹ، گھوڑے خچر اور گدھے وغیرہ اور: وَفَرْشًا بکری، دنبے اور بھیڑ جو وزن نہیں اٹھا سکتے اور زمین کے بھی قریب ہوتے ہیں نیز ان کی کھالوں سے مختلف اشیاء بنائی جاتی ہیں: كُلُوْا: یعنی اس پر حرمت کا حکم مت لگاؤ: وَلَا تَتَّبِعُوْا: یعنی غیر اللہ کے نام پر مت دو۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۗ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

"اللہ نے پیدا کیے آٹھ نر اور مادہ بھیڑ میں اور بکری میں سے دو فرما دیجئے کیا دونوں نر اللہ تعالیٰ نے حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ یا وہ کہ مشتمل ہیں اس پر مادہ کے رحم (بچہ دانی) اگر تم سچے ہو تو مجھے علم کے ساتھ خبر دو [143]۔

تفسیر 143 یہ بھی دلیل عقلی ہے: ثَمٰنِيَةَ یہ حَمُوْلَةً اور فَرْشًا: سے بدل ہے اور اس میں لَفّ، نَشْرِ غَيْرِ مُرَتَّب کے ساتھ تفصیل ہے: زَوْج کی جمع: اَزْوَاج ہے یعنی ہر وہ چیز جو اس کی جنس میں سے اس کے ساتھ جوڑا ہو تو ایک کو زوج کہتے ہیں یہاں بھی یہی معنی مراد ہے۔ اس میں مشرکین سے دلیل کا مطالبہ ہے یعنی جن جانوروں کو تم حرام قرار دیتے ہو اس کے حرام ہونے کا سبب کیا ہے نر ہونا یا مادہ ہونا یا وہ جو مادہ کے رحم میں ہے؟ لہٰذا اگر نر ہونا حرمت کیلئے سبب ہے تو تمام نروں کو حرام قرار دو یا اگر مادہ ہونا سبب حرمت ہے تو سارے مادوں کو حرام قرار دو اور اگر رحم میں ہونا سبب حرمت ہو تو پھر تمام نر اور مادے حرام ہیں کیونکہ سبب سب کیلئے برابر ہے کہ رحموں میں رہیں لہٰذا اس میں تم جو فرق کرتے ہو اس پر دلیل لیکر آؤ۔ مگر اس جواب سے مشرکین قاصر ہیں: نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ: اس میں ان سے دلیل نقلی کا مطالبہ کیا گیا ہے کیونکہ علم سے مراد وہ حکم ہے جو وحی کے ذریعے اللہ کی طرف سے معلوم ہو شریعت میں اسی کو علم کہا جاتا ہے۔

وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۗ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ ع

"اور اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائے اونٹ میں دو اور گائے میں سے دو فرما دیجئے کیا دونوں نر اللہ تعالیٰ نے حرام کئے ہیں یا دونوں مادہ یا کہ مشتمل ہیں ان پر مادہ کے رحم کیا تم حاضر تھے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کے حرام ہونے کا حکم دیا تھا؟ پھر کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جس نے گھڑا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ تا کہ لوگوں کو بغیر علم گمراہ کرے اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت کی (توفیق) نہیں دیتا [144]۔

تفسیر 144 یہ آیت بھی سابقہ آیت کی طرح ہے پہلے ان سے عقلی دلیل کا مطالبہ کیا گیا پھر لفظ: اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ میں

دلیل نقلی کا مطالب ہے کہ کیا تمہیں اللہ تعالیٰ نے حاضر کیا پھر علم دیا اور تم نے سنا؟ فَمَنْ اَظْلَمُ: اس میں داعی مشرک کیلئے وعید ہے جو اور لوگوں کو گمراہی کی طرف بلاتا ہے جیسے کہ عمر بن لحی بن قمعہ الخزاعی نے عرب میں شرک منتقل کیا ہے۔

(صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4624 صحیح مسلم کتاب الجنۃ حدیث 2856) امام شربینی نے فرمایا ہے کہ اس وعید میں ہر وہ شخص داخل ہیں جو دین اسلام میں کوئی ایسی چیز کو داخل کرے جو اس میں نہیں ہے: الظّٰلِمِیْنَ: سے مذکورہ لوگ ہی مراد ہیں۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾

" آپ کہہ دیجیے میں نہیں پاتا اس میں جو میری طرف وحی کی گئی ہے کوئی چیز حرام کسی کھانے والے پر وہ کھائے الا یہ کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت ہو یقیناً وہ ناپاک ہے یا وہ فسق ہے کہ نام لیا گیا ہو اس پر اللہ کے سوا کسی اور کا تو بندہ لاچار ہو جائے بشرطیکہ وہ سرکش نہ ہو اور نہ ہی حد سے نکلنے والا ہو تو یقیناً آپ کا رب خوب رحم کرنے والا بہت ہی معاف کرنے وللا ہے [145]۔

تفسیر 145 اس آیت میں بھی تحریمات غیر اللہ پر عقلی دلیل کے بعد وحی کی دلیل سے رد کیا گیا ہے تو فرمایا کہ مشرکین کی طرف سے حرام قرار دی گئی چیزوں پر دلیل نقلی و عقلی نہیں ہے تو اب فرمایا جاتا ہے کہ دلیل وحی سے بھی نہیں ہے۔ مُحَرَّمًا: امام ابن کثیر نے فرمایا اس سے مراد وہ حرام کردہ چیزیں ہیں جو شریعت میں حرام نہیں ہیں بلکہ مشرکین نے خود اپنے اوپر حرام کی ہیں: اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ: اس میں مقصد حصر اضافی ہے حقیقی نہیں ہے اس لئے کہ حرام چیزیں تو اس کے علاوہ بہت ہیں تو مطلب یہ ہے کہ مذکورہ چیزیں حرام نہیں ہیں البتہ حرام وہ ہیں جو اللہ نے حرام کی ہیں مگر تم ان کو حلال قرار دیتے ہو۔ صرف ان چار چیزوں کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ انکا حرمت تمام آسمانی کتابوں دینوں میں موجود ہیں۔ اس کی تفصیل سورۃ بقرہ آیت 73، سورۃ مائدہ آیت 3 اور سورۃ نحل آیت 115 میں گئی ہے: مَّسْفُوْحًا: اس میں منجمد خون سے احتراز ہے تا کہ کلیجی تلی اور دل وغیرہ حرمت میں نہ ہوں۔ نیز وہ خون جو گوشت کے ساتھ لگا ہوا ہو حلال ہے یہ قول ابن کثیر نے نقل کیا ہے: فَاِنَّهٗ رِجْسٌ: یہ ضمیر خنزیر کی طرف راجع ہے تو معلوم ہوا کہ اس کی ذات اگرچہ زندہ ہو نجس ہے۔ امام شربینی اور بقاعی نے یہ نکتہ ذکر کیا ہے: اَوْ فِسْقًا شَیْئًا ذَا فِسْقٍ: مقدر کے ساتھ ہے فِسْقٌ: اعتقادی مراد ہے سورۃ مائدہ آیت 8

میں فسق لفظا موجود ہے یا پھر اُھِلَّ کیلئے فِسۡقًا: مفعول ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿١٤٦﴾

"اور ان لوگوں پر ہم نے حرام کیا تھا جو یہودی ہوئے ناخن والا جانور، اونٹ، شتر مرغ، بطخ وغیرہ اور گائے بکری میں سے چربی ہم نے ان پر حرام کی تھی مگر جو ان دونوں کے پیٹوں نے اُٹھائی ہو یا آنتوں یا جو ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو یہ ہم نے ان کی سرکشی کی وجہ سے ان کو سزا دی اور یقیناً ہم سچے ہیں [146]۔

تفسیر 146 اس آیت میں سوال کا جواب ہے سوال یہ تھا کہ جب اونٹ اور چربی اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہے تو پھر تم کیوں حلال سمجھ کر استعمال کرتے ہو؟ جواب ہوا کہ یہ تو صرف یہودیوں پر حرام ہے یہودیوں کے بعض مظالم کا ذکر سورۃ نساء آیت 160 میں ذکر ہوا ہے پھر بھی ان کے ظلم کا یہ حال تھا کہ چربی کو پگھلا کر اس سے گھی بنا لیتے اور فروخت کر کے اس کی قیمت حلال سمجھ کر کھا لیتے۔ نبی اکرم علیہ السلام نے فرمایا کہ یہودیوں کی طرح حیلے کر کے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں حلال مت کرو شیخ البانی نے اس روایت کو جید کہا ہے سلسلۃ الضعیفۃ 608 اس امت میں یہ عمل بہت عام ہو گیا ہے۔ (اَللّٰھُمَّ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا) لَصٰدِقُوْنَ: اس میں اشارہ ہے کہ یہود نے کہا تھا کہ دین ابراہیم میں اونٹ کا گوشت حرام ہے تو فرمایا گیا کہ یہ جھوٹ ہے۔

فَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٤٧﴾

"پھر اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو فرما دیجئے تمہارا رب وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب مجرم قوم سے نہیں پھیرا جا تا [147]۔

تفسیر 147 اس آیت میں نبی اکرم علیہ السلام کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو صبر کریں اللہ تعالیٰ مہلت دینے کی وجہ سے اگر ان کو ڈھیل دیتا ہے تو وہ اس کی وسیع رحمت کا سبب ہے مگر وہ مجرموں کیلئے قہر و غضب کا مالک بھی ہے: وَلَا يُرَدُّ: عطف ضد کا دوسری ضد پر ہے۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ﴿١٤٨﴾

"عنقریب وہ لوگ کہیں گے جنہوں نے شرک کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہی ہمارے اباء و اجداد اور نہ ہی ہم حرام کرتے اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ انہوں نے چکھا ہمارا عذاب فرما دیجئے کیا ہے تمہارے پاس کوئی علم (کی دلیل) تو تم اس کو ہمارے سامنے لے آؤ تم پیروی نہیں کرتے مگر گمان کی اور نہیں ہو تم مگر اندازوں پر چلنے والے [148]۔

تفسیر 148 اس آیت میں مشرکین کی دلیل کا رد ہے ان کا کہنا تھا کہ ہم شرک اعتقادی یا فعلی کرتے ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ راضی ہے کیونکہ ہر کام اس کی مشیت اور چاہت سے ہوتا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ كُلُّ شَيْءٍ بِمَشِيَّةِ اللّٰهِ انہوں نے یا الزاما کہا۔ یعنی ایمان والوں کو انہوں نے کہا کہ بقول تمہارے سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا و ارادے سے ہوتا ہے۔ ہمارا شرک بھی اس کی رضا سے ہے؟ پہلا جواب یہ ہوا کہ: كَذٰلِكَ كَذَّبَ: معنیٰ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہوتا تو سابقہ جھٹلانے والوں کو عذاب کیوں دیتا؟۔ دوسرا جواب: قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ: یعنی یقینی دلیل اس پر پیش کرو جبکہ ایسی دلیل پیش کرنے سے وہ عاجز ہیں۔ تیسرا جواب: اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ: یہ تمہارے اندازے کی باتیں ہیں دلیل نہیں ہے اس طرح سورۃ نحل آیت 35 سورۃ زخرف آیت 20 میں بھی ہے: سَيَقُوْلُ: اس میں پیشن گوئی ہے اور سین مستقبل کے لیے ہے اور اس کا واقع ہونا سورۃ نحل اور سورۃ زخرف میں ذکر ہوا ہے یا سین برائے تاکید ہے: كَذَّبَ: دیگر شرعی احکام میں تکذیب مراد ہے یا پھر مطلب یہ ہے کہ مشرکین نے لَوْ شَآءَ بطور تکذیب کہا تھا۔

قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٤٩﴾

"فرما دیجئے پس اللہ تعالیٰ ہی کیلئے محکم (قوی) دلیل ہے پھر اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دیتا [149]۔

تفسیر 149 یہ توحید پر یقینی دلیل ہے۔ یعنی رسولوں کو بھیجنا اور کتابوں کو نازل کرنا: اَلْبَالِغَةُ: جو سچائی، عربیت اور فصاحت و بلاغت میں انتہا کو پہنچ چکا ہو۔ ربیع بن انس سے روایت منقول ہے کہ جو لوگ شرک و بدعت کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے

پاس اپنے عمل کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی کوئی دلیل و حجت نہیں ہے البتہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حجت بالغہ ہے جبکہ ہدایت کی توفیق واختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ

اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿١٥٠﴾ ع

"فرما دیجئے تم لے آؤ اپنے گواہ جو یہ گواہی دیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کیا ہے پھر اگر وہ (بے دلیل) گواہی دیں تو آپ ان کے ساتھ گواہی نہ دیں اور آپ لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اپنے رب کے ساتھ لوگوں کو برابر تصور کرتے ہیں [150]۔

تفسیر 150 یہ ان کے علماء سے دلیل کا مطالبہ ہے هٰذَا: یعنی آیت 138 اور 139 کی طرف اشارہ ہے: الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: یہ کفر کے تین اصول ہیں (۱) آیتوں کی تکذیب، (۲) آخرت کا انکار، (۳) اور ارتکاب شرک اس قسم کے لوگوں کا دین خواہشات پر مبنی ہے: فَاِنْ شَهِدُوْا: مراد یہ ہے کہ اگر وہ بلا دلیل اپنی خواہشات سے بیان کریں تو آپ ان کا ساتھ نہ دیں کیونکہ خواہش کی پیروی منع ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ

اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ

حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿١٥١﴾

"فرما دیجئے آؤ میں پڑھتا ہوں جو کچھ تمہارے رب نے تم پر حرام کیئے ہے کہ تم شریک نہ ٹھہراؤ اس کے ساتھ کسی کو اور والدین کے ساتھ احسان کرو اور مفلسی کے خوف سے اولاد کو قتل مت کرو ہم ہی تمہیں رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی اور تم بے حیائی کے کاموں کے قریب مت جاؤ ان میں سے جو ظاہر اور جو پوشیدہ ہو اور تم اس جان کو قتل مت کرو جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ ان سب باتوں کا اللہ تعالیٰ تمہیں مضبوط حکم دیتا ہے تاکہ تم سمجھو [151]۔

تفسیر 151 اس آیت سے سورت کے آخر تک تیسرا باب ہے اس میں چھ حرام چیزوں کا اور پانچ احکام مذکور ہیں جن کی مخالفت حرام ہے پھر موسیٰ علیہ السلام کی کتاب سے دلیل نقلی مذکور ہے پھر عذروں کو ختم کرنے کیلئے قرآن کی طرف ترغیب

ہے پھر دنیاوی تخویف اور مخالفین کیلئے تنبیہ ہے آخر میں نبی ﷺ کا شرک کی رد پر بیان ہے اور اختتام ترغیب پر کیا ہے۔ **قُلْ تَعَالَوْا**: ان لوگوں سے کہو کہ تم جن چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دیتے ہو وہ حرام نہیں ہے ان کو حرام کی تفصیل بیان کرو۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ تمام علماء پر ان محرمات کو بیان کرنا لازم ہے اور **:تَعَالَوْا**: میں اشارہ ہے کہ ان کو ماننا بلندی و رفعت کا سبب ہے۔ ابن ابی حاتم نے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان تین آیتوں پر صحابہ کرام سے بیعت لی ہے: **مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ**: اس میں جو پانچ اوامر اور احکام ذکر ہوئے ہیں ان سے روگردانی حرام ہے **حَرَّمَ** کے تحت اس کا ذکر موجود ہے پھر جو اعمال اس آیت میں مذکور ہیں وہ سارے عقل دانوں کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں لیکن مخالفت کرنے والوں نے عقل کے بھی خلاف کام کیا ہے اور ان کاموں کو اچھا بھی قرار دیتے ہیں اس لیے فرمایا کہ **لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔ وَلَا تَقْتُلُوا**: اس قتل کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) قتل حقیقی جیسے دور جاہلیت کے مشرکین میں طریقہ رائج تھا۔ (۲) حمل گرانا یعنی اسقاط حمل اور ضبط تولید منصوبہ بندی۔ (۳) قتل حکمی یعنی دین کے علوم سے محروم کر کے صرف دنیاوی علوم و ہنر میں لگانا تاکہ رزق کمائیں اور اسی میں مشغول رہیں اس آیت میں ان لوگوں کو منع کیا گیا ہے جو غربت کی وجہ سے اولاد کو قتل کرتے تھے۔ اس طرح سورۃ بنی آیت 31 میں مالدار لوگوں کو منع کیا ہے وہ اولاد کو اس لیے قتل کرتے تھے کہ یہ روزی کہاں سے کھائیں گے اس وجہ سے یہاں پر **مِّنْ إِمْلَاقٍ**: فرمایا ہے کہ فقیری موجود ہے جبکہ بنی اسرائیل میں **:خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ**: فرمایا ہے یعنی مالدار ہیں مگر فقیری کا خوف ہے اور چونکہ فقیری کے خوف میں انسان سب سے پہلے اپنی فکر کرتا ہے تو اس لیے **نَّرْزُقُكُمْ**: کہہ کر والدین کا ذکر کیا ہے۔ مالداری کی حالات میں اولاد پر خوف کھاتے ہیں تو اس لیے وہاں پہلے **:هُمْ أَوْلَادُ**: کہہ کر ذکر کیا ہے۔ سوال: اس کے بعد بعض منہیات اور کچھ مامورات کا ذکر ہے یعنی جن کے کرنے کا حکم ہے وہ **حَرَّمَ** کے تحت کیسے داخل ہیں؟ اور منہیات کو بھی کے تحت کس طرح ذکر کیا ہے جبکہ **:حَرَّمَ** کیلئے بھی مفعول نہیں ہو سکتا؟۔ (جواب ۱) **أَلَّا تُشْرِكُوا**: سے قبل **هُوَ**: مقدر ہے جو **مَا حَرَّمَ**: کی طرف راجع ہے البتہ **حَرَّمَ**: کے تحت مامورات کا داخل ہونا اشکال باقی ہے۔ جواب ۲: **عَلَيْكُمْ**: اسم فعل ہے یعنی تم پر لازم ہے: **أَلَّا تُشْرِكُوا** شرک نہ کرنا۔ مامورات بھی لازم ہیں اور **حَرَّمَ**: کے ساتھ دوسرا فعل: **أَوْجَبَ** مقدر مراد ہے۔ جواب ۳: **حَرَّمَ**: فرض اور **أَوْجَبَ**: کے معنی میں ہے جس کا مفعول مقدر ہے یعنی ان مامورات اور منہیات پر عمل کرنا۔ جواب ۴: **حَرَّمَ** اپنے معنی پر ہے اور مفعول مقدر یعنی: **مُخَالَفَتُهُ** اور **تُشْرِكُوا**: سے پہلے **هُوَ**: مقدر ہے **وَبِالْوَالِدَيْنِ**: یہاں پر

اَلَّا تُشْرِكُوْا: کہ ان کو برا بھلا مت کہو اس میں اشارہ ہے کہ والدین کو صرف تکلیف دینا منع نہیں ہے بلکہ ان کے ساتھ احسان لازم ہے۔ اَلْفَوَاحِشَ: وہ گناہ جو بے حیائی سے متعلق ہوں اور عقل اس کو ناپسند کرے: بِالْحَقِّ: مرتد ہونے، قاتل ہونے اور شادی شدہ ہو کر زنا کے ارتکاب سے قتل جائز ہوتا ہے: وَصّٰىكُمْ: اللہ تعالیٰ کی وصیت وہ تاکیدی حکم ہوتا ہے جو منسوخ نہیں ہوتا۔

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۟ۙ

"اور تم یتیم کے مال کے قریب مت جاؤ مگر اس طریقے سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی کو پہنچ جائے اور تم ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو اور ہم کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق اور جب تم (بات) کرو تو انصاف کے مطابق کرو اگرچہ تمہارے قریبی رشتہ دار ہوں اور تم اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو یہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کا مضبوط حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو [152]۔

تفسیر 152 مشرکین بھی ان کاموں کی اچھائی کو تسلیم کرتے تھے مگر عملاً مخالفت کرتے اس لیے فرمایا گیا: لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ: یعنی ان کاموں کی اچھائیوں کو مت بھلاؤ: لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا: یہ جملہ معترضہ ہے کہ ان کاموں پر عمل کرنا تمہارے بس اور طاقت میں ہے لہٰذا اس کی مخالفت مت کرو۔ یا اس میں تسلی ہے کہ اپنی طاقت کو اللہ تعالیٰ کی بندگی میں لگاؤ اور جو طاقت میں نہ ہو اسے اللہ تعالیٰ معاف کر دیگا: وَاِذَا قُلْتُمْ: قول عام ہے فیصلہ کرنے میں ہو، گواہی دینے میں ہو یا دعوت و تبلیغ میں: فَاعْدِلُوْا: عدل حق کہنے اور سچ بولنے کے معنی میں ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

"اور جان لو کہ یہ (قرآن) میرا سیدھا راستہ ہے اسکی پیروی کرو اور مت پیروی کرو اور راستوں کی وہ تمہیں الگ کر دینگے اس کے راستے سے اس کا اللہ تعالی نے تمہیں حکم دیا ہے تا کہ تم متقی ہو [153]۔

تفسیر 153 اس آیت میں ایک حکم اور ایک نہی ہے: صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا: سے قرآن و سنت مراد ہے: سُبُلَ سے مراد وہ تمام طریقے مذاہب اور نظریات جو قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ یہودیت، نصرانیت، مرزائیت، رافضیت اور تمام بدعات رسم و رواج اس میں داخل ہیں اور قرآن و سنت کی پیروی سے تقوی حاصل ہوتا ہے اس لیے: تَتَّقُوْنَ فرمایا: هٰذَا میں اس سورۃ کے مضمون یا پورے قرآن کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝ ع

"پھر (یہ بھی سنو) دی تھی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (قرآن سے پہلے) نعمت پورا کرنے کیلئے اس شخص پر جو صالح ہے اور ہر چیز کی تفصیل بیان کرنے کیلئے ہدایت اور رحمت ہے تا کہ وہ اپنے رب کے ملاقات پر ایمان لے آئیں [154]۔

تفسیر 154 یہ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب سے دلیل نقلی ذکر کی ہے کہ اس کتاب میں بھی اوامر و نواہی مذکور تھے: ثُمَّ خبر کی ترتیب کے لیے ہے یعنی ثُمَّ اَخْبَرَكُمْ ۔ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ: بنی اسرائیل میں محسنین لوگ ہیں یا موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور یہ کتاب یعنی تورات ان کے لیے کامل حجت تھی اور ان پر اللہ تعالی کی طرف سے احسان تھا یا پھر: الَّذِيْٓ اَحْسَنَ سے مراد اچھا طریقہ ہے: تَمَامًا: اس سے مراد تَامًّا كَامِلًا: یعنی اس اچھے خوبصورت طریقے پر کامل مکمل کتاب ہے لَعَلَّهُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ: اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالی کی کتاب سے تعلق رکھنا قیامت پر ایمان کی مضبوطی کا سبب ہے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

"اور یہ (قرآن) ایک (عظیم) کتاب ہے اس کو ہم نے اتارا مبارک ہے تم اس کی پیروی کرو اور ڈرو تاکہ تم رحم کیے جاؤ[155]۔

تفسیر 155 یہ قرآن کی دو صفات کے ذکر کے ساتھ قرآن کی طرف ترغیب ہے اور دو حکم اور ایک نہی ہے۔ مُبٰرَكٌ: اس سورۃ کی آیت 72 میں تشریح گزر رہی ہے۔ وَاتَّقُوْا: کتاب اللہ کی مخالفت سے خود کو بچاؤ۔

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾

"تاکہ تم یہ نہ کہو کہ یقیناً ہم سے پہلے دو گروہوں پر کتابیں اتاری گئی تھیں اور ہم ان (کتابوں) کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے[156]۔

تفسیر 156 اس آیت میں دو گروہوں یہود و نصاریٰ کے عذر کا خاتمہ ہے کتابوں سے تورات و انجیل مراد ہے ان کے پڑھنے سے غافل ہونے کا ایک معنی تو یہ ہے کہ یہ سریانی یا عبرانی زبان میں تھیں اور یہ لوگ عربی ہیں تو ان سے غافل بے خبر اس لئے تھے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ ان کتابوں کو لوگوں سے چھپاتے تھے ان کا بیان نہیں کرتے تھے۔

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّ
رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا
سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

"یا تم (یہ) کہو کہ اگر نازل کی ہوتی ہم پر کتاب تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے تمہارے پاس تمہارے (رب) کی جانب سے واضح دلیل اور ہدایت و رحمت آ گئی ہے لہذا کون زیادہ ظالم ہو سکتا ہے اس سے جس نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو اور ان سے اعراض کیا عنقریب ہم سخت عذاب کی سزا دیں گے ان لوگوں کو جو ہماری آیتوں سے اعراض کرتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ تھے اعراض کرنے والے[157]۔

تفسیر 157 اس آیت میں دوسرا عذر ختم کیا گیا ہے سورۃ فاطر آیت 42 میں بھی اس طرح ہے: اَوْ تَقُوْلُوْا: بصریوں کے نزدیک: تَقُوْلُوْا: سے پہلے: كَرَاهِيَةً: اور کوفیوں کے نزدیک: لِاَنْ لَّا: مقدر ہے: لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ: عرب نے

یہ دعویٰ اس لئے کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو زیادہ عاقل سمجھدار ذہین اور :إِنَابَتْ إِلَى الْحَقِّ: والے سمجھتے تھے :وَّ رَحْمَةٌ اس کے بعد: كَذَّبْتُمْ: جملہ مقدر ہے :وَ صَدَفَ عَنْهَا: لازم اور متعدی دونوں ہوسکتا ہے البتہ ابن کثیر نے یہاں متعدی کی بہتر قرار دیا ہے (یعنی اور لوگوں کو منع کرتے ہیں) پھر قرآن سے اعراض کرنے والوں کو وعید ہے اور عذاب کا سبب بھی یہی ہے اس لئے بار بار اس پر وضاحت کی ہے۔

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ ۗ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ انتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ ﴿١٥٨﴾

"نہیں وہ انتظار کرتے مگر (اس بات کی) کہ ان کے پاس (موت یا عذاب کے) ملائک آئیں یا آپکا رب (اپنی شان کے مطابق) آئے یا کوئی بڑی نشانی آپ کے رب کی طرف سے (عذاب) کی آئے جس دن آجائیگی تیرے رب کے عذاب کی نشانی تو فائدہ نہیں دے گا کسی نفس کو اس کا ایمان لانا کہ اس سے پہلے وہ ایمان نہیں لایا ہو یا نہیں کمائی اس نے اپنے ایمان میں کوئی نیکی فرما دیجئے تم انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہیں [158]۔

تفسیر 158 قرآن کی تکذیب کرنے اور اس سے اعراض کرنے والوں کے لئے یہ دنیاوی عذاب سے تخویف ہے یعنی دلائل آنے اور قرآن نازل ہونے کے باوجود انکار پر مصر ہیں اور انتظار میں ہیں کہ عذاب یا موت جب آجائے تو ایمان لے آئینگے لیکن اس وقت ایمان قبول نہیں ہوتا ہے :يَأْتِيَ رَبُّكَ: یہ متشابھات میں سے ہے ظاہر پر ہمارا ایمان ہے یعنی بلا تاویل و تحریف اور بلا تشبیہ و تمثیل اس کو ہم تسلیم کرتے ہیں اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے :بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ: اس سے موت کا وقت یا توبہ کا دروازہ بند ہونے کا وقت ہے جب سورج مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا ان دونوں میں توبہ کی قبولیت اور ایمان کی قبولیت نہیں ہوگا :أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا: ایک معنی تو یہ ہے کہ فائدہ نہیں دے گا کسی نفس کو خیر کا عمل یعنی جب انہوں نے حالت ایمان میں توبہ نہیں کی تھی مقدر عبارت اس طرح ہوگا :أَوْ نَفْسًا لَا يَنفَعُهَا كَسَبَتْ عَمَلَ الْخَيْرِ لَمْ تَكُنْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا: یہ امام ابن کثیر کا قول ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ایمان ذرہ برابر فائدہ نہیں دیگا جب وہ اس سے قبل نہ ایمان لایا ہو نہ عمل کیا ہو۔ کامل فائدے سے مراد بغیر سزا جنت میں داخل ہونا ہے اس توجیہ کے لحاظ سے آیت میں عموم کی نفی ہے کہ نفع کے عدم کے لئے دو امروں کے مجموعے کی نفی کو شرط بنایا گیا ہے تو مفہوم مخالف سے یہ معلوم ہوگا کہ نفع کے لئے دو امروں میں سے ایک امر شرط ہے :مَا يَعِ الْخَلْقِ: کے طریقے پر ان

توجیہات میں معتزلہ کا رد ہے ان کا نظریہ ہے کہ دوسرے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالت ایمان میں جس نے نیک عمل نہ کیا ہوتو اس کو یہ ایمان فائدے نہیں دیگا یعنی ہمیشہ جہنم میں رہے گا تو یہ دلیل ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ابدی جہنمی ہے جبکہ ان کا یہ عقیدہ قرآن کی کئی آیتوں اور صحیح احادیث کے خلاف ہے اور باطل و مردود ہے لہٰذا اس آیت کا سابقہ دو توجیہات میں سے ایک اپنائی جائے تو پھر معتزلہ کا اعتراض ختم ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿159﴾

° جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ بازی کی اور گروہ گروہ ہو گئے آپ ان میں سے کسی چیز میں نہیں ہیں ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے وہ انہیں خبر دے گا اس چیز کی جو وہ کرتے تھے [159]۔

تفسیر 159 اس آیت میں ان لوگوں کیلئے وعید ہے جو قرآن و حدیث سے اعراض کر کے مختلف گروہ میں بٹ گئے۔ اور حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا جو موقوفاً منقول ہے کہ یہ اس امت کے بدعتی لوگ ہیں مگر اس حدیث کا مرفوع ہونا ثابت نہیں ہے (طبرانی صغیر 203/1 ابو نعیم في الحلية 138/1 شعب الايمان للبيهقي 6239/5 مجالد راوی کی وجہ سے محققین علماء نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے تخریج ابن کثیر) فَرَّقُوْا: یعنی دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے اور ہر ایک کے پاس جتنا ٹکڑا ہے اس کو پورا دین قرار دیتا ہے یا فَرَّقُوْا، فَارَقُوْا: کے معنی میں ہے جیسے کہ ایک قرأت میں ہے یعنی دین اسلام سے جدا ہوتے ہیں یہ صفت یہود و نصریٰ میں موجود ہے جیسے کہ سورۃ اَلْبَيِّنَةُ آیت 13 ور سورۃ نساء آیت 150۔ البتہ آیت کا حکم عام ہے پہلے عقیدے اور عمل کا تفرق آتا ہے پھر الگ الگ جماعتیں فرقے وجود میں آجاتے ہیں پھر ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف عداوت تعصب اور دشمنی پر اتر آتے ہیں اس لئے فَرَّقُوْا: کے بعد وَكَانُوْا شِيَعًا: فرمایا۔ سورۃ روم آیت 32 میں بھی ہے: لَسْتَ مِنْهُمْ: یعنی آپ ان کے ساتھ کسی بھی حال میں تعلق نہیں رکھتے اور آپ سے ان کے متعلق کوئی سوال نہیں ہوگا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰۤی اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

"جو شخص ایک نیکی لائے گا اس کیلئے اس کا دس گناہ ثواب ہوگا اور جو شخص لائے گا ایک برائی تو وہ سزا نہیں دیا جائیگا مگر اس کی مثل اور وہ ظلم نہیں کئے جائینگے [160]۔

تفسیر 160 یہ آخرت کی سزا کی تفصیل ہے یعنی فرقے کا نہیں بلکہ اعتبار اچھے اور برے عمل کا ہے: عَشْرُ اَمْثَالِهَا یہ کم سے کم مقدار ہے جو اس سے بڑھ کر مقدار ہے وہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ (سوال) اَمْثَال: تو مذکر کی جمع ہے اس کو عَشْرَةٌ تانیث لانا چاہیے تھا۔؟ (جواب) اس میں لفظ: حَسَنَاتٍ: مقدر ہے یعنی: عَشْرُ حَسَنَاتٍ اَمْثَالِهَا: ایک نیکی اس طرح ہے جیسے کہ دس نیکی کرے اور ہر ایک نیکی کا ایک اجر ہے تو اس طرح دس نیکیاں ہوگئیں: حَسَنَه: وہ عمل جو عقیدہ توحید اور اتباع رسول پر مبنی ہو اور سَیِّئَه وہ ہے جو اس کے برعکس ہو۔

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۶۱﴾

"فرما دیجئے مجھے پہنچایا ہے میرے رب نے سیدھے راستے تک جو مضبوط دین ملت ابراہیم علیہ السلام ہے جو توحید پر قائم تھے اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے [161]۔

تفسیر 161 یہ نبی کریم ﷺ کا تفصیلی بیان ہے اس کو دلیل وحی کہتے ہیں۔ یہ تعلیم کے طریقوں میں سے چوتھی قسم ہے جو دین حق کا بیان ہے یہ صراط مستقیم ہے دِیْنٍ قِیَمٍ: ہے اور مِلَّتِ ابراہیمی ہے: هَدٰىنِیْ: اس میں دلائل عقلیہ نقلیہ اور تعلیم کے طریقوں کی طرف اشارہ ہے جو اس سورت میں گزرے ہیں: دِیْنًا قِیَمًا: اس میں عقلی دلائل کی طرف اشارہ ہے دِیْنًا: یہ صراط مستقیم کے محل سے بدل ہے یا پھر اِتَّبِعُوْا: فعل مقدر ہے: مِلَّةَ یہ دِیْنًا: سے بدل ہے اور یہ بیانات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موحدین اور مشرکین میں اظہار فرق ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾

"آپ فرما دیجئے میری نماز اور میری قربانی (مالی عبادت) اور میری موت (سب) اللہ رب العالمین کے لئے ہے [162]۔

تفسیر 162 یہ ملت ابراہیمی کا خلاصہ ہے مالی اور بدنی عبادات اور زندگی گزارنے کا طریقہ اور مرنا صرف اللہ رب العزت کے لئے ہے: صَلَاتِیْ: فرض نفل سب کو شامل ہے: نُسُكِیْ: قربت الٰہی کیلئے اطاعت کے تمام امور کو کہتے ہیں۔ (قرطبی)

یا صرف نماز جیسی قربانی اور حج کے طریقے مراد ہیں۔ وَمَحْيَايَ: زندگی گزارنا اور ہر وہ کام جو میں زندگی میں کرتا ہوں وَمَمَاتِي: مرنا اور وہ اطاعت، عقیدہ اور ایمان کی وہ حالت جس پر میں مرونگا، یا مرتے وقت وصیت مراد ہے۔

لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٦٣﴾

"اس کا کوئی شریک نہیں ہے اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہوں اور میں سب سے پہلا موحد ہوں[163]۔

تفسیر 163 شرک اعتقادی و عملی دونوں کی نفی مراد ہے: وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ: ہر نبی اپنی امت میں پہلا مسلم ہوتا ہے اور یہ لفظ نبی ﷺ کی خصوصیت ہے نبی کے علاوہ امتی کیلئے تلاوت قرآن مجید کے علاوہ اس طرح کہنا درست نہیں ہے بلکہ وہ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ: کہے گا (سورۃ احقاف آیت 15 میں بھی مِنَ الْمُسْلِمِينَ ہے)(مترجم) جیسے کہ بعض روایات میں ہے (سنن ابو داؤد کتاب السنۃ حدیث 4629).

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۚ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ
ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿١٦٤﴾

"فرما دیجئے کیا میں کسی اور کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب تلاش کروں جبکہ وہی ہر چیز کا رب ہے اور نہیں کماتی کوئی جان (گناہ) مگر اس کا وبال اسی پر ہوگا اور نہیں اٹھائے گی کوئی بوجھ اٹھانے والی جان بوجھ کسی اور جان کا پھر تمہارے رب کی طرف تمہاری واپسی ہے پھر وہ تمہیں اس چیز کے ساتھ خبر دیگا جس میں تم اختلاف کرتے تھے[164]۔

تفسیر 164 یہ تعلیم کا دوسرا طریقہ ہے اور تین سوالوں کے جوابات ہیں۔ سوال ۱: اللہ تعالیٰ کے سوا بھی عالم کا تدبیر کرنے والا کوئی ہوسکتا ہے جیسے کہ قطب؟۔ جواب: اللہ تعالیٰ رب ہے جو ہر چیز کا مدبر ہے تو کسی دوسرے مدبر کی ضرورت نہیں ہے۔ سوال ۲: اگر کہا جائے کہ اس عقیدہ کو اپنانے میں گناہ نہیں ہے؟۔ تو جواب ہوا کہ: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ: کسب سے مراد وہ گناہ ہے جیسے کہ شرک اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتا بلکہ مشرک پر شرک کا وبال ضرور آئیگا۔ سوال ۳: اگر کوئی کہہ دے کہ تیرا گناہ میری ذمہ ہے صرف تم یہ عمل کرو؟۔ جواب: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ: سوال ۵: جب گناہ کا بوجھ کوئی اور نہیں اٹھا سکتا صرف گناہگار ہی اٹھائیگا تو: وَازِرَةٌ: کی تخصیص کی کیا ضرورت تھی؟۔ جواب: اس قسم کا دوسرا ڈالنے والا اکثر (وَازِرَةٌ) گناہگار ہوتا ہے اس لئے تخصیص کی گئی ورنہ حکم عام ہے اس طرح سوالات سورۃ عنکبوت آیت 12 میں ذکر ہوئے ہیں: ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ: یہ تخویف اخروی ہے: فَيُنَبِّئُكُمْ: خبر دینے سے حق پرست اور باطل

پرست لوگوں کے درمیان جزاء سزاء کے ذریعے فیصلہ کرنا مراد ہے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖؗ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾

"اور وہی ہے جس نے زمین میں تمہیں جانشین بنایا اور تمہارے ایک کو دوسرے پر درجات بلند کیے تا کہ ان نعمتوں میں وہ تمہیں آزمائے جو اس نے تمہیں دی ہیں یقیناً آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے [165]۔

تفسیر 165 یہ احکام پر عمل کرنے کی طرف ترغیب ہے اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ثابت کرتا ہے جو گزشتہ آیت میں ہے خَلٰٓئِفَ: امام سجستانی کا قول ہے کہ اس کا معنی رہنے والے ہیں جو دنیا میں ایک دوسرے کے بعد نائب بنتے ہیں اور امام شربینی کا قول ہے کہ یہ صفت صرف اس آخری امت کی ہے کہ ان کا نبی خاتم النبیین ہے تو یہ امت بھی سابقہ امتوں کے خلیفہ ہے۔ یا خلفاء سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین میں مقرر کیے گئے خلیفہ جو زندگی گزارنے کیلئے تصرفات اختیارات دیئے گئے ہیں: وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ: یہ ایک سوال کا جواب ہے کہ جب ہر شخص میں خلافت کی صفت ہے تو پھر سب میں مساوات ہونا چاہئے؟۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں فرق رکھا ہے بعض عاقل بعض جاہل مالدار بعض غریب بعض مالک بعض غلام اس میں سب کا امتحان ہے اور اس امتحان میں توحید کی پہچان مقصود ہے اور اس نعمت پر شکر گزاروں اور ناشکروں میں فرق کرنا مقصود ہے: فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ: اس سے مراد ہر وہ حالت اور صفت ہے جو بندے کو اللہ تعالیٰ نے دی ہے مالدار پر مالداری کا اور غریب پر غربتی کا امتحان ہے اسی طرح خوبصورت شکل والے پر اور بدصورت والے پر ان حالتوں میں امتحان ہے عاقل عالم پر علم میں اور جاہل بے عقل پر اس حال میں آزمائش و امتحان ہے: اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ: ناشکروں کیلئے نعمت کی بے قدری کی وجہ سے اس میں عذاب کی وعید ہے اور اسی طرح ان لوگوں کیلئے جو اس سورۃ پر عمل نہیں کرتے: اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اس میں نعمتوں پر شکر کرنے والوں کے لئے اور اس سورۃ پر عمل پیرا ہونے والوں کیلئے خوشخبری ہے اور چونکہ اللہ کا رحمت و مغفرت غضب پر غالب ہے اس لئے: لَغَفُوْرٌ: کے ساتھ لام تاکید ذکر کیا ہے۔

سورۃ انعام کے امتیازات:

۱۔ امام قرطبی کا قول ہے اس میں مشرکین، مبتدعین اور منکرین قیامت سے مباحثہ ہے۔

۲۔ اس سورۃ میں کثرت سے مختلف دلائل عقلیہ مذکور ہیں۔

۳۔ توحید پر بطور استدلال کے لئے کثیر تعداد میں انبیاء کا ذکر ہے۔

۴۔ اس سورۃ میں داعی کیلئے (6) چھ عقبات بطور شجاعت ذکر ہے اور اس میں سے ہر ایک عقبہ کو ذ لک سے مصدر کیا گیا ہے۔

۵۔ اس میں شرک کے تمام اقسام پر رد کیا گیا ہے۔

۶۔ اس سورۃ مین مشرکین کے تمام اقسام پر رد ہوا ہے۔

۷۔ اس سورۃ میں عرب جاہلیت کے ان قوانین کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنی طرف سے حلال وحرام کے متعلق بنا رکھے تھے۔

۸۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کا حلال وحرام کیا ہوا تفصیل سے ذکر ہے۔

۹۔ اس سورۃ میں دعوت وتعلیم کے طریقوں کا کثرت سے ذکر ہے۔

۱۰۔ اس میں منکرین کے شبہات کا ازالہ اور ان کے اعتراضات پر رد ہے جو لفظ قالو سے پانچ مرتبہ ذکر ہے اور جواب کو (39) انتالیس مرتبہ لفظ قل سے ذکر کیا ہے۔

"اس سورۃ کی تفسیر مکمل ہونے پر ہم اللہ تعالیٰ کی حمد وشکر کرتے ہیں"

رکوعاتها ٢٤ ۞ ٧ سُورَةُ الْأَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ ٣٩ ۞ آیاتها ٢٠٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"(خالص اللہ کے نام کی مدد چاہتا ہوں شروع کرتے ہوئے میں جو رحمٰن و رحیم ہے)"

المٓصٓ ۚ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِتَّبِعُوْا مَآ
اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۗ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

"اللہ تعالیٰ ان حروف کی مراد کو جانتا ہے [1]۔ یہ کتاب ہے آپ کی طرف نازل کی گئی ہے پس نہ ہو آپ کے سینے میں کوئی تنگی اس سے تاکہ آپ ڈرائیں اس کیساتھ اور نصیحت ہے ایمان والوں کیلئے [2]۔ اتباع کرو اس کی جو تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تمہارے رب کی طرف سے اور نہ پیروی کرو اللہ تعالیٰ کے علاوہ باقی دوستوں کی بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو تم" [3]۔

اس سورۃ کا پہلے کیساتھ ربط یہ ہے کہ سورۃ انعام میں توحید کے مسئلے پر دلائل عقلیہ ذکر ہوئے تو اب اس مسئلہ پر منقولہ دلائل ہیں اور توحید کے بیان کیلئے انبیاء علیہم السلام کی بہادری ذکر کر رہا ہے اسی طرح پہلی سورۃ میں تفصیل کیساتھ توحید کا اثبات ہوا تو اس سورۃ میں منکرین کے احوال ذکر ہو رہے ہیں عتاب کے بارہ نمونوں کیساتھ وہ گزشتہ سات قومیں ہیں اور ابلیس ہے اور وہ قوم جو اپنے بتوں کی پوجا کرتی تھی اور بچھڑے کی عبادت کرنے والے اور قول شرعی کو تبدیل کرنے والے اور بیچنے والے اور اَلَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ: ان سب پر مختلف قسم کے عذاب آئے ہیں۔ اس سورۃ میں تین قسم کے دعوے ہیں پہلا توحید کے مسئلے اور قرآن کے بیان میں بہادری اختیار کرو۔ دوسرا کتاب اور سنت کی پیروی کرو اس کے خلاف کسی کی پیروی مت کرو خصوصاً تحلیل اور تحریم میں۔ تیسرا عبادت اور پکارنے میں اللہ تعالیٰ کیساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ پوری سورۃ ان تین دعووں کیساتھ تعلق رکھتی ہے اور مرجع اور اہم دعویٰ اس میں توحید کا اثبات ہے چھ طریقوں کیساتھ جو راقم الحروف کی کتاب توجیہ الناظرین میں مزید تفصیل کی ساتھ موجود ہے۔ خلاصہ: اس سورۃ کے دو حصے ہیں پہلا حصہ آیت 54 تک ہے اس میں تین باب ہیں پہلا باب آیت 10 تک ہے اس میں پہلا اور دوسرا دعویٰ مذکور ہے پھر آیت 4 اور آیت 5 میں منکرین کے تین حالات کے ذریعے سے تخویف دنیوی ہے پھر آیت 6، 7، 8 میں تین حالات کے ذکر کے ذریعے تخویف اخروی ہے پھر

آیت 10 میں ترغیب ہے

تفسیر 1 حروف مقطعات سے متعلق تفصیل پہلے گزر چکی ہے یہاں ان کیساتھ حرف ص ہے اس میں ایک لطیف اشارہ ہے اس سورت میں بیان کئے گئے زیادہ قصوں اور اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک صَمَدٌ کی طرف۔

تفسیر 2 مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب بیان کے لئے نازل ہوئی چنانچہ اس کی تبلیغ میں جو تکالیف آتی ہے ان پر صبر کریں اور بے صبری کا اظہار نہ کریں اس آیت میں پہلا دعویٰ ہے کتاب کی تعریف اور اس کے دو فائدے اور ایک ادب کا ذکر ہے لِتُنْذِرَ : عام ہے اس میں مشرک، کافر مومن سب شامل ہے جبکہ ذِكْرٰى : خاص ہے مومنوں کیساتھ عام فائدے کو خاص پر مقدم کیا یہ دونوں فائدے انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات میں واضح ہے۔

تفسیر 3 اس آیت میں دوسرا دعویٰ ہے اور اِنْذَار اور ذِكْرٰى : کی کیفیت بتائی گئی ہے مَآ اُنْزِلَ : قرآن وسنت ہے (مدارک، خازن، قرطبی رحمھم اللہ) لہٰذا جو کتاب یا پیر اور مولوی ان دونوں یعنی قرآن وسنت کے خلاف ہو اس کی پیروی ست کرو: مِنْ دُوْنِهٖ: ضمیر مَآ اُنْزِلَ : یا رَبّ : کی طرف راجع ہے: اَوْلِيَآءَ : یہاں دوستی سے مراد کسی کی تابعداری جس میں محبت بھی شامل ہو قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو شخص کسی مذہب کو پسند کر لیتا ہے تو اس مذہب کے پیروکار اس کے اولیاء کہلاتے ہیں اس آیت میں تقلید اور مقلدین پر رد ہے جو قرآن وسنت کے مقابلے میں کسی اور کا مذہب اختیار کرتے ہیں: قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ : اس میں اشارہ ہے کہ اس صفت کے حامل افراد دنیا میں کم ہیں۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

"کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں کہ پہنچا ان پر ہمارا عذاب راتوں رات اور دوپہر کو سوتے ہوئے [4]۔ پھر بھی تھی ان کی پکار جس وقت کہ پہنچا ان پر ہمارا عذاب کہ کہنے لگے بے شک ہم ہی تھے گنہگار [5]۔ پھر ہم پوچھیں گے ضرور ان سے جن کے پاس رسول بھیجے گئے تھے اور ہم ضرور پوچھیں گے رسولوں سے" [6]۔

تفسیر 4، 5 یہ تخویف دنیوی ہے یعنی اللہ کا عذاب ایسے وقت میں آتا ہے جب لوگ غفلت میں گرفتار ہوتے ہیں تو ایسے میں ان کو توبہ کرنے کی فرصت نہیں ہوتی ہے اور جب عذاب آنے کے وقت توبہ کرتے ہیں تو پھر اس وقت توبہ قبول نہیں ہوتی، اس میں منکرین کے تین حالات ذکر کئے گئے ہیں (۱) اہلاک (۲) غفلت (۳) ظلم کا اعتراف اَهْلَكْنٰهَا : اس سے مراد ہلاک

کرنے کا ارادہ ہے یا یہ اجمال ہے اور اس کے بعد (فَا) تفصیلیہ قَآئِلُوْنَ: یہ قیلولہ سے ہے یعنی دوپہر کے وقت آرام کرنا چاہے نیند آئے یا نہ آئے شعیب علیہ السلام کی قوم پر ایسے وقت میں عذاب آیا تھا: ظٰلِمِیْنَ: ظلم سے مراد مَآ اُنْزِلَ: کے علاوہ کی پیروی ہے۔

تفسیر 6 اس آیت میں تین حالتوں کے ذریعے سے تخویف اخروی ہے یہاں پہلی حالت کا ذکر ہے یعنی سوال ہر شخص سے اس کے حال کی مناسبت سے کیا جائے گا رسولوں سے ان کی دعوت سے متعلق سوال ہوگا جیسے سورۃ احزاب آیت 8 میں ہے امت کی حالت سے متعلق سوال ہوگا جیسے سورۃ مائدہ آیت 109 میں ہے جبکہ عام لوگوں سے سوال صرف عمل کا نہیں ہوگا بلکہ لِمَ اور کَیْفَ: کا سوال بھی ہوگا لِمَ یعنی عمل کیوں کیا؟ کس وجہ سے کیا؟ کیا باعث تھا تمہارے عمل کا کَیْف: کس کے طریقے یا کس طریقے پر عمل کیا تھا اسی طرح سورۃ حجر آیت 92 میں بھی ہے البتہ سورۃ قصص آیت 78 اور سورۃ رحمٰن آیت 39 میں جہاں یہ ذکر ہے کہ سوال نہیں کیا جائے گا تو اس کی تطبیق اسی مقام پر کی جا چکی ہے

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّ مَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝

"پھر ہم ان کو احوال سنائیں گے اپنے علم سے اور ہم غائب نہ تھے" [7]۔

تفسیر 7 اس آیت میں دوسری حالت کا ذکر ہے یعنی اگر کوئی شخص انکار کرے گا یا کوئی بات چھپائے گا تو اللہ تعالیٰ خود ہی بیان کر دے گا۔

وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ﹰالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝

"اور وزن اس وقت ٹھیک ہوگی پھر جس کی یہ تولیں بھاری ہوئیں سو وہی نجات پانے والے ہیں [8]۔ اور جس کی تولیں ہلکی ہوئیں سو وہی ہیں جنہوں نے اپنا نقصان کیا اس واسطے کہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے" [9]۔

تفسیر 8، 9 اس میں تیسری حالت کا ذکر ہے اور وہ وزن کرنا یعنی قیامت کے احوال میں اعمال کا وزن بھی حق ہے اعمال کا بھاری اور ہلکا ہونا توحید وسنت کے ہونے اور نہ ہونے کی وجہ سے ہوگا اعمال کا کم یا زیادہ ہونا مراد نہیں ہے، وزن سے مراد اعمال کے صحیفوں کا وزن جیسا کہ صحیح احادیث میں مذکور ہے البتہ اعمال کا وزن بھی مراد ہو سکتا ہے کہ ان کو جسم دیا جائے گا۔

جیسا کہ آج ہوا، گرمی، اور سردی کو ناپا جاتا ہے بعض احادیث میں انسانوں کے تولے جانے کا بھی ذکر ہے۔ (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4729) البتہ معتزلہ اور منکرین حدیث نے وزن کرنے کی کئی تاویلیں کی ہے اور وہ وزن سے مراد صرف عدل اور فیصلہ مراد لیتے ہیں تو یہ ظاہر اور صریح آیات کا انکار ہے (امام قرطبیؒ) اعمال تولنے کا مقصد عدل کا اظہار ہے مَوَازِيْنُهٗ: یہ میزان کی جمع ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ میزان ایک سے زیادہ ہوں گے یا تو انسانوں کے یا اعمال کے اعتبار سے یا یہ مَوْزُوْنٌ کی جمع ہے جس سے مراد اعمال ہیں۔ (ترمذی کتاب الایمان حدیث 2448 مستدرک 1/529 و قال صحیح الاسناد و افقه الذهبی) اعمال کا بھاری اور ہلکا ہونا اعمال کی کثرت کی بناء پر نہیں ہوگا جیسا کہ بطاقہ والی حدیث، توحید کا دیگر بہت سے اعمال کے مقابلے میں وزنی ہونے کا ثبوت ہے۔ (ترمذی کتاب الایمان حدیث 2639 ابن ماجه فی الذهد حدیث 4300 امام حاکم امام ذہبی اور امام البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے مشکوٰۃ احوال قیامت 5492) اعمال کا بھاری اور ہلکا ہونا عقیدے اور سنت کی بنیاد پر ہوگا سورہ مومنون آیت 102، 103 اور سورہ قارعہ آیت 6، 7 میں بھی ہے لفظ خَسِرُوْٓا: اور يَظْلِمُوْنَ: اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ کفار کے اعمال کا تولا جانا بھی حق ہے

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ڰ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝

"اور یقیناً ہم نے تمہیں زمین میں جگہ دی اور ہم نے تمہارے لئے اس زمین میں زندگی کے اسباب بنائے تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو [10]۔ اور تحقیق ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں شکل دی پھر (یہ بھی سنو) ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو انہوں نے سجدہ کر لیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں سے نہیں تھا [11]۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھے کس نے منع کیا کہ تو نے سجدہ نہیں کیا جب میں نے تمہیں حکم دیا اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں (اس لئے کہ) تو نے مجھے آگ سے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے" [12]۔

تفسیر 10، 11، 12 اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے کی طرف ترغیب ہے اور آخری جملے میں وعید ہے اور یہ آیت دلیل ہے کہ انسان کے لئے زمین کے علاوہ اور جگہ رہنے کی نہیں ہو سکتی۔ یہاں سے 36 تک دوسرا باب ہے اس میں آدم

علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ ہے شرک فعلی کا رد ہے دورِ جاہلیت کے لوگوں نے طواف میں اپنے آپ پر لباس حرام کیا تھا، چار مرتبہ یا بنی آدم کیساتھ خطاب ہے پہلی مرتبہ لباس کی نعمت کا تذکرہ، دوسری مرتبہ شیطان کے وسوسوں سے بچنے کیلئے اور مشرکین کی دلیل کا رد ہے تیسری مرتبہ شرک فعلی کے رد اور تحریمات الٰہیہ کے ذکر کیلئے خطاب ہے۔ چوتھی مرتبہ رسالت کی نعمت کیلئے پھر اس آیت میں مَكَّنّٰكُمْ : کی ابتدا کی تفصیل ہے یعنی تمکین: میں عزت اور اکرام کا معنی ہے اور وہ آدم کے واقعہ سے ظاہر ہے: خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ : اس میں پہلا قول یہ ہے کہ خلق سے مراد آدم علیہ السلام کا مادہ اور پھر اس کی صورت بنانی ہے تو اس سے مراد آبائکم : ہے دوسرا قول یہ ہے کہ تخلیق باپ کی پیٹھ اور تصویر ماں کے رحم اور خطاب عام ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ انسان کے مادے کو مختلف طریقوں سے پیدا کرنا اور پھر تصویر دینا جیسا کہ سورۃ حج 15 اور مومنون آیت 14 میں ہے: ثُمَّ قُلْنَا : سوال: ثُمَّ آخری دو توجیہات پر مشکل ہے اسلئے کہ آدم علیہ السلام کے سجدے کا واقعہ باقی انسانوں کے خلق سے پہلے ہے: جواب: ا ثُمَّ تراخی کیلئے نہیں ہے بلکہ تعقیب کیلئے یعنی صرف بیان کرنے کے اعتبار سے بعد میں ہے۔ (جواب ۲) ثُمَّ واو کے معنی میں ہے یہ قول امام اخفش کا ہے (امام قرطبی رحمہ اللہ) سجدہ سے مراد تحیہ کا سجدہ ہے یعنی آدم علیہ السلام کو اکرام کے طور پر سر جھکانے کیلئے ہے لیکن ہماری امت میں یہ بھی منع ہے باقی تفصیل سورۃ بقرۃ میں گزر چکی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ نص یعنی اللہ تعالیٰ کے واضح حکم اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں قیاس پیش کرنا یہ کام سب سے پہلے ابلیس نے کیا تھا اسی طرح ہر مشرک اور بدعتی نص کے مقابلے میں قیاس کرتا ہے (امام قرطبیؒ) اور اس دلیل میں اشارہ ہے کہ شرک فعلی کرنے والے اس قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں اور اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ تکبر اور حسد دین سے روکنے والے ہیں اور اس سے معلوم ہو گیا کہ ابلیس بھی سجدہ کرنے پر مستقل مامور تھا اَنَا خَيْرٌ : یہ اپنا تزکیہ ہے جو کہ تکبر ہے اور ضمن میں اللہ تعالیٰ کے امر پر اعتراض ہے: خَلَقْتَنِيْ : یہ اَنَا خَيْرٌ : کی علت ہے لیکن اس کی دلیل باطل ہے کیونکہ مٹی میں آگ سے زیادہ فائدے ہوتے ہیں: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ : اس میں ایک قول یہ ہے کہ لفظ لَا زائد ہے جیسا کہ سورۃ ص آیت 75 میں بغیر لَا کے ہے دوسرا قول یہ ہے کہ مَنَعَكَ دَعَاكَ : کے معنی میں ہے اور الی پوشیدہ ہے یا اَحْوَجَكَ کے معنی میں ہے اور لفظ علی پوشیدہ ہے۔ (سوال) یہاں پر لَا لایا ہے اور سورۃ قَصَصْ : میں لَا نہیں ہے۔ (جواب) یہاں اَمَرْتُكَ کی مخالفت میں سجدے کا مکمل ترک کیساتھ مناسب تھا اور وہاں پر اَمَرْتُكَ : کا ذکر نہیں تھا۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ﴿١٣﴾ قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٤﴾ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ﴿١٥﴾ قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ﴿١٧﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس جگہ سے اتر جا تیرے لئے مناسب نہیں ہے کہ اس جگہ تکبر کرے پس نکل جا (یہاں سے) تو ذلیلوں میں سے ہے [13]۔ شیطان نے کہا مجھے مہلت دے دوبارہ زندگی تک [14]۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو مہلت دیئے جانے والوں میں سے ہے۔ [15]۔ شیطان نے کہا جس وجہ سے تو نے مجھے (اپنے رحم سے) محروم کردیا میں ضرور ان کے لئے تیرے سیدھے راستے میں (منع کرنے کیلئے) بیٹھوں گا [16]۔ پھر ضرور انکے پاس آؤنگا انکے آگے سے اور انکے پیچھے سے اور ان کے دائیں جانب اور انکے بائیں جانب سے اور تو ان میں سے زیادہ کو شکر گزار نہیں پائے گا" [17]۔

تفسیر 13 اس آیت میں آیت دلیل ہے کہ تکبر ذلت کا سبب ہے اور اس آیت میں ابلیس کی تذلیل تین طریقوں سے ذکر کی ہے پہلا: فَاهْبِطْ یہ هُبُوط تذلیل کے طور پر ہے مَا تَكُونُ لَكَ: کے قرینہ سے جبکہ هُبُوط آدم علیہ السلام میں یہ قید نہیں ہے تو وہ تذلیل کیلئے نہیں ہے دوسرا اُخْرُجْ: یہ لفظ اہباط کے بعد ذلت کی تاکید کیلئے ہے تیسرا الصَّاغِرِينَ: میں اشارہ ہے کہ تکبر کے مقابلے میں صغار آتا ہے۔

تفسیر 14، 15 دوبارہ زندگی تک مہلت مانگنا اس لئے تھا تاکہ موت سے بچ جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو صرف فناء کے دن تک مہلت دی جیسا کہ سورۃ حجر آیت 28 میں اور سورۃ ص آیت 81 میں ہے اور اس وقت باقی لوگ بھی موجود ہونگے اس وجہ سے اس کو مُنْظَرِينَ: فرمایا۔

تفسیر 16 یہ دلیل ہے کہ صراط مستقیم کا سب سے بڑا دشمن ابلیس ہے فَبِمَا: باء سببیہ یا قسمیہ ہے اور مَا استفہامیہ ہے اور لَأَقْعُدَنَّ سے مستقل کلام شروع ہوتا ہے یا (مَا) مصدریہ ہے: أَغْوَيْتَنِي أَغْوَاء: دل میں (سرکشی) ڈالنے کے معنی میں ہے اور ہلاک کے معنی میں بھی آتا ہے: لَأَقْعُدَنَّ: بیٹھنا لزوم سے کنایہ ہے: لِإِضْلَالِهِمْ وَأَغْوَاءِهِمْ: کے معنی میں ہے صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ: اس کی ابتدا توحید سے ہے جیسا کہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

تفسیر 17 اس سے مراد یہ ہے کہ ہر طریقہ سے انکو گمراہ کرونگا یا یہ مطلب ہے کہ آخرت سے ان کو منکر یا غافل بناؤں گا اور نیک کاموں سے ان کو منع کرونگا اور برے کاموں کی رغبت انکو دلاؤنگا۔ مِنْ فَوْقِهِمْ: نہیں کہا ہے اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نہیں روک سکتا اور مِنْ تَحْتِهِمْ: بھی نہیں کہا کیونکہ نیچے سے اس کا آنا نہیں ہوسکتا۔ فائدہ پہلے دونوں لفظ میں مِنْ: ذکر کیا ہے اور لفظ مِنْ ابتداء کے لئے آتا ہے اشارہ ہے کہ ابلیس کی توجہ ان دونوں اطراف سے شروع ہوتی ہے اور بعد والے دونوں میں مِنْ: ذکر کیا ہے جو تجاوز کے لئے ہے یعنی ابلیس تجاوز اور انحراف کے باوجود ان دونوں طرفوں سے آتا ہے۔ شٰکِرِیْنَ: امام قرطبیؒ، خازن اور امام ابن کثیر رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد موحدین ہیں اس لئے کہ ابلیس پہلی دشمنی توحید سے کرتا ہے یہ قول ابلیس کا ظن غالب کے طور پر ہے۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ
اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا
الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا
مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہاں سے ذلیل اور خوار ہوکر نکل جا جو شخص ان میں سے تیرا کہا مانے گا میں ضرور تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا [18]۔ اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم علیہ السلام تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو پھر جس جگہ چاہو دونوں کھاؤ اور اس درخت کے پاس مت جاؤ ورنہ تم دونوں ظالموں میں سے ہوجاؤ گے [19]۔ پھر شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ انکی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھیں انہیں انکے سامنے کھول دے اور کہنے لگا تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے اس لیے منع کیا کہ (کہیں ایسا نہ ہو) کہ تم دونوں ملائک ہوجاؤ یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے ہوجاؤ" [20]۔

تفسیر 18 اس آیت میں ابلیس کی دعاء کی قبولیت ہے وعید کے باوجود اس کی پیروی کرنے کا ذکر ہے اُخْرُجْ: اس کو اعادہ عہد کے بعد کہتے ہیں یعنی پہلا اُخْرُجْ: فیصلہ الٰہی کے طور پر تھا اور دوسرا امر کو نافذ کرنا ہے یا پہلا جنت سے اِخْرَاجْ: اور دوسرا آسمان سے۔ مَذْءُوْمًا ذَمٌّ: کی بنسبت ذَءْمٌ: میں زیادہ عیب کا معنی پایا جاتا ہے۔ مَدْحُوْرًا: لعنت کے ساتھ نکالا

گیا ہے اور مفعول کے صیغے دلالت کرتے ہیں کہ یہ برائی بیان کرنا اور دھتکارنا ہر طرف سے ہوگا: لَأَمْلَأَنَّ: میں اشارہ ہے کہ جہنم میں عذاب کے لیے صرف ابلیس کے پیروکار ہونگے چاہے کفر اور شرک کیساتھ ہوں یا باقی گناہوں کیساتھ ہو پہلی قسم کے لوگ جہنم میں ہمیشہ رہینگے اور دوسری قسم کے لوگ ہمیشہ نہیں ہونگے۔

تفسیر 19 اس آیت میں آدم علیہ السلام پر جس کو ابلیس حقیر سمجھتا تھا یہ انعام الٰہی کا اظہار ہے یہ اُخْرُجْ پر معطوف ہے 18 میں: فَكُلَا: سورۃ بقرہ میں انعامات کی تفصیل مقصود ہے تو كُلَا: کو واو کیساتھ ذکر کیا ہے وہاں پر مستقل نعمت کی طرف اشارہ ہے اور اس سورۃ میں انعامات کی تفصیل مقصود ہے: فَكُلَا: کو فاء کیساتھ ذکر کیا ہے اصل کی طرف اشارہ ہے جو کہ رہائش پھر کھانے کی ترتیب ہے اور اسی وجہ سے سورۃ بقرہ میں رَغَدًا ذکر تھا اور یہاں پر وہ ذکر نہیں ہے (واللہ اعلم): وَلَا تَقْرَبَا قربان سے مراد قصد اور عمد ہے جو ظلم کا سبب ہے تو سَهْوًا: بھول جانا اور آدم علیہ السلام کے (نِسْيَانٌ) بھولنے سے اس کا ظلم ثابت نہیں ہوتا اور باقی تفصیل سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

تفسیر 20 اس آیت میں ابلیس کے وسوسے کی تفصیل ہے اور اس وسوسے پر عمل کرنے کا انجام بتایا گیا ہے فَوَسْوَسَ: سوال: جب ابلیس کو جنت اور آسمانوں سے اتارا گیا تو پھر آدم علیہ السلام کو کیسے وسوسہ ڈالا۔ (جواب) جب ابلیس کو اُخْرُجْ: اور آدم کو اُسْكُنْ: فرمایا تو ابلیس نے نکلنے کے وقت آدم علیہ السلام کو یہ بات کی اور اس پر دلالت کرتی ہے فَوَسْوَسَ: میں فاء جو اتصال کے لیے آتی ہے اور جو یہ کہتے ہیں کہ ابلیس جنت کے دروازے میں کھڑا تھا اور آدم علیہ السلام کو آواز دی تو یہ بے دلیل بات ہے اور جو یہ کہتے ہیں کہ سانپ کے منہ میں جنت میں داخل ہوا تو یہ بے دلیل اور اسرائیلی قصہ ہے: لَهُمَا اور سورۃ طٰہٰ آیت 120 میں إِلَيْهِ ذکر ہے وجہ یہ ہے کہ یہاں پر پہلے سے تثنیہ کے الفاظ ذکر ہیں تو اس کو بھی تثنیہ ذکر کیا اور سورۃ طٰہٰ میں پہلے سے صرف آدم کا ذکر ہے تو بعد میں بھی مفرد کی ضمیر ذکر کی تو وسوسہ دونوں کو کیا ہے لیکن بیوی شوہر کے تابع ہے تو بعض جگہ اس کا ذکر نہیں ہے: لِيُبْدِيَ: اکثر مفسرین رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ لام عاقبت کیلئے ہے اس لیے کہ ابلیس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ذریعے سے انکے وجود ظاہر ہونگے اور اگر لام علت کے لیے ہو تو یہ بھی جائز ہے اور ہوسکتا ہے کہ ابلیس کو اس کا علم پہلے سے حاصل ہو: سَوْآتِهِمَا. سَوْءَ: بدن کے اس حصے کو کہا جاتا ہے جس کے ظاہر ہونے پر انسان فطرتاً ناراض ہوتا ہے اس کو عورت کہا جاتا ہے نقاوُرِيَ: اشارہ ہے کہ انسان کی عورت طَبْعًا: چھپی ہوئی ہوتی ہے اور طَبْعًا: اس کے ظاہر کرنے کو برا سمجھتا ہے اسی وجہ سے مجہول کا صیغہ ذکر کیا أَنْ تَكُونَا

مَلَكَيْنِ: یہ تشبیہ کے طور پر مراد ہے یا قلب حقیقت کے طور پر بھی احتمال رکھتا ہے اور ملائک کے ساتھ تشبیہ بہت ساری صفات میں ہے کھانے کے محتاج نہیں ہونگے اور ہر قسم کی شکلیں اختیار کرسکیں گے اور اڑنے پر بھی قدرت رکھیں گے اور عمریں بھی طویل ہو جائیں گی یہ بھی مرغوب صفات ہیں جن کو انسان چاہتا ہے: اَنْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ: یہ ماقبل سے ترقی ہے اور بل کے معنی میں ہے یعنی موت اور فنا ہونے سے بچ جائینگے یہ بھی انسان کیلئے بہت مرغوب چیز ہے اور سورۃ طٰہٰ میں صرف بعد والی بات کو ذکر کیا ہے اس لیے سورۃ اعراف تفصیلی سورت ہے تو اس میں تفصیل ذکر کی ہے اور سورۃ طٰہٰ میں اختصار مقصود ہے اسی وجہ سے آخری مرغوب ذکر کی ہے۔

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۖ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

"اور اس نے ان دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ میں تمہارا خیرخواہ ہوں۔ [21]۔تو اتار لایا ان دونوں کو دھوکے سے پس جب انہوں نے درخت کو چکھ لیا انکے وجود ظاہر ہوگئے اور یہ دونوں شروع ہوگئے جنت کے درخت کے پتوں سے ڈھانپ رہے تھے اور ان دونوں کو ان کے رب نے آواز دی کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے نہیں روکا تھا اور میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بیشک شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے۔[22]۔ان دونوں نے کہا اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہیں کیا اور ہم پر رحم نہیں کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجائینگے"[23]۔

تفسیر 21 قَاسَمَهُمَا: یہ صیغہ یہاں پر مبالغے کیلئے ہے یعنی مضبوط قسم کھائی قسم وسوسے کی تاکید کیلئے ہے اور اس کو مطلق ذکر کیا لیکن اس سے مراد قسم باللہ ہے اور ابلیس سب سے پہلا وہ شخص ہے جس نے اللہ کی ذات پر جھوٹی قسم کھائی ہے اور آدم علیہ السلام کا یہ خیال تھا کہ اللہ کی ذات پر کوئی بھی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا اس وجہ سے انہوں نے اس کی بات مان لی۔

تفسیر 22 فَدَلّٰهُمَا بِغُ۔ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے وسوسہ پر فوراً عمل کیا: دَلّٰهُمَا: سے مراد اطاعت سے معصیت کی طرف اتارنا ہے یا اونچے درجے سے کمزور درجے تک اتار نا یا یہ: اَزَلَّهُمَا: کے معنی میں ہے غُرُوْرٍ: نصیحت

ظاہر کرنے اور نقصان کے چھپانے کو غرور کہتے ہیں :سَوْاٰتِهِمَا : یہاں پر ظاہری معنیٰ مراد ہے اس پر دلیل بعد والا جملہ اپنے آپ پر پتے لگاتا ہے اور تفسیر البحر المحیط میں ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد انکے عیوب اور سخت زندگی کا ظاہر ہونا ہے برہنہ نہیں ہونے مگر یہ قول قرآن کریم کے ظاہر کے خلاف ہے۔ بغیر دلیل کے تاویل ہے اور جمہور مفسرین کے قول کے مخالف ہے اور اگر کوئی سوال کرے کہ اس پر دلیل :وَلَا تَعْرٰی : ہے سورۃ طٰهٰ آیت 88 میں تو جواب یہ ہے کہ یہ صفات درخت نہ کھانے کے ساتھ مقید تھیں جب انہوں نے درخت کھالیا تو ان صفات سے محروم ہوگئے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انکے بدن پر نور کا لباس تھا وہ بھی ان سے اتار دیا گیا مگر اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے کپڑوں کی حقیقت پر اللہ عالم ہے اور صرف اپنی جانیں انکو ظاہر ہوئیں کسی اور نے برہنہ نہیں دیکھا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ تثنیہ کے مقابلے تثنیہ پر اور احاد احاد پر تقسیم چاہتا ہے اور یہ لوگ اپنے آپ پر جنت کے پتے لگا رہے تھے اس میں اشارہ ہے کہ (بغیر ضرورت کے) اپنے ستر کو چھپانا لازم ہے :وَاَقُلْ لَّكُمَا : یہ قول اللہ تعالیٰ کا سورۃ طٰهٰ آیت 117 میں مذکور ہے۔

تفسیر 23 ظلم نقصان کے معنی میں ہے یعنی ہم نے اپنا حصہ کم کرلیا اس لیے کہ جنت سے نکل گئے :وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا : گناہ کا بخشنا مراد نہیں ہے اس لیے کہ گناہ نہیں کیا بلکہ پردہ ڈالنا مراد ہے اور رحم سے مراد آئندہ کے لیے ایسے کام سے بچنا ہے یا یہ دعا انکساری اور تضرع کی وجہ سے ہے تو گناہ پر دلالت نہیں کرتی اور یہ مقربین کی عادت ہے کہ چھوٹے نقصان کو بڑا سمجھتے ہیں۔ امام شربینی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ صرف خلاف اولیٰ کام تھا اور نسیان کیوجہ سے ہوا تھا اس کی دلیل سورۃ طٰهٰ آیت 115 میں ہے باقی تفصیل سورۃ بقرۃ میں گزر چکی ہے۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٢٤﴾ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴿٢٥﴾ ع

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا اتر جاؤ تمہارے بعض بعضوں کیلئے دشمن ہیں اور تمہارے لئے زمین میں رہنے کی جگہ اور ایک وقت تک فائدہ ہے [24]۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اسی زمین میں تم زندگی گزارو گے اور اسی میں تم مرو گے اور اسی سے تم نکالے جاؤ گے [25]

تفسیر 24 معاف کرنے اور توبہ قبول کرنے کے بعد یہ حکم دلیل ہے کہ زمین کی طرف اتارنا گناہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس درخت کا اثر ہے۔ اس آیت میں اتارنے کیلئے تکوینی غایہ ذکر کیا ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ آیت 36 میں ہے جبکہ تشریعی غایہ آیت 35 میں مذکور ہے۔

تفسیر 25 یہ بھی غایہ تکوینی کیساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس میں فناء اور بعث بھی ذکر کر رہا ہے تاکہ غفلت نہ آئے اس سے مراد عام زندگی ہے اور وہ زمین میں ہے البتہ بعض زندگی خرق عادت کے طور پر ہوتی ہے جیسا کہ آسمان میں عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی لہٰذا اس کے ذریعے اعتراض نہیں آتا۔

يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا ۖ وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿٢٦﴾

"اے آدم علیہ السلام کی اولاد یقیناً ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا ہے جو تمہاری ستر کو چھپاتا ہے اور زینت ہے اور پرہیزگاری کا لباس یہ تو بہت بہتر ہے یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں" [26]۔

تفسیر 26 ظاہر یہ ہے کہ خطابات آدم علیہ السلام کے اتارنے کے وقت تھے اس لیے کہ لباس کی یہ نعمت ایک امت کیساتھ خاص نہیں ہے تو پہلا خطاب جو: يَا بَنِي آدَمَ: کیساتھ ہے یہ اس لیے ہے کہ لباس اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے تو طواف میں خود لباس حرام کر کے ناشکری نہیں کرنا: أَنزَلْنَا: امام قرطبی رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت نقل کی ہے کہ إِنزَال بخلق (پیدا کرنے) کے معنی میں ہے لیکن: إِنزَال: اس کو اس وجہ سے کہا ہے کہ اس کے اسباب آسمانی ہیں جیسا کہ بارش برسانا اور اسکے ذریعے سے پودے نکالنا ان پودوں میں اون، ریشم اور روئی وغیرہ پیدا کرنا اور اس طرح کا لفظ سورۃ زمر آیت

6اور سورۃ حدید آیت 25 میں بھی ہے کپڑوں کے دو فائدے ہیں ایک ستر چھپانا دوسرا وجود کا باقی حصہ زینت کیلئے چھپانا
ان دونوں فائدوں کو ذکر کیا پہلا فائدہ بہت ضروری ہے تو اس کو پہلے ذکر کیا اور فضل کے ساتھ ذکر کیا اس میں اشارہ ہے کہ اس
کا ہر وقت لحاظ کرنا ہے: وَلِبَاسُ التَّقْوٰى: اس سے مراد وہ لباس ہے جو شریعت کے مطابق ہو یا اس سے مراد نفس
تقویٰ ہے یعنی ایمان اور نیک عمل اور یہ اس وجہ سے ذکر کیا کہ بنی آدم لباس کی طرف زیادہ توجہ دیکر ایمان کو بھول نہ
جائیں: خَيْرٌ: وجہ یہ ہے کہ صرف ظاہری لباس سے جنت حاصل نہیں ہوتی بلکہ تقویٰ کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ
يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً
قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

"اے آدم علیہ السلام کی اولاد شیطان تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے جیسا کہ تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکالا ان دونوں سے
ان کا لباس اتارا تا کہ انکو انکے ستر ظاہر کریں یقیناً یہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتے ہیں جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے بے شک ہم
نے شیطانوں کو ان لوگوں کے لیے دوست بنایا جو ایمان نہیں لاتے [27]۔ اور جب کوئی بے حیائی کے کام کر لیتے ہیں تو کہتے
ہیں ہم نے اپنے بڑوں کو اس پر پایا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے کہہ دیجئے اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا کیا تم
اللہ تعالیٰ پر وہ باتیں کرتے ہو جو تم نہیں جانتے [28]۔

تفسیر 27 یہ دوسرا خطاب ہے اس میں حلال کی حرمت میں شیطان کی اتباع سے منع کیا گیا ہے۔ اور مشرکین کی دلیل کا رد
ہے: لَا يَفْتِنَنَّكُمْ: اس سے مراد حلال کو حرام سمجھنے کے طور پر گمراہ کرنا ہے اور یہ شرک فعلی ہے: كَمَآ اَخْرَجَ: سے پہلے
عبارت پوشیدہ ہے: بِتَحْرِيْمِ اللِّبَاسِ فِي الطَّوَافِ: (طواف کے دوران میں لباس/ حرام کرنے کے اعتبار سے)
اور اس میں وہ پیر بھی داخل ہیں جو اپنے مریدوں پر بعض جائز لباس حرام کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی داخل ہیں جو ذاتیں کے
وقت لباس اتارتے ہیں: اَخْرَجَ اور يَنْزِعُ اور يُرِيَ: کی نسبتیں سببیت کے طور پر ہیں لفظ قبیلہ سے معلوم ہوا کہ ابلیس
کی نسل اور اولاد ہے دوسرا یہ معلوم ہوا کہ جن (ابلیس بھی ان ہی میں سے ہے) ایسی مخلوق ہے جو انسانوں کو نظر نہیں آتی یعنی
اصلی صورت میں ہاں اگر شکل تبدیل کر لیں تو پھر انسانوں کو نظر آتے ہیں: مِنْ حَيْثُ: سے مراد اصل دیکھنا ہے تو جن

روایات میں ابلیس اور جنات کا دیکھنا آیا ہے ان سے مراد شکل مثالی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ وہ دیکھنا اس آیت کے عموم سے خاص کیا گیا ہے: اَوْلِیَاۗءَ: (دوست اور مددگار کو کہا جاتا ہے) یہ دلیل ہے کہ سرکش قسم کے جن برے لوگوں پر حملہ کرتے ہیں اور ان میں داخل ہوتے ہیں اور اس طریقے پر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

تفسیر 28 فَاحِشَةً: یہ لفظ تو عام ہے ہر قسم کی بدکاری کو شامل ہے لیکن یہاں پر اشارہ ہے کہ مشرکین عرب بیت اللہ کا طواف برہنہ کیا کرتے تھے مرد دن کو اور عورتیں رات کو طواف کیا کرتی تھیں اور اپنی ستر پر آگے پیچھے ہاتھ رکھ لیتے تھے حالت حج میں اپنے اوپر لباس اور گھی والے کھانے حرام سمجھتے تھے اور یہ تحریمات غیر اللہ ہیں تو اس آیت میں مشرکین کی دو دلیلوں کا رد ہے پہلی دلیل بڑوں کی اتباع دوسری اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا پہلی دلیل تو واضح طور پر باطل ہے تو اس کے رد کی کوئی ضرورت نہیں اور دوسری دلیل کا تفصیلی رد کرتا ہے پہلا یہ کہ: قُلْ اِنَّ الخ دوسرا یہ کہ: اَتَقُوْلُوْنَ یعنی یہ افتراء ہے مَالَا تَعْلَمُوْنَ: علم سے مراد قرآن اور حدیث کی دلیل ہے تو وہ ان کے پاس نہیں ہے اور کہتا ہے کہ: قَالَ اللہُ اور اَمَرَ اللہُ: تو یہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا ہے یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ باطل پرستوں کی دلیل یا تو بڑوں کی تقلید ہوتی ہے یا اللہ پر جھوٹ (تَقَوُّلْ عَلَى اللهِ) ہوتا ہے۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڛ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝۲۹

”آپ کہہ دیجئے مجھے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے چہروں کو اللہ تعالیٰ کے لئے برابر رکھو ہر سجدے کے وقت اور اللہ کی عبادت اس طور پر کرو کہ عبادت اس کے لیے خالص کرو تمہیں اللہ تعالیٰ نے جس طرح ابتداء میں پیدا کیا اسی طرح تم دوبارہ پیدا ہو گے“ [29]۔

تفسیر 29 یہ مشرکین کی دلیل کو رد کرنے کے لیے تیسری دلیل ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اس کو یاد کرو یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: اَقِيْمُوْا: اس کیساتھ یلیہ مراد ہے: مَسْجِدٍ: اس سے مراد سجدہ ہے یعنی سجدہ اللہ تعالیٰ کیلئے خاص کرو یہ بھی مشرکین کا رد ہے کہ تم سجدہ غیر اللہ کو کرتے ہو یا مَسْجِدٍ سے مراد مَسْجِدٌ: اور نماز پڑھنے کی جگہ ہے تو معنی یہ ہے کہ نماز کی ہر جگہ میں کعبے کی طرف رخ کیا کرو: وَادْعُوْهُ: اس میں شرک فی الدعا کا رد ہے مُخْلِصِيْنَ: اخلاص سے مراد شرک اور (تشبیہ) سے بچنا ہے: كَمَا بَدَاَكُمْ: اس میں بعث بعد الموت کا ذکر ہے فائدہ یہ ہے کہ برہنہ بغیر لباس اور بغیر ختنے کے پیدا کر سکتا ہے جس طرح کہ بخاری کی حدیث میں ہے اسی طرح قیامت کے دن پیدائش کا ذکر ہے۔

(صحیح بخاری کتاب احادیث الانبیاء حدیث 3349)

فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۗ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ﴿٣٠﴾ يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾ ع

"ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دی اور ایک گروہ پر گمراہی ثابت ہو چکی ہے ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنایا ہے اور گمان کرتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں [30]۔ اے آدم علیہ السلام کی اولاد تم ہر نماز کے وقت اپنی زینت کو لازم اپناؤ۔ کھاؤ اور پیو حد سے مت نکلو بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا [31]۔

تفسیر 30 فَرِيقًا: یہ تَعُودُونَ کی یا بَدَأَكُمْ کی ضمیر سے حال بن رہا ہے اور مراد یہ ہے کہ کسی کی تقدیر میں ہدایت ہے اور کسی کی تقدیر میں گمراہی ہے تو قیامت میں دو گروہ ہوں گے: إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا: اس کا بعد والے فریق کے ساتھ تعلق ہے یعنی گمراہی کا سبب صرف تقدیر نہیں ہے بلکہ شیطانوں کی پیروی ہے: وَيَحْسَبُونَ: یہ ہر بدعتی اور مشرک کے لیے عام ہے جو گناہ کرتا ہے اور اس کو ثواب سمجھتا ہے۔

تفسیر 31 یہ شرک فعلی کے رد پر تیسرا خطاب ہے کہ ہر مسجد کے پاس لباس کا استعمال ضرور کیا کرو چاہے مسجد حرام ہو یا باقی مساجد ہوں چاہے طواف کے وقت میں ہو یا نماز کے وقت میں اس آیت سے معلوم ہوا کہ طواف اور نماز کے وقت ستر ڈھانکنا فرض ہے اس کی تعبیر زینت سے کی ہے اشارہ ہے کہ ستر چھپانے کے علاوہ نماز پاک اور صاف لباس میں پڑھنا اس کی بنسبت بہتر ہے کہ انسان کام یا رات کے لباس میں نماز پڑھے اور جان چھڑائے عام حالت میں باقی بدن کا چھپانا بھی لازم ہے جیسا کہ سینہ، پیٹھ اور سر وغیرہ اس میں مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کا رد ہے جو لباس اتارنے کو ثواب سمجھتے تھے۔ وَكُلُوا: اس میں مقصود ان لوگوں کا رد ہے جنہوں نے حالت حج میں کھانے اور گھی اپنے اوپر حرام کیا تھا: وَكُلُوا وَاشْرَبُوا کھانا پینا ضرورت کے طور پر فرض ہے یعنی بدن کی حفاظت اور عبادت میں قوت پیدا کرنے کے لیے: وَلَا تُسْرِفُوا کھانے پینے اور لباس میں اسراف تین قسم کا ہے۔ (۱) ضرورت سے زیادہ کرنا۔ (۲) حرام چیز کھانا اور پینا۔ (۳) خود پر حلال کو حرام سمجھنا یہ شرک فعلی ہے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے جو زینت اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں پیدا کی ہیں ان چیزوں کو کس نے حرام کیا ہے آپ کہہ دیجئے یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خالص (انہی کیلئے ہوں گی) ہم اس طرح تمام آیات کو سمجھداروں کیلئے تفصیل سے بیان کرتے ہیں" [32]۔

تفسیر 32 یہ بھی غیر اللہ کی تحریم کا رد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیا تو اور کس نے حرام کیا ہے زینت سے مراد جائز اور مناسب لباس ہے: لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یعنی یہ ایمان والوں کا حق ہے اور مشرکین جو یہ انعامات استعمال کرتے ہیں تو اس کا ناجائز استعمال کرتے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو انعامات کیے ہیں تو ایمان اور توحید والوں نے ان کا حق ادا کیا ہے جبکہ مشرکین نے ان کا حق ادا نہیں کیا: خَالِصَةً: اس میں عبارت پوشیدہ ہے: يُخْلِصُ اللّٰهُ هٰذِهِ الطَّيِّبَاتِ خَالِصَةً لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: (ان طیبات کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایمان والوں کیلئے خالص کر دیگا) یہ قول عام مفسرین کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ: فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اٰمَنُوْا: کیساتھ متعلق ہے یعنی جو لوگ دنیا کی زندگی میں ایمان لائے ہیں ان کے لیے یہ طیبات قیامت میں خاص ہیں: نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ: مراد یہ ہے کہ توحید کے احکام کی تفصیل قرآن میں موجود ہے جیسا کہ ان گزری ہوئی آیتوں میں ہے۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ
سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا
يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٤﴾ يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي ۙ فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا
هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٦﴾

"آپ کہہ دیجئے بے شک میرے رب نے حرام کیا ہے برے کاموں کو جو اس میں سے ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور ہر گناہ اور ناجائز طور پر ظلم کرنا اور اللہ تعالیٰ کیساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے اور تمہارا اللہ پر ایسی باتوں کا بنانا جن کو تم نہیں جانتے [33]۔ اور ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے پس جب ان کا وقت مقرر آ ئیگا (تو عذاب دیا جائے گا) نہ پیچھے ہو سکیں گے ایک لمحہ کے لیے اور نہ آگے ہو سکیں گے [34]۔ اے آدم علیہ السلام کی اولاد اگر تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیتیں پڑھ کر سنائیں تو جس نے اپنے آپ کو شرک سے بچایا اور سنت پر عمل کر لیا نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ یہ لوگ غمگین ہونگے [35]۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور اس سے تکبر کیا یہی لوگ جہنم والے ہیں یہ لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے" [36]۔

تفسیر 33 یہ غیر اللہ کی تحریم کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی تحریمات کا ذکر ہے ان کو تحریمات کے اصول کہتے ہیں اس لیے کہ یہ تمام ادیان سماویہ میں حرام ہیں۔ فَوَاحِشَ: ان تمام گناہوں کے لیے عام ہے جس کا گناہ ہونا ہر عقل والے کے لیے ظاہر ہے جیسا کہ زنا اور جھوٹ وغیرہ۔ اِثْمٌ: حقوق میں مخالفت کرنا۔ وَالْبَغْيِ: حقوق العباد میں بغیر حق کے گناہ کرنا اور جو بَغْيِ بِالْحَقِّ ہے تو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ شِرْكٍ: اعتقادی کی طرف اشارہ ہے۔ سُلْطَانًا میں اشارہ ہے کہ شرک کے جواز کے لیے نازل شدہ دلیل چاہیے۔ وَأَنْ تَقُولُوا: فعلی کی طرف اشارہ ہے۔

تفسیر 34 اس آیت میں سوال کا جواب ہے کہ جب یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی تحریمات کی مخالفت کرتے ہیں تو ان پر عذاب کیوں نہیں آتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس کے لیے وقت مقرر ہے اور آیت دلیل ہے کہ جس کو مارا گیا وہ اپنے وقت پر فوت ہوا ہے جبکہ قاتل کے لیے سزا اس وجہ سے ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی ہے۔ اس قسم کی آیت سورۃ یونس آیت 49 اور سورۃ نحل آیت 61 میں بھی آئی ہے۔ سورۃ یونس میں إِذَا: پر فا نہیں لائی گئی البتہ جزا میں فا ذکر کیا۔ اور اس سورۃ اور سورۃ نحل میں إِذَا: پر فا داخل کی ہے تو جزا میں ضرورت نہیں ہے۔ (سوال) جب وقت مقرر (اجل) آجاتا ہے تو

پیچھے ہونے کا امکان ہوتا ہے لیکن آگے ہونے کا امکان تو نہیں ہوتا تو اس کی نفی کرنے میں کیا فائدہ تھا۔ (جواب ۱) اِذَا کی جزا پوشیدہ ہے یعنی: یُعَذَّبُوْنَ: (جواب ۲) لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ: یہ اِذَا جَآءَ: پر عطف ہے تیسرا یہ کہ اس نفی کے لیے یہ تشبیہ ہے یعنی پیچھے ہونے کی ایسی نفی ہے جیسے آگے ہونے کا امکان نہیں ہوتا۔

تفسیر 35 یہ جنت اور جہنم کے معیار کیلئے چوتھا خطاب ہے اور خطاب کے شروع میں لفظ قُلْنَا: پوشیدہ ہے مطلب یہ ہے کہ جس وقت سے آدم علیہ السلام اتر گئے تو اس وقت سے یہ خطاب اس کی اولاد کو متوجہ ہے تو رسالت کا وہ سلسلہ جاری تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا۔ (سوال) یہ آیت تو دلالت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے آنے کا سلسلہ قرآن کے بعد بھی جاری تھا۔ (جواب ۱) پہلے ہم نے ذکر کیا کہ یہ چار خطابات اس وقت ہوئے تھے کہ جب آدم علیہ السلام کو اتارا تھا اس قسم کے عنوان کی آیت سورۃ بقرہ آیت 38 اور سورۃ طٰہٰ آیت 123 میں بھی مذکور ہے: اِهْبِطَا: غائے تشریعی کے لیے ہے۔ تو اس وجہ سے اسکی ابتداء میں: قُلْنَا: پوشیدہ ہے۔ (جواب ۲) ابن جریر رحمہ اللہ نے یسار سلمی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم اور ان کی اولاد کو اپنے کف (ہتھیلی) میں ڈالا اور انکو یہ خطاب کیا تھا تو: قُلْنَا: کا لفظ پوشیدہ ہے (روح المعانی) امام ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تحت کثیر احادیث نقل کی ہے۔

تفسیر 36 یہ بشارت کے بعد تخویف ہے: تَکْذِیْبُ تَقْوٰی اور اِسْتِکْبَارُ: اِصْلَحَ کے مقابل ہے یا تکذیب زبان کے ساتھ ہے اور اِسْتِکْبَارُ: دل سے ہے۔ پہلی آیت میں: فَمَنِ اتَّقٰی: میں فا کو ذکر کیا تھا اور یہاں خبر میں فا کو ذکر نہیں کیا بشارت تاکید اور مبالغہ پر ہے جبکہ تخویف مسامحہ پر مبنی ہے۔ اور مسامحہ (نرمی) کی تخویف پر مبنی ہے اسی طرح: فَمَنِ اتَّقٰی کو مفرد: وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا: کو جمع ذکر کیا اشارہ ہے کہ ایمان والے کم اور تکذیب والے زیادہ ہیں۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝

"پس اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے یا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلائے یہی لوگ ہیں ان کو ان کا حصہ پہنچے گا جو تقدیر میں لکھا گیا ہے (انکی عمر اور رزق میں سے) یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے ملائک آجائیں ان کی روح قبض کرنے یہ لوگ ان سے کہیں گے کہاں ہیں وہ لوگ جن کو تم مصیبتوں میں پکارا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے علاوہ (اب بلاؤ انکو) یہ لوگ کہیں گے وہ لوگ ہم سے گم ہو گئے اور اپنے آپ پر اقرار کرلینگے کہ بیشک یہ لوگ (توحید کے) منکر تھے" [37].

تفسیر 37 یہ تیسرا باب ہے آیت 53 تک اس میں پہلی زجر ہے پھر تخویف ہے یعنی روح قبض ہونے کے حالات اور برزخ پھر آخرت کے حالات کے بارے میں پھر بشارت اخروی ہے پھر اصحاب اعراف کا مکالمہ ہے اور آخر میں شفاعت قہریہ کا رد ہے اس آیت 37 میں جھوٹ بولنے والوں کے لیے وعید ہے پھر نزع اور برزخ کی حالت کا ذکر ہے اور اس میں شرک فی الدعا کا رد ہے: اِفْتَرٰى: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف شریک اور ولد کی نسبت کرنا ہے: اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ سے مراد وہ لوگ ہیں جو آیت 36 میں ذکر ہو گئے: نَصِيْبُهُمْ: ہر انسان کیلئے تقدیر میں عمر، رزق اور اعمال مقرر ہوئے ہیں وہ اس کا حصہ ہے: مِنَ الْكِتٰبِ: اس سے مراد تقدیر کی کتاب ہے: رُسُلُنَا: میں اشارہ ہے کہ موت کے وقت بہت ملائک آتے ہیں اور روح کو ایک ملک قبض کرکے باقی ملائک کے حوالے کردیتا ہے جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے صحیح ابن ماجہ کتاب الزهد حدیث 4262 اس وجہ سے سورۃ سجدہ آیت 11 میں ایک ملک کا ذکر ہے: قَالُوْٓا: یہ بطور وعید کہا ہے۔ ضَلُّوْا عَنَّا اشارہ ہے کہ ان کے جو صالحین معبود تھے وہ ان کی پکار سے بے خبر تھے اسی وجہ سے وہ لوگ ان سے غائب ہو گئے: اِنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ: یہ دلیل ہے کہ غیر اللہ کو پکارنا کفر ہے اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرک سے روح قبض کرنے کے وقت کہا جائیگا کہ اپنے مددگاروں کو پکارو اگر وہ تمہاری مدد کرسکتے ہیں لیکن وہ معبود نہ جسمانی اور نہ روحانی طور پر مدد کرسکتے ہیں۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ قَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع

"اللہ تعالیٰ فرمائے گا ان جماعتوں میں داخل ہوجاؤ جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں جنوں اور انسانوں میں سے آگ میں جب ایک جماعت داخل ہوگی تو اپنے ساتھیوں پر لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب اس میں سب اکٹھے ہوجائینگے تو انکے آخری لوگ (مرید) پہلے لوگوں (پیشواؤں) کے بارے میں کہیں گے اے ہمارے رب ہمیں ان لوگوں نے گمراہ کیا ہے انکو آگ کا دوہرا عذاب دے اللہ تعالی فرمائے گا ہر ایک کے لیے دوہرا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے [38]۔ اور ان کے پہلے لوگ کہیں گے بعد والوں سے تمہارا ہم پر کوئی احسان نہیں ہے عذاب چکھو بسبب اس کے جو تم کیا کرتے تھے [39]۔

تفسیر 38 اس آیت میں برزخ کا حال ہے اور ارواح کو خطاب ہے یا یہ حشر کا حال ہے اور خطاب قیامت کے دن ہوگا اور یہ آیتیں مشرک مولویوں اور پیروں کے بارے میں ہیں کہ وہ لوگ اپنے مریدوں اور مقتدیوں کیساتھ یہ مکالمہ کرینگے: لَعَنَتْ اُخْتَهَا : اس طرح سورۃ عنکبوت آیت 35 میں بھی ہے: اُخْتَهَا : سے مراد شرک اور کفر میں مشابہ ہونا ہے؛ مُؤَنَّث : کی تعبیر حقارت کے لیے ہے: ضِعْفًا : ایک عذاب ان کی گمراہی کا اور دوسرا لوگوں کو گمراہ کرنے کا اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جس نے گمراہی کی طرف دعوت دی تو اس پر اپنے گناہ کے علاوہ اس کی پیروی کرنے والوں کے گناہ بھی ہوں گے۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 247 /156 ابوداؤد 4609 ترمذی 2674) لِكُلٍّ ضِعْفٌ: پیروکاروں کے عذاب کی بھی دو وجوہات ہیں ایک گمراہی کو قبول کرنا اور دوسرا گمراہوں کی تقلید کرنا۔ اشارہ ہے کہ جہالت کی وجہ سے کفر اور شرک میں تقلید کرنا عذر نہیں ہے ہاں بڑوں کے عذاب کا دوگنا ہونا زیادہ ہوگا اس سبب سے کہ ان کے پیروی کرنے والے زیادہ ہونگے۔

تفسیر 39 مِنْ فَضْلٍ: تمہارا ہم پر کوئی احسان نہیں ہے اس لیے کہ اگر مریدوں نے ان کو تحفے دیئے ہیں تو پیروں نے ان کو لنگر دیئے ہیں یا تمہاری ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے تم بھی ہماری طرح گناہ گار ہو اور بیان کو: لِكُلٍّ ضِعْفٌ: سے معلوم ہوگیا:

تکسبون: کسب اس عمل کو کہا جاتا ہے جو ہمیشہ ہوتا ہے یعنی مشرکین اپنے شرک کے اعمال ہمیشہ کے لیے کرتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ۝

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا ان کے (روحوں) کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے اور ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں"|40|۔

تفسیر 40 پہلی آیتوں میں جہنم میں داخل ہونے کا ذکر تھا اب ان آیتوں میں ان کا جنت سے محروم ہونے کا ذکر ہے لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ یعنی مومنوں کے اعمال دعاؤں اور ارواح کے لیے تو آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں مگر کافروں کے لیے نہیں کھولے جاتے بلکہ حدیث میں ہے کہ کافر کی روح جب آسمان کے دروازے تک چڑھ جاتی ہے تو زمین کی طرف اس کو واپس لوٹا دیا جاتا ہے اور اس کو روح خبیث کہا جاتا ہے صحیح مسلم کتاب الجنة والصفة ونعيمها حدیث 2872 جس طرح سوئی کے ناکے میں اونٹ کا گذرنا ممکن نہیں ہے تو اسی طرح ان مشرکین کا جنت میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس کو تعلیق بالمحال کہا جاتا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی نے سوال کیا کہ جمل کیا چیز ہے تو انہوں نے کہا اونٹنی کا شوہر یعنی پوچھنے والے کی حماقت کی طرف اشارہ کیا کہ دوسرے معنی کی طلب میں تکلف ہے۔ (تفسیر قرطبی) اور بعض نے کہا ہے کہ دوسری قراءت میں اَلْجُمَّلُ تشدید سے آیا ہے اور وہ کشتی اور جہاز کی اس رسی کو کہا جاتا ہے جس کو سمندر کے کنارے اس کیساتھ باندھا جاتا ہے۔

لَهُم مِّن جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا
نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٤٢﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ
تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ۖ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ۖ
لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۖ وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾

"ان کے لیے جہنم کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر (آگ کے) لحاف ہونگے اور ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں [41]۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نبی کے طریقوں پر عمل کیا ہم کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ یہ لوگ جنت والے ہیں اس میں ہمیشہ رہینگے [42]۔ اور ہم انکے سینوں سے ناراضگی نکال دینگے ان (گھروں) کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور یہ لوگ کہیں گے تمام (توحید کی) صفات اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس ذات نے ہمیں اس جگہ پہنچایا اور ہم یہاں تک پہنچنے والے نہیں تھے اگر اللہ ہمیں یہاں تک نہ پہنچاتا یقیناً ہمارے پاس ہمارے رب کے رسول حق کیساتھ آئے اور ان کو آواز دی جائیگی کہ یہ جنت تمہارے عمل کی وجہ سے تم اس کے وارث بنائے گئے ہو" [43]۔

تفسیر 41 یہ بھی تخویف اخروی میں داخل ہے: مِهَادٌ: وہ فرش جو لیٹنے کے لیے بچھایا گیا ہو اور غَوَاشٍ: وہ ہے کہ جو اوپر سے اوڑھنے میں استعمال ہو اور یہ اشارہ ہے کہ جہنم کی آگ نے ان کا ہر طرف سے احاطہ کیا ہوگا مجرمین کا ذکر حرمان کیساتھ کیا اور ظالمین کا احاطے کیساتھ ذکر کیا اس لیے کہ ظلم جرم سے بڑا گناہ ہے۔

تفسیر 42 یہ آخرت کی بشارت ہے: لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا: یہ جملہ معترضہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح تمہاری طاقت سے باہر نہیں ہیں اور اشارہ ہے کہ مومن کے لیے ضروری ہے کہ اپنی وسعت اور طاقت کے مطابق جنت کے حصول کیلئے خرچ کرے۔

تفسیر 43 مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ جنت میں جب درجے ایک دوسرے سے بلند ہونگے تو کم درجے والا تو ناراض ہوگا اور اسی کو غل کہا جاتا ہے تو جواب ہوا کہ یہ طبعی ناراضی اللہ تعالیٰ ان کے دلوں سے نکال دے گا اسی طرح سورۃ حجر آیت 47 میں بھی ہے: هَدَانَا لِهَٰذَا: اس آیت میں ہدایت کا آخری مرتبہ مراد ہے جو کہ جنت میں داخل کرنا ہے: بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ: سوال: حدیث میں آیا ہے کہ جنت میں عمل سے کوئی داخل نہیں ہوسکتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے داخل ہوگا۔

(صحیح بخاری کتاب المرضیٰ حدیث 5673) جواب: ایک توجیہ تو یہ ہے کہ وہاں پر رحمت سے مراد توحید ہے اور اس آیت میں: تَعۡمَلُوۡنَ: سے مراد بھی توحید ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ رحمت باطنی اور عمل ظاہری سبب ہے تیسری توجیہ یہ ہے کہ رحمت دخول جنت کا اور اعمال جنت کے درجات کا سبب ہیں: غِلٍّ: یہ بے حد ناراضی ہے اگر یہ حسد اور بغض تک نہ پہنچے تو گناہ نہیں ہے: مِنۡ تَحۡتِهِمُ: ان کی کوٹھیوں کے نیچے یا انکے تصرف اور اختیار کے نیچے: لَقَدۡ جَآءَتۡ اس میں بطور خوشی جنت کے حصول کا سبب مذکور ہے اور اس جملے کے بعد پوشیدہ عبارت یہ ہے کہ: فَاهۡتَدَيۡنَا: ہم نے ہدایت پائی اور: أُوۡرِثۡتُمُوۡهَا: یہ میراث کا ذکر ہے لیکن اس سے مراد میراث کی طرح استحقاق ہے جو کہ وارث کا حق ہے۔ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ کافر شخص کیلئے جنت اور جہنم میں منزلیں ہیں تو جب کافر جہنم میں داخل ہو گئے تو ان کی جنت کی منزلیں مسلمانوں کے لیے میراث میں رہ گئیں اسی وجہ سے: أُوۡرِثۡتُمُوۡهَا: ذکر کیا۔ (نسائی سنن کبری 11454، مستدرک حاکم 2/235 علامہ ہیثمی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ صحیح الزوائد 10/402 شیخ شعیب ارناؤوط نے فرمایا کہ اس کی سند بخاری کی شرط پر ہے الموسوعۃ 10652)

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ
حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ
كُلًّا ۢ بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۟ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتْ
اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ ع

"اور جنت والے جہنم والوں کو پکاریں گے کہ ہم سے ہمارے رب نے جو وعدہ (جنت کا) ہم سے کیا تھا وہ ہم نے سچا پالیا تو کیا تم سے جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا وہ تم نے سچا پالیا؟ یہ لوگ کہیں گے کہ ہاں۔ تو ان کے درمیان ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے [44]۔ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس میں نقص (شکوک وشبہات کی وجہ) تلاش کرتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے منکر ہیں [45]۔ اور ان کے درمیان ایک پردہ ہوگا اور اس پردے کی بلند جگہ پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی نشانی سے پہچانیں گے اور یہ لوگ جنتیوں کو پکاریں گے کہ تم پر سلام ہو یہ (اعراف والے) جنت میں داخل نہیں ہوئے اور وہ اُمید رکھتے ہیں [46]۔ اور جب ان کی نگاہیں جہنم والوں کی طرف پھیر دیے جائیں گے تو یہ لوگ کہیں گے اے ہمارے رب ہمیں ظالم قوم کے ساتھ (آگ میں) نہ ڈالنا" [47]۔

تفسیر 44 ان آوازوں کی وجہ سے اس دن کا ایک نام: يَوْمَ التَّنَادِ: رکھا گیا ہے جیسا کہ سورۃ مؤمن آیت 32 میں ہے اور اس کو يَوْمَ الْاَذَانِ: بھی کہتے ہیں۔ طاؤس رحمہ اللہ نے ہشام بن عبدالملک بادشاہ سے کہا تھا: اِتَّقِ اللّٰهَ وَاحْذَرْ يَوْمَ الْاَذَانِ: اس نے کہا: يَوْمَ الْاَذَانِ: کیا ہے؟ تو انہوں نے یہ آیت پڑھ کر سنائی اور ہشام بے ہوش ہو کر گر گیا۔ طاؤس رحمہ اللہ نے کہا: هٰذَا ذُلُّ الصِّفَةِ فَكَيْفَ ذُلُّ الْمُعَايَنَةِ یعنی یہ خوف تو بیان کرنے سے پیدا ہوا معائنے کی ذلت کیسے ہوگی اور اس آیت سے چار طریقوں سے منادات شروع ہوں گے۔ پہلا طریقہ جنت والوں کو جہنم والوں کی ندا ہے اور اس میں مقصد تخویف اخروی ہے: مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا: اس سے مراد وہ ہے جو آیت 37 سے 41 تک تخویفات ذکر ہوئی ہیں کافر ان کا اقرار کریں گے اور ان وعیدوں کا اختتام: اَلظّٰلِمِيْنَ: پر کیا ہے ظالمین کو لعنت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

تفسیر 45 یہ تفسیر اس ظلم کی ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ ان عذابوں کے حقدار ٹھہرائے گئے: عَنْ سَبِيْلِ اللهِ: یہ توحید، ایمان، قرآن اور سنت سب کے لیے عام ہے اس سے منع کرنا بڑا ظلم ہے: عِوَجًا یہ مَعْوَجَةٌ: کے معنی میں ہے یعنی ٹیڑھا راستہ اس حق راہ میں شبہات اور طعنوں کے ذریعے نقائص تلاش کرتے ہیں۔ امام شربینی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ غیر اللہ کے لیے تلاش کرتے ہیں یا نمازیں پڑھتے ہیں اور ان چیزوں کی تعظیم کرتے ہیں جن کو اللہ تعالی نے تعظیم نہیں دی اور عوج دین اور معنوی چیزوں میں عین کے کسرہ کیساتھ استعمال ہوتا ہے اور جسم والی چیزوں میں عین کے فتحہ کیساتھ استعمال ہوتا ہے اور اس طرح کی آیت سورۃ ہود میں آئی ہے وہاں چونکہ شہادتوں کے بعد ذکر کیا ہے چنانچہ تاکید کے لیے ضمیر دو مرتبہ ذکر کی ہے۔

تفسیر 46 اس حجاب کو سور (دیوار) بھی کہتے ہیں جیسا کہ سورۃ حدید آیت 13 میں ہے اور اس کے بلند حصہ کو اعراف کہتے ہیں یہاں سے اعراف والوں کی دو ندائیں ذکر ہو رہی ہیں۔ پہلے ذکر جنت والوں کا ہے۔ اعراف کے رہنے والوں کے بارے میں مفسرین کے دس اقوال ہیں اس میں بہتر قول وہ ہے جس کے بارے میں امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے مرفوع حدیث نقل کی ہے وہ یہ کہ (مومن ہیں جن کے نیک اور برے اعمال برابر ہیں تو کچھ وقت کے لیے ان کو جنت سے روک دیا جائیگا اور جہنم سے ان کو بچایا جائیگا جیسا کہ اس آیت میں: لَمْ يَدْخُلُوْهَا: ذکر ہے پھر بعد میں انکو جنت میں داخل کیا جائیگا جیسا کہ آیت 49 میں آئیگا: بِسِيْمٰهُمْ: جنت والوں کی نشانیاں سفید چہرے اور ہاتھ اور پاؤں۔ اور جہنم والوں کی نشانیاں کالے چہرے اور نیلی آنکھیں ہوں گی: اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ: یہ بطور سلام تحیہ ہے یا جملہ خبریہ ہے یعنی تم آفات اور جہنم کی آگ سے محفوظ ہو: وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ: امید کی وجہ یہ ہے کہ جہنم والوں کیساتھ ان کو اکٹھا نہیں کیا گیا تو جنت کی امید پیدا ہوئی۔ عبد اللہ بن مسعود عبد اللہ بن عباس حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم سے نقل ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی حسنات اور سیئات برابر ہے امام ابن کثیر تحت القرآن، ان اقوال کو مرفوع حدیث کی تائید حاصل ہے۔

تفسیر 47 مجہول کے صیغہ میں اشارہ ہے کہ یہ لوگ اپنی رضامندی سے جہنم کی طرف نہیں دیکھتے اللہ تعالی ان کے چہروں کو ان کے اختیار کے بغیر آگ کی طرف پھیر دے گا تو یہ لوگ ڈر جائینگے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالی ہمیں جہنم کی طرف لے جائے۔ تو دعا مانگیں گے۔ رَبَّنَا الخ۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ
تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٤٨﴾ اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ
اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿٤٩﴾ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ
اللّٰهُ ۭ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٥٠﴾ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿٥١﴾

"اور پکاریں گے اعراف والے (جہنم میں موجود) ان لوگوں کو جن کو ان کی نشانیوں سے پہچانیں گے کہیں گے تمہیں تمہارے جمع کرنے نے کیا فائدہ دیا اور جس پر تم تکبر کیا کرتے تھے [48]۔ (تو ملائکہ کافروں سے کہیں گے) کیا یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کوئی رحمت نہیں پہنچائے گا (اعراف والوں سے کہا جائیگا) جنت میں داخل ہوجاؤ تم پر کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی تم غمگین ہوگے [49]۔ اور جہنم والے جنت والوں کو پکاریں گے کہ ہم پر (جنت کا) پانی بہادو یا ان چیزوں میں سے (گرادو) جو تمہیں اللہ تعالیٰ نے دی ہیں یہ لوگ کہیں گے بیشک اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں چیزیں کافروں پر حرام کردی ہیں [50]۔ (یہ کافر) وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنایا ہے اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالا تو آج ہم ان کو بھول جائینگے (چھوڑ دینگے) عذاب میں جیسا کہ انہوں نے اس دن کی ملاقات کو بھلایا تھا (اس وجہ سے) کہ ہماری آیتوں سے انکار کیا کرتے تھے" [51]۔

تفسیر 48 یہ اعراف والوں کی جہنم والوں کو دوسری پکار ہے مَآ اَغْنٰى میں مَا نافیہ یا استفہامیہ ہے۔ جَمْعُكُمْ: سے مراد مالوں کو اکٹھا کرنا یا ساتھیوں کی جماعتیں ہیں۔ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ: اس سے مراد دنیا یا پیروکار (مرید وغیرہ) ہیں۔

تفسیر 49 یہ ملائکہ کا قول ہے جہنم والوں کو خطاب ہے اُدْخُلُوْا یہ قول ملائکہ کا اصحاب اعراف کے لیے ہے۔ اَقْسَمْتُمْ: جیسا کہ سورۃ انعام آیت 53 اور سورۃ المطففین آیت 29 سے 32 تک ہے۔

تفسیر 50 یہ چوتھی ندا ہے جب اعراف والے درمیان سے ہٹ گئے۔ یہ آیت دلیل ہے کہ جہنم والوں پر بھوک اور پیاس آسکتی ہے اور یہ لوگ جنت کے انعامات سے ہمیشہ کیلئے محروم ہیں۔ مِمَّا رَزَقَكُمْ: اس سے مراد جنت کے دیگر مشروبات ہیں تو اَفِيْضُوْا: کے ساتھ متعلق ہے یا اس سے مراد کھانے کی چیزیں ہیں اور اَلْقُوْا پوشیدہ ہے حَرَّمَهُمَا اس سے مراد تحریم

لغوی ہے یعنی منع کرنا اس لیے کہ قیامت میں تحریم اور تحلیل شرعی نہیں ہوگی۔

تفسیر 51 اس کی تفسیر سورۃ انعام آیت 45 میں گزر چکی ہے۔ عذاب کے دو اسباب ہیں ایک قیامت کا انکار دوسرا آیتوں کا انکار كَمَا میں کاف تعلیلیہ ہے اور (مَا) مصدریہ ہے اور مَا كَانُوْا مَا نَسُوْا: پر عطف ہے: لَهْوًا وَّلَعِبًا امام رازی رحمہ اللہ نے فرق ذکر کیا ہے یعنی ایسا کام جس میں ہمت صرف کرنا مناسب نہیں ہے اور اگر اس میں صرف کرے تو یہ لَهْوَ ہے اور ایسی چیز کے ذریعے سے خوشی طلب کرنا جس سے خوشی حاصل نہیں ہوتی یہ لَعِبْ ہے۔ امام آلوسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں الفاظ مشترک ہیں یعنی بے مقصد کاموں میں مگن رہنا۔ فرق یہ ہے کہ لعب وہ ہے جس میں جلدی خوشی حاصل کرنی ہوتی ہے اور لَهْوَ: وہ ہے جو مصروفیات پیدا کرے اگرچہ اس میں خوشی نہ ہو۔ فائدہ: سورۃ انعام میں لفظ لَعِبْ پہلے ذکر کیا ہے اور اس سورۃ میں لہو پہلے ذکر کیا ہے وجہ یہ ہے کہ سورۃ انعام آیت 32 میں لعب پہلے ذکر کیا ہے تو اس کی مناسبت سے آیت 70 میں بھی پہلے ذکر کیا اور اس سورۃ میں مشرکین کا برہنہ طواف کرنا اور چیزوں کو حرام کرنا ذکر کیا ہے جبکہ وہ مصروفیت ہے یہ لوگ بھی اس کو کھیل نہیں کہا کرتے تھے تو اس کی مناسبت سے لھو یہاں پہلے ذکر کیا ہے: غَرَّتْهُمْ. غِرَّۃ حالت بیداری میں غفلت اور انسان کی لمبی عمر، خوبصورت زندگی اور زیادہ مال، جاہ و خواہشات کی طمع رکھنا جو کہ دین سے غفلت کا سبب بن جاتا ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿52﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ
يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا
لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿53﴾ ع

"اور یقیناً ہم ان کے پاس کتاب لیکر آئے جسے ہم نے علم و تفصیل کیساتھ بیان کیا ہے جو ایمان رکھتے ہیں ان کیلئے اس میں ہدایت اور رحمت ہے [52]۔ یہ لوگ انتظار نہیں کرتے مگر اس کتاب کے انکار کی عاقبت کا جس دن اس کے انکار کا انجام آئیگا جنہوں نے اس کتاب کو پہلے بھلا دیا تھا وہ کہیں گے ہمارے رب کے رسول ہمارے پاس حق لیکر آئے تھے (لیکن ہم نے نہیں مانا تھا) تو ہے کوئی سفارش کرنے والے جو ہماری سفارش کریں یا ہم (دنیا کی طرف) واپس لوٹا دیے جائیں تو اس عمل کے علاوہ عمل کریں جو ہم پہلے کیا کرتے تھے یقیناً انہوں نے اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا ہے اور یہ لوگ جو جھوٹ بنایا کرتے تھے وہ ان سے گم ہو جائینگے [53]۔

تفسیر 52 قرآن کی طرف ترغیب ہے اور اس میں وعید کی علت ہے جو پچھلی آیتوں میں ذکر ہوئی ہے یعنی ہم ان کے احکام کی تفصیل کے لئے یہ کتاب ہدایت اور رحمت لیکر آئے ہیں تو یہ لوگ انکار کیوں کرتے ہیں۔

تفسیر 53 یہ بھی تخویف اخروی ہے: تَاْوِيْلَهٗ: کی ضمیر کتاب کی طرف راجع ہے اور تاویل سے مراد کتاب کے انکار کا انجام ہے جو کہ ابدی عذاب ہے قیامت کے دن ظاہر ہوگا اور: قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ: اس میں اشارہ ہے کہ قرآن کے منکرین تمام رسولوں کے منکر ہیں اور یہ منکرین پہلی انبیاء علیہم السلام کے حال سے قرآن میں واقف ہو گئے تھے یا نَسُوْهُ کی ضمیر یوم کی طرف راجع ہے تو اس میں پہلے اور بعد والے تمام منکرین کا حال ہے: فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ: یعنی ان کو معلوم ہو گیا کہ بچنے کا سبب یا تو شفاعت ہے یا نیک اعمال کے لئے دنیا کی طرف واپس پلٹنا ہے جبکہ یہ دونوں کام نہیں ہو سکتے: شُفَعَآءَ: سے شفاعت قہریہ (بغیر اجازت کے سفارش) مراد ہے اس لئے کہ مشرکین کا اپنے معبودوں کے بارے میں یہ عقیدہ تھا جیسا کہ سورۃ یونس آیت 18 میں اور سورۃ فاطر آیت 37 میں ہے: قَدْ خَسِرُوْٓا: یہ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ کیساتھ متعلق ہے یعنی انہوں نے اپنی زندگی برے اعمال میں برباد کی ہے اور: وَضَلَّ: شُفَعَآءَ: کیساتھ متعلق ہے۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَٰتٍۭ بِأَمْرِهِۦٓ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَٰلَمِينَ ﴿٥٤﴾ ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٥٥﴾

بیشک تمہارا رب وہ ذات ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ دنوں (کے اندازے) میں بنایا پھر (اپنی شان کے مطابق) عرش پر برابر ہوا رات سے دن کو ڈھانپ لیتا ہے جو ایک دوسرے کو تیزی سے طلب کرتے ہیں۔ سورج، چاند اور تارے اس کے حکم کے تابع کیے گئے ہیں خبردار اللہ تعالیٰ کے لئے پیدائش اور کاموں کا اختیار ہے اللہ تعالیٰ برکات دینے والا اور تمام جہان والوں کو پالنے والا ہے [54]۔ اپنے رب سے عاجزی کیساتھ اور چھپ کر دعا مانگو بیشک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا" [55]۔

تفسیر 54 یہاں سے سورۃ کا دوسرا حصہ ہے اس میں تین باب ہیں پہلا باب 103 تک ہے اس میں پہلی آیتوں میں توحید کا مسئلہ ہے دس جملوں میں اور اس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے: بِشِرْكٍ فِي الرُّبُوبِيَّةِ وَالْخَلْقِ وَالْأَمْرِ وَالْبَرَكَاتِ: دعاء کے رد کے ذریعے پھر ایک مثال پھر پانچ انبیاء علیہم السلام کے واقعات پہلے تین اور پانچویں واقعے میں مذکور ہے کہ ان انبیاء علیہم السلام نے توحید کا مسئلہ بہادری کیساتھ بیان کیا تھا اور چوتھے واقعہ میں مذکور ہے کہ لوط علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کی طرف اپنی قوم کو بلایا تھا اور شیطان کی پیروی سے لوگوں کو منع کیا تھا اور آخر میں آیتیں قصوں کیساتھ متعلق ہیں اور ابتلاء: بِالتَّنَعُّمِ وَالتَّنَقُّمِ: ذکر کیا گیا ماقبل کیساتھ ربط یہ ہے کہ پہلے یہ کہا گیا کہ ان کے سفارشی کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے اس لئے وہ معبود نہیں بن سکتے معبود تو صرف اللہ تعالیٰ ہے جو ان صفات کیساتھ متصف ہے ان آیاتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارا رب ہے، خالق ہے، عرش والا ہے، نظام چلانے والا ہے، ہر چیز اس کے حکم کے تحت ہے، بااختیار ہے، برکات دینے والا ہے: إِنَّ رَبَّكُمُ: امام شربینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رب، سید، مولا اور تمام کاموں کی اصلاح کرنے والا اور فائدہ پہنچانے والا اور مصیبتوں کو دور کرنے والا ہے: فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ: اس سے مراد آخرت کا دن ہیں اس کا ایک دن ہزار سال ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ قول مجاہد اور ضحاک رحمہم اللہ کا ہے یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے یا اس سے مراد دنیا کے دن ہیں۔ (سوال) دنیا کے دن تو سورج کے چڑھنے اور اترنے سے معلوم ہوتے ہیں اور وہ تو اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا۔ (جواب) اس سے مراد چھ دنوں کی مقدار ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ

کے اس قول میں ہے لَهُمْ فِيهَا رِزْقُهُمْ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا اور یہ چھ دن سورۃ حم سجدہ میں مذکور ہیں۔ پہلا دن اتوار کا ہے اور جمعہ پر اختتام ہوا ہے اور ہفتہ کا دن خالی ہے یعنی آسمانوں اور زمین کی پیدائش ان چھ دنوں میں ہوئی ہے اور ہفتے کا دن بھی اسی طرح رہ گیا تھا اور جو حدیث امام مسلم رحمہ اللہ نے باب خلق آدم کتاب صفات المنافقین حدیث 2789 میں روایت کی اس میں خلق کی ابتداء ہفتے کے دن سے ہے اور پیدائش کے مکمل دن سات ہیں تو اس کا امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے رد کیا ہے: ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ : یہ ان صفات میں سے ہے جو معنی کے اعتبار سے محکمات ہیں اس لئے کہ اس کا ظاہری معنی معلوم ہے اور کیفیت کے اعتبار سے متشابہات میں سے ہیں یعنی اسکی کیفیت مجہول ہے جیسا کہ عرش کا معنی معلوم ہے لیکن حقیقت معلوم نہیں ہے اس طرح اللہ تعالیٰ کا استواء اور علو کا معنی معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت معلوم نہیں ہے تو عرش اور استوا اور بلندی میں بغیر کسی تشبیہ تمثیل کیفیت اور تجسیم کے ظاہری معنی مراد ہے، یہ مذہب سلف صالحین کا تمام متشابہات میں ہے امام مالک اور امام زاعی، امام ثوری، امام لیث، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق بن راھو یہ اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ وغیرہ کا یہ مذہب ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کا مشہور قول یہ ہے: اَلْاِسْتِوَاءُ غَيْرُ مَجْهُوْلٍ وَالْكَيْفُ غَيْرُ مَعْلُوْمٍ وَالْاِيْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ : اور نعیم بن حماد (امام بخاری کے استاد) سے یہ روایت منقول ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ کر دیا تو اس نے کفر کیا اور جس نے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت سے انکار کیا تو اس نے بھی کفر کیا اور سلف صالحین کا قول تفویض نہیں ہے اس لئے کہ صفات میں تفویض یہ ہے کہ استویٰ ید وغیرہ کے واضح معانی (لغوی حقیقی) نہیں مانتے یعنی معنی اور کیفیت متشابہ سمجھتے ہیں اور سلف کے قول میں اس کے معنی حقیقی لغوی کیساتھ تعبیر کیا جائیگا لیکن کیفیت کے بارے میں بحث نہیں ہوگی، اس مسئلے کی زیادہ تفصیل اور سوال وجواب شیخ الاسلام کے فتاویٰ جلد 5 جلد 3 اور امام ابن قیم کی کتاب الصواعق المرسلہ اور امام ذہبی کی مختصر کتاب العلو اور دیگر سلف صالحین کی بہت سی کتابیں ملاحظہ کی جاسکتی ہے اور استوا قرآن کریم میں بہت ساری آیتوں میں ہے۔ سورۃ یونس آیت 3، سورۃ رعد آیت 2، سورۃ طٰہٰ آیت 5، سورۃ فرقان آیت 9، سورۃ حم سجدہ آیت 4، سورۃ حدید آیت 4 اور جو اس کی تاویل بادشاہت کیساتھ کرتے ہیں یا استویٰ کا معنی استولی کیساتھ کرتے ہیں تو امام شربینی نے اس پر رد کیا ہے کہ یہ شاذ قول ہے دوسرا یہ کہ یہ حقیقت سے مجاز کی طرف پھر جانا ہے اور جو اشعار پیش کیئے جاتے ہیں استویٰ استولی کے معنی میں ہے اس کا رد کیا ہے، اس مسئلے کی مستقل تفصیل میرے ایک رسالے (غیر مطبوعہ) میں ہے: يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ : یہ جملہ دونوں اطراف کو شامل ہے اس سے مراد تصرف انقلابی

زمانی ہے جبکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے:يَطْلُبُهُ حَثِيثًا : یعنی درمیان ایسا وقت نہیں آتا ہے کہ نہ رات ہو اور نہ دن ہو:وَالشَّمْسَ یہ اَلسَّمٰوٰتِ پر عطف ہے خلق کے تحت ہے:مُسَخَّرَاتٍ : یعنی ان حالات کے تابع کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا ارادہ رکھتا ہے مثلاً ظاہر ہونا چھپ جانا، گرہن لگ جانا اور ختم ہونا وغیرہ:اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ : پہلے صرف خاص امور کی خلقت کا ذکر کیا ہے اور اس جملے میں عام خَلْقٌ بطور حصر ذکر توحید کے فائدے کے لئے کیا ہے:وَالْاَمْرُ : تمام تصرفات تکوینیہ اور تشریعیہ ہیں تو کلام اللہ بھی امر ہے سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ امر کلام اللہ ہے اور خَلْقٌ پر معطوف ہے اور اَلْخَلْقُ مغایرت کو طلب کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ کلام اللہ مخلوق نہیں ہے یہ سلف صالحین کا مذہب ہے اور ابن جریر اور امام ابن کثیر رحمہم اللہ نے یہاں عبدالعزیز الشامی کے والد سے حدیث نقل کی ہے وَمَنْ زَعَمَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى جَعَلَ لِلْعِبَادِ مِنَ الْاَمْرِ شَيْئًا فَقَدْ كَفَرَ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى اَنْبِيَاۗءِهٖ جس نے یہ عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیارات میں سے بندوں کو دیے ہیں تو اس نے ان کتابوں کے ساتھ کفر کیا جو اللہ نے اپنے انبیاء علیہ السلام پر نازل کی ہیں اس روایت کی سند میں عبدالغفور بن عبدالعزیز ہے جس کی وجہ سے محققین علماء نے اس کو ضعیف کہا ہے تخریج ابن کثیر:تَبَارَكَ : یہ صفت اللہ تعالیٰ کیساتھ خاص ہے اسی طرح:مُبَارِكٌ : ر کے زیر کے ساتھ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے اور را کے زبر کے ساتھ:مُبَارَكُ اللّٰهِ : نہیں کہا جا سکتا برکت کہا جاتا ہے فائدے پیدا کرنے کو آسمان اور زمین، سورج اور چاند کے فائدے اور اسی طرح فائدے زیادہ کرنا اور ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے تو فائدوں کا پیدا کرتے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے برکت دینے والا بھی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور [illegible] ہے اور اسکی تفسیر ہم نے تنشیط الاذہان میں ذکر کی ہے۔

تفسیر 55 یہ دعا میں شرک کرنے کا رد ہے اور ماقبل پر تفریع ہے کہ مالک، مختار اور برکت دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے تو کسی کو مدد کے لئے پکارنا اور حاجت طلب کرنا بھی اُسی کے ساتھ خاص ہے، اس آیت میں دعا کا رکن اور شرائط مذکور ہیں رکن یہ ہے کہ خالص رب سے مانگتے ہیں اور شرائط یہ ہیں کہ ظاہری عاجزی اختیار کرنا اور چھپ کر مانگنا اور حد سے تجاوز نہ کرنا یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کی مخالفت سے بچنا:اُدْعُوْا : اس سے مراد سوال اور دعا ہے جو عبادت کی خاص قسم ہے (تفسیر خازن سراج المنیر) اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت پر مکمل یقین اور دل کی خشوع سے جو عاجزی اور تذلل ظاہری اعضاء سے پیدا ہوا ہے:تَضَرُّعًا : کہتے ہیں۔ (ابن کثیر):خُفْيَةً زبان سے بغیر آواز کے پکارنا حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم دعا میں کوشش کیا کرتے تھے کہ ہلکی آواز کے علاوہ ان کی آواز سنی نہیں جاتی تھیں، یہ ادب ذکریا علیہ السلام کی سنت ہے جیسا کہ سورۃ مریم آیت 2 میں مذکور ہے۔ تمام مفسرین اور فقہاء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ذکر اور دعا میں شرعی مقامات کے علاوہ آواز بلند کرنا بدعت ہے: إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ : اس میں دعا کی تیسری شرط پوشیدہ عبارت کے ذریعے سے ہے یعنی وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ : یہ علت ہے، اعتداء حدود شرعیہ سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں تو دعا میں اعتدا کی مختلف صورتیں ہیں (۱) ان الفاظ میں جیسا کہ بعض: اللَّهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ میں یہ الفاظ زیادہ کرتے ہیں: حَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ (۲) آواز کو بلند اور جہر کرنے کے اعتبار سے۔ مطلوب چیز میں جیسے قصر ابیض (سفید محل) جنت کے دائیں طرف مانگتے ہیں صحیح سنن ابوداؤد کتاب الطہارۃ حدیث 96۔ اجتماعی شکل میں ان جگہوں میں دعا مانگنا جہاں جمع کی کوئی شرعی دلیل ثابت نہیں ہے جیسا کہ فرض اور سنت نماز کے بعد اور جنازے کے بعد دعائیں مانگنا۔ ان جگہوں میں ہاتھوں کو اٹھانا جہاں ہاتھوں کو اٹھانا ثابت نہیں ہے اور عام دعاؤں میں حد سے زیادہ ہاتھوں کو اٹھانا۔

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾
وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ
فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٥٧﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ
يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾ ع

"اور زمین میں (شرک کے ذریعے سے) فساد نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے خوف اور طمع کے ساتھ دعا مانگو بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت اچھے عمل کرنے والوں کے قریب ہے[56]۔ اور اللہ تعالیٰ وہی ذات ہے جو ہواؤں کو اس کے رحمت سے پہلے خوشخبری دینے کے لئے بھیج دیتا ہے یہاں تک کہ جب بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں (پانی پر) تو ہم اسکو بنجر زمین کیطرف لے جاتے ہیں پس ہم اس سے پانی نازل کر لیتے ہیں اس کے ذریعے سے ہم ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں اسی طرح ہم مردوں کو (قبروں سے) نکالیں گے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو[57]۔ اور پاکیزہ زمین اس کے پودے اپنے رب کے حکم سے نکالتی ہے اور جو خراب زمین ہوتی ہے تو وہ بے فائدہ پودے نکالتی ہے اس قسم کی آیتیں ہم ایسے لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں جو شکر ادا کرتے ہیں[58]۔

تفسیر 56، 57 اس آیت میں شرک کا رد ہے اس لئے کہ فَسَادٍ: شرک کے معنی میں ہے اور اِصْلَاحِ: توحید کے معنی میں ہے، ان دو شرائط خوف اور طمع کو ذکر کی ہیں جو کہ باطن کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ رحمت سے مراد دعاء کو قبول کرنا اور ثواب ہے: مُحْسِنِيْنَ: سے مراد وہ لوگ ہیں جو توحید کے عقیدے اور سنت کے طریقے پر عمل کرتے ہیں: وَلَا تُفْسِدُوْا کا لفظ عام ہے: (۱) نفسوں میں فساد کا مطلب ہے کسی کو قتل کرنا، (۲) مال میں فساد کا مطلب ہے مال غصب کرنا، چوری کرنا (۳) نسب میں فساد کا مطلب ہے زنا اور قوم لوط والا عمل کرنا: اِصْلَاحِ: سے مراد انبیاء علیہم السلام کو اللہ کی کتابوں کے ساتھ بھیجنا ہے: خَوْفًا وَّطَمَعًا: یہ دونوں صالحین کی دعاء میں سورۃ سجدہ آیت 16 میں مذکور ہیں اور بارش کے وقت سورۃ رعد آیت 12 اور برق کے وقت سورۃ روم آیت 24 میں مذکور ہے: رَحْمَتَ اللّٰهِ: رحمت بہت سارے معانی میں ہے یہاں دعاء قبول کرنا مراد ہے: قَرِيْبٌ: مذکر ذکر کیا ہے اس لئے کہ رحمت کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے تو اس میں ادب ہے یا رحمت ثواب کے معنی میں ہے یا اس وجہ سے کہ رحمت کی تانیث حقیقی نہیں ہے۔

تفسیر 58 توحید کی ایک دلیل ہے اور يُغْشِي الَّيْلَ: پر عطف ہے اور قرآن اور توحید کے بیان کے لئے ایک مثال بھی ہے جیسے بارش سے پہلے ہوائیں چلتی ہیں اور بھاری بادل چھا جاتے ہیں اسی طرح قرآن سے پہلے آنے والے کتابوں میں قرآن اور رسول کے بارے میں بشارتیں تھیں اور ابتدا میں مشرکین نے بہت سخت مقابلے اور اندھیرے بنائے تھے اور جیسے زمین دو قسم کی ہوتی ہے ایک سے بارش کے ذریعے سے فائدے والے پودے اگتے ہیں اور دوسری قسم سے بے فائدہ پودے نکلتے ہیں اسی طرح قرآن کا بیان بعض لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے اور بعض کو نقصان: كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى: اس میں بطور قیاس قیامت کا اثبات ہے دوسرا یہ کہ انسان جب زمین کی فصل کو دیکھ لیتا ہے تو ایسا نہ ہو کہ خوشی سے دوبارہ کی زندگی کو بھول جائے تو اس کے ساتھ آخرت کو یاد دلانے کے لئے یہ ذکر کیا: الرِّيٰحَ: کی چار قسمیں ہیں: (۱) باد صبا بادل کو اٹھاتی ہے (۲) شمال بادلوں کو اکٹھا کرتی۔ (۳) جنوب بادلوں کو پھیرتی ہے ۴ دبور بادلوں کو الگ الگ کرتی ہے۔ بُشْرًا: جیسا کہ سورۃ روم آیت 45 میں: الثَّمَرٰتِ: زمین کے ہر قسم کی آمدنی کے لئے عام ہے گندم پھل معدنیات وغیرہ: لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ: یعنی وہ لوگ جو ان نعمتوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں، قرآن سن کر اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور توحید اور اطاعت کو قبول کرتے ہیں۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥٓ إِنِّيٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ
يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٥٩﴾ قَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِۦٓ إِنَّا لَنَرَىٰكَ فِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٦٠﴾ قَالَ يَٰقَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلَٰلَةٌ وَلَٰكِنِّي
رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَٰلَمِينَ ﴿٦١﴾ أُبَلِّغُكُمْ رِسَٰلَٰتِ رَبِّي وَأَنصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٢﴾ أَوَ
عَجِبْتُمْ أَن جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٦٣﴾ فَكَذَّبُوهُ
فَأَنجَيْنَٰهُ وَالَّذِينَ مَعَهُۥ فِي الْفُلْكِ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِـَٔايَٰتِنَآ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ ﴿٦٤﴾

"یقیناً ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو اس نے فرمایا اے میری قوم خالص اللہ کی عبادت کرو تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی مددگار نہیں ہے میں تم پر بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔[59]۔ ان کی قوم کے بڑوں نے کہا بے شک ہم تمہیں واضح گمراہی میں دیکھتے ہیں[60]۔ اس نے فرمایا اے میری قوم مجھ پر کوئی گمراہی نہیں ہے بلکہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں[61]۔ تمہیں اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان چیزوں کو جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے[62]۔ کیا تم اس پر تعجب کرتے ہو کہ تمہارے رب کی طرف سے تم میں سے ایک شخص پر وحی آئی ہے تاکہ تمہیں ڈرائے اور تم شرک سے بچ جاؤ اور اس لیے کہ تم پر رحم کیا جائے۔[63]۔ انہوں نے اس کو جھٹلایا تو ہم نے اس کو اور اس کے ساتھ جو کشتی میں تھے ان کو بچا لیا اور ہم نے ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا بے شک وہ اندھی قوم تھی"[64]۔

تفسیر 59 اس آیت سے چھ انبیاء علیہم السلام کے ذکر کیے گئے واقعات ہیں جو سورۃ کے تینوں دعووں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں مگر پہلے تین واقعات تیسرے دعوے کے ساتھ واضح تعلق رکھتے ہیں جو کہ توحید کا اثبات ہے ہر قصے کا خلاصہ تین امور میں ہیں پہلا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، دوسرا قوم کی تکذیب، تیسرا ان پر عذاب کا نزول پہلی آیت کے ساتھ اس کا ربط یہ ہے کہ جیسے ہم ہواؤں کو زمین کے اختلاف کے باوجود بارش بھیجتے ہیں اسی طرح ہم نے انبیاء کو قوم کے اختلاف کے باوجود شریعت کے ساتھ بھیجا ہے بعض نے تصدیق کی اور بعض نے تکذیب یہ واقعہ توحید فی العبادت کے مسئلے پر پہلی دلیل نقلی ہے اشارہ ہے کہ یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفق علیہ مسئلہ تھا نوح علیہ السلام وہ پہلے نبی تھے جن کو مشرکین کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی انبیاء علیہم السلام تھے لیکن ان کا شرک کے ساتھ مقابلہ نہیں تھا وہ اصلاحی احکام کے ساتھ بھیجے

گئے تھے: اِلٰی قَوْمِهٖ: یہ دلیل ہے کہ نوح علیہ السلام تمام انسانوں کے لئے رسول نہیں تھے صرف اپنی قوم کے رسول تھے لیکن اس وقت زمین پر صرف یہی لوگ تھے اور کوئی نہیں تھا اس وجہ سے مشہور ہے کہ وہ تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ حقیقت میں یہ خصوصیت ہمارے نبی آخر الزمان ﷺ کی ہے اور اس آیت میں دعوت اور تخویف ہے: اِلٰهٌ: عبادت کے حقدار کے معنی میں ہے تو یہ امر پر تفریع ہے یا: اِلٰهٌ: سے مراد مختار متصرف ہے تو یہ: اُعْبُدُوْا: امر کی علت ہے اور یہ دلیل ہے کہ: اُعْبُدُوْا: سے مراد توحید ہے: عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ: یہ دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔

تفسیر 60 اس آیت میں قوم کی تکذیب ذکر کی گئی ہے: اِنَّا لَنَرٰىكَ: یعنی توحید کی طرف دعوت دینا اور پانچ معبودوں یعنی، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی عبادت سے منع کرنا یہ گمراہی ہے تو اہل حق کو گمراہی اور کم عقلی کی بری نسبتیں کرنا یہ پرانے کافروں کی عادت ہے: اَلْمَلَاُ: قوم کے بڑے اور مالدار نسب والے لوگ جن سے مجلس پر نظر آتی ہے (مَلَأَ یَمْلَأُ: کا لغوی معنی ہے بھرنا) یا وہ لوگ دنیا کے مالوں اور اقتدار کی وجہ سے بھرے ہیں یہاں ملاء کے ساتھ کفر ذکر نہیں کیا ہے اشارہ ہے کہ وہ سب کافر تھے۔

تفسیر 62 یہ نوح علیہ السلام کی طرف سے قوم کو جواب ہے چنانچہ بہت نرم طریقے سے جواب دیا ہے لفظ ضلال کے برعکس یہ جنس پر دلالت کرتا ہے تو نفی جنس کے ساتھ کامل نفی آئی ہے: وَلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ: توحید کے بیان کے ساتھ یہ رسالت کا دعویٰ ہے۔ رسول کے تین احوال کے ساتھ یہ بھی جواب ہے پہلا ابلاغ، دوسرا نصیحت (خیر خواہی اور اخلاص) تیسرا وحی کا علم: مِنَ اللّٰهِ: یہ دلیل ہے کہ نبی کا علم صرف اللہ تعالی کی طرف سے ہوتا ہے: مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: اور نبی کا علم امت سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ وحی پر مبنی ہوتا ہے۔

تفسیر 63 اس سے پہلے والے منکرین کے ذہن میں بھی یہ بات تھی کہ رسالت اور بشریت کے درمیان منافات ہے چنانچہ یہ خیال اس قوم کا بھی تھا بلکہ ان کا یہ قول سورۃ مؤمنون آیت 21 میں بھی مذکور ہے اور یہ عقیدہ بھی باطل پرستوں میں ہے کہ نبی کی بشریت سے انکار کرتے ہیں لیکن موجودہ منکرین نے نبی کو نہیں دیکھا ہے تو کہتے ہیں کہ نبی تھا لیکن بشر نہیں تھا اور پہلے لوگوں نے تو نبی کو دیکھا تھا ان کو معلوم بھی تھا کہ یہ بشر ہے لیکن اس کی نبوت سے انکار کیا کرتے تھے تو انکار کا سبب سب کا ایک ہے جو بشریت اور نبوت کے درمیان منافات ہے جبکہ یہ کفر ہے: لِیُنْذِرَكُمْ: یہ ترتیب کے ساتھ رسالت کا فائدہ ہے یعنی رسالت انذار کے لئے ہے اور انذار تقویٰ کا سبب ہے اور تقویٰ رحم الٰہی کا سبب ہے۔ یہ آیت دلیل ہے کہ انبیاء علیہم

السلام بشر اور مرد تھے۔

تفسیر64 اس آیت میں تکذیب کا دوام ذکر ہوا یعنی: کَذَّبُوْهُ: (انہوں نے تکذیب پر ہمیشگی اختیار کی): وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ: اس کی تعداد میں بہت سارے اقوال ہیں۔ راجح یہ ہے کہ چھ افراد تھے تین ان کے بیٹے سام، حام، یافث اور تین ان کی بیویاں تھیں: اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا: یہ آیت دلیل ہے کہ نوح علیہ السلام کا طوفان ساری زمین پر نہیں تھا بلکہ صرف اس کی قوم کے علاقے پر تھا اور وہ علاقہ عراق کا تھا اس وجہ سے اس وقت اس قوم کے علاوہ زمین پر اور لوگ آباد نہیں تھے تو یہ بات جو مشہور ہے کہ طوفان ساری زمین پر آیا تھا مراد یہ ہے کہ زمین پوری آبادی پر آیا تھا اسی طرح جنہوں نے اس طوفان کے آثار پائے ہیں تو صرف عراق کی سرزمین موصل کوہ ارادات کے پاس پائے ہیں): اِنَّهُمْ كَانُوْا: یہ عذاب کی علت ہے عَمِيْنَ: سے مراد دلوں کا اندھا ہونا ہے جیسا کہ سورۃ حج آیت 47 میں ہے۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۗ قَالَ يَٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥٓ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿65﴾ قَالَ ٱلْمَلَأُ ٱلَّذِينَ
كَفَرُوا۟ مِن قَوْمِهِۦٓ إِنَّا لَنَرَىٰكَ فِى سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ ٱلْكَٰذِبِينَ ﴿66﴾ قَالَ يَٰقَوْمِ لَيْسَ بِى سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّى
رَسُولٌ مِّن رَّبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿67﴾ أُبَلِّغُكُمْ رِسَٰلَٰتِ رَبِّى وَأَنَا۠ لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿68﴾ أَوَعَجِبْتُمْ أَن جَآءَكُمْ ذِكْرٌ
مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ ۚ وَٱذْكُرُوٓا۟ إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِى ٱلْخَلْقِ
بَصْۜطَةً ۖ فَٱذْكُرُوٓا۟ ءَالَآءَ ٱللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿69﴾ قَالُوٓا۟ أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ ٱللَّهَ وَحْدَهُۥ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ ءَابَآؤُنَا ۖ
فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿70﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ ۖ أَتُجَٰدِلُونَنِى فِىٓ
أَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّا نَزَّلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَٰنٍ ۚ فَٱنتَظِرُوٓا۟ إِنِّى مَعَكُم مِّنَ ٱلْمُنتَظِرِينَ ﴿71﴾
فَأَنجَيْنَٰهُ وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ ٱلَّذِينَ كَذَّبُوا۟ بِـَٔايَٰتِنَا ۖ وَمَا كَانُوا۟ مُؤْمِنِينَ ﴿72﴾

"اور ہم نے عادیوں کی طرف ان کے بھائی ہود علیہ السلام کو بھیجا اس نے فرمایا اے میری قوم خالص اللہ کی عبادت کرو تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے کیا تم شرک سے بچتے نہیں ہو[65]۔جن سرداروں نے اس کی قوم میں کفر کیا تھا انہوں نے کہا یقیناً ہم تمہیں بے وقوفی میں دیکھتے ہیں اور ہم تم پر جھوٹوں کا گمان کرتے ہیں[66]۔اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو مجھ پر کوئی بیوقوفی نہیں ہے میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں[67]۔تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچانے والا ہوں اور تمہارے لئے امانت دار خیرخواہ ہوں۔کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے رب کی طرف سے تم میں سے ایک شخص پر وحی آئی ہے تاکہ وہ تمہیں ڈرائے اور یاد کرو جس وقت تمہیں اللہ تعالیٰ نے زمین کے آباد کرنے والے بنایا تھا[68]۔نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد اور تمہاری پیدائش میں وسعت پیدا کی تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ[69]۔انہوں نے کہا کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کریں اور ان کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے بڑے کیا کرتے تھے تو ہمارے پاس وہ (عذاب) لے آؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو اگر تم اپنی (بات) دین میں سچے ہو[70]۔اس نے فرمایا یقیناً تم پر تمہارے رب کی طرف سے (گندگی اور عذاب) اور غضب لازم ہو چکا ہے کیا تم مجھ سے ان ناموں کے بارے میں جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے

بڑوں نے اپنی طرف سے بنا رکھے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی دلیل نازل نہیں کی (عذاب کا) انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں [71]۔ ہم نے اپنی رحمت کے سبب اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو نجات دی اور ہم نے ان لوگوں کی جڑیں کاٹ ڈالیں جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں تھے" [72]۔

تفسیر 65 یہ توحید کے لئے دوسری دلیل ہے۔ عاد سام بن نوح کی اولاد میں سے پانچویں پشت میں تھا ہود عاد کی اولاد میں تیسری پشت میں تھا پھر عاد پورے قبیلے کا نام پڑ گیا: اَخَاهُمْ : سے نسبی اخوت مراد ہے یعنی ان کے ساتھ قوم میں شریک تھا اور کبھی اخوت لفظ خیر خواہی کے معنی میں ہوتا ہے: اَفَلَا تَتَّقُوْنَ : کے ساتھ تخویف مذکور ہے۔ سوال: پہلے قصہ میں فَقَالَ تھا اور یہاں قَالَ ہے؟ جواب ۱: فاء میں اتصال اور دوام کی طرف اشارہ ہے یعنی نوح علیہ السلام نے مبعوث ہونے کے ساتھ متصل اور ہمیشہ کے لئے دعوت شروع کی تھی اور یہ ان کی خصوصی فضیلت تھی۔ جواب ۲: فاء تفصیل کے لئے ہے اور لفظ قَالَ جملہ مستانفہ ہے اور سوال کا جواب ہے کہ اس نے کیا کہا تھا؟ تو جواب میں قال فرمایا۔

تفسیر 66 یہ قوم کی طرف سے تکذیب ہے جس نے توحید بیان کیا اس کو کم عقل، بیوقوف اور جھوٹا کہا جاتا تھا: اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا : اس میں اشارہ ہے کہ اس کی قوم میں سے بعض بڑے ایمان لائے تھے: فِیْ سَفَاهَةٍ : عقل سمجھ اور دانائی کی کمزوری کو کہا جاتا ہے یہ لفظ: اُعْبُدُوْا : کے مسئلے کے ساتھ ہے اور مِنَ الْکٰذِبِیْنَ تَتَّقُوْنَ : کے ساتھ متعلق ہے اس میں عذاب آنے کی طرف اشارہ ہے۔

تفسیر 67 اشارہ ہے کہ رسول کم عقل نہیں ہوتا بلکہ اس میں عقل اور علم دونوں کامل ہوتے ہیں اور اس میں اس کی رسالت کا دعویٰ مذکور ہے۔

تفسیر 68 اس میں رسول کے تین اوصاف مذکور ہیں: نَاصِحٌ اَمِیْنٌ : اسم فاعل کے صیغہ کے ساتھ ان صفات کی شہرت کی طرف اشارہ عموماً ہے یا نَاصِحٌ : توحید کی دعوت میں اور اَمِیْنٌ رسالت کے دعوٰی میں (ناصح) ہے۔

سوال: نوح علیہ السلام کے بارے میں اَنْصَحُ مذکور تھا جواب فعل تعدد پر دلالت کرتا ہے یعنی اس کی دعوت نئے نئے طریقوں پر تھی جیسا کہ سورۃ نوح میں ہے چونکہ: سَفَاهَةٌ : کے وصف میں خیانت کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ بے وقوف شخص پوری بات نہیں کرتا تو ان کی رد میں ہود کے لئے امین کا لفظ کا اضافہ کردیا۔

تفسیر 69 اس پر یہ اعتراض تھا کہ آپ بشر ہیں اور مرد ہیں تو رسول کیسے بن گئے ہو؟ جیسا کہ سورۃ ابراہیم آیت 10 اور سورۃ مؤمنون آیت 33 میں ہے تو اس نے أَوَ عَجِبْتُمْ: کے ساتھ جواب دیا۔ بَصْطَةً: نسل کا زیادہ ہونا مراد ہے یا لمبے قد کے ساتھ بدن کا بڑا ہونا مراد ہے۔ صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ گز کا تھا اور اولاد کا قد اس سے کم ہوگا (صحیح بخاری کتاب احادیث الانبیاء حدیث 3326) تو عادیوں کے بارے میں جو اسرائیلی روایات آئی ہیں کہ وہ سو گز کے تھے یا ان میں عوج نام کا شخص آسمان تک پہنچتا تھا یہ تمام روایات بے اعتبار ہیں۔ لِيُنذِرَكُمْ چونکہ اس کے بیان میں: أَفَلَا تَتَّقُونَ: پہلے ذکر ہو چکا تو یہاں لِتَتَّقُوا: ذکر نہیں کیا۔ وَاذْكُرُوا: یہ یہ نعمتوں کے ذکر کے ذریعے ترغیب کے لیے دعوت کی تاکید ہے۔ فَاذْكُرُوا: پہلا ذکر یاد دہانی کے معنی میں ہے اور یہ ذکر شکر کرنے کے معنی میں ہے آلَاءَ: جرے اور واضح انعامات کو کہا جاتا ہے۔

تفسیر 70 یہ ان کی تکذیب کا طریقہ تھا یعنی توحید پر تعجب کرنا۔ امام آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ ان کا آباء کی تقلید میں انہماک تھا: أَجِئْتَنَا: اس وجہ سے کہا کہ یہ نبوت سے پہلے ان سے الگ رہتا تھا جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے غار حراء میں رہا کرتے تھے یا تو یہ قول بطور استہزاء کے ہے کہ انہوں نے کہا کیا تم آسمان سے اس بات کے لئے آئے ہو یا یہ کہ نئے مسائل کے لانے سے انہوں نے کنایہ اختیار کیا ان کے نئے مسائل لانے کی وجہ سے یہ دلیل ہے کہ ان کا (اور اسی طرح تمام مشرکین کا) جھگڑا نفس عبادت میں تھا صرف اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہیں تھا بلکہ توحید میں تھا وہ دعاء سجدہ نذر وغیرہ اللہ کے لئے خالص نہیں مانتے تھے بلکہ اور لوگوں کو اس کے ساتھ شریک اور حقدار سمجھتے تھے اسی طرح سورۃ اسراء آیت 46، سورۃ صافات آیت 35، سورۃ ص آیت 5، سورۃ زمر آیت 45 اور سورۃ مؤمن آیت 12 میں ہے۔ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا: عذاب کا یہ مطالبہ ان کی ضد اور عناد کی وجہ سے ہے۔

تفسیر 71 قَدْ وَقَعَ: ان کی بات کی وجہ سے یہ وَجَبَ: کے معنی میں ہے۔ رِجْسٌ یہ رِجْزٌ: کے معنی میں ہے یعنی عذاب یا دلوں کا زنگ: أَسْمَاءٍ: اس سے مراد وہ صفات ہیں جو یہ لوگ اپنے معبودوں کے لئے مانا کرتے تھے اور ان کے بارے میں رسول سے جھگڑتے تھے جیسا کہ اس زمانے میں کہتے ہیں کہ فلاں مزار والا یا پیر فلاں مرض سے شفاء دیتا ہے کوئی فالج کوئی جوڑوں کا درد ٹھیک کرتا ہے یہ داتا گنج بخش ہے غوث اعظم ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان بزرگوں کے یہ نام بعد والے لوگوں نے رکھے ہیں قرآن اور سنت میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور یہ نام ان کی ماں باپ کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ شرکی

عقیدہ کے ساتھ یہ مشرکین کے بڑے چھوٹوں کی طرف سے ہوتا ہے: اٰبَآؤُكُمْ: شرکیہ نام ذکر کرنے میں آباء کی تقلید کا رد ہے: مَا نَزَّلَ: اشارہ ہے کہ شرک (اور ہر عقیدے) کے اثبات کے لئے دلیل نازل شدہ آیات اور احادیث چاہئیں غیر منزل دلائل (قیاس اور خوابوں اور حکایات وغیرہ) سے عقیدہ ثابت نہیں ہوتا اسی طرح سورۃ یوسف آیت 40 اور سورۃ نجم آیت 32 میں بھی ہے فرق یہ ہے کہ اس سورۃ میں ان کے معبودوں کی معبودیت کا رد ہے اور سورۃ یوسف میں ان کی عبادت کرنے کا اور سورۃ نجم میں ان ناموں کے رکھنے کا رد ہے اور لفظ نَزَّلَ اور اَنْزَلَ: کے ساتھ ذکر کیا اشارہ ہے کہ اس کلام الٰہی میں جو تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے یا ایک ساتھ نازل ہوا ہو دونوں طریقوں میں شرک کی دلیل نہیں ہے۔

تفسیر 72 اس میں نجات کا سبب صرف رحمت کو قرار دیا ہے اور رحمت اصل میں ایمان اور توحید کی توفیق ہے اور یہ رحمت خاص ہے اور اشارہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کی نجات ان کے عمل کی وجہ سے واجب نہیں تھی۔ دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا: میں استیصالی عذاب مراد ہے کہ ان کی ساری نسل تباہ کردی تھی: وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ یہ كَذَّبُوْا پر عطف ہے یعنی تکذیب اور عدم ایمان ان کے عذاب کے لئے سبب ہے عذاب کا تذکرہ سورۃ حم سجدہ آیت 16، سورۃ احقاف آیت 24، 25 اور سورۃ الحاقۃ آیت 6 میں ہے۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ
هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝73 وَ
اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ
الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝74 قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ
قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ
مُؤْمِنُوْنَ ۝75 قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝76 فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ
وَ قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝77 فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝78
فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝79

"اور ثمودیوں کی طرف ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو بھیجا اس نے کہا اے میری قوم عبادت اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی دوسرا مددگار نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح معجزہ آ چکا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اونٹنی ہے تمہارے لئے معجزہ ہے اس کو چھوڑ دو تاکہ اللہ کی زمین میں کھائے اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا ورنہ تمہیں دردناک عذاب پہنچے گا [73]۔ اور اس وقت کو یاد کرو جب تمہیں اللہ تعالیٰ نے عادیوں کے بعد زمین کے آباد کرنے والے بنایا اور تمہیں زمین میں جگہ دی تم اس کے میدانوں میں عمارتیں بناتے ہو اور پہاڑوں سے گھر تراشتے ہو پس اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرنے والے نہ بنو [74]۔ کہا ان کی قوم میں سے جنہوں نے تکبر کیا تھا (مال کی وجہ سے) ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے (نسب کی وجہ سے) جو ان میں سے ایمان لائے تھے ان سے پوچھا کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ صالح (علیہ السلام) اپنے رب کا رسول ہے انہوں نے کہا جس چیز کے ساتھ یہ بھیجے گئے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ [75]۔ جنہوں نے تکبر کیا تھا انہوں نے کہا جس پر تم ایمان لائے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں [76]۔ انہوں نے اونٹنی کو قتل کر ڈالا اور اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی اور انہوں نے صالح (علیہ السلام) سے کہا جس عذاب کا وعدہ تو نے ہم سے کیا وہ عذاب لے آ اگر تم رسولوں میں سے ہو [77]۔ ان کو ایک زلزلے نے پکڑا تو اپنے گھروں (علاقوں) میں

اوندھے منہ (مردے) پڑے رہ گئے[78]۔تو صالح علیہ السلام ان سے چلے گئے اور فرمایا اے میری قوم میں نے تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچایا اور تمہاری خیر خواہی کی لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے"[79]۔

تفسیر73 یہ توحید کے مسئلے پر تیسری دلیل ہے ثمود عاد کا بیٹا تھا اس کی نسل کو ثمود کا قبیلہ کہا جاتا ہے،صالح ثمود کی اولاد میں پانچویں پشت پر تھا یہ لوگ حجاز اور شام کے درمیان تبوک کے راستے میں آباد تھے اب اس جگہ کو مدائن صالح کہا جاتا ہے اور وہ ویران جگہ ہے اس آیت میں ہود علیہ السلام کی توحید کی دعوت کا ذکر ہے۔پھر اس کی قوم نے معجزے کا مطالبہ کیا ان کے مطالبے: بَيِّنَةٌ : معجزے کا ظہور ہوا رسالت کا اظہار اور توحید کا اثبات ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کو بَيِّنَةٌ کہا جاتا ہے: مِنْ رَّبِّكُمْ : میں اشارہ ہے کہ معجزہ نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا: هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ: یہ معجزے کا بیان ہے: نَاقَةُ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت مخلوق کی خالق کی طرف اضافت ہے اور اس کی تخصیص شرف کی وجہ سے ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بغیر کسی ظاہری اسباب کے پیدا ہوئی ہے اور اَرْضِ اللّٰهِ: میں بھی اضافت اسی طرح ہے: تَأْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ: مراد یہ ہے کہ تم پر اس کا رزق اور دیکھ بھال نہیں ہے البتہ اس کی بے حرمتی نہ کرنا یہ دلیل ہے کہ معجزے کی بے حرمتی کرنا عذاب کا سبب ہے۔

تفسیر74 اس آیت میں انعامات کے ساتھ مذکور ہیں عادیوں کے انعامات نفسی اور بدنی تھے جبکہ ثمودیوں کے انعامات آبادیوں اور صنعت کاری کی وجہ سے تھے: سُهُوْلِهَا : یعنی میدانی زمین میں بلاضرورت بڑے بڑے محلات بنایا کرتے تھے اور پہاڑوں میں پتھروں کی آبادیاں کرتے تھے قوم ثمود عمارات اور پتھروں کے تراشنے میں بہت ہنرمند قوم تھی اسی وجہ سے زیادہ سرمایہ دار تھے: مُفْسِدِيْنَ : بڑا فساد یہ تھا کہ نو آدمی تھے ان میں وہ لوگوں کو صالح علیہ السلام کے ساتھی بننے اور ان پر ایمان لانے سے روکا کرتے تھے جیسا کہ سورۃ نمل آیت 48 میں ہے۔

تفسیر75 اس قوم میں سرمایہ دار زیادہ تھے تو ان کا کفر اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو بڑا سمجھا تھا اسی وجہ سے: اِسْتَكْبَرُوْا کہا: اُسْتُضْعِفُوْا : ان کی کمزوری غربت یا نسب کی وجہ سے تھی حدیث ہرقل (جو امام بخاری رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے) کہ انبیاء علیہم السلام کے پیروکار لوگ قوم کے کمزور لوگ ہوتے ہیں۔صحیح بخاری کتاب بدء الوحی حدیث 7 لیکن باب استفعال کا لفظ اور مجہول کا صیغہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ لوگ حقیقت میں ضعیف نہیں تھے بلکہ مخالفین ان کو کمزور سمجھتے تھے: لِمَنْ اٰمَنَ : اشارہ ہے کہ سارے ضعفاء ایمان نہیں لائے تھے: اَتَعْلَمُوْنَ : ان کا یہ کہنا مؤمنوں پر دباؤ ڈالنے کے طور پر تھا لیکن انہوں نے ترقی کے ساتھ جواب دیا یعنی صرف صالح پر نہیں بلکہ توحید کے مسئلے پر بھی ہمارا

ایمان ہے تو مخالفت مزید ظاہر ہوئی۔

تفسیر 76 یہ بھی ان کے اِسْتِکْبَارْ اور ضد کا بیان ہے اور اشارہ ہے کہ ہم تمہاری وجہ سے ایمان نہیں لاتے اس لئے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان بہت فرق ہے۔

تفسیر 77 لفظ عَقَرَ: اصل میں پاؤں کے کاٹنے کو کہتے ہیں لیکن یہاں پر مراد نحر ہے ایک شخص نے اونٹنی کو نحر کیا جیسا کہ سورۃ قمر آیت 39 میں ہے اس کا نام قدار بن سالف ذکر ہوا ہے اور صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4942 صحیح مسلم فی صفة الجنة حدیث 2855 کی حدیث میں ہے: رَجُلٌ عَزِيزٌ عَارِمٌ خَبِيثٌ مُنِيعٌ فِي رَهْطِهِ مِثْلُ أَبِي زَمْعَةَ: یا مراد یہ ہے کہ پہلے اس کے پاؤں کاٹے پھر اس کو مار ڈالا اور باقی آٹھ افراد اس کے ساتھ تھے: عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ: امر آیت 35 میں مذکور تھا یہ دلیل ہے کہ یہ لوگ بہت مفسد تھے رسالت سے منکر تھے، قوم عاد نے رسول کو اَلصّٰدِقِیْنَ: کہا تھا صرف عذاب کے اخبار میں اس کی تکذیب کیا کرتے تھے۔

تفسیر 78 رَجْفَةُ: زمین کا زلزلہ ہے اور سورۃ ہود میں (صَيْحَةُ) ہے یعنی ان پر دونوں عذاب اکٹھے ہوگئے تھے یا رَجْفَةُ: سے مراد دل کی گھبراہٹ ہے صَيْحَةُ: کے سبب سے یا صَيْحَةُ: سے مراد سخت زلزلہ کے وقت ہیبت ناک آواز ہے زلزلے سے ان کے تمام مکانات گر گئے تھے: فَاَصْبَحُوْا: دلیل ہے کہ عذاب رات کے وقت آیا تھا۔ لفظ دَارِ: اس گاؤں کے معنی میں ہے جو بہت گھروں پر مشتمل ہو اسی وجہ سے مفرد ذکر ہوا: جٰثِمِیْنَ جثم: سے ہے یعنی زمین کے ساتھ چمٹ جانا یا گھٹنوں پر بیٹھنا دونوں معانی لسان العرب میں مذکور ہیں۔

تفسیر 79 یٰقَوْمِ: سوال: یہ مرے ہوئے لوگوں سے خطاب ہے تو معلوم ہوا کہ مردے سنتے ہیں۔ [illegible] یہ خطاب عذاب کے آنے سے پہلے ہے جیسا کہ سورۃ ہود کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے۔ آیت 66، 67۔ [illegible] یہ خطاب معجزے کے طور پر ہے جیسا کہ بدر کے واقعہ میں اس طرح ہوا تھا اور معجزہ نبی کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ صحیح بخاری غزوۃ بدر

جواب ۳: یہ افسوس ہے اور افسوس انکے انکار پر ہے نہ کہ عذاب پر تو یہ آیت: فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ: کے ساتھ متعارض نہیں ہے اس میں پہلا جواب بہتر ہے اس لئے کہ نبی کا مقصد الزام حجت ہے جیسا کہ ہمارے نبی نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا تھا۔ (صحیح بخاری کتاب الحج حدیث 1339) اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ: اور اسی طرح عادت الہیہ بھی ہے کہ عذاب کے آنے سے پہلے نبی اور ایمان والوں کو اس وطن سے نکال دیتا ہے یہاں: فَتَوَلّٰى: میں فا تعقیب

کے لئے نہیں ہے بلکہ کلام میں تقدیم اور تاخیر ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۚ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿٨١﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٨٣﴾

"اور لوط (علیہ السلام) نے جس وقت اپنی قوم سے کہا کیا تم بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو جس کا تم سے پہلے تمام لوگوں میں سے کسی نے بھی اس کام میں سبقت نہیں کی ہے [80]۔ بیشک تم عورتوں کو چھوڑ کے مردوں کے پاس شہوت سے آتے ہو بلکہ تم اسراف کرنے والی قوم ہو [81]۔ اس قوم کا کوئی اور جواب نہیں تھا مگر انہوں نے یہ کہا کہ ان کو اپنی بستیوں سے نکالو یہ ایسے لوگ ہیں کہ خود کو پاک سمجھتے ہیں [82]۔ ہم نے ان کو اور ان کے گھر والوں کو نجات دی سوائے اس کی بیوی کے وہ پیچھے رہنے والوں میں سے تھی [83]۔ ہم نے ان پر عجیب بارش برسائی دیکھو مجرموں کا انجام کیسے ہوا" [84]۔

تفسیر 80 یہ چوتھا واقعہ ہے اس کا تعلق سورۃ کے تیسرے دعوے سے ہے کہ لوط علیہ السلام نے قوم کو شیطان کی پیروی سے منع کیا تھا لیکن وہ باز نہیں آئے تو ان پر عذاب آیا اور یہ قوم شرک میں بھی مبتلا تھی۔ لوط علیہ السلام اس قوم کی نسل میں سے نہیں تھے بلکہ ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے لوط بن ہاران بن تارخ (آذر) اسی وجہ سے اَخُوْهُمْ نہیں فرمایا پھر مَا سَبَقَكُمْ: کے لفظ سے معلوم ہوا کہ اس قبیح گناہ کو اس قوم نے ایجاد کیا یہ دوسروں کی پیروی کی بہ نسبت بڑا گناہ تھا اسی طرح ایک بدعت کرتا ہے اور ایک بدعت کو ایجاد کرتا ہے۔ تو یہ دوسرا پہلے سے بڑا گناہ گار ہے لِقَوْمِهٖ: یہ اس اعتبار سے اس کی قوم تھی کہ ان کے قیام (نظام دینی) کے لیے ان کو بھیجا گیا تھا یا اس وجہ سے کہ لوط علیہ السلام کا سسرال تھا اَلْفَاحِشَةَ: وہ گناہ جو ظاہر ہوتا ہے اور شرع کے ساتھ ساتھ عقل اور عرف میں بھی برا سمجھا جاتا ہے امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قرآن میں زنا کو فَاحِشَةً: کہا ہے اور قوم لوط کے اس عمل کو بھی فاحشہ کہا ہے معلوم ہوا کہ اس عمل پر بھی زنا کی سزا جاری ہوگی۔

تفسیر 81 یہ اس فَاحِشَةً: کا بیان ہے مُسْرِفُوْنَ: سے مراد مشرکون ہے اور اس طرح اس کی تفسیر سورۃ عنکبوت 29 میں آئی ہے۔

تفسیر 82 اس قوم کا ایک جواب یہ ہے اور اسی طرح سورۃ نمل آیت 56 میں ہے اور ان کا دوسرا جواب سورۃ عنکبوت آیت

29 میں ہے اور دونوں میں حصر کا طریقہ ہے تو فرق یہ ہے کہ یہ جواب لوط علیہ السلام کے بارے میں تھا اور سورۃ عنکبوت کا جواب اپنے بارے میں ہے: اَخْرِجُوْهُمْ لَنُخْرِجَنَّ: نہیں کہا اشارہ ہے کہ یہ قوم اس خسیس عمل کی وجہ سے بے غیرت بن گئی تھی تو ایک دوسروں سے کہتے ہیں کہ ان کو نکال دو: اِنَّهُمْ اُنَاسٌ: ان کا یہ کہنا بطور مزاق تھا قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا :عَابُوْهُمْ وَاللّٰهِ بِغَيْرِ عَيْبٍ: (اللہ کی قسم یہ لوگ بغیر کسی عیب کے ان کی عیب جوئی کر رہے تھے)۔

تفسیر 83 لوط علیہ السلام کی بیوی مشرکہ تھی اسی وجہ سے عذاب میں رہ گئی یہ سورۃ تحریم آیت 15 میں مذکور ہے۔وَاَهْلَهٗ ؛سورۃ ذاریات آیت 36 سے معلوم ہوا کہ اس کے گھر کے علاوہ کوئی اور ایمان نہیں لایا تھا تاریخ میں ہے کہ اس کی صرف دو بیٹیاں تھیں: اَلْغٰبِرِيْنَ غَبَرَ: اضداد میں سے ہے گزرے ہوئے اور جو باقی رہ گیا ہو دونوں کو کہا جاتا ہے یہاں پر دوسرا معنیٰ مراد ہے۔مذکر کے صیغے میں یہ اشارہ ہے کہ اس عورت کا عذاب بھی اس قوم کے مردوں کی طرح تھا اگرچہ عذاب کا سبب الگ تھا۔

تفسیر 84 اس آیت میں ایک قسم کا عذاب ذکر ہوا یعنی پتھروں کی بارش اس کی دلیل مَطَرًا: نکرہ ہونا ہے اور سورۃ ھود آیت 82 اور حجر آیت 74 میں دیگر عذابوں کا تذکرہ بھی ہے یہاں اس ایک عذاب کا ذکر خاص ہوا اشارہ ہے کہ ان کی ہلاکت کا اصل عذاب بھی ایک ہی تھا اور اس کے ساتھ باقی عذاب کا پیش خیمہ تھے اور اس طرح کا عمل کرنیوالوں کی دنیا میں بھی یہ سزا ہے۔

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِم مَّطَرًا ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ﴿٨٤﴾ وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ
اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا
النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٨٥﴾ وَلَا
تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ
قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨٦﴾ وَإِن كَانَ طَائِفَةٌ مِّنكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ
بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿٨٧﴾

"اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو بھیجا اس نے فرمایا اے میری قوم اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کرو اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح معجزہ آچکا ہے لہٰذا ناپ تول پورا دو اور لوگوں سے مال کم نہ کرو اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت کرو یہ (کام) تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو [85] اور ہر راستے میں نہ بیٹھو کہ جو اللہ پر ایمان لائے اس کو تم راستے دھمکاتے ہو اور اللہ کے دین سے روکتے ہو اور اس میں کجی تلاش کرتے ہو اور اس وقت کو یاد کرو جب تم کم تھے تو تمہیں نسل میں بڑھایا اور دیکھو کہ فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا [86]۔ اگر تم ایسے گروہ ہو جو اس پر ایمان لائے جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور دوسرے گروہ ایمان نہ لائے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کردے اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے [87]۔

تفسیر 85 یہ پانچواں واقعہ ہے سورۃ کے دوسرے اور تیسرے دعوے سے متعلق ہے یعنی توحید کے مسئلے پر دلیل ہے اور حرام آمدنی میں قوم کو شیطان کی پیروی سے روکنا ہے۔ مدین ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا تھا اور اس کے نام سے یہ شہر مشہور ہوا تھا اور شعیب علیہ السلام مدین کی اولاد میں دوسری پشت میں تھے ان کو خطیب الانبیاء کہا جاتا ہے اس قصے میں پہلے توحید کی طرف دعوت ہے پھر رسالت کا اثبات اور معجزہ کا ذکر جو قرآن وسنت میں متعین نہیں ہے پھر مالی احکام کی اصلاح کے لئے دعوت ہے پھر عام افساد سے منع ہے بَيِّنَةٌ: اس سے مراد معجزہ ہے لیکن قرآن اور سنت میں اس کا کوئی تعین نہیں ہے۔
اَلْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ: سورۃ ہود میں آیت 85 الْمِكْيَالَ: لفظ ہے اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ اَلْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ: سے مصدری معنی مراد ہے اور اس سورۃ میں وزن اور کیل کا آلہ مراد ہے وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ: اس لفظ سے چوری غصب

ڈاکہ مارنے حرام مال کے لئے حیلے کرنا سب مراد ہیں تَبْغُوْنَ اِصْلَاحِهَا: اصلاح انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور احکام شریعت کے بھیجنے سے تھی اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: یعنی خیر (ثواب) اس وقت ہوگا جب تم ایمان لے آؤ یا خیر سے مراد انسانیت کا وصف ہے اور ایمان سے مراد لغوی معنی ہے یا یہ خطاب اس وجہ سے تھا کہ یہ لوگ ایمان کا دعویٰ کرتے تھے۔

تفسیر 86 ضلال کے بعد اضلال سے بھی منع کیا گیا ہے وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ: سے مراد وہ راستے ہے جو شعیب علیہ السلام کے گھر تک پہنچانے والا تھا اور قُعُوْد: سے مراد حقیقی بیٹھنا مراد ہے یا صِرَاطٍ: سے مراد دین کے راستے یعنی دینی امور ہیں جن کو بعد میں سبیل اللہ کہا ہے تُوْعِدُوْنَ: منع کرنا دو طریقوں سے تھا ایک دباؤ ڈالنا اور ڈرانا دھمکانا تھا دوسرا حق والوں پر طعن وتشنیع اور شبہات پیدا کرنا تھا وَتَبْغُوْنَهَا: یہ دوسرے معنی کی تفسیر ہے عِوَجًا: معنوی چیزوں میں عین کے کسرہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور جسمانی اعتبار سے یعنی کجی عین کے فتحہ سے ہے وَاذْكُرُوْا: میں ترغیب ہے وَانْظُرُوْا: میں وعید ہے قَلِيْلًا: مال یا تعداد یا اشخاص کے اعتبار سے ہے اور تبلیغ میں یہ اوامر و نواہی اور ترغیب اور تخویف ذکر کرنا یہ خطابت کی صفت ہے اس وجہ سے ان کو خطیب کہا جاتا تھا اَلْمُفْسِدِيْنَ: یہ لفظ ان کے شرک و حرام خوری اور حق سے روکنے کو شامل ہے۔

تفسیر 87 یہ بھی شعیب علیہ السلام کے قول میں داخل ہے اور اس کو دعوت کا: فَحَتّٰى يَحْكُمَ: کہا جاتا ہے اور نرم لہجہ میں تخویف ہے فَاصْبِرُوْا: انتظار کے معنی میں ہے صبر اور مضبوط ہونے کے معنی میں نہیں ہے اس لیے کہ نبی غلط دین پر پختگی کا حکم نہیں دیتا خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ: لفظ میں دلیل ہے کہ انسان کو بھی حاکم کہنا جائز ہے اور اللہ کے حکم میں خیر یہ ہے کہ وہ مضبوط اور عدل کامل پر مبنی ہوتا ہے اور کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ اَوْ
لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۫ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ
نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ
عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ۝۸۹

"اس کی قوم میں سے ان وڈیروں نے کہا جنھوں نے تکبر کیا ہم تجھے ضرور نکال دیں گے اے شعیب علیہ السلام اور ان لوگوں کو بھی جو ایمان لائے تیرے ساتھ اپنی بستی میں سے یا تم یقیناً لوٹ آؤ گے ہمارے دین میں، شعیب علیہ السلام نے فرمایا کیا اگر چہ ہم کراہیت کرنے والے ہو[88]۔ یقیناً ہم نے تو پھر اللہ پر جھوٹ باندھا اگر ہم لوٹ آئے گے تمہارے دین میں اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے نجات دی اور ہمارے لیے لائق نہیں کہ ہم لوٹ آئے اس میں مگر یہ کہ اللہ چاہے گھیر لیا ہے ہمارے رب نے ہر چیز کو اپنے علم سے اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا ہے اے ہمارے رب تو ہی فیصلہ کر ہمارے اور ہمارے قوم کے درمیان حق کی ساتھ اور تو ہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے"[89]۔

تفسیر 88 اس آیت میں ان کی تکذیب کا طریقہ مذکور ہے: اَوْلَتَعُوْدُنَّ: سوال یہ ہے کہ عود کا معنیٰ ہے سابقہ حالت کی طرف پلٹ آنا حالانکہ شعیب علیہ السلام تو پہلے ان کی ملت میں نہیں تھے تو پھر واپس لوٹنے کا کیا مطلب؟ [illegible] چونکہ شعیب علیہ السلام نبوت سے قبل خاموش تھے تو ان کا خیال تھا کہ یہ ہمارے دین میں تھے۔ [illegible] یہ دوسرے مومنوں کے اعتبار سے کہا گیا ہے جو ایمان سے قبل ان کے دین میں شامل تھے۔ [illegible] عُوْدٌ: ابتداءً داخل ہونے کے معنیٰ میں ہے جیسا کہ حدیث میں یہ لفظ اس معنیٰ کے لیے استعمال ہوا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: يُعَادُ رُوْحُهٗ فِيْ جَسَدِهٖ (سنن ابو داؤد کتاب السنہ حدیث 4753، ابن ماجہ فی الجنائز حدیث 1549)(اس کی روح اس کے جسم میں ڈال دی جاتی ہے) وَاسْتَكْبَرُوْا: چونکہ یہ لوگ بھی ثمود کی طرح سرمایہ دار تھے چنانچہ ثمود کی طرح ان کے لیے بھی استکبار کی صفت بیان کی: قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ: یہ شعیب علیہ السلام کی طرف سے نرم لہجے میں مضبوط جواب ہے کہ ہم تو تمھارے دین کو ناپسند کرتے ہیں۔

تفسیر 89 یہ آیت بھی قَالَ: کے تحت میں داخل ہے یہ شعیب علیہ السلام کا قول ہے یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مرتد ہونا بہت بڑا گناہ اور اللہ تعالیٰ پر افترا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کفر کی طرف پلٹ جانے کو ناپسند کرنا ایمان کی تکمیل ہے جیسا کہ حدیث ذَاقَ طَعْمَ الْإِيْمَانِ: (صحیح بخاری کتاب الایمان ،و ترمذی حدیث 2623 حدیث 56) میں مذکور ہے: إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ: یہ استثناء منقطع ہے یا متصل مفرغ بھی ہوسکتی ہے۔ اس کی مقصد تفویض الی اللہ ہے تعلیق مراد نہیں ہے۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ کفر بھی اللہ کی مشیت میں داخل ہے: وَسِعَ رَبُّنَا یہ دو جملے اللہ کی صفات سے وسیلے کے طور پر ہیں۔ اور ان کے بعد رَبَّنَا افْتَحْ: دعا ہے۔ یہ بددعا ہے مگر خیر کی دعا کے لہجے میں ہے یہ بھی شعیب علیہ السلام کی خطابت ہے۔

وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۞ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۞ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۞ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۞

"اور ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو یقیناً بڑا نقصان اٹھاؤ گے [90]۔ پس ان کو زلزلہ نے آگھیرا وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے [91]۔ جنہوں نے شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا تھا ان کی یہ حالت تھی جیسے کہ وہ گھروں میں بسے ہی نہیں۔ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا وہی خسارے میں پڑ گئے [92]۔ اس وقت شعیب علیہ السلام ان سے چہرہ پھیر کر یہ فرماتے ہوئے گئے کہ اے میری قوم میں نے تمہیں اپنے رب کے احکام پہنچا دیئے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی میں ایسی قوم پر کس طرح افسوس کروں" [93]۔

تفسیر 90 جب ان کے دباؤ کا کچھ فائدہ نہ ہوا تو دوسرا طریقہ اختیار کیا جو کہ ایمان والوں کو ایمان سے روکنا تھا نبی کی اتباع کو خسران کہا جبکہ یہ باطل پرستوں کا خیال ہے۔

تفسیر 91 ان کا بھی دوسرا عذاب صیحہ ہے جو سورۃ ہود آیت 94 میں مذکور ہے یہ آیت 76 کی طرح ہے۔

تفسیر 92 یہ کفار کے مقابلے میں ہے وہ کہا کرتے تھے کہ شعیب علیہ السلام کی پیروی خسران کا سبب ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شعیب علیہ السلام کی تکذیب خسران کا سبب ہے: اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا: مبتداء ہے اور خبر محذوف ہے یعنی فَنُوْا (فنا

ہو گئے) يَغْنَوْا : یہ غنی سے ماخوذ ہے ایک جگہ میں عیش وعشرت کے ساتھ رہائش اختیار کرنا: كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ یہ حصر
:اِتَّبَعْتُمْ : کی نسبت سے ہے یعنی حصر اضافی ہے۔

تفسیر 93 یہ دلیل ہے کہ جب کافروں اور ظالموں پر عذاب آجائے تو ان پر غم اور افسوس نہیں کرنا چاہیے اس طرح آیت 29 میں گزر چکا ہے فرق یہ ہے کہ وہاں پر: رِسَالَةَ :مفرد تھا اور یہاں جمع ہے وجہ یہ ہے کہ شعیب علیہ السلام نے اپنی دعوت میں بہت پیغامات جمع کیے ہیں: اٰسٰی : غمخواری اور ہمدردی کو کہا جاتا ہے: عَلٰى قَوْمٍ: سے عَلٰى عَذَابِهِمْ :مراد ہے تو اگر ان کے کفر پر دکھ کا اظہار کرتا ہے پھر تو جائز ہے جیسا کہ دیگر نصوص سے معلوم ہوتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿٩٤﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ
الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩٥﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ
الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٩٦﴾

"اور ہم نے کسی بستی (یا شہر) میں کوئی بھی رسول نہیں بھیجا (کہ انہوں نے انکار کیا) مگر ہم نے اس کے رہنے والوں کو مال اور بیماریوں کی سختی کیساتھ پکڑ لیا تاکہ یہ لوگ (اللہ تعالی کی طرف) عاجزی اختیار کریں [94]۔ پھر ہم نے سختی خوشی میں تبدیل کی یہاں تک کہ یہ لوگ زیادہ ہو گئے اور انہوں نے کہا یقیناً ہمارے بڑوں کو تکلیفیں اور خوشیاں پہنچی ہیں تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا جبکہ وہ شعور نہیں رکھتے تھے [95]۔ اور اگر یہ بستی والے ایمان لاتے اور اپنے آپ کو بچاتے (شرک سے) تو ضرور ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات کھول دیتے لیکن انہوں نے (پیغمبروں) کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو (عذاب سے) پکڑ لیا ان اعمال کی وجہ سے جو یہ لوگ کرتے تھے" [96]۔

تفسیر 94 یہ تین آیتیں پہلے واقعات کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں کہ ان قوموں پر مصیبتوں کا پھر نعمتوں کا امتحان آیا تھا اشارہ ہے کہ اللہ تعالی نے ان قوموں کے لیے کوئی عذر باقی نہیں چھوڑا ہر طریقے سے ان کے لئے ہدایت کے اسباب بنائے اور ان کو: اِبْتِلَاءٌ بِالنِّعَمِ وَالنِّقَمِ : کہا جاتا ہے جیسا کہ سورۃ انعام آیت 42 میں ہے: اِلَّآ اَخَذْنَا : اس سے پہلے لفظ: كَذَّبُوْا : پوشیدہ تھا اس پر دلیل گزرے ہوئے واقعات ہیں: بِالْبَاْسَآءِ : سختی میں انسان اکثر اللہ تعالی کی طرف رجوع کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے اس کو مقدم اس وجہ سے کیا ہے۔

تفسیر 95 اس آیت میں ابتلاء: بِالنِّعَمِ : ذکر کر رہا ہے: اَلْحَسَنَةَ : سے مراد مال کی وسعت اور جسمانی صحت ہے: عَفَوْا

:زیادہ ہوگئے :عَفَواْ :زیادہ ہونے کو کہتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ :وَاعْفُوا اللُّحٰی :داڑھیوں کو بڑھاؤ:وَقَالُوْا قَدْ مَسَّ :یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ زمانے کی رفتار اور انقلاب ہے کبھی تکلیف کبھی خوشی ہوتی ہے یہ گناہوں کی وجہ سے نہیں ہے یہ دلوں کی بہت بڑی سختی ہے کہ کسی بھی حال میں اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتے اور یہ عذاب کا سبب ہے :بَغْتَةً :جس کی تاریخ دن ،اور وقت معلوم نہ ہو اور لوگ اس سے غافل بھی ہوں اس کو :بَغْتَةً :کہا جاتا ہے اگر چہ علامات آئی ہوں لیکن اس سے عبرت نہیں لیتے۔

تفسیر 96 یہ بھی پہلے واقعات کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں مطلب یہ ہے کہ ایمان لانا اور شرک سے اپنے آپ کو بچانا برکات کے نزول کا سبب ہے لیکن ان قوموں نے شرک کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی تو ان پر عذاب کا نزول ہوا اور اس میں مقصد بعد والی قوموں کو نصیحت ہے کہ دنیاوی ترقی کے لیے ایمان اور تقویٰ حاصل کرو تقویٰ سے مراد ہر قسم کے کفر،شرک اور ہر قسم کے گناہوں سے بچنا ہے جیسا کہ سورۃ طلاق میں مذکور ہے۔لفظ :بَرَكَاتٍ: سے مراد بارشیں، پودے،غلہ پھل اور رزق کی وسعت ہے اس طرح سورۃ ہود آیت 3،52 اور سورۃ نوح آیت 11 اور 13 میں مذکور ہے :فَأَخَذْنٰهُمْ اس سے مراد وہ مختلف عذاب ہیں جو گزشتہ قوموں پر آئے تھے۔

أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ ﴿٩٧﴾ أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضُحًى وَ
هُمْ يَلْعَبُونَ ﴿٩٨﴾ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ ۚ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٩٩﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ
الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿١٠٠﴾ تِلْكَ الْقُرَىٰ
نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَائِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ
يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿١٠١﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۖ وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ﴿١٠٢﴾ ثُمَّ
بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿١٠٣﴾

"کیا یہ بستی والے امن میں ہیں اس سے کہ ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت آئے اور یہ لوگ سوئے ہوں [97]۔ اور کیا یہ بستی والے اس سے امن میں ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب چاشت کے وقت آئے اور یہ لوگ کھیل میں مصروف ہوں [98]۔ کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہو چکے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے صرف نقصان والی قوم بے خوف رہ سکتی ہے [99]۔ کیا ان لوگوں پر واضح نہیں ہوا ہے جو اس کے رہنے والوں کے بعد زمین کے وارث بن گئے ہیں اگر ہم چاہتے تو ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب پہنچاتے اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگاتے ہیں یہ سنتے نہیں ہیں [100]۔ یہ بستی ہے جس کی بعض خبریں ہم آپ سے بیان کرتے ہیں اور یقیناً ان کے پاس ان کے رسول واضح احکام (دلائل) لیکر آئے تھے تو وہ لوگ ایمان لانے والے نہیں تھے کیونکہ انہوں نے پہلے سے انکار کیا تھا تو اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر مہر لگاتا ہے [101]۔ اور ہم نے بہت سارے لوگوں کو وعدہ پورا کرنے والا نہیں پایا اور یقیناً ہم نے بہت سارے لوگوں کو نافرمان پایا ہے [102]۔ پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا اپنے معجزات کے ساتھ۔ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی طرف تو انہوں نے ان کیساتھ ظلم (انکار) کیا پس دیکھو کہ فساد کرنے والوں کا انجام کیسے ہوا" [103]۔

تفسیر 97 ان چار آیتوں میں موجودہ لوگوں کا حال ذکر ہو رہا ہے جو شرک میں مبتلا ہیں کہ یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے چاہے عذاب رات کے وقت آئے یا دن کے وقت اس آیت میں رات کا عذاب ذکر کیا ہے۔ اَفَاَمِنَ: فا تعقیب کے لئے ہے اور اَلْقُرٰی: سے مراد موجودہ لوگ ہیں یعنی تکذیب کے بعد عذاب کا آنا ضروری ہے۔

تفسیر 98 اس آیت میں چاشت کا عذاب (دن کے وقت) مذکور ہے اور اشارہ ہے کہ منکرین یا نیند میں سوئے ہوتے ہیں یا کھیل میں مصروف ہوتے ہیں یہ ان کی دنیا کی زندگی ہے جو نیند اور کھیل میں گزر جاتی ہے معلوم ہوا کہ ساری رات سونا اور صبح کے وقت کھیلنا ایمان والوں کی شان کے مناسب نہیں ہے۔

تفسیر 99 خاص اوقات کے بعد اب عام اوقات کی طرف اشارہ ہے مگر بطور استدراج اور مہلت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اس آیت میں اس سے مراد دنیا میں بے خوف ہونا ہے یعنی ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کچھ بھی خوف نہیں ہے اور سورۃ انعام آیت 82 سے میں امن سے مراد توحید کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنا ہے تو پھر تعارض نہیں آتا۔

تفسیر 100 اس آیت میں وعید ہے اور عذاب دنیاوی سے خوف دلاتا ہے اور اس میں عذاب آنے کے ساتھ پہلی آیتوں کی تاکید ہے یَهْدِ لِلَّذِیْنَ: یہاں پر ہدایت سے مراد ہدایت عقلی ہے یعنی عقل کا ظاہر ہونا بِذُنُوْبِهِمْ: میں اشارہ ہے کہ موجودہ لوگوں میں وہ تمام گناہ جمع ہوتے ہیں جو پہلی قوموں میں ایک ایک یا دو دو موجود تھے اور ان کی غفلت کا سبب دلوں پر مہر لگانا اور حق کانوں سے نہ سننا دل پر مہر کا سبب ہے اس وجہ سے فَهُمْ: میں فاء ذکر کی ہے۔

تفسیر 101 اس میں موجودہ لوگوں کی تذکیر کے لئے پہلی قوموں کا ذکر ہے اس لئے کہ موجودہ لوگوں کا حال پہلے لوگوں کے حال کے ساتھ مشابہ ہے ان کے پاس انبیاء علیہم السلام آئے تھے اور ان کے پاس بھی انبیا آئے ہیں لیکن ان میں مخالفت کے تین درجے تھے جو ان موجودہ لوگوں میں بھی ہیں پہلا تکذیب، دوسرا ایمان سے محروم ہونا، تیسرا مہر لگانا۔

تفسیر 102 یہ پہلے اور بعد کے تمام کافروں کے ساتھ متعلق ہے اور عذاب کی علت کے لئے مشترکہ ہے: عَهْدٍ سے مراد توحید کا وعدہ پورا کرنا ہے جو عالم ارواح میں ان سے لیا گیا تھا اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے یاد دہانی کروائی گئی لفظ اِنْ مُثَقَّل سے مُخَفَّف ہے۔

تفسیر 103 یہاں سے 168 تک دوسرا باب ہے اس میں موسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی واقعہ ہے جو چھ مقامات میں تقسیم ہے اور اس کا تعلق سورۃ کے پہلے دعوے کے ساتھ ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے دین کی خاطر بہت مصیبتیں برداشت کیں مگر اس کے دل میں تنگی نہیں آئی موسیٰ علیہ السلام کا قصہ چار سورتوں میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے یہ سورۃ، سورۃ طٰہٰ اور سورۃ شعراء اور سورۃ قصص ہر سورۃ میں ابتداء اور اختتام الگ الگ طریقوں سے ہے اور حکمتیں بھی اس میں بہت ہیں لیکن

بڑی حکمت اس میں حق کے بیان میں (دلیری) ہے۔ اس پہلی آیت میں واقعے کا خلاصہ ہے، موسیٰ علیہ السلام کی بعثت فرعونیوں کی تکذیب اور پھران کی ہلاکت ہے مِنۢ بَعْدِهِمْ: یہ دلیل ہے کہ شعیب علیہ السلام کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا: فَظَلَمُوا بِهَا: اس سے مراد عنادی انکار ہے جیسا کہ سورۃ نمل آیت 14 میں ہے۔

وَقَالَ مُوسَىٰ يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠٤﴾ حَقِيقٌ عَلَىٰ أَن لَّا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿١٠٥﴾ قَالَ إِن كُنتَ جِئْتَ بِآيَةٍ فَأْتِ بِهَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿١٠٦﴾ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿١٠٧﴾ وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٠٨﴾

"اور موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے فرعون یقیناً میں رب العالمین کی طرف سے بھیجا گیا رسول ہوں [104]۔ اس بات پر مضبوط ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ پر حق کے سوا اور کچھ نہیں کہوں گا یقیناً میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح بیان لیکر آیا ہوں تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو [105]۔ فرعون نے کہا اگر کوئی معجزہ لیکر آئے ہو تو وہ لے آؤ اگر اپنے دعوے میں سچے ہو [106]۔ تو اس نے اپنی لاٹھی پھینکی اس سے ظاہر اژدھا بن گیا [107]۔ اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان سے نکالا تو دیکھنے والوں کو سفید نظر آیا" [108]۔

تفسیر 104 یہاں سے 126 تک پہلا مقام ہے اس میں فرعون کو دعوت دینا اور اس کو معجزے پیش کرنا پھر جادوگروں کے ساتھ مقابلہ کرنا اور ایمان لانے کے بعد ساحروں کی بہادری یعنی موسیٰ علیہ السلام کی بہادری اور ایمان لانے کے بعد ساحرین کی بہادری۔ اس میں دو دعوے ہیں ایک موسیٰ علیہ السلام کی رسالت دوسرا توحید ربوبیت فرعون سے نرم لہجے میں خطاب ہے اس لیے کہ یہ اس کا لقب تھا نام کے ساتھ خطاب نہیں کیا یہ بھی دعوت کے طریقوں میں سے ہے۔

تفسیر 105 پہلے جملے میں توحید کا اثبات ہے دوسرے جملے میں معجزے کے ساتھ توحید اور رسالت کی تاکید ہے تیسرے جملے میں موحدین کو آزاد کرنا: حَقِيقٌ: حق میں مبالغہ ہے ثابت کے معنی میں ہے اور مبتداء حذف ہے أَنَا ثَابِتٌ مُسْتَمِرٌّ یا حَقِيقٌ حَرِيصٌ: کے معنی میں ہے۔

تفسیر 106 اشارہ ہے کہ فرعون بھی مطلق معجزات کا قائل تھا لیکن ضدی تھا۔ وہ بھی مانتا تھا کہ معجزہ صدق رسول کی دلیل

ہے

تفسیر 107 یہ پہلا معجزہ ہے جو مخالفین کے لیے تخویف اور غلبہ کے ساتھ ساتھ انقلاب پر دلالت کرتا ہے: مُّبِيْنٌ یعنی اس کی حقیقت تبدیل ہوگئی تھی نظر بندی نہیں تھی۔ یہاں پر امام شربینی رحمہ اللہ نے اس سانپ کی مقدار اور ہیبت ذکر کی ہے یہاں تک کہ فرعون پر ڈر کی وجہ سے دست لگ گئے تھے چار سو مرتبہ قضاء حاجت کیلئے گیا تھا۔ سوال یہاں اور سورۃ شعراء میں ثعبان (اژدھا) فرمایا ہے اور سورۃ نمل آیت 10 اور قصص آیت 31 میں جان (باریک سانپ) کہا ہے اس میں کیا تطبیق ہے؟۔ (جواب ۱) شکل میں حقیقی ثعبان کی طرح تھا لیکن رفتار میں تیز باریک سانپ کی طرح تھا اسی وجہ سے: كَاَنَّهَا: کہا۔ (جواب ۲) وحی کی ابتداء میں جان تھا اور فرعون کے سامنے ثعبان تھا اس لیے تاکہ اس پر رعب پڑ جائے۔

تفسیر 108 یہ دوسرا معجزہ ہے جو روشنی اور بشارت کے ساتھ انقلاب پر دلالت کرتا ہے نَزَعَ سے پہلے: اُدْخُلْ يَدَكَ پوشیدہ ہے جیسا کہ سورۃ نمل آیت 13 اور سورۃ قصص آیت 32 میں ہے: لِلنّٰظِرِيْنَ: لفظ دلیل ہے کہ اس کی سفیدی عجیب وغریب تھی جس نے لوگوں کو تعجب میں ڈالا تھا۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

"فرعون کی قوم میں سرداروں نے کہا یہ تو ماہر جادوگر ہے [109]۔ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمھاری زمین سے نکال دے تو تم مجھے کیا حکم دیتے ہو؟ [110]۔ انہوں نے کہا مہلت دو اس کو اور اس کے بھائی کو اور شہروں میں بھیج دو لوگوں کو جمع کرنے والے [111]۔ کہ وہ تمھارے پاس ہر قسم کے ماہر جادوگر لے آئیں [112]۔ اور جادوگر فرعون کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کیا ہمارے لئے کوئی اُجرت ہوگی اگر ہم غالب آجائیں؟ [113]۔ کہا (فرعون نے) جی ہاں اور یقیناً تم اس وقت مقرب ہوجاؤ گے [114]۔ انہوں نے کہا اے (موسیٰ علیہ السلام) آپ ڈالیں یا ہم ڈالنے والوں میں سے ہوجائینگے" [115]۔

تفسیر 109 پہلے فرعون نے سرداروں سے کہا کہ یہ ساحر ہے جیسا کہ سورۃ شعراء آیت 34 میں ہے پھر ان بڑوں نے اس

کی تقلید میں عام لوگوں سے اس طرح کہا اس لیے کہ اس زمانے میں سحر زیادہ موجود تھا اور ایسا سحر تھا کہ اس کی وجہ سے نظر پر اثر ہوا کرتا تھا اسی وجہ سے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام پر بھی یہی عیب لگا دیا۔

تفسیر 110 یہ الزام لگایا کہ یہ تمھارے اس وطن پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور موسیٰ کو ساحر کہنا عام لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے تھا۔ یہ قول اقتدار والوں کو غصہ دلانے کے لیے ہے۔

تفسیر 111 اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے عام لوگوں کا مشورہ دینا ہے۔

تفسیر 112 اس وقت شہر میں سحر کا بہت چرچا تھا اور سحر کے مدرسے تھے اور اس کے اساتذہ اور ماہرین تھے اور عادت الٰہی یہ ہے کہ ہر نبی کو وحی کا وہ معجزہ دیتا ہے جو اس زمانے کے ساتھ مناسب اور غلبے کا سبب ہو۔

تفسیر 113 باطل پرست لوگ ہر عمل دنیا کے مقصد کے لیے کرتے ہیں اس لئے یہ لوگ اجرت کا ذکر پہلے کرتے ہیں۔ قَالُوْا : میں فاء کو داخل نہیں کیا اشارہ ہے کہ یہ قول استیناف ہے سوال کے جواب میں تاکید کے لیے ہے۔ اِنْ کُنَّا نَحْنُ : یہ ان کے انصاف کی دلیل ہے کہ وہ لوگ بغیر غلبے کے ویسے اجرت نہیں مانگتے۔

تفسیر 114 اس نے زیادہ رغبت دے دی اس لیے کہ بادشاہ کے قریب ہونا بہت بڑا مرتبہ ہے۔ امام شربینی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ فرعون کا ان سے مدد طلب کرنا واضح دلیل ہے کہ وہ عاجز اور بے بس بندہ تھا اور اسی طرح جادوگروں کا اجرت کا مطالبہ کرنا یہ دلیل تھی کہ وہ لوگوں کے دلوں پر قادر نہیں تھے ورنہ اپنے لیے سونا اور چاندی بناتے اجرت مانگنے پر مجبور نہ ہوتے جو دلوں پر قابو رکھنے اور قبضہ کا دعویٰ کرتے ہیں وہ جھوٹے ہیں۔

تفسیر 115 یہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے ساحرین کا ادب ہے اور اسی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان نصیب فرمایا۔ یہ امام شربینی رحمہ اللہ کا قول ہے۔

قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ۝116 وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَلْقِ
عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۚ ۝117 فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۚ ۝118 فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا
صٰغِرِيْنَ ۚ ۝119 وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۚ ۝120 قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ ۝121 رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ۝122 قَالَ فِرْعَوْنُ
اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝123

"موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم ہی پھینکو جب انہوں نے پھینکیں (رسی اور لاٹھیاں) تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا اور ان کو ڈرایا وہ بہت بڑا جادو لیکر آئے [116]۔ اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ اپنی لاٹھی پھینکو تو اچانک اس نے نگل لیا جو کچھ انہوں نے جھوٹ بنایا تھا [117]۔ حق ظاہر ہو گیا اور ان کے وہ اعمال باطل ہو گئے جو وہ کیا کرتے تھے۔ [118]۔ تو یہ لوگ اسی وقت مغلوب ہو گئے اور یہ (فرعونی) لوگ ذلیل ہو گئے [119]۔ اور جادوگر لوگ سجدے میں گر گئے [120] انہوں نے کہا ہم رب العالمین پر ایمان لائے [121]۔ جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے [122] فرعون نے کہا تم موسیٰ پر میری اجازت سے پہلے ایمان لائے ہو یہ تو ایک چال ہے جو تم لوگوں نے اس شہر میں چلائی ہے تا کہ اس کے ذریعے اس کے رہنے والوں کو نکال دو عنقریب تم جان لو گے" [123]۔

تفسیر 116 یہ دلیل ہے کہ سحر کا اثر حق ہے اور کسی کے کمال کے منافی نہیں ہے اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام پر بھی اثر ہوا جیسا کہ سورۃ طٰہٰ آیت 66 میں ہے اور یہ سحر نظر بندی کا تھا اس کے ساتھ صرف موسیٰ علیہ السلام کی خیالی قوت پر اثر ہوا تھا سحر انبیاء علیہم السلام کی قوت عاقلہ پر اثر نہیں کر سکتا۔ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ: سین مبالغہ کے لیے ہے: عَظِيْمٌ: اشارہ ہے کہ لاٹھیاں اور رسیاں اور جادوگر بہت زیادہ تھے یہ ان کی عظمت ہے یا ان کے خیال میں عظمت مراد ہے۔

تفسیر 117 موسیٰ علیہ السلام وحی کا انتظار کیا کرتے تھے اس وجہ سے فرمایا: وَاَوْحَيْنَا: اشارہ ہے کہ معجزہ نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ جس وقت چاہے ظاہر کر سکتا ہو بلکہ ہر وقت وحی کا محتاج ہوتا ہے: تَلْقَفُ: کا ظاہر معنیٰ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کے اس سانپ نے ان کی تمام رسیاں اور لاٹھیاں نگل لیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ نگلنے سے مراد یہ ہے کہ ان کا اثر ختم کر دیا: يَاْفِكُوْنَ: اِفْكٌ: کا معنیٰ اصل چیز سے پھیر دینا اور باطل کے لیے استعمال ہوتا ہے تو انہوں نے لاٹھیوں اور رسیوں کی شکلیں سانپوں کی شکل میں تبدیل کیں تو ان کا اثر ختم کرنا بھی نگل دینا ہے یا اس کو ختم کرنا بھی ہو سکتا ہے لیکن پہلا قول بہتر ہے۔

تفسیر 118 یہ مقابلے کا پہلا نتیجہ ہے لفظ: وَقَعَ: یقینی ظہور پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی شک بھی باقی نہ رہا ہو: وَبَطَلَ بے فائدہ اور بے اثر ہو گئے یا فنا ہو گئے دونوں احتمالات ہیں۔

تفسیر 119 اس میں ضمائر فرعونیوں کی طرف راجع ہیں اور صریح دلیل ہے کہ فرعون الہ یا رب نہیں ہو سکتا اور یہ مقابلے کا دوسرا ظاہری نتیجہ ہے۔

تفسیر 120 یہ ان کی خوش نصیبی ہے کہ حق کے ظاہر ہوتے ہی جلدی ایمان لے آئے اور حق کے اثر کی وجہ سے یہ لوگ ایمان لانے کی طرف مجبور ہو گئے اس لیے مجہول صیغہ ذکر کیا: وَأُلْقِيَ: یا جلدی میں سجدہ کرنے کی وجہ سے مجہول کا صیغہ ذکر کیا۔

تفسیر 121 یہ ایمان کا اقرار اور اعلان ہے جبکہ پہلی آیت میں عملی ایمان تھا۔

تفسیر 122 یہ اس لیے کہا کہ فرعون یہ نہ سمجھے کہ رب العالمین میں ہوں: وهَارُونَ: کے لفظ میں دو غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا تھا یعنی فرعون یہ نہ کہے کہ موسیٰ کا رب میں ہوں اس لیے کہ میں نے اس کی تربیت کی ہے جب ہارون ان کے ساتھ ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ وہ رب مراد ہے جس کی توحید کی طرف موسیٰ اور ہارون دعوت دیتے ہیں۔

تفسیر 123 یہ عام لوگوں پر فرعون کی تلبیس ہے ورنہ اسے خوب معلوم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے ساتھ کوئی ساز باز نہیں کی ہے: قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ: اس کے ساتھ فرعون اپنے تکبر کا ذکر کرتا ہے کہ سب کچھ اس کے اذن کا محتاج ہے حالانکہ ایمان لانے اور حق ماننے میں کسی کے اذن کی ضرورت نہیں ہے: اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ: یہ خالص جھوٹ اور فرعون کے عجز پر صریح دلیل ہے کہ جب وہ مصر کے حالات کی خبر نہیں رکھتا تو الہ اور رب کیسے ہو سکتا ہے: لِتُخْرِجُوْا مِنْهَا: اشارہ کرتا ہے کہ موسیٰ کا مقصد حکومت پر قبضہ کرنا ہے حالانکہ ان کا ارادہ دین قائم کرنے کا تھا یہ باطل پرست لوگوں کی عادت تھی کہ حق پرستوں پر دنیا پرستی کا الزام لگاتے تھے: فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ: اس میں دھمکی دے رہا ہے اور سورۃ طٰهٰ آیت 71 اور شعراء آیت 49 میں ہے کہ یہ تمہارا بڑا ہے اور تمہارا استاد ہے تو اس میں اشارہ ہے کہ اس کے ساتھ مشورے میں موافقت ہے کیونکہ یہ تمہارا استاد ہے ان سابقہ سورتوں میں سبب مذکور ہے اور اس میں مسبب غایہ کے ساتھ مذکور ہے جو کہ لِتُخْرِجُوْا ہے۔

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

"ضرور میں کاٹ ڈالوں گا تمہارے ہاتھ اور پاؤں مختلف سمتوں سے اور ضرور تم سب کو (ایک ساتھ) سولی پر چڑھاؤں گا [124]۔ انہوں نے کہا بے شک ہم تو اپنے رب کی طرف پلٹنے والے ہیں [125]۔ اور نہیں تو ہمیں سزا دیتا مگر یہ کہ ہم اپنے رب کی آیتوں پر ایمان لائے جب ہمارے پاس آئیں اے ہمارے رب ہمیں صبر پر قائم رکھ اور ہمیں اسلام کی حالت میں (توحید کے عقیدے پر) موت دینا" [126]۔

تفسیر 124 یہ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ کی تفصیل ہے ہاتھ پاؤں مختلف جگہوں سے کاٹنا اور پھر پھانسی پر چڑھانا یہ سزا فرعون کے وقت سے شروع ہوئی ہے اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اس میں فرعون کے بڑے ظلم کی طرف اشارہ ہے کہ جو سزا اللہ تعالیٰ نے قُطَّاعُ الطَّرِیْقِ : اور اللہ اور رسول کے ساتھ محاربہ کرنے والوں کے لیے مقرر کی ہے سورۃ مائدہ آیت 33 میں وہ سزا فرعون نے ایمان والوں کے لیے مقرر کی ہے۔

تفسیر 125 یہ ساحرین کی (جو مسلمان ہو گئے تھے) ان کی بہادری اور ثابت قدمی ہے یعنی موت میں اپنا فائدہ سمجھتے ہیں کہ اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔

تفسیر 126 یعنی جو چیز اکرام اور عزت کا سبب ہے وہ اپنے لئے انہوں نے عیب کا سبب سمجھ لیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہمیشہ حق پرستوں کے ساتھ لوگوں نے دشمنی ایمان کی وجہ سے کی ہے جیسا کہ سورۃ بروج آیت 8 میں ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ فرعون نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے اور ان کو سولی پر چڑھایا موت کے وقت یہ لوگ یہ دعا پڑھ رہے تھے۔ اَفْرِغْ : کامل صبر پر دلالت کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ سے صبر جو نبیوں کا عمل ہے طلب کرتے ہیں تو یہ دلیل ہے کہ بندے اپنے فعل میں اللہ کی محتاج ہیں۔ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ : اشارہ ہے کہ ایمان اور اسلام ایک ہی چیز ہے اور اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کا دین اسلام ہے۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ
أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٧﴾ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ
الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٨﴾ قَالُوا أُوذِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَ
مِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٢٩﴾

"فرعون کی قوم کے سرداروں نے (اس سے) کہا کیا آپ چھوڑتے ہیں موسیٰ (علیہ السلام) اور اس کی قوم کو کہ زمین میں فساد کریں اور آپ کی اور آپ کے معبودوں کی عبادت چھوڑ دیں۔ فرعون نے کہا عنقریب ہم ان کے بیٹوں کو قتل کرینگے اور زندہ چھوڑینگے (بے حرمتی کریں گے) ان کی عورتوں کی اور یقیناً ہم ان پر غالب ہیں [127]۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو اور صبر کرو بیشک زمین اللہ کے اختیار میں ہے ان لوگوں کو اس کا مالک بناتا ہے جن کو چاہے اور اچھا انجام پرہیزگاروں کا ہی ہے [128]۔ انہوں نے کہا ہمیں تکلیفیں آپ کے ہمارے پاس آنے سے پہلے اور آپ کے آنے کے بعد بھی دی گئی ہیں۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمنوں کو ہلاک کرے اور بعد میں تمہیں اس زمین (شہر) میں آباد کرے وہ دیکھ لیگا کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو" [129]۔

تفسیر 127 یہاں سے تین آیتوں میں دوسرا مقام ہے اور اس مقام میں موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم پر باقی مصائب کا بیان ہے اور ساتھ میں ان کی ثابت قدمی بھی ہے اس آیت میں فساد سے مراد حق بیان کرنے کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوتا ہے ہمیشہ باطل پرستوں نے اس کو فساد کہا ہے: اٰلِهَتَكَ: اس سے مراد وہ معبود ہے کہ مصر میں فرعون کے حکم سے اس کی عبادت کی جاتی تھی ان معبودوں میں فرعون، گائے، دیے یا بھیڑ چاند اور سورج کی شکلیں موجود تھیں۔ فرعون خود بھی بھیڑ کی عبادت کرتا تھا اگرچہ فرعون مناظرے میں مغلوب اور عاجز ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود اپنے آپ غالب سمجھتا رہا یہ اس کی بے عقلی تھی۔

تفسیر 128 اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو مصائب کی خلاف دو علاج بتائے استعانت باللہ اور صبر کرنا اور دو خوشخبریاں سنا دیں ایک دنیا کی اور دوسری آخرت کی: اَلْاَرْضَ لِلّٰهِ: حقیقی ملکیت ساری زمین اور مصر کی زمین کی اللہ تعالیٰ کی ہے ملکیت حکمی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ دیتا اور تقسیم کرتا ہے۔

تفسیر 129 یہ قول بنی اسرائیل کا ثابت قدمی کے اظہار کے طور پر تھا اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دومزید بنیادی بشارتیں پیش کیں: أُوْذِيْنَا: پہلے اَذًی : سے مراد قتل اور اِسْتِحْيَاء ہے اور بنی اسرائیل سے ذلت کے کام لینا اور دوسرا اَذًی سے مراد ذلت کے کام اور پھر قتل اور اِسْتِحْيَاء: کا ارادہ کرنا ہے: كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ : یہ دلیل ہے کہ اعمال میں مقصد کیفیات اور شرعی طریقے ہیں اور یہ سورۃ یونس آیت 14 میں بھی مذکور ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

"اور تحقیق ہم نے فرعونیوں کو چند سالوں کی قحط سالی کے ساتھ پکڑا اور اور مالوں کی کمی سے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں [130]۔ جب ان کے پاس خوشی آئی تو یہ لوگ کہتے کہ یہ ہمارا حق ہے اور اگر ان کو کوئی تکلیف پہنچ جائے تو نحوست کی نسبت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کرتے اور ان لوگوں کی طرف جو ان کے ساتھ تھے خبردار ان کی نحوست اللہ کے نزدیک مقرر تھی لیکن ان میں اکثر نہیں جانتے [131]۔ انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے پاس جو بھی نشانی لیکر آتے ہیں تاکہ ہم پر اس کے ذریعے سے جادو کر لیں تو ہم آپ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں" [132]۔

تفسیر 130 یہاں سے آیت 135 تک تیسرا مقام ہے ایک تو اس میں بنی اسرائیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد کا ذکر ہے اور سحر والے فرعونیوں پر سات قسم کے عذابوں کو بھیجنا اور آخر میں ان کو غرق کرنا اس آیت میں دو عذابوں کا ذکر ہوا۔ سِنِيْنَ: دیہاتیوں اور صحرا والوں کا عذاب ہے: وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ : یہ شہر والوں کا عذاب ہے جو باقی زمین کی تمام آمدنیوں اور تجارتی منافع پر مشتمل ہے۔

تفسیر 131، 132 اپنے آپ کو کشادگی اور خوشی کا حقدار سمجھا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے: يَطَّيَّرُوْا : جب کبھی مصائب ہر طرف سے آجائیں تو اپنی بدعملی کی بجائے اوروں کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ فلاں شخص فلاں گھر یا سفر وغیرہ منحوس تھا حدیث میں آیا ہے: لَا طِيَرَةَ فِي الْاِسْلَامِ : اسلام میں بدشگونی نہیں ہے (صحیح مسلم باب الطیرۃ حدیث 2223) اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہمیشہ باطل پرستوں نے نیک لوگوں کو منحوس کہا ہے اور اپنی بری نحوست کی نسبت ان کی طرف کی ہے جیسا کہ سورۃ یونس آیت 18 میں ہے۔ عبداللہ

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ان کے مصائب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں یا تقدیر میں اللہ کی جانب سے مقرر تھا امام شربینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے منحوس ہونے کا سبب ان کے وہ اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پاس لکھے ہوئے ہیں: لَا يَعْلَمُونَ لیکن اکثر لوگ حوادث اور مصائب کی نسبت محسوس اسباب کی طرف کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے غافل ہوتے ہیں اس کو تقدیر بھی نہیں مانتے۔ فائدہ: اَلْحَسَنَةُ: کو معرفہ ذکر کیا ہے اور سَيِّئَةٌ بنکرہ اشارہ ہے کہ حسنات زیادہ ہیں اور سیئات کم ہیں۔ یہ ان کا بہت سخت عناد تھا اس لیے کہ اسکو آیت بھی کہتے ہیں اور اس کی طرف سحر کی نسبت بھی کرتے ہیں۔

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ﴿١٣٣﴾ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يَا مُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِندَكَ ۖ لَئِن كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿١٣٤﴾

"ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک اور خون (یہ سب) نشانیاں الگ الگ تھیں انہوں نے ایمان لانے سے تکبر کیا اور وہ مجرم قوم تھی [133]۔ اور جب ان پر عذاب آتا (ان عذابوں میں سے) تو یہ لوگ کہتے اے (موسیٰ علیہ السلام) ہمارے لئے اپنے رب سے دعا مانگیں اس سبب سے کہ آپ سے وعدہ لیا ہے اگر آپ نے ہم سے (دعا کے ذریعے سے) یہ عذاب ہٹا دیا تو ہم آپ پر ایمان لائینگے اور ہم ضرور آپ کے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دینگے" [134]۔

تفسیر 133 بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے بددعا کی تو ان پر یہ عذاب شروع ہوئے۔ فَأَرْسَلْنَا: اس میں زیادہ ہونے کی طرف اشارہ ہے اور معلوم ہوا کہ اس کے لیے آسمانی اسباب تھے طوفان سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے عام ہلاکتیں ہوتی ہیں وہ سخت بارش ہو یا عام وباء ہو جیسا کہ یہاں پر بعض مفسرین نے خسرہ کی بیماری ذکر کی ہے۔ تو یہ عذاب مالی اور بدنی دونوں ہیں: وَالْجَرَادَ: یہ مالی عذاب ہے اس لیے کہ ٹڈیوں نے ان کی ساری فصل اور پھل کھائی تھی اور یہ قحط کی نشانی ہوتی ہے ذبح کیے بغیر ٹڈیوں کا کھانا جائز ہے (صحیح بخاری کتاب الذبائح حدیث 5495 صحیح مسلم کتاب الصید حدیث 1952 نسائی کتاب الصید حدیث 4367 ترمذی کتاب الاطعمۃ حدیث 1822 احمد 357,4) ٹڈیوں کو جو بھی قسم ہو ہاں ابوداؤد کی حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ اس کو نہیں کھاتے تھے اس لیے کہ طبعاً اس کو ناپسند تھی جیسا کہ ضب یعنی سانڈہ نوٹ: ابوداؤد والی روایت ضعیف ہے کتاب الاطعمۃ باب فی اکل

الجراد 3813 (مترجم) جیسا کہ ضرب: یعنی ساتوہ: وَالْقُمَّلَ: اس کی ایک قسم وہ ہے کہ جو تیار غلہ کھائے اس کو گھن کہا جاتا ہے دوسری قسم وہ ہے جو بالوں اور بدن میں ہوتی ہیں جوئیں تیسرا وہ کہ جو جانوروں کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور ان کو کاٹتے ہیں جسے پسّو کہتے ہیں یہ ساری قسمیں یہاں پر مراد ہیں تو یہ بھی مالی اور بدنی عذاب ہے۔ وَالضَّفَادِعَ: یہ بھی ان کے کھانے پینے کی چیزوں میں داخل ہوا کرتے تھے اور ان کے بدن اور سروں پر چڑھتے وَالدَّمَ یہ بھی ان کے کھانے پینے میں ظاہر ہوتا: مُفَصَّلٰتٍ: الگ الگ عذاب تھے ایک روایت میں آیا ہے کہ ہر دو عذابوں کے درمیان سات یا آٹھ دن کا وقفہ تھا۔ یا یہ کہ آیت اللہ پر اس کا دلالت کرنا ظاہر اور واضح ہے: فَاسْتَكْبَرُوْا: عقیدے کا مرض ہے اور مُجْرِمِيْنَ: اعمال کا مرض ہے۔

تفسیر 134 یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ فرعونی اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے اور مصیبت میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کے قائل تھے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے دو مقاصد تھے ایک توحید کا مسئلہ اور دوسرا توحید والوں کو آزاد کرنا: عَهِدَ عِنْدَكَ: عہد سے مراد نبوت ہے یا اس سے مراد دعا کی قبولیت ہے: بِمَا میں با، اُدْعُ کے ساتھ متعلق ہے یعنی اس حق کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت دی ہے یا اس عہد کے ساتھ وسیلہ پکڑو یا قسم کے لیے ہے لَئِنْ كَشَفْتَ: کشف کی نسبت مجازی ہے یعنی آپ کی دعا کے سبب جو: وَالْقُمَّلَ: میں مذکور ہے اور اس طرح سورۃ زخرف آیت 49 میں بھی ہے۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُم بَالِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ ﴿١٣٥﴾ فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿١٣٦﴾

"پس جب ہم ان سے عذاب کو ہٹا دیتے ایک وقت مقرر تک جس کو یہ لوگ پہنچنے والے ہوتے تو اس وقت یہ وعدہ کو توڑ دیتے [135]۔ پس ہم نے ان سے بدلہ لیا ہم نے ان کو سمندر میں غرق کر دیا اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور یہ لوگ ان سے غافل تھے" [136]۔

تفسیر 135 اس آیت میں ان کی ضد اور عناد کا ذکر ہوا ہے: اِلٰٓى اَجَلٍ: اس سے مراد وہ سات یا آٹھ دن ہیں جو اللہ تعالیٰ نے عذاب کے لیے مقرر کیے تھے اور اس طرح زخرف آیت 50 میں بھی ہے۔

تفسیر 136 اس آیت میں ان کا غرق ہونا یہ آخری عذاب ذکر ہوا ہے اور اس کی دو وجوہات ذکر ہوئی ہیں۔ فَانْتَقَمْنَا.

نَقِمَۃٌ: اصل میں عذاب کے ذریعے سے نعمت کو زائل کرنا ہے: اَلْیَمِّ: گہرا سمندر یا سمندر کی بھنور کو کہا جاتا ہے۔ ازہری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ یم بحر مالح اور بحر عذب دونوں کو کہا جاتا ہے جیسا کہ: فَاَقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ: میں عذب مراد تھا اور یہاں پر بحر مالح (قُلْزُم) مراد ہے اور بحر صرف: مالح: کو کہا جاتا ہے۔ عذاب کی دو وجوہات تکذیب اور غفلت ذکر کیں اگرچہ ان کے اور بھی بہت گناہ تھے لیکن یہ دونوں تمام گناہوں کی جڑیں تھیں۔ (سوال) غفلت تو غیر اختیاری امر ہے تو اس کو عذاب کا سبب میں کیوں ذکر کیا۔ (جواب) اس سے مراد اعراض اور بے پرواہی کرنا ہے اس کو تغافل کہا جاتا ہے اس سے آیتوں کی توہین لازم آتی ہے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ ۝

"اور ہم نے وارث ان لوگوں کو بنایا جو کمزور سمجھے گئے تھے (مصر میں) زمین کے مشرق و مغرب میں وہ زمین کہ جس میں ہم نے برکتیں ڈالی ہیں اور پورا ہوا آپ کے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر اس وجہ سے کہ انہوں نے صبر کیا تھا اور ہم نے ہلاک کیا جو فرعون اور اس کی قوم کے لوگ بناتے اور وہ باغات جو چھپروں پر اٹھاتے تھے" [137]۔

تفسیر 137 اس زمین سے مراد شام کی زمین ہے کہ اس میں دنیاوی اور اخروی برکات زیادہ ہیں بنی اسرائیل پہلے شام کی زمین کے وارث تھے پھر داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے دور میں مصر کے بھی وارث بن گئے۔ یُسْتَضْعَفُوْنَ اس سے مراد ان میں سے غلام بنانا اور اولاد کو ذبح کرنا اور مشقت اور سخت کام کروانا اور ذلیل کرنا ہے اس طرح سورۃ قصص آیت 4 اور 5 میں بھی مذکور ہے: مَشَارِقَ الْاَرْضِ: مشارق اور مغارب سارے اطراف کی جانب اشارہ ہے اور جب ہر علاقے کا مشرق اور مغرب الگ الگ ہوتا ہے تو اس وجہ سے جمع ذکر کیا: اَلْاَرْضُ: اس سے مراد وہ علاقہ ہے جو فرات سے بحر صرف (قلزم) تک ہے جیسا کہ بقاعی نے سورۃ مائدہ میں ذکر کئے ہیں اور یہ زمین سورۃ انبیاء آیت 11 اور آیت 18 اور سورۃ اسراء میں مذکور ہے: كَلِمَتُ رَبِّكَ: وہ سورۃ قصص آیت 5 اور 6 میں مذکور ہے: مَا كَانَ یَصْنَعُ: اس سے مراد عمارات اور صنعتیں وغیرہ ہیں۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا
لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْـهَلُوْنَ ﴿١٣٨﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٩﴾ قَالَ
اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٤٠﴾ وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ
الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿١٤١﴾

"اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کیا تو یہ لوگ ایک قوم (کے لوگوں) پر سے گزرے جو عبادت کر رہے تھے اپنے معبودوں کی انہوں نے کہا اے موسیٰ علیہ السلام ہمارے لئے بھی عبادت کے لیے الٰہ بنالو جیسے ان کے معبود ہیں اس نے کہا بیشک تم نا سمجھ قوم ہو [138]۔ یہ لوگ ہلاک کیئے جائیں گے جس کی عبادت میں یہ لوگ مشغول ہیں اور وہ اعمال باطل ہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں [139]۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا اللہ کے علاوہ تمہارے لئے دوسرا معبود تلاش کروں اور اس (اللہ تعالیٰ) نے (توحید کی وجہ سے) فضیلت دی ہے تمہیں اس زمانے کے تمام لوگوں پر [140]۔ اور جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی جو تمہیں برے عذاب پہنچایا کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑتے اور اس کام میں بڑی آزمائش (امتحان) تھی تمہارے رب کی طرف سے" [141]۔

تفسیر 138 یہاں سے آیت 141 تک چوتھا مقام ہے اس میں بنی اسرائیل کے کمزور عقیدہ کا بیان ہے اور موسیٰ علیہ السلام کے ان کو سمجھانے کا ذکر ہے کہ بنی اسرائیل میں نبی کی موجودگی میں دینی کمزوری شروع ہوئی تھی: وَجَاوَزْنَا: یہ مجاوزہ (بچانا) عاشورا کے دن تھا اسی وجہ سے وہ لوگ اس دن روزہ رکھتے تھے (صحیح بخاری کتاب الصوم حدیث 2004) اس امت میں یہ روزہ رکھنا سنت ہے: عَلٰی قَوْمٍ: یہ قوم لخم قبیلے کی تھی گائے کی شکلوں کے بت بناتے اور ان کی عبادت کرتے تھے بعض نا سمجھ بنی اسرائیل نے یہ مطالبہ پرانی عادت اور نئے ایمان کی وجہ سے کیا تھا اور اسی طرح مطالبہ غزوہ حنین میں بعض نئے مسلمانوں نے بھی کیا تھا کہ ہمارے لئے ایک درخت مقرر کرلو کہ ہم بطور برکت اس کے ساتھ اپنے ہتھیار لٹکائیں جیسے ان مشرکین کے لیے درخت تھا اس کو ذات انواط کہا جاتا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو تنبیہ کی کہ تم لوگ بھی بنی اسرائیل کی طرح بات کرتے ہو (صحیح ابن ماجہ حدیث 6702 نسائی فی سنن کبری 11185 ترمذی کتاب الفتن حدیث 2187 ابن ابی شیبہ 15 / 101 احمد 5 / 218 ابو یعلی 1441 شیخ البانی صحیح رشاد

شیخ حسن عباس وغیرہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے) سوال: یہ دونوں واقعات تو ان کے کفر اور ارتداد پر دلالت کرتے ہیں؟
جواب: یہ ہے کہ یہ کفر نہیں ہے اس لیے کہ اپنے نبی سے اس قسم کا مطالبہ کیا تھا اس عقیدے کے ساتھ کہ الہ کا حلول ممکن ہے
نئے مسلمانوں میں یہ جہالت عذر ہے۔ يَعْكُفُوْنَ: عکوف کسی چیز کو لازم پکڑنا اور تعظیم کے طور پر اس کی طرف متوجہ ہونا
ہے۔ تَجْهَلُوْنَ: میں اشارہ ہے کہ مشرکین کے ساتھ مشابہت بھی جہالت ہے۔

تفسیر 139 پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ یہ معبود اہل توحید کے ہاتھوں سے فناء ہونے والے ہیں اور اللہ تعالی کی طرف سے
بھی کسی دوسرے ذریعے سے ہلاک ہونگے ان کی عبادت جائز نہیں ہے دوسرے جملے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے یہ شرکیہ
کام بے فائدہ ہیں نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ تکلیف بنا سکتے ہیں۔

تفسیر 140 یہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو وعید ہے پہلے اس بات کو ذکر کیا کہ یہ معبود عبادت کے اہل نہیں ہیں اب اس بات کا
ذکر ہے کہ اللہ تعالی توحید کے ساتھ عبادت کا حقدار ہے اس لیے کہ یہ فضیلت کا سبب ہے اور فضیلت کا طریقہ سورۃ مائدہ ۲۰
میں مذکور ہے۔

تفسیر 141 اس آیت میں بنی اسرائیل کی فضیلت اور اللہ تعالی کی نعمت کا تذکرہ ہے، اس طرح آیت سورۃ بقرہ آیت
49 اور ابراہیم آیت 6 میں بھی مذکور ہے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ
اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

"اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ لیا اور ہم نے ان کو (مزید) دس راتوں سے مکمل کیا پوری ہوگئی اس کے
رب کی مقرر کردہ چالیس راتیں اور فرمایا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے میری قوم میں میری جانشینی
کرتے رہنا اور ان کی اصلاح کرو اور فساد کرنے والوں کے راستے کی پیروی نہ کرنا" [142]۔

تفسیر 142 یہاں سے آیت 154 تک پانچواں مقام ہے کتاب دینے کے لئے اس میں میقات اول کا ذکر ہے اور ہارون
علیہ السلام کے استخلاف کا ذکر ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالی کی رؤیت (دیکھنے) کے مطالبہ کرنے کا بیان ہے اور پھر بنی
اسرائیل کا بچھڑے کے ذریعے سے شرک کرنا اور موسیٰ علیہ السلام کا اس پر غصہ ہونا مذکور ہے یہ چالیس راتیں ذی القعدہ
کے مہینے اور دس دن ذی الحجہ کے تھے اور روایت میں ہے کہ مہینے کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے مسواک کا استعمال شروع کیا تو

اللہ تعالیٰ نے دس دن اور زیادہ کر لیے اسی وجہ سے لفظ بِعَشْرٍ :کو الگ ذکر کیا اور ان دس دنوں میں ان کو تورات مل گئی ابن کثیر: نوٹ مسواک والی روایت کسی مستند کتاب میں وارد نہیں ہے (مترجم) (سوال) فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ: اس کی کیا ضرورت تھی؟ جواب: اس میں وہم کو ختم کرنا ہے یعنی کوئی یہ وہم نہ کرے کہ: عَشْرٍ ، ثَلٰثِيْنَ: کا جزء ہے بلکہ ثَلٰثِيْنَ: کے بعد ہے میقات اور وقت میں فرق یہ ہے کہ وقت مطلق وقت کو کہا جاتا ہے اور میقات وہ وقت ہے جو کسی کام کے لیے مقرر کیا جائے: وَقَالَ مُوسٰى :اشارہ ہے کہ امیر کی غیر موجودگی میں جانشین ضروری ہے چاہے امامت کبریٰ ہو یا صغریٰ ہو: سوال: ہارون علیہ السلام تو نبی تھے تو نبی تو کسی اور کا خلیفہ نہیں بنتا؟ جواب: انبیاء میں درجات ہیں ہارون علیہ السلام نبی تھے لیکن خلافت کا کام موسیٰ علیہ السلام کے ذمے تھا۔ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ :تاکید کے لئے ہے جیسا کہ سورۃ ص آیت 29 اور 26 میں ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوسٰى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ قَالَ يٰمُوسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

"اور جب موسیٰ علیہ السلام ہماری ملاقات کے لئے آئے اور ان سے ان کے رب نے کلام کیا تو انہوں نے کہا اے میرے رب مجھے اپنا آپ دکھا کہ میں تجھے دیکھوں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، اس پہاڑ کو دیکھو اگر یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو عنقریب تم مجھے دیکھ لوگے تو جب نور (جلوہ) ظاہر کیا اس کے رب نے پہاڑ کی طرف تو اس کو زمین کے ساتھ ہموار بنا یا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر گئے پس جب (ہوش میں آئے) تو انہوں نے کہا تیرے لئے پاکی ہے میں نے تیری طرف توبہ کی اور میں سب سے پہلے (اس وقت) ایمان والوں میں سے ہوں [143]۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ علیہ السلام میں نے تمہیں اپنے پیغام اور کلام کے ذریعے سے لوگوں پر چن لیا تم اس کتاب کو تھام لو جو میں نے تمہیں دی ہے اور اس کو بیان کرنے کے ذریعے شکر کرنے والوں میں سے ہو" [144]۔

تفسیر 143 کلام کے سننے سے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا، موسیٰ علیہ السلام کا یہ سوال محبت کی وجہ سے اور بنی اسرائیل کا سوال:

اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً: یہ بے ادبی اور انکار کی وجہ سے تھا اسی وجہ سے وہ عذاب کا سبب بن گیا اور حق یہ ہیں کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ممکن ہے لیکن واقع نہیں ہے اور بعض علماء کے نزدیک دنیا میں ممتنع ہے امکان کے لیے دلائل یہ ہیں (۱) موسیٰ علیہ السلام نے اس کا مطالبہ کیا ہے اور انبیاء علیہم السلام بے دلیل چیز کا مطالبہ نہیں کرتے اس لیے کہ ممتنع کو طلب کرنا جہالت ہے اور انبیاء علیہم السلام جہالت سے پاک ہیں: لَنْ تَرَانِي: کہا: لَنْ أُرٰى: نہیں کہا ہے۔ (۲) اس کی تعلیق استقرار جبل سے کی ہے اور یہ ممکن ہے ممکن کے ساتھ تعلق امکان کا فائدہ کرتا ہے۔ سوال: حرف لن نفی تابیدی پر دلالت کرتا ہے، معتزلہ نے بھی اسی طرح کہا ہے؟: جواب: لَنْ نفی موکد پر دلالت کرتا ہے چاہے ہو یا نہ ہو اور اس کی تحقیق امام شربینی رحمہ اللہ نے سراج المنیر میں ذکر کی ہے: (سوال) موسیٰ علیہ السلام نے تُبْتُ: کہا ہے؟: جواب: یہ توبہ عاجزی اور عبدیت کی وجہ سے تھا یہ بالاجماع گناہ کی وجہ سے نہیں ہے ہاں توبہ اس وجہ سے ہے کہ بغیر اجازت کے یہ دعا مانگی تھی، جنت والوں کا آخرت میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا یقینی ہے اس کی تفصیل سورۃ قیامۃ 22 اور سورۃ تطفیف آیت 15 میں ہے: فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ: یہ ایک مثال ہے کہ پہاڑ کی ظاہری قوت زیادہ ہے تو جب وہ اللہ تعالیٰ کی تجلی کی طاقت نہیں رکھتا تو کمزور وجود کا انسان کیسے طاقت رکھ سکے گا صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجلی میں صرف چھنگلی انگلی کا ایک پورہ ظاہر کیا تھا (صحیح ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3074 مستدرک 2/320 احمد 3/125 الکامل لابن عدی 2/260 اور امام شربینی نے کہا ہے کہ یہاں پر صاحب کشاف نے اپنے مذہب کے اثبات میں فاسد تاویلات کی ہیں ان سے خود کو بچائیں۔

تفسیر 143 یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو تسلی ہے کہ اگر دیدار سے تم کو منع کیا مگر باقی احسانات تو تم پر کئے ہیں اَلنَّاسِ: سے مراد امتی ہیں اور شکر سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتاب سے تمسک ہے، امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ تسلی بھی اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے امکان پر دلالت کرتی ہے۔

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا ۚ سَأُرِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ ﴿١٤٥﴾ سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿١٤٦﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٧﴾

"اور ہم نے اس کے لیے تختیوں میں ہر قسم ضروری احکام لکھ دیے اور وعظ اور ہر ضروری حکم کی تفصیل تو اسے کوشش کے ساتھ اپناؤ اور اپنی قوم کو حکم دو کہ اس کو تھام لے پکڑے اچھے طریقے سے (عمل کرے) عنقریب میں تمہیں نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا [145]۔ ضرور میں پھیر دونگا اپنی آیتوں کے سمجھنے سے ان لوگوں کو جو زمین میں ناجائز طریقے سے تکبر کرتے ہیں اور اگر یہ لوگ حق کی ہر قسم نشانی دیکھ لیتے ہیں تو اس پر ایمان نہیں لاتے اور اگر یہ لوگ ہدایت کی راہ دیکھ لیں اس کی پیروی نہیں کرتے اور اگر وہ گمراہی کی راہ دیکھ لیں تو اسے اپنا لیتے ہیں اپنے لیے راستہ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور یہ لوگ ان سے غافل ہیں [146]۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا تو ان کے اعمال ضائع ہیں ان کو بدلہ نہیں دیا جائیگا مگر ان اعمال کا جو یہ لوگ کیا کرتے تھے" [147]۔

تفسیر 145 تورات تختیوں میں نازل ہوئی تھی لیکن ان تختیوں کی گنتی اور حقیقت صحیح روایات میں معلوم نہیں ہے تو اس میں بحث کرنا بے مقصد ہے: مَوْعِظَةً: اس سے مراد زجر اور تخویفات وغیرہ ہیں: وَتَفْصِيلًا: اس سے مراد تورات کے احکام ہیں: بِأَحْسَنِهَا: یہ اضافت بیانیہ ہے یعنی سارا اَحْسَن ہے یا اشارہ ہے کہ اَحْسَن عزیمت اور حَسَن رخصت کو کہا جاتا ہے: دَارَ الْفَاسِقِينَ: اس سے مراد یا تو شام کی زمین ہے جس میں سرکش قسم کے لوگ رہتے تھے یا مصر کا شہر ہے یا اس سے مراد قیامت کے دن جہنم ہے بعد والی توجیہ سے کتاب اللہ کی مخالفت کرنے والوں کو خطاب ہے، اس معنی میں یہ وعید ہے اور پہلے والے معنی کے ساتھ یہ بشارت ہے۔

تفسیر 146 پہلی آیت میں تورات پر عمل کرنے کے لئے ترغیب ذکر ہوئی تو اس آیت میں ان لوگوں کو وعید ہے جو اللہ تعالی کی کتاب سے ضد اور عناد کی وجہ سے منہ پھیرنے والے ہیں بعد والے جملے ان کے عناد کرنے پر دلالت کرتے ہیں یہ آیت

اس بات کی دلیل ہے کہ جس کے دل میں تکبر ہوتو وہ کتاب اللہ کے سمجھنے سے محروم ہے،علماء نے وہ (9) صفات ذکر کی ہیں جو قرآن کے سمجھنے میں رکاوٹ بنتی ہیں وہ الاتقان ص 232 میں سیوطی نے اور البرھان میں زرکشی نے صفحہ 180 میں ذکر کی ہیں عَنْ اٰيٰتِيَ : توحید کے دلائل تورات اور قرآن کی آیتیں مراد ہیں :سَاَصْرِفُ : یعنی ان کے دلوں پر (مہر) لگانے کے سبب سے قرآن کے فہم سے روکنا:بِغَيْرِ الْحَقِّ :اس سے مراد باطل دین ہے یعنی باطل دین کے ذریعے سے تکبر کرتے ہیں اور یہ اشارہ ہے کہ تکبر بالحق جائز ہے یعنی اہل حق کا اہل باطل پر تکبر کرنا اور امام شربینی رحمہ اللہ نے مشہور قول ذکر کیا کہ متکبر کے مقابلے میں تکبر صدقہ ہے۔

تفسیر 148 اس آیت میں منکرین کیلئے تخویف اخروی ہے :وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ: میں اشارہ ہے کہ ان سے توبہ کرنے کی امید نہیں ہے اس لئے کہ آخرت کو نہیں مانتے تو مراد یہ ہے کہ توبہ کے بغیر تکذیب پر مرجائیں :اَعْمَالُهُمْ : اس سے مراد ان کے نیک اعمال ہیں جیسے صلہ رحمی ،صدقہ کرنا اور ان کے اچھے اخلاق۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

"اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اس کے جانے کے بعد ان کے زیورات سے بچھڑا بنایا ایک جسم تھا کہ اس کی آواز تھی کیا یہ لوگ سوچتے نہیں ہیں کہ یہ بچھڑا نہ ان کے ساتھ بات کرسکتا ہے اور نہ ان کو کوئی راہ (فائدے کی) دکھا سکتا ہے انہوں نے اس بچھڑے کو (معبود) بنایا اور یہ لوگ ظلم (شرک) کرنے والے تھے [148]۔ اور جب ان کے سامنے گرادیا گیا اور انہوں نے جان لیا کہ یہ لوگ یقیناً گمراہ ہوگئے انہوں نے کہا اگر ہم پر ہمارے رب نے رحم نہ کیا اور ہمیں معاف نہ کیا تو ہم ضرور نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوجائینگے" [149]۔

تفسیر 148 موسیٰ علیہ السلام کا میقات اول کی طرف سفر کرنے کا یہ دوسرا واقعہ ہے۔اس کی تفصیل سورۃ طٰہٰ آیت 85 میں ہے۔آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ سامری کا بنا ہوا وہ بچھڑا صرف ایک مجسمہ تھا اور اس سے بچھڑے کی آواز نکلتی تھی اس سے گوشت اور خون نہیں بنا تھا اور یہ قول راجح ہے اور اس آیت میں معبود برحق کی دو صفات ذکر کی ہیں پہلی یہ کہ اس کے لیے کلام کی صفت ہوگی دوسری یہ کہ وہ ہدایت کی رہنمائی کرسکتا ہے اور یہ دونوں صفات بچھڑے میں نہیں ہیں اور نہ مُردوں اور نہ

باطل معبودوں میں ہیں۔ پہلا اِتَّخَذَ: بنانے کے معنی میں ہے اور دوسرا معبود بنانے کے معنی میں ہے۔ حُلِيِّهِمْ: یہ اگرچہ ان سے عارضی طور پر لیے تھے لیکن فرعونیوں کی ہلاکت کے بعد بنی اسرائیل کی میراث اور ملکیت بن گیا۔ جیسا کہ سورۃ دخان آیت 25 اور 28 میں ہے۔ لَا يُكَلِّمُهُمْ: یہ صریح دلیل ہے کہ اللہ کے لیے صفت کلام ہے اس لیے کہ یہ معبودیت کا وصف ہے۔ قَوْمِ مُوسٰى: اس سے مراد بعض افراد ہیں سب نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی سورۃ اعراف 159 میں اس کی اشارہ ہے۔

تفسیر 149 اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو جلایا اور اس کی راکھ سمندر میں بہادی جیسا کہ سورۃ طٰہٰ آیت 98 میں ہے دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب بچھڑے کی عبادت پر نادم ہوگئے اس لیے کہ گرنا نادم ہونے کا اشارہ ہے اور شرمندہ ہونے کا سبب بعد والی آیت میں مذکور ہے۔ قَالُوْا: یہ بنی اسرائیل کا بچھڑے کی عبادت سے توبہ کرنے کا ذکر ہے اور یہ عَفَوْا کا سبب ہے جو سورۃ بقرہ آیت 56 میں مذکور ہے۔ يَرْحَمْنَا: یہاں پر رحم توبہ کی قبولیت کے معنی میں ہے اور وہ مَغْفِرَةٌ پر مقدم ہے اور جب رحم گناہ سے بچانے کے معنی میں ہو تو پھر مغفرت رحم پر مقدم ہوتی ہے جیسا کہ سورۃ اعراف آیت 23 میں آدم علیہ السلام کی دعا میں ہے اور اسی طرح اور بھی بہت سارے مقامات میں مذکور ہے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۡ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَ اَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ڮ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَ اٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ښ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۝

اور جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف غصے میں پلٹ گئے (اپنی قوم کے شرک کرنے پر) غمگین تھے انہوں نے فرمایا بہت برا ہے وہ کام جو تم نے میرے بعد کیا کیا تم نے جلدی کر لی اپنے رب کے حکم سے اور تختیوں کو رکھ دیا اور اپنے بھائی کو سر سے پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ فرمایا (ہارون علیہ السلام نے) اے میری ماں کے بیٹے بیشک اس قوم نے مجھے کمزور سمجھا تھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے مجھ پر دشمنوں کو خوش نہ کرنا اور نہ مجھے ظالم قوم میں سے شمار کرنا [150]۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے میرے رب مجھے اور میرے بھائی کو معاف کرنا اور ہمیں اپنی خاص رحمت میں داخل فرمانا اور آپ مہربانوں میں سب سے بڑھ کر مہربان ہیں [151]۔ اور جن لوگوں نے برے عمل کیے پھر توبہ کی ان (اعمال) کے بعد اور ایمان لے آئے۔ تو بیشک آپ کا رب توبہ کے بعد ضرور معاف کرنے والا مہربان ہے [153]۔ اور جب موسیٰ کا غصہ زائل ہوا تو تختیوں کو اٹھا لیا اور ان نسخوں میں ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لیے جو خاص اپنے رب سے ڈرتے ہیں [154]

تفسیر 150 کتاب دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی قوم کے شرک کے بارے میں خبر دی اس وجہ سے وہ حالت غصہ میں واپس ہو گئے۔ واقعہ کی اصل ترتیب سورۃ طٰہٰ میں مذکور ہے کہ پہلا خطاب قوم سے کیا پھر ہارون علیہ السلام سے پھر سامری سے اس سورۃ میں ترتیب مقصود نہیں ہے: خَلَفْتُمُوْنِيْ: بچھڑے کی عبادت کرنے والوں کو خطاب ہے یعنی شرک کو توحید کے مقام پر رکھنا یہ بدترین جانشینی ہے یا ہارون علیہ السلام اور باقی بڑوں کو خطاب ہے کہ تم نے میری صحیح جانشینی اور نیابت نہیں کی اس لیے کہ تم نے شرک سے لوگوں کو نہیں روکا: اَعَجِلْتُمْ: جلدی سے مراد تبدیل کرنا اور امر سے مراد توحید

کا دین ہے یا امر سے مراد چالیس دنوں کا وعدہ ہے۔ اس طرح سورۃ طٰهٰ آیت 86 میں مذکور ہے۔ وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ: اس سے مراد غصے کی حالت میں رکھنا ہے بے ادبی کے ساتھ پھینکنا مراد نہیں ہے اس لیے کہ یہ نبی کی شان کے لائق نہیں ہے اور اسی طرح اس بات پر بھی صحیح دلیل نہیں ہے کہ اس کے کچھ تختے ٹوٹ گئے تھے اور یہاں پر بنی اسرائیل سے قتادہ نے کچھ اسرائیلی روایات نقل کی ہیں جن کا ابن عطیہ اور امام ابن کثیر رحمہم اللہ نے رد کیا ہے۔ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ: یہ پکڑ نا غصے کی وجہ سے ہے نہ کہ ذلیل کرنے کے لیے اور سورۃ طٰهٰ میں مذکور ہے کہ سر اور داڑھی دونوں تھے لیکن اس میں داڑھی کے پکڑنے پر صراحت نہیں ہے صرف: لَا تَأْخُذْ: ذکر ہے وہ صریح نہیں ہے: ابْنَ أُمَّ: ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کا سگہ بھائی تھا۔ ماں باپ ایک ہی تھے لیکن صرف ماں کا ذکر ترحم کی وجہ سے کیا ہے۔ وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہارون علیہ السلام نے ان لوگوں کے سامنے توحید کا مسئلہ مکمل وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا تھا اسی وجہ سے وہ لوگ ان کے قتل کے درپے ہوئے تھے اس کا بیان سورۃ طٰہٰ آیت 10 میں ذکر ہو چکا ہے: تُشْمِتْ: دشمن کی بری حالت دیکھ کر اس پر خوشی کے اظہار کو: شَمَاتَةٌ: کہتے ہیں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اگر موحد لوگ باہم اختلاف کریں گے تو یہ مشرکین کے لئے خوشی کا سبب بنے گا اس وجہ سے یہ اختلاف حرام ہے۔

تفسیر 151 یہ دعا ہے اس بارے میں کہ اگر موسیٰ علیہ السلام سے غصے کی حالت میں کوئی غلطی ہوئی ہو یا ہارون علیہ السلام سے قوم کی اصلاح کی کوشش میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو اس کی معافی طلب کی گئی ہے یہ اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ دونوں نے گناہ کیا ہو۔

تفسیر 152 اس آیت میں زجر ہے ان بنی اسرائیل کے لئے جنہوں نے بچھڑے کی عبادت سے توبہ نہیں کی تھی مثلاً سامری اور اس کے ساتھی اور وہ بنی اسرائیل جو اس عمل پر راضی تھے۔ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ: امام مالکؒ سے روایت ہے کہ مفترین سے مراد مبتدعین ہیں اور یہ بدعتی کو ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ابن کثیر رحمہ اللہ نے حسن بصری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ذلت ہمیشہ ان پر سوار رہے گی اگر چہ یہ ترکی گھوڑوں پر ہی کیوں نہ سوار ہوں۔ ابوقلابہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ قیامت تک ہر بدعتی اس میں شامل ہے ان لوگوں پر جو غضب اور ذلت طاری ہوئی اس کے دیگر اسباب سورہ بقرہ آیت 61 اور آل عمران آیت 112 میں مذکور ہیں۔

تفسیر 153 یہ آیت شرک کے بعد توبہ کی طرف ترغیب ہے۔ مِنْ بَعْدِهَا: میں توبہ کی قرب کی طرف اشارہ ہے یعنی مرنے

سے قبل: وَاٰمَنُوْا: اس میں اشارہ ہے کہ: السَّیِّاٰتِ: میں کفر اور شرک شامل ہے اور توبہ پر استقامت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ دوسرا مِنْۢ بَعْدِهَا: میں ضمیر توبہ کی طرف راجع ہے۔

تفسیر 154 یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو تختیاں رکھ دی تھیں وہ سب دوبارہ اٹھا لیں معلوم یہ ہوا کہ کوئی تختی ٹوٹی نہیں تھی اس لئے کہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ اگر معرفہ کو دوبارہ لایا جائے تو بعد والا بعینہ پہلے والا ہی مراد ہوتا ہے چنانچہ جو: سَكَتَ: سُكُوتٌ: سکون اور زوال کو کہتے ہیں یہ غضب کی صفت ہوسکتی ہے: سَكَتَ: ترک کلام کے معنی میں ہوتا ہے مگر یہاں وہ معنی مراد نہیں ہے: يَرْهَبُوْنَ: اشارہ ہے کہ رھبت کتاب اللہ کو اپنانے کا سبب ہے نُسْخَتِهَا: اس میں اشارہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو لکھی ہوئی کتاب (تختیوں کی صورت میں) دی گئی تھی۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي
الْمُفْتَرِينَ (152) وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (153) وَ
لَمَّا سَكَتَ عَن مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ (154) وَ
اخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا ۖ فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن
قَبْلُ وَإِيَّايَ ۖ أَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا ۖ إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَن تَشَاءُ وَتَهْدِي مَن
تَشَاءُ ۖ أَنتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ۖ وَأَنتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ (155) وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي
الْآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ۚ قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ ۖ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا
لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ (156) الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ
الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ
لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ
وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (157)

"بیشک وہ لوگ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی عنقریب ان کو پہنچے گا ان کے رب کی طرف سے غضب اور رسوائی دنیا کی زندگی میں اسی طرح ہم جھوٹ بنانے والوں کو بدلہ دیتے ہیں [155] ۔اور چن لیا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے ستر آدمیوں کو ہمارے مقرر وقت کے لیے جب ان کو زلزلے نے آ پکڑا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے میرے رب اگر ان کو تو ہلاک کرنا چاہتا اور مجھے بھی اس سے پہلے ہلاک کرتا کیا ہمیں اس عمل کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے جو ہم میں سے بیوقوفوں نے کیا ہے۔نہیں ہے یہ مگر تیرا امتحان ہے تو گمراہ کرتا ہے اس کے ذریعے سے جسے چاہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے تو ہمارا مددگار ہے تو ہمیں معاف کرنا اور ہم پر رحم کرنا اور تو بہتر معاف کرنے والا ہے اور ہمیں اس دنیا میں نیک کاموں کی توفیق دینا اور آخرت میں (اچھا بدلہ) بیشک ہم تیری طرف توبہ کر چکے ہیں اور لکھ دے ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھی یقیناً ہم نے تیری طرف رجوع کیا فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) عذاب پہنچاتا ہوں میں جسے چاہوں اور میری رحمت ہر چیز

کو پہنچ چکی ہے میں ضرور اپنی رحمت ان لوگوں کے لیے مختص کروں گا جو خود کو شرک سے بچاتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں[156]۔ وہ لوگ جو اُمّی نبی کی اتباع کرتے ہیں جس کو وہ لوگ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ ان کو نیک کاموں کا حکم دیتا ہے اور ان کو برائی کے کاموں سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور ان پر گندی چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ اور ان سے ان کے بھاری حکموں کو ہٹاتا ہے اور وہ سخت سزائیں جو ان پر ہوتی ہیں پس جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور اس کا ساتھ دیا اور اس کی مدد کی اور اس نور کی اتباع کی جو اس پر نازل کیا گیا۔ یہی لوگ کامیاب ہیں"[157]۔

تفسیر155 اس آیت سے 168 آیت تک چھٹا مقام ہے(۱) اس میں دوسرے میقات کا اور(۲) عذاب کے نزول کا ذکر ہے(۳) موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے۔(۴) پھر آخری نبی کی صفات اور اس کی رسالت کا ذکر ہے(۵) پھر انعامات اور عذاب کی تفصیل ہے۔ اس زلزلے کا سبب سورۃ بقرۃ آیت 55 میں ملاحظہ ہو اوپر کی طرف سے ان پر کڑک اور نیچے کی طرف سے زلزلہ آیا یا رجفہ سے مراد کڑک کی وجہ سے ان کے دلوں کا ہل ہو جانا ہے: قَوْمَهُ: یہاں پر مِنْ پوشیدہ ہے یا یہ سَبْعِيْنَ: عطف بیان ہے یا قوم سے بدل ہے پھر مِنْ کے مقدر ہونے کی ضرورت نہیں ہے: لِمِيْقَاتِنَا یہ دوسرا میقات ہے۔ اس میں بچھڑے کی عبادت سے توبہ کے طریقے سیکھنے کا ذکر ہے لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ: مقصد یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی تو نے ان کو ہلاکت سے بچایا تھا تو اب بھی ان کو ہلاکت دائمہ سے بچانا یعنی ان کو زندہ کر دے یہ ان کے زندہ کرنے کے لیے سفارش ہے: بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ: یہ موسیٰ علیہ السلام کا اجتہاد تھا اور اس عذاب کی نسبت ان کی طرف کی کیونکہ انہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی یا سُفَهَاءُ: سے مراد ان ستر آدمیوں میں سے بعض لوگ ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کا مطالبہ کیا تھا جبکہ باقی لوگوں نے خاموشی اختیار کی لہٰذا عذاب سب پر آیا۔ اِنْ هِيَ ضمیر هِيَ کی سُفَهَاءُ: کے فعل کی طرف راجع ہے فتنہ کی تاویل کے ساتھ: خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ: یعنی تو تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے اور شرمندہ کرنے کے بغیر معاف کرتا ہے اور اس دعا کے بعد یہ کہ وہ لوگ زندہ ہو گئے تھے جیسے سورۃ بقرہ آیت 56 میں ہے۔

تفسیر156 حَسَنَةً: سے مراد نیک اعمال کی توفیق ہے اور دنیا کی وہ زندگی جو آخرت کے لیے صرف کی ہو عَذَابِیْ میں اشارہ ہے کہ گناہ کی وجہ سے پکڑنا اور معاف کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے: رَحْمَتِیْ: یعنی عذاب سے بچانا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ اس سے مراد عام دنیاوی رحمت ہے۔ اسی طرح سورۃ مومن آیت 2 میں ہے: وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ

: بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابلیس نے کہا کہ میں بھی اس کی رحمت کی امید رکھتا ہوں تو اس پر
:فَسَاَکْتُبُھَا: کے ذریعے اس کی بات کورد کر دیا گیا پھر یہود ونصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ یہ صفات ہم میں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے
بعد والی آیت نازل کی جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت آخری امت کے ساتھ خاص کی گئی ہے اور اس تخصیص کی وجہ یہ صفت ہے
:اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ :اسی طرح سورۃ انعام آیت 12 اور آیت 54 میں گزر چکا ہے۔
یَتَّقُوْنَ: اس سے مراد شرک کی تمام اقسام، کفر اور کبیرہ گناہوں سے بچنا ہے:وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ: بنی اسرائیل پر زکوۃ کا ادا
کرنا بہت مشکل تھا اس وجہ سے اس کی تخصیص کر لی امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے مراد عام ہے چاہے مال کی
زکوۃ ہو یا نفس کی:بِاٰیٰتِنَا: اس سے مراد تمام نازل شدہ احکام ہیں جو تورات، انجیل یا قرآن میں تھے۔

تفسیر 157 جب یہود ونصاریٰ کا یہ دعویٰ تھا کہ گزشتہ تین صفات ہم میں موجود ہیں لہٰذا رحمت ہمارے لئے خاص ہے تو یہ
صفت ذکر کی تاکہ وہ لوگ اس سے خارج ہو جائیں۔ اس آیت میں آخری نبی کی دس صفات مذکور ہیں اسی طرح صفات
تورات اور انجیل میں بھی مذکور تھیں رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام لانے کے اعتبار سے ہے اور نبی امت کو خبریں دینے
اور بلند مرتبے کے اعتبار سے ہے اور اُمّی: آپ کی مدح کی صفت ہے۔ یہ کسی اور کے لیے مدح کی صفت نہیں بن سکتی۔
اس صفت میں معجزہ ہے۔ جس کی تفصیل کی وجوہات تفسیر سراج المنیر نے لکھی ہیں۔ دوسرا قول: یہ ہے کہ: اُمّی اُمّ
الْقُرٰی: کی طرف منسوب ہے:یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا: یعنی اس کے نام اور صفات اس پر مسند احمد کی حدیث میں دلیل ہے
جس کی سند کو امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے جید کہا ہے اس روایت کو شیخ شعیب ارناؤوط نے ضعیف کہا ہے البتہ امام بیہقی
نے دلائل الصلوۃ میں جید سند سے روایت نقل کی ہے 385/1 یہود ونصاریٰ نے اگرچہ اس کی تحریف میں بہت کوششیں
کی ہے لیکن پھر بھی ایسی عبارات موجود ہیں جو نبی آخر الزمان کی رسالت پر دلالت کرتی ہیں:یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ
:عطاء رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ:مَعْرُوْفِ: میں شرکیات کا چھوڑنا اور اچھے اخلاق اور صلہ رحمی کرنا بھی داخل ہے اور منکر
میں تمام شرکیات اور قطع رحمی داخل ہیں:مَعْرُوْفِ: وہ چیز ہے جس کی کتاب اور سنت سے اچھائی معلوم ہو اور منکر وہ چیز
ہے جو دلیل شرعی کے مخالف ہو:یُحِلُّ: حلال اور حرام کی نسبت نبی ﷺ کی طرف بطور بیان ہے نہ کہ بطور تشریع ہے اس
کی دلیل (صحیح بخاری کتاب الجہاد حدیث 3110 صحیح مسلم کتاب المساجد حدیث 565)
علی رضی اللہ عنہ کا ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں ہے اور صحیح مسلم حدیث ج 1 ص 209 میں ابن

کھانے کے بارے میں: اَلطَّیِّبَاتِ: سے مراد وہ چیزیں ہیں کہ مشرکین اور یہود ونصاریٰ نے خود بلا دلیل کے حرام کی تھیں جن کو غیر اللہ کی تحریم کہا جاتا ہے اور: خَبَائِثَ: سے مراد خنزیر کا گوشت وغیرہ ہے جو یہود ونصاریٰ نے اپنے لیئے حلال کیا تھا یا اس سے مراد عام ہے امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ جو چیز شرعاً حلال ہو تو وہ طیب ہے اور جو چیز شرعاً حرام ہو وہ خبیث ہے دین اور بدن کو ضرر دینے والی ہے: اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ: ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اصر ان گناہوں کو کہا جاتا ہے جو بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے یا اس سے مراد مشکل اعمال ہیں اور وَ الْاَغْلٰلَ: سے مراد ان کی برے اعمال کی وجہ سے سخت سزائیں ہیں: وَعَزَّرُوْهُ: اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے دین کی حفاظت ہے مشرکین اور مبتدعین کا رد ہے: وَنَصَرُوْهُ: اس سے مراد جہاد اور قتال سے رسول اللہ کے دین کی اشاعت ہے خلاصہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعاء نے جو پہلی آیت میں مذکور ہے اس کی قوم کو بھی فائدہ پہنچایا لیکن خاص فائدہ نبی ﷺ کی امت کو دیا۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي
وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿158﴾
وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿159﴾ وَقَطَّعْنَاهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا ۚ وَأَوْحَيْنَا
إِلَىٰ مُوسَىٰ إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُ أَنِ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ
كُلُّ أُنَاسٍ مَشْرَبَهُمْ ۚ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا
رَزَقْنَاكُمْ ۚ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿160﴾ وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اسْكُنُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا
حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَاتِكُمْ ۚ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿161﴾

"آپ فرما دیجئے اے لوگو بیشک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول (بھیجا گیا) ہوں (بیان کرتا ہوں) کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی (خاص) ہے بندگی کا حقدار اس کے علاوہ کوئی نہیں زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤں اور اس کے رسول ﷺ پر جو اُمّی نبی ہے اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر ایمان لاؤ اور اس کی اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پاؤں [158]۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے ایک گروہ جو حق کو بیان کرتا ہے (حق کی طرف دعوت دیتا ہے) اور اسی حق پر فیصلے کرتا ہے [159]۔ اور ہم نے ان کو بارہ خاندانوں میں (مختلف جماعتوں میں) تقسیم کیا اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی جب اس سے اس کی قوم نے پانی طلب کیا کہ اپنی لاٹھی اس پتھر پر مارو اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ یقیناً ہر گروہ نے پانی پینے کی اپنی جگہ جان لی اور ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ بنایا اور ہم نے ان پر من وسلویٰ نازل کیا (ہم نے کہا) ان مزیدار چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا تھا لیکن وہ اپنے نفسوں پر خود ظلم کرتے تھے [160]۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ اس بستی میں رہو اور اس سے کھاؤ جہاں سے تم چاہو لفظ حِطّۃ کہو اور دروازے میں سر جھکاتے ہوئے داخل ہو جاؤ تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے ہم اچھے عمل کرنے والوں کو ضرور زیادہ اجر سے نوازیں گے" [161]۔

تفسیر 158 جب نبی ﷺ کی صفات ذکر ہوئیں تو اب رسالت کا مقصد ذکر کرنے کے لیے دعوت عامہ کا ذکر ہے جو توحید ہے۔ ہدایت کے حصول کے لیے اس پر ایمان اور اس کی اتباع کا حکم ہے۔ اس آیت میں آخری نبی ﷺ کی عام

رسالت کا بیان ہے کہ یہود و نصاریٰ وغیرہ اور تمام انسانوں کے لیے قیامت تک وہ رسول ہیں۔ اس طرح سورۃ آل عمران آیت 30 اور سورۃ انعام آیت 19 میں ہے اور اَلَّذِیۡ لَہٗ : سے توحید کے اس مسئلے کا بیان مراد ہے جس کے لئے نبی ﷺ کو بھیجا گیا ہے پہلا توحید ربوبیت اور دوسرا توحید الوہیت ہے: اَلْاُمِّیِّ : صفت اس وجہ سے ذکر کی کہ یہ آخری نبی کی خاص صفت ہے: یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ : یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کا مکلف ہے۔ اسی طرح اس نبی کا عقیدہ بھی اپنی دعوت کے ساتھ موافق ہے۔ فائدہ: اس آیت میں ایمان کو اتباع کے ساتھ ہدایت کا سبب قرار دیا گیا تو معلوم ہوا کہ اتباع کے بغیر صرف نبی کی تصدیق فائدہ نہیں دیتی۔

تفسیر 159: اس آیت میں اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل میں بھی ایسے لوگ ہیں جو کہ آخری نبی کے پیروکار ہیں اور یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھے، اس طرح نبی آخری الزمان کے زمانہ میں بھی بعض لوگ تھے۔

تفسیر 160: جب آخری نبی ﷺ کی عام رسالت اور اس کی دعوت کا ذکر ہوا تو اب بنی اسرائیل آیت 168 تک کی آیات میں ترغیب و تخویف کے لیے تذکیر بِالنِّعَمِ وَالنِّقَمِ : کی جارہی ہے۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کو چار انعامات کے ساتھ تذکیر ہے۔ پہلا انعام تنظیم کے لیے ان کا بارہ جماعتوں میں تقسیم ہونا۔ بنی اسرائیل یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد تھے اور ہر ایک سے مستقل خاندان اور جماعت بن گئی اور ہر جماعت کا الگ الگ نقیب تھا تو کثرت کے باوجود یہ تنظیم انعام تھا۔ دوسرا انعام پتھر سے پانی نکالا۔ تیسرا انعام بادلوں کا سایہ بنانا۔ چوتھا انعام مَنّ اور سَلْوٰی نازل کیا: فَانۡۢبَجَسَتۡ اِنۡۢبِجَاسٌ : تھوڑے تھوڑے پانی نکلنے کے معنی میں ہے اور اِنۡفِجَارٌ : زیادہ پانی کے نکلنے کے معنی میں ہے۔ پہلے پانی کم مقدار میں پھر زیادہ ہوا۔ ان انعامات کا ذکر سورۃ بقرہ آیت 60 اور 57 میں گزر چکا ہے: اِثۡنَتَیۡ عَشۡرَۃَ حال ہے اور اَسۡبَاطًا : حال سے بدل ہے اور: اُمَمًا اَسۡبَاطًا : کی صفت ہے۔ فائدہ: سورۃ بقرہ میں انعامات کی تفصیل مقصود تھا تو انعام کے کمال کے لیے وہاں: اِنۡفِجَارٌ : اور یہاں: اِنۡۢبِجَاسٌ : ذکر ہوا۔

تفسیر 161: اس میں پانچویں انعام کا ذکر ہے جو چار امور پر مشتمل ہے دو انعام ہیں اور دو احکام اس کی تفسیر سورۃ بقرہ آیت 58 میں گزر چکی ہے سورۃ بقرہ میں داخل ہونا ذکر ہوا تھا اور یہاں پر رہنا ذکر کیا اس لیے کہ داخل ہونا رہنے سے پہلے ہے اور ترتیب قرآنی میں سورۃ بقرہ اس سورۃ سے پہلے ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝
وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ
لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ
مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا
الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْۗءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَـِٔيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ
قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝

"تو ظالموں نے بات تبدیل کرلی۔ اُس بات کے علاوہ جو ان سے کہی گئی تھی ہم نے ان پر آسمان کی طرف سے سخت عذاب بھیجا بسبب اس کے کہ وہ ظلم کر رہے تھے[162]۔ اور ان سے پوچھیں اس بستی کے بارے میں جو سمندر کے کنارے آباد تھی۔ جب وہ لوگ (شرعی حد سے) ہفتے کے دن میں تجاوز کر رہے تھے جب ان کے پاس ان کی مچھلیاں ہفتے کے دن کھل کر آتیں اور جب ہفتے کا دن نہ ہوتا تو ان کے پاس مچھلیاں نہیں آتیں اس طرح ہم ان کو آزماتے تھے بسبب اس کے جو وہ نافرمانی کرتے تھے[163]۔ اور جب ان میں سے ایک جماعت نے کہا تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ تعالی ہلاک کریگا (دنیا میں) یا ان کو سخت عذاب دیگا (آخرت میں) انہوں نے کہا یہ تو تمہارے رب کی طرف عذر پیش کرنا ہے اور امید ہے کہ یہ لوگ (اس گناہ سے) بچ جائینگے[164]۔ تو جب انہوں نے اس نصیحت (حکم) کو بھلایا ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو برائی سے منع کیا کرتے تھے اور ہم نے ظالموں کو سخت عذاب کے ذریعے پکڑا اس وجہ سے کہ وہ لوگ نافرمانی کرتے تھے[165]۔ جب انہوں نے اس حکم کی نافرمانی کی جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے کہا ہو جاؤ تم ذلیل بندر"[166]۔

تفسیر 162 یہ پہلے عذاب کے ذریعے نصیحت ہے اس کی تفسیر سورۃ بقرہ آیت 59 میں ہے۔ اس عذاب کا سبب شرعی قول اور شرعی عمل کو تبدیل کرنا ہے اس میں اور سورہ بقرۃ آیت 59 میں عبارت کا اختلاف آٹھ طریقوں سے ہے جس کی تفصیل سورۃ بقرہ میں مذکور ہے۔

تفسیر 163 یہ دوسرے عذاب کے ذریعے تذکیر ہے جس کا سبب حیلہ کرنا تھا۔ اس قصے کو یہودی شرم کی وجہ سے چھپایا

کرتے تھے تو اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَسْـَٔلْهُمْ : اس بستی کا نام ایلہ تھا اب اس کو عقبہ داؤد کہا جاتا ہے اس آیت میں اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ امتحان لیتا ہے تو حرام چیزیں زیادہ اور حلال کم کردیتا ہے۔ دوسرا اس میں اشارہ ہے کہ شرعی احکام میں حیلے کرنے کو عدوان کہا جاتا ہے اور یہ حرام ہے۔ اہل علم کہتے ہیں کہ ہر وہ حیلہ جو حکمت شرعیہ کو باطل کرتا ہے یا اس کے ذریعے سے انسان حرام کو پہنچتا ہے تو وہ بالاتفاق جائز نہیں ہے موجودہ زمانے میں اس کی مثال میت کی طرف سے ایک خاص رسم کے طور پر رقم تقسیم کرنا ہے جسے اسقاط کہا جاتا ہے اس کے ساتھ شرعی حکمت کو نقصان پہنچتا ہے وہ نقصان یہ ہے کہ لوگ شرعی احکام کی نافرمانی میں دلیر ہوجاتے ہیں کہ معافی کی یہ صورت موجود ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ روزوں کا شرعی فدیہ فقیروں کا حق ہے اور اس حیلے کی وجہ سے مولوی اس کا لینا جائز سمجھتے ہیں تو یہ حیلہ حرام اور بدعت ہے۔ اس طرح سورۃ بقرہ آیت 56 میں گزر چکا ہے: وَاسْـَٔلْهُمْ : سوال سے ان کی تذلیل اور ان کے گناہوں کو افشا کرنا مقصود ہے اس آیت میں نبی کریم ﷺ کی سچائی پر دلیل ہے کہ وہ اُمّی تھا کہ یہ واقعہ نہ کسی سے سنا تھا اور نہ پڑھا تھا اور یہودیوں کے علماء کو یاد دلایا حَاضِرَةَ الْبَحْرِ : اس سے مراد بحر قلزم ہے اور حَاضِرَةً : سے مراد کنارہ ہے اس لیے حضور غیب کا نقیض ہے اسی وجہ سے غائب شخص کو حضور اور حضرت کہنا بھی شرک کا وہم پیدا کرتا ہے۔

تفسیر 164 یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ان لوگوں میں تین گروہ بن گئے تھے ایک گروہ اس حیلے سے منع کرتا تھا اور ایک جماعت ان کو اس مسئلے کی تبلیغ سے منع کرتی تھی تو پہلے گروہ نے جواب دیا کہ اس کے بیان کرنے میں دو فائدے ہیں پہلا فائدہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی ذمہ داری ادا کرنی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نجات ملے۔ دوسرا فائدہ امید ہے کہ یہ لوگ سمجھ جائیں اور اس گناہ سے خود کو بچالیں۔ تیسرا گروہ یہ تھا کہ حیلہ کیا کرتے تھے تو آیت 163 میں حیلہ بازی کا ذکر تھا اور 164 میں دوسرے گروہ کا ذکر تھا (جو وعظ کرنے سے صراحتاً روکتا تھا) اور تیسرا گروہ اس میں ضمناً مذکور ہے: مَعْذِرَةً یہ دلیل ہے کہ نہی عن المنکر فرض ہے اگرچہ سننے والے اس پر عمل نہ کرتے ہوں اور غیر ضروری عذر پیش کرتے ہوں۔

تفسیر 165 یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عذاب سے صرف پہلا گروہ بچ گیا تھا اور دوسرے گروہ پر بھی سخت عذاب آیا ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو اس آیت میں: الَّذِينَ ظَلَمُوا : سے مراد دوسرا گروہ ہے یہ قول امام قرطبی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اگرچہ ان سے اس کے خلاف بھی روایت مروی ہے۔

تفسیر 166 اس آیت میں تیسرے گروہ کے عذاب کا ذکر ہے اوران کا جرم پہلے گروہ سے زیادہ تھا اس لیے اس کے بارے میں لفظ عَتَوْا : فرمایا اوران کا عذاب ان سے سخت تھا جب حیلے کے ساتھ دین کو مسخ کیا گیا تو عذاب بھی اسی مناسبت سے مسخ کرنے کا دیا گیا۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

"اور جب آپ کے رب نے اعلان کیا کہ ضرور بھیجے گا ان پر قیامت تک ایسے لوگوں کو جو ان کو برے عذاب پہنچا ئینگے بے شک آپ کا رب جلد عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ ضرور معاف کرنے والا مہربان ہے [167]۔ اور ہم نے ان کو زمین میں متفرق کر دیا مختلف جماعتوں میں۔ ان میں سے بعض نیک تھے بعض اس کے علاوہ تھے اور ہم نے ان کو خوشیوں اور تکلیفوں کے ساتھ آزمایا تاکہ یہ لوگ (نافرمانی سے) بچ جائیں [168]۔ ان کے بعد نااہل جانشین ہوئے انہوں نے میراث میں کتاب (تورات) لی وہ لیتے (حرام) مال اس ذلیل زندگی کا اور کہتے ہیں کہ ہمیں ضرور معاف کیا جائیگا اور اگر ان کے پاس اسی طرح حرام مال مزید آئے تو وہ بھی لیتے ہیں کیا ان سے پختہ وعدہ کتاب میں نہیں لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہیں کہو گے مگر صرف حق بات اور انہوں نے ان احکام کو پڑھا جو اس کتاب میں ہیں اور آخری گھر (جنت) بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو خود کو شرک سے بچاتے ہیں تو کیا تم عقل نہیں رکھتے" [169]۔

تفسیر 167 اس آیت میں ان لوگوں کے لئے تخویف اخروی جو کتاب اللہ کو حیلوں کے ذریعے تبدیل کرتے ہیں کہ ان پر ایسے حکمران مسلط ہو جائینگے جو ان کو ذلیل کرینگے اور ان سے جزیہ لینگے جیسے ان پر یونان والے کلدانیین مسلط ہوئے تھے پھر کلدانیین پھر نصاریٰ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اور پھر آخر میں عیسیٰ علیہ السلام کو مقرر کیا گیا ہے۔

تفسیر 168 اس آیت میں بھی دنیاوی خوف ہے کہ اس گناہ کے بعد ان میں مختلف گروہ بن گئے تھے اور زمین میں بھی مختلف علاقوں میں تقسیم ہو گئے تاکہ ایک ساتھ نہ ملیں اور ان میں اتفاق نہ آئے۔ تو یہ بھی عذاب کی شکل ہے۔ ان پر انعامات اور

عذاب کے ذریعے سے امتحان ہوا۔

تفسیر 169 یہاں سے آخر تک اس حصے کا آخری باب ہے اس میں یہودیوں کے ایک قول کو چار طریقوں سے رد کیا گیا ہے اور پھر جو آیتیں ہیں وہ سورۃ کے تینوں دعووں سے تعلق رکھتی ہیں اور اس میں سات زواجر ہیں اور شرک کا تفصیلاً رد ہے اور آخر میں دعوت الی اللہ کے آداب ہیں۔ اس آیت میں ان کے بڑوں کا حال بیان کرنے کے بعد۔ بعد والے لوگوں کا ذکر ہے : خَلْفٌ لام کے سکون کے ساتھ نااہل جانشینوں کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ بعد والے مذہبی رہنماؤں کے ذریعے سے حرام مالوں کو کھاتے اور کہتے کہ یہ ہمارے لئے حلال ہے اس لیے کہ ہم معاف کئے گئے ہیں جیسے اس امت میں بھی بعض پیر اور مولوی حرام کھاتے ہیں اور بہانہ یہ بناتے ہیں کہ یہ ہمارے لئے ہمارے مرتبے کی وجہ سے حلال ہے۔ مفسر آلوسی رحمہ اللہ نے اس آیت کی شرح میں بعض پیروں اور صوفیوں کا حال ذکر کیا ہے : عَرَضٌ : را کے فتحہ کے ساتھ دنیا کے تمام سامان کو کہا جاتا ہے اور را کے سکون کے ساتھ پیسوں اور اشرفیوں کے بغیر سامان کو کہا جاتا ہے : اَلَمْ يُؤْخَذْ یہ ان کے قول کا پہلا رد ہے کہ اگر ان کو معاف کیا گیا ہے تو ان سے یہ عہد کیوں لیا گیا : اِلَّا الْحَقَّ : گناہ کے باوجود اپنے گناہ کی مغفرت کا قطعی حکم لگانا یہ ناحق بات ہے : دَرَسُوْا الخ میں اشارہ ہے کہ یہ اہل کتاب علماء کا حال ہے : وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ آیت کی ابتداء میں ان کی دنیا پرستی کا ذکر کیا تو آخر میں آخرت کی طرف ترغیب ذکر کی۔

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

" اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی کتاب پر عمل کرتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں ہم ایسے اصلاح (نیکی) کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے [170]۔ اور جب ہم نے ان پر پہاڑ اٹھایا گویا کہ یہ سایہ بان تھا اور انہوں نے یقین کرلیا کہ یہ ان پر گرنے والا ہے (ہم نے کہا) مضبوطی سے تھام لو جو ہم نے تمہیں دیا اور اس کو یاد کرو جو اس کتاب میں ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ" [171]۔

تفسیر 170 اس آیت میں صالحین کا ذکر ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ جو اللہ کی کتاب پر عمل کرتے ہیں اور اس کو بیان بھی کرتے ہیں اور نماز کے پابند ہوں تو یہ نیکی کی طرف دعوت دینے والا کام ہے اور تمسک بالکتاب کی واضح نشانی ہے اور یہ لوگ اصلاح کرنے والے ہیں اگرچہ مخالفین ان کو فسادی کہتے ہیں۔

تفسیر 171 یہ ان کے قول کا دوسرا رد ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں معاف کیا گیا ہے تو تمہارے بڑوں پر عہد لینے کے وقت پہاڑ کیوں اٹھایا گیا تھا اور وہ عہد کرنے پر مجبور ہوئے تھے پھر یہ آیت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ یہ پہاڑ حقیقت میں ان پر اٹھایا گیا تھا اور اسی طرح سورۃ بقرہ آیت 63 اور 93 میں مذکور ہے: نَتَقْنَا : لغت میں کسی چیز کو جڑ سے اکھیڑنا اور پھینکنا ہے اور یہاں پر مراد اُٹھانا ہے اس کی دلیل فَوْقَ اور ظُلَّةٍ ہے ظُلَّةٌ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو سایہ کرتی ہو چاہے وہ گھر کی چھت ہو یا بادل ہو یا سایہ بان ہو۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ ۚ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ أَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿172﴾ أَوْ تَقُوْلُوٓا إِنَّمَآ أَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ ۖ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿173﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿174﴾

"اور جب تمہارے رب نے لیا آدم علیہ السلام کی اولاد کی پشت سے ان کی اولاد ان کو اپنے نفسوں پر گواہ بنادیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں انہوں نے کہا کیوں نہیں ہم گواہی دیتے ہیں (تو ہم نے یہ وعدہ یاد دلایا) کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ بیشک ہم اس (توحید) سے غافل تھے [172]۔ یا تم یہ نہ کہو کہ ہمارے بڑوں نے اس سے پہلے شرک کیا تھا اور ہم ان کے بعد (ان کی) اولاد تھے کیا تو ہمیں اس کام کی وجہ سے ہلاک کرے گا جو باطل پرست لوگوں نے کیا ہے [173]۔ اور اسی طرح ہم تفصیلی آیتیں بیان کرتے ہیں۔ (ان کی یادداشت کے لیے) اور تا کہ یہ لوگ حق کی طرف پلٹ جائیں" [174]

تفسیر 172 یہ ان کے قول کا تیسرا رد ہے اگر تمہیں معاف کیا گیا تھا تو تم سے توحید کا یہ عہد کیوں لیا جاتا اور پھر اس کو انبیاء اور کتابوں کے ذریعے سے کیوں یاد دلایا جاتا۔ اس آیت میں عالم ارواح کے وقت وعدہ مراد ہے اس کے بارے میں اگرچہ مرفوع صحیح حدیث نہیں ہے لیکن موقوف صحیح حدیث (مسند احمد 1/ 272 مستدرک حاکم 1/ 27 نسائی فی الکبریٰ 11191 شیخ البانی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے سلسلۃ الصحیحۃ 1623 صحیح جامع الصغیر 1701) اور اس باب میں موقوف حدیث مرفوع حدیث کی طرح قبول ہوتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے اس کی اولاد باریک چیونٹیوں کی شکل میں ظاہر کی تھی اور ان سے یہ عہد لیا گیا تھا بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ مراد لیا ہے کہ ہر بچے

کا توحید پر پیدا ہونا اور اسی سے عہد لینے کی طرف کنایہ کیا گیا ہے پہلی تفسیر کی بنیاد پر بنی آدم سے مراد آدم علیہ السلام ہے یا یہ کہ اس وقت ان کو اس طرح پیدا کیا جیسے بعد میں سلسلے وار پیدا کیا لیکن یہ قول صریح حدیث کے خلاف ہے اور پہلے قول پر بھی اعتراض ہے کہ یہ فصیح کلام کیخلاف ہے کہ آدم کے بجائے بنی آدم ذکر کیا ہے تو عزالدین بن عبدالسلام نے توجیہہ ذکر کی ہے کہ: اَشۡهَدَهُمۡ : حال ہے اس میں لفظ قَدۡ: مقدر ہے اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی اولاد کی پیٹھ سے یہ اولاد لی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے (امت) تک حالانکہ ان کو اس دن اپنے نفسوں پر گواہ بنایا تھا اس توجیہہ میں آیت کے ظاہر اور موقوف دونوں پر عمل ہوگا اور یہ بہتر قول ہے۔

تفسیر 173 اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر بڑوں سے عہد نہ لیا جاتا اور رسول اللہ کے ذریعے یاد داشت نہ دی جاتی تو یہ لوگ دو بہانے بنایا کرتے ایک غفلت (بے خبری) اور دوسرا انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کے بعد بھی بڑوں کی تقلید کرنا لہٰذا رسولوں کے آنے کے بعد کسی کا جہل عذر نہیں ہے اور اسی طرح تقلید بھی جائز نہیں ہے۔

تفسیر 174 یہ بھی ماقبل کی تاکید ہے یعنی آیتوں کی تفصیل غفلت ختم کرنے اور تقلید سے رجوع کرنے کا سبب ہے۔

وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ الَّذِىۡۤ اٰتَيۡنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنۡهَا فَاَتۡبَعَهُ الشَّيۡطٰنُ فَكَانَ مِنَ الۡغٰوِيۡنَ ۝ وَلَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰهُ بِهَا وَلٰـكِنَّهٗۤ اَخۡلَدَ اِلَى الۡاَرۡضِ وَاتَّبَعَ هَوٰٮهُ‌ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الۡـكَلۡبِ‌ ۚ اِنۡ تَحۡمِلۡ عَلَيۡهِ يَلۡهَثۡ اَوۡ تَتۡرُكۡهُ يَلۡهَث‌ ؕ ذٰ لِكَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا‌ ۚ فَاقۡصُصِ الۡقَصَصَ لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ ۝

"اور پڑھ کر سنائیں ان کو اس شخص کی خبر کہ جس کو ہم نے اپنی آیتوں کا علم دیا تھا وہ ان سے نکل گیا تھا (علم چھوڑنے کی وجہ سے) تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا وہ گمراہوں میں سے ہوا [175]۔ اگر ہم چاہتے تو اس کے مرتبے کو ضرور (آیتوں پر عمل کرنے سے) بلند کرتے لیکن وہ دنیا کی طرف جھک گیا اور اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا اس کی مثال اس کتے کی مانند ہے اگر آپ اس پر بوجھ لاد دیں تو تب بھی ہانپتا ہے اور اگر چھوڑ دیں تب بھی ہانپتا ہے یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ اس قصے کو بیان کریں تاکہ یہ لوگ غور وفکر کریں۔ بہت بری مثال اس قوم کی ہے جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے" [176]۔

تفسیر 175 یہ ان کے قول کا چوتھا رد ہے اگر تمہیں معاف کیا گیا تو پھر کیا وجہ ہے کہ تمہارا عالم بدعملی کی وجہ سے کتے کی طرح

ہے۔بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ اس عالم سے مراد بلعام بن باعورۃ تھا یہ بہت بڑا عالم تھا بارہ ہزار شاگرد اس کے درس میں ہوا کرتے تھے اور ایمان کی طرف دعوت دیتا تھا لیکن اس وقت ایک بادشاہ نے اس کو مال کا لالچ دیا جس کی وجہ سے اس نے موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت شروع کر دی اور تورات سے منہ پھیر لیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیا میں پہلے اس نے کتاب لکھی تھی اس مسئلہ پر کہ دنیا بنانے والا کوئی نہیں ہے یعنی دنیا قدیم ہے۔اس آیت میں اشارہ ہے کہ شیطان انسان کو اس وقت گمراہ کرتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے منہ پھیر لیتا ہے:اٰیٰتِنَا: اس سے مراد وحی کی آیتیں ہیں یعنی تورات اور اس سے پہلے کی الٰہی کتابوں کا عالم تھا کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے پاس اسم اعظم کا علم تھا مگر اس کی کوئی صحیح دلیل نہیں ہے:فَانْسَلَخَ مِنْهَا۔اِنْسِلَاخ :اصل میں جانوروں کی کھال کو کہا جاتا ہے یا سانپ جب اپنی کھینچلی اتارتا ہے۔یعنی اس نے کتاب اللہ سے انکار کیا اور اس پر عمل چھوڑ دیا:فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ ۔اِتِّبَاع لزوم سے کنایہ ہے یعنی شیطان اس کو گمراہ کرنے میں لگ گیا:اَلْغٰوِیْنَ:عقیدے اور عمل کے گمراہ ہیں۔

تفسیر 176 لَوْ شِئْنَا: میں اشارہ ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے لَرَفَعْنٰهُ بِهَا:عقیدے اور کتاب اللہ پر عمل کرنے کی وجہ سے رفعت ،عزت اور بلند مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔اس آیت میں پہلے اس کے دو گناہ ذکر ہوئے ہیں ایک دنیا سے محبت اَخْلَدَ: میں میلان اور لزوم دونوں داخل ہیں دوسرا خواہش کی پیروی کرنا اور یہ دونوں باقی گناہوں کی جڑیں ہیں۔اس کو لَاهِثٌ کتے کے مشابہ کیا گیا ہے لَهَثٌ :اس کو کہتے ہیں کہ زبان نکالی ہو اور ہانپ رہا ہو جیسے یہ حالت ہر وقت کتے کی ہوتی ہے۔اگر آپ اس کو دھتکاریں یا نہ دھتکاریں تو اسی طرح حال اس عالم کا ہوا کہ اس کو وعظ کیا جاتا یا نہ کیا جاتا وہ اپنی ذلت سے نہیں رکتا تھا:اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ: یہ مشابہت مطلق کتے کے ساتھ نہیں ہے بلکہ وہ کتا جو لَاهِثٌ ہوتا ہے تو شکاری سدھایا ہوا کتا اس سے خارج ہے: كَمَثَلِ الْكَلْبِ :اس میں دو اقوال ہیں پہلا یہ کہ کتے کی شکل میں لَاهِثٌ ہوا یعنی حقیقت میں زبان باہر نکلی۔دوسرا قول یہ صفت میں تشبیہ ہے یعنی لَهَثٌ: دنیا کی زیادہ حرص اور خوراک پر دلالت کرتا ہے۔ فائدہ: مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ مثال اس امت کے ان علماء کو شامل ہے جو قرآن اور سنت پر عمل کو چھوڑ کر اور کفر، شرک، بدعات اور خواہشات میں مبتلا ہو جائیں دنیا کی محبت اور اس کے حصول کے لیے تو وہ اس قسم کے کتے کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں جیسے کتا کسی کے پیچھے بھونکتا ہو تو جب تھوڑی سی خوراک اس کی طرف پھینک دی جاتی ہے تو خاموش ہو جاتا ہے۔اسی طرح اپنے ہم جنسوں پر حملہ کرتا ہے اور اپنی قے کو بھی واپس چاٹتا ہے تو اسی وجہ سے (صحیح بخاری

کتاب الھبۃ حدیث 2622 نسائی کتاب الھبۃ حدیث 3700 ترمذی کتاب البیوع حدیث 1298) کی حدیث میں ان لوگوں کی مثال کتے کے ساتھ دی ہے جو تحفہ یا صدقہ وغیرہ دیں پھر ان سے واپس لیں اور اسی طرح جب یہ کتا چلتا ہے تو منہ نیچے کر کے چلتا ہے۔ اور سونگھتا رہتا ہے اسی طرح یہ بدن کے اعضاء یعنی اپنی دبر کے علاوہ نہیں سونگھتا اور اسی طرح جب پتھر سے مارا جاتا ہے تو پتھر کے پیچھے بھاگ کر اسے کاٹتا ہے اور اسی طرح صاف گوشت بنسبت مردار اس کو بہت پسند ہوتی ہے۔ اور اسی طرح مردار پر اپنے ساتھ دوسرے کتے کو کبھی نہیں چھوڑتا اور اسی طرح جب پیشاب کرتا ہے تو پاؤں اٹھا کر صاف پودے یا پتھر پر پیشاب کرتا ہے تاکہ خود ناپاک نہ ہو جائے اور یہ تمام اوصاف زیادہ حرص اور خباست پر دلالت کرتے ہیں: یَتَفَکَّرُوْنَ: علامہ طیبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جس نے اس زمانے کے برے مولویوں میں فکر کی تو یہ لوگ بلعام سے زیادہ برے مولویوں کو پالیں گے سمعانی رحمہ اللہ نے تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ علماء کے بارے میں بہت سخت آیت ہے اس لیے کہ بہت کم اہل علم ہونگے کہ جو دنیا کی محبت اور خواہش کی پیروی سے خالی ہونگے۔ اے اللہ ہمیں ان خصلتوں سے بچا اور جو بھی یہ آیت حق والوں پر چسپاں کرتے ہیں ان کو ہلاک کر دے۔ (آمین)۔

تفسیر 177 یہ آیت اس مثال کی تعمیم اور تفصیح پر دلالت کرتی ہے۔

سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

"جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے تو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جس کو گمراہ کرے تو یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں [178]۔ اور تحقیق ہم نے جہنم کے لیے بہت سارے جنوں اور انسانوں میں سے پیدا کیے ان کے ایسے دل ہیں کہ ان کے ذریعے سے (حق کو) نہیں سمجھتے اور ان کی ایسی آنکھیں ہیں کہ ان کے ذریعے (حق کو) نہیں دیکھتے اور ان کے ایسے کان ہیں کہ ان کے ذریعے (حق کو) نہیں سنتے یہی لوگ جانوروں کی مانند ہیں بلکہ ان سے زیادہ (ناسمجھ ہیں) اور یہی لوگ غافل ہیں" [179]۔

تفسیر 178 اس آیت کا تعلق سورۃ کے پہلے دعوے سے ہے۔ اسی طرح اس آیت میں دو گروہوں کا ذکر ہے جو مذکورہ مثال سے معلوم ہوتی ہیں نیز اس آیت میں زجر ہے۔

تفسیر 179 اس آیت کا تعلق سورۃ کے دوسرے دعوے سے ہے اور اسی طرح گزشتہ میں جو دوسرا گروہ تھا اس کا حال ذکر کیا اور دوسری وعید ہے۔ سوال: سورۃ الذاریات میں فرمایا ہے کہ جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور اس آیت میں اس کے خلاف مذکور ہوا ہے کہ ان میں زیادہ جہنم کے لیے پیدا کیے ہیں؟۔ جواب: سورۃ الذاریات میں تشریعی غایہ مذکور ہے اور اس آیت میں غایہ تکوینی کا ذکر ہے۔ دوسرا جواب: یہ ہے کہ لِجَهَنَّمَ: میں لام عاقبت کے لیے ہے لَهُمْ قُلُوبٌ: اشارہ ہے کہ ان کے علم کے اسباب برباد ہیں۔ یہ آیت خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ: کی طرح ہے اور اس آیت میں جانوروں کے ساتھ تشبیہ اس بات میں ہے کہ ان کا مقصد بھی صرف کھانا پینا اور جنسی خواہشات کی تکمیل ہے یہی مقصد ان کافروں کا ہے بَلْ هُمْ اَضَلُّ: یہ اس وجہ سے کہ جانوروں میں اس بات کا شعور ہے کہ اپنے نقصان اور فائدے کی جگہوں کو جانتے ہیں اسی طرح اپنے مالکوں کو جانتے ہیں اور ان کے فرمان بردار ہوتے ہیں جبکہ ان لوگوں میں اس طرح کی صفات نہیں ہیں۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝

"اور خاص اللہ کے اچھے اچھے نام (اور صفات) ہیں ان کے ذریعے اللہ سے دعا مانگو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو کجی اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ناموں (اور صفات) میں عنقریب ان کو بدلہ دیا جائیگا ان اعمال کا جو وہ کرتے ہیں [180]۔ اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ایک جماعت بنایا جو حق کو بیان کرتے ہیں اور اسی پر فیصلے کرتے ہیں [181]۔ اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں عنقریب ہم ان کو ایسی جگہ سے کھینچ لینگے جہاں سے وہ نہیں جانتے [182]۔ اور میں ان کو مہلت دیتا ہوں بیشک میرا پکڑنا بہت سخت ہے" [183]۔

تفسیر 180 یہ آیت سورۃ کے تیسرے دعوے کے ساتھ متعلق ہے یعنی حاجت روا صرف ایک اللہ تعالیٰ کو مانو اس کے ساتھ کسی کو پکار میں شریک نہ بناؤ۔ یہ تیسرا زجر ہے۔ اس طرح قرآن میں چار مقامات پر مذکور ہے سورۃ اسراء آیت 110، سورۃ طٰہٰ آیت 8، سورۃ حشر آیت 24 اور یہاں پر اللہ تعالیٰ کے ناموں کو حسنیٰ اس وجہ سے کہا ہے کہ یہ صفات اس کی

پہچان، وجود اور توحید اور اس کے کمال پر دلالت کرتی ہیں۔ حسنیٰ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ نام اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں ان کا اطلاق غیر اللہ پر نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ کیا ہے۔ تیسری وجہ ہے کہ یہ نام خود اللہ تعالیٰ کے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ یہ اسماء قدیم ہیں حادث نہیں ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفی ہیں قرآن اور حدیث سے منقول ہیں: فَادْعُوهُ بِهَا: اس بات پر دلیل ہے کہ دعاء میں بطور وسیلہ اللہ تعالیٰ کے نام اور صفات پیش کرنی چاہئیں۔ جیسے قرآن اور سنت میں بہت ساری دعاؤں میں بطور وسیلہ اللہ تعالیٰ کے نام اور صفات مذکور ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول فقہاء نے نقل کیا ہے کہ کسی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے نام اور صفات کے وسیلے سے اسی طرح: فَادْعُوا: کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان ناموں کے ساتھ یاد کرتے ہیں تو اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو لفظ خدا کے ساتھ یاد کرنا اور اس لفظ کے ساتھ دعا مانگنا جائز نہیں ہے صرف معنی کے اعتبار سے اطلاق کرنا جواز رکھتا ہے جیسے خالق کا معنی پیدا کرنے والا تو مالک کا معنی خدا ہے: يُلْحِدُونَ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں کجی اختیار کرنا مندرجہ ذیل طریقوں سے ہے ایک طریقہ اس میں شرک کرنے کا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام اور صفات اوروں کے لیے بھی مانتے ہیں۔ دوسرا طریقہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایسی صفت بیان کرنا کہ اس کی شان کے لائق نہ ہو اور نہ منقول ہو۔ تیسرا طریقہ اللہ تعالیٰ کے بعض ناموں اور صفات کا انکار کرنا ہے۔

تفسیر 181 یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ قیامت تک اس امت میں ایسے لوگ ہونگے جو حق کی طرف دعوت دینگے اور ملحدین کے ساتھ مقابلہ کرینگے اور اس طرح کا مضمون صحیح حدیث میں بھی مذکور ہے جو امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کی ہے۔ (صحیح بخاری کتاب التوحید حدیث 7460 صحیح مسلم کتاب الامارۃ حدیث 1923)۔

تفسیر 182 یہ آیت سورۃ کے دوسرے دعوے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اسی طرح دوسرے گروہ کا ذکر اس گروہ کے مقابلے میں ہے جو پہلی آیت میں مذکور ہے اور چوتھی زجر ہے: سَنَسْتَدْرِجُ: اس کو کہتے ہیں کہ ایک انسان گناہ کرتا ہے اور توبہ بھی نہیں کرتا (اپنی گمراہی میں پختہ ہو) اس کے باجود اللہ تعالیٰ اس کو دنیا کے انعامات سے نوازتا ہے اور کبھی اس سے عجیب کام صادر کرتا ہے اور پھر بھی یہ اللہ تعالیٰ کا شکر نہیں کرتا اسی طرح کا حال دجال کا بھی ہوگا۔

تفسیر 183 یہ بھی استدراج کی ایک قسم ہے کہ اس کو مہلت دینا ہے۔ عذاب نہیں لاتا آیت میں عذاب دنیاوی کی وعید

ہے۔اسی طرح سورۃ آل عمران آیت 178 میں بھی گزرا ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّ اَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ
يُؤْمِنُوْنَ ۝ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ
مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ۘؔ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا
بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

"کیا یہ لوگ نہیں سوچتے (قرآن میں) کہ ان کے خیر خواہ (محمد ﷺ) پر کوئی دیوانگی نہیں ہے وہ تو صرف کھل کر ڈرانے والا ہے [184] ۔کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے (عبرت کی نظر سے) آسمانوں اور زمین کی بادشاہی میں اور اس میں کہ جو اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پیدا کی ہے اور اس بات میں کہ ان کا وقت مقرر قریب ہوا ہے کونسی بات پر قرآن کے بعد یہ لوگ ایمان لائینگے [185] ۔جس کو اللہ گمراہ کرے اس کو کوئی راہ دکھانے والا نہیں اور ان کو اپنی سرکشی میں سرگرداں چھوڑ دیگے [186] یہ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا آنا کب ہوگا آپ کہہ دیجئے بیشک اس کا علم میرے رب کے پاس ہے نہیں کوئی ظاہر کر سکتا اس کو اس کے وقت میں مگر اللہ تعالیٰ ۔ بھاری بات ہے آسمانوں اور زمین میں نہیں آئے گی تمہارے پاس مگر اچانک ،وہ آپ سے سوال کرتے ہیں گویا آپ اس کو تلاش کرنے والے ہیں آپ کہہ دیجئے بیشک اس کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے لیکن زیادہ لوگ نہیں جانتے" [187]۔

تفسیر 184 یہ منکرین رسالت کے لئے پانچویں ڈانٹ ہے کہ اگر انہوں نے قرآن میں فکر کی ہوتی یا اس نبی کے حالات اور صفات میں غور کرتے تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ یہ رسول سچا ہے مجنون نہیں ہے۔

تفسیر 185 یہ توحید کے منکرین کے لئے چھٹی زجر ہے کہ یہ لوگ آسمانوں اور زمین کے نظام اور تمام مخلوقات میں فکر کیوں نہیں کرتے تاکہ ان کو توحید معلوم ہوجائے اسی طرح یہ لوگ سوچتے کیوں نہیں ہیں کہ ہماری موت یا عذاب کا وقت قریب ہے تاکہ اس سے پہلے توحید کا مسئلہ مان لیں ۔حدیث اس کلام کو کہا جاتا ہے جو نقل کیا جاتا ہے قرآن بھی ایسا ہے کہ جبرائیل نے اس کو اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے اور نبی ﷺ نے جبرئیل سے نقل کیا ہے یہ حادث کے معنی میں نہیں ہے جیسا کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے

یہ آیت دلیل ہے کہ قرآن کے بعد کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی اور محمد ﷺ کے بعد کوئی اور رسول نہیں ہے۔

تفسیر 186 یہ منکرین کے لیے ساتویں زجر ہے، نہ سوچنے کی وجہ ہے جو پہلی آیت میں گزر چکی ہے جو کہ زاضْلَالْ طُغْيَانْ اور عَمَهُ (خلط ملط ہونا) ہے۔

تفسیر 187 قیامت کے انکار کے بارے میں یہ آٹھویں زجر ہے اور یہ ان کی سرکشی کی علت ہے جو پہلی آیت میں ذکر ہوئی: يَسْتَلُوْنَكَ: یہ سوال بطور استہزاء ہے: سَاعَةً: قیامت کو کہا جاتا ہے پہلے اس وجہ سے کہ اچانک واقع ہوتی ہے دوسرا اس وجہ سے کہ ایک لمحے میں اعمال کا فیصلہ کیا جائے گا۔ تیسرا اس وجہ سے کہ لمبے ہونے کے باوجود اللہ کے نزدیک ایک لمحے کی طرح ہوگا: عِنْدَ رَبِّيْ: یعنی قیامت کے وقت کا علم اللہ تعالی نے اپنے لئے خاص کیا ہے کسی کو بھی اس کا علم نہیں دیا: لِوَقْتِهَا: لام فِيْ کے معنی میں ہے: بَغْتَةً: سے مراد لوگوں کی غفلت ہے یعنی لوگ اپنے کاموں میں مشغول اور غافل ہوں گے اگرچہ اس کی علامات آئی ہوں گی اس آیت میں سوال دو مرتبہ مذکور ہے دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلا سوال قیامت کے وقت کے بارے میں ہے اور دوسرا سوال قیامت کی تفصیل اور حقیقت کے بارے میں: ثَقُلَتْ: کا ایک معنی یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں والوں پر اس کی ہیبت زیادہ ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس کا علم آسمانوں اور زمین والوں سے پوشیدہ ہے جس چیز کا علم پوشیدہ ہوتا ہے تو وہ نفس پر بھاری ہوتی: حَفِيٌّ: تلاش کرنے والے کو کہا جاتا ہے اسی طرح عالم سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ آپ پر گمان کرتے ہے کہ قیامت سے باخبر ہیں تو اسی وجہ سے آپ سے قیامت کے سوالات کرتے ہیں۔ سوال: پہلے جواب میں رَبِّيْ اور دوسرے جواب میں لفظ اللہ ہے۔ جواب: پہلے میں وقت کا مسئلہ ہے اور وقت مقرر کرنا اور اس کو قائم کرنا ربوبیت کا کام ہے اور دوسرے میں احوال اور احوال کی تفصیل کا مسئلہ اور اس کے ساتھ لفظ اللہ مناسب ہے جو کہ اسم اعظم ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ڔ وَمَا
مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ڔ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۱۸۸ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا
زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ
اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝۱۸۹ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَاۗءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا
يُشْرِكُوْنَ ۝۱۹۰ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـــًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝۱۹۱ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ۝۱۹۲
وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ۝۱۹۳

"کہہ دیجیے میں اپنے لئے کسی قسم کے نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے اور اگر میں غیب کو جانتا تو میں ضرور جمع کر لیتا زیادہ فائدے اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی نہیں ہوں میں مگر ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہو اس قوم کو جو ایمان لاتی ہے [188]۔ اللہ تعالیٰ وہی ذات ہے جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی جنس سے اس کی بیوی پیدا کی تاکہ سکون حاصل کرے پھر جب اس نے اس (بیوی) سے صحبت کی تو اٹھایا اس نے ہلکا حمل جس کے ساتھ چلتی پھرتی تھی تو جب بھاری ہوئی تو دونوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جو ان کا رب ہے اگر تو ہمیں صحیح سالم بچہ دے تو ضرور ہم شکر کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے [189]۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو صحیح سالم بچہ دیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے شریک بنائے اس بچے میں جو ان کو دیا تھا اللہ تعالیٰ ان سے پاک ہے جن کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ لوگ شریک بناتے ہیں [190]۔ یہ لوگ ان کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں [191]۔ اور وہ طاقت نہیں رکھتے ان مشرکین کی مدد کرنے کی اور نہ اپنے نفسوں کی مدد کر سکتے ہیں [192]۔ اور اگر آپ ان مشرکین کی رہنمائی ہدایت کی طرف کریں تو یہ تمہاری بات ماننے کے لیے تیار نہیں لہٰذا تمہارا حال ان کے لیے برابر ہے کہ تم ان کو بلاؤ یا تم خاموش رہو" [193]۔

تفسیر 188 یہ بھی پہلے سوال کے جواب میں اضافہ ہے کہ جب میں اپنے لئے فائدے اور نقصان کا اختیار نہیں رکھ سکتا تو قیامت کا علم کیسے رکھ سکتا ہوں اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک فی التصرف اور شرک فی العلم دونوں کی نفی کی گئی ہے: اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ: اس کو استثناء منقطع کہتے ہیں معنی یہ کہ جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اصل وجہ یہ ہے کہ یہ استثناء سورۃ الجن

آیت 21 میں نہیں ہے اور متصل استثناء لازماً ذکر ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت فائدے اور ضرر سے کثیر ہے۔ فائدہ: اس طرح سورۃ یونس آیت 49 میں بھی ہے۔ سوال: وہاں پر ضَرًّا مقدم ہے۔ اس آیت میں نَفْعًا کو مقدم کیا ہے۔ جواب: یہاں علم کا ذکر ہے اور علم میں نفع ہے جبکہ وہاں عذاب کا ذکر ہے اور عذاب میں ضرر ہے۔ وَلَوْ كُنْتُ: لَوْ عربی میں نفی کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی میں غیب نہیں جانتا اسی وجہ سے خیر حاصل کرنے میں مجھے تکلیفیں پہنچی تھیں یعنی لَوْ: کا کلمہ دونوں جز کی نفی پر دلالت کرتا ہے تو علم غیب اور نفع کا اِسْتَكْثَرْتُ: دونوں کی نفی ہوگئی۔ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ: یہ جملہ ماقبل کے لیے بطور قید حال ہے یعنی اگر غیب کا علم ہوتا تو میں بغیر تکلیف کے بہت خیر حاصل کرتا جبکہ نبی ﷺ نے بہت تکلیفیں برداشت کی ہیں۔

تفسیر 189 یہ آیت سورۃ کے دوسرے اور تیسرے دعوے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ آیت میں لوین زجر ہے میاں بیوی کو جو اللہ تعالیٰ سے اولاد مانگتے ہیں اور جب ان کی اولاد پیدا ہوجاتی ہے پھر اس کی نسبت اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف کرتے ہوئے شرک کرتے ہیں۔ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ: اس طرح سورۃ نحل آیت 72 اور سورۃ روم آیت 21 میں جنس کے معنی میں ہے یہاں پر بھی جنس کے معنی میں ہے اور آیت ابتداء سے تمام انسانوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، یہ قول سمعانی رحمہ اللہ نے عکرمہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے۔ فائدہ: بعض روایات میں مذکور ہے کہ یہ آیت آدم علیہ السلام اور حوا کے بارے میں ہے (ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3077 تفسیر ابن ابی حاتم 8637/5، طبرانی مستدرک حاکم 545/2 ابن عدی فی الکامل 1700/5 شیخ البانی نے ترمذی اور سلسلۃ الضعیفۃ میں 342 اس کو ضعیف قرار دیا ہے)۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کا تفصیل کے ساتھ رد کیا ہے پہلی وجہ یہ کہ عمر بن ابراہیم کو ابو حاتم نے ضعیف کہا ہے دوسری وجہ یہ کہ یہ سمرۃ سے موقوف منقول ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ اس کا راوی حسن بصری رحمہ اللہ ہے اور اس نے خود کہا ہے کہ دوسری آیت میں مراد اولاد آدم اور حوا ہے اور راوی جب اپنی روایت کی خود مخالفت کرتا ہے تو یہ دلیل ہے کہ یہ حدیث مرفوع ثابت نہیں ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بحث کے آخر میں اور امام قرطبی اور رازی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ واقعہ اسرائیلی ہے اس کی یقینی تصدیق نہیں ہوسکتی اور جس نے یہ کہا کہ یہ شرک فی التسمیہ ہے حقیقی شرک نہیں ہے یہ قول باطل ہے اس لیے کہ بعد والی تمام آیتیں شرک حقیقی کے رد میں ہیں تو آیت میں مراد آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے مشرک لوگ ہیں۔ یہاں پر نفس سے مراد جنس ہے۔

تفسیر 190 اللہ تعالیٰ کے ساتھ اولاد میں شریک ٹھہرانا کئی طریقوں سے ہے ایک یہ کہ اس طرح کہے کہ یہ اولاد مجھے فلاں ولی یا بزرگ نے بخشی ہے دوسرا یہ کہ اس کا نام عبدالنبی یا بندہ علی یا پیر بخش وغیرہ رکھتا ہے۔ تیسرا یہ کہ وہ غیر اللہ کے نام پر اولاد و نذریں دیتے ہیں اور یہ تمام شرک حقیقی کی اقسام ہیں اس کی دلیل یہ جملہ ہے کہ: تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ

تفسیر: 191 اس آیت اور بعد والی آیت میں شرک فی الخالقیت کا رد ہے یعنی مخلوق خالق کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتی جیسے سورۃ نحل آیت 20 میں ہے۔

تفسیر 192 اس میں شرک فی الاستعانت کا رد ہے: وَلَا اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ: یعنی خود کچھ نقصان مصیبت دور نہیں کر سکتے ان معبودوں پر بیماریاں اور تکلیفیں آتی ہیں موت بھی آتی ہے لیکن یہ لوگ اپنے آپ سے ٹال نہیں سکتے اگر کوئی ان کی قبروں کو توڑے (یا ان کی قبروں کو گرائے) یا اس سے غلاف اور جھنڈے گرائے اور ان کو جلائے تو یہ لوگ دفاع نہیں کر سکتے چنانچہ ایسی کمزور صفات والا معبود نہیں بن سکتا۔

تفسیر 193 اس آیت اور بعد والی آیت میں شرک فی الدعا کا رد ہے هُمْ کی ضمیر مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی طرف راجع ہے: اِلَى الْهُدٰى: اس سے مراد ہدیت اور خیر کی طلب ہے جیسے ہدایت اور خیر کی طلب اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے اور وہ قبول کرتا ہے مگر یہ معبود کچھ بھی قبول نہیں کر سکتے اگرچہ بت ہوں یا قبریں ہوں اس آیت میں دوسرا قول یہ ہے کہ ضمیر مشرکین کی طرف راجع ہے اور اس سے مراد عنادی مشرکین ہیں لیکن یہ کلام کے سیاق سے بعید تفسیر ہے: عَلَيْكُمْ: اس میں اشارہ ہے کہ ان سے فائدہ طلب کرنے اور نہ کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٩٤﴾ أَلَهُمْ
أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ
بِهَا ۗ قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُونِ فَلَا تُنْظِرُونِ ﴿١٩٥﴾ إِنَّ وَلِيِّيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى
الصَّالِحِينَ ﴿١٩٦﴾ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ﴿١٩٧﴾ وَإِنْ تَدْعُوهُمْ
إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَسْمَعُوا ۖ وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٩٨﴾

"بیشک وہ لوگ جن کو (حاجتوں میں) اللہ تعالیٰ کے علاوہ پکارتے ہو یہ تمہاری طرح بندے ہیں پس ان کو پکارو تو تمہاری کسی حاجت کو پورا کریں اگر تم سچے ہو؟[194]۔کیا ان کے پاؤں ہیں کہ ان کے ساتھ چلیں یا ان کی آنکھیں ہیں کہ یہ ان سے دیکھیں یا ان کے کان ہیں کہ ان کے ذریعے سنتے ہیں؟۔آپ کہہ دیجئے اپنے شریکوں کو پکارو (مجھے ضرر پہنچانے کے لیے) پھر میرے خلاف چال چلو اور مجھے مہلت نہ دینا[195]۔بیشک مجھے بچانے والا اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے کتاب نازل فرمائی اور وہ نیک لوگوں کو بچاتا ہے[196]۔اور جن لوگوں کو تم اللہ تعالیٰ کے علاوہ پکارتے ہو وہ تمہاری مدد کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ اپنے نفسوں کی مدد کر سکتے ہیں[197]۔اور اگر تم ان کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو یہ لوگ نہیں سنتے اور آپ خیال کریں گے یہ آپ کو دیکھتے ہیں حالانکہ یہ کچھ نہیں دیکھ سکتے"[198]۔

تفسیر 194 یہ آیت ان لوگوں کا واضح رد ہے جو بندوں کی عبادت کرتے ہیں چاہے زندہ ہوں یا فوت شدہ اور ان سے حاجتیں طلب کرتے ہیں۔اس طرح سورۃ کہف آیت 102 میں بھی ہے تو یہ مشرکین بالعباد کا خصوصا رد ہے۔اشارہ ہے کہ عبدیت معبودیت کے منافی ہے اور اگر اس سے مراد بت ہو جائیں تو امام شربینی اور رازی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ تم یہ انسانوں کی شکل میں بناتے ہو اگر یہ لوگ تمہاری طرح زندہ حقیقی انسان بن جائیں تب بھی تمہارے حاجت روا نہیں بن سکتے: فَادْعُوهُمْ : یہ ڈانٹ کے طور پر ہے تو اس سے مراد صرف بت نہیں ہیں۔

تفسیر 195 اس آیت میں بھی شرک فی التصرف کا رد ہے اور ان کے معبودوں کے عجز کا بیان تاکید کے لیے ہے پہلی آیت میں چار طاقتوں کی نفی کرنے سے ان کے پیروں میں چلنے کی اور ہاتھوں میں تھامنے کی اور آنکھوں میں دیکھنے کی اور کانوں میں سننے کی طاقت نہیں پھر کیوں ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں اس میں صرف قید کی نفی ہے کیونکہ ان کے معبودوں کے تو

اعضاء ہیں اگر بت ہوتے ہیں تو بھی عابدوں نے ان کے لیے بنائے ہوتے ہیں اور اگر مردے ہوتے ہیں تب بھی ان کے اعضاء ہوتے ہیں اس شرط کے ساتھ کہ بوسیدہ نہ ہوئے ہوں تو یہاں پر مقید کی نفی مراد نہیں ہے اور جب مدد کے لیے یہ چار طاقتیں ضروری ہیں تو اس کا ذکر کیا: قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ : یہ مشرکین کے سوال کا جواب ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ باتیں نہیں کرو ورنہ یہ معبود تمہیں کوئی نقصان پہنچائیں گے تو جواب ہوا کہ انہیں مجھے نقصان پہنچانے کے لیے پکارو اور تم بھی ان کے ساتھ مل جاؤ اور مجھے مہلت نہ دینا میں نہیں ڈرتا۔

تفسیر 196 یہ اس بات کی علت ہے کہ موحد غیر اللہ سے نہیں ڈرتا اور کہتا ہے کہ مجھے بچانے والا وہ اللہ تعالیٰ ہے جس نے اس مسئلے پر قرآن کو بھیجا ہے اشارہ ہے کہ قرآن بیان کرنے والا اور توحید کی طرف دعوت دینے والا صالحین میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ موحدین کی مدد کرتا ہے۔

تفسیر 197 یہ بھی شرک فی الدعاء کا رد ہے کہ معبود باطل کچھ مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ تو ان کو مدد کے لیے کیوں پکارتے ہیں: لَا يَسْتَطِيعُونَ: شرک فی الدعاء کے رد پر دلیل ہے جبکہ 92 میں مطلق شرک یا شرک فی التسمیہ کا رد ہے۔

تفسیر 198 یہ بھی شرک فی الدعا کا رد ہے کہ یہ معبود تمہارا احوال دیکھتے ہیں نہ تمہاری باتیں سنتے ہیں تو ان کو مدد کے لیے کیوں پکارتے ہو الْهُدَىٰ اس سے مراد خیر اور فائدے کی بات ہے: وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ: اگر آیت بتوں کے بارے میں ہے تو انہوں نے بتوں کے لیے آنکھیں بنائی تھیں اسی وجہ سے تَرَاهُمْ کہا اور اگر اس سے مراد مردے ہیں تَرَاهُمْ: مشرک سے خطاب ہے اور رؤیت عقیدے کے معنی میں ہے یعنی مشرکین کا عقیدہ ہے کہ یہ مردے دیکھتے ہیں اور حاضر اور ناظر ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴿١٩٩﴾ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٠٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ ﴿٢٠١﴾

"عفو ودرگزر اختیار کرو اور نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے درگزر کرو [199]۔ اور اگر تمہیں شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پہنچے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرو بیشک وہ سننے والا جاننے والا ہے [200]۔ بیشک وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں جب ان کو کوئی وسوسہ پہنچے شیطان کی طرف سے تو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور اس وقت یہ لوگ سوجھ بوجھ والے ہوتے ہیں" [201]۔

تفسیر 199 مشرکین کا رد کرنے کے بعد رد کا طریقہ ذکر کیا گیا ہے اس آیت سے سورۃ کے آخر تک مبلغ کے لیے دس آداب

بیان کئے گئے ہیں اور اس آیت میں تین آداب کا ذکر ہے: خُذِ الْعَفْوَ . خُذْ : سے مراد عمل میں لانا ہے ابن کثیر اور ابن جریر رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد مشرکین سے درگزر ہے جب وہ گالی گلوچ اور ظلم کریں تو ایمان والوں سے عفو کرنا تو بطریقہ اولیٰ ہے: اَلْعُرْفِ : معروف کے معنی میں تمام طاقتوں کو شامل ہے یعنی ظلم اور سختی سے درگزر کرنے کے باوجود اچھائی کو بیان کرنا اور بیان کرنے کے بعد اگر وہ جہالت اور ضد کریں تو: اَعْرِضْ : یعنی جاہلوں کا جواب جہالت سے نہیں دینا بلکہ سورۃ فرقان آیت 62 پر عمل کرنا۔ فائدہ: امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے فرمایا کہ قرآن میں اس آیت کی طرح آیت نہیں ہے جس میں اختصار کے ساتھ اچھے اخلاق کو جمع کیا ہو۔ اس آیت میں تین آداب ہیں۔

تفسیر 200 یہ چوتھا ادب ہے کہ جب مبلغ کو جاہلوں کے اعمال کی وجہ سے غصہ آجائے تو: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ : کہے، اس طرح سورۃ حم سجدہ آیت 32 میں ہے: سَمِيْعٌ : میں اشارہ ہے کہ: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ : زبان سے کہا جاتا ہے اور عَلِيْمٌ میں اشارہ ہے کہ دل میں اس کا عقیدہ اور علم رکھتا ہے۔ شربینی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ قلبی معرفت کے بغیر صرف لفظی اور زبانی ذکر فائدہ نہیں دیتا۔

تفسیر 201 جب شیطان کا نزغ ذکر ہوا تو اب اس کا عموم ذکر ہو رہا ہے اور انسانوں کی دو قسمیں ذکر کیں: طٰٓئِفٌ غضب گناہ کے ارادے، اور گناہ کرنے اور جنوں کا حملہ کرنے ان تمام معنوں میں آتا ہے: تَذَكَّرُوْا : اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور وعید یاد کرلو یا استعاذہ یاد کرو اس آیت میں لفظ: تَذَكَّرُوْا : کے ساتھ پانچواں ادب مذکور ہے، اس میں اشارہ ہے کہ شیطان متقیوں پر غلبہ حاصل نہیں کرسکتا۔

وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ ﴿٢٠٢﴾ وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِنْ رَبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠٣﴾ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٢٠٤﴾

"اوران کے (شیاطین) بھائی ہے ان کو سرکشی کی طرف کھینچتے ہیں پھر یہ لوگ (ان پر) کچھ بھی کمی نہیں کرتے [202]۔ اور جب آپ ان کے پاس کوئی معجزہ نہیں لاتے (جو یہ لوگ مانگتے ہیں) تو یہ لوگ کہتے ہیں اپنے پاس سے (معجزہ) کیوں نہیں بناتے؟ آپ کہہ دیجئے بیشک میں تو اس کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے تمہارے رب کی طرف سے یہ قرآن دلائل، رحمت اور ہدایت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان لاتی ہے [203]۔ اور جب قرآن کی تلاوت کی جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے" [204]۔

تفسیر 202 اس آیت میں ہے کہ جو شیطان کی پیروی کرتا ہے وہ اس کا بھائی ہے اور یہ متقین کے مقابلے میں دوسرا گروہ ہے جو شیطان کا دوست ہے: غٰوِیْنَ ہے لَا یُقْصِرُوْنَ: ضمیر شیطانوں یا اِخْوَانُ: کی طرف راجع ہے یعنی شیطان وسوسہ ڈالنے میں اور ان کے اخوان گناہ کرنے میں کوتاہی اور کمی نہیں کرتے۔

تفسیر 203 اس آیت میں ان کی گمراہی کا ذکر ہے کہ یہ لوگ معجزے کو نبی کا بنایا ہوا سمجھتے تھے اس لیے اس سے بنانے کا مطالبہ کرتے ہیں پھر اس آیت میں چھٹا ادب قُلْ کے ساتھ ذکر ہے: هٰذَا بَصَائِرُ: یہ مَا یُوْحٰى اِلَیَّ: کے لیے تفسیر ہے اور اشارہ ہے کہ اگر تمہارا مانگا ہوا معجزہ نہیں لاتا تو کوئی حرج نہیں ہے اس لیے کہ قرآن معجزہ کافی ہے: بَصَائِرُ سے مراد ایسے دلائل جو عقل میں بصیرت پیدا کرتے ہیں تو سبب کو مسبب کا نام دیدیا ہے قرآن سے فائدہ لینے والے تین قسم کے ہیں پہلا جو: عَیْنُ الْیَقِیْنِ: کے مرتبے میں ہوتے ہیں تو ان کے لئے بصائر ہے۔ دوسرا عِلْمُ الْیَقِیْنِ: والے تو ان کے لیے هُدًى اور تیسرا جو: حَقُّ الْیَقِیْنِ: والے ہیں تو ان کے لئے رحمت ہے۔

تفسیر 204 اس آیت میں دو آداب مذکور ہیں ساتواں اور آٹھواں قرآن پڑھتے وقت یعنی قاری کو چاہیے کہ سننے والوں کو یہ ادب بتائے صحیح یہ ہے کہ یہ آیت عام ہے نماز اور خطبہ دونوں اس میں شامل ہیں اسی طرح عام اوقات میں جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ ادب اس وقت بھی واجب ہے۔ (فائدہ) استماع ارادے کے ساتھ سننا ہے جبکہ سماع عام ہے چاہے قصد ہو یا نہ ہو: اِنْصَاتُ: باقی مشاغل کے چھوڑنے کو کہتے ہیں آیت میں دو بحثیں ہیں۔ پہلی بحث: اس آیت کے نزول

اورخطاب کے بارے میں ہے امام رازی رحمہ اللہ نے اس میں بہت سے اقوال ذکر کئے ہیں پہلا یہ کہ یہ آیت اپنے عموم پر ہے یعنی جب بھی کوئی انسان قرآن کی قراءت کرتا ہے تو ہر شخص پر پہلی اس کا سننا واجب ہے چاہے نماز میں ہو یا خطبے میں درس قرآن میں ہو یہاں تک کہ شامی نے لکھا ہے کہ: یُکْرَہُ اَنْ یَّقْرَءُ الْقُرْاٰنَ جُمْلَۃً وَّاحِدَۃً: یعنی بہت سارے لوگ جب ایک ساتھ قرآن کی تلاوت بلند آواز سے کرتے ہیں (جیسے قرآن خوانی کرنے والے) تو یہ مکروہ کام ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ نماز میں باتوں کے منع کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے تیسرا قول یہ ہے کہ ایک دوسرے کو نماز میں سلام سے منع کرنے کے بارے میں یہ نازل ہوئی ہے۔ چوتھا قول ہے کہ یہ خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ یہ قراءت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ اقوال امام ابن کثیر اور ابن جریر رحمہم اللہ نے بھی نقل کئے ہیں۔ چھٹا قول یہ ہے کہ یہ کافروں کو خطاب ہے: رحم سے مراد ہدایت کا حصول ہے، امام رازی رحمہ اللہ نے یہ قول تین وجوہات سے بہتر قرار دیا ہے۔ پہلی وجہ آیت کا ربط ماقبل کے ساتھ ہے وہ اس طرح کہ جب قرآن ہدایت، بصائر اور رحمت ہے اور صدق رسول کے لیے پورا معجزہ ہے تو کافروں سے کہا گیا کہ قرآن غور سے سنو تاکہ اس کی فصاحت، بلاغت اور اعجاز تمہیں معلوم ہوجائے۔ تو تم پر ہدایت کے ساتھ رحم کیا جائیگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ کافروں کے بارے میں ہے جن کا حال سورۃ حم سجدہ آیت 26 میں ذکر ہوا ہے: لَا تَسْمَعُوْا: کے مقابلے میں: فَاسْتَمِعُوْا اور وَالْغَوْا: کے مقابلے میں وَاَنْصِتُوْا: ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مومنوں کے بارے میں کہا گیا کہ: رَحْمَۃٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ: تو یہ یقین کے طور پر ہے اگر بعد والی آیت میں بھی ایمان والوں کو خطاب ہوجائے تو: لَعَلَّکُمْ: کیوں فرمایا ہے۔ سوال؟ امام احمد نے فرمایا ہے کہ اجماع سے یہ ثابت ہے کہ یہ آیت صلوٰۃ کے بارے میں ہے جواب: امام زیلعی رحمہ اللہ نے اس کی کوئی سند ذکر نہیں کی ہے اسی طرح بیہقی نے بھی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا اور دوسرا یہ کہ ابن کثیر میں بہت سندوں سے باقی اقوال (جو پہلے ذکر ہو چکے ہیں) لائے ہیں تو ایک قول پر اجماع کیسے ثابت ہوا البتہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سبب کے خصوص کا کبھی کافروں کے بارے میں آیتیں نازل ہوئی ہیں مگر ان سے ایمان والوں کے بارے میں استدلال ہوسکتا ہے جیسے یہ آیت: اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ: یہودیوں کے بارے میں ہے لیکن مسلمانوں کے ان علماء کو بھی شامل ہے جو بعض حق مسائل کو چھپاتے ہیں اور بہت سارے اقوال میں جو لفظ: نَزَلَتْ: کہا گیا ہے تو وہ مفسرین کی اصطلاح میں نزول کے سبب کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ آیت کے ہر مصداق پر نزلت کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ دوسری بحث اس آیت سے قراءت خلف

الامام کے منع کے بارے میں استدلال کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ جواب: یہ استدلال بہت ساری وجوہات کی بنا پر ضعیف ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ امام کے پیچھے بلند آواز سے قراءت نہ کرو اس لیے کہ یہ استماع اور انصات کے منافی ہے چپکے چپکے قراءت کرنے استماع اور انصات میں کچھ منافات نہیں اور اس آیت کی تائید یہ ہے کہ صاحب ہدایۃ نے جمعے کے خطبے کے باب میں کہا ہے کہ خطبے میں استماع اور انصات واجب ہے لیکن جب خطیب یہ کہے کہ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا: تو سننے والے چپکے چپکے آواز میں درود پڑھیں کفایہ میں کہا ہے کہ زبان سے چپکے چپکے یہ استماع اور انصات کے منافی نہیں ہے ورنہ فقہا، اس کی اجازت نہیں دیتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مقتدی امام کے سکتات میں قراءت کرتا ہے جیسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے اصحاب الحدیث کا مذہب ذکر کرنے کے بارے میں کہا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے جزء القراءۃ میں کہا ہے کہ پہلے سکتے میں قراءت کر لے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ آیت اگرچہ سورۃ فاتحہ کو شامل ہے اور عام ہے لیکن اُن احادیث: لَا صَلٰوۃَ اور لَا تُجْزِیُ صَلٰوۃٌ: نقص کے ساتھ یہ خاص کی گئی ہے ابن حاجب نے مختصر الاصول میں کہا ہے کہ خبر واحد کے ساتھ قرآن کی تخصیص ائمہ اربعہ کا قول ہے جبکہ احناف میں صرف عیسیٰ بن ابان اور کرخی نے مخالفت کی ہے۔ خبر واحد کی جو حدیث اکثر صحاح، سنن اور صحیح سند کے ساتھ ذکر کی ہے تو وہ ظنی نہیں ہوتے ہیں بلکہ قطعی ہوتی ہے اور بالاتفاق آیت کی تخصیص کر سکتی ہے دوسری اور تیسری وجہ امام ابو المظفر سمعانی نے بھی اپنی تفسیر میں لکھی ہے تو ان وجوہات سے امام عبدالحی لکھنوی نے کہا ہے کہ یہ آیت سکتے کے حال میں قراءت کے عدم جواز پر دلالت نہیں کرتی چاہے سری طور پر ہو یا جہری اور اس طریقے سے قرآن اور حدیث دونوں پر عمل ہوتا ہے جبکہ دلائل میں اصل اعمال ہے نہ کہ اہمال۔ (وضیت) جب اس مسئلے میں صحابہ اور آئمہ مجتہدین کا استدلالی اختلاف موجود ہے تو اس میں تشدد کرنا اور ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں چھوڑنا جائز نہیں ہے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۩ ۝

"اور اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ صبح وشام بلا جہر یاد کرو اور غفلت کرنے والوں میں سے نہ ہونا[205]۔ بیشک وہ لوگ جو آپ کے رب کے پاس ہیں اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور خاص اسی کو سجدہ کرتے ہیں" [206]۔

تفسیر 205 اس آیت میں بھی دو آداب نواں اور دسواں مذکور ہے اور ذکر کے دو طریقے بتائے گئے ہیں ایک فِيْ نَفْسِكَ: زبان کی حرکت کے بغیر دل میں ذکر کرنا، یہ اَخْفٰی: ذکر ہے، امام رازی اور آلوسی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ نَفْسِكَ میں اشارہ ہے کہ ذکر کے معنی سے واقف ہوگا ورنہ معنیٰ جانے بغیر تو زبانی ذکر ثواب نہیں رکھتا، جس نے کلمہ طیبہ پڑھا اور معنیٰ کا لحاظ نہیں کیا اور اس معنیٰ سے لاعلم رہا تو یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مؤمن نہیں ہے۔ دوسرا: دُوْنَ الْجَهْرِ: زبان پر چپکے سے ذکر کرنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایسے پڑھے کہ اپنے آپ کو سنائے یہ آیت دلیل ہے کہ اذکار میں اصل اخفاء ہے جب تک خاص دلیل شرعی نہ ہو بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہ قول اس آیت کے استدلال کے ساتھ فقہ حنفی کی کتابوں میں (کبیری بحر الرائق فتح القدیر تبیین الحقائق اور روح المعانی میں لکھا ہے) اس آیت میں امام ابن جریر رحمہ اللہ نے قول یہ نقل کیا ہے کہ اس سے مراد مخفی آواز سے قراءت خلف الامام ہے لیکن اس قول کا امام ابن کثیر نے رد کیا ہے: اَلْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ: اس سے مراد ہر وقت ہے لیکن ان دو وقتوں کی تخصیص چند وجوہات کی وجہ سے کی ہے پہلی وجہ یہ ہے کہ غَدَاةٌ: کا وقت بیداری کا وقت ہے اور اٰصَالُ: کا وقت نیند آنے کا وقت ہے تو اشارہ ہے کہ بیداری اور نیند کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے ذکر سے کرنی چاہیے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ صبح اور عصر کی نماز کے بعد باقی نفلی نمازیں پڑھنا مکروہ ہے تو اس وقت باقی ذکر کرنا چاہیے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ان اوقات میں ملائک دن اور رات کے اعمال اوپر لیجاتے ہیں تو ان اوقات میں ذکر کثرت کے ساتھ کرنا چاہیے۔

تفسیر 206 اس آیت میں مقربین کا حال بیان کرنا مبلغ کے ترغیب کے لیے ہے کہ اس میں تین صفات ہوتی ہیں ایک دلی، ایک زبانی، اور ایک اعضاء کی صفت ہے۔

سورۃ الاعراف کی خصوصیات:

۱۔ آدم علیہ السلام کے کو سجدے کا تفصیلی واقعہ اور ابلیس کے وسوسے کا تذکرہ۔

۲۔ لباس کی نعمت کا تذکرہ۔

۳۔ جنت والوں جہنم والوں اور اعراف والوں کا مکالمہ اور گفتگو۔

۴۔ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا تفصیلی ذکر۔

۵۔ سابقہ انبیاء کے واقعات کا تذکرہ۔

۶۔ دنیا پرست اور بے دین عالم کی کتے کے ساتھ تشبیہ۔

۷۔ اصحاب السبت کے واقعے کی تفصیل۔

۸۔ آدم علیہ السلام کی اولاد سے توحید پر کاربند رہنے کا عہد۔

۹۔ شرک کے تمام اقسام پر رد۔

۱۰۔ حق کے داعی کیلئے اس سورۃ میں اخلاق حسنہ مذکور ہے۔

"سورۃ اعراف کی تفسیر اللہ تعالی کے فضل سے مکمل ہوئی"

آیاتھا ۷۵ ۸ سورۃ الانفال مدنیۃ ۸۸ رکوعاتھا ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"(خاص اللہ کے نام کی مدد چاہتا ہوں شروع کرتے ہوئے میں جو رحمن ورحیم ہے)"

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ ؕ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ ۪ وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ
وَ رَسُوۡلَہٗۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ① اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَ اِذَا تُلِیَتۡ عَلَیۡہِمۡ
اٰیٰتُہٗ زَادَتۡہُمۡ اِیۡمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ② الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ③ اُولٰٓئِکَ ہُمُ
الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا ؕ لَہُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ وَ مَغۡفِرَۃٌ وَّ رِزۡقٌ کَرِیۡمٌ ④

"پوچھتے ہیں آپ سے غنیمت کے بارے میں غنیمتوں کے اختیار اللہ اور رسول کے پاس ہے اور ڈرو اللہ سے اور اپنے درمیان اصلاح قائم رکھو اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو [1]۔ بیشک ایمان والے وہ لوگ ہیں جب اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جہاں اس کی آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کے ایمان کو زیادہ کرتی ہیں اور خاص اپنے رب پر توکل کرتے ہیں [2]۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور اس مال میں سے جو ہم نے ان کو دیا ہے خرچ کرتے ہیں [3]۔ یہی لوگ حقیقی ایمان والے ہیں ان کے لئے بہت درجے ہیں ان کے رب کے پاس اور بخشش اور باعزت رزق ہے" [4]

تفسیر 1، 2، 3 (آیت ۱) اس سورت کا ربط پہلی سورۃ کے ساتھ دو وجوہات کے ساتھ ہے پہلی وجہ یہ ہے کہ پہلی سورۃ میں زبانی طور پر بہادری کے ساتھ مسئلے توحید بیان کرنے کی ترغیب تھی اور اس سورۃ میں توحید کے مسئلے کی اشاعت کے لیے قتال کی ترغیب ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلی سورتوں میں توحید ثابت ہوا دلائل کے ساتھ تو اس سورۃ میں منکرین کے ساتھ قتال کرنے کا امر ہے، اس سورۃ کے دو دعوے ہیں پہلا یہ کہ مال غنیمت میں اپنے اختیار سے کام مت لو بلکہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے موافق تقسیم کرو۔ آیت 1۔41 میں دوسرا دعویٰ قتال فی سبیل اللہ کا امر ہے۔ سورت کا خلاصہ: اس سورۃ میں پہلے دعویٰ کے لیے تیرہ علتیں ہیں۔ دوسرے دعویٰ کے لیے تیرہ قوانین ہیں اور توحید کے

تیرہ کلمات ہیں اور تیرہ اسمائے حسنیٰ ہیں۔ خلاصہ کی تفصیل اس طرح ہے: اس سورۃ میں دو حصے ہیں پہلے حصے میں دو باب ہیں جو کہ یہ چالیسویں آیت تک ہے پہلا باب انیسویں آیت تک ہے اس میں پہلا دعویٰ ہے پھر ایمان والے مجاہدین کی پانچ صفات ہیں پھر پہلے دعوے کی علتیں ہیں اور قتال کے لیے ایک قانون ہے۔ فائدہ: اس سورۃ میں غزوہ بدر کے حالات ہیں جو ہجرت کے دوسرے سال رمضان کے مہینے میں ہوا ہے اس میں تین سو تیرہ (313) صحابہ کرام تھے اور مقابلے میں تقریباً ایک ہزار کافر تھے اس غزوہ میں ایمان والوں نے فتح حاصل کی تھی اور بہت ساری غنیمتیں ہاتھ آئیں چونکہ غنیمتوں کے بارے میں اس سے پہلے حکم شرعی نہیں تھا چنانچہ اس وجہ سے ان میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا (۱) ایک گروہ جو جنگ میں شریک رہا تھا ان کا دعویٰ تھا کہ یہ صرف ہمارا حق ہے۔ (۲) گروہ جو جنگ میں شریک نہیں تھا مگر بطور کمک کے پیچھے تیار بیٹھا تھا ان کا دعویٰ تھا کہ ہمارا بھی حصہ ہے (۳) وہ گروہ تھا جو رسول ﷺ کے دفاع پر مامور تھا ان کا دعویٰ تھا ہمارا بھی حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں فرمایا کہ غنیمتوں کی تقسیم تمہارے اختیار میں نہیں ہے باہمی اختلاف سے اجتناب کرو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق تقسیم کرو اس کی تفصیل سورۃ کی آیت 41 میں آئے گی: اَلْاَنْفَالُ: یہ نفل کی جمع ہے اور نفل اضافے چیز کو کہتے ہیں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہاد کا مقصد اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنا ہے غنیمت نہیں ہے۔ دوسرا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ نفل چیز میں اختلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ اس آیت میں پانچ آداب ہیں۔ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ: یعنی غنیمت کا حکم اللہ تعالیٰ اور رسول کے لیے خاص ہے اللہ تعالیٰ امر دیتا ہے اور رسول اللہ تعالیٰ کے امر سے تقسیم کرتے ہیں اس کی تقسیم کسی اور کے حوالے نہیں کی گئی ہے: اِنْ كُنْتُمْ: لفظ اِنْ زیادہ ترغیب کے لیے کہا گیا ہے یا اِنْ اِذَا: کے معنی میں ہے۔

تفسیر 2، 3 ان آیتوں میں مجاہدین کی صفات کا ذکر ہے جس کا پہلا مصداق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے اور یہ پانچ صفات ہیں پہلی تین صفات عبادت قلبی ہے اور چوتھی عبادت بدنی ہے اور پانچویں عبادت مالی ہے۔ سوال: اس آیت میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت دل کانپتے ہیں اور سورۃ رعد کی آیت 20 میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے تو اس میں کیا تطبیق ہے؟۔ پہلا جواب: یہ ہے کہ دلوں کا ڈرنا اس وقت ہے جب اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر ہو اور دلوں کا اطمینان اس وقت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے ثواب کا ذکر ہو۔ دوسرا جواب: یہ ہے کہ یہ صفت اس دوسری صفت کے ساتھ لازم ہے یعنی جب دل اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو کمال کے یقین کی تکمیل سے دل میں اطمینان پیدا ہو

تا ہے اسی وجہ سے ان دونوں کو سورۃ زمر 23 میں جمع کیا ہے اور جب جہاد کا مقام خوفِ الٰہی کا مقام ہے تو اس سورۃ میں خوف کی صفت ذکر کی جبکہ سورۃ رعد میں دلائل اور توحید کی مثالوں کا مقام تھا اور وہ مقام اطمینان کا ہے: زَادَتْهُمْ إِيمَانًا: امام ابن قیم رحمہ اللہ نے بدائع الفوائد میں کہا ہے کہ ایمان دو قسم کا ہے ایک مطلق ایمان جو صرف دل کا یقین ہے اس میں کمی بیشی اختلافی مسئلہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس میں کمی بیشی ہوتی ہے اور دوسرا مقید ایمان ہے یقین مع عمل تو اس میں عمل کی کمی بیشی سے کمی اور زیادتی ہونے پر اتفاق ہے البتہ کچھ لوگ اسے ایمان میں اضافہ اور کچھ لوگ ایمان کی تقویت کہتے ہیں۔ اور اس طرح سورۃ توبہ 124 میں بھی ہے: يَتَوَكَّلُونَ: توکل میں امید رکھنا اور پناہ طلب کرنا اور حاجات مانگنا اور رغبت کرنا سب شامل ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے (ابن کثیر) اور یہ تینوں صفات قلبی ہیں اور بعد کی دو صفات ظاہری عملی ہیں ظاہر یہ ہے کہ اس آیت میں دوسری قسم کا ایمان مراد ہے۔

تفسیر 4. حقیقی مؤمن اس کو کہتے ہیں کہ جس میں ظاہر اور باطن ایمان برابر ہو اور اس کو کمال ایمان کہتے ہیں اس آیت میں پانچ طریقوں سے مجاہدین کو خوشخبری ہے۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ۙ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ
مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶ۭ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّاۗىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ
اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷ۙ لِيُحِقَّ الْحَقَّ
وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸ۚ

"جیسے تجھے تیرے رب نے گھر سے نکالا حکمت کے ساتھ اور یقیناً ایمان والوں میں سے کچھ لوگ بلاشبہ ناپسند کرتے تھے۔[5]۔یہ لوگ آپ سے جنگ کے بارے میں بحث کرتے ہیں اس کے بعد کہ ظاہر ہوا (اسکا فرض ہونا) گویا ان کو موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور یہ لوگ ان کو دیکھ رہے ہیں[6]۔ اور جس وقت تم سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ لیا دونوں جماعتوں میں سے ایک کا کہ یہ تمہارے لئے ہوگا اور تم چاہتے تھے کہ یہ بغیر اسلحے کا گروہ تمہارے لئے ہو جائے اور اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ حق کو ظاہر کرے اپنے وعدوں کے ساتھ اور کافروں کی جڑیں کاٹ ڈالے[7]۔تا کہ حق کو غالب کرے اور باطل کو ختم کرے اگر چہ مجرمین ناپسند کرتے ہوں"[8]

تفسیر 5 لفظ كَمَا: کے متعلق مفسرین کے بہت سارے اقوال ہیں لیکن اس میں بہتر قول یہ ہے کہ یہ (ك) علت کے لیے ہے یہ تفسیر البحر المحیط میں مذکور ہے اور یہ :اَلْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ: جملے کے ساتھ متعلق ہے پہلے دعوے کے ساتھ متعلق ہے یعنی پہلے دعوے کے لیے یہ پہلی علت ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جنگ بدر کے دن تمہارا قتال کے لیے نکلنا تمہاری طبیعت کے خلاف تھا لیکن تمہیں اللہ تعالی نے نکالا اور تمہیں غنیمتیں دیں تو اس میں کیوں اختلاف کرتے ہو، اس آیت میں کراہت سے مراد کراہت طبعی غیر اختیاری ہے یہ قول امام مبرد کا ہے تقدیری عبارت یہ ہے :قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ وَاِنْ كَرِهُوْا كَمَا كَانُوْا يَكْرَهُوْنَ الْخُرُوْجَ: یا کاف واو کے معنی میں ہے: بِالْحَقِّ: جہاد یا حکمت کے معنی میں ہے (تفسیر مدارک اور کبیر)۔

تفسیر 6 جدال سے مراد بحث کرنا ہے لڑائی نہیں ہے اور وہ ان کا صرف یہ قول تھا کہ یہ لوگ نبی سے کہہ رہے تھے کہ اگر آپ ہمیں قتال کی خبر پہلے دیتے تو ہم پوری تیاری کرتے: تَبَيَّنَ: یعنی ان پر واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی مدد کرتا ہے اور اسی طرح نبی جو کہتا ہے وحی کے ذریعے سے کہتا ہے: كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ: یہ کراہت کی مثال ہے تو لَكٰرِهُوْنَ کے ساتھ

متعلق ہے اور یہ دلیل ہے کہ یہ کراہت طبعی تھی یا: یُجَادِلُوْنَكَ: کے ساتھ متعلق تھا اور تقدیری عبارت: یَخَافُوْنَ کَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ ہے۔

تفسیر 7 یہ پہلے دعوے کے لیے دوسری علت ہے حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خواب میں دکھایا تھا کہ کافروں کے ایک گروہ پر ہم نے غلبہ حاصل کیا ہے لیکن یہ لوگ چاہتے تھے کہ وہ گروہ قافلہ ابو سفیان کا ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے ابو جہل کے لشکر کا انتخاب کیا تھا اور ایمان والوں کو اس کے ذریعے غلبہ دیا تو فرمایا کہ تم غنیمت میں کیوں اختلاف کرتے ہو۔ اَنَّهَا لَكُمْ: یعنی ان کے مال تمہیں حاصل ہونگے اور تم ان پر غالب ہوگے: اَلشَّوْكَةِ: اسلحے اور قوت کو کہا جاتا ہے شوکت لغت میں کانٹے کو کہا جاتا ہے: ذَاتِ الشَّوْكَةِ: سے مراد ابو جہل کا لشکر تھا اور غَیْرَ: سے مراد ابوسفیان کا قافلہ تھا: وَیُرِیْدُ اللّٰهُ: یہ پوشیدہ عبارت کے لیے معنی میں علت ہے یعنی: اَرَادَ اللّٰهُ ذَاتَ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ لِاَنَّهٗ یُرِیْدُ لِیُحِقَّ الْحَقَّ: اس سے مراد ظاہر کرنا اور دین حق کو مضبوط کرنا ہے: بِكَلِمٰتِهٖ: قتال کے بارے میں آیتیں یا اللہ تعالیٰ کی نصرت دَابِرَ الْكٰفِرِیْنَ: اشارہ ہے کہ ابو جہل اور وہ کفار جو بدر میں قتل کئے گئے تھے یہ کفر کی جڑ اور بنیاد تھے تو ان کے قتل کی وجہ سے کفر کی جڑیں کاٹ دی گئیں۔ فائدہ: غزوہ بدر کے وقت ابو سفیان کا ایک قافلہ تھا جو تجارت کے لیے ملک شام روانہ ہوا تھا اور مدینہ منورہ کی طرف سے واپس آتے ہوئے سمندر کے ساحل کے پاس ان کے ساتھ تجارت کا سامان تھا جنگ کا سامان ان کے پاس نہیں تھا تو ان کو عِیْر: کہا جاتا ہے اور دوسرا گروہ ابو جہل کا لشکر تھا جس نے جنگ کے لیے پوری تیاری کی تھی اور مقام بدر میں جنگ کے لیے پہنچ گئے اور ان کے پاس لڑائی کا اسلحہ زیادہ تھا اور اس کو نفیر کہا جاتا ہے۔

تفسیر 8 یہ آیت لفظ یَقْطَعُ: کے ساتھ تعلق رکھتی ہے یعنی کافروں کی جڑیں اس فائدے کے لیے کاٹتے ہیں کہ حق غالب آجائے اور باطل مغلوب ہوجائے سوال: یُحِقَّ الْحَقَّ: میں تکرار کیوں ہوا ہے؟۔ جواب: یہ تکرار نہیں ہے بلکہ مشرکین کا ابو جہل وغیرہ کے ساتھ قتال کی فرضیت کے لیے زجر ہے اور قطع مشرکین کی جڑوں کے ساتھ دوسری علت ہے۔ پہلے یُحِقُّ: میں اظہار مراد ہے اور دوسرے میں مضبوط کرنا مراد ہے، پہلے حق سے بدر کا جہاد مراد ہے اور دوسرے حق سے پورا حق دین مراد ہے۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَٰٓئِكَةِ مُرْدِفِينَ ⑨ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَ
لِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ⑩ إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ
وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ
الْأَقْدَامَ ⑪ إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَٰٓئِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا
الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ⑫ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَن
يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ⑬ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ ⑭

”جس وقت تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے پس تمہاری دعا کو قبول فرمائی کہ میں ایک ہزار ۱۰۰۰ ملائکہ کے ساتھ تمہاری مدد کرتا ہوں جو پے در پے آئینگے [9] ۔ اور اللہ تعالیٰ نے نہیں بنایا ہے (ان ملائکہ کا بھیجنا) مگر خوشخبری اور تاکہ اس کی وجہ سے تمہارے دل مضبوط ہوجائیں اور نہیں ہے غلبہ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیشک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے [10] ۔ جب تم پر اللہ تعالیٰ نے اونگھ طاری کی اپنی طرف سے امن کے لیے اور تم پر آسمان کی طرف سے پانی نازل کیا تاکہ تمہیں اس کے ذریعے سے پاک کرے اور تم سے دور کرے ناپاکی (وسوسہ) شیطان کی اور تاکہ مضبوط کرے اس کے سبب سے تمہارے دلوں کو [11] ۔ جس وقت تمہارے رب نے ملائکہ کی طرف وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں ان لوگوں کو مضبوط کرو جو ایمان لائے ہیں ضرور میں کافروں کے دلوں میں خوف (ہیبت) ڈالوں گا لہٰذا ان کو گردنوں پر مارو اور ان کی انگلیوں کی ہر پور پر مارو [12] ۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے اور جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کی تو بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے [13] ۔ یہ تمہارا عذاب ہے تو اس کو چکھ لو (دنیا میں اور جان لو) بے شک کافروں کے لیے آگ کا عذاب ہے“ [14] ۔

تفسیر 9 ۔ پہلے دعوے کے لیے تیسری علت ہے خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ قبلہ رخ ہوئے اور ہاتھوں کو اٹھا کر دعا مانگی اس میں یہ الفاظ ہیں: اَللّٰهُمَّ اَنْجِزْ لِيْ مَا وَعَدْتَنِيْ اَللّٰهُمَّ اٰتِنِيْ مَا وَعَدْتَنِيْ اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ اَهْلِ الْاِسْلَامِ لَا تُعْبَدْ فِي الْاَرْضِ : (صحیح مسلم کتاب الجهاد والسير حديث 1763) یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول کر لی اور ایک ہزار ملائکہ بھیجے اور مال غنیمت حاصل ہوا تو اس مال غنیمت میں اختلاف مت کرو: اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ غوث.

سے ماخوذ ہے اور غوث فریاد اور مدد طلب کرنے کو کہا جاتا ہے، یہ آیت واضح دلیل ہے کہ استغاثہ رب کے ساتھ خاص ہے:
مُمِدُّكُمْ : مدد میں نصرت اور اضافہ دونوں کا معنی ماخوذ ہے مُرْدِفِيْنَ: ملائک کی جماعتوں کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا،
اس طرح کے آنے سے دشمنوں پر زیادہ رعب آتا ہے یہ بدر میں ملائک کے آنے کا طریقہ تھا سورۃ آل عمران 124 میں ان
کا نازل ہونا مذکور ہے اشارہ ہے کہ آسمانی ملائک ہیں اور سورۃ آل عمران 125 میں ان کی فوجی علامات مذکور ہے
مُسَوِّمِيْنَ: کے ساتھ۔

تفسیر 10 یعنی ظاہری مدد میں دو فائدے ہیں ایک دل کا اطمینان اور دوسرا چہرے پر خوشی کے آثار ہے کہ اس میں سوال کا
جواب ہے کہ اگر کوئی یہ سمجھے کہ مدد ملائک کی قدرت میں ہے تو جواب آیا وَمَا النَّصْرُ نَصْرٌ : کے دو معنی ہیں پہلا معنی جو
اسباب کے نیچے ہو یہ مخلوق کی صفت ہے جیسے سورۃ آل عمران 52 اور اس سورۃ کے 22 میں دوسرا جو مافوق الاسباب ہو وہ
اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور وہ غلبے کے معنی میں ہے اس آیت میں یہی مراد ہے۔ اس قسم کی آیت سورۃ آل عمران
126 میں مذکور ہے اس کا فرق تین طریقوں سے ہے پہلا اس میں لَكُمْ : مذکور ہے اور یہاں نہیں ہے اس لئے وہاں غم کا
سبب ذکر کیا تو لَكُمْ : کے ساتھ ذکر ہے اور یہاں پر ایسا نہیں ہے اسلئے وہاں پر غم کا سبب ذکر کیا کہ کافروں نے بڑی تعداد
میں آنا ہے تو لَكُمْ : کے ساتھ بشارت کی تخصیص تاکید کی ساتھ کر لی۔ دوسرا فرق وہاں بِهٖ لفظ قُلُوْبُكُمْ : کے بعد ذکر کیا
ہے اور یہاں پہلے اس لئے کہ یہاں پہلے مدد کا ذکر ہے (جو ہزار ملائک ہیں) اور یہ پہلا سبب ہے تو بِهٖ کے ساتھ پہلے
سببیت کو ذکر کیا تیسرا فرق وہاں :اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ :اور یہاں پر :اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
:ذکر کیا اور پھر فرمایا :اِنَّ اللّٰهَ : اس لئے کہ یہاں پر استغاثہ ذکر ہے تو زیادہ تاکید کی وجہ سے دونوں جملے الگ الگ لائے
گئے ہیں اور دوسرے جملے کو ان کے ساتھ مؤکد کیا اور جب اس سورۃ میں اَنَّ :ذکر نہیں کیا تھا تو تاکید کے لیے :الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ :معرفہ ذکر کیا۔

تفسیر 11 یہ چوتھی علت ہے اور نصرت الٰہیہ کے باقی طریقے ہیں اونگھ اور بارش۔ اونگھ کا ایک فائدہ اور بارش کے چار
فائدے ذکر کئے ہیں علت کا خلاصہ یہ ہے کہ میدان بدر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کم ہونے کی وجہ سے خوف زدہ ہو گئے
تھے اور دوسرا یہ کہ شیطان نے وسوسے ڈالے کہ تمہارے پاس پانی نہیں ہے اور ریت میں ہو تو تم لڑائی کیسے لڑو گے تو اللہ
تعالیٰ نے ان پر اونگھ کی کیفیت طاری کی اس کے ذریعے سے ان سے خوف کو زائل کیا اور ان پر بارش برسائی جس کے

ذریعے پاکی حاصل ہوگئی اور شیطان کے وسوسے ختم ہوگئے: اَلنُّعَاسَ: نیند کا تھوڑا سا اثر ہے: اَمَنَةً: اس کو کہا جاتا ہے کہ خوف کا سبب موجود ہو لیکن خوف ختم ہوجاتا ہے یہ معجزہ اور کرامت ہے اور امن اس کو کہتے ہے کہ خوف کا سبب بھی ختم ہوجاتا ہے یہاں تو کافر مقابلے میں تیار کھڑے ہیں جنگ موجود ہے لیکن خوف ختم ہوا تو اس وجہ سے: اَمَنَةً: ذکر کیا اس طرح سورۃ آل عمران 154 میں بھی مذکور ہے وہاں ایک گروہ کا ذکر کیا ہے اس لئے کہ جنگ احد میں منافقین تھے لیکن ان پر نُعَاسٌ نہیں آیا جبکہ غزوہ بدر میں منافقین نہیں تھے تو یہاں سب کو خطاب کیا ہے: لِيُطَهِّرَكُمْ: وضو اور غسل کرنے کے ساتھ: رِجْزَ الشَّيْطَانِ: بے وضو اور جنابت یا وہ وسوسے جو شیطان ایمان والوں کے دلوں میں ڈالتا تھا کہ تمہارے پاس پانی نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ تم حق پر نہیں ہو: لِيَرْبِطَ: ربط القلب بھی اولیاء کی صفت ہے ربط اور اطمینان میں فرق ہے اطمینان کے ساتھ سبب ذکر ہوتا ہے جبکہ ربط کے ساتھ سبب ذکر نہیں ہوتا اور ربط عبارت ہے کسی خوف کے بغیر دل کا عقیدے اور دعوت اور جہاد میں مضبوط ہونے سے: وَلِيَرْبِطَ: اس میں لام ذکر کیا۔ اشارہ ہے کہ اس کا تعلق نعاس اور بارش دونوں سے ہے: يُثَبِّتَ بِهِ: ضمیر ربط قلب یا بارش کے پانی کی طرف راجع ہے۔

تفسیر 12: یہ پہلے دعوے کے لیے پانچویں علت ہے خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائک کو جنگ کرنے میں تمہارے ساتھ شریک کرلیا اور اس کی وجہ سے غنیمت حاصل ہوا تو اس میں اختلاف مت کرو: فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا: ایک تثبیت قولی تھا مطلب یہ تھا کہ ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کی مدد کی خوشخبری دینا۔ دوسرا تثبیت عملی تھا کہ ملائک قتال کے لیے مردوں کی شکل میں حاضر ہوئے تھے ایمان والوں میں سے بعضوں نے ان کو دیکھا اور بعض کی آوازیں سنیں لیکن انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خبر سے پہلے پہچانا نہیں۔ تیسرا الہام کے طور پر تثبیت ہے ایمان والوں کے دلوں میں أَنِّي مَعَكُمْ: معیت نصرت کی ہے معلوم ہوا کہ ملائک بھی اللہ تعالیٰ کی نصرت کے محتاج ہیں اور ایک احتمال یہ ہے کہ یہاں پر لفظ قُولُوا: پوشیدہ ہے اور ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا کہ: أَنِّي مَعَكُمْ سَأُلْقِي مَعَكُمْ: کی تفسیر ہے یا فَثَبِّتُوا: کا نتیجہ ہے رُعْبَ: دل کا خوف سے بھر جانا مصیبت کے اندیشے کے ساتھ: فَوْقَ الْأَعْنَاقِ: اس سے مراد سر کا پچھلا حصہ ہے یا سارا سر ہے: بَنَانٍ: اس کو مارنے کے ساتھ اس وجہ سے خاص کیا اس لئے کہ اس کے ذریعے جنگ ہوتی ہے۔

تفسیر 13: اس آیت میں کافروں کو قتل کرنے کا سبب مذکور ہے جو کہ شقاق ہے مشاق اصل میں دو ٹکڑے ہونے کو کہا جاتا ہے جو ایک دوسرے کے مقابل ہوں۔ علماء نے لکھا ہے کہ ہر مشرک اور مبتدع اللہ تعالیٰ اور رسول کا مشاق ہے اس

لئے کہ ان کی مخالفت میں دین بنایا ہے (کتاب الاعتصام للامام شاطبی) اس طرح آیت سورۃ حشر 4 میں بھی ہے یہ آیت عام، کافروں کے بارے میں ہے اور ان کا شقاق خفیف ہے اسی وجہ سے یہاں پر لفظ: یُشَاقِقِ: میں ادغام نہیں کیا اور سورۃ حشر میں یہودیوں کا حال بیان ہوا ہے ان کا شقاق جب کہ زیادہ شدید ہے اسی وجہ سے ادغام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

تفسیر 14 یہ خطاب کافروں کو ہے اور اس میں قتل قید اور جنگ بدر میں کافروں کی ذلت کی طرف اشارہ ہے۔ فَذُوْقُوْهُ یہ بطور استہزا ذکر کیا ہے اس لئے کہ ذوق میٹھی چیزوں میں ذکر ہوتا ہے اور آنَّ سے پہلے لفظ وَاعْلَمُوْا: پوشیدہ ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ﴿١٥﴾ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَى فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٦﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٧﴾ ذَٰلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ مُوهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِينَ ﴿١٨﴾ إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمُ الْفَتْحُ ۖ وَإِنْ تَنْتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۖ وَإِنْ تَعُودُوا نَعُدْ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٩﴾

"اے ایمان والو جب تم کافروں سے میدان جنگ میں ملو تو مت پھیرو ان سے پیٹھ پھیر کر [15]۔ اور جو کوئی اس دن ان سے اپنی پیٹھ پھیرے ماسوائے اس کے جو لڑائی کے لئے پینترا بدلنے والا ہو، یا کسی جماعت کے لئے طرف پناہ لینے والا ہو تو وہ یقیناً اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹا، اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے [16]۔ سو تم نے ان کو نہیں مارا لیکن اللہ نے ان کو مارا اور تو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک کی جس وقت کہ پھینکی تھی لیکن اللہ نے پھینکی اور تا کہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے [17]۔ یہ تو ہو چکا اور جان رکھ کہ اللہ سست کردے گا تدبیر کافروں کی [18]۔ اگر تم چاہتے ہو فیصلہ تو پہنچ چکا ہے تمہارے پاس فیصلہ اور اگر باز آؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر پھر یہی کرو گے تو ہم بھی پھر وہی کریں اور کچھ کام نہ آئے گی تمہاری جماعت تمہارے اگرچہ تم بہت ہوں اور جان لو اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہیں" [19]۔

تفسیر 15 یہ مجاہدین کے لیے پہلا قانون ہے میدان جنگ سے بھاگنا نہیں اور یہ بھاگنا کبیرۃ گناہ ہے لفظ: اَدْبَار کام کی

قباحت پر دلالت کرتا ہے: زَحْفًا: اصل میں بچے کا سرک سرک کر چلنے کو کہتے ہیں یعنی لشکر زیادہ ہونے کی وجہ سے کم رفتار سے چلتا ہے، اسی طرح زحف قریب ہونے کو کہا جاتا ہے یعنی لڑائی کے وقت ایک دوسرے کے قریب ہونگے۔

تفسیر 16 اس آیت میں بھاگنے پر عذاب اخروی کا ذکر ہے لیکن اس سے دو احوال کو مستثنیٰ کیا گیا ہے ایک جنگ کے لئے دشمن کو پیٹھ دکھائے اور دوسری طرف آ کر حملہ کر لے۔ دوسرا یہ ہے کہ اپنے گروہ سے الگ ہوا ہو تو اپنے آپ اُس یا دوسرے گروہ تک مدد حاصل کرنے کے لیے پہنچے تو ان دونوں حالتوں میں پیٹھ دکھاتا ہے لیکن بھاگنے کے ارادے سے نہیں تو جائز ہے۔

تفسیر 17 یہ پہلے دعوے کی چھٹی علت ہے خلاصہ یہ ہے کہ جن مشرکین کو بدر میں قتل کیا تھا یا ان کی آنکھوں میں کنکریاں اور بجری چلی گئی تھی یہ تم نے نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اسی سے غنیمت حاصل ہوئی ہے تو اس میں اختلاف نہ کرو: وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ: یہ نسبت یا تو اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو باوجود اسباب کی کمی کے ان کو قتل کرنے کی توفیق دی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کو ملائکہ کے ذریعہ سے قتل کیا گیا تھا اس لئے بعض روایات (صحیح بخاری کتاب المغازی باب شہود الملئکۃ بدر حدیث 3992 صحیح مسلم کتاب الجہاد حدیث 1763) میں مروی ہے کہ صحابہ نے وار نہیں کیا ہوتا کہ کافر کا سر گر جاتا۔ سوال: اس آیت میں رسول ﷺ کی طرف رمی کی نسبت ہوئی ہے اور ان سے نفی بھی ہوئی ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ جواب: یہ ہے کہ رمی کی نسبت ظاہر کے اعتبار سے ہے کہ رسول اللہ نے ایک مٹھی کنکریوں سے بھر لی اور کافروں کی طرف پھینکی اور رمی کی نفی اس وجہ سے ہے کہ ان کنکریوں کو کافروں کی آنکھوں میں پہنچانا یہ رسول کا کام نہیں تھا یہ اللہ کا کام تھا اس لئے کہ یہ معجزہ تھا۔ فائدہ 1: جو فعل بندے کے اختیار اور کسب کے ساتھ ہے ہاتھ سے (کنکری پھینکنا) تو اس کی نسبت: اِذْ رَمَيْتَ: کے ساتھ نبی کی طرف کی اور جو کام بندے کے کسب اور اختیار سے باہر ہے تو اس کی نبی سے نفی کر دی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نفس کی طرف نسبت کر لی۔ فائدہ نمبر 2: امام ابن جریر اور قرطبی رحمہم اللہ وغیرہ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ دلیل ہے اس بات پر کہ بندوں کے تمام کام اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے اور بندہ صرف کسب کرتا ہے۔ سوال: رمی کی طرح قتل کی نسبت ظاہری مومنوں کی طرف کیوں نہ کی؟ جواب: قتل سے مراد قاتل کے عمل کے بعد روح قبض کرنا ہے اور روح لینے کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو سکتی ہے جبکہ بندے کے کسب کے ساتھ قتل کا آلہ استعمال کرے تو اس کو بھی قتل کہا جاتا ہے لیکن یہاں یہ معنی مراد نہیں ہے۔

تفسیر 18 یہ ایمان والوں کو خطاب ہے: ذٰلِکُمْ : میں اشارہ ہے: بَلَاۗءً حَسَنًا : کی طرف جو کہ مبتدا محذوف ہے یعنی :اَلْغَرَضُ ذٰلِکُمْ اور اَنَّ ذٰلِکُمْ : پر عطف ہے یا: اِعْلَمُوْا : محذوف ہے۔

تفسیر 19 یہ زجر اور تخویف ہے اور کافروں کو خطاب ہے، آخر میں ایمان والوں کو بشارت ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کافروں نے ایک دعا مانگی تھی اور اس کا برا اثر اللہ تعالیٰ نے ان پر لوٹایا اور ان کو مغلوب کر دیا پھر اس آیت میں دو توجیہات ہیں پہلی توجیہ یہ کہ یہ کافروں کو خطاب ہے، یہ توجیہ بہتر ہے اس لئے کہ بعد والے جملے اس پر دلالت کرتے ہیں۔
دوسری توجیہ یہ ہے کہ یہ مومنوں کو خطاب ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے بدر جانے سے پہلے کعبے کا غلاف پکڑا اور یہ دعاء مانگی کہ اے اللہ ان دونوں گروہوں میں جو ہدایت پر ہو اور جو تیرے نزدیک بہتر ہو تو اس کی مدد کر جبکہ یہ دونوں صفات ایمان والوں میں تھیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ دعاء ان کے حق میں قبول کر لی: وَاَنَّ اللّٰهَ سے پہلے وَاعْلَمُوْا : پوشیدہ ہے اور یہ مومنوں کو خاص نصرت کے ساتھ بشارت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا
سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿٢١﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ
فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٣﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ
وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٢٤﴾
وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾

"اے ایمان والو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اتباع کرو اور اس سے منہ نہ پھیرو حالانکہ تم (قرآن اور حدیث) سنتے ہو[20]۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو کہتے ہیں ہم نے سنا حالانکہ انہوں نے (دل سے) نہیں سنا[21]۔ بیشک سب سے بدتر جانداروں میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہرے ہیں (حق سے) گونگے ہیں وہ لوگ ہیں جو (حق کو) نہیں سمجھتے[22]۔ اور اگر اللہ ان میں کچھ بھلائی جانتا تو انہیں سنا دیتا اور اگر انہیں سنا دیتا وہ اعراض کرنے والے ہوتے[23]۔ اے ایمان والوں اللہ تعالیٰ اور رسول کا حکم مانو جب تمہیں بلائے اس کی طرف جو تمہیں زندگی بخشے گی اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ کا حکم آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوتا ہے اور یقیناً خاص اسی کی طرف تمہیں اکٹھا کیا جائیگا[24]۔ اور اپنے آپ کو بچاؤ (جہاد کے ذریعے) اس فتنہ سے کہ نہیں پہنچے گا تم میں سے صرف ظالموں کو اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے"[25]۔

یہاں سے آیت 40 تک دوسرا باب ہے اس میں جہاد کے چار قوانین ذکر کیے گئے اور درمیان میں جہاد کی طرف ترغیب ہے اور پانچویں قانون کے بعد تقویٰ کے آثار وجوداً اور عدماً ذکر کیے گئے اور دو علتوں کا ذکر کیا اور منکرین کے لیے تخویف ہے اور سورۃ کا دوسرا دعویٰ ہے۔

تفسیر 20 اس آیت میں تیسرا قانون ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی پوری اتباع کرے: وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ: مفرد ضمیر کا ذکر اس لئے کیا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ایک ہے: وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ یہ زیادہ تاکید کے لیے قید ہے یعنی علم کے باوجود اعراض مت کرو سماع سے مراد سمجھنے کے لیے سننا اور تصدیق کرنا ہے۔

تفسیر 21 ان تین آیتوں میں منافقین کے لیے وعید ہے کہ وہ لوگ جہاد میں سستی کرتے ہیں اور ایمان والوں کو منافقین کے

اخلاق سے روکتا ہے یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو زبانی اقرار کرتا ہے کہ میں فرمانبردار امتی ہوں لیکن اس پر اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا تو یہ اقرار بے فائدہ ہے، یہ نفاق کی علامت ہے: لَا يَسْمَعُونَ: سماع کی نفی سے مراد قبولیت اور تصدیق کی نفی ہے۔

تفسیر 22 یہ پہلی آیت کے لئے دلیل ہے کہ منافقین کی طرح نہ ہونا اس لئے کہ یہ برے لوگ ہیں، اس آیت سے معلوم ہوا کہ عنادی کافر اور مشرک اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام مخلوق سے بدتر ہوتا ہے۔ اور یہ قتال کے لیے اصل علت ہے اسلئے کہ شر والی چیز کا قتل کرنا ضروری ہے اور یہ آیت منافقین اور کافروں کے لیے عام ہے اور اس طرح اس سورۃ 55 میں اور سورۃ بَيِّنَةٌ: آیت 5 میں بھی ہے اور ان کے شریت (بدتر ہونے) کی وجہ یہ ہے کہ باقی جانداروں کے جب کان اور زبان اور دماغ ہیں تو وہ ان سے اپنے مناسب فائدے لیتے ہیں جبکہ یہ کافر اور منافقین فائدے نہیں لیتے تو اس سے بدتر ہو گئے جیسے سورۃ اعراف آیت 179 اور فرقان 44 میں ہے۔

تفسیر 23 اللہ تعالیٰ کا علم اس کے وجود سے کنایہ ہے اس لئے کہ جب خیر موجود ہوگا تو اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہوگا اور اس جملے کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ان میں حق کو طلب کرنا موجود ہوتا تو ان کو الہام اور تصدیق کے ساتھ سناتا اس لئے کہ انابت کے ساتھ ہدایت حاصل ہوتی ہے اور یہ جملہ سوال کا جواب ہے یعنی اگر سوال ہو جائے کہ باوجود اس کے کہ یہ لوگ صُمٌّ اور بُكْمٌ: ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سمجھنے کی صلاحیت دے؟ جواب: یہ ہے کہ ان میں انابت نہیں ہے اس لئے فہم ان کو حاصل نہیں ہوتا ہے: وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ: یہ دوسرے سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ اگر چہ یہ لوگ اپنی ضد اور عناد میں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کو سنائے تو جواب ہوا کہ اگر اس حال میں ان کو سنائے تو یہ لوگ منہ پھیرتے ہیں معلوم ہوا کہ اس آیت میں دونوں جملے مستقل ہیں صغریٰ اور کبریٰ نہیں ہے۔

تفسیر 24 یہ جہاد کا تیسرا قانون ہے اور خلاصہ یہ ہے کہ جہاد کی فرضیت کے وقت نفل کام چھوڑ دو اور جہاد میں ضرور شریک ہو جاؤ اس پر دلیل صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4647 میں حدیث ہے ابو سعید ابن المعلی سے کہتے ہیں کہ میں مسجد میں نفل نماز پڑھ رہا تھا تو مجھے نبی کریم ﷺ نے آواز دی لیکن میں نے جواب نہ دیا جب میں نماز سے فارغ ہوا تو چلا گیا اور عذر پیش کیا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا تو آپ نے فرمایا کہ کیا آپ نے یہ آیت نہیں سنی؟ تو اس سے معلوم ہوا کہ فرض کام کے لیے ہر نفل کام کو چھوڑنا ضروری ہے: لِمَا يُحْيِيكُمْ: اس سے مراد جہاد ہے اس لیے کہ وہ زندگی کا سبب ہے

اسی طرح اس سے مراد قرآن کریم اور سنت بھی ہے اس لئے کہ وہ بھی حیات کا سبب ہے، امام شربینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد دینی علوم ہیں اور صحیح عقیدہ اور ایمان جہاد ہے: یَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ: پردہ ڈالنے سے مراد مہر لگانا ہے جیسے دوسرے مقام میں ان کو ختم اور طبع کہا گیا ہے یہ قول امام مجاہد کا ہے، ضحاک نے کہا ہے کہ یہ عام ہے یعنی مؤمن اور معصیت کافر اور اطاعت کے درمیان رکاوٹ اور مانع پیدا کرتا ہے۔

تفسیر 25 یہ اِسْتَجِيبُوا: پر عطف ہے اور جہاد کی طرف ترغیب ہے چاہے زبان کے ساتھ ہو یا تلوار کے ذریعے سے ہو جبکہ جہاد کو ترک کرنے میں عذاب آنے کا اندیشہ ہے" بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد = بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد" ترجمہ۔ بے ادب خود کو تنہا برائی میں نہیں ڈالتا بلکہ پوری دنیا کو آگ میں ڈال دیتا ہے۔ اور اس کے بارے میں ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہت سے احادیث ذکر کی ہیں آیت کے مفہوم سے یہ معلوم ہوا کہ جہاد اور حق کی دعوت عذاب دنیاوی کے دور کرنے کا سبب ہے۔

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَ
رَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢٦﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَ
أَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٧﴾ وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٨﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٢٩﴾

"اور اس وقت کو یاد کرو جب تم کم تھے زمین میں کمزور سمجھے گئے تھے تم ڈر رہے تھے کہ لوگ تمہیں اُچک کر لے جائینگے پس تمہیں جگہ دی اور اپنی مدد کے ساتھ تمہیں مضبوط کیا اور پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا تاکہ تم شکر ادا کرو[26]۔ اے ایمان والو اللہ تعالیٰ اور رسول کے ساتھ خیانت مت کرو اور تم جانتے ہو[27]۔ اور جان لو کہ بیشک تمہارے مال اور اولاد تمہارے لئے امتحان ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ کے پاس بڑا اجر ہے[28]۔ اے ایمان والو اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو تمہیں فتح دیگا اور تم سے تمہارے گناہوں کو مٹادے گا اور تمہیں معاف کرے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے"[29]۔

تفسیر 26 اس آیت میں بھی جہاد کی طرف ترغیب ہے اور اشارہ ہے کہ یہ تین انعامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس پر ہوں تو اس پر جہاد فرض ہے پہلا انعام اپنی جگہ جیسے مدینہ منورہ ہے دوسرا ظاہری اسباب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد جیسے بدر میں ہوا

تیسرا حلال رزق جیسے مال غنیمت کو حلال کرنا اس آیت میں شکر سے مراد جہاد کرنا ہے: يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ يَتَخَطَّفُ: اس کو کہا جاتا ہے کہ چیل چوزوں کو اچک کر لے جائے یا باز اپنے شکار کو پنجوں میں اٹھالیتا ہے۔

تفسیر 27 یہ چوتھا قانون ہے کہ مجاہد کے لیے کسی قسم کی خیانت کرنا جائز نہیں ہے اللہ تعالی کے ساتھ خیانت اس کے احکام میں کمی یا زیادتی پیدا کرنا ہے اور رسول کے ساتھ خیانت تو اس کی سنت کی مخالفت کرنا ہے اور اماتوں سے مراد وہ تمام حقوق ہیں جن کا بندہ مکلف ہوتا ہے خیانت حق کی مخالفت کرنا ہے چھپ کر وعدے کی خلاف ورزی کی صورت میں یہ نفاق کی علامت ہے اسی طرح امام راغب رحمہ اللہ نے مفردات میں بھی ذکر کیا ہے۔

تفسیر 28 یہ پہلی آیت کی علت ہے کہ جب خیانت ہوتی ہے تو مال یا اولاد کی وجہ سے ہوتی ہے اور وہ فتنہ ہے، فتنے سے مراد امتحان ہے یا گناہوں میں اور خیانت میں مبتلا ہونے کا سبب ہے اور اولاد کی نسبت یہ سبب مالوں میں زیادہ ہے، اس طرح سورۃ منافقون 9 اور سورۃ تغابن 25 میں مذکور ہے اس وجہ سے مالوں کا ذکر پہلے کیا ہے۔

تفسیر 29 یہ جہاد کے لیے پانچواں قانون ہے مطلب یہ ہے کہ مجاہد پر تقوی لازم ہے، وہ فتنے اور خیانت سے بچنے کا سبب ہے تقوی سے مراد اللہ تعالی کے اوامر کی پیروی اور اللہ تعالی کے نواہی سے رکنا اور شبہات کو چھوڑنا ہے اس آیت میں اس تقوی کے تین فائدے ذکر کئے ہیں ایک فتح کا حاصل ہونا دوسرا تکلیف اور سختی کا دور ہونا، تیسرا گناہوں کا معاف ہونا اور اس کے بعد تقوی ہونے اور نہ ہونے کے آثار بیان کرتے ہیں: فُرْقَانًا: میں بہت سے اقوال ہیں اور یہ لفظ ان سب کو شامل ہے یعنی دل کا نور جس کے ساتھ حق اور باطل کی تمیز ہوتی ہو فتح غلبہ دارین کی نجات شبہات کا نکلنا ایمان والوں کے نام کی شہرت سَيِّئَاتِ: صغائر گناہ بری صفات اور سختی تینوں معنوں کو شامل ہے اور يَغْفِرْ لَكُمْ: گناہ کبیرہ کے لیے ہے ذُو الْفَضْلِ: میں اشارہ ہے کہ یہ تین فائدے اللہ تعالی کے فضل کے ساتھ ہیں صرف تقوی کے ساتھ نہیں۔

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ
الْمَاكِرِينَ ﴿٣٠﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا ۙ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٣١﴾
وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَا
كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿٣٣﴾ وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ
يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٤﴾

"اور جب آپ ﷺ کے خلاف کافر لوگ چال چل رہے تھے تاکہ آپ کو قید کرلیں یا آپ کو قتل کردیں یا آپ کو نکال دیں اور یہ لوگ چال چل رہے تھے اور (تجھے بچانے کے لئے؟) اللہ تعالیٰ چھپی تدبیر چلا رہے تھے اور اللہ تعالیٰ بہت بہتر تدبیر چلانے والا ہے [30]۔ اور جب ان پر ہماری آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں تحقیق ہم نے سن لیا اگر ہم چاہیں تو ضرور اس طرح کہتے نہیں ہے یہ قرآن مگر پچھلے لوگوں کے قصے کہانیاں [31]۔ اور جس وقت انہوں نے کہا اے اللہ اگر یہ قرآن حق ہے تیری طرف سے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا ہمیں دردناک عذاب دینا [32]۔ اور نہیں تھا اللہ تعالیٰ کہ ان کو عذاب دیتا جب کہ آپ ان میں موجود ہوں اور اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دینے والا نہیں تھا یہ لوگ بخشش طلب کرتے ہیں [33]۔ اور ان کے لیے کیا عذر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہیں دیگا جبکہ یہ لوگ مسجد حرام سے روکتے ہیں جبکہ یہ لوگ اس کے مختار نہیں ہیں اس کے مختار لوگ صرف پرہیزگار لوگ ہیں لیکن ان میں سے زیادہ لوگ نہیں جانتے" [34]۔

تفسیر 30 یہاں پر تقویٰ کے وجود کا اثر بیان کیا ہے کہ جس میں تقویٰ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دشمنوں کی چال سے بچاتا ہے دوسرا یہ کہ یہ آیت پہلے دعوے کے لیے چھٹی علت ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین نے دار الندوۃ میں اجلاس منعقد کیا بعض نے کہا اس نبی کو قید کرتے ہیں اور بعض نے کہا کہ اس کو گاؤں سے نکالتے ہیں اور آخری اتفاق اس بات پر ہوا کہ ہر قبیلے میں سے ایک ایک بڑا آئے ایک ساتھ اس پر حملہ کریں گے اور قتل کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اندھا کردیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان سے رات کو نکل گئے اور ہجرت کرلی یہ غزوہ بدر اور غنیمتوں کے حاصل کرنے کا سبب بن گیا تو تم اس کے بارے میں اختلاف نہ کرو: وَيَمْكُرُ اللَّهُ: مکر چھپی تدبیر چلانے کو کہتے ہیں چاہے خیر کی ہو یا شر کی اللہ تعالیٰ کی صفت میں خیر کی تدبیر کے بارے میں استعمال ہوتا ہے اس طرح سورۃ آل عمران 54 میں ہے تو اللہ

تعالی کی طرف یہ نسبت حقیقتاً ہے مجاز نہیں ہے۔

تفسیر 31 یہ منکرین کو توبیخ اور زجر ہے اور تقویٰ نہ ہونے کا اثر ہے گزشتہ آیت میں مشرکین کا عملی مکر مذکور تھا اور اس آیت میں قولی مکر کا ذکر ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں تھا اور یہ قرآن کے مقابلے میں ہے :لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا: یہ قول زیادہ ضد اور عناد کی وجہ سے ہے ورنہ قرآن کا اعجاز ان کو واضح ہوا تھا یہ لوگ ایک سورۃ اور ایک آیت سے بھی قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے :اَسَاطِيْرُ: اسطورت کی جمع ہے لکھی ہوئی بات کو کہتے ہیں یا اسطور کی جمع ہے اور وہ سطر کی جمع ہے لکیریں کھینچی ہوئیں۔

تفسیر 32 یہ بھی منکرین کو وعید ہے اور تقویٰ کے نہ ہونے کا اثر ہے اور پہلے دعوے کے لیے آٹھویں علت ہے، ان کا یہ کہنا عناد پر مبنی ہے اور اس لئے کہ باقی لوگوں کو شک میں ڈالتے ، ہونا تو یہ چاہئے کہ یہ لوگ کہتے اے اللہ اگر یہ حق ہے تو ہمیں اس کی ہدایت دینا ، اسی طرح عذاب کی طلب سورۃ معارج آیت 1 ، اور عنکبوت آیت 53 ، سورۃ شعراء 187 میں مذکور ہے۔

تفسیر 33 اس آیت میں دو سوالوں میں دو جملے ہیں پہلا سوال یہ ہے کہ جب یہ لوگ عذاب مانگ رہے تھے تو ان پر عذاب کیوں نہیں آیا؟ اور یہ ان کے اس وقت کا مطالبہ تھا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے؟ جواب ہوا کہ جس قوم میں نبی موجود ہوتا ہے تو ان پر عذاب نہیں آتا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کر لی تو پھر ان پر عذاب کیوں نہیں آیا؟ ان کا عذاب تو غزوہ بدر کو موخر کیا گیا جواب ہوا کہ استغفار کی وجہ سے موخر کیا گیا اور اس استغفار میں دو قول ہیں پہلا قول یہ کہ یہ مشرکین طواف کی حالت میں کہتے تھے :غُفْرَانَكَ: تو وہ عذاب کے موخر ہونے کا سبب بن گیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ استغفار اگر چہ گناہ گار کی طرف سے بھی ہو لیکن اس سے بعض شر اور ضرر ختم ہوتے ہیں (قرطبی) حالانکہ اس سے مکمل عذاب ختم نہیں ہوتا۔ دوسرا قول: اس سے مراد ان ایمان والوں کا استغفار ہے کہ جنہوں نے کمزوری کی وجہ سے جہاد نہیں کیا تھا اور سورۃ فتح 25 میں مذکور ہے یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ عذاب سے امن یا تو نبی کی وجہ سے ہوتا ہے یا استغفار کی وجہ سے ہوتا ہے اس کا پہلا سبب تو اب نہیں ہے لیکن دوسرا سبب قیامت تک جاری ہے یہ روایت ابو موسیٰ اشعری اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی (ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3082) امام ترمذی نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے ابن عباس کی قول کو تفسیر زاد المسیر میں شیخ عبد الرزاق مھدی نے ضعیف کہا ہے 2/207۔

تفسیر 34 اس آیت میں اس عذاب کے سبب کا ذکر ہے جو مشرکین پر جنگ بدر میں نازل ہوا تھا اور آثار کا ذکر تقوی کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے: إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ: اس کے دو معانی ہیں پہلا یہ ہے کہ اللہ تعالی کے دوست صرف متقین ہوتے ہیں پاگل اور مجذوب لوگ نہیں ہوتے جیسے جاہل لوگوں کا یہ عقیدہ ہے اور اس کا تفصیلی رد روح المعانی میں مذکور ہے اور اسی طرح سورۃ یونس 62،63 میں ہے لیکن یہاں پر تقوی کا پہلا مرتبہ مراد ہے پہلے معنی کے اعتبار سے توحید اور ایمان ہے سورۃ یونس میں کامل تقوی مراد ہے: وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ: اکثر کل کے معنی میں ہے یا وجہ یہ ہے کہ ان میں کم لوگ علم کے باوجود عنادی ہیں۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾

" اور نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس مگر سیٹیاں اور تالیاں بجانا تو عذاب کو چکھ لو اس وجہ سے کہ تم کفر کرتے تھے [35]۔ بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ تعالی کے راستے سے روکیں تو عنقریب یہ لوگ ان مالوں کو خرچ کریں گے پھر ان پر افسوس بن جائیگا پھر کمزور کئے جائینگے اور جو لوگ کافر ہیں ان کو جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے" [36]۔

تفسیر 35 یہ بھی منکرین کو توبیخ اور زجر ہے تقوی کے نہ ہونے کا اثر ہے، اس آیت کے دو معانی ہیں پہلا یہ کہ قریب کے مشرکین بیت اللہ کا طواف کیا کرتے تھے اور سیٹیاں اور تالیاں بجاتے اور اسے عبادت سمجھتے تھے جیسے اب اس کی مثال بعض پیروں کی ہے جو ذکر کے وقت ناچتے گاتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں یہ سب شریعت کے خلاف ہے یہ عقلمند لوگوں کا کام نہیں ہے اسی طرح امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے دوسری تفسیر یہ ہے کہ بیت اللہ کے پاس ان کا وہ نماز پڑھنا ایسے برباد ہے جیسے سیٹیاں اور تالیاں بجانا عبث اور بیکار ہے یہ معنی امام آلوسی اور امام راغب رحمہم اللہ نے ذکر کیا ہے معلوم ہوا کہ ان میں صلوۃ (نماز) ادا ہوتی تھی لیکن شرک کی وجہ سے برباد ہوگئی تھی اور مُكَاءً وَتَصْدِيَةً مشابہت کے طور پر ہے۔

تفسیر 36 اس آیت میں بھی منکرین کو ڈانٹ ہے اور تقوی کے نہ ہونے کا اثر بیان ہوا ہے اور جسمانی عبادت کی بربادی کے بعد مالی عبادت کی بربادی کا ذکر ہے: لِيَصُدُّوا: ہر وہ انفاق جو دین حق کے مقابلے میں باطل دین کی اشاعت

کے لیے ہو وہ اس میں داخل ہے۔ حسرۃ انفاق کا مقصد حاصل نہ ہونے کے سبب: ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ: یہ بربادی میں مزید اضافہ ہے یعنی پہلے تو مقصد سے محروم ہو جائینگے پھر مومنوں کے مقابلے میں کمزور ہو جائینگے: اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفر پر پختہ رہ جائیں اور پھر ان دونوں آیتوں میں تخویف اخروی ہے۔

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿37﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿38﴾ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿39﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿40﴾

"تا کہ الگ کرے اللہ تعالیٰ ناپاک کو پاک سے اور ناپاک (لوگوں) کو رکھ لینگے ان کے بعضوں کو بعض پر ڈھیر بنا کر جہنم میں ڈال دیگا یہی لوگ (پورے) نقصان والے ہیں[37]۔ آپ کہہ دیجئے ان لوگوں کے بارے میں جو کافر ہیں اگر یہ لوگ باز آجائیں (کفر اور شرک سے) ان کو وہ گناہ معاف کر لئے جائینگے جو گزر چکے ہیں اور یہ لوگ اگر (جنگ کی طرف) پلٹ گئے تو یقیناً پہلے لوگوں کا طریقہ گزر چکا ہے[38]۔ اور ان سے قتال کرو یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لیے ہو جائے پس اگر یہ لوگ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ ان اعمال کو جو وہ کرتے ہیں اس کو دیکھنے والا ہے[39]۔ اور اگر یہ لوگ منہ پھیر لیں تو جان لو کہ بیشک اللہ تمہارا مولیٰ ہے بہتر مولیٰ اور اچھا مددگار ہے"[40]۔

تفسیر 37 اس آیت میں منکرین کا آخرت میں برا حال پانچ طریقوں سے ذکر ہوا ہے: لِيَمِيْزَ اللّٰهُ: لام يُحْشَرُوْنَ کی علت ہے یا لام عاقبت کا ہے: خَبِيْثَ وَ طَيِّبِ: شرک کے عقیدے کے اعتبار سے خبیث ہے اور توحید کے عقیدے کے اعتبار سے طیب ہے اور یہ تمیز آخرت میں ہے جیسے سورۃ یٰس 59 اور سورہ یونس 28 میں مذکور ہے یا دنیا میں بھی ہے جیسے سورۃ آل عمران 179 میں ہے۔

تفسیر 38 ان کی خباثتوں کو ذکر کرنے کے بعد یہ منکرین کو توبہ کی طرف ترغیب ہے یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان لانے سے تمام گناہ معاف ہوتے ہیں چاہے وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد ہو لیکن یہ حربی کافر کے لیے ہے جبکہ ذمی کافر کے گناہ معاف نہیں ہوتے: سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا انبیاء علیہم السلام اور ایمان والوں کی مدد کرنا،

کافروں کو عذاب دینا اور ان کو مغلوب کرنا ہے اور: اَلْاَوَّلِیْنَ: سے مراد پہلے انبیاء علیہم السلام اور مؤمنین ہیں جیسے سورۃ اسراء 77 میں ہے یا اس سے مراد پہلے کافر ہیں جیسے سورہ فاطر 43 میں دونوں معنوں میں: سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ: کی اضافت مفعول کی طرف ہے کبھی اضافت فاعل کی طرف ہوتی ہے جیسے سورۃ اسراء 77 اور سورۃ فاطر 43 میں ہے۔

تفسیر 39 یہ سورۃ کا دوسرا دعویٰ ہے اور یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ قتال اس وقت تک جاری رہے گا جب تک دنیا میں شرک موجود ہے: وَقَاتِلُوْا یہ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ: پر عطف ہے اور لفظ یَعُوْدُوْا: کے تحت ہے فتنۃ شرک کرنا اور مومن کو دین سے پھیرنا لیکن یہاں پر پہلا معنیٰ مناسب ہے اور سورۃ بقرہ 193 میں دوسرا معنیٰ مناسب ہے شرک کو ختم کرنا اس بات کے لیے مستلزم ہے کہ پورے عالم میں توحید ہوگی اسی وجہ سے اس آیت میں کُلُّہٗ: ذکر کیا ہے سورۃ بقرۃ میں کُلُّہٗ: ذکر نہیں کیا تھا اور اس معنیٰ کی وجہ سے یہاں حَتّٰی اِلٰی: کے معنیٰ میں ہے اور سورۃ بقرۃ میں علت کے معنیٰ کے ساتھ ہے۔

تفسیر 40 آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ قتال سے نہیں رکتے تو تم بھی ان سے قتال کرو اور اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کریگا اس لئے کہ وہ تمہارا مولیٰ ہے: مَوْلٰکُمْ مَوْلٰی مُتَوَلِّیْ (سنبھالنے والے) کے معنیٰ میں ہے: نِعْمَ الْمَوْلٰی: اللہ تعالیٰ جس کی تولی (دیکھ بال) کرتا ہے تو وہ کبھی بھی برباد نہیں ہوتا اور جس کی مدد کرتا ہے تو وہ کمزور نہیں ہوتا اور دونوں مقام میں یہ نِعْمَ: کا مقصد ہے اسی طرح سورۃ حج 78 میں بھی ہے وہاں بھی جہاد کا مقام تھا اور وہ دعوت کے معنیٰ میں تھا اور یہاں قتال کا مقام ہے اور قتال کا مقام دعوت سے زیادہ سخت ہے اسی وجہ سے اس آیت میں (فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ) کے ساتھ تاکید ذکر ہوئی ہے۔

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ
السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ
قَدِیْرٌ۝ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی وَ الرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَ لَوْ تَوَاعَدْتُّمْ
لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ ۙ وَ لٰكِنْ لِّیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّ یَحْیٰی مَنْ حَیَّ
عَنْۢ بَیِّنَةٍ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۝

"اور جان لو کہ بیشک جو تم نے کافروں سے میدان جنگ میں کوئی چیز بھی حاصل کیا ہے تو بیشک اللہ تعالیٰ کے لئے پانچواں حصہ ہے اور رسول کے لئے اور (رسول) کے رشتہ داروں کے لئے اور یتیموں غریبوں مسافروں کے لئے اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو اور اس (مدد) پر جو ہم نے اپنے بندے پر بھیجی تھی فیصلے (بدر کے دن) جس دن دو گروہ آمنے سامنے آئے تھے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے[41]۔ جس وقت تم نزدیک کنارے پر تھے اور وہ دور کنارے پر تھے اور (سوداگروں) کا قافلہ تم سے پیچھے جا رہا تھا اور اگر تم وعدہ کرتے تو ضرور وقت مقررہ میں اختلاف کرتے لیکن (اللہ تعالیٰ نے تمہیں بغیر وعدے کے اکٹھا کیا) اس لئے تاکہ اللہ تعالیٰ وقت مقررہ کو پورا کرے اس لئے فوت ہو جائے وہ شخص جو دلیل کے بعد فوت ہوا اور زندہ رہ جائے وہ شخص جو دلیل پر زندہ ہو اور بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے"[42]۔

تفسیر41 یہاں سے سورۃ کا دوسرا حصہ ہے اور اس میں بھی دو باب ہیں پہلا باب آیت 56 تک ہے اس میں اول دعوے کی تشریح ہے اور اس کی پانچ علتیں ہیں اور جہاد کا ایک قانون ہے اور زجر ہیں اور دنیاوی اور اخروی تخویف ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ مال غنیمت کو جہاد کا امیر تین حصوں میں تقسیم کرے گا یہ اللہ اور رسول کا حکم ہے جیسے پہلی آیت میں گزر چکا ہے۔ چار حصوں کو عاملین میں تقسیم کیا جائیگا اور پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہے جس کے پانچ مصارف اس آیت میں مذکور ہیں پہلے کے ساتھ ربط یہ ہے کہ پہلی آیت میں قتال کا حکم تھا تو اس آیت میں اس مال کا حکم ذکر کر رہا ہے جو قتال کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے جو کہ غنیمت ہے اور مال غنیمت کا حلال ہونا اس امت کی خصوصیت ہے پہلی امتوں پر مال غنیمت کی قبولیت کے لیے آسمان سے آگ نازل ہوتی تھی: لِلّٰهِ: اللہ تعالیٰ کا ذکر بطور اختیار مطلقہ اور برکت حاصل کرنے کے لئے ہے: لِلرَّسُوْلِ: یہ حصہ بعض علماء کے نزدیک آپ کی زندگی کے ساتھ خاص تھا آپ کے اور آپ کے اہل

اور مہمانوں وغیرہ کے لئے اور آپ کی وفات کے بعد ساقط ہوا ہے اور بعض علماء کے نزدیک یہ حصہ بیت المال میں جمع کیا جائیگا مسلمانوں کے مصالح کے لئے علماء کے لئے جو تفسیر اور فقہ اور حدیث کے مدرسین ہیں ان کا خرچہ اسی سے دیا جائیگا (امام شریح اور ابن کثیر) : وَلِذِی الْقُرْبٰی : اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے رشتہ دار ہیں جو فقط بنی ہاشم اور بنی مطلب ہیں اس آیت میں : اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ : کے ساتھ پہلی علت کا بیان ہے کہ جب تم ایمان لاتے ہو اور یقین رکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں تمہاری مدد کی ہے تو مال غنیمت میں کیوں اختلاف کرتے ہو؟ اِنْ : کی جزا مخفی ہے : وَاعْلَمُوْا : اس پر دلالت کرتا ہے (تو غنیمت کی تقسیم اسی طریقے سے کرلو) اور یہ دلیل ہے کہ مال غنیمت میں سے خمس کی ادائیگی ایمان کا جزء ہے جیسے وفد عبد القیس کی حدیث (صحیح بخاری کتاب الایمان حدیث 53 میں مذکور ہے اور امام بخاری نے بَابُ اَدَاءُ الْخُمُسِ مِنَ الْاِیْمَانِ : میں درج کی ہے)۔

تفسیر 42 اس دعوے کے لئے یہ دوسری علت ہے خلاصہ یہ ہے کہ ابوجہل کے قبیلہ کے ساتھ بغیر کسی کی وعدے کے اللہ تعالیٰ نے تمہیں لڑایا اور تمہیں فتح دی تو مال غنیمت میں مت لڑو آیت کی تفسیر یہ ہے کہ بدر میں ایک چھوٹا تالاب تھا جو مدینے کے قریب تھا اس کی ہر طرف مسلمانوں کا لشکر تھا اور وہ دوسری طرف جو مدینے سے دور اور مکے کے قریب تھا اور مکے سے اس کی طرف راستہ نکلا ہے اس پر ابوجہل کا بڑا لشکر تھا اور ابوسفیان کا قافلہ مدینے کے پیچھے کی طرف سمندر کے کنارے پر تھا جو بدر سے تین میل دور تھا : لَاخْتَلَفْتُمْ : اختلاف دونوں طرفوں سے واقع ہوگا اس لئے کہ ایک دوسرے پر زیادہ ہونے کا گمان کیا ہوگا : اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا : امر سے مراد قتال میں ایمان والوں کا غلبہ حاصل کرنا ہے : لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ : اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ بدر کی فتح کے بعد اسلام کی سچائی کی دلیل ظاہر ہوئی تو اگر کوئی فوت ہوجائے تو اس کی موت دلائل دیکھنے کے بعد ہے اور اگر کوئی زندہ ہے تو تب بھی دلیل دیکھ لی دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہلاکت سے مراد کفر ہے اور حیات سے مراد ایمان ہے ۔ زیادہ تر مفسرین نے دوسرا قول بہتر قرار دیا ہے : وَاِنَّ اللّٰهَ : یہ مومنوں اور کافروں کے احوال پر معطوف ہے جو پہلے جملوں میں ذکر ہوا ہے۔

إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ
عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٤٣﴾ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ
اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٤٤﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا
اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٤٥﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ ۖ وَاصْبِرُوا ۚ
إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٤٦﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن
سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٤٧﴾

"جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ لوگ خواب میں کم دکھائے اور اگر یہ لوگ آپ کو زیادہ دکھاتا تو ضرور تم کمزور پڑ جاتے اور جنگ کے بارے میں تم ضرور اختلاف کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں بچایا (کمزوری اور اختلاف سے) یقیناً وہ ان چیزوں کو جاننے والا ہے جو سینوں میں ہیں [43]۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہاری نگاہوں میں بہت کم دکھایا اور تمہیں ان کی نگاہوں میں بہت کم دکھایا تاکہ اللہ تعالیٰ اس کام کو انجام تک پہنچادے جو کرنا ہی تھا اور تمام کاموں کا پلٹنا اللہ کی طرف ہے [44]۔ اے ایمان والو جب تمہارا کسی گروہ سے سامنا ہو تو ثابت قدمی اختیار کرنا اور کثرت کے ساتھ اللہ کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ [45]۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں اختلاف نہ کرو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے [46]۔ ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لئے اپنے گھروں سے نکلے تھے اور اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو گھیرنے والا ہے" [47]۔

تفسیر 43 یہ اس دعوے کے لئے تیسری علت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو خواب میں دکھایا کہ کافروں کی تعداد کم ہے اگر زیادہ دکھاتا تو پھر جنگ کے نہ ہونے کا احتمال تھا تمہارے ڈر کی وجہ سے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس طریقے سے جنگ اور غنیمت کا سبب بنادیا اس وجہ سے مال غنیمت میں اپنے اختیارات استعمال مت کرو۔ [redacted] کافر زیادہ تھے تو ظاہر میں ان کا کم دکھانا تو جھوٹ ہے؟ جواب: سارے خواب باطنی امور پر بناء ہوتے ہیں تو حقیقت میں کافر اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیر اور ذلیل ہونے کی وجہ سے کم تھے یا اس وجہ سے کہ مستقبل میں بعض قتل ہوئے اور بعض ایمان

لائے: إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ واو کے بغیر ذکر کیا اس لئے کہ یہ پہلے ملازمے کی دلیل ہے جو وَلَوْ أَرٰكَهُمْ میں ہے۔

تفسیر 44 یہ دعوے کے لئے چوتھی علت ہے خلاصہ یہ ہے کہ میدان جنگ میں دونوں گروہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کو تھوڑے تھوڑے ظاہر کئے تھے تاکہ جنگ ہو جائے اور مال غنیمت بھی حاصل ہو جائے تو مال غنیمت میں اختلاف نہیں کرنا: أَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا: اس آیت میں اس سے مراد جنگ کرنا ہے جبکہ گزشتہ آیت میں اس سے مراد فتح اور غلبہ تھا: يُرِيْكُمُوْهُمْ: فاعل کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور كُمْ اور هُمْ دو مفعول ہے اور قَلِيْلًا: حال ہے۔

تفسیر 45 جب پہلی آیتوں میں صحابہ کرام پر انعامات کا ذکر ہوا جو کہ قتال کے اسباب تھے تو اب قتال کے آداب کا ذکر کر رہے ہیں پہلے حصے میں پانچ قوانین ذکر ہوئے ہیں یہ چھٹا قانون تین آیتوں میں ذکر ہے اس میں چھ باتیں ہیں جن میں سے دو اس آیت میں مذکور ہیں پہلی یہ کہ میدان جنگ میں ثابت قدم رہو۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کو زیادہ یاد کرو یہ دونوں حقیقت میں کامیابی کے لئے کافی ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ: لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: ذکر ہوا: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ: اس سے مراد دل اور زبان دونوں کا ذکر ہے لیکن شرط یہ ہے کہ پوشیدہ ہوگا اس لئے کہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے مرفوع حدیث اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے قیس بن عباد رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ قتال کے وقت بلند آواز نکالنے کو مکروہ سمجھتے تھے طبرانی کبیر 5130 مصنف عبدالرزاق 9518 وغیرہ میں روایتیں آئی ہیں مگر محققین علماء نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے جن میں مخفی ذکر کا تذکرہ ہے (مترجم) اس ذکر میں نصرت طلب کرنے کے لئے اور غلبے کی دعائیں بھی داخل ہیں اور اس کی طرف ترغیب ہے۔

تفسیر 46 اس آیت میں جہاد کے لئے تین باتیں ہیں رسول اللہ کی اطاعت اور اختلاف سے بچنا اور صبر کرنا اور یہ کہ اختلاف طاقت کے زوال اور کمزوری کا سبب ہے جبکہ صبر اللہ تعالیٰ کی دوستی کا سبب ہے: رِيْحُكُمْ: اس میں دو قول ہیں پہلا یہ کہ اس سے مراد قوت اور بطور تشبیہ رعب ہے جیسے ریح ہر جگہ میں داخل ہوتی ہے تو اسی طرح قوت اور رعب بھی تاثیر کرتا ہے دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حقیقی معنیٰ ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے مدد کی ہوائیں آتی ہیں اور جب اللہ کی طرف سے مدد نہیں ہوتی تو ہوائیں آنا بند ہو جاتی ہیں۔

تفسیر 47 اس آیت میں جہاد کے لئے چھٹی بات ہے کہ کافروں کے ساتھ تین صفات میں مشابہت نہ کرنا ایک حق سے تکبر دوسرا عمل میں ریاکاری تیسرا اللہ تعالیٰ کی راہ سے لوگوں کو روکنا: بَطَرًا: اصل میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کو گناہوں میں خرچ

کرنے کو کہا جاتا ہے ۔ وَيَصُدُّوْنَ: یہ فعل مضارع کے ساتھ ذکر کیا اشارہ ہے کہ بطور تکبر اور ریاکاری کے ان کا نکلنا تو ایک مرتبہ تھا اور ان کا سبیل اللہ سے روکنا ہمیشہ کی عادت تھی۔

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾

" اور جب شیطان نے انہیں ان کے اعمال خوبصورت کر کے دکھائے اور کہا تم پر آج لوگوں میں سے کوئی غالب آنے والا نہیں ہے اور یقیناً میں تمہارا مددگار ہوں تو جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تو پلٹ گیا (یہ شیطان) اپنی ایڑھیوں پر اور کہا بیشک میں تم سے الگ ہوں میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھتے بیشک میں اللہ تعالیٰ (کے عذاب) سے ڈرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا [48]۔ جب منافقین نے کہا اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں مرض (شک) تھا کہ ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکا دیا ہے اور جس نے اللہ پر توکل کیا تو بیشک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے" [49]۔

تفسیر 48 اس آیت میں پہلے دعوے کے لئے پانچویں علت ہے حاصل یہ ہے کہ ابلیس نے جنگ بدر کے دن کافروں کو دلیر بنایا تھا پھر جب ملائکہ کو دیکھ لیا تو بھاگ گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کمزور بنایا اور تمہیں مال غنیمت دیا تو اس میں اختلاف مت کرو۔ امام بیہقی کی سنن کبریٰ کی روایت میں ہے کہ ابلیس جنگ بدر کے دن سراقہ بن مالک کی شکل میں آیا (یہ ایک قبیلے کا سردار تھا) اور ابوجہل کو لڑائی میں تیزی کا حکم دیا اور ایک مشرک حارث بن ہشام کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اور میدان جنگ کی طرف گئے جب اس نے جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا تو ڈر کر بھاگ گیا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیطان کبھی انسان کی شکل میں آتا ہے اور لوگوں کو گناہ کرنے پر ابھارتا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیطان ملائکہ کو دیکھتا ہے اور اس آیت میں شیطان کا جو خوف ذکر ہوا ہے یہ طبعی خوف غیر اختیاری ہے جیسے انسان سانپ اور بچھو وغیرہ سے ڈرتا ہے اسی طرح یہ جبرئیل سے ڈر گیا۔ قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابلیس: اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ: میں سچا تھا جبکہ: اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ میں جھوٹا تھا حدیث میں ہے کہ ابلیس عرفے اور بدر کے دن بہت ذلیل تھا (موطاء۔ وسنن کبری حدیث 9565 مرعاۃ 9/ 144) شیطان کا خوف سورۃ حشر 16 میں بھی مذکور ہے مگر یہ ایمانی خوف نہیں ہے۔

تفسیر 49 یہ بھی پہلے دعوے کے لئے علت ہے کہ منافقین تم پر ہنستے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی ہنسی ناراضگی میں تبدیل کردی اور یہ علت پہلی پانچویں علت میں داخل ہے یعنی اس میں کافروں کا اپنے مقصد سے محروم ہونے کا ذکر ہوا اور اس میں منافقین کے گمان سے مخالف ہونے کا ذکر ہے: اَلْمُنٰفِقُوْنَ: سے مراد مدینے کے اعتقادی منافقین تھے جو زبان سے ایمان کا دعویٰ کیا کرتے تھے مگر دل میں مکمل انکار رکھتے تھے: وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: اس سے مراد شک والے ہیں جو مکہ مکرمہ اور باقی اطراف سے بدر کی طرف آئے تھے یہ لوگ بھی کافر تھے اس لیے کہ ایمان شک کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا: وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ: یہ بدر کے مجاہدین کی صفت ہے یعنی وہ لوگ جو زیادہ کافروں کے مقابلے کے لئے نکلے تھے تو یہ غرور کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ توکل کی وجہ سے تھا۔

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۞
ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۞ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ
كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۞ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا
نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۞

"اور اگر آپ دیکھ لیں جس وقت کافروں سے ملائکہ روح قبض کریں گے ان کے چہروں کو مارتے ہیں اور ان کی پیٹھوں کو اور کہتے ہیں جلنے والی آگ کا عذاب کو چکھ لو [50]۔ یہ سزا ان اعمال کی وجہ سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجے ہیں اور بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے [51]۔ ان کا حال فرعونیوں کے حال کی طرح ہے اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا اور سخت عذاب دینے والا ہے [52]۔ یہ عذاب اس وجہ سے ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کسی نعمت کو بدلنے والا نہیں ہے جو ایک قوم پر کی ہو یہاں تک کہ (اس عقیدے) کو تبدیل کریں جو ان کے دلوں میں ہے اور (جان لو) کہ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے" [53]۔

تفسیر 50 پہلی آیتوں میں کافروں اور منافقوں کے دنیاوی حالات کا ذکر ہوا ہے تو اس آیت میں روح نکلنے اور برزخ میں دیئے جانے والے عذاب کا خوف دلانا ہے اور یہ عذاب ان مشرکین پر نازل ہو چکا ہے جو بدر میں قتل کئے گئے تھے: یَضْرِبُوْنَ: چہرے اور پشت پر مارنے سے بہت بے عزتی ہوتی ہے اس وجہ سے اس کو خاص طور پر ذکر کیا یا اس سے

مراد ہر طرف ہے۔ اس طرح سورۃ محمد 37 میں بھی ہے: عَذَابَ الْحَرِيقِ: ظاہر اور باطن دونوں کو جلانے والا۔

تفسیر 51 اس آیت میں اشارہ ہے کہ عذاب کے دو اسباب ہیں ایک لوگوں کے برے اعمال اور دوسرا اللہ تعالی کا عدل اسی طرح سورۃ آل عمران 182 میں بھی مذکور ہے: اَيْدِيْكُمْ: سے مراد بدن کی تمام قوتیں ہیں لیکن اکثر اعمال ہاتھوں کے ذریعے ہوتے ہیں اس لیے اس کو خاص ذکر کیا۔

تفسیر 52 اس آیت میں موجودہ کافروں کی پہلے کافروں کے ساتھ مشابہت ہے کہ کفر کرنے اور دنیا اور برزخ کے عذاب کے لحاظ سے دونوں ایک جیسے ہیں پہلے بدر کے مشرکین کا ذکر ہوا تو اب موجودہ کفار کی مزید قباحت کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اس میں: بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ: کی تفصیل ہے: بِذُنُوْبِهِمْ: اس میں اشارہ ہے کہ کفر بہت سے گناہوں کا جڑ ہے۔

تفسیر 53 یہ تفسیر اس جملے: لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ: کی ہے اور یہ عذاب کا سبب ہے جو پہلی آیت میں ذکر ہوا ہے سوال کا جواب ہے کہ کفر تو ان میں پہلے سے موجود تھا تو اس وقت عذاب کیوں نہیں دیا؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ نفس کفر تو بری حالت ہے لیکن اس کے باوجود ان کو امن حاصل تھا اور جب ان کے پاس نبی آئے اور آیتوں کو بھیجا تو ان کا کفر سخت ہو گیا تو اللہ نے ان کی نعمت (غصے) میں تبدیل کر دی تو: نِعْمَةً: سے مراد وہ امن اور رزق تھا جو ان کے کفر کے باوجود جاری تھا: يُغَيِّرُوْا: سے مراد آیتوں اور نبی کا انکار کرنا ہے یا نعمت سے مراد عام ہے خوشحالی، امن اور صحت اور نبی کا دین، اس آیت میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالی کے دین کو بدلنا عذاب کا سبب ہے: يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ: اس سے مراد نیک اعمال کو برے اعمال سے بدلنا ہے یا کفر کو زیادہ کفر سے تبدیل کرنا ہے اور وہ حال کے بدلنے کا سبب ہے امن کا عذاب میں بدل جانا اور اس طرح سورہ رعد آیت 11 میں بھی آتا ہیں۔

كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَكُلٌّ كَانُوا

ظَالِمِينَ ﴿٥٤﴾ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٥﴾ الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ

عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ﴿٥٦﴾ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿٥٧﴾

"ان کا حال فرعونیوں کے حال کی طرح ہے جو ان سے پہلے تھے انہوں نے اپنے رب کی آیتوں کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور ہم نے فرعونیوں کو غرق کر دیا اور یہ سب ظالم تھے[54]۔ بیشک جانداروں میں سے سب سے برے اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا ہے پس یہ لوگ ایمان نہیں لاتے[55]۔ یہ وہ لوگ ہے کہ آپ نے ان سے وعدہ لیا ہے پھر ہر مرتبہ وعدہ توڑتے ہیں اور یہ لوگ اپنے آپ (باقی گناہوں سے) نہیں بچاتے[56]۔ پس اگر آپ ان کو لڑائی میں پالیں تو ان کے سبب سے ان کے بعد والے لوگوں کو ڈراؤ تاکہ یہ (بعد والے لوگ) نصیحت قبول کر لیں"[57]۔

تفسیر 54 اس آیت میں تکرار نہیں ہے اس لیے کہ پہلی آیت میں کفر میں تشبیہ تھی جبکہ اس آیت میں نعمت کے بدلنے کی مشابہت ہے اسی طرح پہلی آیت میں کفر کا ذکر تھا جبکہ اس آیت میں تکذیب کا ذکر ہے جو زیادہ کفر ہے اور اس میں اجمالی اخذ کا ذکر تھا جبکہ اس آیت میں نَخَا هْلَكْنٰهُمْ: کے ساتھ اس کی تعبیر اور تفصیل ہے اور اشارہ ہے کہ: مُكَذِّبِيْنَ: کی سزائیں پہلے مختلف طریقوں سے تھیں ہوائیں رجفہ پتھر برسنا اور غرق کرنا تو مشرکین مکہ پر عذاب قتل اور تلوار کے ساتھ آیا۔
ظٰلِمِيْنَ: اشارہ ہے کہ ان کے یہ اعمال عذاب کا سبب اس لیے بنے کہ وہ خالص ظلم تھا۔

تفسیر 55 جب تمام کافروں کی مشترکہ صفت ذکر ہوئی جو ظلم ہے تو اب کفار کی ایک خاص قسم کے لوگوں کی مخصوص صفت کا ذکر ہو رہا ہے کہ ان میں چار عیوب اور برائیاں ہیں جو کہ گزشتہ عذاب کا سبب بھی ہے کہ یہ عذاب ان پر اس لیے آیا کہ یہ شریر لوگ ہیں اور ان کے چار قبائح ذکر کئے ہیں دو اس آیت میں اور دو بعد والی آیت میں: لَا يُؤْمِنُوْنَ: یعنی کفر کے پابند ہیں ان سے ایمان کی امید نہیں ہے اور اس کا سبب 22 میں مذکور تھا اس آیت کا مقصد منافقین کے عناد کا ذکر تھا جبکہ یہاں اس آیت میں واضح کافروں کی عناد کا ذکر ہے۔

تفسیر 56 اس آیت میں ان کے دو برائیاں اور مذکور ہیں ایک وعدے کا توڑنا اور دوسرا التقویٰ کا نہ ہونا خلاصہ یہ ہے کہ تمام لوگوں میں سے کافر برے ہیں اور کافروں میں ضدی کافر برے ہیں اور ان ضدیوں میں شریر وعدہ خلافی کرنے والے

ہیں:اَلَّذِیْنَ عٰھَدْتَّ :اس آیت کے پہلے مصداق بنی نضیر اور بنو قریظہ کے یہود اور مشرکین مکہ اور پھر عام لوگ ہیں:مِنْھُمْ :یہ لفظ اسی وجہ سے ہے کہ عہد اصل میں بعض لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو بڑے ہوتے ہیں۔

تفسیر 57 یہاں سے آخر تک اس حصے کا دوسرا باب ہے اس میں جہاد کے قوانین ذکر کئے اس میں ایک قانون عام مجاہدوں کے لئے ہے اور باقی نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہیں۔ وہ جہاد کے امیر کے لئے بھی ہیں اور آخر میں لوگوں کی پانچ اقسام ہیں اور مؤمنین کے لئے خوشخبری ہے۔ یہ ساتواں قانون ہے اس کے مخاطب رسول اللہ ﷺ اور آپ کا نائب ہے جو کہ امیر ہے۔ اس قانون کا مطلب مشرکین کے ساتھ لڑائی میں سختی کرنا ہے تاکہ باقی لوگ اس سے عبرت حاصل کریں:فَشَرِّدْ بِھِمْ :مسبب کا ذکر ہے اس سے مراد سبب ہے کہ ان کے ساتھ ایسا عمل کرو یعنی قتل کرنا اور زیادہ خون بہانا جو بعد والے لوگوں کے ڈرانے کا سبب اور عبرت بن جائے۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۝٥٨ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ۝٥٩ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝٦٠

"اور اگر آپ کسی قوم کی وعدے توڑنے سے ڈرتے ہیں تو ان کو خبر دینا (وعدہ توڑنے کی) تاکہ وہ دونوں برابر ہو جائیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے ولوں (وعدہ توڑنے والوں) کو پسند نہیں فرماتا ہے[58]۔ اور کافر یہ نہ سمجھیں کہ یہ بچ جائینگے بیشک یہ لوگ اللہ کو عاجز (کمزور) نہیں بنا سکتے[59]۔ اور تم ان (کافروں کے مقابلے کے لئے قوت کی تیاری کرو جتنی طاقت رکھتے ہو جنگ کے سامان میں سے اور پالے ہوئے گھوڑوں میں سے کہ اس کے ساتھ تم اللہ تعالیٰ اور اپنے دشمن کو ڈراتے ہو اور ان کے علاوہ باقی لوگ (منافقین) جن کو تم نہیں جانتے اللہ تعالیٰ ان کو جانتا ہے اور جو چیز بھی تم اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہو تو تمہیں اس کا ثواب پورا پورا دیا جائے گا اور تم پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائیگا"[60]۔

تفسیر 58 یہ پہلے قانون کا تتمہ ہے کہ جب کافروں کے ایک گروہ سے لڑائی ہو اور دوسرے گروہ سے امن کا معاہدہ کیا گیا ہو لیکن ان کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ وعدہ خلافی کرنے والے ہیں تو ان کو معاہدہ توڑنے کی خبر دی

جائے گی: تَخَافَنَّ: مراد یہ ہے کہ علامات سے اور غالب گمان سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ لوگ معاہدہ توڑنے والے ہیں اور یہ قبیح کام ہے تو مشکل کام کے واقع ہونے کو خوف کہا جاتا ہے: فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ: نَبَذَ: ترک عہد کے معنی میں ہے اور لفظ اِلَيْهِمْ: سے مراد یہ ہے کہ ان کو خبر دو کہ اس کے بعد معاہدہ ختم ہے تا کہ یہ لوگ آپ کی طرف خائن کی نسبت نہ کریں: عَلٰى سَوَآءٍ: یعنی ترک عہد کا جس طرح تمہیں علم ہوا اسی طرح ان کو بھی علم ہوجائے۔

تفسیر 59 یہ منکرین کو توبیخ ہے کہ جب یہ لوگ وعدہ خلاف بن جائیں تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہیں سکتے۔ سَبَقُوْا لَا يَحْسَبَنَّ: کے لئے مفعول کے مقام میں ہے: اَنْ يَّسْبِقُوْنَا: کے معنی میں ہے: اِنَّهُمْ یہ لَا يَحْسَبَنَّ: کے لئے علت ہے۔

تفسیر 60 یہ مجاہدین کے لئے آٹھواں قانون ہے اس سے مراد جنگ کے سامان کی اور پیدل اور سواری کی فوج کی تیاری کرنا ہے جنگ سے پہلے اس میں فائدہ یہ ہے کہ مشرکین اور منافقین پر رعب ہوگا: مِنْ قُوَّةٍ: قوت سے مراد ہر قسم کی جنگ کا سامان ہے جو ہر زمانے کے لیے مناسب ہو اور حدیث میں: اَلرَّمْيُ (پھینکنا) ذکر ہے وہ قوت کے لئے ایک مثال ہے۔ (صحیح مسلم کتاب الجهاد حدیث 1917) اس دور میں اس میں ہر قسم کے بم اور میزائل وغیرہ پھینکنا اور بنانا داخل ہے: وَمَا تُنْفِقُوْا: اس میں اشارہ ہے کہ جہاد کی نیت سے جتنے بھی پیسے خرچ کرے تو وہ ثواب ہے: مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ: ہر زمانے میں جنگ کے لئے گھوڑوں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ معلوم بات ہے اسی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا: اَلْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ فِي نَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ :(صحیح بخاری کتاب الجهاد حدیث: 2850، 3119: صحیح مسلم کتاب الامارة حدیث:1873 ابن ماجه کتاب التجارات حدیث:2305 ترمذی حدیث: 1694 گھوڑوں کی پیشانی میں قیامت تک خیر لکھی گئی ہے تو خیر سے مراد جہاد اور مالِ غنیمت ہے اس آیت میں دلیل ہے کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا: لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ: اس طرح سورۃ توبہ 101 میں آتا ہے یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غیب نہیں جانتے تھے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ
فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي
الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ
اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾

"اور اگر یہ لوگ صلح کے لئے مائل ہو جائیں تو آپ بھی اس کی طرف مائل جائیں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے [61]۔ اور اگر یہ لوگ آپ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں بیشک آپ کے لئے اللہ کافی ہے اللہ تعالیٰ وہی ذات ہے کہ آپ کو اپنی مدد کے ساتھ مضبوط کیا اور ایمان والوں کی مدد کے ساتھ اور ان کے دلوں میں محبت ڈالی [62]۔ اگر تو ان چیزوں کو خرچ کرتا جو سب زمین میں ہے تو آپ ان کے دلوں میں محبت نہیں ڈال سکتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں محبت ڈالی بیشک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے [63]۔ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور ان کے لئے جنہوں نے آپ کی اتباع کی ایمان والوں میں سے" [64]۔

تفسیر 61 یہ جہاد کے لئے نواں قانون ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان والے کافروں کو صلح کی دعوت نہیں دینگے اور اگر کافر صلح کا مطالبہ کریں تو صلح کرنا جائز ہے: فَاجْنَحْ: یہ امر وجوب کے لئے نہیں ہے اور اگر انہوں نے مطالبہ نہ کیا ہو تو صلح کرنا منع ہے اس کو وہن کہا جاتا ہے جیسے سورۃ محمد 35 میں ہے۔

تفسیر 62 یہ پہلی آیت کے ساتھ متعلق ہے کہ اگر یہ لوگ صلح کرنے میں دھوکے کا ارادہ کرتے ہیں تو (ان سے خوف نہیں کرنا) یہ بدلہ پوشیدہ ہے۔ فائدہ ۱: حَسْبُ: کا لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے سورہ توبہ 129 اور آل عمران 173 کی دلیل سے اور مخلوق کے ساتھ اس کی تائید ہو سکتی ہے: هُوَ الَّذِيْ: کو بغیر عطف کے ذکر کیا ہے اس لیے کہ یہ حسبیت الھیہ کی تفسیر ہے سوال ۲: تائید تو نصرت الہی کے ساتھ ہے: بِالْمُؤْمِنِيْنَ: کی کیا ضرورت ہے۔ جواب تائید دو قسم کی ہے پہلی اسباب ظاہر کے بغیر یہ: نَصْرِهٖ: سے مراد ہے دوسری اسباب کے ساتھ یہ بِالْمُؤْمِنِيْنَ: میں مراد ہے۔ فائدہ ۳: بِالْمُؤْمِنِيْنَ: کے ساتھ صحابہ کرام کی مدح کی طرف اشارہ ہے جیسے حدیث میں ہے: اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ (اللہ تعالیٰ نے میرے صحابہ کرام کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لیے چن لیا ہے الاصابۃ فی معرفۃ الصحابۃ 1۔12 مسند بزار

حدیث 2774 مذکورہ حوالہ میں الفاظ یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ اِخْتَارَ أَصْحَابِیْ عَلَی الثَّقَلَیْنِ سِوَی النَّبِیِّیْنَ وَالْمُرْسَلِیْنَ ابن حجر فرماتے رِجَالُہٗ مُوَثَّقُوْنَ)۔

تفسیر 63 یہ مؤمنوں کے ساتھ تائید کا بیان ہے جو اتفاق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی: مَآ اَنْفَقْتَ: اس میں اشارہ ہے کہ نبی ﷺ کسی کے دل پر قدرت نہیں رکھتے تو مختار کل نہیں ہیں۔ فائدہ: یہ آیت اس بات کی دلیل ہے صحابہ کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت تھی دشمنی نہیں تھی۔ اور وہ تاریخ جس سے صحابہ کی دشمنی معلوم ہوتی ہے وہ اس آیت کے خلاف ہے چنانچہ اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس طرح سورۃ آل عمران ۱۰۳ اور سورۃ فتح ۲۹ میں بھی آیا ہے۔

تفسیر 64 یہ امیر کے لئے دسواں قانون ہے کہ ہر حال میں اللہ پر توکل کرنا چاہئے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں کافی ہے۔ سوال: یہ تو آیت 22 کے ساتھ ٹکراؤ ہے۔ جواب: وہاں پر دشمنوں کی تکلیف دور کرنے کے لئے خاص حسبیت مراد تھی جبکہ یہاں عام حالات میں حسبیت مراد ہے: وَمَنِ اتَّبَعَكَ: یہ (ك) پر عطف ہے مبتداء ہے اس کی خبر محذوف ہے: حَسْبُهُمُ اللّٰهُ: اور جو کہتے ہے کہ یہ لفظ اللہ پر معطوف ہے تو یہ قول غلط ہے اس لیے کہ پہلے ذکر ہوا ہے کہ حسبیت صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اس میں شرکت ممکن نہیں ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کا تفصیلا رد کیا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ حَرِّضِ ٱلْمُؤْمِنِينَ عَلَى ٱلْقِتَالِ ۚ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَٰبِرُونَ يَغْلِبُوا۟ مِا۟ئَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن
مِّنكُم مِّا۟ئَةٌ يَغْلِبُوٓا۟ أَلْفًا مِّنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ﴿٦٥﴾ ٱلْـَٰٔنَ خَفَّفَ ٱللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ
ضَعْفًا ۚ فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّا۟ئَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا۟ مِا۟ئَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوٓا۟ أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۗ وَ
ٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُۥٓ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِى ٱلْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ ٱلدُّنْيَا ۖ وَ
ٱللَّهُ يُرِيدُ ٱلْـَٔاخِرَةَ ۗ وَٱللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٧﴾ لَّوْلَا كِتَٰبٌ مِّنَ ٱللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَآ أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٦٨﴾
فَكُلُوا۟ مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَٰلًا طَيِّبًا ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٦٩﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ قُل لِّمَن فِىٓ أَيْدِيكُم مِّنَ
ٱلْأَسْرَىٰٓ إِن يَعْلَمِ ٱللَّهُ فِى قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٧٠﴾

"اے نبی ﷺ ایمان والوں کو جنگ پر آمادہ کرو اگر تم میں سے بیس (۲۰) افراد صبر کرنے والے ہوں تو وہ دوسو پر غالب آئینگے اور اگر تم میں سے سو افراد ہوں تو وہ کافروں میں سے ہزار پر غالب آئینگے اس لیے کہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں [65]۔ اب اللہ تعالیٰ نے تم پر آسانی کر دی اور جان لیا کہ تم میں سے کمزور لوگ بھی ہیں۔ پس اگر تم میں سے سو افراد صبر کرنے والے ہوں تو وہ دوسو پر غالب آئینگے اور اگر تم میں سے ایک ہزار صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو ہزار پر غالب آئیں گے اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے [66]۔ نبی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہو یہاں تک کہ زمین میں خونریزی نہ کرے تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ آخرت چاہتا ہے (تمہارے لئے) اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے [67]۔ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا جس کا پہلے فیصلہ کیا گیا ہے تو ضرور تمہیں پہنچ جاتا اس مال کی وجہ سے جو تم نے لیا ہے (قیدیوں کے فدیہ میں) بڑا عذاب [68] تو اس میں سے کھاؤ جو تمہیں مال غنیمت میں حلال کا مال حاصل ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو بیشک اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے [69]۔ اے نبی! جو تمہارے ہاتھوں میں قیدی بن کر آئے ہیں ان سے کہو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں ایمان پالیا تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس مال سے بہتر دیگا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہیں معاف کریگا اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا مہربان ہے" [70]۔

تفسیر 65 یہ امیر کے لئے کیا رہنما قانون ہے خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ اور پھر امیر پر لازم ہے کہ مجاہدین کو جہاد پر ایسی ہمت دلائے کہ ایک شخص دس افراد کا مقابلہ کر سکتا ہو اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو کم از کم ایک شخص دو افراد کا مقابلہ کر سکے یہ

فرض ہے تو: تحرِّض: کے ساتھ یہ قانون ذکر کیا۔ جیسے سورۃ النساء 84 میں ہے: وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ: کے ساتھ تحریض کا طریقہ ذکر کیا ہے۔ سوال: اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ ایک شخص دس کے ساتھ مقابلہ کرتے تو اتنی طویل عبارت کیوں ذکر کی۔؟ جواب: اسلام کی ابتداء میں صحابہ کا شمار کم تھا تو اکثر دستے 20 سے زیادہ سوتک کی تعداد پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔ صَابِرُوْنَ: امام شربینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حکم کی شرط صبر ہے اور صبر سے مراد یہ ہے کہ بدن اس کا قوی اور سالم اعضاء والا ہو اور اس کا دل مضبوط اور بہادر ہو، اسی طرح ایمان مضبوط ہو اور ان قوانین کا پابند ہو جو اس سورت میں بیان ہوئے ہیں۔ جب ایک مرتبہ یہ صفت ذکر ہوئی تو دوسری مرتبہ مِائَۃٌ: کے ساتھ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تفسیر 66 یہ آیت متقدمین علماء کے نزدیک پہلی آیت کے لئے ناسخ ہے جبکہ بعد والے علماء کے نزدیک یہ تخفیف ہے اور یہ قول بہتر ہے ایک وجہ یہ ہے کہ آیت میں لفظ خَفَّفَ: موجود ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ گذشتہ آیت پر بھی عمل کرنا ثواب ہے جبکہ منسوخ پر تو عمل نہیں ہوسکتا تو معلوم ہوا کہ پہلا حکم منسوخ نہیں ہے: وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضُعْفًا: اس سے مراد ہمت کی کمزوری ہے لیکن یہ برائی کی صفت نہیں ہے بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کے درجات میں فرق تھا، سفیان بن شبرمہ نے کہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھی یہی حکم ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔

فائدہ: پہلی آیت کے آخر میں کافروں کی فقاہت نہ ہونے کا سبب ذکر کیا اور اس سے مراد توحید اور ایمان بالرسول، قرآن اور آخرت سے جہالت اور مفہوم کے طور پر معلوم ہوا کہ مؤمن مجاہدین فقاہت کے ساتھ متصف ہوتے ہیں اور اس صفت کی موجودگی میں زیادہ تعداد کی ضرورت نہیں ہے اور دوسری آیت میں: بِاِذْنِ اللّٰہِ اور مَعَ الصّٰبِرِیْنَ: کا سبب ذکر کیا ہے اشارہ ہے کہ فقاہت کی صفت سے اللہ تعالیٰ کا اِذْنَ صَبَرَ: اور نصرت الٰہی زیادہ ضروری ہے اور اسی طرح پہلی آیت میں صفت سلبیہ ہے جو کہ کافروں کی مغلوبیت کے لئے علت ہے جبکہ دوسری آیت میں مؤمنوں کے غلبہ کے لئے صفت ثبوتیہ کا ذکر ہے۔

تفسیر 67 یہ امیر کے لئے بارھواں حکم اور قانون ہے خلاصہ یہ ہے کہ ابتداء میں کافروں کو قتل کرنا ضروری ہے تاکہ دشمنوں پر رعب بیٹھ جائے۔ یہ آیت بدر کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی تھی جب اس میں کافروں کے ستر افراد قید کئے گئے اور اس وقت تک قیدیوں کے بارے میں شرعی حکم نازل نہیں ہوا تھا تو نبی ﷺ نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا بعض نے رائے پیش کی کہ ان سب کو قتل کرنا چاہئے اور بعض نے رائے پیش کی کہ ان سے فدیہ لے لیتے ہیں اس فدیہ کی رقم

سے ہتھیار خرید لیں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد والی رائے پر اتفاق کیا اور ان سے فدیہ لیا گیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا (صحیح مسلم کتاب الجہاد حدیث 1763 ابوداؤد کتاب الجہاد 2690 ترمذی کتاب الجہاد حدیث 3081 بیہقی دلائل النبی 3/51/52) لِنَبِیٍّ کو نکرہ ذکر کیا اشارہ ہے کہ یہ حکم تمام انبیاء کے لئے ہے۔ اَسۡرٰی یعنی ایسے قیدی جو قتل نہیں کیے جائے بلکہ فدیہ کے بدلے میں رہا کر دیے جاتے ہیں تو اس میں اشارہ ہے کہ مشرکین بدر کو قتل کرنا فدیہ لینے اور چھوڑنے سے بہتر ہے یہ واقعہ دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی نہ ہونے کی صورت میں اجتہاد کی طرف رجوع کیا ہے جس کا طریقہ مشورہ کرنا ہے اور جب یہ اجتہادی فیصلہ اللہ نے رد نہیں کیا بلکہ صرف اولیٰ جانب کو اہمیت دی تو معلوم ہوا کہ نبی کا اجتہاد بھی وحی ہے: تُرِيۡدُوۡنَ: یہاں پر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کے لحاظ کے لئے صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہوا ہے۔

تفسیر 68 یہ ایک سوال کا جواب ہے کہ جب انہوں نے یہ فدیہ لے لیا تو گناہ گار ہوئے پھر تو ان پر عذاب کا آنا ضروری تھا۔ (جواب) کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے سے قانون نہ رکھا ہوتا تو عذاب ضرور آتا لیکن اللہ تعالیٰ نے قانون رکھا ہے وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک حکم پہلے نہ بھیجا ہو اور یہ سورۃ توبہ 115 میں مذکور ہے فدیے کے معنی کے بارے میں پہلے سے حکم نہیں بھیجا گیا تھا تو حکم کی مخالفت نہیں آئی۔ دوسرا یہ قانون کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے مال غنیمت کو حلال کیا ہے تیسرا قانون یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بدر والے سب مجاہدین کو معاف کیا ہے لفظ كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ: میں یہ تینوں باتیں شامل ہیں۔

تفسیر 69 جب بعض صحابہ کرام نے اس وعید کے بعد اس فدیہ کے استعمال کرنے سے نفرت کی تو یہ آیت نازل ہوئی کہ نفرت نہ کرو یہ مال غنیمت ہے اور حلال ہے: فَكُلُوۡا: میں فاء سببیت کے لئے ہے اور شرط محذوف ہے یعنی: لَمَّا اُبِيۡحَتۡ لَكُمُ الۡغَنَآئِمُ: جب تمہارے لئے مال غنیمت حلال کیے گئے۔

تفسیر 70 یہ امیر کے لئے تیرہواں قانون ہے خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح قیدیوں میں جو ایمان کا دعویٰ کرے تا کہ فدیہ دینے سے بچ جائے تو اس سے کہہ دینا کہ تجھ پر فدیہ دینا لازم ہے اور اگر ایمان کا دعویٰ صحیح ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں زیادہ دیگا یہ مسئلہ بدر کے واقعہ میں عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا تھا اگرچہ آیت عام ہے اور اس قانون کی حکمت یہ ہے کہ اگر ایمان کے دعوے کے ساتھ کوئی شخص فدیہ سے معاف کیا جائے تو اس طرح دعویٰ ہر ایک کریگا اور ایمان کی صفت تو

پوشیدہ ہے تو فدیہ ہر ایک کو معاف کیا جائیگا اس طرح فدیہ کا قانون عبث اور مہمل ہو جائیگا: اِنْ يَّعْلَمِ: یہ علم سے تعبیر کنایہ ہے اور خیر سے مراد ایمان اور اخلاص ہے: يُؤْتِكُمْ: یہ وعدہ دنیا اور آخرت کے لئے عام ہے۔ [redacted] یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی وجہ سے دنیاوی اور اخروی برکات حاصل ہوتی ہیں۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

"اگر یہ لوگ آپ کو دھوکا دینا چاہیں تو انہوں نے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کو بھی دھوکا دیا تھا تو تمہیں ان پر قدرت دی اور اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے [71]۔ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور ہجرت کی ہے اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا ہے اور وہ لوگ جنہوں نے جگہ دی ہے اور (مہاجرین کے ساتھ) مدد کی ہے وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو ایمان لائے ہیں اور ہجرت نہیں کی تمہارے لئے ان کی دوستی میں سے کچھ حق نہیں ہے یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر تم سے دین کے بارے میں مدد کا مطالبہ کریں تو تم پر ان کے ساتھ مدد کرنا لازم ہے مگر اس قوم کے مقابلے میں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو (امن کا) اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے" [72]۔

تفسیر 71 خَانُوا اللّٰهَ: خیانت سے مراد ان کا کفر اور شرک اور مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کرنا ہے: مِنْ قَبْلُ: بدر کے واقعہ سے پہلے: فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ: اس سے مراد مومنوں کا کافروں پر جنگ بدر میں غلبہ پانا ہے: وَاِنْ يُّرِيْدُوْا: جزا مخفی ہے (ان کو دنیا اور آخرت میں ذلیل کرینگے)۔

تفسیر 72 جب جہاد کے قوانین تفصیلاً بیان ہوئے تو اب مجاہدین کو ایک دوسرے کے ساتھ دوستی اور نصرت کی ترغیب دلاتا ہے تاکہ ان کی باہمی محبت کی وجہ سے کفار پر رعب طاری ہوجائے اس آیت میں مومنوں کی تین اقسام اور ان کے احکام مذکور ہیں ایک قسم مہاجرین کی اور دوسری قسم انصار کی ان دونوں کا حکم یہ ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ دوستی رکھیں

گے اور مکمل طور پر ایک دوسرے کی مدد کریں گے یہ ولایت کا معنیٰ ہے۔ بعض مفسرین نے اس میں میراث بھی داخل کی ہے یعنی یہ لوگ ایک دوسرے کے وارث ہونگے لیکن یہ حکم بعد میں اس سورۃ کی آیت 75 اور سورۃ احزاب 6 کی وجہ سے منسوخ ہوا ہے تیسری قسم ایمان والوں میں غیر مہاجرین کی ہے ان کا حکم یہ ہے کہ ان کے ساتھ دوستی اور مدد کرنا ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے جائز نہیں ہے اور نہ ان کی کوئی میراث ہے لیکن اگر وہ لوگ دین کے بارے میں کچھ مدد طلب کرنا چاہیں تو ان کی مدد کرنی چاہئے لیکن اس شرط پر کہ باقی مجاہدین کے ساتھ مقابلہ نہیں کریں گے۔ اس میں ہجرت کرنے پر بہت ترغیب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان سے دشمنی کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ان کی دینی نصرت کرنا جائز ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ﴿٧٣﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا
وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ
كَرِيمٌ ﴿٧٤﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ ۚ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ
بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٧٥﴾

"اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اگر تم (یہ مدد) نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بہت بڑا فساد پیدا ہوگا [73]۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے جگہ دی ہے اور مہاجرین کی ساتھ مدد کی ہے بس یہی لوگ حقیقی مؤمن ہیں ان کے لئے بخشش اور باعزت رزق ہے [74]۔ اور جو ان کے بعد ایمان لائے اور ہجرت کی ہے اور تمہاری دوستی میں جہاد کیا تو یہی لوگ تمہارے گروہ سے ہیں اور ایک نسب والے رشتہ دار ایک دوسرے کے (میراث) کے حقدار ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم میں بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے" [75]۔

تفسیر 73 اس میں چوتھے قسم کے لوگوں کا ذکر ہے جو کہ کافر ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ کفر میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں تو تم لوگ اسلام میں ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے ہو؟ کافروں کی ولایت سے مراد ایک دوسرے کے ساتھ کفر کے کاموں میں مشابہت اختیار کرنا اور ایک دوسرے کے ساتھ مدد اور گروہ بندی کرنا دوسرے جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ایک دوسرے کے ساتھ دین میں مدد نہیں کی تو اس سے کافروں کا مسلمانوں پر غالب آنے کی وجہ سے فتنہ پیدا ہوگا اور شرک عام ہونے کی وجہ سے بڑا فساد پیدا ہوجائیگا: تَفْعَلُوْهُ: اس کی ضمیر نصرت اور ولایت کی طرف راجع ہے۔

تفسیر 74 اس آیت میں ایمان والوں کو خوشخبری ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان مذکور ہے کہ وہ لوگ حقیقی اور کامل ایمان والے ہیں اور وہ لوگ معاف کئے گئے ہیں اس سورۃ کی ابتدا میں پانچ صفات مذکور تھیں اور پھر یہ جملہ مذکور تھا کہ: أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ تو ان دونوں آیتوں کے ملنے سے یہ نتیجہ نکلا کہ مہاجرین اور انصار ان پانچ صفات سے متصف ہیں اور یہ لوگ اس بشارت کے مستحق ہیں جو سورۃ کے شروع میں اور اس آیت میں مذکور ہے جبکہ اسی وجہ سے ان لوگوں پر لعنت ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہتے ہیں اور ان پر طعن کرتے ہیں جیسا کہ شیعہ اور روافض خصوصاً امامیہ اثنا عشریہ۔

تفسیر 75 اس آیت میں پانچویں قسم کے لوگوں کا ذکر ہے جو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں اور وہ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے ہیں اور ہجرت اور جہاد کیا ہے تو یہ لوگ پہلے صحابہ کرام کی جماعت میں شمار ہیں۔ فتح سے مراد یا تو صلح حدیبیہ ہے جو ہجرت کے چھٹے سال ہوا ہے یا فتح مکہ ہے جو ہجرت کے آٹھویں سال ہوا ہے تو اس میں صحابہ کرام کی تقسیم کی طرف اشارہ ہے ان میں تفاوت اور تفاضل ہے لیکن صحابیت کی صفت میں سب شریک ہیں: وَأُولُو الْأَرْحَامِ: اس کا مطلب یہ ہے کہ میراث نسب کے سبب سے تقسیم ہوتا ہے دوستی کی وجہ سے نہیں ہوتا: فِي كِتَابِ اللَّهِ: اس سے مراد قرآن میں میراث کا حکم ہے جو سورہ نساء میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اور وہ ذی الفروض اور عصبہ ہے جبکہ ذوی الارحام کے مسئلے میں اختلاف ہے۔ یہ آیت 72 کے لئے ناسخ ہوئی اس لیے کہ اس میں میراث کا سبب ہجرت اور اخوت قرار دیا گیا ہے۔

سورۃ الانفال کی خصوصیات:

۱۔ مال غنیمت کی تقسیم کا تذکرہ۔

۲۔ جنگ بدر کے واقعہ کی تفصیل۔

۳۔ سورۃ کے پہلے دعوے کے لئے وجوہات اور علتیں۔

۴۔ دوسرے دعوے کے لئے عام و خاص قوانین کا تذکرہ۔

۵۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی مدح و تعریف۔

۶۔ لوگوں کے اقسام۔

۷۔ جہاد فی سبیل اللہ کی طرف کثرت سے ترغیبات۔

۸۔ جن اسباب سے عذاب الٰہی رک جاتا ہے ان کا ذکر۔

۹۔ مشرکین کی نماز اور اُسکے باطل ہونے کا تذکرہ۔

۱۰۔ مشرکین کے انفاق (خرچ کرنے) کے باطل ہونے کا تذکرہ۔

الحمد للہ سورۃ الانفال کی تفسیر مکمل ہوئی

آیاتھا ۱۲۹ ۹ سُوْرَۃُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ ۱۱۳ رکوعاتھا ۱۶

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

"اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے بیزاری کا اعلان ہے ان لوگوں کی طرف جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے (مشرکین میں سے)[1]۔پس زمین میں پھرو چار مہینے اور جان لو کہ بیشک تم اللہ کو کمزور نہیں کر سکتے ہو بیشک اللہ تعالیٰ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے[2]۔اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے لوگوں کو اعلان ہے بڑے حج کے دن کہ بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہیں پس اگر تم نے (شرک سے) توبہ کی تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ بیشک تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری دینا"[3]۔

سورۃ کا ربط: اس سورۃ کا پہلے سورۃ کے ساتھ بہت سے طریقوں سے ربط ہے پہلا طریقہ یہ ہے کہ جب سورۃ انفال میں جہاد کے قاعدے بیان ہوئے تو اس سورۃ میں جہاد کا اعلان ہے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سورۃ انفال میں صرف جہاد کا اعلان تھا اور اس سورۃ میں ان گروہوں کا ذکر ہے جن سے جہاد کیا جا سکتا ہے تیسرا طریقہ یہ ہے کہ انفال میں قتال کا اعلان تھا تو اس سورۃ میں مشرکین اور اہل کتاب سے قتال کی علتیں اور قتال کے موانع جوابات کے ساتھ مذکور ہیں۔

اس سورۃ کا دعویٰ: مشرکین اور اہل کتاب کے ساتھ قتال کرنا اور منافقین سے جہاد کرنا اور یہ 5، 14، 29، 36، 73، 123 میں چھ مقامات پر ذکر ہوا ہے اور توحید کا مسئلہ سورۃ کے آخر میں 31، 116 اور 123 میں ذکر ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اس میں (13) مذکور ہیں۔ سورۃ کا خلاصہ: اس سورۃ میں چار حصے ہیں پہلے حصے میں مشرکین کے قتال کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اہل کتاب کے قتال کا حکم ہے اور تیسرے حصے میں منافقین کے عیبوں کا ذکر ہے اور چوتھے حصے میں مومنوں کی صفات ہیں۔ پہلا حصہ 28 آیت تک ہے اور اس میں تین قسم کے مشرکین کا ذکر ہے اور قتال کے چار موانع کا

رد ہے اور قتال کی تیرہ علتیں مذکور ہیں اور جہاد کی ترغیب ہے۔ فائدہ: اس سورۃ کی ابتداء میں بسم اللہ نہ لکھنے کا ایک سبب یہ تھا کہ اس کی ابتداء میں بسم اللہ نازل نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا سبب عثمان رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے (جو امام ترمذی نے روایت کی ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے صفحہ 194 پر نقل کی ہے کتاب التفسیر حدیث 3097 ابو داؤد حدیث 786) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سورۃ کو سورۃ انفال کے بعد لانا اجتہادی مسئلہ ہے اس احتمال کی وجہ سے کہ یہ سورۃ پہلی سورۃ کا بہت سی مناسبتوں کے اعتبار سے جزء ہے اس وجہ سے اس کے شروع میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی ہے اور اس احتمال کی وجہ سے کہ چونکہ یہ مستقل سورۃ ہے تو سورت کا نام شروع میں لکھا گیا ہے اور اسی طرح بسم اللہ نہ لکھنے کی ایک حکمت یہ ہے کہ بسم اللہ امن کے لیے ہے اور یہ سورۃ امن کے برعکس جنگ کے لیئے ہے دوسری حکمت یہ ہے کہ طریقہ یہ تھا جن کو اعلان جنگ کے لیے خط لکھا جاتا تو اس کے شروع میں بسم اللہ نہیں ہوا کرتی تھی۔

تفسیر 1 اس پہلی آیت میں پہلا گروہ مشرکین کی ہے جن کو محاربین کہتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے معاہدہ توڑا ہے اور یہ بھی اس میں داخل ہے کہ ان کے ساتھ عہد غیر مؤجل تھا اور اس کا ایک حکم براءت ہے اور براءت سے مراد ہر قسم کے امن اور ذمے کو دور کرنا اور ہر تعلق کو ختم کرنا ہے اس کا بیان آیت 5، 12، 15، 17، 23، 36، 38، 73 اور 113 میں ہے۔

تفسیر 2 اس آیت میں ان مشرکین کا دوسرا حکم ہے جو چار مہینوں کی مہلت ہے۔ (شوال) ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم اس لئے کہ امام ازہری سے منقول ہے کہ یہ سورۃ شوال کے شروع میں نازل ہوئی ہے دوسرا یہ ہے کہ حج اکبر کے دن سے چار مہینوں کا حساب لیا جائیگا۔ ربیع الثانی کے آخر تک لیکن پہلا قول آیت 5 کے قرینہ کی وجہ سے بہتر ہے اور یہ مہلت ایمان لانے کے لیے دی ہے: وَاعْلَمُوْا: اس کے ساتھ دو وہموں کو دور کرتا ہے پہلا وہم کیا یہ مہلت ان کے مقابلے سے اللہ تعالیٰ کے عجز کی وجہ سے ہے تو: اَنَّكُمْ غَيْرُ: سے جواب ہوا دوسرا وہم کہ یہ مہلت ان کے اکرام اور عزت پر دلالت کرتی ہے تو جواب ہوا: وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ:

تفسیر 3 اس آیت میں براءت کا اعلان مذکور ہے۔ مشرکین محاربین کو براءت کے فیصلے کے بعد جنہوں نے معاہدہ توڑا تھا اور جب یہ اعلان حج کے دن ہے اور اس سے محرم تک چار مہینے باقی نہیں تھے تو اس وجہ سے اس آیت میں چار مہینوں کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ سوال: پہلی آیت میں: اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ :مذکور تھا اور اس میں اِلَى النَّاسِ :مذکور ہے۔ جواب: وہ براءت ہے ان معاہدین سے جو معاہدہ توڑتے ہیں اور یہ اعلان تمام مشرکین کو عام ہے چاہے معاہد ہو یا نہ ہوں

بلکہ اعلان کے سننے میں ایمان والے بھی داخل ہیں۔ وَرَسُوْلُهٗ: یہ رفع کے ساتھ ہے۔ یہ مبتدا ہے اس کی خبر محذوف ہے یا اسم ان کے محل پر عطف ہے: فَاِنْ تُبْتُمْ: اس میں مہلت کے زمانے میں توبہ کرنے کی ترغیب ہے: فَاعْلَمُوْٓا: اس میں تہدید مقصود ہے اور آیت 2 میں وہم کو دور کرنا مقصود تھا جیسے پہلے گزر چکا ہے: وَبَشِّرِ بشارت کو بطور تہکم: تمسخر کہا ہے: بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ: دنیا میں قتل اور قید کرنے اور آخرت میں ابدی عذاب کے ساتھ۔ فائدہ: حج اکبر یا تو عرفے کا دن ہے یا نحر کا ہر حج کو اکبر کہا جاتا ہے جبکہ عمرے کو حج اصغر کہا جاتا ہے اور یہ بات جو مشہور ہے کہ عرفہ جمعہ کے دن ہوتا ہے تو حج اکبر کہلاتا ہے یہ بات ثابت نہیں ہے لیکن جو حج نبی ﷺ نے کیا تھا حجۃ الوداع تو اس میں عرفے جمعے کا دن تھا شاید اسی وجہ سے جو اس کے ساتھ موافق آجائے تو لوگ اس کا نام حج اکبر رکھتے ہیں۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"مگر وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے مشرکین میں سے پھر تم سے کچھ بھی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کی تو ان سے ان کا عہد اپنی مدت تک پورا کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ متقین (وعدہ خلافی سے بچنے والوں) کو پسند کرتا ہے:[4]۔ پس جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو قتل کرو جہاں تم ان کو پاؤ اور ان کو پکڑ و اور ان کو گھیر لو اور ان کو ہر گھات میں بیٹھ جانا پس اگر یہ لوگ (شرک سے) توبہ کرلیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو بیشک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا مہربان ہے"[5]۔

تفسیر 4 اس آیت میں دوسری قسم کے مشرکین کا ذکر ہو رہا ہے ان کو عہد مؤجل کے ساتھ معاہدین کہتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے اپنا عہد نہیں توڑا تھا اور وہ دو قبیلے تھے ایک بنو ضمرہ اور دوسرا کنانہ۔ ان کا حکم یہ ہے کہ ان کا عہد پورا کرو اس وقت تک جو مقرر کیا گیا ہے اور ان کے عہد میں مہینے باقی رہ گئے تھے لیکن ان کے لئے دو شرطیں ہیں (۱) لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ (۲) لَمْ يُظَاهِرُوْا: ان کا حکم اس قول کے ساتھ مذکور ہے کہ فَاَتِمُّوْٓا وَاِنَّ اللّٰهَ یہ اَتِمُّوْٓا: کے لیے علت

ہے اور یہ دلیل ہے کہ عہد پر عمل کرنا تقویٰ کا عمل ہے

تفسیر 5 اس آیت میں پہلے گروہ کا دوسرا حکم مذکور ہے اور مطلب یہ ہے کہ مہلت کا موقع (جو چار مہینے تھے) اور اس کا آخری مہینہ محرم تھا وہ گزر گیا تو ان سے :قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ: قتال کرو اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے عہد توڑا ہے۔ وَخُذُوْهُمْ: اس سے مراد قید کرنا ہے پھر امیر کی مرضی ہے کہ ان کو قتل کرے یا فدیہ لے یا احسان کر کے چھوڑ دے: وَاحْصُرُوْهُمْ: اس کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ ان کے قلعوں کا محاصرہ کرو دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ بغیر اجازت دار الاسلام میں داخل نہ ہونے دو:وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ: اس سے مراد یہ ہے کہ ان کا راستے بند کر دو تا کہ یہ لوگ دار الاسلام میں آزاد نہ پھریں: تَابُوْا: کفر اور شرک سے توبہ کریں جس سے حدیث میں :شَهِدَ وَاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ: کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان حدیث 25 صحیح مسلم کتاب الایمان 22):وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کافر کے صرف لفظ توبہ کا اعتبار نہیں ہو سکتا جب تک توبہ ثابت کرنے کے لیے یہ اعمال نہ کیے جائیں:وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ: امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کے روکنے والوں سے قتال کی دلیل اس آیت سے لی تھی:فَخَلُّوْا: اس سے مراد ان کے مال اور جان کی حفاظت ہے جیسے بخاری اور احمد کی حدیث میں مذکور ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ حدیث 392)

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۟

" اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے امن طلب کرے (دار الاسلام میں داخل ہونے کے لیے) تو اس کو امن دو یہاں تک کہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو یہ اس وجہ سے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو نہیں جانتے" [6]۔

تفسیر 6 اس آیت میں تیسری قسم کے مشرکین کا ذکر ہے جن کو :مُسْتَاْمِنِيْنَ: کہا جاتا ہے ان کا حکم یہ ہے کہ اگر کافر دار الاسلام میں داخل ہونے کی اجازت مانگیں تو ان کو اجازت دینا چاہئے لیکن مقصد یہ ہوگا کہ وہ لوگ دار الاسلام میں قرآن سنیں گے جو کہ علم توحید کے حصول کا ذریعہ ہے اور یہ اہم مقصد ہے اور اس کے علاوہ باقی مقاصد کے لئے بھی (جو شرعاً ممنوع نہ ہوں) امن دینا جائز ہے جیسے پیغام لیکر آنا، صلح طلب کرنا، جزیہ لانا (یہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کیئے ہے: يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ: یہ صریح دلیل ہے کہ :مَسْمُوْعٌ: کلام اللہ ہے اور یہ سلف صالحین کا مذہب ہے :مَتْلُوٌّ اور مَسْمُوْعٌ اور مَكْتُوْبٌ: اللہ کا کلام ہے اور وہ قول غلط ہے جو کہتے ہے کہ یہ کلام لفظی ہے کلام نفسی پر دلالت کرتا ہے اور

کلام نفسی کلام اللہ ہے۔ اَبْلِغْهُ مَأْمَنَهٗ: یعنی پھر ان کو اپنی سرحدیں حدود کے پار پہنچادو تاکہ اپنے وطن تک پہنچ جائیں۔
اہل علم نے کہا ہے کہ سال تک رہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی البتہ چار مہینے تک اجازت دی جاسکتی ہے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

"کیسے ہوگا مشرکین کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک کوئی عہد مگر وہ لوگ جن کے ساتھ تم لوگوں نے مسجد حرام کے نزدیک عہد کیا ہے تو جب تک یہ لوگ تمہارے لئے (وعدے پر) قائم رہوں تو تم لوگ بھی ان کے لئے وعدے پر قائم رہو بیشک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں (وعدہ خلافی سے بچنے والوں) سے محبت کرتا ہے [7]۔ ان کی بات کا اعتبار کیسے کیا جائیگا اور اگر یہ لوگ تم پر غالب آجائیں تو تم میں یہ لوگ رشتہ داری اور وعدے کا لحاظ نہیں کرتے تمہیں اپنے منہ سے راضی کرتے ہیں اور ان کے دل انکار کرتے ہیں اور ان کے اکثریت نافرمان ہیں [8]۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے بدلے میں تھوڑی قیمت لی ہے یہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں یقیناً ان کے اعمال بہت برے ہیں [9]۔ کسی مؤمن کے بارے میں رشتہ داری اور وعدے کا لحاظ نہیں کرتے ہیں اور یہی لوگ حد سے گزرنے والے ہیں [10]۔ پس اگر انہوں نے توبہ کی (ان کاموں سے) اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ ادا کی تو دین میں تمہارے بھائی ہیں اور ہم احکام کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں اس قوم کے لئے جو جانتے ہیں" [11]۔

تفسیر 7 یہ قتال کی پہلی ممانعت کا رد ہے کہ یہ خیال کرتے ہیں کہ مشرکین مکہ کے ساتھ تو معاہدہ ہوا تھا تو ان کے ساتھ قتال کرنا کیسے جائز ہے؟ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنا عہد توڑا ہے اور جب وعدہ توڑ دیا جائے تو اس کا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کے نزدیک کچھ اعتبار نہیں ہے سوائے اس دوسرے گروہ کے جو اپنے عہد پر قائم تھے تو ان کے ساتھ عہد پورا کیا جائیگا۔ اس آیت میں براءت کی حکمت ذکر ہو رہی ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو آیت 4 میں مذکور ہیں یا اس

سے مراد مکے والے ہیں جن کے ساتھ صلح حدیبیہ میں صلح کی گئی تھی اور دو سال تک عہد برقرار رہا پھر دو سال کے بعد توڑا۔

تفسیر 8 اس آیت سے ان مشرکین کی صفات شروع ہیں جو کہ قتال کے اسباب ہیں اس آیت میں چار صفات مذکور ہیں: كَيْفَ یہ پہلے كَيْفَ کا اعادہ ہے اور فعل مقدر ہے: كَيْفَ يَكُوْنُ لَهُمْ عَهْدٌ: اِلًّا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اکثر روایات مذکور کی گئی ہیں کہ اِلًّا رشتہ داری کے معنی میں ہے اور قتادہ رحمہ اللہ کی روایت میں حلف کے معنی میں ہے اور مجاہد رحمہ اللہ کی روایت میں اللہ کے معنی میں ہے لیکن پہلا قول بہتر ہے: يُرْضُوْنَكُمْ: اس سے مراد وعدہ وفا کے بارے میں باتیں کرنا ہے ایمان کے بارے میں اس طرح نہیں ہے اس لئے کہ یہ صفات مشرکین کی ہیں منافقین کی نہیں ہیں۔
سوال: وَاَكْثَرُهُمْ: کافر تو سب منافق ہیں تو اکثر کیوں کہا ہے؟: جواب: یہاں پر منافقین سے مراد وعدہ خلافی کرنے والے ہیں۔ جواب ۲: ان میں سے بعض بعد میں ایمان لائے تھے اور فاسقین سے مراد وہ ہیں جو موت تک کفر پر قائم تھے۔

تفسیر 9 اس آیت میں باقی تین صفات مذکور ہیں: اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: اس سے مراد یہ ہے کہ ان مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے احکام اور قرآن کو چھوڑا ہے اور دنیا کو پسند کیا ہے ہر کافر اور مشرک کا یہ حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کے مقابلے میں دنیا کو پسند کرتا ہے: فَصَدُّوْا: لازمی اور متعدی دونوں احتمالات ہیں یعنی خود رک گئے یا باقی لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔

تفسیر 10 اس آیت میں دو صفات مذکور ہیں: لَا يَرْقُبُوْنَ: اس میں تکرار نہیں ہے اس لئے کہ پہلے خاص ذکر ہوا تھا اور یہ عام ہے: اَلْمُعْتَدُوْنَ: یہ خباثت میں ترقی ہے صرف لحاظ کا ترک نہیں ہے بلکہ ساتھ میں ظلم بھی کرتے ہیں۔

تفسیر 11 اس آیت میں توبہ کی ترغیب ہے لیکن آیت 5 میں قتال کی ممانعت کا مقصد اور مال اور خون کی عصمت کا حصول ہے اسی وجہ سے وہاں پر فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ: کہا تھا اور اس آیت میں مقصد ان کے عہد کا اعتبار کرنا ہے اور جس کا اعتبار کیا جاسکتا ہے تو اس کو بھائی کہا جاسکتا ہے اسی وجہ سے اس آیت میں: فَاِخْوَانُكُمْ: کہا ہے تو آیتوں میں تعارض نہیں ہے: وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ: آیتوں سے مراد وعدہ توڑنے والوں کے اوصاف ہیں جو کہ قتال کی علتیں ہیں اور اسی طرح توبہ کرنے والوں کی صفات کا بیان ہے۔

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ
يَنْتَهُوْنَ ﴿١٢﴾ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ
فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣﴾ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ
يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٤﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٥﴾

"اور اگر انہوں نے اپنی قسموں کو مضبوط ہونے کے بعد توڑا اور تمہارے دین میں طعن کیا تو کفر کے سرداروں سے لڑو یقیناً ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہیں تاکہ یہ لوگ (کفر سے) باز آجائیں[12]۔ کیوں نہیں لڑتے ہو اس قوم کے ساتھ جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑا ہے اور کوشش کی تھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نکالنے کی اور انہوں نے تم پر ابتداء کی پہلی دفعہ (جنگ کرنے میں) کیا تم ان سے ڈرتے ہو پس اللہ تعالیٰ زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو اس لئے کہ تم ایمان لانے والے ہو[13]۔ ان سے قتال کرو ان کو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے عذاب دیگا اور ان کو رسوا کریگا اور تمہاری مدد کریگا ان کے مقابلے میں اور ایمان والوں کے سینوں کو شفاء عطا کر دیگا[14]۔ اور کافروں کے دلوں کا غصہ دور کریگا اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر مہربانی کریگا (ایمان کی توفیق دے گا) جن کو چاہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔"[15]۔

تفسیر 12 اس آیت میں دو توجیہات ہیں پہلی توجیہ یہ ہے کہ اس سے مراد مشرکین معاہدین ہیں اس لئے لفظ اِنْ ذکر کیا ہے یعنی اگر ان معاہدین نے مدت پوری کرنے سے پہلے وعدہ خلافی کی تو ان کے ساتھ قتال کرو دوسری توجیہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ وعدہ خلافی کرنے والے مشرکین ہیں اور اِنْ اِذْ: کے معنی میں ہے معنی یہ ہے کہ جب انہوں نے اپنا وعدہ توڑا۔ پھر اس آیت میں تین صفات مذکور ہیں یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جس نے دین اسلام میں طعن و تشنیع کیا تو وہ کافر ہے یا معاہد اور ذمی کافر طعن کرے تو اس کا ذمہ اور امن ختم ہو جاتا ہے (خازن مدارک) طعن یہ ہے کہ دین کی طرف اس چیز کی نسبت کرے جو مناسب نہیں ہوتی یا دین کو حقیر سمجھے اور اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن کریم یا دین کے احکام کو گالیاں دے تو یہ طعن کرنا کفر ہے یہ کفر کے ائمہ کہلاتے ہیں اس لئے کہ اس قسم کے آدمی کفر کی بنیاد بنتے ہے اور باقی لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں: اَیْمَانَهُمْ: عہد کے وقت قسم مذکور ہوتا ہے اس لئے ایمان کہا ہے: اِنَّهُمْ لَآ اَیْمَانَ لَهُمْ: پہلے ان کے لئے ایمان (قسمیں) ثابت کیں اور اب اس سے نفی کر دی اس لئے کہ جب ایمان کو توڑا تو نہ ہونے کے مثل ہو گیا۔

تفسیر13 اس آیت میں باقی دوصفات ہیں اور ایمان والوں کو ان مشرکین سے قتال کرنے کی ترغیب ہے جن میں یہ صفات موجود ہوتی ہیں اور پانچ طریقوں سے ترغیب ہے۔ (۱) لفظ اَلَا تحضیض: کے لئے، (۲) دو علتوں کا ذکر، (۳) اَتَخْشَوْنَهُمْ، (۴) فَاللّٰهُ اَحَقُّ، (۵) اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: وَهَمُّوْا: کوشش کرنے کے معنی میں ہے اس لئے کہ صرف گناہ کا ارادہ کرنا تو گناہ نہیں ہے اور اخراج سے مراد مکے سے نکالنا ہے تو اس میں کامیاب ہوگئے یا مدینے سے نکالنا ہے اور اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔

تفسیر14 اس آیت میں ان کے اسباب بیان کرنے کے بعد قتال کا اعلان ہے اور اس کے چار فوائد ذکر ہو رہے ہیں يُعَذِّبْهُمُ: اس سے مراد قتل ہے: وَيُخْزِهِمْ: قید کرنے اور ذلیل کرنے کو شامل ہے: يَشْفِ: شفاء سے مراد دلوں کی خوشی ہے۔

تفسیر15 اس آیت میں قتال کے دو فائدے مذکور ہیں: قُلُوْبِهِمْ: کی ضمیر کافروں کی طرف راجع ہے: وَيَتُوْبُ یہ کلام: مُسْتَاْنِف: ہے اس لئے مرفوع ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۚ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ﴿١٧﴾ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ ۖ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ﴿١٨﴾

"کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تمہیں چھوڑ دیا جائیگا (بغیر کسی امتحان کے) اور اب تک اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ظاہر نہیں کیا ہے جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کے علاوہ کسی کو راز دار دوست نہیں بنایا اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ [16] مشرکین کو دیا نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے گھروں کو آباد کریں جبکہ اپنے نفسوں پر کفر کی گواہی دینے والے ہیں یہی لوگ ہیں کہ ان کے اعمال ضائع ہیں اور آگ میں ہمیشہ رہیں گے [17]۔ بیشک اللہ کی مسجدوں کو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی اور سے نہیں ڈرتے تو قریب ہے کہ یہی لوگ ہدایت پانے والوں میں سے ہونگے" [18]۔

تفسیر 16 اس آیت میں جہاد کی ترغیب ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا امتحان لے گا اور یہ امتحان دو طریقوں سے ہوگا ایک جہاد کرنا دوسرا مشرکین سے براءت کرنا: وَلَمْ يَتَّخِذُوا : یہ جملہ اس وجہ سے ذکر کیا کہ اس سورۃ میں براءت کا اعلان تھا اور براءت تعلقات ختم کرنے کو کہا جاتا ہے: وَلِيجَةً: امام فراء نے کہا ہے کہ ولیجہ راز دار دوست کو کہا جاتا ہے اور امام رازی نے کہا ہے کہ ولیجہ کا اطلاق ہر اس شخص پر کیا جاسکتا ہے جس پر انسان اعتماد کرے۔

تفسیر 17 اس آیت میں قتال کی ممانعت کا دوسرا جواب ہے سوال پیدا ہورہا تھا کہ یہ مشرکین تو مسجد کی خدمت کرتے ہیں اور خاص کر مسجد حرام کی اور حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں تو ان سے قتال کیوں جائز ہے؟ تو جواب ہوا کہ مشرکین کے اعمال اسی طرح برباد ہیں: شَاهِدِينَ: کفر کا (اقرار زبان سے) یہ ہے کہ اپنے معبودوں کو مخلوق کہتے ہیں اور پھر بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کو شریک ٹھہراتے ہیں اور عمل کے ساتھ اقرار یہ ہے کہ شرک کے کام ظاہر کرتے ہیں جیسے سجدہ اور غیر اللہ سے دعا مانگنا، مَا كَانَ: میں اشارہ ہے کہ ایمان والے مشرکین کو مساجد بنانے کا موقع نہیں دینگے: مَسَاجِدَ اللَّهِ: تمام

مساجد کے حکم کی تعلیم کے لئے جمع کا صیغہ ذکر کیا۔

تفسیر 18 اس آیت میں ایمان والوں کی صفات مذکور ہیں کہ اس وجہ سے ان کا مساجد کو آباد کرنا قبول ہے یہ آباد کرنا دو قسم کا ہے ایک تعمیر اور آباد کاری ہے یہ بھی عبادت ہے اس کی صفائی اور اس میں روشنی وغیرہ کا انتظام کرنا۔ دوسرا مساجد کو عبادت کے ذریعے عقیدہ توحید اور سنت کے طریقے پر آباد کرنا: وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ: خشیت وہ خوف ہے جو تعظیم کے ساتھ ہوتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے: وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّكٰوةَ: اس میں اشارہ ہے کہ نفل کام (جیسے مساجد کی تعمیر) یہ فرائض کی ادائیگی کے بعد ہے چاہے وہ فرض بدنی ہو یا مالی ہو: وَلَمْ یَخْشَ: تمام عبادات میں اخلاص کی طرف اشارہ ہے اس وجہ سے اس کو بعد میں ذکر کیا: فَعَسٰی: عَسٰی: اللہ کی طرف سے وجوب (یقین) کے لئے ہوتا ہے لیکن جب: اِهْتِدَاءٌ: سے مراد قبولیت ہے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو اس وجہ سے لفظ عسٰی کے ساتھ ذکر کیا۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾

"کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس شخص کی طرح قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آخرت کے دن پر اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا (19)۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنے نفسوں کے ساتھ یہ اللہ کے نزدیک بلند درجوں والے ہیں اور خصوصاً یہی لوگ کامیاب ہیں" (20)۔

تفسیر 19 یہ آیت بھی پہلے جواب کے ساتھ متعلق ہے خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین کے نیک اعمال برباد ہیں اسی وجہ سے وہ لوگ ان اعمال کے ساتھ ایمان والوں کے ساتھ برابر نہیں ہو سکتے۔ اس آیت میں ان لوگوں کا رد ہے جو نیک کاموں پر فخر کرتے تھے جیسے کفر اور شرک کے عقیدے کے باوجود مساجد بنانا اور صدقہ خیرات کرنا: سِقَایَةَ: اس سے پہلے اہل کا لفظ پوشیدہ ہے یا كَمَنْ: کے ساتھ اِیْمَانَ: پوشیدہ ہے لَا یَهْدِیْ: ہدایت سے مراد قبولیت اور اجر دینا ہے یا اس سے مراد خیر اور شر کے درمیان فرق کرنے کے لئے بصیرت اور سمجھ ہے۔

تفسیر 20 یہ آیت علت ہے یا پہلی آیت کے لئے تفسیر ہے کہ جس میں: لَا یَسْتَوٗنَ: فرمایا تھا اور اس میں دوسری جانب

مرجوح مذکور نہیں ہوا اس لئے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿٢١﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٢﴾

"ان کو ان کا رب خوشخبری دیتا ہے اپنی طرف سے مہربانی اور رضامندی کی اور ایسے باغات کی جن میں ان کے لئے ہمیشہ کی نعمتیں ہیں [21]۔ یہ لوگ اس میں ہمیشہ رہینگے بیشک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے" [22]۔

تفسیر 21، 22 ان دونوں آیتوں میں اخروی خوشخبری ہے اور یہ اَلْفَآئِزُوْنَ: کے لئے تفسیر ہے: بِرَحْمَةٍ: اس سے مراد ہر عذاب سے بچنا ہے جیسے سورہ انعام 16 اور مؤمن 9 میں ہے یا اس سے مراد ان کے اعمال کی قبولیت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ
فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٣﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ
اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ
فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰي يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ
حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَـيْـــًٔـا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ
مُّدْبِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَعَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٧﴾

"اے ایمان والوں اپنے بڑوں کو اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ۔ اگر وہ کفر کو ایمان کے مقابلے میں پسند کریں اور جس نے تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کی پس یہی لوگ ظالم ہیں [23]۔ آپ کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے قبیلے اور تمہارا وہ مال جس کو تم کماتے ہو اور وہ تجارت جس کے خراب ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو یہ تمہیں زیادہ محبوب ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ لے آئے اور اللہ تعالیٰ نافرمان قوم کو ہدایت نہیں دیتا [24]۔ یقیناً اللہ نے تمہاری بہت ساری جگہوں میں مدد کی ہے اور جنگ حنین کے دن جب تمہیں تمہاری کثرت نے خوش کر دیا تو تمہیں کچھ فائدہ نہیں دیا اور وسعت کے باوجود تم پر زمین تنگ ہوگئی پھر تم نے (میدان جنگ سے) پیٹھ پھیر لی [25]۔ پھر اللہ نے اپنی طرف سے تسلی اپنے رسول اور ایمان والوں پر نازل کی اور ایسے لشکروں کو بھیجا جن کو تم نہیں دیکھ سکتے تھے اور کافروں کو عذاب دیا اور یہی کافروں کی سزا ہے [26]۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس (غلبے) کے بعد مہربانی کی جس کو اللہ نے چاہا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے" [27]۔

تفسیر 23 یہ قتال کی ممانعت کے لئے دوسرا جواب ہے سوال یہ تھا کہ ان مشرکین سے ہماری رشتہ داری ہے اور صلہ رحمی تو واجب ہوتی ہے تو ان سے قتال کیوں واجب ہوا؟۔ تو جواب ہوا کہ مشرکین سے اگرچہ رشتہ دار ہوں لیکن ان سے دوستی حرام ہے اور دوستی کی تفسیر یہ ہے کہ کفر اور شرک کے کاموں میں ان کی پیروی کرتے ہیں یا ان کاموں میں ان کی مدد کی

جائے یا اس وجہ سے جہاد چھوڑ دیا جائے۔ فائدہ: اس آیت میں بیٹوں کا ذکر اس وجہ سے نہیں کیا کہ بیٹے باپ کے تابع ہوتے ہیں تو باپ بیٹے سے دوستی اس کی پیروی کے طور پر نہیں کرتا اس آیت کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جو شرک پر راضی ہوا تو وہ مشرک ہے۔

تفسیر 24 یہ آیت بھی پہلی آیت کے ساتھ متعلق ہے پہلے سے بیان میں ترقی ہے اس لئے کہ پہلے کافروں سے دوستی کو منع کر دیا اور اس آیت میں اللہ اور رسول کی مخالفت میں ہر کسی سے تعلق رکھنے کو منع کیا اور ان کے لئے وعید ہے جو اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مقابلے میں رشتہ داروں یا دنیا کی چیزوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ اسی طرح ان کی محبت کی وجہ سے ہجرت اور جہاد چھوڑتے ہیں۔ مفسر کشاف نے کہا ہے کہ یہ آیت بندوں پر بہت سخت ہے یعنی ہر مسلمان اپنا محاسبہ کرے کہ کیا خود کو اللہ کے دین میں اس طرح مضبوط پاتا ہے جیسے اس آیت کا تقاضا ہے؟ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت دلیل ہے کہ ایک طرف دین کی ایک مصلحت ہو اور دوسری طرف دنیا کی بہت ساری مصلحتیں ہوں لیکن مسلمان پر دین کو دنیا پر ترجیح دینا اور دین کی مصلحت کا لحاظ کرنا فرض ہے: وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ: اس کی تخصیص اس وجہ سے ہوئی کہ یہ دین کے غلبے اور بلندی کا ذریعہ ہے: أَمْرِهِ: اس سے مراد مختلف طریقوں سے دنیا کا عذاب ہے: الْفَاسِقِينَ: سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت سے کھلے طور سے نکلے ہیں اور توبہ نہ کی ہو اور: لَا يَهْدِي: سے مراد عذاب سے بچانا ہے۔

تفسیر 25 پہلے کے ساتھ ربط یہ ہے کہ جیسے ان ذکر شدہ چیزوں پر اعتماد کرنا منع ہے تو اسی طرح اپنی کثرت پر اعتماد کرنا بھی منع ہے۔ اس آیت میں جہاد کی ترغیب کے لئے اللہ تعالی کی مدد کی خوشخبری ہے دوسرا مقصد یہ ہے کہ اپنی کثرت پر اعتماد مت کرو بلکہ اللہ تعالی پر توکل کرو: مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ: اس سے مراد مغازی یعنی غزوات ہیں۔ مورخین نے کہا ہے کہ وہ مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہوئے (صحیح بخاری کتاب المغازی باب کم غزا النبی ﷺ حدیث 4471) کی روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود 19 غزوات میں شریک ہوئے ہیں: يَوْمَ حُنَيْنٍ: اس کی تخصیص وہم کو ختم کرنے کے لئے کی ہے اگر کوئی سوچے کہ حنین میں تو شکست ہوئی ہے تو معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے نصرت نہیں تھی؟ تو جواب دیا۔ حنین مکہ اور طائف کے درمیان وادی ہے مقابلے میں ہوازن اور ثقیف قبیلوں کے چار ہزار افراد تھے جو تیر مارنے کے بہت ماہر تھے۔ غزوہ حنین فتح مکہ کے بعد ہوا ایمان والوں کے لشکر میں بارہ ہزار افراد تھے لیکن ان میں نئے

مسلمان بھی تھے جو آداب سے واقف نہیں تھے تو اسی وجہ سے جنگ کی ابتداء میں پریشان ہوئے اور میدان کو چھوڑ دیا۔

تفسیر 26 اس آیت میں جنگ حنین میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا ذکر ہے بعد والی حالت میں جب اللہ تعالیٰ نے ملائکہ بھیجے اور کافروں کو مغلوب کیا: عَلٰى رَسُوْلِهٖ: اس طرح سورۃ فتح 26 میں بھی ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ رسول بھی اللہ کی طرف سے آئے ہوئے تسکین کا محتاج ہے۔ اگرچہ آپ ﷺ اس موقعے پر مضطرب اور پریشان نہیں ہوئے تھے صرف ساتھیوں کے جانے کا آپ ﷺ کو دکھ ہوا تھا: وَعَذَّبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: بعض کو قتل کیا اور بعض کو قید کیا پھر ایمان لانے کے بعد واپس دیئے۔

تفسیر 27 اس آیت میں اشارہ ہے کہ جنگ کے بعد بہت سارے کافروں کو ایمان کی توفیق دی گئی اسی طرح اس آیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مغفرت کی طرف بھی اشارہ ہے: یَتُوْبُ: ماضی کے حال کی حکایت ہے تا کہ آنے والے زمانے کو شامل ہو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَ اِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً فَسَوْفَ یُغْنِیْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۸﴾

"اے ایمان والو بیشک مشرکین ناپاک ہیں تو وہ لوگ اس سال (ہجرت کا نواں سال) کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ جائیں اور اگر تم فقیری سے ڈرتے ہو تو عنقریب تمہیں اللہ تعالیٰ مالدار بنائے گا اپنے فضل سے اگر چاہے بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے" [28]۔

تفسیر 28 اس آیت میں براءت کا ایک طریقہ مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ مشرکین کو حج عمرہ اور حرم میں داخل ہونے سے روک لو۔ اس کی علت یہ ذکر ہوئی کہ یہ لوگ: نَجَسٌ: (ناپاک) ہیں اکثر علماء نے کہا ہے کہ نجاست سے مراد باطنی معنوی نجاست ہے جو کہ شرک ہے اور بعض اہل علم کے نزدیک نجاست سے مراد بدن کی ظاہری نجاست ہے: فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ: اس سے مراد حج عمرہ اور طواف سے منع کرنا ہے۔ مسجد حرام اور باقی مساجد میں داخل ہونا احناف کے نزدیک جائز ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک صرف مسجد حرام میں منع ہے باقی مساجد کے لئے جائز ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک تمام مساجد کے لئے منع ہے بہتر یہ ہے کہ مسجد حرام سے مراد سارا حرم ہے اور مشرکوں اور کافروں کا حرم میں داخل ہونا منع ہے پھر اس آیت میں جہاد کی چوتھی ممانعت کا جواب ہے سوال یہ تھا کہ مشرکین کی طرف سے ہمارے پاس مال آتا ہے تو

اگر ان سے قتال کریں اور ان کو حرم سے روکیں تو وہ مال تو بند ہو جائینگے تو جواب ہوا کہ کوئی فکر نہ کرنا اللہ تعالیٰ دوسری طرف سے کوئی سبب بنادے گا: إِنْ شَاءَ: یہ اس پر دلیل ہے کہ مالداری اور غربت بندوں کے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿٢٩﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٣٠﴾

"اور ان لوگوں کے سے لڑو جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر (صحابہ کرام کے ایمان کی طرح) ایمان نہیں رکھتے اور اس چیز کو حرام نہیں سمجھتے جس کو اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے اور حق دین کی اتباع نہیں کرتے ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ جزیہ (ٹیکس) دینگے اپنے ہاتھ سے اور یہ لوگ ذلیل ہونگے [29]۔ یہودیوں نے کہا عزیر علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کا بیٹا ہے یہ ان کی منہ کی بات ہے ان کی یہ بات ان لوگوں کی مشابہ ہے جنہوں نے کفر کیا ہے ان سے پہلے اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے یہ لوگ حق سے کس طرح پھر جاتے ہیں" [30]۔

تفسیر 29 اس آیت سے آیت 67 تک سورۃ کا دوسرا حصہ ہے اور اس حصے میں اہل کتاب کفار کا ذکر ہو رہا ہے۔ ان سے قتال کی 13 وجوہات ذکر کی ہیں اس آیت میں ان میں سے تین مذکور ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان کافروں کے قتال سے مقصد ان کو کمزور بنانا ہے تو اگر دارالاسلام میں رہیں اور جزیہ دیں یا دار اسلام سے باہر ہوں لیکن مسلمانوں سے جزیہ دینے کی وجہ سے صلح کرلیں تو یہ جائز ہے۔ جزیے کے تفصیلی احکام احادیث اور فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں: وَهُمْ صَاغِرُونَ: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دارالاسلام میں ذمی لوگ عزت سے نہیں رہ سکتے: لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ: اس سے مراد شرعی ایمان کی نفی ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان ہے یہودی تجسیم اور تشبیہ کا اور نصاریٰ تثلیث اور حلول کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اجسام کے بغیر ارواح کے اٹھنے کے قائل ہیں اور جنت اپنے لئے خاص کرتے ہیں: مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ: یعنی قرآن اور سنت کی تحریمات نہیں مانتے یا تورات اور انجیل کی تحریمات بھی نہیں مانتے بلکہ اس میں تحریف کی ہے عَن يَدٍ: اپنے ہاتھ سے دینگے اور نقد ادا کرینگے اور زبردستی دینگے اس کو عَن يَدٍ: کہتے ہیں: وَهُمْ

صٰغِرُوْنَ: یہ دلیل ہے کہ معاہد اور ذمی دار الاسلام میں عزت سے نہیں رہیں گے۔ علماء نے کہا ہے کہ شہروں میں نہیں رہیں گے بلند عمارتیں نہیں بنائیں گے۔ فوج میں یا دیگر اعلیٰ عہدوں پر مقرر نہیں ہونگے۔

تفسیر 30 اس آیت میں ان کے قتال کے باقی چار اسباب مذکور ہیں۔ یہودیوں کا شرک یہ تھا کہ عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے اور نصاریٰ کا شرک یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے اور ان میں عوام کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ لوگ حقیقت میں اللہ کے بیٹے ہیں اور خاص لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ لوگ اللہ کے چہیتے بیٹوں کی طرح ہیں کہ باپ ان کی بات مانتا ہے اور ان کو اختیارات دیتا ہے۔ یہ دونوں عقیدے کفر کے ہیں۔ اس امت کے جاہل لوگوں میں یہ دوسرا عقیدہ کثرت کے ساتھ موجود ہے امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے تفسیر محرر الوجیز میں کہا ہے کہ یہ بیٹے کا ہونا محبت اور شفقت کی وجہ سے ہے حقیقی نہیں ہے اور نیشاپوری نے کہا ہے کہ جب عزیر علیہ السلام نے یہودیوں کو بہت زمانے کے بعد تورات زبانی پڑھ کر سنائی تو انہوں نے یہ عقیدہ رکھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت کا مظہر ہے یعنی اس کو: عَلِیْمٌۢ بِکُلِّ شَیْءٍ: قرار دیا اور جب عیسیٰ علیہ السلام نے معجزات پیش کیے تو نصاریٰ نے یہ عقیدہ رکھا کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے: کُلُّ شَیْءٍ: کے تصرف کی صفت دی ہے یعنی الوہیت کی صفت عزیر اور عیسیٰ علیہ السلام میں ظاہر ہوئی ہے جس طرح باپ کا اثر بیٹے میں ظاہر ہوتا ہے: قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ: اس سے مراد بے دلیل بات ہے: قَوْلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: اس سے مراد وہ ناسمجھ کافر ہیں جو ملائک کو بنات اللہ (اللہ کی بیٹیاں) کہتے تھے یا اس سے مراد ان کے بڑے ہیں کہ کفر میں یہ لوگ ان کی تقلید کیا کرتے تھے یا مقصد یہ ہے کہ موجود یہود اور نصاریٰ اپنے بڑوں گمراہوں کی تقلید کرتے ہیں یا اس سے مراد فرقہ براہمہ اور بوذیہ کافر ہیں جو یہود اور نصاریٰ سے پہلے گزرے ہیں اور وہ بوذا اور برہما کے بارے میں عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ لوگ اللہ کے بیٹے ہیں (تاریخ ابوزہرہ) قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ: یہ بددعا ہے اور اس سے مراد لعنت ہے۔

اِتَّخَذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَالۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ
لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبۡحٰنَهٗ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ۞ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يُّطۡفِئُوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَيَاۡبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنۡ يُّتِمَّ نُوۡرَهٗ وَلَوۡ
كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ ۞ هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۞

"انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو مختار (حلال اور حرام کے) بنایا اور مسیح مریم کے بیٹے کو حالانکہ ان کو صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ صرف ایک معبود کی عبادت کرو جس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے پاک ہے جن کو یہ لوگ شریک بناتے ہیں[31]۔ یہ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا مگر یہ کہ اپنی روشنی کو پورا کردے اگرچہ کافر لوگ اس کو ناپسند کریں[32]۔ اللہ تعالیٰ وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو دین حق اور ہدایت کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اگرچہ مشرکین اس کو ناپسند کریں"[33]۔

تفسیر 31 اس آیت میں قتال کے باقی اسباب ذکر کیے گئے ہیں۔ احبار ان علماء کو کہتے ہیں کہ الفاظ اور معنی خوبصورت انداز میں پیش کریں اور رہبان ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور اپنا وقت اور عمل خاص اللہ کے لئے خرچ کرتے ہیں لیکن اس آیت میں جب اضافت ان کی ضمیر کی طرف کی تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ برے پیر اور مولوی ہیں ان کو کفر شرک اور بدعات خوبصورت بنا کر دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دین ہے: اَرۡبَابًا اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ مولویوں اور پیروں کو رب سمجھتے تھے یہ ان کی عبادت کرتے تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر وہ لوگ ان کے ایک چیز حرام کرتے تو یہ اس کو حرام سمجھتے اور اگر وہ ان کے لیے کوئی چیز حلال کرتے تو یہ اسے حلال سمجھتے جس طرح عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے (ترمذی کتاب التفسیر حدیث : 3095 شیخ البانی نے اس روایت کو حسن کہا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ خلاف شرع حکم میں مولویوں اور پیروں کی تقلید کرنا شرک ہے اور معلوم ہوا کہ رب حکم کے مختار ہونے کے معنی میں ہے۔ اس کو: شِرۡكٌ فِي الۡحُكۡمِ اور فِي التَّشۡرِيۡعِ کہا جاتا ہے لفظ: يُشۡرِكُوۡنَ : اس پر دلالت کرتا ہے امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ابو العالیہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ جب بھی یہ لوگ اللہ کی کتاب میں ایسا حکم پاتے جو احبار اور رہبان کے قول کے مخالف ہوتا تو یہ لوگ کتاب اللہ کا قول چھوڑتے اور ان کا قول لیتے پھر اس کے بعد ذکر ہے کیا کہ اس طرح حال ہمارے زمانے کے مقلدین کا بھی ہے کہ جب ان کے مذہب کے مخالف آیت یا کوئی حدیث ان کو سنائی جاتی

ہے تو یہ لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے: وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ: اس کو الگ اس وجہ سے ذکر کیا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ صرف عبادت میں شریک ٹھہرایا تھا اتباع میں نہیں بلکہ اس کی اتباع کو چھوڑا تھا یہ شرک فی الالوہیت ہے۔ یہ دونوں طرح کا شرک اس امت کے جاہلوں میں بھی موجود ہے۔ فائدہ: اس آیت میں دلیل ہے کہ اہل کتاب شرک کا عمل کرتے جبکہ اس کو شرک نہیں کہتے تھے تو یہ مشرک ہے۔

تفسیر 32 یہ قتال کا سبب ہے: نُوْرَ اللّٰهِ: سے مراد دین توحید ہے اور بِاَفْوَاهِهِمْ: سے مراد بلا دلیل باتیں ہیں۔ يُرِيْدُوْنَ: ارادے سے مراد کوشش کرنا ہے۔ اس طرح سورۃ صف 8 میں بھی ہے: اَنْ يُّطْفِـُٔوْا: لام کے بغیر ذکر کیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ ان کا اصل مقصد روشنی کو بجھانا ہے۔

تفسیر 33 اس آیت میں نور کے اتمام کا بیان ہے اور آخری نبی ﷺ کی سچائی کا بیان ہے هُدٰى: سے مراد اصول اور عقائد ہیں اور: وَدِيْنِ الْحَقِّ: احکام اور فروع مراد ہیں: لِيُظْهِرَهٗ: یہ ضمیر یا تو دین کی طرف راجع ہے معنی یہ ہے کہ دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرتے ہیں الطہ دلائل کے اعتبار سے ہر زمانے میں غالب ہے اور تسلط کے اعتبار سے عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے زمانے میں یا یہ نبی ﷺ کی طرف راجع ہے معنی یہ ہوا کہ پورے دین اسلام کی نبی ﷺ کو خبر دیتے ہیں۔ اس طرح آیت سورۃ صف 9 اور سورۃ فتح 28 میں بھی ہے۔ (فائدہ) پہلی آیت کا فاصلہ لفظ كٰفِرُوْنَ: کے ساتھ ہے اور اس آیت کا فاصلہ لفظ مُشْرِكُوْنَ: کے ساتھ ہے اس لئے کہ پہلی آیت میں لفظ نور ہے اور نور کے مقابلے میں اندھیرا ہے اور کفر اندھیرے کو کہتے ہیں جبکہ اس آیت میں هُدٰى بتوحید ہے اور اس کے مقابل مشرکین ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

"ایمان والو بہت سے علماء اور پیر لوگوں کا مال کھاتے ہیں باطل طریقے سے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دیجئے" [34]۔

تفسیر 34 ربط یہ ہے کہ پہلی آیتوں میں اسلام کے ساتھ ان کی دشمنی ذکر کی تو اس میں ان کی بری صفات ذکر کر کے مومنوں کو ان کی مشابہت سے تنبیہ کی ہے مال کی حرص اور لوگوں کو گمراہ کرنا اور بخل یہ قتال کے باقی اسباب ہیں كَثِيْرًا سے

مراد وہ مولوی اور پیر ہیں جو آیت 28 میں ذکر ہوئے ہیں: لَيَأْكُلُوْنَ: أَكَلَ سے مراد لینا اور حاصل کرنا ہے لیکن بڑا مقصد اس کو کھانا ہے اس وجہ سے اس کی تعبیر اَكَلَ: سے کی اور اس طرح تعبیر زیادہ برائی ہے کہ انہوں نے پیٹ کے لئے دین کو تبدیل کیا ہے: اَلنَّاسِ: سے مراد ان کے مقلدین اور مریدین ہیں۔ جو آیت 3 میں ذکر ہوئے ہیں: بِالْبَاطِلِ: باطل سے مراد مال کے حصول کے لئے وہ تمام طریقے ہیں جو شریعت کے خلاف ہیں اور وہ لوگوں کو ثواب کے طور پر ظاہر کرتے ہیں رشوتیں نذریں وغیرہ: سَبِيْلِ اللهِ: سے مراد توحید وسنت اور قرآن ہے: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ: یہ بھی پہلے پر عطف ہے اور احبار اور رہبان کی صفت ہے۔ مال جمع کرنے سے مراد زکوٰۃ اور واجبات نہ دینا ہے اگرچہ مالدار بھی ہوتے ہیں یہ قول جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے سوائے ابوذر رضی اللہ عنہ کے لیکن اس کی تائید ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ باب فی حقوق المال حدیث 1664 شیخ البانی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے البتہ ابن ماجہ کتاب النکاح 1856 ترمذی کتاب التفسیر 3094 والی حدیث کو صحیح کہا ہے)۔ عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے سوال کیا اور انہوں جواب دیا۔ جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ میں جو چالیسواں حصہ اور عشر مقرر کیا ہے اور میراث کو ورثاء کا حق قرار دیا گیا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ زائد مال جمع کرنا جائز ہے: وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا: هَا کی ضمیر خزانوں اور مال کی طرف راجع ہے۔ فائدہ: ان آیتوں میں اگرچہ یہود ونصاریٰ کی صفات ہیں لیکن اس امت کے وہ مولوی بھی اس میں داخل ہیں جن میں یہ تین صفات ہیں۔ بخاری کی حدیث اس پر دلیل ہے کہ جس میں یہ الفاظ ہیں: نَزَلَتْ فِيْنَا وَفِيْهِمْ (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4660) (یہ آیت ہمارے اور ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے) اسی طرح امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں تمام بڑے علماء اور گمراہ پیروں سے تحذیر ہے خوف دلاتا ہے اور امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر میں اس زمانے کے برے علماء کے اخلاق ذکر کئے ہیں۔

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا
مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝٣٥ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ
كَاۗفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝٣٦ اِنَّمَا النَّسِيْۗءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ
يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِــــُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۭ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْۗءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٣٧ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ
اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝٣٨

"اس دن کہ ان چیزوں کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائیگا تو ان کا ماتھا داغا جائیگا اور ان کی کروٹیں اور ان کی پیشانیوں کو (کہا جائیگا) کہ یہ وہ چیز ہے کہ جس کو تم اپنے نفسوں کے لئے جمع کرتے تھے تو اس کی سزا چکھ لو جو تم جمع کرتے تھے [35]۔ بیشک مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہیں جس دن سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اس میں سے حرمت کے چار مہینے ہیں یہ قائم دین ہے تو ان مہینوں میں اپنے نفسوں پر ظلم نہیں کرو اور سارے مشرکین سے قتال کرو جس طرح یہ لوگ تم سب سے قتال کرتے ہیں اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کا دوست ہے [36]۔ بیشک آگے پیچھے کرنا حرمت کے مہینوں کو یہ کفر میں زیادتی ہے اس کے ساتھ کافروں کی گمراہی زیادہ ہوتی ہے یہ لوگ اس کے مہینے کو ایک سال حلال اور دوسرے سال حرام سمجھتے ہیں تاکہ ان مہینوں کو پورا کریں جن کو اللہ تعالیٰ نے عزت دی ہے تو یہ لوگ حلال سمجھتے ہیں (اس طریقے سے) ان مہینوں کو جن کو اللہ نے حرام کیا ہے ان کے برے اعمال ان کے لئے مزین کئے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا [37]۔ اے ایمان والو تمہیں کیا عذر ہے کہ جب تمہیں اللہ کی راہ میں نکلنے کا کہا جائے تو تم زمین (دنیا) کی طرف بھاری ہو جاتے ہو کیا تم نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے میں پسند کیا ہے تو دنیاوی سامان آخرت کے مقابلے میں بہت کم ہیں" [38]۔

تفسیر 35 اس آیت میں تخویف اخروی ہے ان پہلی صفات والوں کے لئے، اس آیت میں یہ تین اعضاء مذکور ہیں اس لئے کہ غریبوں کو دیکھتے وقت ان کے ماتھے پر بل پڑ جائے اور پھر کروٹ تبدیل کر لیتے اور پھر پیٹھ دکھاتے، دوسری وجہ یہ

ہے کہ یہ تمین اطراف سے احاطہ کا کنایہ ہے اس میں بھی: عَلَيْهَا اور بِهَا: ضمائر کنوز اور اموال کی طرف راجع ہیں۔

تفسیر 36 اس آیت میں بھی اہل کتاب کا رد ہے ان کے نزدیک ان کے سال میں بارہ مہینے سے کچھ دن زیادہ تھے اور بعض سالوں میں ان کے نزدیک تیرہ مہینے ہوتے تھے۔ اس میں حج اور رمضان کو خلط ملط کرنے کا سبب تھا اسی طرح مشرکین عرب کا رد ہے کہ وہ حرمت کے مہینوں میں تبدیلی کیا کرتے تھے اور اہل کتاب کا بھی اس میں ان کے ساتھ اتفاق تھا اَلدِّينُ الْقَيِّمُ: امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حق بات یہ ہے کہ دین مشہور معنی میں ہے اور: قَيِّمُ مُسْتَقِيمُ: کے معنی میں ہے اس لئے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے اس آیت میں تمام مشرکین سے پھر قتال کا امر ہے: فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ: معنی یہ ہے کہ ان تمام مہینوں میں اضافہ کر کے ظلم مت کرو اسی طرح تبدیل کرنے اور آگے پیچھے کرنے میں اور باقی گناہوں کے ساتھ ظلم نہ کرو۔ فائدہ ۱: یہ آیت دلیل ہے کہ شریعت کے احکام میں حساب چاند کے اعتبار سے ہے نہ کہ سورج کے۔ فائدہ ۲: عِنْدَ اللہِ: کے بعد: كِتَابِ اللہِ: لفظ دلیل ہے کہ یہ حکم لوح محفوظ میں لکھا گیا ہے۔ فائدہ ۳: چاند کے حساب سے سال میں کل دن تین سو پچپن (355) بنتے ہیں جبکہ سورج کے حساب سے تین سو پینسٹھ (365) دن اور ایک چوتھائی کی دن بنتے ہیں۔ اس طرح شمسی سال سے تقریباً دس دن زیادہ کا بنتا ہے اس طرح تین سال میں ایک مہینہ زیادہ ہو جاتا ہے تو سال تیرہ (13) ماہ کا بنتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف ہے۔ فائدہ ۴: كَافَّةً: یعنی مشرکین کی تمام اقسام یا تمام مہینے بعد والے معنی کی بناء پر یہ آیت حرمت والے مہینوں میں قتال کی حرمت کے لئے ناسخ ہے۔

تفسیر 37 اس آیت میں مشرکین کے ایک باطل رسم کا رد ہے جس کا تعلق مہینوں کے ساتھ ہے جیسے گزشتہ آیتوں میں مہینوں کی زیادتی کے ساتھ اہل کتاب کا رد تھا تفصیل اس کی یہ ہے کہ تین حرمت والے مہینے مسلسل ہے ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، عرب مشرکین کے لیے مسلسل تین ماہ تک جنگ سے رکنا مشکل تھا۔ تو یہ لوگ حج میں جب منیٰ سے واپس پلٹ جاتے تو بنو کنانہ کا ایک شخص کھڑا ہو جاتا جس کا نام قلمس تھا اور اس کا فیصلہ کوئی واپس نہیں لوٹا سکتا تھا یہ لوگ اس سے کہتے کہ حرمت کے مہینوں میں ہمارے لئے: اَلنَّسِيْ: (پیچھے لانا) تو وہ کہتا کہ حرمت محرم صفر تک منتقل ہوئی تو محرم کا مہینہ یہ لوگ حلال کر لیتے اگلے سال یہ حرمت ربیع الاول کی طرف منتقل ہوئی اس طریقے سے ہر سال میں ایک سے دوسرے مہینے کی طرف منتقل کرتے اس رسم میں کفر یہ تھا کہ حرام کو حلال کرتے تو اسی لئے آیت کریمہ میں اس کو کفر کا اضافہ کہا گیا ہے یعنی ان کی اور

بھی کفریات تھیں لیکن مہینوں کی تحریم اور تحلیل اپنی طرف سے کرنا بھی کفر کا کام تھا جیسے ایمان میں اضافہ کرنا ہے تو اسی طرح کفر میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ فائدہ: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو ایک عبادت کے لئے شرعی وقت تبدیل کرتے ہیں اور اس کے لئے دوسرا وقت مقرر کرتے ہیں تو یہ حرام کام ہے اسی طرح بغیر شرعی دلیل کے حرام اور حلال کرنا کفر ہے :يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا شَيْطَانَ: کے وسوسے کی وجہ سے گمراہ ہونا ہے چاہے انسی ہو یا جنی: لِيُوَاطِئُوا: یعنی یہ لوگ صرف گنتی کا اعتبار کرتے ہیں اور تحریم کا وصف تبدیل کرتے ہیں اس کی پروا نہیں کرتے۔

تفسیر 38 یہاں سے آیت 99 تک سورۃ کا تیسرا حصہ ہے اور اس میں منافقین کو وعید ہے تکرار کے بغیر اور ان کی 76 بری صفات مذکور ہیں ہر صفت پر نمبر لکھا گیا ہے۔ ان آیتوں میں غزوہ تبوک کی طرف اشارہ ہے جو ہجرت کے نویں سال ہوا تھا۔ اس سفر میں بعض منافقین شامل تھے اور بعض نفاق کی وجہ سے رہ گئے تھے اور مومنوں میں سے بھی بعض رہ گئے تھے۔ اس میں منافقین کی دو خصلتیں مذکور ہیں: اِثَّاقَلْتُمْ: اس سے مراد دنیا سے محبت کرنے کی وجہ سے سستی کرنا ہے: اَلْاَرْضِ: عیش عشرت اور دنیا کے سامان کی طرف کنایہ ہے اس وقت میں اس کی چار وجوہات تھیں۔ (۱) سخت گرمی کا ہونا، (۲) مسافت کا دور ہونا، (۳) اور مدینے میں فصلوں اور پھلوں کا تیار ہونا، (۴) سخت دشمن سے مقابلہ کرنا: مِنَ الْاٰخِرَةِ مِنْ بدل کے معنیٰ میں ہے۔ جیسے سورۃ زخرف آیت 60 میں ہے۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں عمل آخرت کے مقابلے میں کم ہیں۔ اس طرح سورۃ نساء آیت 77 میں بھی ہے۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۳۹

"اگر تم (جہاد کے لئے) نہ نکلو تو اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب دیگا اور تمہارے بدلے میں دوسری قوم لے آئیگا اور تم اللہ تعالیٰ کو کچھ ضرر نہیں دے سکتے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے" [39]۔

تفسیر 39 اس آیت میں خوف دلانا ہے عذاب اور ہلاکت کے ذریعے، اور یہ عذاب اور خوف جہاد ترک کرنے کی وجہ سے ہوگا۔ عذاب اگرچہ عام ہے لیکن بعض روایات میں (ابو داؤد کی روایات میں) اس کی مثال قحط سالی کے ساتھ ذکر کی ہے عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: تو قوموں کے بدلنے اور لشکر کے بغیر نصرت کی قدرت رکھتا ہے جیسے بعد والی آیت میں مذکور ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ
اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۗ وَ
كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿40﴾ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿41﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ
الشُّقَّةُ ۭ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿42﴾ عَفَا
اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿43﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿44﴾

"اگر تم اس رسول کی مدد نہ کرو تو اس کی اللہ نے مدد کی ہے جب اس کو کافروں نے نکالا دو میں سے دوسرا تھا جب دونوں غار میں تھے جب نبی نے اپنے دوست سے کہا غم نہ کرنا بیشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے تو اللہ تعالیٰ نے دل کی تسلی اس پر بھیج دی اور اس کو ایسے لشکر کے ذریعے مضبوط کیا جس کو تم نے نہیں دیکھا اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کی بات کو نیچے کر دیا اور اللہ کا کلمہ بلند کر دیا اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے[40]۔ نکلو چاہے ہلکے ہو یا بھاری اپنے مالوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور اپنے نفسوں کے ساتھ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔[41]۔ اگر (غزوہ تبوک) ہوتا سامان آسانی سے حاصل ہونے والا اور درمیانہ سفر ضرور یہ لوگ آپ کے ساتھ جاتے لیکن ان پر سفر دور پڑ گیا اور عنقریب یہ لوگ اللہ کی ذات کی قسمیں کھائیں گے اگر ہم طاقت رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے یہ لوگ اپنے آپ کو (جھوٹی قسم سے) ہلاک کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ بیشک یہ لوگ جھوٹے ہیں۔[42]۔ اللہ نے آپ کو معاف کر دیا ہے آپ ﷺ نے ان کو اجازت کیوں دی یہاں تک کہ آپ پر سچے لوگ ظاہر ہو جاتے اور جھوٹوں کو جان لیتے[43]۔ آپ سے وہ لوگ اجازت نہیں مانگتے جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں کہ جہاد کریں اپنے مالوں اور اپنے نفسوں کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ متقین کو جاننے والا ہے"[44]۔

تفسیر 40 اس آیت میں جہاد کے چھوڑنے پر وعید اور رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ اس ہجرت میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا ساتھی تھا اور پھر دونوں غار ثور میں تین دن رہے تھے۔ (صحیح

بخاری کتاب مناقب الانصار حدیث 3922 فی التفسیر 4663 صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة حدیث 2381) واقعے کی تفصیل محدثین نے نقل کی ہے اس آیت میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور ان کی صحابیت کی دلیل ہے تو جو اس سے انکار کرے وہ کافر ہے: اِلَّا تَنْصُرُوْهُ: جزا محذوف ہے: فَاللّٰهُ مُتَكَفِّلٌ بِهٖ: اللہ تعالیٰ اس کی مدد کا ذمہ دار ہے. ثَانِيَ اثْنَيْنِ: یہ اِحْدٰهُمَا: کے معنیٰ میں ہے اور یہ آیت دلیل ہے کہ دو سے زیادہ نہیں تھے اور نبی کریم ﷺ کی اولیت پر دلیل ہے یعنی وہ اول اور ابوبکر رضی اللہ عنہ دوئم تھے: لِصَاحِبِهٖ: مراد دینی محبت ہے اس لئے کہ غار کی صحبت تو پہلے ذکر کر دی: لَا تَحْزَنْ: حزن اور خوف انبیاء علیہم السلام پر بھی آتا ہے جیسے یعقوب اور ابراہیم، موسیٰ اور لوط علیہ السلام پر آیا تھا تو یہ نقص نہیں ہے امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوبکر کا یہ حزن نبی کریم ﷺ کے بارے میں تھا لہٰذا یہ تو کمال تھا: عَلَيْهِ: ضمیر ابوبکر کی طرف راجع ہے ماقبل کے قرینے سے وَاَيَّدَهٗ: ضمیر نبی ﷺ کی طرف راجع ہے فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ: پر عطف ہے یہ تائید غار کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بہت سارے غزوات میں ملائک بھیجے گئے ہیں: كَلِمَةَ الَّذِيْنَ: اس سے مراد کفر کے تمام اقوال اور اعمال ہیں اور اسی طرح نبی کریم ﷺ کے قتل کے بارے میں کافروں کے ارادے۔

تفسیر 41 اس آیت میں فرضیت قتال کیلئے ہر حال میں حکم ہے، اور خِفَافًا وَّثِقَالًا میں مفسرین کے دس اقوال ہیں جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔ (۱) خفافا کم اسلحہ ہو یا ثقالا زیادہ اسلحہ۔ (۲) خفافا۔ غریب۔ ثقالا مالدار (۳) خفافا۔ عیالدار نہ ہو۔ ثقالا عیالدار (۴) خفافا۔ صحت مند جسم ثقالا معمولی بیمار۔ البتہ بیمار میں معذور شامل نہیں ہیں: بِاَمْوَالِكُمْ: مال کا ذکر پہلے کیا اس لیے کہ اسلحہ اور اخراجات پہلے ہوتے ہیں اور اس کے لئے مال کی ضرورت ہوتی ہے تَعْلَمُوْنَ: یہ شرط اس لیے لگائی کہ علم کے ذریعے ہی خیر و شر کی تمیز کی جا سکتی ہے یا علم سے مراد حق کا علم ہے۔ اس لیے کہ ثواب ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

تفسیر 42 اس آیت میں منافقین کے لئے ترک جہاد پر وعید ہے اور ان کے چار برے صفات کا تذکرہ ہے۔ آیت کریمہ کا مقصد یہ ہے کہ تبوک کا سفر تقریباً 800 سو کلومیٹر طویل تھا اور مال غنیمت ہاتھ لگنا بھی مشکل تھا کیونکہ مد مقابل دشمن جنگجو لوگ تھیں اس لئے بعض منافقین اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے اور اس آیت میں دلیل ہے کہ جھوٹے قسمیں سبب ہلاکت ہے: عرضا: دنیا کی تمام چیزوں پر عرض: کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے کہ سب عارضی اور اپنی ذات میں اللہ تعالیٰ کے

محتاج ہیں لہذا منطقیوں والی اصلاح کی مطابق اس میں جو ہر نہیں ہے۔ وَسَيَحْلِفُونَ: اس میں۔س۔برائے استقبال ہے کیونکہ یہ آیتیں تبوک کی سفر میں۔نازل ہوئی ہے یعنی جب آپ سفر سے واپس کرو گے تو منافقین آپ کو جھوٹی قسموں کے ذریعے عذر یں پیش کریں گے۔

تفسیر 43 عمرو بن میمون کے نزدیک اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو شفقت کی انداز میں عتاب کیا گیا ہے۔کیونکہ بعض منافقین کو ان کے اجازت طلب کرنے پر نبی کریم نے ان کو جہاد سے رہ جانے کی اجازت دی تھی۔لیکن اس اجازت پر نبی کریم ﷺ کسی قسم گناہ مرتکب نہیں ہوئے اس لئے آپ کو ان کے حقیقت کا علم نہیں تھا۔قاضی عیاض نے شفاء میں فرمایا ہے کہ اس میں نبی کریم ﷺ کے لئے عتاب نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے طرف سے کوئی نہی وارد نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس پر معصیت کا اطلاق کیا ہے لہذا (عَفَا) غَفَرَ کی معنی میں نہیں ہے۔بلکہ لَمْ يَلْزِمْ: کی معنی میں ہے جیسا کہ عَفَى اللهُ عَنْ صَدَقَةِ الْخَيْلِ: گھوڑوں کے زکوۃ سے اللہ تعالیٰ درگزر کیا ہے یعنی آپ پر کوئی ملامت نہیں ہے۔امام مکی کا قول ہے کہ یہ کلام کی ابتداء کی طور پر ہے جیسا کہا جاتا ہے: أَعَزَّكَ اللهُ: اللہ تجھے عزت دے۔امام رازی نے اس کو نبی کریم ﷺ اکرام عزت میں مبالغہ قرار دیا ہے یہ اقوال امام خطیب شربینی نے تفسیر میں نقل کئے ہیں۔فائدہ: اس آیت میں نبی کریم ﷺ سے علم غیب کی نفی صراحت سے کی گئی ہیں۔

تفسیر 44 سے اس آیت میں ایمان والوں کے صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ بغیر عذر شرعی کی جہاد سے پیچھے نہیں رہتے اور رہنے کے لئے اجازت بھی طلب نہیں کرتے۔اس آیت میں ماقبل کی تائید ہے کہ جنگ تبوک کی موقعہ پر پچھے مؤمن اور منافق میں امتیاز ہو گیا یعنی منافقین نے رہے جانے کے لئے اجازت مانگ لی جبکہ ایمان والوں نے جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر جہاد میں شمولیت کی۔ سوال: سورۃ نور آیت 62 میں ایمان والوں کے اجازت کا تذکرہ ہے۔جبکہ یہاں عدم اجازت یعنی برعکس تذکرہ ہے جواب: وہاں مجلس نبوی سے جانے کے لئے اجازت کا ذکر ہے جبکہ یہاں پر ترک جہاد کے لئے گھروں میں رہنے کے لئے اجازت کا ذکر ہے جو کہ منافقین کا وتیرا ہے۔

إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ﴿٤٥﴾ وَلَوْ
أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَلَٰكِن كَرِهَ اللَّهُ انبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ ﴿٤٦﴾ لَوْ خَرَجُوا فِيكُم
مَّا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٤٧﴾

"بےشک آپ سے (جہاد چھوڑنے کے لئے) وہ لوگ اجازت طلب کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دلوں نے شک کیا ہے تو یہ لوگ اپنے شک کی وجہ سے تردد میں ہیں [45]۔ اور اگر یہ لوگ جہاد میں نکلنے کا ارادہ رکھتے تو یہ لوگ ضرور اس کے لئے سامان کی تیاری کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا تو ان کو روک لیا اور ان سے کہا بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ جاؤ [46]۔ اگر یہ لوگ تمہارے لشکر میں نکلتے تو نہیں بڑھاتے تمہیں مگر نقصان میں اور ضرور تمہارے درمیان دوڑ لگاتے چغلی کے ساتھ۔ یہ تم میں اختلاف چاہتے ہیں اور تمہارے (لشکر) میں ان کے جاسوس ہیں اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے" [47]۔

تفسیر 45 اس آیت میں منافقین کو وعید ہے اور اس میں بھی ان کے چار بری صفات مذکور ہیں اور یہاں استیذان جہاد چھوڑنے کے بارے میں مراد ہے: وَارْتَابَتْ: یہ صیغہ مضبوط شک پر دلالت کرتا ہے جو کہ انکار کے طور پر ہے اور یہ لَا يُؤْمِنُونَ: کے لئے علت ہے: يَتَرَدَّدُونَ: یعنی حیران ہیں کہ ایمان والوں کا ساتھ دیں یا کافروں کے ساتھ مل جائیں۔

تفسیر 46 اس آیت میں بھی منافقین کے لئے وعید ہے کہ وہ لوگ نہ تو جہاد کی نیت رکھتے ہیں اور نہ اس کے لئے تیاری کرتے ہیں اس لئے کہ لفظ لَوْ: نفی پر دلالت کرتا ہے اور اس کے لئے تیاری نہ کرنا اس کے امر کی مخالفت ہے جو کہ سورۃ انفال 60 میں تھا۔ اس آیت میں منافقین کی دو بری صفات ہیں: وَلَٰكِن: کے بعد تین جملے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسانوں کی معصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ارادے کا تعلق ہے: انبِعَاثَهُمْ: ان کا جہاد کے لئے جانا صحیح نیت سے نہیں تھا سستی کے ساتھ تھا اسی وجہ سے اس لفظ سے تعبیر ہوا لفظ خروج کے ساتھ نہیں ہوا: قِيلَ: یہ تقدیر الٰہی کا قول ہے یا صحابہ اور رسول کا ہے منافقین سے کلام ہے: قَاعِدِينَ: سے مراد اندھے لنگڑے اور عورتیں اور بچے ہیں۔

تفسیر 47 اس آیت میں منافقین کے جہاد سے رہ جانے کی وجہ مومنوں کو تسلی ہے اور منافقین کی پانچ بری صفات کے ذکر کی وجہ سے وعید ہے اور: كَرِهَ اللَّهُ: یعنی ان کے نکلنے میں بہت نقصانات ہیں: إِلَّا خَبَالًا: اگر ماقبل میں: شَيْئًا کا لفظ

مقدر ہے تو یہ استثناء متصل ہے اور اگر خیر مقدر ہو جائے تو یہ استثناء منقطع ہے پہلی توجیہ بہتر ہے: اَلْفِتْنَةُ: اس سے مراد اختلاف اور جہاد سے واپس ہونا اور دین سے پھرنا ہے: وَفِيكُمْ: اس سے مراد وہ منافقین ہیں جو جاسوسی کرنے کے لئے جنگ تبوک کے سفر میں شریک تھے۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ
يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٩﴾ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ
تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿٥٠﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ
اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾

"تحقیق انہوں نے فتنے کو اس سے پہلے تلاش کیا اور انہوں نے آپ کے خلاف بہت چالیں چلی تھیں یہاں تک کہ حق آیا اور اللہ کا حکم ظاہر ہوا اور یہ لوگ اس کو ناپسند کر رہے تھے [48]۔ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں مجھے اجازت دو اور مجھے فتنے میں نہ ڈالو خبردار یہ لوگ فتنے میں پڑ گئے ہیں اور بیشک اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے [49]۔ اگر تجھے کوئی خوشی پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تجھے مصیبت پہنچ جائے تو کہتے ہیں یقیناً ہم نے اپنی تدبیر پر اس سے پہلے عمل کیا ہے اور یہ لوگ پھر جاتے ہیں اور (تمہاری مصیبت پر) یہ لوگ خوش ہوتے ہیں [50]۔ آپ کہہ دیجئے کہ ہمیں کبھی بھی کچھ نہیں پہنچ سکتا مگر جو اللہ نے ہمارے لئے لکھا ہے وہ ہمارا مولیٰ (مددگار) ہے اور خاص اللہ پر ایمان والے توکل رکھیں" [51]۔

تفسیر 48 اس آیت میں بھی منافقین کو تین بری صفات ذکر کرنے کے ساتھ وعید ہے اور یہ ان مفاسد کے لزوم کے لئے دلیل ہے جو گزشتہ آیت میں مذکور ہیں: لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ: اس میں گزشتہ غزوات میں منافقت کے ظہور کی طرف اشارہ ہے جیسے غزوہ احد اور غزوہ احزاب: وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُوْرَ: اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ انہوں نے نبی کے قتل کے لئے ہر وقت تدبیریں چلائیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ انہوں نے اپنی رائے اور خیالات کو نبی کی مقابلے میں استعمال کیا ہے اور تدبیریں چلائی ہیں۔

تفسیر 49 یہ بھی منافقین کے لئے وعید ہے اور اس میں ان منافقین کا ذکر ہے کہ جو غزوہ تبوک سے رہ گئے جس میں ایک کا نام جد بن قیس تھا اس میں ان کی دو بری صفات ہیں حاصل کلام یہ ہے کہ جو نبی کی اتباع کو فتنہ کہتے ہیں وہ منافق ہیں نبی

الْفِتْنَةِ: جہاد سے رک جانا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت فتنہ ہے: بِالْكٰفِرِيْنَ: اشارہ ہے کہ لَا تَفْتِنِّيْ: لفظ کے ساتھ انہوں نے اپنا کفر ظاہر کیا اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور جہاد کو فتنہ کہتے تھے۔

تفسیر 50 اس میں بھی منافقین کے لئے وعید ہے اور ان کی تین بری صفات ذکر ہیں: قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا: اس سے مراد اپنے آپ کو عقلمند کہنا ہے اسی وجہ سے قتال سے رہ گئے: تَسُؤْهُمْ: یہ حسد کی وجہ سے ہے: حَسَنَةٌ: اس سے مراد نصرت اور غنیمت ہے جو ظاہر اور بڑی نعمت ہے اسی وجہ سے: تُصِبْكَ: کے ساتھ ذکر کیا ہے: تَمْسَسْكُمْ: کے ساتھ ذکر نہیں کیا۔

تفسیر 51 یہ منافقین کو پہلا جواب ہے کہ جب وہ مومنوں کی مصیبت پر خوش ہوجائیں تو ان کو اس طرح جواب دیا جائیگا اور دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پہلے سے لکھی ہوئی ہے اور اس پر ایمان لانا فرض ہے: هُوَ مَوْلٰىنَا: اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ایمان والوں کے لئے ہر قسم کا خیر ہے: وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ: یعنی تقدیر پر ایمان لانا توکل کے لیے مستلزم ہے۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ڮ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

”کہدیجئے کہ تم لوگ ہمارے بارے میں انتظار نہیں کرتے مگر دو خوشیوں میں سے ایک کا اور ہم انتظار کرتے ہیں تمہارے بارے میں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ عذاب پہنچائے گا اپنی طرف سے یا ہمارے ہاتھوں کے ذریعے تو انتظار کرو بیشک ہم تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں [52]۔ آپ کہدیجئے خوشی سے یا بغیر خوشی کے خرچ کرو تم سے کبھی بھی قبول نہ کیا جائیگا بیشک تم نافرمان قوم ہو“ [53]۔

تفسیر 52 یہ منافقین کے قول کا دوسرا جواب ہے اور اس میں ان کی دو بری صفات مذکور ہیں: حُسْنَيَيْنِ: سے مراد مال غنیمت کے ساتھ فتح ہے اور شہادت ہے: نَتَرَبَّصُ بِكُمْ: اس کے بعد: اِحْدَى السُّوْٓءَيَيْنِ: مقدر ہے اور بعد میں ان دونوں کی تفصیل مذکور ہے۔ فائدہ: تَرَبُّصُ: اکثر وہاں ذکر ہوتا ہے جو ضرور واقع ہوتا ہے جبکہ انتظار عام ہے واقع ہونے اور نہ ہونے دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر 53 اس آیت میں بھی منافقین کی دو بری صفات ہیں: اَنْفِقُوْا: یہ امر خبر کے معنی میں ہے یعنی نفاق کی دو قسمیں قبول نہ ہونے میں برابر ہیں۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ نیک اعمال کفر اور نفاق کے ساتھ باطل ہوتے ہیں۔ فٰسِقِيْنَ

بفسق سے مراد اعتقادی فسق یعنی کفر ہے۔

وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا
يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ ﴿٥٤﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿٥٥﴾ وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ﴿٥٦﴾

"اور نہیں روکا ان کو کہ ان کے صدقات قبول کیے جائیں مگر اس بات نے کہ انہوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور یہ لوگ نماز میں سستی کے ساتھ آتے ہیں اور ناپسندیدگی کے حال میں خرچ کرتے ہیں [54]۔ تو آپ کو ان کے مال اور اولاد تعجب میں نہ ڈالیں بیشک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے (ان کے مال اور اولاد کے بڑھانے کی وجہ سے) کہ ان کو اس کے ساتھ عذاب دے دنیاء کی زندگی میں اور ان کی روحیں (سانس) ایسے حال میں نکلیں کہ یہ لوگ کافر ہوں [55]۔ اور یہ لوگ اللہ کی ذات کی قسمیں کھاتے ہیں کہ یہ لوگ آپ میں سے ہیں حالانکہ یہ لوگ آپ میں سے نہیں ہیں لیکن یہ ایسے لوگ ہے کہ ڈرتے ہیں" [56]۔

تفسیر 54 یہ آیت فسق کی تفصیل ہے جو نفقات کی قبولیت کے لئے مانع ہے اور اس آیت میں ان کی تین بری صفات مذکور ہیں یعنی ان میں ایمان نہیں ہے اور بدنی اور مالی عبادات بھی عبادت کے طور پر نہیں کرتے: وَهُمْ كُسَالَىٰ: اس طرح سورۃ نساء آیت 42 میں ہے۔

تفسیر 55 جب پہلی آیت میں ذکر ہوا کہ ان کے نفقات قبول نہیں ہونگے تو اس آیت میں حرف فا کے ساتھ اس آیت پر تفریع ہے کہ ان کے مال بغیر فائدے کے ہیں کہ اس پر کچھ ثواب نہیں ملتا اور ان کی اولاد بھی بغیر فائدے کے ہے جن کے عمل میں ان کو کچھ فائدہ نہیں ملتا بلکہ یہ دونوں ان کے لئے عذاب کا سبب ہیں کہ یہ لوگ اس کے حاصل کرنے اور حفاظت کرنے میں تھکاوٹ، مشقتیں اور غم برداشت کرتے ہیں اور ان کو کچھ ثواب کی نیت سے برداشت نہیں کرتے اور جو مالدار مؤمن کا معاملہ ہے تو ان کا کسب، مشقت اور مصائب اجر کا سبب ہے لہذا وہ عذاب نہیں ہے اور ان کے اموال اور اولاد کا زیادہ ہونا یہ تو ان کے لئے استدراج ہے اور اس آیت میں دو قبیح صفات ہیں اور آخری جملے میں اشارہ ہے کہ مال اور اولاد میں مشغول ہونے کی وجہ سے موت تک توبہ کا موقعہ انہیں نہیں ملتا تو وہ کفر میں فوت ہو جاتے ہیں۔

تفسیر 56 اس آیت میں بھی منافقین کو وعید ہے اور ان کی دو قبیح صفات ذکر ہیں جب ان کے کفر کی علامات ذکر ہو گئیں تو

انہوں نے مؤمنوں کو دھوکا دینے کے لیے جھوٹی قسمیں شروع کیں کہ ہم کافروں کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ تمہارے ساتھ ہیں: وَلٰكِنَّهُمْ : کے بعد عبارت پوشیدہ ہے: لٰكِنَّهُمْ يَظْهَرُوْنَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ: یعنی یہ لوگ خوف کی وجہ سے ایمان ظاہر کرتے ہیں: يَفْرَقُوْنَ: یہ فرق سے ماخوذ ہے گھبراہٹ اور ہیبت کے ساتھ ڈر خوف سے بھی زیادہ ہے۔ يَفْرَقُوْنَ: سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ ہمارا نفاق ظاہر ہو جائے اور مسلمان ہمیں قتل کر دیں۔

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾

"اگر یہ لوگ پناہ کی جگہ یا کوئی غار یا سر داخل کرنے کی جگہ پالیں تو یہ اس کی طرف بھاگ کر جائیں گے [57]۔ اور ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو آپ پر زکوۃ کی تقسیم میں عیب لگاتے ہیں تو اگر ان کو اس میں سے دیا جائے تو خوش ہو کر جاتے ہیں (راضی ہوتے ہیں) اور اگر ان کو نہ دیا جائے تو اس وقت یہ لوگ ناراض ہوتے ہیں [58]۔ اور اگر وہ لوگ اللہ اور رسول کے دیئے ہوئے مال پر راضی رہتے اور کہتے کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے دیگا اور اس کا رسول (تقسیم کرتے ہوئے) بیشک ہم خاص اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں [59]۔ بیشک زکوتیں (دی جائے گی) فقراء اور مسکینوں (غریبوں) اور کام کرنے والوں کو جو اس پر مقرر ہوتے ہیں اور جن کے دل خوش کئے جاتے ہیں اور غلاموں کے آزاد کرنے میں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور مسافروں کو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے" [60]۔

تفسیر 57 یہ بھی منافقین کو ڈانٹ ہے اور اس میں خوف کا بیان ہے اور اس میں ایک صفت قبیحہ کا بیان ہے: مَلْجَاً: پناہ کی جگہ جیسے قلعے وغیرہ: مَغٰرٰتٍ: اور وہ غار جو پہاڑوں میں ہوتے ہیں: مُدَّخَلًا: جو زمین میں کھائی ہوتی ہے: يَجْمَحُوْنَ: جمع گھوڑے کے اس دوڑ کو کہتے ہیں جو لگام سے بھی کنٹرول نہیں ہو سکتا ہو۔

تفسیر 58 اس آیت میں بھی منافقین کو وعید ہے اور اس میں تین بری صفات مذکور ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ جو نبی ﷺ کی ایک طریقے پر اعتراض کرے تو وہ منافق ہے اور جو شخص مالی مفادات کے لئے دین کا کام کرتا ہو وہ منافق ہے اسی طرح سورہ بقرۃ آیت 20 اور سورۃ نور آیت 49 اور سورۃ حج آیت 11 میں بھی ہے: يَلْمِزُكَ. لَمَزَ: کہتے ہیں مخاطب کو معیوب قرار دینا، اسی طرح آنکھوں کے اشارے سے تمسخر اڑانا اور اس سے منع سورۃ حجرات آیت 11 میں ہے اور اس پر زجر سورۃ ہمزہ آیت 1 میں مذکور ہے: يَسْخَطُونَ. سَخَط: ناراضگی کے معنی میں ہے غضب کے ساتھ اور اِذَا: کو مفاجات کے لئے اس وجہ سے ذکر کیا کہ یہ لوگ نہ دینے کا سبب میں کچھ فکر نہیں کرتے ہیں بلکہ اچانک بغیر سوچے غصہ کرتے ہیں۔

تفسیر 59 یہ بہترین اخلاق کی طرف ترغیب ہے جس کے ذریعے انسان نفاق سے بچتا ہے: وَلَوْ: اس کی جزا محذوف ہے یعنی: لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ: (ان کے لئے بہتر ہوتا): وَرَسُولُهُ: اس مقام میں رسول اللہ ﷺ کے دینے سے مراد اللہ تعالیٰ کے امر سے زکوۃ اور غنیمت کے حصے دینے ہیں اس کی تشریح صحیح حدیث میں ہے کہ: إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللَّهُ يُعْطِي (صحیح بخاری کتاب العلم حدیث 71 صحیح مسلم کتاب الزکوۃ حدیث 33 مسند بزار 8365): البتہ اس سے مشرکین کی دلیل پکڑنا (کہ نبی بھی نفع اور نقصان کا مالک ہے) یہ غلط ہے اس لئے کہ اس سے مراد تقسیم کے طور پر دینا ہے: إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ: معنی یہ ہے کہ ہم مال کی طرف رغبت نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کی طرف رغبت کرتے ہیں یا رغبت سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف عاجزی کرنا ہے اور یہ عمل اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اسی وجہ سے: إِلَى: کا لفظ پہلے ذکر کیا ہے۔

تفسیر 60 اس آیت میں زکوۃ کے مصارف کا بیان اور منافقین کا رد ہے مقصد یہ ہے کہ وہ نبی ﷺ پر صدقات کی تقسیم میں اعتراض کرتے تھے۔ فقیر اور مسکین میں بہت طریقوں سے فرق ہے اس میں مشہور یہ ہے کہ فقیر وہ ہے کہ جس کے پاس گزارا کرنے کے لئے کچھ مال ہوتا ہے لیکن نصاب سے کم ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور دوسرا قول اس کے برعکس ہے اور یہ فرق اس وقت ہے جب یہ دونوں لفظ ایک ساتھ آئیں اور جب الگ الگ مذکور ہوں تو دونوں کا ایک ہی معنی ہے: الْعَامِلِينَ: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو امیر کی طرف سے مالدار لوگوں سے زکوۃ جمع کرنے کے لئے مقرر کئے گئے ہوں اگرچہ مالدار ہوں پھر بھی عمل کے مطابق ان کو زکوۃ میں سے دیا جائیگا اس لئے کہ یہ فقراء کی خدمت میں

مصروف ہیں اس میں لکھنے والا تقسیم کرنے والا جمع کرنے والا دور دراز سے لانے والا اس کی حفاظت کرنے والا سب داخل ہیں۔ وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ : اس کی بہت ساری اقسام ہیں پہلی یہ کہ اسلام کا اظہار کیا ہو لیکن ان کا یقین کمزور ہو تو ان کو بھی ان کے دلوں کی الفت کی وجہ سے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے دوسری یہ ہے کہ کافر ہو لیکن اس سے ایمان کی امید رکھی جاسکتی ہو۔ تیسرے وہ لوگ ہیں کہ ان کی وجہ سے باقی لوگ اسلام لائیں۔ چوتھی قسم کے وہ لوگ ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں سے نقصان دور ہوسکتا ہے، نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد ان کے حصے کے منسوخ ہونے میں اختلاف ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ ضعف اسلام کے وقت یہ حصہ دینا چاہئے، یہ قول امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی پسند کیا ہے: اَلْغَارِمِيْنَ : اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیکی کے کام میں یا عام لوگوں کے فائدے کے لئے یا دو گروہوں کے درمیان صلح کرنے کے لئے ان کا نقصان خود اٹھا لیتے ہیں اور یہ مالدار تھے لیکن ان کا مال اس نقصان سے کم تھا تو ان کو بھی زکوٰۃ دینی چاہئے۔ تفسیر سراج المنیر میں مذکور ہے کہ جس نے کسی مہمان کی مہمان نوازی کے لئے یا مسجد کی آبادی کے لئے یا قیدی کو چھڑانے کے لئے (اور میں کہتا ہوں مدرسے کی آبادی یا خرچ کے لئے) قرضہ اٹھایا ہو وہ بھی اس میں داخل ہے اس شرط کے ساتھ کہ اس کا اپنا مال قرضے سے کم ہوگیا ہو اور اس میں عام قرض دار بھی داخل ہے جس کا قرض مال کے ساتھ برابر ہو یا زیادہ ہو اگرچہ گناہ کے کسی کام میں مقروض ہوگیا ہو لیکن پھر توبہ کی ہو: وَفِي سَبِيلِ اللهِ: اس سے مراد غازی ہے ان کو بھی زکوٰۃ غزوہ کے خرچ کے لئے دی جاسکتی ہے اگرچہ وہ مالدار بھی ہو اس طرح اس میں علم دین کے طلباء بھی داخل ہیں اور اسی طرح دین کی دعوت بھی اس میں داخل ہے۔

وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۚ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ ۚ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦١﴾

"اور ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو ہر ایک کی بات ماننے والا ہے آپ کہہ دیجئے یہ تمہاری خیر کی بات ماننے والا ہے اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور مومنوں کی بات مانتا ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کے رسول کو ایذا دیتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے" [61]۔

تفسیر 61 اس آیت میں منافقین کو وعید ہے اور اس میں ان کی دو بری صفات مذکور ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نبی کریم ﷺ کے پیٹھ پیچھے برائیاں کرتے تھے اور آپ ﷺ پر عیب لگاتے تھے ان سے کہا جاتا کہ اگر نبی کریم ﷺ کو

معلوم ہو جائے تو تم سے ناراض ہو جائیں گے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو ہر بات کو مانتے ہیں اور اگر ہم جھوٹ سے کوئی بہانہ
28/28 بنالیں تو ضرور اس کو قبول کر لیں گے تو جواب میں کہا گیا کہ یہ نبی ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ پر اور مومنوں کی بات قبول کرتا ہے
منافقین کی باتوں کی تصدیق نہیں کرتے ہیں: أُذُنٌ: اصل میں کان کو کہا جاتا ہے اس سے مراد وہ شخص ہے کہ جو کان کی طرح
ہر بات اور ہر عذر کو قبول کرتا ہے تو اس کو: أُذُنٌ: مبالغے کے طور پر کہا گیا ہے: يُؤْمِنُ: یہ ماقبل کی تفسیر ہے: بِاللّٰهِ: (بَا)
کے ساتھ شرعی ہے اور لام کے ساتھ لغوی ایمان مراد ہے: وَرَحْمَةٌ: یہ أُذُنُ خَيْرٍ: پر عطف ہے: آمَنُوا: وہ شخص جو ایمان کا
اظہار کرے چاہے مخلص ہو یا منافق ظاہری ایمان پر اکتفاء کرتے ہیں ان کے دلوں کے راز کو نہیں جانتے ہیں اور ان کے
لئے دعا مانگتے ہیں جب یہ لفظ منافقین کو شامل ہے تو ان کے بعد والے جملے میں (ایذا دینے کے سبب سے) استثنیٰ کیا ہے
اور ان کو خوف دلایا ہے۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٦٢﴾ أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَنْ
يُحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ۚ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ﴿٦٣﴾ يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنَزَّلَ
عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلِ اسْتَهْزِئُوا إِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَا تَحْذَرُونَ ﴿٦٤﴾ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ
لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللّٰهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ﴿٦٥﴾

"تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کریں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ حقدار
ہیں کہ انہیں راضی کریں اگر یہ لوگ ایمان والے ہیں [62]۔ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ جس نے اللہ اور رسول کی حدود کی مخا
لفت کی تو بیشک اس کے لئے جہنم کی آگ ہے یہ اس میں ہمیشہ رہیگا یہ بہت بڑی رسوائی ہے [63]۔ منافقین اس بات سے
ڈرتے ہیں کہ ان (مسلمانوں) پر کوئی سورت نازل کی جائے کہ ان کو اس چیز کے بارے میں خبر دے جو ان
(منافقین) کے دلوں میں ہے آپ کہہ دیجئے کہ تم مذاق کرتے رہو بیشک اللہ تعالیٰ اس چیز کو ظاہر کرتا ہے جس (کے
ظاہر کرنے) سے تم ڈرتے ہو [64]۔ اگر آپ ان سے سوال کریں تو یہ لوگ ضرور کہیں گے کہ بیشک ہم تو بات چیت اور دل
لگی کرتے تھے تو آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی آیتوں اور رسول کے ساتھ تم مذاق کرتے ہو" [65]۔

تفسیر 65 اس آیت میں بھی منافقین کے لئے زجر ہے اور ان کی ایک بری صفت مذکور ہے یعنی جھوٹی قسموں کے

ذریعے مخلوق کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ناراض کرتا ہے: اَنْ یُّرْضُوْهُ: ایک ضمیر ذکر کی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی رضامندی ایک جیسی ہے، بیضاوی کے نزدیک یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور امام سیبویہ کے نزدیک رسول ﷺ کی طرف راجع ہے۔

تفسیر 63 اس آیت میں اخروی خوف ہے اور ان کی ایک صفت قبیحہ ہے: یُّحَادِدُ: مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی حدود سے مخالف اپنی طرف سے حدود بناتے ہیں، حدود دو قسم کی ہیں ایک قسم میں بعض گناہوں کے لئے شرعی سزائیں ہیں جیسے زنا کی حد اور چوری وغیرہ۔ دوسری قسم ہر حکم شرعی کی سنت اور طریقہ اس کی حد ہے اسی وجہ سے ہر مبتدع اللہ اور اس کے رسول کا مُحَادٌ: ہے، اس طرح سورۃ مجادلہ آیت 5 اور 20 میں مذکور ہے: فَاَنَّ اس میں حُقَّ: کا لفظ پوشیدہ ہے یا اَنَّ کا تکرار پہلے اَنَّ کے ساتھ ہے یا جواب محذوف ہے یعنی: یُهْلِكُ۔

تفسیر 64 اس آیت میں منافقین کو وعید ہے اور ان کی ایک قبیح صفت مذکور ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور قرآن کا مذاق اڑاتے تھے اور پھر ان باتوں سے ڈرتا کہ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ہماری برائی کے بارے میں کوئی سورۃ نازل کرے اور مؤمنوں کو ہمارے حال سے باخبر کرے۔ لیکن یہ سورۃ اللہ تعالیٰ نے ان کے عیبوں کے بارے میں نازل کی ہے اور اسی وجہ سے اس سورۃ کو: اَلْفَاضِحَةُ: (رسوا کرنے والی) بھی کہتے ہیں اور سورۃ الحفارۃ (ان باتوں کو کریدنے والی جو دلوں میں ہیں) اور سورۃ اَلْمُثِيْرَةِ اور مُبَعْثَرَةِ (عیوب کو ظاہر کرنے والی) بھی کہتے ہیں: قُلِ اسْتَهْزِءُوْا: یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اور ایمان والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور یہ امر تھدید (ڈانٹ) کے لئے ہے۔

تفسیر 65 اس آیت میں ان کی دو قبیح صفات مذکور ہیں: سَاَلْتَهُمْ: سوال کی تفصیل پہلی آیت سے معلوم ہے یعنی استہزاء کرنے کا سبب: نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ: یہ استہزاء کرنے کا سبب ہے اور یہ اس مشہور مقولے کا مصداق ہے کہ عذر گناہ بدتر از گناہ (گناہ کے لئے جو عذر پیش کی ہے وہ اس گناہ سے بڑھ کر ہے) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اور آیتوں کا مذاق اڑانا یہ بہت بڑا گناہ ہے، جصاص اور رازی نے کہا ہے کہ کفر کی بات مذاق میں کہنا بھی کفر ہے: نَخُوْضُ: کھیل کود کے لئے ناجائز باتوں میں مصروف ہونا: وَنَلْعَبُ: وقت گزارنے کے لئے ایک ناجائز قول یا عمل کرنا اگرچہ وہ اس کا مقصد نہ ہو: تَسْتَهْزِءُوْنَ: یہ دلیل ہے کہ خوض اور لعب استہزاء کے برابر ہے اور استہزا باللہ عام ہے یعنی اس کے ناموں اور احکام اور صفات کا مذاق اڑانا۔

لَا تَعۡتَذِرُوۡا قَدۡ كَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ ؕ اِنۡ نَّعۡفُ عَنۡ طَآئِفَةٍ مِّنۡكُمۡ نُعَذِّبۡ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ۝

اَلۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتُ بَعۡضُهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۘ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمُنۡكَرِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمَعۡرُوۡفِ وَيَقۡبِضُوۡنَ اَيۡدِيَهُمۡ ؕ

نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمۡ ؕ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ

خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ هِىَ حَسۡبُهُمۡ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ ۝

"بہانے مت تراشو تم نے اپنے ایمان (ظاہر کرنے) کے بعد کفر کیا ہے اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر دیں تو دوسرے گروہ کو عذاب دینگے اس وجہ سے کہ وہ مجرم ہیں [66]۔ منافق مرد اور منافق عورتیں ان کے بعض بعضوں سے ہیں جو برائی کا حکم دیتے ہیں اور اچھائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلایا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو چھوڑ دیا بیشک منافقین نافرمان ہیں [67]۔ اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے وہ ان کی مکمل سزا ہے۔ اور ان پر اللہ نے لعنت کی ہے اور ان کے لئے ہمیشہ کا عذاب ہے" [68]۔

تفسیر 66 اس آیت میں بھی منافقین کو ڈانٹ ہے اور ان کی دو بری صفات مذکور ہے اور یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو اللہ تعالیٰ یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا مذاق اُڑاتے ہیں اور اس کو حقیر جانتے ہیں تو وہ کافر اور مرتد ہیں: اِنۡ نَّعۡفُ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض منافقین کو توبہ کی توفیق دی اور ان کو معاف کیا اس میں اشارہ ہے کہ مرتد کی توبہ بھی قبول ہو سکتی ہے: مُجۡرِمِيۡنَ: وہ لوگ جو گناہ پر کار بند رہتے ہیں توبہ نہیں کرتے۔

تفسیر 67 اس آیت میں منافقین کے لئے ڈانٹ ہے اور ان کی چار بری صفات مذکور ہیں: بَعۡضُهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ: معنیٰ یہ ہے کہ یہ لوگ دین سے نکلنے میں ایک دوسرے کی طرح ہیں اور اسی طرح ان مذکورہ صفات میں بھی ایک جیسے ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس حکم میں مرد اور عورتیں دونوں برابر ہیں: مِنۡ: لفظ مشابہت اور عمل میں مشارکت کے لئے استعمال ہوتا ہے: وَيَقۡبِضُوۡنَ اَيۡدِيَهُمۡ: اس سے مراد جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ اور باقی واجبات کا چھوڑنا ہے: نَسُوا اللّٰهَ: اس سے مراد قصداً چھوڑنا ہے اور ایسا چھوڑنا کہ بھلائی ہوئی چیز کی طرح ہو مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اطاعت کو چھوڑا ہے۔

تفسیر68 اس آیت میں پانچ طریقوں سے منافقین کے لئے اُخروی خوف ہے: وَعَدَ: اس کا اکثر استعمال خیر کے کاموں میں ہوتا ہے جبکہ: اَوْعَدَ: کا استعمال شر کے کاموں میں ہوتا ہے اور جب وعد کے ساتھ نار جہنم مذکور ہو تو اس سے مراد وعید ہے۔

كَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنكُمْ قُوَّةً وَأَكْثَرَ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُم بِخَلَاقِكُمْ
كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُم بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا ۚ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٦٩﴾ أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَقَوْمِ إِبْرَاهِيمَ وَأَصْحَابِ
مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكَاتِ ۚ أَتَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٧٠﴾

"تم ان لوگوں کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے وہ لوگ تم سے طاقت میں زیادہ تھے اور مال اور اولاد میں بھی پس انہوں نے اپنے حصے سے فائدہ اُٹھایا تو تم نے بھی اپنے حصے کے ساتھ فائدہ اٹھایا اور تم بھی ان کی طرح مشغول ہو گئے ہو یہی لوگ ہیں کہ دنیا میں ان کے اعمال ضائع ہوئے ہیں اور یہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں[69]۔ کیا ان کے پاس ان لوگوں کے واقعات نہیں آئے جو ان سے پہلے تھے نوح علیہ السلام اور عادیوں اور ثمودیوں اور ابراہیم (علیہ السلام) کی قوم اور مدین کے رہنے والے اور الٹ پلٹ کی ہوئی بستیوں والے ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل کے ساتھ نہیں آئے؟ نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ ان پر ظلم کرے لیکن وہ اپنے نفسوں پر خود ظلم کرتے تھے" [70]۔

تفسیر69 اس آیت میں ان منافقین اور کفار کی پہلے کافروں کے ساتھ ان قبیح صفات میں تشبیہ دی گئی ہے جو گزر چکے ہیں اور خوض اور استمتاع کی صفت میں یہ بڑے جامع اوصاف ہیں اور سزا میں بھی: فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ: ان فاسقوں اور فاجروں کی صفت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ دنیا کی چیزیں اپنی خواہش کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ وَخُضْتُمْ: اس میں مبتدعین اور حق کے جھٹلانے والوں کی طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ خواہشات کے مطابق اپنی طرف سے دین ایجاد کرتے ہیں: كَالَّذِينَ: اس سے پہلے اَنْتُمْ: پوشیدہ ہے: قُوَّةً: بدنوں کی طاقت یا ظلم کی اور مظلوموں کو پکڑنا مراد ہے: فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ خَلَاق: سے مراد دنیا کے مال اور مرتبے ہیں کہ یہ تقدیری حصہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ لفظ اس وجہ سے ذکر کیا کہ گزشتہ لوگوں کی قباحت پر دلالت کرے ہر بعد والے جملے میں ان کے عمل کے

ساتھ تشبیہ دی گئی ہے: فِی الدُّنْيَا: دنیا میں حبط یہ ہے کہ اس میں بھلائی کا نتیجہ حاصل نہیں ہوتا اسی طرح دنیا میں ان کی تعریف ان کی عبادات کی وجہ سے نہیں ہوتی کہ یہ متقی ہیں غازی یا حاجی ہیں: وَالْاٰخِرَةِ: اور آخرت میں ان اعمال سے ثواب حاصل نہیں ہوتا۔

تفسیر 70 یہ آیت پہلی آیت کے لئے تفسیر ہے جس میں فرمایا: كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ: یعنی پہلی جھوٹی قوموں کا ذکر ہے ساتھ میں ان کے دنیاوی عذاب کی طرف بھی اشارہ ہے جو باقی کی سورتوں میں مذکور ہے، ان قوموں کا ذکر سورۃ حج آیت 42، 43، 44 اور سورۃ ص آیت 12 اور 13 میں مذکور ہے: اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ: ظلم سے مراد تکذیب اور کفر کرنا ہے جو ان کے عذاب کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ع يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

"اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں جو اچھائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں ان پر ضرور اللہ تعالیٰ رحم کریگا بیشک اللہ تعالیٰ غالب حکمتوں والا ہے [71]۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والے مردوں اور مؤمن عورتوں سے وعدہ کیا ہے ان باغات کا جس کے نیچے نہریں بہتی ہونگی یہ لوگ اس میں ہمیشہ رہینگے اور مزید ار جگہوں میں ہمیشہ کی جنتوں میں ہونگے اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی (بہت بڑی نعمت ہے) یہ بہت بڑی کامیابی ہے [72]۔ اے نبی (ﷺ) کافروں کے ساتھ جہاد کرو اور منافقین کے ساتھ اور ان کے مقابلے میں سخت ہو جاؤ، ان کافروں کا ٹھکانہ جہنم ہے لوٹ کر جانے کی جگہ (یہ جہنم) بہت بری ہے" [73]۔

تفسیر 71 اس آیت میں منافقین کے مقابلے میں ایمان والوں کی صفات کا ذکر ہیں۔ فائدہ: ان کے بارے میں اَوْلِيَآءُ:

لفظ ہے جبکہ منافقین کے بارے میں :بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ: لفظ تھا تو اس میں نکتہ یہ ہے کہ مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے میں ایک ہیں اور ایک دوسرے پر شفقت کرتے ہیں اور جو منافقین ہیں تو ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے اختلاف ہے لیکن حکم میں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے ہوئے ہیں :بِالْمَعْرُوفِ: شربینی نے کہا ہے کہ ہر خیر اور اطاعت جب شرعی ہو تو پہلے اس میں ایمان اور توحید اور سنت داخل ہے :الْمُنْكَرِ: ہر وہ چیز جس کی قباحت شرع سے معلوم ہو پہلے اس میں شرک اور بدعت داخل ہے :وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (منافقین کی صفت) کے مقابلے میں ہے ان صفات کا خلاصہ چار امور ہیں پہلا گھریلو معاملات میں دوستی یعنی باتی سے براءت، دوسرا عورت، تیسرا نیک اعمال اور چوتھا قرآن اور حدیث کی اتباع۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ حق کی دعوت عورتوں پر بھی لازم ہے لیکن مردوں اور عورتوں کے اوصاف میں شرعا فرق ہے جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

تفسیر 72 اس آیت میں منافقین کے عذاب کے مقابلے میں ایمان والوں کو آخرت کی خوشخبری ہے :وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً: یعنی موتیوں اور یاقوت وغیرہ کی عمارتیں بنی ہوں گی اور خوشبودار ہوں گے اور پانچ سال کی مسافت تک ان کی خوشبو پھیلے گی اور بے شمار انعامات پر مشتمل ہوں گے اس آیت میں :جَنَّاتٍ: کا لفظ دو مرتبہ ذکر ہے ایک وجہ یہ ہے کہ پہلے سے مراد ثواب کا گھر ہے تمام ایمان والوں کے لئے اور دوسرے سے مراد باغات ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلے سے ساری جنت مراد ہے اور دوسرے سے مراد جنت میں ایک متعین چیز ہے۔ اس آیت میں وَالْمُؤْمِنَاتُ: بھی مذکور ہے تا کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ سورۃ جہاد کے بارے میں ہے اور جہاد تو مردوں کا کام ہے تو جنت بھی صرف انہی کے لیے ہوگی؟۔

تفسیر 73 اس آیت میں نبی کو خطاب ہے مگر اس خطاب میں ایمان والے بھی داخل ہیں جب پہلی آیتوں میں کافروں اور منافقوں کے ساتھ صفات اور حالات میں مقابلہ ذکر ہوا تو اب اس آیت میں تمام کافروں کے ساتھ جہاد کا اعلان ہے اور کافروں کے ساتھ جہاد تلوار اور زبان کے ساتھ ہے اور اگر دار الاسلام میں ہوں تو زبان کے ساتھ ہے :وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ: غَلَظ شفقت کے مقابلے میں ہے اور یہ دل کی سختی کو کہا جاتا ہے ان کے معاملے سے مراد یہ ہے کہ ان دونوں کے ساتھ کچھ بھی شفقت اور نرمی نہ کرو اور ان کے مقابلے میں دلیر ہو جاؤ یہاں گالیاں دینا مراد نہیں ہے اسی طرح سختی سے مراد منافقین کے عیوب سے ان خصلتوں کا تذکرہ مراد ہے جو اس سورۃ میں مذکور ہیں۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ
اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿74﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ
لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿75﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿76﴾ فَاَعْقَبَهُمْ
نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿77﴾

"یہ لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ نہیں کہا حالانکہ انہوں نے کفر کی بات کی ہے اور اسلام کے ظاہر کرنے کے بعد انہوں نے کفر کیا ہے اور اس کام کا ارادہ کیا ہے جو حاصل نہیں کر سکتیں اور انہوں نے عیب نہیں لگایا مگر یہ کہ ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے مالدار کر دیا پس اگر انہوں نے توبہ کی تو ان کے لئے بہتر ہوگا اور انہوں نے اگر منہ پھیر لیا تو ان کو اللہ تعالیٰ دردناک عذاب دیگا دنیا اور آخرت میں اور ان کے لئے زمین میں کوئی دوست اور مددگار نہیں ہوگا [74]۔ اور ان میں سے بعض لوگ وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کیا ہے اگر ہمیں (اپنے فضل سے) کچھ مال دیا تو ضرور ہم صدقہ کریںگے اور ضرور ہم نیک اعمال کرنے والوں میں سے ہو جائینگے۔ [75]۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو انہوں نے اس میں کنجوسی کی اور (اپنے عہد سے) پھر گئے اور یہ لوگ منہ پھیرنے والے ہیں [76]۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں منافقت پیدا کر دی قیامت کے دن تک۔ اس دن تک جب ان کا سامنا ہوگا اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی مخالفت کی ہے۔ اس وعدے کی جو اس کے ساتھ کیا ہے اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے" (77)۔

تفسیر 74 اس آیت میں منافقین کو ڈانٹ ہے اور ان کی تین بری صفات مذکور ہیں جب پہلی آیت میں کافروں کے حکم میں منافقوں کو شامل کر لیا تو انہوں نے قسم کھانے کے ذریعے کفر کرنے سے انکار کیا اس آیت میں اس کا جواب ہے كَلِمَةَ الْكُفْرِ: اس سے مراد نبی کو گالیاں دینا اور اسلام پر طعن کرنا ہے: وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا: اس سے مراد غزوہ تبوک میں ان (12) بارہ منافقین کا واقعہ ہے جنہوں نے نبی کے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن ان کا وہ ارادہ کامیاب نہ ہوا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خبر دیدی: وَمَا نَقَمُوْا: اس سے مراد یہ ہے کہ منافق آدمی احسان کرنے والوں کے ساتھ برائی کرتا

ہے اس آیت میں مالدار کرنے کی صفت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینے کے طور پر ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت تقسیم کے اعتبار سے ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مال فئ اور مال غنیمت اور زکوٰۃ میں مال دیتے تھے یہاں تک کہ یہ لوگ مالدار ہوگئے اس لئے صحیح احادیث میں آیا ہے:إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللهُ يُعْطِي:(صحیح بخاری کتاب العلم حدیث 71 صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ 33 مسند بزار 8365) بیشک میں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ دینے والا ہے۔

تفسیر 75 اس آیت میں دوسری کے قسم کے منافقین اور ان کی بری صفات کی طرف اشارہ جو اللہ تعالیٰ کے نام پر نذر مانتے ہیں مگر اس کو پورا نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ کرتے ہیں اور پورا نہیں کرتے ہیں۔ [redacted] بہت سے مفسرین نے اس آیت کے نزول کے سبب میں ثعلبہ بن حاطب انصاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہے لیکن وہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ بدری صحابی ہے اس لئے وہ منافق نہیں ہوسکتا۔ اس قصہ کا اہل علم نے رد کیا ہے۔ امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں اس کو ضعیف کہا ہے، اسی طرح ابن عبد البر اور ابن الاثیر اور علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد اور صاحب فیض القدیر اور نسیب رفاعی نے مختصر ابن کثیر میں اور امام سیوطی وغیرہم رحمہم اللہ نے بھی اس کو ضعیف کہا ہے۔

تفسیر 76 اس آیت میں منافقین کی دوسری صفات مذکور ہیں اور یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو نذر کو صحیح طریقے سے پورا نہیں کرتا وہ گنہگار ہے۔

تفسیر 77 یہ آیت بھی گزشتہ آیت کے ساتھ متعلق ہے اور اس میں ان کی ایک قبیح صفت مذکور ہے: يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ اس سے مراد موت کا دن ہے: فَأَعْقَبَهُمْ: بھی فاعل کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یا بخل کی طرف: أَوْ يَلْقَوْنَهُ: اس میں بھی ضمیر اللہ یا بخل کی طرف راجع ہے اور اس میں بخل کی جزا مقدر ہے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَأَنَّ اللَّهَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿٧٨﴾

"کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ان کی چھپی ہوئی باتوں اور سرگوشیوں کو جانتا ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ تمام عیبوں کو خوب جاننے والا ہے" [78]۔

تفسیر 78 اس آیت میں بھی منافقین کو ڈانٹ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال سے باخبر ہے تو ان کو سزا دیگا، آیت میں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے: سِرَّهُمْ: وہ باتیں جو دل میں ہوتی ہیں

اور: نَجْوٰىهُمْ :ان کی چھپی سرگوشیاں کرنا۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۙ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان والوں میں سے رغبت کرنے والوں پر عیب لگاتے ہیں اور وہ لوگ جو صرف اپنی مزدوری پاتے ہیں تو یہ لوگ انکا مذاق اڑاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ان کے مذاق کی سزا دیگا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے[79]۔ اگر آپ ان کے لیے بخشش مانگو یا نہ مانگو اگر ان کے لئے ستر مرتبہ معافی مانگیں تو اللہ تعالیٰ ان کو کبھی معاف نہیں کرے گا یہ اس وجہ سے کہ بیشک انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر کفر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نافرمان قوم کو (ہدایت کی توفیق) نہیں دیتا" [80]۔

تفسیر 79 اس آیت میں بھی منافقین کو ڈانٹ ہے اور ان کی دوہری صفات مذکور ہیں مراد یہ ہے کہ جو اللہ کی راہ میں مالداری کی وجہ سے زیادہ خرچ کرتے ہیں تو منافقین ان پر عیب لگاتے ہیں کہ یہ ریاکار ہیں اور جو غربت کی وجہ سے کم خرچ کرتے ہیں تو منافقین اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ فائدہ: یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن و تشنیع کرتے ہیں وہ منافقین ہیں جیسے شیعہ اور روافض ہیں۔

تفسیر 80 اس آیت میں نبی اور ایمان والوں کو خطاب ہے اور منافقین کے لئے وعید ہے کہ ان کے لئے استغفار قبول نہیں ہوتا ہے اس آیت کی ابتداء میں اختلاف ہے بعض علماء نے کہا ہے کہ اس میں مقصد اس کی مغفرت سے ناامید کرنا ہے تو ان کے لئے استغفار بے فائدہ ہوا جبکہ بعض علماء کے نزدیک یہ اختیار دینا ہے۔ بخاری کی حدیث میں دلیل ہے کہ یہ اختیار نبی ﷺ کو تھا لیکن پھر آیت 84 اور 113 کی وجہ سے منسوخ ہوا: سَبْعِيْنَ: اس سے مراد صرف ۷۰ مرتبہ نہیں ہے بلکہ عرب کے عدد کی بناء پر یہ لفظ استعمال ہوتا ہے کثرت کے لئے۔ سبع کا عدد ایسا عدد ہے کہ جو عدد کی تمام صفات پر مشتمل ہے فرد اور زوج اصم اور منطق احد اور مرکب اور اسی طرح عدد کے سات مرتبے ہیں مثلاً (دس، سو، ہزار، دس ہزار، لاکھ، دس لاکھ) تو اسی وجہ سے عرب لوگ زیادتی کی وجہ سے سبع کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی تاکید کے لئے سَبْعِيْنَ ذکر کرتے ہیں

اور زیادہ تاکید کے لئے سَبْعِیْنَ مَرَّةً: ذکر کرتے ہیں: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ: کفر کی طرح اشارہ ہے کہ ان کی مغفرت کا نہ ہونا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا ہے بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے ہے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ
قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ
جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَاۗىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا
مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۭ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿٨٣﴾

"جو لوگ (غزوہ تبوک میں) پیچھے رہ گئے وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف بیٹھ رہنے سے خوش ہوتے اور یہ لوگ ناپسند کرتے ہے کہ اپنے مال اور نفسوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور یہ لوگ (باقی لوگوں سے) کہتے ہیں کہ (گرمی میں) جہاد کے لئے نہ نکلو آپ کہہ دیجئے جہنم کی آگ بہت زیادہ گرم ہے اگر یہ لوگ جانتے (تو ایسا نہ کرتے) [81]۔ تو یہ لوگ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں ان کو بدلہ دیا جائیگا ان اعمال کا جو یہ لوگ کرتے ہیں [82]۔ پس اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک گروہ کی طرف واپس لوٹایا تو آپ سے اجازت طلب کریں گے تو آپ کہہ دیجئے ہرگز میرے ساتھ نہ نکلنا اور میرے ساتھ کبھی بھی جہاد نہ کرنا دشمن کے مقابلے میں بیشک تم پہلی مرتبہ بیٹھنے والوں کے ساتھ خوش ہوئے تھے تو پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ بیٹھ جاؤ" [83]۔

تفسیر 81 اس آیت میں بھی منافقین کو ڈانٹ ہے اور ان کی چار بری اوصاف مذکور ہیں پہلی صفت کا مطلب یہ ہے کہ جہاد سے بیٹھنا ایک گناہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت دوسرا گناہ ہے اور اس پر خوشی منانا تیسرا گناہ ہے یہ مبتدعین کا عمل بھی ہے کہ ان کا جو عمل رسول کے خلاف ہوتا ہے اس پر خوشی مناتے ہیں: اَلْمُخَلَّفُوْنَ: اگرچہ یہ لوگ جہاد سے خود پیچھے رہ گئے تھے لیکن یہ ان پر اللہ کی طرف سے قہر اور غضب ہے یعنی ان کو اللہ تعالیٰ نے جہاد پر جانے کی توفیق نہ دی جیسے 46 آیت میں گزر چکا ہے: خِلٰفَ: مخالفت کے معنی میں ہے اور یہ مفعول لہ ہے یا خلف کے معنی میں ہے یَفْقَهُوْنَ: یعنی دنیا اور آخرت مشقتوں اور انعامات دونوں کا علم اور یہ حقیقی علم ہے اسی وجہ سے اس کو فقاہت کہا گیا ہے۔

تفسیر 82 یہ بھی منافقین کے لئے وعید ہے اور اس سے امر مراد نہیں ہے بلکہ خبر دینا اور وعید دلانا مراد ہے اور اسی طرح

وَلْيَبْكُوا: امر سے مراد خبر ہے اور قلیل سے مراد دنیا ہے اور کثیر سے مراد جہنم ہے اور ضحک اور بکاء سے مراد حقیقی معنیٰ ہے اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد غم اور خوشی ہوں۔ فائدہ: بغیر قہقہے کے ہنسنا نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے لیکن اس کا زیادہ ہونا بیوقوفوں کا عمل ہے۔

تفسیر 83 اس آیت میں بھی منافقین کو وعید ہے اور اس میں ان کو آئندہ زمانے میں جہاد سے روکنا ہے اور جب یہ آیتیں جنگ تبوک کے سفر میں نازل ہوئی تھیں تو اسی وجہ سے فرمایا کہ: فَإِن رَّجَعَكَ اللَّهُ الْخَالِفِينَ: عورتیں، بچے اور کمزور آدمی اس میں داخل ہیں اور خالفین فاسدین کو بھی کہتے ہیں اور فاسدین گندے کے معنی میں ہے امام فراء بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خالفین مخالفت کرنے والوں کو بھی کہتے ہیں۔ فائدہ: اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو نبی کی مخالفت کرنے والے ہوں تو ان سے دوستی رکھنا منع ہے۔ اسی طرح امام رازی نے تفسیر کبیر میں ذکر کیا ہے: إِلَىٰ طَائِفَةٍ: طائفہ اس وجہ سے کہا کہ ان میں سے بعض ایمان لائے اور بعض نبی کریم ﷺ کے آنے سے پہلے فوت ہو گئے یا طَائِفَةٌ: سے مراد منافقین ہیں اس لئے کہ جو رہ چکے تھے وہ بعض ایمان والے تھے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ
فَاسِقُونَ ﴿٨٤﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ
كَافِرُونَ ﴿٨٥﴾ وَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُو الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا
ذَرْنَا نَكُن مَّعَ الْقَاعِدِينَ ﴿٨٦﴾

"اور نماز (جنازہ) نہ پڑھنا ان میں سے کسی کی کبھی جب ان میں سے فوت ہو جائے اور اس کی قبر کے پاس کھڑے نہ ہونا بیشک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر کفر کیا ہے اور ایسے حال میں فوت ہو چکے ہیں کہ یہ لوگ نافرمان تھے [84]۔ اور آپ کو تعجب میں نہ ڈالے ان کا مال اور اولاد بیشک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ ان کو دنیا میں عذاب دے دے اور ان کی روحیں نکل جائیں تو یہ لوگ کفر کی حالت میں ہوں [85]۔ اور جب کوئی سورۃ (اس مضمون پر) نازل کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول (ﷺ) کے ساتھ (مل کر) جہاد کرو تو آپ سے ان میں سے طاقتور لوگ اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں بیٹھنے والوں کے ساتھ رہنے دیں" [86]۔

تفسیر 84 یہ آیت مضمون میں پہلی آیت میں لفظ :فَقُلْ: پر عطف ہے اور :فَاسْتَأْذَنُوا: کے تحت داخل نہیں ہے اس آیت میں بھی منافقین کو وعید ہے اور مقصود خوف دلانا ہے کہ منافقت کی وجہ سے ان پر نماز جنازہ پڑھنا اور موت کے بعد ان کیلئے دعا کرنا منع ہے:وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ: مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عادت تھی کہ جب میت کو دفنایا جاتا اور قبر تیار ہو جاتی تو اس کے پاس ٹھہر جاتے اور دعا مانگتے اور اسی طرح جب کسی قبر کی زیارت کرتے تب بھی کھڑے ہو کر دعا مانگتے لیکن منافقین کیلئے اس طریقے سے رسول اللہ ﷺ روک دیئے گئے یہ دلیل ہے کہ قبر کے پاس کھڑے ہو کر دعاء مانگنا سنت ہے:عَلٰى قَبْرِهٖ: (علی) عند کے معنی میں ہے اس لئے کہ قبر کے اوپر کھڑا ہونا جائز نہیں ہے:اِنَّهُمْ كَفَرُوْا اس میں علت ہے نماز جنازہ پڑھنے اور قبر کے پاس دعا کے لئے کھڑے ہونے سے ممانعت کی:فَاسِقُوْنَ: جو کفر اور کھل کے گناہ کے کام کرتے ہیں۔

تفسیر 85 اس آیت میں ایک وہم کا جواب ہے کہ کہیں ان کی مالداری یا اس کے بیٹوں کی وجہ سے ان کا جنازہ پڑھنا جائز ہوگا تو اس میں جواب ہوا یہ منافقین کے لیے دوسرا حکم ہے اور لَا تُصَلِّ: پر عطف ہے۔سوال: یہ آیت پہلے بھی آیت 55 میں گزر چکی ہے تو تکرار کے ساتھ لانے کا کیا فائدہ ہے۔ جواب ۱: پہلی آیت میں نفقات کی قبولیت کی ممانعت کے لیے تفریع تھی اس وجہ سے فاء کے ساتھ ذکر کیا ہے اور یہ آیت گزشتہ وہم کے لیے جواب ہے۔جواب ۲: پہلی آیت ان منافقین کے بارے میں تھی جو آیت کے نزول کے وقت موجود تھے اور یہ ایک عام ہے دونوں آیتوں میں چار طریقوں سے فرق ہے پہلا یہ کہ اس کے شروع میں فاء ہے اور اس کے شروع میں واو ہے اس کی وجہ معلوم ہے دوسری یہ کہ وہاں (لَا) کا کلمہ دو مرتبہ ذکر کیا گیا تھا اور یہاں ایک مرتبہ ہے اس لیے کہ وہ تفریع تھی اور تفریع تفصیل پر مبنی ہوتی ہے اور اس آیت میں صرف حکم ہے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ تیسرا وہاں :لِيُعَذِّبَهُمْ: لام کے ساتھ اور یہاں :يُعَذِّبَهُمْ: ہے وہاں مفعول پوشیدہ ہے یعنی تُكْثِرُ الْاَمْوَالُ وَالْاَوْلَادُ: اور یہاں :اَنْ يُعَذِّبَهُمْ: بذات خود مفعول ہے۔ چوتھا وہاں اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَا: کا لفظ تھا اور یہاں حَيٰوةٌ کا لفظ پوشیدہ ہے وجہ یہ ہے کہ وہاں تاکید مقصود تھی جبکہ یہاں تاکید مقصود نہیں ہے۔(اللہ اپنی کتاب کی حکمت کو خوب جانتا ہے)۔

تفسیر 86 یہ بھی بطور عطف ذکر کیا اس کو قصے کا قصے پر عطف کہا جاتا ہے اس آیت میں بھی منافقین کو وعید ہے کہ جب جہاد کا اعلان ہو جائے تو مالدار لوگ ان سے رہ جانے کی کوشش کرتے ہیں:اٰمِنُوْا: سے مراد ایمان والوں کے لئے ایمان کی ہیشگی

مراد ہے اور منافقین کے لیے ایمان کا اخلاص ہے اور اس کو پہلے اس وجہ سے ذکر کیا کہ ایمان کے بغیر جہاد قبول نہیں ہوتا۔ سورۃ کے کچھ حصے کو بھی سورت کہا جاتا ہے یا سورۃ سے مراد مکمل سورۃ توبہ ہے: اُولُوا الطَّوْلِ: کو اسی وجہ سے خاص ذکر کیا ہے کہ انکی قوت اور طاقت ہونے کے باوجود جہاد نہیں کرتے: اَلْقَاعِدِيْنَ: سے مراد عام ہے چاہے بیمار اور معذور ہوں یا بچے اور بوڑھے۔

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾ وَجَاۗءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

"یہ لوگ اس بات پر راضی (خوش) ہیں کہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ ہو جائیں اور ان کے دلوں پر مہر لگائی گئی ہے تو یہ لوگ (اس نقصان کو) نہیں جانتے [87]۔ لیکن رسول اللہ ﷺ اور اس کے ایمان والے ساتھی اپنے مالوں اور جانوں کے ذریعے جہاد کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے زیادہ خوشیاں ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں [88]۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے باغات تیار کیے ہیں کہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں یہ لوگ اس میں ہمیشہ رہینگے یہ بہت بڑی کامیابی ہے [89]۔ اور دیہاتیوں میں سے جھوٹے بہانے کرنے والے آئے تاکہ ان کو اجازت دی جائے اور وہ لوگ بیٹھ گئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ اس کے رسول (ﷺ) سے جھوٹ بولا تھا عنقریب ضرور پہنچ جائے گا ان میں سے کافروں کو دردناک عذاب" [90]۔

تفسیر 87 اس آیت میں بھی منافقین کو وعید ہے اور ان کی دو بری صفات کا ذکر ہے: خَوَالِف۔ خَالِفَة: کی جمع ہے اس سے عورتیں، بچے اور معذور مرد مراد ہیں اسی طرح خوالف ذلیل مردوں کو بھی کہا جاتا ہے: يَفْقَهُوْنَ: فقاہت سے مراد یہاں جہاد کے فائدوں اور جہاد چھوڑنے کے نقصانات میں فرق ہے۔ اور اسی طرح مجاہدین کی صحبت اور عورتوں کی صحبت میں فرق ہے اور اسی طرح سورۃ کے مقاصد کو جاننے کی مہارت رکھنا۔

تفسیر 88، 89 ان آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفت ہے منافقین کے مقابلے میں

جہاد کرنے کے ساتھ اور ان کے لیے اخروی خوشخبری ہے اور لفظ: لٰکِنِ: میں فائدہ ہے کہ منافقین یہ وہم نہ کریں کہ اگر ہم جہاد نہ کریں تو کوئی اور نہیں ہے جو جہاد کرے تو اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کی شان ذکر کی اور چار طریقوں سے بشارت دی پچھلی آیت میں اور دوسری میں بھی دو طریقے ہیں اور دوسری آیت میں اخروی بلائی کا ذکر ہے: اَلْخَیْرَاتُ: سے مراد دنیا اور آخرت کا منافع ہے یا اس سے مراد جنت میں بیویاں ہیں جیسے سورۃ رحمٰن آیت 70 میں ہے۔

تفسیر 90 اس آیت میں بھی منافقین کے لئے وعید ہے اور پھر مدینے والوں کا حال بیان کرنے کے بعد دیہاتی منافقین کا حال ذکر ہے: مُعَذِّرُوْنَ: مراد جھوٹے عذر کرنے والے ہیں یعنی ان لوگوں نے جھوٹا عذر پیش کیا تھا اور کبھی صحیح عذر کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے: وَقَعَدَ الَّذِیْنَ: اس سے مراد وہ دوسرا گروہ ہے جو عذر پیش کرنے کے بغیر جہاد سے رہ گیا تھا، معنی یہ ہے کہ عذر کرنے سے بیٹھ جانا، یا اس سے مراد یہ پہلا گروہ ہے جنہوں نے جھوٹ سے عذر پیش کیا اور جہاد سے رہ گیا تھا تو معنی یہ ہوا کہ جہاد سے بیٹھ جانا: کَذَبُوْا: اس سے جھوٹ مراد ہے ان کے ایمان کا دعویٰ ہے یا اس سے مراد جھوٹا عذر ہے: کَفَرُوْا مِنْهُمْ: مِنْهُمْ: اس وجہ سے فرمایا کہ ان میں سے بعض لوگوں نے توبہ کی تھی۔

لَیۡسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَی الۡمَرۡضٰی وَلَا عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ مَا یُنۡفِقُوۡنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوۡا لِلّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ ؕ مَا
عَلَی الۡمُحۡسِنِیۡنَ مِنۡ سَبِیۡلٍ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَی الَّذِیۡنَ اِذَا مَاۤ اَتَوۡکَ لِتَحۡمِلَہُمۡ قُلۡتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ
اَحۡمِلُکُمۡ عَلَیۡہِ ۪ تَوَلَّوۡا وَّاَعۡیُنُہُمۡ تَفِیۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ حَزَنًا اَلَّا یَجِدُوۡا مَا یُنۡفِقُوۡنَ ﴿ؕ۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِیۡلُ عَلَی الَّذِیۡنَ
یَسۡتَاۡذِنُوۡنَکَ وَہُمۡ اَغۡنِیَآءُ ۚ رَضُوۡا بِاَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مَعَ الۡخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۳﴾

”نہیں ہے کمزور لوگوں پر اور نہ بیماروں پر اور نہ ان لوگوں پر جو خرچ کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں پاتے کوئی گناہ (جہاد سے بیٹھ جانے پر) جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بارے میں اخلاص رکھیں احسان کرنے والوں پر کچھ ملامت نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا مہربان ہے [91]۔ اور نہ ان لوگوں پر کوئی گناہ ہے جو آپ کے پاس آتے تھا تاکہ ان کو کوئی سواری دیں تو آپ نے کہا میں ایسا کچھ نہیں پاتا جس پر تمہیں سوار کروں تو یہ لوگ واپس پلٹ گئے اور ان کی آنکھیں (غم کی وجہ سے) آنسو بہار رہی تھیں اس بات پر کہ خرچ کرنے کیلئے کچھ نہیں پایا [92]۔ بیشک ملامت کی بات ان لوگوں کے لیے ہے جو آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں (جہاد سے رہ جانے کے لیے) اور یہ لوگ مالدار ہوں یہ لوگ اس بات پر خوش ہیں کہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگائی ہے پس یہ لوگ نہیں جانتے ہیں“ [93]۔

تفسیر 91 اس آیت میں معذوروں کا ذکر ہے کہ یہ لوگ صحیح عذر کی وجہ سے جہاد سے رہ چکے ہیں تو یہ گنہگار نہیں ہیں اس آیت میں تین قسم کے لوگوں کا ذکر کیا ہے ایک ضعیف قسم کے لوگ یہ عام لفظ ہے کہ بدن کی ایسی طاقت ختم ہو جائے جس کے ذریعے جہاد ہو سکے جیسے اندھا یا لنگڑا ہو یا ہاتھوں سے معذور یا بوڑھا ہو چکا ہو۔ دوسرا مریض لوگ ایسا مرض جو جہاد کرنے سے بڑھتا ہو یا انسان کو ہلاکت تک پہنچاتا ہو، تیسری قسم کے وہ معذور لوگ ہیں جو جہاد کا خرچہ تو نہیں پاتے لیکن ان پر دو شرطیں لگائی ہیں: نَصَحُوۡا لِلّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ: اللہ تعالیٰ کے لیے خیر خواہ، عقیدہ توحید کا اخلاص اور ہر قسم کے شرک سے بچنا اور اللہ تعالیٰ کے دیگر احکام پر عمل کرنا اور اس کی منہیات سے رک جانا رسول کی نصیحت یہ ہے کہ اس پر ایمان لائے اور اس کی اطاعت کرے اور اسکی عزت اور اس سے محبت کرے اور اس کی سنت کی اتباع کرے اور اسکی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ دشمنی کرے۔ دوسری شرط یہ ہے: مَا عَلَی الۡمُحۡسِنِیۡنَ: اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ معذورین اپنی

طاقت کی مناسبت سے زبان کا جہاد کرتے ہیں اور مجاہدین کے ساتھ ان کے مالوں میں اور ان کے اہل عیال کی حفاظت میں ان کے ساتھ احسان کرتے ہیں یا یہ کہ عذر کے ساتھ نصیحت کا ذکر بھی ایک ساتھ کیا تو ان کا نام محسنین ہوا۔

تفسیر 92 اس آیت میں چوتھی قسم کے معذور لوگ مذکور ہیں یعنی وہ لوگ جو سفر کے وقت سواری نہیں پاتے، یہ غزوہ تبوک کے وقت سات افراد تھے جو نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے سواری کی درخواست کی لیکن سواری دینا آپ ﷺ کے بس میں نہیں تھا تو یہ لوگ بہت دکھ کے ساتھ واپس پلٹ گئے اور کافی زمانے تک روتے رہے (صحیح بخاری کتاب الجهاد حدیث 4422 ابو داود کتاب الجهاد حدیث 2508) اور ان کو: بَكَّائُوْنَ: کہا جاتا تھا اور دوسرا قول یہ ہے کہ انہوں نے جوتے یا موزے مانگے تھے پہلا قول راجح ہے: تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ: اس کلام میں جزا کا مبالغہ مقصود ہے اسلئے کہ اصل میں اس طرح ہے: دُمُوْعُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الْأَعْيُنِ يَا تَمْتَلِئُ الْأَعْيُنُ مِنَ الدُّمُوْعِ ثُمَّ تَفِيْضُ: ان کے آنسو آنکھوں سے بہہ رہے تھے یا آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں پھر بہتی ہیں۔

فائدہ: یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اختیار میں کسی کو جانور دینا بھی نہیں ہے جہاد کے لیے اگرچہ وہ اس وقت زندہ تھے تو مردوں کے پاس کس طرح اختیار ہو سکتا ہے کہ اہل شرک مردوں سے جانور وغیرہ مانگتے ہیں۔

تفسیر 93 اس آیت میں مالدار منافقین کو وعید ہے یہ: لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ اور اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ: کے مقابلے میں ہے: أَغْنِيَاءُ: یعنی یہ لوگ نفقہ اور سواری پر قادر ہیں اور معذور بھی نہیں ہیں: رَضُوْا: جملہ مستانفہ ہے ان کی اجازت طلب کرنا 86 اور 57 میں بھی اس طرح مضمون مذکور تھا لیکن وہاں: أَغْنِيَاءُ: مراد ہیں کہ زیادہ مالدار ہیں اس لیے ان کو: أُولُو الطَّوْلِ: کہا تھا یہاں کم مالدار ہیں صرف نفقہ اور سواری پر قادر ہیں اسی طرح وہاں سورۃ کے نزول کے وقت منافقین کا حال مذکور تھا اور یہاں غزوہ تبوک کے اعلان میں انکے حال کا ذکر ہے پھر جب وہاں: أُنْزِلَتْ: مجہول ذکر ہوا تھا تو طُبِعَ: کو بھی مجہول ذکر کیا وہاں سورۃ پر عدم فقاہت مراد تھی جبکہ یہاں جہاد کے چھوڑنے کے نقصانات پر ترک علم مراد ہے اسی وجہ سے وہاں فقہ کی نفی اور یہاں علم کی نفی کی ہے۔

يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ ۚ قُل لَّا تَعْتَذِرُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّأَنَا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ ۚ
وَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٩٤﴾
سَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ إِذَا انقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا عَنْهُمْ ۖ فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ ۖ إِنَّهُمْ رِجْسٌ ۖ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ
جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٥﴾

"یہ لوگ آپ کے سامنے جھوٹے بہانے بنائینگے جب آپ ان کی طرف پلٹ جائیں۔ آپ کہہ دیجئے بہانے نہ بناؤ ہم تم پر کبھی اعتبار نہیں کرینگے یقیناً ہمیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے حالات کے بارے میں خبر دی ہے اور عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارا عمل دیکھ لے گا اور اس کا رسول ﷺ پھر اس ذات کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو غیب اور ظاہر کا جاننے والا ہے تو تمہیں ان اعمال کے بارے میں خبر دیگا جو تم کرتے تھے [94]۔ عنقریب اللہ کی ذات پر تمھارے سامنے قسمیں کھائیں گے جب تم ان کی طرف واپس لوٹ جاؤ تاکہ ان سے منہ پھیر لو تو ان سے منہ پھیر لو بیشک یہ لوگ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے ان کو ان اعمال کا بدلہ دیا جائیگا جو یہ لوگ کرتے ہیں" [95]۔

تفسیر 94 یہ بھی منافقین کو زجر و توبیخ ہے۔ نبی ﷺ کو یہ وحی جنگ تبوک کے سفر میں پیشگوئی کے طور پر ہوئی إِذَا رَجَعْتُمْ إِلَيْهِمْ: یہ جملہ اس کی دلیل ہے: يَعْتَذِرُونَ: جملہ مستانفہ ہے یعنی اگر کہا جائے کہ یہ لوگ کیسے اجازت طلب کرتے ہیں تو اس کا طریقہ اعتذار کے ساتھ ذکر کیا: يَعْتَذِرُونَ: اعتذار جھوٹے عذر کے معنی میں ہے: قَدْ نَبَّأَنَا اللَّهُ انباء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور: مِنْ: کا حرف اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ بعض چھپی باتوں پر اس وقت باخبر ہوتے تھے جب اللہ تعالیٰ ان کو خبر دیتا۔ جیسے سورۃ تحریم آیت 2 میں ہے یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ غیب کا علم رکھنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے: وَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ: لفظ مستقبل اس بات کی دلیل ہے کہ: عَمَلَكُمْ: سے مراد آنے والے اعمال ہیں یعنی نفاق سے توبہ کرنا یا نہ کرنا اور قتال میں شرکت ایمان والوں کی مدد کرنا یا نہ کرنا۔ فائدہ: اس آیت سے بعض جاہلوں نے دلیل لی ہے کہ نبی کریم ﷺ حاضر اور ناظر ہے اس کا جواب بہت سے طریقوں سے ہے پہلا یہ ہے کہ اس آیت میں: نَبَّأَنَا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ: اس کے خلاف ہے دوسرا یہ کہ بعد والے جملے میں عالم الغیب صفت اللہ تعالیٰ کے لیے ذکر ہوئی ہے۔ تیسرا یہ کہ آیت 105 میں: الْمُؤْمِنُونَ: بھی مذکور ہے تو لازم یہ ہوا کہ سارے ایمان والے

حاضر اور ناظر ہو جائیں۔ چوتھا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی رویت (علم) میں فرق کے لیے مفعول اوّل ذکر کیا ہے اور معطوف (رسولہ) بعد میں ذکر کیا ہے یہ بعد والی وجہ روح المعانی میں مذکور ہے۔

تفسیر 95 اس آیت میں پھر منافقین کو وعید ہے اور ان کی دو بری صفات مذکور ہیں: فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ: اس سے مراد یہ ہے کہ ان سے بات بھی نہ کرو اور ان کے ساتھ بیٹھنا بھی نہیں ہے: لِتُعْرِضُوْا: اس سے مراد صفح کا اعراض ہے یعنی ملامت نہ کرنا اور: اَعْرِضُوْا: میں اعراض سے مراد مجلس اور سلام کلام کو چھوڑنا ہے۔ اس دلیل کی علت کے ساتھ کہ یہ لوگ نجس (رِجْسٌ) ہیں اس سے مراد معنوی باطنی نجاست ہے یعنی جس طرح ناپاک چیز سے خود کو بچانا ضروری ہے اسی طرح ان سے بھی خود کو بچانا لازمی ہے تا کہ ان کی ناپاکی تم پر اثر نہ کرے۔ فائدہ ۱: پہلی آیت میں: رَجَعْتُمْ اور یَعْتَذِرُوْنَ مذکور ہے اور اس میں: اِنْقَلَبْتُمْ اور سَيَحْلِفُوْنَ: مذکور ہے اس کی حکمت یہ ہے کہ رجوع مطلق واپسی کو کہتے ہیں چاہے حال کی تبدیلی آئی ہو یا نہیں جبکہ انقلاب حال کی تبدیلی کو کہا جاتا ہے تو پہلی آیت میں صرف مدینے کی طرف واپسی مراد ہے حال کی تبدیلی سے قطع نظر تو اس وقت منافقین صرف شرمندگی سے بچنے کے لیے عذر پیش کرتے رہے جبکہ اس آیت میں واپسی حال کی تبدیلی کے ساتھ بھی مراد ہے یعنی ایمان والے غزوہ تبوک میں غلبے کے بعد خوشی سے واپس آگئے تو منافقین ڈر گئے اور معافی کو طلب کرنے کیلئے قسمیں پیش کیں۔ فائدہ ۲: مشرکین کو آیت 28 میں نجس کہا تھا اور منافقین کو رجس کہا ہے اس لیے کہ نجس وہ ہے جس کی ناپاکی ظاہر اور پوشیدہ دونوں ہو جبکہ رِجْسٌ وہ ہے جس کی ناپاکی پوشیدہ ہو تو پہلا وصف مشرکین کے ساتھ اور دوسرا منافقین کے ساتھ مناسب ہے۔

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٩٦﴾ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ
كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٩٧﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ
مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ۗ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٩٨﴾ وَمِنَ
الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ۗ اَلَآ اِنَّهَا
قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۗ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩٩﴾

"تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ پس اگر تم ان سے راضی ہو جاؤ تو بیشک اللہ تعالیٰ نافرمان قوم سے راضی نہیں ہوتا[96]۔ دیہاتی لوگ کفر اور منافقت میں زیادہ سخت ہیں اور اس بات کے لائق ہیں کہ ان احکام کا مطلب نہ جانیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیے ہیں اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمتوں والا ہے[97]۔ اور بعض دیہاتیوں میں سے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اسے نقصان سمجھتے ہیں اور تم پر آفتوں کا انتظار کرتے ہیں انہی پر بری آفت پڑے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے[98]۔ اور بعض دیہاتیوں میں سے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا اللہ کی طرف نزدیکی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعاؤں کا سبب سمجھتے ہیں۔ خبردار بیشک ان کا یہ خرچ کرنا ان کے نزدیکی (قربت) کا سبب ہے عنقریب ان کو اللہ تعالیٰ اپنی خاص رحمت میں داخل کریگا بیشک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا مہربان ہے"[99]۔

تفسیر 96 یہ بھی منافقین کے لئے وعید ہے اور اس بات کی صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین سے ناراض ہے۔ راضی ہونا اعراض سے بلند ہے تو یہ ماقبل کی ترقی ہے اور معلوم ہوا کہ منافقین سے اعراض کرنا جائز ہے لیکن ان سے راضی ہونا منع ہے۔

تفسیر 97 یہ بھی دیہاتی منافقین کے لئے دوسری صفات کے ذکر کرنے کے ساتھ وعید ہے: اَلْاَعْرَابِ: اعرابی کی جمع ہے وہ لوگ جو دیہات میں رہتے ہیں اور عربی وہ ہیں جن کا سلسلہ نسب عرب والوں کے ساتھ ہو۔ وَاَجْدَرُ یہ اَشَدُّ کے لیے علت ہے یعنی ان کا کفر اور منافقت اس وجہ سے سخت ہے کہ یہ لوگ قرآن کریم اور سنت اور شریعت کے احکام سے زیادہ ناواقف ہیں: حُدُوْدَ: یہ لفظ احکام آداب معانی اور مقاصد کے لیے عام ہے۔

تفسیر98 اس آیت میں بھی ان منافقین کے لئے وعید ہے اور ان کی دو بری صفات مذکور ہیں :مَغْرَمًا: وہ چیز جس کو انسان واجب اور فائدہ مند نہ سمجھے اور مجبوراً کرے یہ صفت قیامت کی علامات میں بھی شامل ہے:دَوَائِرَ ،دَائِرَةٌ: کی جمع ہے اس حال کو کہتے ہیں جو نعمت سے مصیبت میں تبدیل ہو جائے اس سے مراد عام حادثات ہیں:عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ یہ ان کے لئے بددعاء ہے بعد والے تمام صفات میں اور اس سے مراد مصائب ،عذاب اور شکست کے حادثے ہیں۔

تفسیر99 اس آیت میں بعض مومن دیہاتیوں کا ذکر ہے منافقین کے مقابلے میں اور ان کو بشارت ہے: وَصَلَوٰتِ الرَّسُولِ :اس سے مراد رسول کی دعائیں ہیں کہ وہ صدقہ دینے والوں کو دعا دیتے تھے جیسے آیت 103 میں آنے والا ہے:أَلَآ إِنَّهَا قُرْبَةٌ جب صَلَوٰتِ الرَّسُولِ :میں بھی قربت الٰہی کے حصول کا مقصد تھا اس وجہ سے قربت کا ذکر بھی بہت تاکید کے ساتھ کیا۔اور قربت کی غایہ سَيُدْخِلُهُمُ اللَّهُ کے ساتھ ذکر کیا اور رحمت سے مراد جنتیں ہیں۔

وَالسَّٰبِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَٰجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَٰنٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

"اور ایمان کی طرف سبقت کرنے والے پہلے لوگ جو مہاجرین اور انصار میں سے ہیں اور وہ لوگ جو اچھی بات (کاموں) میں ان کی تابعداری کرتے ہیں اللہ تعالی ان سے راضی (خوش) ہے اور یہ لوگ اللہ تعالی سے راضی ہیں اور ان کے لئے باغات تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں یہ لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے"[100]۔

تفسیر100 یہاں سے سورۃ کے آخر تک چوتھا حصہ ہے اور اس حصہ میں تبوک کے واقعہ میں تین قسم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر ہوا ہے ایک قسم مجاہدین کی دوسری قسم جہاد سے رہنے والوں کی لیکن جلدی توبہ کرنے والے اور تیسری قسم جہاد سے رہ جانے والے اور توبہ میں تاخیر کرنے والے اس حصے میں جہاد کی ترغیبات ہیں اور منافقین کو ان کے برے اعمال پر وعیدیں ہیں اور سورۃ کے آخری حصہ میں رسول اللہ ﷺ کی سچائی اور توحید کا دعوی ہے۔اس آیت میں بلند شان اور اللہ تعالی کی رضا کی خوشخبری اور جنتوں کی خوشخبری تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے مذکور ہے اور اسی طرح وہ لوگ جو صحابہ کرام کی تابعداری کرنے والے ہوتے ہیں اور ساتھ ہی صحابہ کرام کی مدح بھی کرتے ہیں اس آیت میں دو قول ہیں پہلا یہ کہ:اَلسَّابِقُوْنَ :سے مراد یہ ہے کہ جو سب سے پہلے ایمان لائے ،ہجرت اور نصرت کی صفت حاصل کی ہے اور

اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ: سے مراد باقی صحابہ کرام ہیں جو بعد میں ایمان لائے ہیں۔ یہ دونوں قسمیں سورۃ انفال کی آیت 72 اور 75 میں مذکور ہوئی ہیں تو آیت صرف صحابہ کرام کے بارے میں ہے اس روایت کی تائید محمد بن کعب قرظی نے بھی کی ہے جو تفسیر خازن اور آلوسی وغیرہ میں مذکور ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ: اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ: سے تمام صحابہ کرام مراد ہیں جیسے الواحدی نے تفسیر الوجیز میں ذکر کیا ہے کہ تمام صحابہ کرام ایمان لانے اور نبی کریم ﷺ کی صحبت اور رؤیت میں امت سے پہلے ہیں: وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ: سے مراد باقی بعد والے لوگ ہیں۔ اس شرط کے ساتھ کہ قیامت تک احسان اور نبی کی اتباع کرینگے تو پہلے قول کی بناء پر اس آیت میں صحابہ کرام کے مراتب اور تفاوت کی طرف بھی اشارہ ہے ایک قسم :اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ: اور دوسری قسم ان کے بعد ایمان لانے والے ہیں: سٰبِقُوْنَ: سے مراد یہ ہے کہ باقی لوگوں سے پہلے ایمان لائے ہوں، نبی کی اتباع کی ہو، ہجرت اور نصرت کی ہو اور: اَلْاَوَّلُوْنَ: سے مراد یہ ہے کہ ان کا زمانہ باقی ایمان لانے والوں سے پہلے ہے: وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ: اس میں دو قول ہیں پہلا قول: ان کے بعد والے صحابہ کرام مراد ہیں جنہوں نے پہلے صحابہ کرام کی اتباع کی ہے دوسرا قول وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے قیامت تک صحابہ کرام کی اتباع کی ہو: بِاِحْسَانٍ: کے ایک معنی یہ ہے کہ ان کاموں میں ان کی اتباع کرتے ہیں جو قرآن اور سنت کے موافق ہوتے ہیں جو کام ان سے غلطی کی وجہ سے صادر ہوئے ہیں وہ ان سے خارج ہوگئے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ صحابہ کرام کے تابعداری کرتے ہیں اور ان کے بارے میں اپنی مجالس میں ذکر خیر کرتے ہیں تو اس لفظ کے ساتھ وہ لوگ خارج ہوگئے جو صحابہ کرام کے عیوب بیان کرتے ہیں اور ان پر طعن کرتے ہیں جیسے شیعہ اور روافض وغیرہ۔ نکتہ: بشارت کی تاکید کی وجہ سے: تَحْتَهَا: سے مِنْ: حذف کیا گیا ہے جو نیچے ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ قریب ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛؔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۟ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۚ﴿۱۰۱﴾

"اور ان لوگوں میں سے جو تمہارے ارد گرد دیہاتی ہیں وہ منافقین ہیں اور مدینے والوں میں سے بعض منافقت پر سخت ہیں تم ان کو نہیں جانتے ہم ان کو جانتے ہیں عنقریب ہم ان کو دوگنا عذاب دینگے پھر یہ لوگ بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائینگے" [101]۔

تفسیر 101 اس آیت میں منافقین کا ذکر اور ان کو عذاب کی ذریعہ خوف دلانا مقصود ہے، پہلی آیت سے اس کا ربط مقابلے

کا ہے یعنی منافقین کے مقابل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں: لَا تَعْلَمُوْنَ: امام آلوسی اور قرطبی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری وقت تک بھی غیب نہیں جانتے تھے اس لئے کہ یہ سورۃ ان سورتوں میں سے ہے جو ہجرت کے نویں اور دسویں سال میں نازل ہوئی ہے اور دوسری بات یہ دلیل ہے کہ کسی کے بارے میں یقینی حکم نہیں ہوسکتا کہ یہ جنتی ہے یا جہنمی۔ ان لوگوں کے علاوہ جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔ سوال ۱: سورۃ محمد آیت 3 میں ہے کہ: لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ: جواب: اس کا جواب ہم نے امام ابن کثیر سے سورۃ محمد کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ وہاں ملاحظہ کیجئے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں تمام منافقین کے بارے میں علم مراد ہے جبکہ سورۃ محمد میں بعض منافقین مراد ہے۔ سوال ۲: تفسیر جمل میں کہا ہے کہ سورۃ محمد کی آیت اس آیت کی وجہ سے ناسخ ہے اور یہ منسوخ ہے۔ جواب: تمام محققین مفسرین نے کہا ہے کہ یہ سورۃ نزول کی ترتیب سے نمبر 113 ہے اور سورۃ محمد 95 ہے تو وہ اس کی ناسخ نہیں بن سکتی اور اسی طرح صاحب تفسیر جمل کا وہ مقام اور مرتبہ نہیں ہے کہ اس کا قول محققین مفسرین کے مقابلے میں قبول کیا جاسکتا ہو۔ سوال ۳: ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مفسرین نے یہاں پر اور سورۃ محمد میں روایت نقل کی ہے۔ وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مکمل طور پر جانتے تھے۔ جواب ۳: وہ روایت ضعیف ہے اس کا ایک راوی اسباط ہے تہذیب التہذیب صفحہ 212 میں اس کو ضعیف کہا گیا ہے اور ایک راوی سدی کبیر ہے اس پر اسی کتاب کے صفحہ 314 میں کلام ہے یعنی حدیث کے باب میں کمزور ہے: سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ: اس میں ایک دنیاوی عذاب اور دوسرا قبر کا عذاب ہے: ثُمَّ يُرَدُّوْنَ: اس سے قیامت کا عذاب مراد ہے اسی طرح مفسر الواحدی نے تفسیر الوجیز میں اور امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ۝ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

"اور باقی لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا ہے انہوں نے نیک اور برا عمل خلط ملط کیا ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تعالی ان کی توبہ قبول کریگا بیشک اللہ تعالی معاف کرنے والا مہربان ہے[102]۔ ان کے مالوں سے زکوۃ لو کہ آپ ان کو (گناہوں سے) پاک کرلو اور اس کے سبب سے تزکیہ کریں اور ان کے لئے دعا مانگو بیشک آپ کی دعاء ان کے (دلوں کے) آرام کا سبب ہے اور اللہ تعالی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے[103]۔ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالی بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور زکوۃ قبول کرتا ہے اور بیشک اللہ تعالی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے"[104]۔

تفسیر 102 اس آیت میں دوسری قسم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف اشارہ ہے جو جنگ تبوک سے رہ گئے تھے اور پھر اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں کے ساتھ باندھا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ جب تک ہماری توبہ قبول نہیں ہوتی ہم اپنے آپ کو نہیں کھولیں گے اور رسول اللہ ﷺ ہمیں کھول نہ دیں۔ اسی طرح ہوا ابو عثمان سے روایت ہے کہ قرآن میں میرے نزدیک کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس کے لیے اس امت کی امید زیادہ ہو مگر یہ آیت ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آیت صحابہ کرام کے ساتھ خاص نہیں ہے: عَمَلًا صَالِحًا: باقی جہادوں میں شرکت کرنا اور اسی طرح باقی گناہوں سے جلدی توبہ کرنا: تُطَهِّرُهُمْ: فاعل کی ضمیر صدقہ کی طرف راجع ہے اور صیغہ مؤنث غائب کا ہے یا مخاطب کا صیغہ ہے جو کہ نبی کریم ﷺ ہیں: وَتُزَكِّيْهِمْ: یہ مخاطب کا صیغہ ہے اور تزکیہ سے مراد نفاق کی خباثت سے بچانا ہے اور مال اور درجات کو زیادہ کرنا اس کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف سببی ہے جو آپ ﷺ کی دعا ہے جو اس کے بعد لفظ: صَلِّ کے ساتھ مذکور ہے۔

تفسیر 103 یہ آیت بھی ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہے جن کی زکوۃ لینے سے نبی کریم ﷺ نے منع کیا تھا تو اللہ تعالی نے فرمایا کہ ان کی توبہ قبول ہوئی لہذا ان کا باقی زکوۃ قبول کر لینا یہ حکم پھر ہر امیر المومنین کے لیے عام ہے کہ ایمان والوں کی زکوۃ لیا کرے اور انہیں دعائیں دے۔ فائدہ: رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب صحابہ کرام زکوۃ لاتے تو رسول اللہ ﷺ اس کو وصول کر لیتے لیکن یہ وصول کرنا وکالت کے طور پر نہ کہ ملکیت کے طور پر تھا اور پھر اس کو

مصارف میں خرچ کرتے اور زکوۃ دینے والوں کو خاص کر لفظ :صَلٰوۃ: کے ساتھ دعا کرتے تھے۔

تفسیر 104 اس آیت میں توبہ کرنے اور صدقات دینے کی ترغیب ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عبادت مالی کے ساتھ عبادت بدنی یعنی توبہ ایک ساتھ کرنا چاہیے اور یہ آیت دلیل ہے کہ آیت 102 میں لفظ :عَسیٰ شک کے لیے نہیں ہے :یَأْخُذُ: :اللہ تعالیٰ کی یہ صفت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ذکر کی گئی ہے :اِنَّ الصَّدَقَةَ تَقَعُ فِي يَدِ اللهِ تَعَالٰى قَبْلَ اَنْ تَقَعَ فِي يَدِ السَّائِلِ: نوٹ: یہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔(ابن کثیر) بیشک صدقہ مانگنے والوں کے ہاتھوں میں جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں جاتا ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

حَكِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ

وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ

يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝

"آپ کہہ دیجئے کہ عمل کرو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان والے اور عنقریب تم اس ذات کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو چھپی ہوئی باتوں اور ظاہر کو جاننے والا ہے تو تمہیں ان اعمال کے بارے میں خبر دیگا جو تم کرتے ہو[105]۔ اور باقی لوگ جو اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے لیے مؤخر کیے گئے ہیں یا ان کو عذاب دے گا اور یا انہیں توبہ کی توفیق دیگا اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے[106]۔ اور وہ لوگ جنہوں نے مسجد کو ضرر دینے کے لیے اور کفر کے وجہ سے بنایا اور ایمان والوں کے درمیان جدائی کے لیے اور ان کے لئے گھات ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے پہلے مخالفت کی ہے اور ضرور یہ لوگ قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا ارادہ اور کچھ نہیں مگر نیکی کرنے کا ہے اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بیشک یہ لوگ جھوٹ بولنے والے ہیں[107]۔ اس مسجد میں کبھی بھی کھڑے نہ ہونا البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے عقیدے کے اخلاص پر رکھی گئی ہے وہ زیادہ لائق ہے کہ آپ اس میں (نماز کے لیے) کھڑے ہو جائیں۔ اس مسجد میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو پاک رکھیں اور اللہ تعالیٰ ایسے پاک لوگوں سے محبت کرتا ہے"[108]

تفسیر 105 اس آیت میں پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اور پھر تمام ایمان والوں کو خطاب ہے۔ (نکتہ) اس آیت میں وَالْمُؤْمِنُوْنَ: مذکور ہے اور آیت 94 میں یہ لفظ مذکور نہیں تھا تو وہاں اس وجہ سے مُؤْمِنُوْنَ: ذکر نہیں ہوا کہ وہ منافقین کے بارے میں تھی جبکہ یہ آیت ایمان والوں کے بارے میں ہے اور ایمان والوں کا عمل باقی مومنوں کے ساتھ شریک ہوتا ہے اور ان کی سامنے ہوتا ہے اور وہ اس عمل سے باخبر رہتے ہیں اور بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ زندوں کے اعمال فوت

شدہ ایمان والے رشتہ داروں پر پیش کئے جاتے ہیں اور اس کے لئے ابو داؤد طیالیسی کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔لیکن اس کی سند میں مجہول راوی ہے چنانچہ اس سے استدلال صحیح نہیں ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ عرض علم کو مستلزم نہیں ہے جیسا کہ: ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ: آیت میں ہے۔

تفسیر 106 یہ تیسری قسم کے صحابہ کرام ہیں یہ تین آدمی تھے کعب بن مالک، ھلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہم یہ لوگ بغیر کسی عذر کے غزوہ تبوک سے رہ گئے تھے اور پھر توبہ میں بھی تاخیر کی تھی جس کی تفصیل بخاری کی حدیث میں آئی ہے۔(کتاب التفسیر حدیث 4677) اس آیت میں ان کا فیصلہ موقوف ہوا اور ان کی توبہ پچاس دن کے بعد قبول ہوئی۔جس کا ذکر آیت 118 میں آیگا: إِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَإِمَّا يَتُوبُ عَلَيْهِمْ :یہ تردید بندوں کے اعتبار سے ہے کہ تم لوگ اس کا انتظار کرو یعنی یا عذاب یا توبہ کا۔

تفسیر 107 اس آیت میں منافقین کے خاص عمل پر وعید ہے جو کہ مسجد ضرار بنانا تھا اور یہ اس وجہ سے ذکر کیا کہ مؤمنین اور منافقین کے درمیان تمیز ہو جائے یہ مسجد ضرار منافقین نے مسجد قباء کے مقابلے میں بنائی تھی ان کو یہ طریقہ ابو عامر راہب نے سکھایا تھا جو کہ مرتد ہوا تھا اور قیصر روم کے ساتھ رابطہ شروع کیا تھا مفسرین نے تفصیلی واقعہ ذکر کیا ہے جب یہ مسجد تیار کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ تبوک کے لیے تیاری کر رہے تھے کہنے لگے ہم نے معذور لوگوں کے لیے ایک مسجد بنائی ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ اس میں پہلی نماز ادا کریں اور برکت کی دعا مانگیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب میں سفر کی تیاری میں مصروف ہوں جب واپس آؤں گا تو پھر تمہاری مسجد میں نماز ادا کرلوں گا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ تبوک کے لیے تشریف لے گئے اور واپس ہوئے تو اللہ تعالی نے یہ وحی بھیج دی اس آیت 107 میں اس مسجد کی چار بری صفات ذکر کی ہیں اور وہ اصل میں مسجد بنانے والوں کی صفات ہیں۔ پہلی صفت: دوسری مسجد کو ضرر دینا ضرار اور ضرر میں یہ فرق ہے: کہ ضرار وہ کام ہے جس میں کچھ فائدہ نہیں ہوتا البتہ آپ کے پڑوسی کو نقصان ہوتا ہے ضرر اس کو کہتے ہے کہ آپ کا اس میں فائدہ ہو لیکن آپ کے پڑوسی کو ضرر ہو۔ دوسری صفت: کفر کی ہے یعنی بنانے والوں نے یہ مسجد کفر کے عقیدے پر بنائی ہے اور تیسری صفت تفریق ہے یعنی اس لیے بنائی کہ ایمان والوں کے درمیان جدائی آجائے اور چوتھی صفت: إِرْصَادً: ہے یعنی جو مشرک اور مبتدع ہوتا ہے تو اس کو پناہ دیتے ہیں نیز بیان کرنے کے لئے یا باقی مکروفریب کے لئے پناہ دیتے ہیں۔ فائدہ 1: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر وہ مسجد بنانا جس میں ان صفات میں سے کوئی

ایک صفت ہو تو وہ مسجد ضرار ہے استطاعت ہو تو اس کو گرانا واجب ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کتاب الاقتضاء میں ذکر کیا ہے کہ جو مسجدیں بزرگوں کی قبروں کے پاس ان کے دفن ہونے کے بعد ان کی تعظیم کی نیت سے بنائی گئی ہیں تو وہ بھی مسجد ضرار کے حکم میں آتی ہیں۔ امام شربینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو مسجد بھی فخر کرنے ریاکاری کرنے یا اللہ تعالیٰ کی رضا کے علاوہ کسی اور مقصد سے بنائی جائے تو وہ بھی مسجد ضرار کے حکم میں داخل ہے۔ (فائدہ ۲) اس سے معلوم ہوا کہ دین کا جو بھی کام فاسد نیت سے کیا جائے تو وہ نفاق کی صفت میں شامل ہے: مِنۡ قَبۡلُ: مسجد بنانے یا غزوہ تبوک سے پہلے: اِلَّا الۡحُسۡنٰی: یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہم نے بوڑھے لوگوں اور معذوروں کے لیے بنائی ہے جو مسجد قباء اور مسجد نبوی تک نہیں پہنچ سکتے۔

تفسیر 108 اس آیت میں مسجد ضرار کا حکم بیان ہوا کہ اس میں نماز پڑھنا منع ہے: لَمَسۡجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقۡوٰی: اس میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد مسجد قباء ہے یا مسجد نبوی۔ اس میں پہلا قول بہتر ہے لیکن یہ حکم عام ہے مِنۡ اَوَّلِ یَوۡمٍ: اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی ہجرت کا وہ پہلا دن ہے جس میں مدینہ منورہ پہنچے اور مسجد قباء کی بنیاد رکھی اور اسی لفظ سے عمر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی تاریخ ایجاد کرنے کا آغاز کیا ہے: رِجَالٌ یُّحِبُّوۡنَ: یہ صحابہ کرام کی صفت ہے۔ اَنۡ یَّتَطَهَّرُوۡا ۡ یَتَطَهَّرُ: سے مراد عام ہے باطنی پاکی یعنی شرک اور گناہوں سے اپنے آپ کو بچانا اور ظاہری پاکی یعنی استنجاء کرنا اور بے وضو ہونے کے بعد جلدی دوسرا وضو کرنا اور وضو کے بعد دو رکعتیں پڑھنا اور جنابت کے بعد جلدی غسل کرنا یہ مختلف روایات سے ثابت ہے۔ (صحیح ابو داؤد کتاب الطہارت حدیث 44 احمد 3/ 422 طبرانی کبیر 348 حاکم 1/ 155 مجمع الزوائد 1/ 212)

اَفَمَنۡ اَسَّسَ بُنۡیَانَهٗ عَلٰی تَقۡوٰی مِنَ اللّٰهِ وَرِضۡوَانٍ خَیۡرٌ اَمۡ مَّنۡ اَسَّسَ بُنۡیَانَهٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانۡهَارَ بِهٖ فِیۡ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾

"کیا وہ شخص جس نے اپنی آبادی کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے ڈر اور اس کی رضا مندی پر رکھی ہے وہ بہتر ہے یا وہ شخص جس نے اپنی آبادی کی بنیاد ایک کھوکھلے کنارے پر رکھی ہے جو گرنے والی ہے تو اس کے ساتھ جہنم کی آگ میں گر جائے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو نیکی کی توفیق نہیں دیتا" [109]۔

تفسیر 109 اس آیت میں ان دو قسم کی مسجدوں میں تقابل اور مسجد ضرار والوں کو خوف دلانا ہے یہ ماقبل آیت کے لیے علت

ہے۔تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ: تقویٰ علت مادیہ ہے اور رضوان علت غائیہ ہے۔ اشارہ ہے کہ ان کی بنیاد مضبوط اور قوی ہے جبکہ مقابل کی بنیاد کمزور ہے۔عَلٰى شَفَا جُرُفٍ: یہ کمزور بنیاد کے لیے مثال کے طور پر ہے اس میں اشارہ ہے کہ مسجد ضرار کی بنیاد کمزور ہے۔لَا يَهْدِي : اس سے مراد اصلاح اور نجات کی ہدایت ہے۔جُرُفٍ : پانی کے گڑھے میں وہ چٹان یا کنویں کی تہہ میں جسے پانی نے کھایا ہو اور وہ اندر سے کھوکھلی ہو گئی ہو۔

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١١٠﴾ إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهِ مِنَ اللّٰهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ ۚ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١١﴾

"یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں (موجب) خلجان رہے گی (اور ان کو متردد رکھے گی مگر یہ کہ ان کے دل پاش پاش ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے [110]۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے ان کے نفسوں کو خریدا ہے اور ان کے مالوں کو اس کے بدلے ان کے لیے جنت ہے اللہ کی راہ میں قتال کریں گے کافروں کو قتل کریں گے اور خود بھی قتل کیے جائیں گے ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے سچا وعدہ کیا ہے جو توراۃ انجیل اور قرآن میں ذکر کیا گیا ہے اور اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ تو اپنی اس تجارت سے خوش ہو جاؤ جو تم نے اللہ سے کی ہے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے" [111]۔

تفسیر 110 جب رسول اللہ ﷺ نے مسجد ضرار کے گرانے کا حکم دیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ گرائی تو اس پر منافقین سخت غصہ ہوئے لیکن مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔بُنْيَانُهُمْ : یہ مصدر مفعول کے معنی میں ہے اور یہاں پر مضاف محذوف ہے یعنی :هَدْمُ بُنْيَانِهِمْ : (ان کی عمارت کو گرانا)۔رِيبَةً : سے مراد غضب اور غیظ ہے یا بنیان سے مراد مسجد ضرار کا نفس آباد کرنا ہے یعنی مصدر اپنے معنی میں اور مضاف محذوف نہیں ہے یعنی جب مسجد ضرار کو آباد کر لیا تو منافقت کی زیادت کا سبب بنا تو رِيبَةً: سے مراد نفاق ہے۔إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ : اس کا معنی : إِلٰى أَنْ ہے اس سے مراد غصے اور منافقت پر موت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد خالص دل کے ساتھ توبہ کرنا ہے۔

تفسیر 111 اس آیت کریمہ میں سخت وعید کے بعد دس تاکیدات کے ساتھ جہاد کی ترغیب ہے: **اِشْتَرٰی**: یہ مثال کے طور پر ہے کہ ایمان والوں کے نفسوں اور مالوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرنا یہ تجارت کی طرح ہے اور جنت اس کے عوض اور قیمت کی طرح ہے: **يُقَاتِلُوْنَ**: یہ **اَنْفُسَهُمْ**: کا بیان ہے جو تجارت ہے تو اس میں اشارہ ہے کہ ایمان والوں کا مال اور جانیں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں تو مؤمنوں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اس کو اللہ کی رضاء کے علاوہ خرچ کریں: **اَنْفُسَهُمْ**: کو اس وجہ سے ذکر کیا کہ بدنی عبادات کی بنسبت زیادہ ہے۔ اس آیت کی طرح سورۃ صف کی آیت 10 بھی ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾ مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِیْنَ وَ لَوْ كَانُوْۤا اُولِیْ قُرْبٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۳﴾

"توبہ کرنے والے عبادت کرنے والے حمد کرنے والے چلنے والے (جہاد کے لیے) رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے (اللہ تعالیٰ کو) نیکی کا حکم کرنے والے اور برائی سے منع کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی حفاظت کرنے والے ایسے ایمان والوں کو خوشخبری دیجئے [112]۔ نبی اور ایمان والوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ مشرکین کے لیے بخشش مانگے اگرچہ ان کے رشتہ دار ہوں اس کے بعد کہ ان پر ظاہر ہوا کہ یہ لوگ جہنمی ہیں" [113]۔

تفسیر 112 اس آیت میں ایمان والوں کی دس صفات ترغیب کے لیے مذکور ہیں اور اس لیے بھی کہ جہاد کی صفت کے ساتھ جنت کے درجات حاصل کرنے کے لیے یہ دس صفات بھی ضروری ہیں یہ صفات ظاہری اور باطنی سب کو شامل ہے: **اَلتَّائِبُوْنَ**: اس سے مراد تمام گناہوں سے توبہ کرنا ہے چاہے شرک ہو یا کفر ہو یا باقی چھوٹے بڑے گناہ ہوں حقوق اللہ یا حقوق العباد میں ہو: **اَلْعَابِدُوْنَ**: اس سے مراد تمام ظاہری بدنی اور مالی قلبی عبادات ہیں: **اَلسَّائِحُوْنَ**: ایک معنی روزہ دار ہے اس لیے کہ روزہ دار آدمی کھانا پینا اور خواہشات چھوڑتا ہے۔ دوسرا معنی مجاہدین، تیسرا معنی مہاجرین اور چوتھا معنی علم کے طلباء، امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علم کے طلبہ کے لیے سیاحت کے بہت سارے فائدے ہیں پہلا یہ کہ بہت سارے مختلف علماء سے ملاقاتیں ہو جاتی ہیں اور مختلف علوم حاصل کر لیتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ اپنے سے بڑے علماء کو دیکھ لینگے تو ان کو اپنا آپ حقیر نظر آئیگا۔ تیسرا فائدہ: یہ کہ تکلیف کے ساتھ سفر کرنے کے عادی بن جائینگے اور: **اَلسَّائِحُوْنَ** کا پانچواں معنی اپنی سوچوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید میں صرف کرنا ہے: **اَلْمَعْرُوْفِ**: سے مراد توحید اور سنت ہے اور: **اَلْمُنْكَرِ**

سے مراد شرک اور بدعت ہے اسی طرح دونوں الفاظ ہر نیکی اور برائی کو شامل ہیں: وَالنَّاهُوْنَ: اس میں واؤ ایک اس وجہ سے ذکر ہوا کہ واؤ جمع کے لیے ہے تو مطلب یہ ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مجموعہ مدح کی صفت ہے صرف ایک کافی نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ واؤ ثمانیہ ہے مطلب یہ ہے کہ عرب کی یہ عادت تھی کہ جب سات چیزوں کو شمار کرتے تو آٹھویں کی ابتدا میں واؤ ذکر کرتے تھے: وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ: اس صفت میں اشارہ ہے کہ ان پہلے کاموں میں اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدود کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ حدود کا لحاظ نہ کرنا بدعت ہے: وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ: اشارہ ہے کہ ماقبل صفات ایمان کے بغیر بشارت کا سبب نہیں بن سکتیں۔

تفسیر 113 جب کمال کی صفات ایمان والوں کے لیے مذکور ہوگئیں تو اس آیت میں مشرکین سے براءت کرنے کا ایک خاص طریقہ ایمان والوں کے لیے ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ نبی اور ایمان والوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لئے بخشش طلب کریں اور جس حدیث میں یہ آیا ہے۔ رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (احمد 20/6 مستدرك حاكم 261/4 مسند ابو يعلى 1399 شرح السنة للبغوى 1239) امام حاکم وذھبی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے اور اسی طرح شیخ البانی نے بھی سلسلة الصحيحة 104) تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس آیت کے نزول سے پہلے تھا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ: اِغْفِرْ: اِهْدِ: کے معنی میں ہے: مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ: اس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ قرآن کریم سے معلوم ہوا ہے کہ مشرک کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ جیسے سورۃ نساء آیت 48 اور 116 میں ہے لہذا یہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائیگا جیسے سورۃ مائدہ آیت 72 میں ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب شرک پر مر جائے تو معلوم ہوا کہ یہ ہمیشہ جہنمی ہے اس توجیہ کی وجہ سے بعد والی موت کے ساتھ خاص ہے لیکن پہلی توجیہ بہتر ہے اس لیے کہ زندہ مشرک کے لیے مغفرت کی دعا منع ہے البتہ ان کے لیے ہدایت کی دعا مانگنا جائز ہے۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ
إِبْرٰهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ۝١١٤ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُم مَّا يَتَّقُونَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ
شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝١١٥ إِنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللّٰهِ مِن وَلِيٍّ وَّلَا
نَصِيرٍ ۝١١٦ لَقَد تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِينَ وَالْأَنصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِن بَعْدِ مَا كَادَ
يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝١١٧ وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا ۖ حَتّٰى إِذَا
ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللّٰهِ إِلَّا إِلَيْهِ ۚ ثُمَّ
تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا ۚ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝١١٨ يٰأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ ۝١١٩

"ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لیے بخشش طلب کرنا ایک وعدے کی وجہ سے تھا جو وعدہ اس نے اپنے (باپ) سے کیا تھا لیکن جب ان پر ظاہر ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو اس سے الگ ہوئے بیشک ابراہیم بہت نرم دل والے اور صبر کرنے والے تھے [114]۔ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ انہیں ہدایت دینے کے بعد گمراہ کرے، یہاں تک کہ ان کو وہ باتیں واضح طور پر بیان کرے جن سے یہ لوگ خود کو بچاتے ہیں بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے [115]۔ اللہ کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست اور مددگار نہیں ہوگا [116]۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے نبی اور مہاجرین اور انصار پر مہربانی کی ہے (آسمانی لانے کی وجہ سے) جنہوں نے تنگی کی حالت میں اس کی تابعداری کی ہے اس کے بعد کہ قریب تھا ان میں سے ایک گروہ کے دل ٹیڑھے ہوجاتے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو مضبوط کیا بیشک وہ ان پر شفقت کرنے والا مہربان ہے [117]۔ (اور توبہ قبول کی) ان تین افراد کی جن کا معاملہ مؤخر کیا گیا تھا یہاں تک کہ جب ان پر زمین تنگ ہوگئی کشادہ ہونے کے باوجود اور ان پر ان کے دل تنگ ہوگئے اور انہوں نے یقین کرلیا کہ اللہ کی طرف سے پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہے مگر اس کے پاس ہے پھر ان کو توبہ کی توفیق دی تاکہ یہ لوگ توبہ کرلیں بیشک اللہ تعالیٰ ہی توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ [118]۔ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہوجاؤ" [119]۔

تفسیر 114 یہ ایک سوال کا جواب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے مشرک باپ کے لیے بخشش کی دعا مانگی ہے جیسے سورۃ ابراہیم

آیت 41 اور سورۃ شعراء آیت 86 میں آیا ہے تو اس کا جواب ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا لہٰذا اس وعدے کو پورا کیا وعدے کا ذکر سورۃ مریم آیت 37 اور سورۃ ممتحنہ آیت 4 میں ہے پھر یہ سوال ہے کہ جب ان کا باپ مشرک تھا تو پھر استغفار کا وعدہ کیوں کیا؟: فَلَمَّا تَبَيَّنَ: اس میں جواب کی طرف اشارہ ہوا جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ وعدہ کرنے کے وقت اس کو یقین نہیں تھا کہ یہ کافر اور مشرک ہے اور جب یقین ہوا تو استغفار مانگنا چھوڑ دیا۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ وعدے کے وقت ان کو وحی نہیں آئی تھی کہ مشرک کے لیے استغفار مانگنا منع ہے تو جب مشرک کے لیے استغفار مانگنے سے منع کیا گیا تو پھر رک گئے یہ توجیہ بہتر ہے: أَوَّاهٌ: امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس کے پندرہ معانی ذکر کئے ہیں سب دل کی نرمی کی طرف راجع ہیں اور یہ اپنے باپ سے استغفار کی دعا کو وعدہ کرنے سے متعلق ہے: حَلِيمٌ: استغفار مانگنے کے ساتھ متعلق ہے۔

تفسیر 115 یہ دوسرے دلائل کا جواب ہے سوال یہ تھا کہ جب مشرک کے لیے استغفار منع تھا تو اس سے پہلے جنہوں نے استغفار طلب کیا تو وہ گنہگار رہوئے؟ اس آیت میں جواب ہوا ہے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جب تک ایک حکم بیان نہ کیا ہو تو اس کی مخالفت کرنے سے مؤمن شخص گمراہ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ جس چیز کا حکم دیا گیا ہو اس کی مخالفت کو معصیت کہا جاتا ہے: لِيُضِلَّ: سے مراد گمراہی کا حکم کرنا یا گمراہی کی سزا دینا ہے۔ فائدہ ۱: اس آیت سے معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ وحی پر مبنی ہیں۔ فائدہ ۲: اسی طرح شرعی حکم کے آنے سے پہلے کسی پر گناہگار ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

تفسیر 116 اسی طرح یہ پہلی آیت کے لیے علت ہے کہ قانون بیان کرنا اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے اس لیے کہ بادشاہی اللہ کے لیے ہے۔ اس آیت میں ردِ شرک فی التصرف کے ساتھ توحید کا دعویٰ ہے: يُحْيِي وَيُمِيتُ: اس سے حقیقی زندگی اور موت مراد ہے البتہ اس سے اشارۃً ہدایت اور گمراہی مراد لینا جائز ہے۔

تفسیر 117 اس آیت کریمہ میں ایمان والوں کو توبہ کی قبولیت کی خوشخبری ہے اور غزوہ تبوک میں تکلیفوں کی طرف اشارہ ہے کہ سخت گرمی تھی سفر طویل تھا اور سواریوں پر بھی باری باری جانا تھا اور ان کے پاس زادِ راہ پرانی کھجوریں تھیں پھر اس آیت میں توبہ سے مراد پہلے: تَابَ: میں تخفیف اور آسانی لانا اور دوسرے: تَابَ: میں دلوں کو مضبوط کرنا ہے اس میں اشارہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم توبہ کا محتاج ہے البتہ اس کی توبہ گناہ سے نہیں بلکہ آسانی لانا ہے: يَزِيغُ: زیغ سے مراد جہاد چھوڑنا

ہے ارتداد مراد نہیں ہے۔ فائدہ: جصاص نے کہا ہے کہ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدح ہے جن کا ظاہر باطن کے موافق تھا اور طعن کرنے والوں (روافض) کا رد ہے۔

تفسیر 118 اس آیت میں ان تین افراد کی توبہ کی قبولیت کی طرف اشارہ ہے جو آیت 106 میں مذکور ہیں۔ کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4677) کہ اس سے مراد ان کے حکم کا مؤخر ہونا مراد ہے جہاد سے پیچھے رہنا مراد نہیں ہے اس لیے کہ وہ منافقوں کی صفت ہے: ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ: یہ اس وجہ سے کہ ان سے صحابہ کرام نے معاملات چھوڑ دیے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی وجہ سے ان سے بات چیت نہیں کرتے تھے: وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ: یہ اس وجہ سے کہ جب ان کے ساتھی ان کے سامنے ہوتے تو ان سے سخت کلام کرتے۔ دوسرا یہ کہ ان پر ان کے دل بہت متفکر اور مغموم ہوئے تھے ابو بکر وراق سے روایت ہے کہ توبہ نصوح کی علامت یہ ہے کہ گناہ کی وجہ سے انسان پر اس طرح کی حالت آجاتی ہے: حَتّٰۤى اِذَا: یہ خُلِّفُوْا: کے لیے غایہ ہے اور ثُمَّ تَابَ اِذَا ضَاقَتْ: پر عطف ہے۔

تفسیر 119 یہ جہاد کی ترغیب ہے اور جہاد سے پیچھے رہنے والوں کے ذکر کے بعد جہاد سے پیچھے رہنے کی ممانعت اور مجاہدین اور سچے لوگوں کا ساتھ دینے کی طرف ترغیب ہے اس آیت میں دو حکم ہیں پہلے میں تقویٰ کے ذریعے نفس کی انفرادی اور دوسرے میں اجتماعی اصلاح مراد ہے یعنی سچوں کا ساتھ دینا۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ
عَنْ نَفْسِهِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ
الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا
يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا
يَعْمَلُونَ ﴿١٢١﴾ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي
الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿١٢٢﴾

"مدینے والوں کے لیے مناسب نہیں ہے اور جو دیہاتیوں میں سے ان کے آس پاس ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پیچھے رہ جائیں اور نہ اپنی جانوں کو آپ ﷺ کی جان سے زیادہ عزیز رکھیں یہ اس وجہ سے ہے کہ انہیں کوئی پیاس، تھکاوٹ اور اللہ کے راستے میں کوئی بھوک پہنچتی ہے یا یہ لوگ کسی راستے میں چلتے ہیں جس سے کافروں کو غصہ آئے یا دشمن سے کوئی چیز حاصل کریں ان سب کے بدلے میں ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے بیشک اللہ تعالی اچھے عمل کرنے والوں کا اجر ضائع (برباد) نہیں کرتا [120]۔ اور یہ لوگ کچھ خرچ نہیں کرتے ہیں کم یا زیادہ اور نہ یہ لوگ ایک وادی طے کرتے ہیں مگر ان کے لیے لکھے جاتے ہیں تا کہ ان کو اللہ تعالی ان کے اعمال کا اچھا بدلہ دے [121]۔ اور مناسب نہیں ہے کہ ایمان والے (جہاد یا علم کے لیے) سب ایک ساتھ نکل جائیں پس ان میں سے ہر گروہ سے کچھ افراد کیوں نہیں نکلتے ہیں تا کہ دین میں سمجھ حاصل کریں اور تا کہ اپنی قوم کو ڈرائیں۔ (اس علم کے ذریعے سے) جب ان کے (قوم) کے پاس واپس لوٹ جائیں تا کہ یہ (قوم) اپنے آپ کو (گناہوں سے) بچائے" [122]۔

تفسیر 120 اس آیت میں جہاد کی ترغیب ہے ایک تو اس طریقے سے کہ رسول اللہ ﷺ جہاد کرتے ہیں اور اپنے نفس پر تکالیف برداشت کرتے ہیں تو تم اس طرح کیوں نہیں کرتے؟ اور اپنے آپ کو تکلیف کیوں نہیں دیتے؟ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جہاد میں ہر تکلیف برداشت کرنا ثواب کا سبب ہے: وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا: مطلب یہ ہے کہ جب ایمان والے مجاہدین زمین پر چلتے ہیں اور کافر ان کو دیکھ کر غصہ ہوتے ہیں تو یہ بھی ثواب ہے: وَلَا يَنَالُونَ: اس سے مراد یہ ہے کہ کافروں کو قتل کرنا یا ان کو شکست دینا یا ان سے مال غنیمت حاصل کرنا یہ تمام ثواب کے کام ہیں: أَنْ يَتَخَلَّفُوا: اس کے حکم

سے یا اس کی دوستی میں جہاد کرنے سے مخالفت کرنا۔ بِأَنْفُسِهِمْ : یعنی نبی کریم ﷺ جہاد میں بہت سارے تکالیف اور بدنی مصائب برداشت کرتے ہیں تو تم تو اس سے بہتر نہیں ہو تم بھی جہاد کے مصائب برداشت کرو۔ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ : یعنی یہ تکلیفیں بذات خود عبادات نہیں ہیں لیکن فی سبیل اللہ کی وجہ سے اس کے ساتھ نیک عمل کا اجر لکھا جاتا ہے۔ الْمُحْسِنِيْنَ : توحید اور سنت کی طرف اشارہ ہے یعنی ثواب کا اصل سبب احسان ہے۔

تفسیر 121 اس آیت میں بھی مجاہد کے باقی اعمال مذکور ہیں جن کی وجہ سے اس کو ثواب حاصل ہوتا ہے اور یہ اعمال بذات خود عبادات ہیں اسی وجہ سے ان کے ساتھ : عَمَلٌ صَالِحٌ : ذکر نہیں کیا ہے اور پہلے والے بذات خود نیک اعمال نہیں تھے لیکن جہاد کی وجہ سے ان پر نیک عمل کا اجر دیا جاتا ہے جبکہ اسی وجہ سے اس آیت میں : مُحْسِنِيْنَ : ذکر کیا ہے یعنی یہی اعمال احسان کی وجہ سے صالح قرار دیئے جاتے ہیں اس میں : أَحْسَنَ : ذکر کیا۔ اشارہ ہے کہ یہ اعمال بذات خود اچھے ہیں : وَلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا : اس سے مراد جہاد کا سفر کرنا ہے : وَادِيْ : اصل میں وہ کشادہ جگہ ہے جو پہاڑوں اور ٹیلوں کے درمیان ہوتی ہے وہ درہ بھی ہے اور میدان بھی ہے چنانچہ وادی کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔

تفسیر 122 اس آیت میں دین کے علم کی طرف ترغیب ہے جہاد کی تکمیل کے لیے یعنی جہاد کے لیے پہلے دین کا علم سیکھنا ضروری ہے آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ علاقے کے تمام لوگ جہاد کے لیے مت نکلو (جب جہاد فرض کفایہ ہو) بلکہ بعض افراد جہاد کے لیے نکلو اور بعض خود کو دین کے علم کے لیے وقف کر دو تو یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ دین کا تمام علم فرض کفایہ ہے البتہ جن احکام کا علم فرض عین ہو وہ فرض عین ہے۔ فائدہ: آیت میں توجیہات ہیں پہلی توجیہ یہ کہ : لِيَنْفِرُوْا : سے مراد جہاد کے لیے نکلنا ہے اس لیے کہ پہلی آیتوں میں جہاد کی ترغیب مذکور ہوئی ہے : طَائِفَةٌ : اس سے مراد مجاہدین کی جماعت ہے اور : لِيَتَفَقَّهُوْا : میں ضمیر اس جماعت کی طرف راجع ہے اس شرط کے ساتھ کہ نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ ہوں اور ان سے علم سیکھیں یا فِرْقَةٍ : کی طرف راجع ہے یعنی جہاد سے پیچھے رہنے والے دین کا علم سیکھیں۔ یہ نبی کے زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ : يَنْفِرُوْا : سے مراد علم کو طلب کرنے کے لیے نکلنا ہے اور : طَائِفَةٌ : سے مراد علم کے طلبگار ہیں : لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ : دین سے مراد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے اور تفقہ سے مراد ایسا علم ہے کہ احکام کا استنباط کیا جائے حدیث میں آیا ہے۔ مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ۔ (صحیح بخاری کتاب العلم حدیث 71، صحیح مسلم حدیث 98) : وَلِيُنْذِرُوْا : انذار سے مراد قرآن وسنت کی تبلیغ ہے لہذا کتاب وسنت ماننے اور

اس پر عمل کرنے سے تقلید لازم نہیں آتی اس لیے کہ یہ علم دلائل کے ساتھ ہے جبکہ تقلید بغیر دلیل کے بات ماننے کو کہتے ہیں۔

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

" ایمان والوان لوگوں کے ساتھ لڑو جو کافروں میں سے تمہارے قریب ہیں اور وہ تم میں سختی پائیں اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالی متقین کا دوست ہے [123]۔ اور جب کوئی آیت نازل کی جاتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ کہتے ہیں تم میں سے کہ اس سورت نے کس کے ایمان میں اضافہ کیا تو جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں اضافہ کرتی ہے اور وہ سورت کے نزول پر خوش ہوتے ہیں" [124]۔

تفسیر 123 اس آیت میں بھی قتال کا حکم ہے اور جہاد کے طریقے کی تعلیم ہے کہ قریب سے شروع کیا جائے : غِلْظَةً (پختگی) غیرت کے معنی میں ہے۔ فائدہ: ان دونوں آیتوں میں ترتیب سے ایمان والوں کی تین ذمہ داریاں مذکور ہوئی ہیں پہلے دین کا علم دوسری دعوت اور تیسری قتال فی سبیل اللہ۔

تفسیر 124 جب اس مقام تک اس سورۃ کے تفصیلی احکام مذکور ہوئے اور خصوصاً جہاد کا مسئلہ مذکور ہوا تو اس آیت میں منافقین کا رد اور ان کے لئے وعید ہے جب یہ سورۃ نازل ہوئی جس میں جہاد کا مسئلہ تھا تو منافقین نے اعتراض کیا کہ اس کے نزول کا کیا فائدہ ہے؟ تو جواب ہوا کہ اس کے ذریعے ایمان والوں کا ایمان بڑھتا ہے اس لیے کہ وہ اس پر عمل کرتے ہیں فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا : مجاہد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ یہ آیت دلیل ہے کہ ایمان زیادت قبول کرتا ہے یعنی ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اگر نفس تصدیق اور یقین کے درجے میں ہو یا اعمال کے ساتھ اضافہ ہو۔

وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿١٢٥﴾ أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ
عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾ وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ هَلْ يَرَاكُم
مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ انصَرَفُوا ۚ صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُم بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ﴿١٢٧﴾ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا
عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٨﴾

"اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری (نفاق) ہے یہ (سورۃ) ان کی ناپاکی میں اضافہ کرتی ہے ان کی ناپاکی کے ساتھ اور یہ لوگ کفر کی حالت میں مرتے ہیں [125]۔ کیا وہ لوگ نہیں سوچتے کہ ان پر ہر سال ایک یا دو مرتبہ امتحان آتے ہیں پھر یہ لوگ توبہ نہیں کرتے اور نہ یہ لوگ نصیحت قبول کرتے ہیں۔ [126]۔ اور جب ایک سورۃ نازل کی جائے (جس میں منافقین کے عیب کا ذکر ہو) تو ان کے بعض بعضوں کو دیکھتے ہیں یہ لوگ نصیحت قبول نہیں کرتے اور آنکھوں کے اشاروں سے ایک دوسرے سے کہتے ہیں کیا تمہیں کوئی دیکھ رہا ہے پھر (مجلس سے) پھر جاتے ہیں ان کے دلوں کو اللہ تعالیٰ (حق سے) پھیرتا ہے اس وجہ سے کہ یہ ایسی قوم ہے کہ نہیں جانتی [127]۔ تمہارے پاس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آیا ہے جو تمہاری جنس سے ہے اس پر وہ کام گراں گزرتا ہے جس سے تم تکلیف پاتے ہو۔ تمہاری ہدایت پر حریص ہے اور ایمان والوں کے ساتھ خاص کر بہت محبت کرنے والا رحم کرنے والا ہے" [128]۔

تفسیر 125 اس آیت میں منافقین کے حال کا بیان ہے کہ قتال کا حکم جب نازل ہو تو منافقین اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کو اپنانے میں سستی کرتے ہیں تو ان کی ناپاکی بڑھ جاتی ہے۔ اس زیادت کا ذکر سورۃ مائدہ 48، 64 اور سورۃ اسراء آیت 82 میں بھی ہے۔ منافقت کی ناپاکی اس سورۃ کی آیت 95 میں ہے۔

تفسیر 126 اس آیت میں منافقین کو وعید ہے کہ ان پر جہاد کی فرضیت کی وجہ سے ہر سال امتحان آتا ہے ایک یا دو مرتبہ لیکن یہ لوگ منافقت سے توبہ نہیں کرتے ہیں۔ توبہ: مَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ: کی علت ہے۔ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ: یعنی ہر سال میں غزوات ایک یا دو مرتبہ ہوتے ہیں: يَذَّكَّرُونَ: توبہ کا تعلق افتتان سے ہے اور: يَذَّكَّرُ: قرآن سننے سے تعلق رکھتا ہے۔

تفسیر 127 اس آیت میں بھی منافقین کے حال کا بیان ہے کہ جب جہاد کی سورت بیان ہوتی ہے اور اس میں منافقین کی بری صفات کا تذکرہ ہوتا ہے جیسے یہ سورت ہے تو یہ لوگ مجلس سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں: هَلْ يَرَاكُمْ یہاں:

يُشِيرُوْنَ: پوشیدہ ہے یعنی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ یہ صحابہ کرام ہمیں دیکھ رہے ہیں کہ نہیں لیکن صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کی مجلس میں سر جھکائے ہوئے ہوتے تھے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں منافقین کا خیال ہوتا کہ یہ لوگ ہمیں نہیں دیکھ رہے ہے: ثُمَّ: سے پہلے: انْصَرَفُوْا: پوشیدہ ہے: لَا يَفْقَهُوْنَ: ان کی یہ صفت 81 اور 87 میں گزر چکی ہے: صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ: یہ منافقین کے حالات بیان کرنے کے بعد ان کے لیے بددعا ہے یا یہ جملہ خبریہ ہے۔

تفسیر 128 اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا بیان اور نبی کریم ﷺ کی چھ صفات کا ذکر ہے پہلی صفت رَسُوْلٌ: یہ بشریت کی صفات میں اعلیٰ صفت ہے اور اشارہ ہے کہ یہ اپنی طرف سے باتیں نہیں بناتا لہٰذا اس کی اتباع فرض ہے۔ دوسری مِنْ اَنْفُسِكُمْ: یعنی تمہاری جنس سے ہے عربی ہے اور بشر ہے اس میں آپ کی نسب کی شرافت کی طرف اور آپ ﷺ سے حصول علم کی آسانی کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ ایک بشر دوسرے سے استفادہ کرسکتا ہے۔ اس لئے کہ ہم جنس سے فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ دوسری عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ: یعنی تمہیں کوئی چیز تکلیف دیتی ہے تو اس کا دکھ اور تکلیف وہ محسوس کرتا ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے طریقہ میں امت کے لئے آسانی ہے۔ چوتھی حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ: مطلب یہ ہے کہ وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ تم ایمان والے بن جاؤ اور جنت میں داخل ہوجاؤ۔ پانچویں رَءُوْفٌ: ایمان والوں پر بہت شفقت کرتا ہے اور تمہاری حفاظت کے لیے دعائیں مانگتا ہے۔ چھٹی رَحِيْمٌ: مؤمنوں پر رحم کرنے والا ان دونوں میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ آخرت میں ایمان والوں کے لیے شفاعت کریں گے اور دنیا میں بھی آپ ﷺ کی رحمت اور شفقت کے بہت سارے واقعات موجود ہیں۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾

"پس اگر یہ لوگ منہ پھیر لیں تو آپ کہہ دیجئے میرے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے اس کے علاوہ کوئی مددگار نہیں ہے میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور وہ بڑے عرش کا مالک ہے" [129]۔

تفسیر 129 اس آیت کی چار جملوں میں توحید کے مسئلے کا بیان ہے پہلا جملہ منکرین کے مقابلے میں کہا جاتا ہے یہاں کافروں کی تمام اقسام اور منافقین کے خباثت کے مقابلے میں مذکور ہے۔ دوسرا جملہ پہلے کے لیے علت ہے۔ تیسرا پہلے دونوں جملوں پر تفریع ہے اور چوتھا ماقبل کے لیے علت ہے عرش کی ربوبیت تمام عالم کی ربوبیت کو مستلزم ہے۔ ابوداؤد کی

روایت میں ہے کہ جس نے صبح اور شام یہ کلمات سات سات مرتبہ پڑھ لیے تو اللہ تعالیٰ اس کے غم دور کریگا یہ روایت مرفوعاً ضعیف ہے۔ حسن سند کے ساتھ موقوف ہے۔

سورۃ توبہ کی خصوصیات:

۱۔ شرک اور مشرکین سے برأت کا اعلان۔

۲۔ مشرکین کے اقسام کا تذکرہ۔

۳۔ مشرکین سے قتال کے کثیر وجوہات۔

۴۔ منافقین کے برے عادات جو کہ کثرت سے اس سورۃ میں ذکر ہے۔

۵۔ اہل کتاب سے قتال کے وجوہات جو کہ ان کے عادات شنیعہ ہے۔

۶۔ مشرکین کی ایک بدعت پر رد یعنی اپنی طرف سے اوقات کو حلت وحرمت میں تبدیل کرنا۔

۷۔ واجبی زکاۃ کے حقداروں کا تذکرہ۔

۸۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے اوصاف جمیلہ اور ان کے لئے خاص خوشخبریوں کا ذکر۔

۹۔ مسجد ضرار کا تذکرہ اور اس کا حکم۔

۱۰۔ مشرکین اور منافقین کیلئے استغفار بے سود ہے۔

الحمدللہ سورۃ توبہ کی تفسیر اور پہلی جلد کا تیسرا حصہ مکمل ہوا

ایاتها ۱۰۹ ۱۰ سورۃ یونس مکیۃ ۵۱ رکوعاتها ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خاص اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ ①

"اللہ تعالیٰ ہی اس کے معنی جانتا ہے۔ یہ ایسی کتاب کی آیتیں ہیں جو حکمتوں والی ہے" [1]۔

ربط: اس سورت کا پچھلی سورت کے ساتھ تعلق یہ ہے کہ سابقہ سورتوں یعنی سورۃ الانفال اور سورۃ التوبۃ میں مشرکین سے اعلان جنگ تھا تو اس سورت میں ان کے شرک کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کے ساتھ جنگ وقتال کا سبب یہ عقیدہ ہے نیز یہ سورت اس سوال کا جواب ہے کہ اگر وہ کہہ دیں کہ ہمارے ساتھ کس وجہ سے قتال کرتے ہو؟ ہم تو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں تو اس سورت میں اس کا جواب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ عقیدہ شفاعت قہریہ کی صورت میں شرک اور کفر کرتے ہو، اسی طرح جب سورت توبہ میں مشرکین اور اہل کتاب کا شرک اور منافقین کے نفاق کا ذکر کیا گیا تو اس سورۃ میں ان سب کو دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید، رسول کی رسالت اور آخرت پر ایمان لے آؤ۔ سورت کا دعویٰ: شفاعت قہریہ شرکیہ کا رد آیت 3 تا 18 میں ہے نیز یہ رد مختلف وجوہات اور مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے۔ (۱) عقلی دلائل سے (۲) شرک کی مختلف اقسام ذکر کرنے سے (۳) متعدد وعیدیں ذکر کرنے سے (۴) مشرکین کی برائیاں بیان کرنے سے (۵) دلائل نقلیہ بیان کرنے سے (۶) مشرکین کا اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا اقرار اور پریشانی اور سختی میں اللہ تعالیٰ ہی کو مدد کیلئے پکارنا اور پھر اس پریشانی سے چھٹکارہ اور خلاصی ملتے پھر سے شرک کرنا۔ سورۃ کا خلاصہ: اس سورت میں پانچ ابواب ہیں پہلا باب آیت 17 تک ہے اس میں کتاب اللہ کی طرف ترغیب دی گئی ہے اور مختلف طریقوں سے چھ بار دعید بیان کی گئی ہے، نیز تین عقلی دلائل ہیں۔ اطاعت کرنے والوں کیلئے خوشخبری ہے اور منکرین کیلئے دنیا و آخرت کے عذاب کی وعید ہے۔

تفسیر 1 پہلی آیت میں قرآن کریم کی طرف ترغیب دی گئی ہے؛ حَكِیْمِ: کے تین معانی ہیں: (۱) حکمتوں والا (۲) حاکم فیصلہ کرنے والا (۳) محکم مضبوط اور قوی حکم دینے والا۔ اور لفظ حَكِیْمِ: میں اشارہ ہے کہ اس سورت میں عقلی دلائل

بیان ہونگے جو کہ حکمت ہے۔

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ ۗ قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ مُّبِينٌ ۝

"کیا ان لوگوں کیلئے اس بات میں تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کی طرف وحی بھیجی یہ کہ منکرین لوگوں کو ڈراؤ اور ایمان والوں کو ان کے رب کے پاس بلند مرتبوں کی خوشخبری دو کافروں نے کہا کہ یہ شخص کھلا جادوگر ہے"[2].

تفسیر 2 اس آیت میں منکرین کیلئے وعید ہے جنہوں نے آپ ﷺ کے آدمی ہونے یعنی بشریت کا بہانہ بنا کر آپ کی رسالت کا انکار کیا۔ یہ آیت دلیل ہے کہ نبی ﷺ بشر تھے یعنی انسانوں کی جنس سے تھے نیز اس آیت میں ایک نبی کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں وہ ذمہ داریاں یہ ہیں: (۱) ڈرانا (۲) خوشخبری دینا: قَدَمَ صِدْقٍ: اس کا ایک معنی بلند مرتبہ ہے دوسرا معنی اپنی زندگی میں کئے ہوئے نیک صالح اعمال کا بہترین اجر ہے اور قدم سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ نیک اعمال کیلئے قدم استعمال ہوتے ہیں پھر ان کو وعید سنائی گئی ہے۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۖ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۖ مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝

"یقیناً تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے پھر وہ (اپنی شان کے مناسب) عرش پر مستوی ہوا۔ وہ تمام امور کا انتظام کرتا ہے اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے پاس سفارش نہیں کرسکتا۔ ان صفتوں والا اللہ تعالیٰ تمہارا رب ہے لہٰذا تم اس کی بندگی کرو کیا تم پھر بھی نصیحت نہیں پکڑتے۔"[3].

تفسیر 3 اس آیت میں وحی کا بیان ہے۔ جو أَنْ أَوْحَيْنَا: میں ذکر ہوا، اور توحید پر عقلی دلیل ہے نیز مشرکین کے عقیدہ شفاعت قہریہ کا رد ہے۔ اور (فَاعْبُدُوهُ) میں اس کی تشریح و تفریع ہے: إِنَّ رَبَّكُمُ: اس میں توحید اور ربوبیت کا ثبوت ہے یہاں پر رَبّ: کا معنی "حاجت روا" بندگی کا حقدار" ہے: اللَّهُ الَّذِي: اس میں تین صفات کے ساتھ معرفت الٰہی کا ذکر ہے: (۱) خالق (۲) عرش پر مستوی ہونا (۳) تدبیر کرنے والا۔ سورت اعراف میں: سِتَّةِ أَيَّامٍ: اور: اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ: کی تفسیر گزر گئی ہے: الْأَمْرَ: اس میں الف لام برائے استغراق ہے یعنی تمام تصرفات و انتظامات اس کے

قبضہ اور قدرت میں ہے۔ کسی قطب، غوث وغیرہ کو کچھ نہیں سونپا جیسا کہ مشرکین کا خیال اور عقیدہ ہے۔ مَا مِنْ شَفِيْعٍ: یہ ان مشرکین کے عقیدے کا رد ہے جن کا کہنا ہے کہ ہمارے معبود خالق مدبر نہیں البتہ وہ تو ہمارے لیے سفارشی ہیں۔ فَاعْبُدُوْهُ: اس میں شرک فی العبادت کا رد کیا گیا ہے۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَھُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ④

"تم سب نے اسی کے پاس جانا ہے اللہ تعالیٰ نے سچا وعدہ کر رکھا ہے۔ یقیناً اسی نے پیدا کیا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کریگا۔ تاکہ ایسے لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے انصاف کے ساتھ بدلہ دے اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے کفر کی وجہ سے ان کو کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ [4]۔

تفسیر 4 توحید باری تعالیٰ ذکر کرنے کے بعد اس آیت کے تین جملوں میں اثبات آخرت ہے۔ پھر ایمان والوں کے لئے خوشخبری اور کافروں کیلئے وعید ہے اور یہ آیت اَنْذِرْ وَ بَشِّرْ: کی تشریح اور وضاحت ہے۔ لِيَجْزِيَ: اس میں لام: مَرْجِعُكُمْ یا يُعِيْدُهٗ: سے متعلق ہے اور یہ بعث بعد الموت کا حکم ہے۔ بِالْقِسْطِ: یہ لِيَجْزِيَ: سے متعلق ہے اور قسط اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ یعنی ایمان والوں کو بدلہ اور انصاف عدل سے دے گا یا پھر قسط ایمان والوں کی صفت ہے۔ یہ ان کے نیک اعمال اور توحید کے سبب جزا ہے لہٰذا (با) سببیہ ہے: مِنْ حَمِيْمٍ: مِنْ میں عذاب کی ایک قسم کی طرف اشارہ ہے اور اس (مشروب) کے علاوہ بھی عذاب کے دیگر مشروبات ہونگے: بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ: یہ دوسرے معنی کے اعتبار سے: بِالْقِسْطِ: کے مقابل ہے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاۗءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ⑤

"وہ اللہ تعالیٰ ایسی ذات ہے کہ اسی نے سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو روشن بنایا اور ان کے لئے منزلیں مقرر کی ہیں تا کہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لو ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے نہیں پیدا کیا مگر اظہار حق کیلئے وہ ذات تفصیلی دلائل اس قوم کے لئے بیان کر رہی ہے جو جانتی ہے۔" [5]۔

تفسیر 5 یہ توحید کیلئے دوسری دلیل عقلی ہے۔ روشنی ایک عرض (کیفیت) خاص کو کہا جاتا ہے جس کو نور کہا جاتا ہے اور جب یہ

کیفیت کامل ہوتو ضیاء کہلا تا ہے: وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ: اس سے چاند وسورج کی منزلیں مراد ہیں یا پھر صرف چاند کی منازل مراد ہیں۔ سورۃ یس کی آیت 39 سے دوسرے قول کی تائید ہوتی ہے۔ چاند کی ان منزلوں سے دنوں اور شرعی مہینوں کا تعین معلوم ہوتا ہے اور یہ کل 28 ہیں اور منزلوں سے مراد طلوع ہونے اور غروب ہونے کی جگہیں ہیں: عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ: یعنی سال کی ابتداء اور انتہاء اور دنوں اور مہینوں کا حساب مراد ہے: مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ: حق سے علم وقدرت الٰہی کے دلائل اور مسئلہ توحید ثابت کرنا مراد ہے۔ (تفسیر خازن رحمہ اللہ) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث لولاک جو کہ ضعیف روایت ہے (احمد ج 1 ص 355 دارمی 306/4۔ قال شیخ البانی رحمہ اللہ لا اصل لہ شیء فی کتب المحدثین۔ التوسل وانواعہ الاحادیث الموضوعۃ للشوکانی 116) اور عوام الناس کی زبانوں پر جاری ہے وہ معناً بھی درست نہیں جس طرح محدثین نے اس کے الفاظ رد کئے ہیں۔ (الفوائد المجموعہ ص 326 کشف الخفاء ص 164) دونوں نے صنعانی سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت من گھڑت ہے ہیں اگر یہ معنی کیا جائے کہ نبی کا ارسال نہیں ہے مگر مسئلہ توحید کے اظہار کیلئے تو پھر معنوی کچھ مطابقت بنتی ہے مگر یہ توجیہہ بہت بعید ہے۔

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝

"یقیناً دن اور رات کی گردش میں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے اس قوم کے لئے بہت دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتی ہے" [6]۔

تفسیر 6 اس آیت میں تیسری عقلی دلیل ہے: اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: یعنی ایک دوسرے کے بعد آنا اور رنگوں کا بدلنا اور کم ہونا بڑھ جانا: لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ: اس سے مراد اہل توحید ہیں کیونکہ اہل شرک مذکورہ مخلوق سے دلیل نہیں لیتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝

"جولوگ ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں رکھتے اور دنیوی زندگی پر راضی اور اس میں دل لگا بیٹھے اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں سے غافل ہیں" [7]۔

تفسیر 7 اس آیت میں منکرین کیلئے وعید اور ان کی چار صفتوں کا ذکر ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا: رجاء کا معنی خوف، امید اور عقیدہ کے ہیں۔ یہاں پر آخری معنی مراد ہے: وَرَضُوْا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا: یعنی دنیا کی زندگی پر خوش اور

راضی ہیں لہٰذا جو بھی عمل کرتے ہیں وہ دنیا کیلئے کرتے ہیں: وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا: دنیا پر تو اطمینان حاصل نہیں ہوتا ہے تو مراد خوش ہونا ہے اور دنیا کی محبت کو دلوں میں راسخ کرنا مراد ہے: غٰفِلُوْنَ: غفلت سے جہالت اور سادگی مراد نہیں ہے بلکہ اعراض اور بے پرواہ ہونا مراد ہے۔ اور آیت سے دلائل توحید یا قرآن مجید مراد ہے۔

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝

"یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا آگ ہے ان اعمال کی وجہ سے جو وہ کر رہے تھے۔[8] "یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے تو ان کا رب ان کے ایمان کے سبب ان کو جنت میں پہنچا دے گا اور ان کے محلات کے نیچے سے نہریں جاری ہونگی نعمتوں والی جنت میں رہیں گے"[9]۔

تفسیر 9,8 اس آیت میں ماننے والوں کیلئے خوشخبری ہے: يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ: ایک معنی یہ ہے کہ ان کے ایمان کی وجہ سے ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ان کو انکا رب ایمان کی وجہ سے جنت میں لے جائے گا۔ پہلے معنی کے اعتبار سے ہدایت سے مراد اعمال صالحہ کی توفیق ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے جنت تک رسائی ہے: مِنْ تَحْتِهِمْ: سے بنگلوں اور محلات کے نیچے نہروں کا بہنا مراد ہے۔

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"ان کی پکار جنت میں سبحان اللہ کے کلمات ہوں گے اور آپس میں انکا سلام السلام علیکم ہوگا اور ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے"[10]۔

تفسیر 10 یہ بھی مذکورہ بشارت میں داخل ہے مطلب یہ ہے کہ جنت کی نعمتوں کے طلب کیلئے: سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ: کے الفاظ ذکر کرینگے اور نعمت کھا لینے، پینے پر: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ: پڑھیں گے یا پھر مراد یہ ہے کہ ہر وقت انکا کلام: سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ: سے شروع ہوگا اور: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ: پر ختم ہوگا: وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ: ایک معنی یہ ہے کہ ابتداء ملاقات سلام سے کرینگے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ آپس میں یا ملائکہ کی جانب سے ان کو عذاب سے بچنے کی اور سلامتی کی بشارت و مبارک باد دی جائیگی۔ لہٰذا پہلے معنی کے اعتبار سے سلام اپنے مشہور معنی میں ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے مبارک باد، سلامتی کے معنی میں ہے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١١﴾

"اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر نقصان جلدی واقع کرتا جیسے وہ خیر کو جلدی مانگتے ہیں تو کب کا ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ لہٰذا جو لوگ ہمارے پاس آنے کا عقیدہ نہیں رکھتے ان کے حال پر ہم ان کو چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے سرکشی میں بھٹکتے رہیں" [11]۔

تفسیر 11 اس آیت کا تعلق آیت 2 سے ہے یعنی جو لوگ اس رسول کی رسالت میں تعجب کرتے ہیں اور اپنے لئے عذاب طلب کرتے ہیں جیسا کہ سورۃ انفال آیت 32 میں ہے مراد اس سے یہ ہے کہ بد دعا کو اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا نیز اس آیت کا تعلق رب العالمین سے بھی ہے یعنی ربوبیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انکی دعاء جلدی قبول نہیں کرتا اور اس میں منکرین کیلئے وعید ہے مطلب یہ ہے کہ کبھی وہ اپنے لیے خیر طلب کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول فرماتا ہے اور کبھی وہ اپنے لئے عذاب مانگتے ہیں لیکن اللہ ان کی بد دعائیں جلدی قبول نہیں فرماتا۔ اگر جلد قبول فرماتا تو کب سے ان کو ہلاک کر دیتا امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ انسان بعض اوقات غصہ وجلال میں آ کر اپنے آپ اور اہل وعیال کو بد دعاء دینے لگتا ہے اور ہلاکت وموت چاہتا ہے جیسا کہ عام اوقات میں روزی کی فراوانی صحت وغیرہ دعاء میں طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ خیر کی دعاؤں کو تو قبول فرماتا ہے جبکہ بد دعاء رد کرتا ہے اگر ان بد دعاؤں کو بھی دعاء کی طرح قبول فرماتے تو یہ لوگ جلد ہلاک ہو جاتے لہٰذا انسان کو چاہیے کہ اولاد کیلئے بد دعاء سے گریز کرے ایسا نہ ہو کہ قبولیت دعاء کے وقت اس کی دعا قبول ہو جائے اور پھر یہ نادم ہو حدیث میں بھی اس سے منع آیا ہے۔ (صحیح مسلم فی آخر کتابہ حدیث 3009، ابو داؤد حدیث 1532) فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا: یعنی جب فوری ان کو ہلاک نہیں کرتا تو ان کو مہلت دیتا ہے فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ: اس سے کفر، شرک اور دیگر گناہ مراد ہیں جسکی تفسیر سورت بقرہ میں گزر چکی ہے۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ

ضُرٍّ مَسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢﴾

"اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو کروٹ کے بل اور بیٹھے بھی اور کھڑے بھی پکارتا ہے پھر جب ہم اس سے تکلیف ہٹا دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے اپنی تکلیف کیلئے جو اسکو پہنچی تھی ہم کو پکارا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح حد سے گزرنے والوں کیلئے ان کے اعمال خوشنما بنا دیے گئے ہیں" [12]۔

تفسیر 12 گزشتہ آیت میں عذاب طلب کرنے کا بیان تھا اس آیت میں ثابت کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں کیونکہ حالاتِ ضرورت میں بھلائی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ لہٰذا یہ بھی منکرین کیلئے وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ ہی کو مصیبت کے وقت پکارتے ہیں مگر جب ان سے اللہ تعالیٰ تکلیف ہٹا دیتا ہے تو شرک کے مرتکب ہو جاتے ہیں جیسا کہ سورۃ روم آیت 33 اور سورۃ حم سجدہ آیت 51 میں وارد ہے۔ بعض مومنین بھی اس طرح کرتے ہیں کہ مصیبتوں اور تکلیفوں میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں تو بہ استغفار کرتے ہیں مگر مصیبت ٹل جانے کے بعد گناہوں میں لت پت ہو جاتے ہیں۔

اہم نکتہ: اس آیت میں لِجَنْبِہٖ: سے شروع کیا گیا ہے وجہ یہ ہے کہ جسکی تکلیف زیادہ ہوتی ہے تو اس کی دعائیں بھی زیادہ ہوتی ہیں اس کے بعد بیٹھے ہوئے آدمی کی حالت بیان ہو رہی ہے پھر کھڑے آدمی کی: جَنْبِهٖ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَآئِمًا یہ دَعَانَا: کے ساتھ متعلق ہے بقول مفسر زجاج اسکا: اَلضُّرُّ: سے متعلق ہونا بھی درست و جائز ہے۔ ان تین حالتوں کو اسلئے ذکر کیا ہے کہ انسان اکثر ان تین حالتوں میں منحصر ہوتا ہے: مَرَّ: یہ شرک پر قائم رہنے کے معنی میں ہے یعنی استمرار اور ہمیشگی کرنا: لِلْمُسْرِفِيْنَ: اس سے مشرکین مراد ہیں ان کو مسرفین اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے غیر اللہ کی عبادت کی وجہ سے اپنے نفوس اور جانوں کو اور تحریم لغیر اللہ اور نذر لغیر اللہ کی وجہ سے اپنے اموال کو تباہ کیا: مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: اس سے مشرکین کے اعمال مراد ہیں۔

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِن قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۙ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٣﴾

"اور ہم نے تم سے پہلے بہت سارے گروہوں کو ہلاک کیا تھا جب انہوں نے ظلم کیا حالانکہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لیکر آئے تھے اور نہیں تھے وہ ایمان لانے والے۔ مجرم لوگوں کو ہم اسی طرح سزا دیتے ہیں"[13]۔

تفسیر 13 اس آیت میں منکرین کے لیے تخویف دنیوی کا بیان ہے۔ سابقہ آیت سے اس کا ربط یہ ہے کہ کبھی تو اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول کرتا ہے اور ان کو مہلت دیتا ہے لیکن مہلت کے بعد شرک کے ارتکاب اور رسالت کے انکار کی وجہ سے ان کو ہلاک کرتا ہے پھر ان کی کوئی دعا قبول نہیں ہوتی۔ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم: یہ جملہ حالیہ ہے اور اس کے بعد فَكَذَّبُوهُمْ: مقدر ہے یعنی انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا یہ ظَلَمُوا: پر عطف ہے یعنی ان سے ایمان لانے کی امید نہیں تھی۔ الْمُجْرِمِينَ: اس آیت میں ظلم اور ایمان سے انکار کا ذکر ہے جو کہ عظیم جرم ہے جبکہ گزشتہ آیت میں صرف شرک کا ذکر تھا اس کو اسراف کہا گیا۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾

"پھر ان کے بعد ہم نے بطور امتحان تمہیں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح (امتحان کے طریقے) پر عمل کرتے ہو"[14]۔

تفسیر 14 اس آیت میں تخویف دنیوی ہے۔ كَيْفَ تَعْمَلُونَ: اس میں دلیل ہے کہ عبادات میں اللہ کے نزدیک مقصود کیفیات اور طریقے ہیں اور وہ طریقہ سنت رسول ہے اور اس آیت میں خطاب ساری امت کو ہے۔ لِنَنظُرَ: سے امتحان مراد ہے۔ كَيْفَ تَعْمَلُونَ: مخلوق پیدا کرنے کا ایک مقصد توحید ہے جیسا کہ سورۃ الذّٰریٰت آیت 56 میں ہے اور دوسرا مقصد زندگی گزارنے کا طریقہ ہے جو سنت کے موافق ہونا لازم ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔

وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۚ
قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ
رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

"اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جو بالکل واضح ہیں تو یہ لوگ جن کو ہماری ملاقات کی امید نہیں کہتے ہیں اس قرآن سے ہٹ کر کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اس میں آپ کچھ ترمیم کرلو آپ فرما دیجئے مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کروں مجھے تو اسی کی اتباع کرنی ہے جو میرے پاس وحی کے ذریعے سے پہنچا ہے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے اس بڑے دن کے عذاب کا خدشہ ہے"[15]۔

تفسیر 15 اس آیت میں بھی منکرین توحید کیلئے وعید ہے مطلب یہ ہے کہ جب ان پر قرآن میں توحید کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ قرآن نصیحت والی کتاب ہے مگر اس میں بار بار توحید کا تذکرہ ہے اور شرک کا رد ہے اگر یہ اس میں سے نکالا جائے تو باقی ہم مانتے ہیں: بَیِّنٰتٍ: جو توحید پر واضح دلیل ہے: غَیْرِ ھٰذَآ اَوْ بَدِّلْہُ: غیر اور بدل میں فرق یہ ہے کہ اس قرآن کو بالکل ہٹا دیا جائے اسکی جگہ کوئی دوسری کتاب لے آؤ اور بدل کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ترمیم کرو یعنی مسئلہ توحید اس سے خارج کرو جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل آیت 46 سورۃ ص آیت 5 اور سورۃ زمر آیت 45 میں ہے کیونکہ ان آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی اصل دشمنی توحید کی آیتوں سے تھی: قُلْ: یہ پہلا جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں تبدیل نہیں کر سکتا تو تغیر تو بطریق اولیٰ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ دونوں کام بڑے عذاب کا سبب ہیں: اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ: اس میں دلیل ہے کہ وحی کے بغیر کسی چیز کی پیروی جائز نہیں: اِنْ عَصَیْتُ، عَصْیَانٌ: سے مراد تبدیلی اور تغیر ہے۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۫ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾

"آپ فرما دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور نہ ہوتا تو نہ میں تمہیں قرآن سناتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی اطلاع دیتے کیونکہ اس سے پہلے میں عمر کا بڑا حصہ تم میں گزار چکا ہوں کیا پھر بھی تم عقل نہیں رکھتے"[16]۔

تفسیر 16 یہ مشرکین کے مطالبے کا دوسرا جواب ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ اس قرآن کو میں نے اپنی طرف سے شروع نہیں کیا۔ اس کی تعلیم اللہ تعالیٰ کے ارادے سے میں تمہیں دے رہا ہوں: فَقَدْ لَبِثْتُ: پہلا مطلب یہ ہے کہ میری چالیس سال

صداقت و ایمانداری تمہیں تسلیم ہے اور یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ میں پڑھا لکھا بھی نہیں ہوں تو آخر یہ کتاب میں نے کیسے اپنی طرف سے بنائی اور یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ ان چالیس سالوں میں اللہ تعالیٰ کی میں نے نافرمانی نہیں کی تو کیونکر اب میں نافرمان ہو جاؤں۔ نیز یہ نبوت سے قبل عصمت رسول کی دلیل ہے۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم علیہ السلام پر چالیس 40 سال کے بعد وحی کا نزول شروع ہوا تھا پھر آپ نے 13 تیرہ سال مکہ مکرمہ میں اور دس 10 سال مدینہ منورہ میں گزارے اور تریسٹھ 63 سال کی عمر میں آپ ﷺ فوت ہوئے۔ جن روایتوں میں 60 ساٹھ سال کا ذکر ہے ان میں تین سال حذف کیے گئے ہیں (صحیح بخاری کتاب المناقب حدیث 3536، صحیح مسلم فی المناقب حدیث 2351)۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ ؕ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

"لہٰذا اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے یقیناً ایسا مجرم (عذاب سے) بچ نہیں سکتا" [17]۔

تفسیر 17 یہ بھی منکرین رسالت اور مشرکین کیلئے وعید ہے: اِفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا: اول تو اس سے مشرک مراد ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور اس جواز کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں نیز اللہ تعالیٰ کیلئے اولاد کی نسبت کرتے ہیں دوم مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں تبدیلی کرتا ہے اور اپنے الفاظ اس میں ڈالتا ہے پہلے معنیٰ کے اعتبار سے مراد یہ ہے کہ میں ظالم نہیں ہوں کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ نہیں باندھا جو کہ بڑا ظلم ہے: اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ: اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والے اور قرآن کو جھٹلانے والے دونوں کفر کے ایک جیسے مرتکب ہیں۔

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ وَیَقُوْلُوْنَ ھٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰہَ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۱۸﴾

"اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر دے سکتی ہیں اور نہ ہی نفع اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں آپ فرما دیجئے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو۔ جو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہی نہیں آسمانوں اور نہ ہی زمین میں وہ اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک و برتر ہے" [18]۔

خلاصہ: اس آیت سے آیت نمبر 30 تک دوسرا باب ہے اس باب میں مشرکین کے شفاعت شرکیہ کے عقیدہ پر رد کیا گیا ہے

پانچ وعیدیں نیز دنیا کے فنا ہونے اور تخویف اخروی اور تبشیر اخروی کا ذکر ہے۔

تفسیر 18 اس آیت میں عبادت میں شرک اور اپنے معبودوں کو سفارشی بنانے کے عقیدے کی تردید ہے۔ ان کے عقیدے کا نچوڑ یہ تھا کہ اللہ ایک ہے البتہ جن بزرگوں کو ہم پکارتے ہیں یعنی لات، منات، ھُبل، وہ اللہ تعالیٰ پر ہماری حاجتیں منوا تے ہیں یعنی رزق، اولاد دینا، بیماریاں دور کرنا وغیرہ اور ان میں سے جن کا آخرت پر عقیدہ تھا تو ان کا کہنا تھا کہ یہ بزرگ قیامت کے دن عذاب الٰہی سے ہمیں نجات دلائیں گے اور ہم کو اللہ تعالیٰ پر جبری بخشوائیں گے اور اس عقیدے کو شفاعت قہر یہ (یعنی جبری شفاعت) کہا جاتا ہے جو وسیلہ شرکیہ سے بھی موسوم ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ میں اس کی مثال ان قبر پرست لوگوں کی ہے (جو قبروں پر غلاف چڑھاتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں) اور ان کی ناجائز تعظیم کر تے ہیں (یعنی ان پر جھنڈے گاڑتے ہیں طواف کرتے ہیں اور ان کے ناموں کے نذرانے شکرانے دیتے ہیں چادریں غلاف چڑھاتے نظر آتے ہیں) اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہماری اس تعظیم سے یہ اولیاء کرام خوش ہوتے ہیں اور ہماری حاجتیں اللہ تعالیٰ سے منواتے ہیں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ سے ہمیں جبری نجات دلائیں گے۔ یہ عقیدہ قطعاً شرکیہ ہے اس لئے کہ آیت کے آخر میں: يُشْرِكُونَ: فرمایا ہے اور تین طریقوں سے ان کے عقیدے پر رد کیا ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ یہ معبود نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھتے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں ایسا کوئی معلوم نہیں جو جبری طریقے سے شفاعت کروا سکتا ہو تو کیا تم اللہ تعالیٰ کو ایسے معبودوں کی اطلاع دیتے ہو جو وہ نہیں جانتا؟: بِمَا لَا يَعْلَمُ: یہ عدم وجود سے کنایہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ تو ہر چیز کے وجود پر عالم ہے تو معلوم ہوا کہ اس قسم سفارشی کا وجود ہی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں۔ تیسرا یہ ہے کہ یہ عین شرک ہے اور اللہ تعالیٰ شرک سے پاک ہے: مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ: ضرر اور نفع کی نفی عام ہے۔ بعض علماء نے تخصیص ذکر کی ہے کہ عبادت چھوڑنے کے وقت ضرر دینا اور عبادت کرتے وقت فائدہ دینا مراد ہے سُبْحَانَهُ: تسبیح شرک فی العبادت کی طرف راجع ہے: وَتَعَالَىٰ: يَشْفَعَاؤُنَا: کی طرف راجع ہے۔ فائدہ دنیا میں مجرم بندوں کو بچانے یا ان سے تکلیف دور کرنے کیلئے تین قسم کی سفارشیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم (1) محبت کی سفارش یعنی جس کے ذریعے سفارش کی جاتی ہے وہ (مشفوع الیہ) کے نزدیک یعنی جس سے سفارش طلب کی جاتی ہو اسکا بہت محبوب ہو اور اسکا کامل دوست ہو۔ (۲) دوسری قسم شفاعت بالوجاہت ہے یعنی مجرم یا ضرورت مند جسکو سفارش میں پیش کرتا ہو وہ مشفوع الیہ کے نزدیک زیادہ مرتبہ اور عزت والا ہو مذکورہ دونوں قسموں میں جن سے سفارش کی جاتی ہے وہ مجبور ہو کر اپنا ارادہ بدل

دیتا ہے اور اپنے قانون میں ترمیم کرلیتا ہے اور مجبوراً اس سفارش کو قبول کرلیتا ہے اس کو اصطلاح میں شفاعت قہریہ سے تعبیر کیا گیا ہے بدعقیدہ لوگ یہ دونوں قسمیں اپنے بزرگوں معبودوں کیلئے جائز مانتے ہیں حالانکہ یہ کھلا شرک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کے مرتبے کی محبت یا مقام وبلندی کی وجہ سے مجبور نہیں۔ (۳) تیسری قسم: اجازت سے سفارش ہوتی ہے یعنی کسی نے اپنے قانون میں لکھا ہو کہ میں اپنے قانون میں ترمیم نہیں کرسکتا ہوں اور نہ ہی ارادہ بدل سکتا ہوں اور نہ ہی قانون توڑ سکتا ہوں مگر فلاں شخص کی سفارش سے ایسا کرسکتا ہوں۔ تو یہ سفارش انکی اجازت سے اور اسی کے اختیار سے ہوگی اسمیں سفارش کروانے والے کا جبر مشفوع الیہ پر نہیں چلے گا۔ اس قسم کی سفارش اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین طریقوں سے ثابت ہیں۔ پہلی قسم زندہ آدمی کا کسی زندہ کیلئے دعاء کرنا۔ دوم: زندہ انسان کا فوت شدہ کیلئے دعاء مانگنا۔ سوم: قیامت کے دن مؤمنین جو بخشے گئے ہوں گے گناہگار مؤمنین کیلئے دعاء سفارش کرینگے یہ تینوں اقسام ثابت ہیں مگر چوتھی قسم مردوں کا زندوں کیلئے دعا طلب کرنا شریعت میں ثابت نہیں ہے۔ البتہ اس زمانے میں یہ عقیدہ شرک میں داخل ہوا ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٩﴾

"اور نہیں تھے لوگ (اس سے قبل) مگر ایک ہی دین (توحید) پر قائم پس (بعد والوں) نے اختلاف کیا اور (عذاب کے مؤخر کرنے کا) حکم نہ ہوتا (جو پہلے سے تمہارے رب کی طرف سے مقرر ہیں) تو اس چیز میں جس میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں کب کا فیصلہ ہو چکا ہوتا" [19]۔

تفسیر 19 اس آیت میں ایک سوال کا جواب ہے سوال: یہ عقیدہ شفاعت تمہارے دین میں منع ہوگا مگر گزشتہ ادیان میں جائز تھا جواب: تمام نبیوں کا ایک ہی دین تھا اختلاف تو عوام نے بنایا ہے: أُمَّةً وَّاحِدَةً: آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام کی قوم تک یا نوح علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت سے عادیوں کی پیدائش تک لوگ توحید پر قائم تھے۔ سوال: یہ عقیدہ کفریہ شرکیہ ہے تو ان پر عذاب کیوں نہیں آتا۔ جواب: اس جملے میں جواب ہوا کہ: لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ: اس کلمہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا ہے کہ اس امت کو قیامت تک عذاب کے ذریعے ہلاک نہیں کرے گا یا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا جب تک ان کو رسول کے واسطے یا اس کے نائب (عالم) کے ذریعے سے خبر نہ دے۔

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾

"اور وہ کہتے ہیں کیوں اس نبی پر کوئی نشانی (جو ہم طلب کرتے ہیں) نازل نہیں ہوتی ہے۔آپ فرمادیجئے غیب کی خبریں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں لہٰذا تم منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں" [20]۔

تفسیر 20 اس آیت میں نبی سے معجزات طلب کرنے پر تنبیہ کی جارہی ہے اور معجزات بھی من پسند ہو تو جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ معجزات کا اترنا علم غیب ہے لہٰذا مجھے تو اس کا علم تک نہیں تو اتارنا تو دور کی بات ہے: فَانتَظِرُوا یعنی معجزات کے آنے کا انتظار کرو یا عذاب آنے کا انتظار کرو جو انکار کا نتیجہ ہے۔

وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّن بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِي آيَاتِنَا ۚ قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾ "اور جب ہم لوگوں کو ان کی پہنچی ہوئی مصیبت کے بعد کسی نعمت کا مزہ چکھادیتے ہیں تو وہ فوراً ہماری آیتوں کے خلاف چالیں چلتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ تدبیر کرنے میں زیادہ تیز ہے اور ہمارے ملائکہ تمہاری سب چالوں کو لکھ رہے ہیں" [21]۔

تفسیر 21 اس آیت میں منکرین کیلئے وعید ہے: رَحْمَةً: صحت مندی۔ رحمت کی بارشیں۔ رزق کی فروانی۔ اور دیگر نعمتیں مراد ہیں: ضَرَّاءَ: قحط سالی اور امراض وغیرہ مراد ہیں: مَكْرًا: جھوٹ، جھگڑنے اور مقابلہ کرنے کے معنیٰ میں ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ بعض انسانوں پر مصیبتوں کے بعد جب راحت و فروانی آجاتی ہے تو توحید باری تعالیٰ اور قرآن کا مقابلہ کرنے پر اُتر آتے ہیں نیز یہ آیت دلیل ہے کہ ہر انسان کے ساتھ لکھنے والے ملائکہ موجود ہیں: أَسْرَعُ مَكْرًا: عذاب کے خفیہ تدبیر کو کہا جاتا ہے سرعت یہ ہے یعنی جو جلدی ہلاکت کے حقدار ہیں ان کو پہلے اور دوسروں کو بعد میں ہلاک کرتا ہے نیز اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں عجلت صفت نہیں ہے، سرعت اس کی صفت ہے یعنی: سَرِيعُ الْحِسَابِ سَرِيعُ الْعَذَابِ: ذکر ہوا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿٢٢﴾ "اللہ تعالیٰ وہی ذات ہے جو تمہیں خشکی تری میں چلاتا ہے یہاں تک کہ جب کشتی میں ہوتے ہو اور وہ کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ساتھ چلاتی ہیں اور لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں تو تیز ہوا کا جھونکا ان پر آجا

تا ہے اور ہر طرف سے ان پر موجیں اٹھتی چلی آتی ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ گھیر لئے گئے تو اس وقت خالص عقیدے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں کہ اگر تو ہمیں اس مصیبت سے بچالے تو ضرور ہم شکر گزار بن جائیں گے"[22]۔

تفسیر22 اس آیت میں پہلی دلیل عقلی ذکر ہے پھر مشرکین کیلئے وعید ہے۔ جسکا خلاصہ یہ ہے کہ جب ان پر کوئی پریشانی آتی ہے تو پھر صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور اپنے معبودوں کا نام نہیں لیتے، نیز یہ وعدے بھی کرتے ہیں کہ اگر تو نے ہماری اس مصیبت کو ٹال دیا تو ہم خالص تیری ہی بندگی کرینگے نذرانے صدقات صرف تیری ہی نام پر دینگے۔ لیکن افسوس ہے اس دور کے جاہلوں پر کہ اگر ان پر کوئی تکلیف آجائے تو بھی ان ہی بزرگوں کے واسطوں اور وسیلوں کے چکر میں رہتے ہیں اور ہر مشکل میں ان ہی کو مدد کیلئے پکارتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں معلوم ہوا کہ ان کا حال ان مشرکین سے بھی بدتر ہے۔ اس طرح علامہ الوسی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر روح المعانی میں بھی ذکر کیا ہے: يُسَيِّرُكُمْ: یہ خشکی اور تری دونوں قسم کی سواریوں کو شامل ہے خواہ وہ سواریاں اس وقت موجود نہ تھیں: حَتّٰٓى إِذَا كُنْتُمْ: اس میں (سمندر) کی سواری کا ذکر ہو رہا ہے: فِي الْفُلْكِ: اس میں کشتیاں لانچ اور بڑے جہازوں کا ذکر ہے: وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ: اس میں حاضر سے غائب کی طرف التفات (انتقال) ذکر ہوا ہے اور اس طرز میں بہت فائدے ہیں ایک فائدہ یہ ہے کہ انکا حال اور شان دوسروں کیلئے بطور عبرت بیان ہو رہا ہے: طَيِّبَةٍ: معتدل ہوا جو زیادہ تیز بھی نہ ہو اور زیادہ سست بھی نہ ہو۔ أُحِيْطَ بِهِمْ: احاطہ ہلاکت کے معنیٰ میں ہے مگر ان کو ہلاک نہیں کیا تھا تو اسلئے لفظ: وَظَنُّوْا: استعمال ہوا یعنی انہوں نے گمان کیا: مُخْلِصِيْنَ: یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرینگے، یہ اخلاص علم یقینی فطری ہے ایمانی نہیں ہے۔

فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۳ "پھر جب اللہ تعالیٰ ان کو بچالیتا ہے تو فوراً ہی زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمہاری یہ سرکشی تمہارے لئے وبال ہونے والی ہے دنیاوی زندگی کے چند فائدے ہیں پھر تمہیں ہمارے پاس آنا ہے پھر ہم تمہارا کیا ہوا سب تمہیں بتلادینگے"[23]۔

تفسیر 23 یہ گزشتہ آیت سے متعلق ہے: فَلَمَّا أَنجَاهُمْ: اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرک کی بھی عاجزی والی دعاء کو قبول فرمادیتے ہیں: يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ: سورۃ عنکبوت آیت 65 سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بَغْيِ: سے مراد شرک ہے اور یہی بات سورۃ بنی اسرائیل آیت 67 اور سورۃ لقمان آیت 32 میں ہے: بِغَيْرِ الْحَقِّ: اس سے مراد باطل ہے یعنی شرک کا ارتکاب کرتے ہیں جو کہ فساد فی الارض ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ سرکشی ناجائز طور پر کرتے ہیں اور بَغْيِ بِالْحَقِّ یہ ہے کہ مسلمان کافروں پر غلبہ حاصل کرتے ہوئے جہاد کے ذریعے ان کے مال وغیرہ قبضہ میں لیکر تقسیم کرے: مَتَاعَ: اس کا فعل حذف ہوا ہے اصل اس طرح ہے: تَمَتَّعُوا مَتَاعًا: یا یہ مَنْصُوبٌ بِنَزْعِ الْخَافِضِ ہے یعنی: فِي مَتَاعِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا: یعنی تمہاری بغی سرکشی صرف کچھ دنوں کیلئے ہے جو بہت جلد فنا ہوگی: مَّتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا: اس میں سوال کا جواب ہے یعنی اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ کو جب معلوم تھا کہ انسانوں نے شرک کا ارتکاب کرنا ہے تو ان کی دعائیں کیوں قبول کرتا ہے؟ تو جواب ہوا کہ یہ تو صرف دنیاوی فائدہ ہے۔ لہٰذا یہ تو اللہ تعالیٰ مشرکین کو بھی دیتا ہے اور اس آیت میں دلیل ہے کہ کبھی کبھار اللہ تعالیٰ مشرک کی دعاء بھی قبول فرمادیتا ہے۔

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنزَلْنَٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهِۦ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَٰمُ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قَٰدِرُونَ عَلَيْهَآ أَتَىٰهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَٰهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْءَايَٰتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٤﴾ "یقیناً دنیاوی زندگی کی مثال تو ایسی ہے جیسا کہ ہم نے آسمانوں سے پانی برسایا پس اس کے ذریعے وہ نباتات خوب گنجان ہو کر اگ آئے جن کو انسان اور چوپائے کھاتے ہیں یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق پکڑ لیتی ہے اور خوبصورت ہوجاتی ہے اور اس کے مالک سمجھتے ہیں کہ اب ہم اس پر پورے طریقے سے قادر ہو چکے ہیں تو دن یا رات کو ہماری طرف سے اس پر کوئی عذاب آپڑتا ہے جسکو ہم ایسا ملیا میٹ کر دیتے ہیں گویا کہ کل یہاں پر کوئی فصل نہیں تھی۔ ہم اس طرح فکر رکھنے والوں کیلئے واضح آیتیں نازل فرماتے ہیں" [24]۔

تفسیر 24 دنیاوی متاع ذکر ہوا تو اب اسکے فنا و زوال کا ذکر ہو رہا ہے تا کہ دنیا سے بے رغبتی حاصل ہو جائے الْحَيَاةِ الدُّنْيَا: اس سے دنیوی ساز وسامان اور عمر مراد ہے: زُخْرُفَهَا: اس سے مختلف رنگوں کے پھول یعنی سفید لال پیلے جس سے زمین کو رونق حاصل ہوتی مراد ہے اس میں دلہن (عروس) کے ساتھ تشبیہ ہے کہ وہ جب زیب و زینت کر لیتی ہے بندے کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہے: قَادِرُونَ عَلَيْهَا: اس میں فصل پکنے اور تیار ہونے کی طرف اشارہ ہے: بِالْأَمْسِ: گزرا ہوا

قریب زمانہ مراد ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ جیسا اللہ تعالیٰ بارش کے ذریعے زمین کو سرسبز وشاداب فرمالیتا ہے اور زمین رنگارنگ پھولوں سے مزین ہوجاتی ہے تو مالک گمان کرتا ہے کہ اب فصل کٹائی کیلئے تیار ہے لیکن اچانک کسی طوفان سے وہ فصل تباہ ہوکر اس کی رونقیں ختم ہوجاتی ہیں۔اسی طرح انسان اپنی زندگی پر غرور کرتا رہتا ہے کہ اچانک موت کے ذریعے اس کی ساری امیدیں دم توڑ دیتی ہیں۔لہٰذا اس دنیا کی محبت میں دین کو داؤ پر نہیں لگانا چاہئے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ "اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست پر چلنے کی توفیق بخشتا ہے۔"[25]۔

تفسیر 25 دنیا کے فنا ہونے کے بعد اب اس آیت میں جنت کی طرف ترغیب ہے: يَدْعُوْٓا: اللہ تعالیٰ کا جنت کی طرف دعوت دینے کا معنیٰ یہ ہے کہ اس نے کتابیں نازل کی اور رسولوں اور مبلغین حق کو بھیجا اور اپنے دلائل قائم کئے۔اس میں اشارہ ہے کہ دعوت کا بہت بڑا مرتبہ ہے اس کے ذریعے ہدایت تک رسائی ہوجاتی ہے چنانچہ اسی وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے: يَهْدِيْ: ہدایت کا ذکر بعد میں کیا لیکن ہدایت مشیت الٰہی سے حاصل ہوتی ہے: دَارِ السَّلٰمِ: یہ جنت کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اسی سورت آیت (10) میں گزرا ہے کہ وہاں سلام ہی سلام سنائی دے گا اور ہر آفت ومصیبت سے سلامتی ہوگی۔ یا سلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور جنت اللہ تعالیٰ کا گھر ہے: يَهْدِيْ: ہدایت سے مراد صحیح مقصد تک رسائی اور ہدایت کی توفیق ہے: مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق سے بے پرواہے اور اپنے ارادے سے جو چاہے کرتا ہے

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۭ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَھُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ "ان لوگوں کیلئے جنہوں نے نیکی کی ہے اچھا بدلہ ہے اور مزید نعمتیں ہیں اور ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی اور نہ ہی ذلت یہ لوگ جنت میں رہنے والے ہیں یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"[26]۔

تفسیر 26 اس آیت میں موحدین کیلئے آخرت کی بشارت ہے: زِيَادَةٌ: کی بہترین تفسیر جنت میں دیدار الٰہی ہے اس لئے کہ یہ صحیح مسلم کی حدیث میں وارد ہے: اَحْسَنُوا: احسان سے مراد عقیدتاً اور عملاً توحید اختیار کرنا ہے۔ اَلْحُسْنٰى: اچھے حالات ہیں اور وہ جنت ہے: وَزِيَادَةٌ: تمام اہل سنت مفسرین نے اس کی تفسیر دیدار الٰہی سے کی ہے۔البتہ معتزلہ اس معنیٰ کے منکر ہے جیسا کہ صاحب کشاف نے کہا ہے اور صحیح حدیث کو رد کرتے ہیں (**صحیح مسلم کتاب الایمان باب**

اثبات رأية المؤمنين لربهم حديث 181 ترمذی کتاب صفة الجنة 2551 احمد 333/4) امام رازی اور خا

زن نے ان کے شبہات کے جوابات ذکر کیے ہیں انہیں وہاں ملاحظہ کیجئے۔

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۗ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ "اور جن لوگوں نے گناہ کا ارتکاب ہے ان کو اس کے مثل بدلہ ملے گا اور ان پر ذلت چھائے گی۔ اللہ تعالیٰ سے ان کو کوئی نہ بچا سکے گا گویا ان کے چہروں پر اندھیری رات کے ٹکڑے لپیٹ دیے گئے ہیں یہ لوگ جہنم میں ہمیشہ رہنے والے ہیں" [27]۔

تفسیر 27 اس آیت میں مشرکین کے لیے تخویف اخروی کا بیان ہے: وَالَّذِيْنَ: اس میں لام مقدر یعنی مخفی ہے جو لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا: پر عطف ہے: بِمِثْلِهَا: برائی میں برابری ہوگی یعنی جس طرح کفر و شرک گندہ عمل ہے تو اس طرح اسکا بدلہ بھی گندی جگہ نجس خوراک وغیرہ ہے نیز ایک گناہ کے بدلہ میں ایک سزا کے طور پر مماثلت اور برابری ہے: مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ: اس میں شفاعت قہریہ کی طرف اشارہ ہے جو کہ اس سورۃ کا موضوع اور عنوان ہے: كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ: مراد یہ ہے کہ ان کے چہرے اتنے کالے ہونگے گویا کہ رات کا اندھیرہ ان کے چہروں پر چسپاں کیا گیا ہے اور یہ ایمان والوں کے مقابل ہے جن کیلئے فرمایا۔ لَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ۔ یعنی ان کے چہروں پر کسی قسم کی سیاہی نہیں ہوگی۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَاۗؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاۗؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ۝ "اور جس دن ہم ان کو اور ان کے شریکوں کو اکٹھا کریں گے پھر ہم ان لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے شرک کیا ہے کہ تم اور تمہارے معبود اپنی جگہ ٹھہر جاؤ پس ہم ان کے درمیان (تفریق) جدائی ڈالدیں گے ان کے شریک کہیں گے نہیں تھے تم ہماری عبادت کرنے والے" [28]۔

تفسیر 28 اس آیت میں سوال کا جواب بھی ہے اور مشرکین کے اس عقیدے پر وعید ہے کہ ان کے سفارشی اللہ تعالیٰ پر ان کے مطالبات جبراً منوا سکتے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ گزشتہ آیت میں فرمان الٰہی ہے کہ انہیں بچانے والا کوئی نہیں۔ حالانکہ انہوں نے بزرگوں کی بندگی کی ہے تو امید ہے کہ وہ ان کو چھڑا لیں گے اور عذاب سے بچا لیں گے۔ [redacted] ہوا کہ وہ صالحین اور نیک لوگ کی بندگی سے انکار کرینگے: فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ: الگ الگ مقامات میں ان کو کھڑا کیا جائے گا اس وجہ سے بھی کہ مجرمین

سے صالحین الگ رہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے تعلقات ہی قائم نہ ہوں: وَقَالَ شُرَكَآؤُهُم: یہ مشرکین کے جواب میں ہیں کہ انہوں نے کہا تھا کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں جن کو تیرے سوا ہم نے پکارا ہے۔ دیکھئے سورۃ نحل آیت (86) (قَالُوا رَبَّنَا هَؤُلَاءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُوا مِن دُونِكَ)؛ فائدہ: اس آیت میں ان لوگوں کا رد ہے جنہوں انبیاء ،اولیاء یا ملائکہ یا بالفاظ دیگر قبر پرستی کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی صفت میں کسی کو شریک کیا ہے اور یہ اس امت کا حال ہے اس سے بت مراد نہیں کیونکہ سوال و جواب کا ہونا اور میدان حشر میں حاضری یہ بتوں کے شان سے بعید ہے۔

فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾ "ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے اس بات پر کہ ہم تمہاری عبادت سے باخبر بھی نہ تھے" [29]۔

تفسیر 29 فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا: یہ قسم کے معنی میں ہے یعنی مشرکین کہیں گے کہ ہم نے تمہارے طواف اور سجدے کئے ہیں تمہیں مدد کیلئے پکارا ہے تمہارے نام پر نذر، نیاز صدقات دیتے ہیں تو وہ قسم کھا کر تاکیدی جواب دیں گے۔ اس آیت میں واضح دلیل ہے جنہوں نے انبیاء یا بزرگوں کی عبادت کی ہے یعنی انہیں پکارا ہے غرض ہر قسم کے شرکیہ اعمال جو انہوں نے کئے ہیں ان بزرگوں کے نام پر وہ ان تمام اعمال سے باخبر ہیں نہ انہوں نے سنا ہے اور نہ ہی دیکھا ہے اس طرح عنوان سورۃ فاطر آیت 14 اور سورۃ احقاف آیت 5 میں بھی وارد ہے۔ مفسر آلوسی نے لکھا ہے کہ بتوں کا بے خبر ہونا تو یقینی ہے اور ملائکہ چونکہ آسمانوں پر ہونے کی وجہ سے دور ہیں۔ کیونکہ انہوں نے آسمانی ملائکہ کی عبادت کی ہے جیسا کہ سورۃ نجم آیت 26 میں ذکر ہے باقی رہے اولیاء کرام تو بعض اپنے عابدین پکارنے والوں سے دور تھے لہٰذا ان کے پاس علم غیب نہیں اور جو قریب تھے تو وہ فوت شدگان ہیں۔ اور فوت شدگان سننے سے قاصر ہیں سماع موتی کی تفصیلی بحث میں اس کا ذکر آئے گا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مشرکین کی پکار اور دیگر شرکی اعمال سے ان کو اللہ تعالیٰ نے بے خبر رکھا ہوتا کہ وہ غم اور پریشانی میں مبتلا نہ ہوں۔

هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾ "اس وقت ہر شخص اپنے کئے ہوئے کاموں کی جانچ کر لے گا اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف جو انکا حقیقی مالک ہے لوٹا دیئے جائیں گے اور جو کچھ انہوں نے جھوٹ بنایا تھا ان سے غائب ہوجائے گا" [30]۔

تفسیر 30 یہ بھی گزشتہ آیت سے متعلق ہے مطلب یہ ہے کہ میدان حشر میں جب ان کو معلوم ہوجائے کہ ہمارے اعمال یعنی

عبادات سے ہمارے معبودان اور اولیاء کرام، انبیاء کرام بے خبر تھے تو ان کے سامنے انکے اعمال کی غلطی ظاہر ہو جائیگی۔ تَبْلُوْا: بَلَاءٌ: امتحان اور کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنے کو کہتے ہیں ان کو معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے جو اعمال کئے ہیں وہ خیر کے ہیں یا شر کے ہیں اور قبول ہیں یا مردود ہیں: مَوْلٰىهُمُ: یہاں پر مَوْلٰى: مالک کے معنیٰ میں ہے اور سورۃ محمد آیت 11 میں مددگار کے معنیٰ میں ہے لہٰذا اس میں تعارض نہیں ہے: مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: یعنی شرک کی کہانیاں قصے اور باطل معبود وغیرہ۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ "فرما دیجئے کون تمہیں آسمان و زمین سے رزق پہنچاتا ہے اور کون تمہارے کانوں اور آنکھوں پر پورا قبضہ اور قدرت رکھتا ہے اور کون ہے جو زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون ہے جو تمام کاموں کے تدبیر کرتا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ تو پھر آپ ان سے کہہ دیجئے کہ کیوں اپنے آپ کو شرک سے نہیں بچاتے ہو" [31]۔

خلاصہ: یہاں سے آیت (54) تک تیسرا باب ہے اس میں عقلی دلائل کا ذکر ہے جن کو مشرکین خود بھی تسلیم کرتے ہیں اس باب کے آٹھ آیتوں میں وعید ہے ۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔ دنیاوی اور اُخروی عذاب کی وعید دی گئی ہے۔

تفسیر 31: اس بات پر دلیل ہے کہ مشرکین عرب اللہ تعالیٰ کی ان صفتوں کو مانتے تھے کہ وہ رازق مالک خالق ہے اور سارے نظام کو چلانے والا ہے لیکن اس کے باوجود عقائد شفاعت قہریہ کی وجہ سے شرک کا ارتکاب کرتے تھے۔ اس آیت کا سورۃ کے دعویٰ سے یہ مناسبت ہے کہ جو لوگ اپنے معبودوں کو شفیع مانتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے بعض صفتوں کے منکر ہیں: مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ: اس سے بارش اور فصلیں پودے وغیرہ اُگانا مراد ہے: اَلسَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ: یعنی سننے دیکھنے کا اختیار کس کے پاس ہے۔ سورۃ انعام آیت 46 میں بھی اس طرح ہے: اَلْحَيَّ: زندہ، حیوان، پرندوں کے بچوں، مؤحد تازہ فصلوں مومن اور عالم سب کو شامل ہیں: اَلْمَيِّتِ: نطفہ، انڈا۔ بنجر زمین، مشرک، جاہل، سب کو شامل ہیں۔ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ۔ اَلْاَمْرَ: میں الف لام استغراق کیلئے ہے یعنی پورے عالم کا نظام چلاتا ہے اس میں صوفیوں کے عقیدے پر رد ہے 1۔ جنہوں نے قطب، ابدال اور غوثوں کو کائنات کا نظام اپنے خیال میں سونپ رکھا ہے جبکہ اس عقیدے پر کوئی صحیح مرفوع یا موقوف حدیث نہیں ہے۔ ابن عساکر کی ذکر کردہ روایت بے سند ہے اور ابدال کی روایت

منقطع ضعیف ہے جیسے کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے المنار المنیف میں اس کی نشاندہی کی ہے۔(اس حدیث پر شیخ احمد شاکر نے مسند احمد کی تخریج میں منقطع ضعیف کا حکم لگایا ہے،احمد 1/2 ' 1 ،منار المنیف ص 136)

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۖ فَأَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿٣٢﴾ "ان صفات کا مالک تمہارا حقیقی رب ہے پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا رہ گیا پھر کہاں تم پھرے جاتے ہو" [32]۔

تفسیر 32 یہ سابقہ آیت کا نتیجہ ہے: فَأَنّٰى تُصْرَفُوْنَ، صَرَفَ: پھرنے کو کہا جاتا ہے معنی یہ ہے کہ کس دلیل پر تم حق سے باطل کی طرف اور توحید سے شرک کی طرف مڑتے ہو: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ: اس آیت میں دلیل ہے کہ مسائل اعتقادیہ میں ایک جانب حق ہوتا ہے تو مقابل جانب لازماً باطل ہوتا ہے نہ دونوں جانب حق ہو سکتا ہے اور نہ ہی دونوں جانب باطل۔ آج کل بعض جاہل عقیدے کے مسائل کو فرعی قرار دیتے ہیں اور دونوں جانب کو حق قرار دیتے ہیں تو یہ لوگ حقیقت میں جاہل ہیں۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٣٣﴾ "اسی طرح تیرے رب کی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ فاسق لوگ ایمان نہیں لائیں گے" [33]۔

تفسیر 33 آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ مشرکین جاننے کے باوجود توحید قبول نہیں کرتے تو معلوم ہوا کہ ان کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے: أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ: یہ: كَلِمَةُ: کی تفسیر ہے یا: كَلِمَةُ: سے عذاب کا وعدہ مراد ہے اور: أَنَّهُمْ: لام کے مقدر ہونے کے ساتھ: حَقَّتْ: کیلئے علت ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۚ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَأَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿٣٤﴾ "فرما دیجئے کہ تمہارے مددگاروں میں سے کوئی ہے جو پہلی بار پیدا کرنے اور دوبارہ پھر بھی پیدا کرنے والا ہو۔ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہی پہلی بار پیدا کرتا ہے دوبارا پھر پیدا کریگا تو تم کہاں پھرے جاتے ہو" [34]۔

تفسیر 34 اس آیت میں مشرکین پر رد ہے کہ ان کے مددگاروں نے کچھ بھی پیدا نہیں کیا ہے تو پھر کیوں ان کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں: فَأَنّٰى تُؤْفَكُوْن: صَرَفَ: میں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھرنے کا معنی ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ جبکہ: أَفَكَ: جھوٹ کی طرف پلٹ جانے کا معنی دیتا ہے لہذا انصَرَفَ: سے: إِفْكٌ: خاص ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ إِلَى الْحَقِّ ۚ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۗ أَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُّتَّبَعَ أَمَّنْ لَّا

يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ؀ ”فرما دیجئے کہ تمہارے معبودوں میں کوئی ہے جو حق کا راستہ بتاتا ہے فرما دیجئے اللہ تعالیٰ ہی تو ہے جو حق کا راستہ بتاتا ہے تو جو حق کا راستہ بتاتا ہے وہ لائق ہے کہ اس کے احکام (اور حکمتوں) کو تسلیم کیا جائے یا وہ جو راستہ نہیں پاتا ہے مگر جب اس کی رہنمائی کی جائے، تو تمہارے پاس کیا دلیل ہے، کیسے بے دلیل فیصلے کرتے ہو“ [35]۔

تفسیر 35 اس میں بھی مشرکین پر رد ہے کہ تمہارے معبود حق تک رسائی نہیں کر سکتے ہیں حق تک رسائی تو صرف اللہ تعالیٰ کرتا ہے تو پھر ان کو کیوں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے۔ گزشتہ آیت میں ان لوگوں پر رد ہے جو نیک بندوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں اور شرک فی الالوھیت پر رد تھا اور اس آیت میں ان لوگوں پر رد ہے جو اپنے مولویوں اور پیروں کو شریک فی الحکم تصور کرتے ہیں یعنی حلال و حرام کے فیصلے ان کے اہل مانتے ہیں۔ یعنی تمہارے احبار و رہبان گمراہ پیرو مولوی حق کی ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اپنی ہدایت میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں اور اس پر: اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ :دلیل ہے کیوں کہ ہدایت اور اتباع بتوں کے شان کے ساتھ مناسب نہیں :اِلَى الْحَقِّ :اور لِلْحَقِّ :میں فرق یہ ہے کہ پہلے سے مراد حق کی رہنمائی ہے اور دوسرے سے مراد حق پر قائم و گامزن رکھنا ہے۔ اس طرح فرق لام اور الی کے ہدایت کے صلہ میں ہدایت کی تفسیر سورۃ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔ نیز پہلی قسم یعنی رہنمائی تو مخلوق کر سکتی ہے مگر دوسری قسم یعنی ہدایت پر قائم رکھنا مخلوق کے بس میں نہیں ہے اسلئے شرکاء کے ساتھ الی کو ذکر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ لام ذکر کیا ہے: كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ: اللہ تعالیٰ کے دین کی اتباع چھوڑتے ہو اور گمراہوں کی پیروی کرتے ہو۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ؀ ”ان کی اکثریت (شرک میں) نہیں پیروی کرتی مگر گمان کی، یقیناً گمان فائدہ نہیں دیتا حق کے متعلق کچھ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں“ [36]۔

تفسیر 36 گزشتہ آیت میں تقلید پر رد ہے جو اہل ضلال کا کام ہے تو اب گمان و اٹکل کے پیچھے چلنے والوں کا رد ہو رہا ہے کہ انکے پاس صرف گمان ہی دلیل ہے ان کے پاس کوئی یقینی دلیل نہیں ہے۔ جبکہ گمان سے یقین ثابت نہیں ہوتا: اَكْثَرُهُمْ :اکثر اسلئے فرمایا کہ بعض تو خواہش کے پیرو کار ہیں جبکہ اکثر گمان کے پیرو کار تھے یا اکثر سے مراد ان کے بڑے ہیں تفسیر خازن میں اس طرح ذکر ہے حاصل کلام یہ ہے کہ مشرکین جو اپنے معبودوں بزرگوں کو سفارشی مانتے ہیں اور ان کی بندگی کرتے ہیں یہ سب

گمان پر مبنی ہے اسلئے کہ وحی الٰہی میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے نیز یہاں پر ظن گمان کے معنی ہے یعنی بے دلیل بات۔ شریعت میں عقیدے کے مسائل میں ٹھوس اور وحی پر مبنی دلائل چاہیے خیالی اور گمانی باتوں سے عقیدہ ثابت نہیں ہوتا ہے سورۃ النجم آیت 28 میں بھی یہ مضمون وارد ہے۔ فائدہ: امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عقائد کے باب میں دلیل ظنی کافی نہیں ہوتی اور اس آیت سے استدلال کیا ہے (نوٹ جو مسئلہ وحی سے بدلیل صحیح ثابت ہوجائے تو وہ یقینی ہے ظنی نہیں)۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ "اور نہیں ہے یہ قرآن ایسا کہ اپنے پاس سے اللہ کے سوا گھڑ لیا گیا ہو بلکہ یہ تو ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ اور (ضروری) احکام بیان کرنے والا ہے اور اس کا رب العالمین کی طرف سے ہونے میں کوئی شک نہیں ہے" [37]۔

تفسیر 37 اس آیت میں قرآن مجید کی پانچ صفات کے ذریعے سچائی قرآن کی صداقت اور سچائی کا بیان ہے: (1) پہلی بات یہ ہے کہ افترا نہیں ہے دوم (2) سابقہ کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے (3) احکام ضروریہ کی تفصیل اس میں ہے (4) اس میں شک نہیں ہے (5) اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ سابقہ آیت سے ربط یعنی تعلق یہ ہے کہ گمان کی باتوں کو چھوڑ دو اور یقینی دلائل کی طرف آجاؤ جو کہ قرآن مجید میں ہے۔ تصدیق سے قبل لفظ: كَانَ یا أُنْزِلَ: مقدر (مخفی) ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ "کیا وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو اس نے اپنے پاس سے گھڑ لیا ہے؟ فرما دیجئے کہ تم اس کی مثل ایک ہی سورت بنا لاؤ اور جن جن کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو" [38]۔

تفسیر 38 گزشتہ آیت میں قرآن کی سچائی بیان ہوئی تو اب منکرین قرآن کیلئے وعید ہے ان سے ایک سورۃ بنانے کا مطالبہ کیا گیا ہے اس کو: تحدی: کہتے ہیں اور اس میں قرآن کریم کا معجزہ ہونا اور اس کا اللہ کی طرف سے ہونا ثابت کیا جارہا ہے کہ اس کا مقابلہ کسی کے بس میں نہیں بِمِثْلِهٖ: اس میں ضمیر (ہٗ) قرآن کی طرف راجع ہے اور برابری یعنی مماثلت سے فصاحت، بلاغت، اچھی ترتیب اور سچائی پر مبنی پیشنگوئیاں وغیرہ مراد ہے۔ سورۃ بقرۃ میں مِّنْ مِّثْلِهٖ: اس لئے ذکر کیا ہے کہ وہاں یہ احتمال تھا کہ ضمیر بندے (عبد) کی طرف راجع ہو یا مراد تورات اور انجیل ہو اور: تحدی: مراد نہ ہو بلکہ مناظرہ مراد ہو جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی تفسیر میں گزرا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾ "بلکہ وہ ہر اس چیز کو جھٹلاتے ہیں جس کا علم ان کے پاس نہیں اور جب کہ نہیں آئی اب تک ان کے پاس اس قرآن کی حقیقت اسی طرح ان لوگوں نے (اپنے رسولوں کو) جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے پس دیکھ لو! ظالموں کا کیا انجام ہوا"[39]۔

تفسیر39 قرآن کریم کا معجزہ ہونا اور مُنَزَّلٌ مِنَ اللہ ہونا ثابت کرنے کے بعد انکار کرنے والوں کیلئے وعید ہے اور ان کے انکار کے دو سبب بتائے ہیں پہلا سبب یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کا مقصد ہی نہیں جانا ہے اس لئے اس سے انکار کرتے ہیں اور اسی طرح سورۃ نمل آیت 84 اور سورۃ احقاف آیت 11 میں مذکور ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ قرآن سے انکار و اعراض پر جو عذاب ان کو ملے گا ابھی تک انہوں نے نہیں دیکھا ہے: بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ بِمَا میں (با) زیادہ ہے اور یہ كَذَّبُوْا کا مفعول ہے۔ یا پھر (با) سببیہ ہے اور مفعول اس کا مقدر ہے جو کہ القرآن ہے اور اس میں مراد یہ ہے کہ قرآن کے علوم پر کامل احاطہ کوئی بھی نہیں کر سکتا ہے اور انہوں نے بھی نہیں کیا ہے اس لئے جھٹلانے پر اتر آئے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں جنت وجہنم کا ذکر ہے جو ان کے علم میں بھی نہیں آیا ہے۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ قرآن میں وہ علوم اور مسائل ہیں کہ ابھی تک ان کے علم میں نہیں آئے ہیں اور نہ ہی انہوں نے سنے ہیں لہذا یہ اس مثال کے مصداق ہے کہ لوگ اس چیز کی دشمنی پر اتر آتے ہیں جس سے جاہل ہوتے ہیں: اَلنَّاسُ اَعْدَاءٌ لِمَا جَهِلُوْا. وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيْلُهٗ: ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے اور تاویل سے قرآن کی تفسیر مراد ہے یعنی انہوں نے قرآن کے معنی اور مفہوم میں غور نہیں کیا بلکہ اپنے بڑوں کی تقلید کرتے ہوئے تکذیب کرتے رہے۔ تفسیر مدارک۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ضمیر تکذیب کی طرف راجع ہے اور تاویل انجام کے معنی میں ہے یعنی انکار کا انجام انہوں نے نہیں دیکھا ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾ "بعض ان میں سے وہ ہیں جو اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو اس قرآن پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور تیرا رب فسادیوں کو خوب جانتا ہے"[40]۔

تفسیر40 اس آیت میں قرآن سے انکار کرنے والوں کیلئے وعید ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ قرآن سے اعراض کرنے والا

ہر شخص فسادی ہے: یُؤۡمِنُ اور لَّا یُؤۡمِنُ: اس میں یا تو مستقبل کا معنی ہے یا ماضی کا ہے۔

وَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ فَقُلْ لِّىۡ عَمَلِىۡ وَلَـكُمۡ عَمَلُكُمۡ‌ ۚ اَنۡتُمۡ بَرِيۡٓـئُوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَاَنَا بَرِىۡۤءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۞ ''اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ فرما دیجئے کہ مجھے میرے عمل کا بدلہ (جو دعوت حق ہے) ملے گا اور تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ (جو ناحق ہے) ملے گا میرے اعمال سے تم بری ہو اور تمہارے اعمال سے میں بری الذمہ ہوں''[41]۔

تفسیر 41 اس آیت میں نبی کریم علیہ السلام کو تسلی دی گئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر یہ آپ کی بات نہیں مانتے تو ان سے برأت کرلو۔ اس آیت میں ہر شخص کیلئے اس کے اعمال کے جزا کو مختص کیا گیا ہے لہٰذا اس آیت کا قتال سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے تو ان مفسرین کا قول درست نہیں ہے جو آیت ہذا کو قتال کی آیتوں سے منسوخ قرار دیتے ہیں۔

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُوۡنَ اِلَيۡكَ‌ ؕ اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ وَلَوۡ كَانُوۡا لَا يَعۡقِلُوۡنَ ۞ ''بعض ان میں سے وہ ہیں جو آپ کی طرف کان لگا کر بیٹھے ہیں تو کیا آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں جبکہ وہ سمجھ بھی نہ رکھتے ہوں''[42]۔

تفسیر 42 اس آیت میں بھی منکرین قرآن کیلئے وعید ہے کہ وہ اگر کان سننے کیلئے لگاتے بھی ہیں تو وہ بھی ظاہراً جبکہ ان کے دل غافل ہیں۔ اور نبی اکرم ﷺ کیلئے اس میں تسلی بھی دی ہے: يَّسۡتَمِعُوۡنَ: یہ سننا صرف اعراض واستہزا کیلئے ہیں: اَلصُّمَّ: اس میں ضدی اور فسادی لوگوں کی بہروں سے تشبیہ دی ہے یعنی مثال بہروں کے ساتھ دی ہے جیسے بہرے قرآن کو کان لگانے سے فائدہ نہیں لے سکتے تو اسی طرح ضدی لوگوں کے کان لگانے سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ وَلَوۡ كَانُوۡا لَا يَعۡقِلُوۡنَ: اس سے پہلے تقدیری عبارت کا خلاصہ اس طرح ہے کہ بہرہ انسان عقل مند ہونے کے باوجود سماعت سے قاصر ہوتا ہے تو جب اس میں عقل بھی نہ ہو تو کیسے دھیان دے گا۔

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡظُرُ اِلَيۡكَ‌ ؕ اَفَاَنۡتَ تَهۡدِى الۡعُمۡىَ وَلَوۡ كَانُوۡا لَا يُبۡصِرُوۡنَ ۞ ''بعض ان میں سے آپ کی طرف نگاہیں لگائے ہوئے ہیں کیا آپ ان کو راہ دکھا سکتے ہیں جب کہ وہ دیکھنے سے بھی قاصر ہوں''[43]۔

تفسیر 43 اس میں بھی منکرین کیلئے وعید ہے کہ ظاہراً آپ کو نظریں لگائے ہوئے ہیں مگر تجھے ڈراتے یا تعجب میں ڈالنے کیلئے لیکن وہ دل کے اندھے ہیں۔ اور اس میں بھی نبی کریم علیہ السلام کیلئے تسلی ہے مذکورہ دونوں آیتوں میں کافروں کی مشابہت اندھوں اور بہروں کے ساتھ دی ہے جس طرح بہرہ اور اندھا دیکھنے اور سننے سے قاصر ہیں اسی طرح کافر بھی حق سننے اور دیکھنے سے قاصر ہیں: وَلَوۡ كَانُوۡا لَا يُبۡصِرُوۡنَ: مقدر عبارت کا خلاصہ اسی طرح ہے کہ نابینا انسان دل کی بصیرت

رکھنے کے باوجود راستہ دیکھنے سے قاصر ہے تو جب دل کی بصیرت بھی برباد ہوجائے تو پھر کیا دیکھے گا۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٤٤﴾ "یقینا اللہ تعالیٰ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا ہے لیکن لوگ اپنے نفسوں پر خود ظلم کرتے ہیں" [44]۔

تفسیر 44 اس میں سوال کا جواب ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان سے سننے دیکھنے کی طاقت سلب کی تو یہ ظلم نہیں ہے جواب ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے صرف اپنی ملکیت میں اپنے اختیارات استعمال کرتا ہے جیسا وہ چاہتا ہے اور یہ تو عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو فائدہ لینے کے اسباب سے نوازا تھا یعنی سننے کیلئے کان اور دیکھنے کیلئے آنکھیں۔ اور عقل مگر انہوں نے ظلم کرتے ہوئے ان کو ضائع کیا جو فائدے ان سے لینے تھے وہ نہیں لئے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿٤٥﴾ "جس دن ان کو اللہ تعالیٰ جمع کرے گا (وہ گمان کرینگے) گویا وہ دنیا میں نہیں رہے مگر دن کی ایک گھڑی (حصہ) اور آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہونگے یقینا نقصان میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے آخرت کو جھٹلایا اور نہیں تھے وہ ہدایت پانے والے" [45]۔

تفسیر 45 اس آیت میں تخویف اخروی کا بیان ہے اور یہ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ: کا نتیجہ ہے۔ قیامت کی ہولناکی اتنی ہے کہ منکرین لوگ دنیاوی عمر اور قبر کا حال ایک گھڑی اور لمحہ تصور کرینگے: يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ: اس تعارف سے مراد ایک دوسرے کو ملامت کرنے کا تعارف ہے اور ایک دوسرے کو ڈانٹیں گے پھر پریشانیاں اتنی ہونگی کہ ایک دوسرے سے لاتعلق ہونگے یعنی ملامت کیلئے صرف تعارف ہوگا ایک دوسرے کو فائدے دینے کیلئے نہیں ہوگا۔ اس طرح تفسیر میں آیتوں کے آپس میں تعارض دور ہوتا ہے یعنی وہ آیتیں جن میں ذکر ہے کہ یہ لوگ روز قیامت ایک دوسرے کے حال سے بے خبر ہونگے اور ایک دوسرے کا حال بھی نہیں پوچھیں گے جیسا کہ سورۃ مؤمنون آیت 101 میں ذکر ہے کہ (فَلَآ أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ) إِلَّا سَاعَةً۔ یہ قیامت کی دہشت کی وجہ سے انکا گمان ہے یا اس وجہ سے کہ انہوں نے عمر ضائع کی ہے اور آخرت کیلئے کوئی کام نہیں کیا ہے لہٰذا عمر ضائع ہونے اور برباد ہونے کی وجہ سے کہتے ہوں گے کہ ایک ساعت کی مانند دنیاوی زندگی گزر گئی: يَحْشُرُ: کی نسبت سورۃ طٰہٰ آیت 102 میں ذکر ہے سورۃ مؤمنون آیت 113 میں: يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ: ذکر ہوئی ہے اور سورۃ نازعات آیت 46 میں: عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا: وارد ہے اور سورۃ اسراء

آیت 52 میں لفظ قلیل کا ذکر اور سورۃ مومنون آیت 114 میں قَلِیْلًا آیا ہے اور سورۃ روم آیت 55 سورۃ احقاف آیت 35 اور اس آیت میں سَاعَةً: ذکر ہوا ہے: قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا: یہ ماقبل کیلئے علت ہے یعنی بیہوں کا سبب قیامت کا انکار اور توحید کا نہ ہونا ہے۔

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ۝ "اور اگر بعض وہ جو ہم نے ان سے وعدہ کیا تمہیں دکھائے یا تجھے فوت کرے پھر بھی انہوں نے ہمارے پاس آنا ہے پھر اللہ تعالیٰ ان پر جو وہ کر تے ہیں خبردار ہے" [46]۔

تفسیر 46 اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تسلی ہے اور منکرین کیلئے وعید اور خوف ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یا تو ہم ان کو دنیا میں عذاب دینگے جیسے آپ دیکھ لینگے اور اگر دنیا میں ان کو عذاب نہیں دیا تو قیامت میں ضرور ان کو عذاب دینگے لہٰذا آپ ان کے عذاب سے بے پرواہ ہو جائیں: اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ: اس کے بعد جَزَاءَهُمْ: مقدر ہے یعنی آپ آخرت میں دیکھ لینگے: فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ: یہ مخفی جزاء کی علت ہے اس طرح سورۃ مومن آیت 77 اور سورۃ زخرف آیت 41، 42 میں بھی آیا ہے: ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ: اس میں اشارہ ہے کہ ان کے اعمال پر کسی کو گواہ بنانے کی ضرورت نہیں ہیں اللہ تعالیٰ ان پر خود خبردار ہے: وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ: اس کیلئے جزاء مقدر ہے یعنی آپ کو تسلی ہو جائے گی۔ فائدہ اس آیت میں: نُرِيَنَّكَ: کا مقابلہ: نَتَوَفَّيَنَّكَ: سے ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ وفات کے بعد دنیا کے حال واحوال سے فوت شدگان بے خبر ہوتے ہیں اگر چہ وہ انبیاء ہی کیوں نہ ہوں۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ "ہر امت کیلئے رسول ہے (جو ان پر قیامت کے دن گواہی دیگا) پس جب انکا رسول (گواہی کیلئے) آجائے تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر کچھ ظلم نہ ہوگا" [47]۔

تفسیر 47 اس آیت کا تعلق تخویف اخروی کے ساتھ ہے۔ اسکا ایک معنی یہ ہے کہ ہر گزری ہوئی امت کیلئے رسول مقرر کیا گیا تھا پھر جب قیامت کے دن ان پہ رسول آکر گواہی دے گا تو ان پر عذاب کا فیصلہ ہوجائے گا یعنی :جَآءَ رَسُوْلُهُمْ: رسول کا برائے شہادت حاضر ہونا مراد ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ہر امت کیلئے رسول مقرر ہوئے تھے پھر جب اللہ کی طرف سے رسول بھیجا گیا اور انہوں نے اس رسول کی دعوت سے انکار کیا تو ان پر عذاب نازل ہوا۔ دوسری تفسیر

کی بناء پر دنیاوی عذاب مراد ہے۔اور: فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ : کے بعد: كَذَّبُوا: مقدر ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾ "اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو" [48]۔

تفسیر48 اس آیت میں انکار کرنے والوں کیلئے وعید ہے چونکہ سابقہ آیت میں عذاب کی طرف اشارہ کیا گیا تو انہوں نے بطور انکار سوال کیا کہ عذاب آنے کی تاریخ بتا دیجئے: إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ: جمع اسلئے ذکر کیا ہے کہ رسول اور مؤمنین سب سے مطالبہ کرتے ہیں۔

قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٤٩﴾ "فرما دیجئے کہ میں اپنی ذات کیلئے نفس نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہتا ہے (وہی کرتا ہے) ہر ایک انکار کرنے والی امت کیلئے (عذاب) کا وقت مقرر ہے جب وہ وقت مقرر آ جائے تو نہ وہ لوگ آگے بڑھ سکیں گے اور نہ ہی پیچھے ہٹ سکیں گے" [49]۔

تفسیر49 یہ منکرین کے سابقہ قول کا جواب ہے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جب میں اپنی ذات سے ضرر ہٹانے اور نفع حاصل کرنے کا اختیار نہیں رکھتا ہوں تو عذاب کی تاریخ بتانا تو بہت دور کی بات ہے البتہ یہ بات اٹل ہے کہ ہر عذاب کیلئے ایک وقت مقرر ہے جس سے وہ مقدم بھی نہیں ہو سکتا اور موخر بھی نہیں ہو سکتا۔ اہم نکتہ: اس طرح مضمون والی آیت سورۃ الاعراف آیت188 میں گزر گیا ہے صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں ضرر سے نفع پہلے ذکر کیا ہے وجہ یہ ہے کہ وہاں قیامت کے علم کی بات تھی جبکہ علم نفع ہے اور یہاں پر عذاب کا ذکر ہے اور عذاب تو ضرر ہے لہذا ہر ایک جگہ اس کی مناسبت سے الفاظ ذکر کئے گیا۔ فائدہ: کافروں کے سابقہ سوال: مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ: کا جواب سورۃ ملک آیت 26 اور سورۃ یٰسین آیت 49 میں ایک اور طریقے سے ذکر ہوا ہے جبکہ یہاں پر اس سے مختلف ہے وجہ یہ ہے کہ یہاں پر اعتراض رسول کی رسالت پر تھا تو جواب میں رسول کی شان بیان ہوئی ہے اور ان دونوں جگہوں میں عذاب کی خبر دینا مقصود ہے اس لئے اسی کی مناسبت سے بات کی گئی: إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ : اس طرح سورۃ نحل آیت 61 سورۃ اعراف آیت 34 میں بھی ہے وہاں فرق کی وجہ بیان ہوئی ہے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ﴿٥٠﴾ "آپ فرما دیجئے کہ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب رات یا دن کو آ جائے تو کونسی وہ چیز ہے جس سے مجرم (اپنی جان بچانے کیلئے) جلدی کر سکیں

گے"[50]۔

تفسیر 50 اس آیت میں عذاب کی وعید کے ساتھ منکرین کیلئے ذلت اور خوف بھی ہے کہ جب ان پر رات کے وقت یا دن کے وقت عذاب الٰہی آ جائے تو یہ منکرین اس وقت اپنے بچاؤ کیلئے اچانک کیا تدبیر کریں گے :بَيَاتًا: ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور :لَيْلًا: کے معنیٰ میں ہے :فَمَاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ: اسکا ایک معنیٰ تو یہ ہے کہ کتنا بڑا عذاب ہے جسکو مجرمین اللہ تعالیٰ سے طلب کرتے ہیں اس توجیہ کے اعتبار سے (إِنْ) کا جزاء مقدر ہے۔ اپنے مطالبہ پر نادم ہونگے جو انہوں نے عذاب جلدی طلب کیا تھا اس معنیٰ میں : مِنْهُ: کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور یہ مَاذَا: استفہام انکاری کیلئے برائے تعظیم ہے۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ ان مجرموں کے پاس کونسی تدبیر ہے جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آ پہنچے تو جلدی یہ مجرمین اس تدبیر کو اختیار کرلیں اس معنیٰ میں :مِنْهُ: کی ضمیر :مَاذَا: کی طرف راجع ہے اور (مَا):أَيُّ شَيْءٍ: کے معنیٰ میں ہے اور :ذَا الَّذِي: کے معنیٰ میں ہے اور یہ (إِنْ) کیلئے جزا ہے۔

أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ ۚ آلْآنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ۝ "کیا پھر جب (عذاب) الٰہی جائے تو تم اس پر ایمان لاؤ گے کیا اب (ایمان لاتے ہو) اور یقیناً تم اسی کی جلدی آنے کا مطالبہ کرتے تھے"[51]۔

تفسیر 51 اس آیت کا تعلق گزشتہ آیت سے ہے مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ تدبیر کریں گے کہ عذاب کے آنے پر ایمان لے آئیں گے تو اس وقت ملائکہ انکو جواب دیں گے کہ اب ایمان لاتے ہو جبکہ اس سے قبل تو عذاب کی خواہش رکھتے تھے لہٰذا اب ایمان کی قبولیت کا وقت نہیں :آلْآنَ: اس سے پہلے مقدر عبارت ہے یعنی ان کو کہا جائے گا اس طرح اس سورۃ کے آیت 91 میں بھی ہے۔

ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ۝ "پھر ظالموں سے کہا جائے گا دائمی عذاب کا مزہ چکھو تمہیں بدلہ نہیں دیا جاتا مگر ان اعمال کا جو تم کرتے تھے"[52]۔

تفسیر 52 آیت میں تخویف دنیوی ہے اگر :عَذَابَ الْخُلْدِ: سے دنیوی عذاب مراد ہو تو یہ اس صورت میں ماقبل سے متعلق ہوگا اور دنیاوی عذاب کو ہمیشگی کا عذاب اس وقت کہا جاتا ہے جب عذاب میں مارے جائیں۔ اگر عذاب الْخُلْدِ: سے آخرت کا عذاب مراد ہو تو یہ خوف اخروی کیلئے ہے۔

وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ۝ "اور آپ سے پوچھتے ہیں کہ عذاب قیامت

حق ہے فرما دیجئے مجھے میرے رب کی قسم ہے البتہ وہ حق ہے اور تم اس عذاب سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے ہو" [53]۔

تفسیر 53 اس آیت میں منکرین عذاب اور منکرین قیامت کیلئے وعید ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قیامت ثابت کرنے کیلئے اپنی ذات پر قسم اٹھائی ہے اس طرح سورۃ مریم آیت 68 سورۃ سبا آیت 3 سورۃ تغابن آیت 7 میں ذکر ہے: ھُوَ: ضمیر اس عذاب کی طرف راجع ہے جسکا وعدہ کیا گیا ہے اور وہ دائمی عذاب قیامت کا عذاب ہے۔ بِمُعْجِزِیْنَ: یہ لازم ہے عذاب سے بچنے کے معنی میں یا پھر متعدی ہے یعنی اپنے آپ کو بچانے والا۔ یا اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والا یہ بات تو واضح ہے کہ جس کام سے کوئی عاجز ہو جائے تو وہ کام رہ جاتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ۗ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ "اگر ہو ہر جان کیلئے جس نے ظلم (شرک) کیا جو کچھ زمین میں تب بھی ضرور اس کو بدلہ میں دے کر جان چھڑانے لگیں گے اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو اپنی شرمندگی کو پوشیدہ رکھیں گے اور انصاف کے ساتھ ان کا فیصلہ ہوگا اور ان کے ساتھ ظلم نہیں ہوگا" [54]۔

تفسیر 54 اس آیت میں تخویف قیامت کا بیان ہے کہ قیامت قائم ہوگی مشرکین کو نہ فدیہ دینے پر نجات ملے گی اور نہ ہی ندامت اور رسوائی ان کو بچا سکیگی۔ فائدہ: وَاَسَرُّوْا: لفظ: اَضْدَادْ: میں سے ہے جس کے دو معنی ہیں جو آپس میں مخالف ہیں ایک معنی یہ ہے کہ مشرکین کے بڑے اپنے مریدوں تابعداروں سے ندامت کو چھپائیں گے مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ آگ میں داخل نہیں ہوئے ہونگے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ اپنی ندامت کو عذاب دیکھ کر ظاہر کر دینگے اور اور حیرت میں مبتلا ہو جائینگے: اَفْتَدَتْ بِهٖ: اس کے بعد لفظ: مَا تُقُبِّلَ مِنْهَا: مخفی ہے یعنی یہ فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا جیسا سورۃ العمران آیت 91 اور سورۃ مائدہ آیت 41 میں ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ "خبردار یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خبردار! یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے مگر لوگوں کی اکثریت نہیں جانتی" [55]۔

خلاصہ: یہاں سے آیت 70 تک سورۃ کا چوتھا باب ہے اس میں شرک فعلی کا رد کیا گیا ہے اور: اِتِّخَاذِ وَلَدْ: یعنی بیٹا بنانے

کے عقیدہ پر بھی رد ہے اور اللہ تعالی کے غیب دان اور کارساز ہونے پر عقلی دلائل ہیں قرآن کی طرف ترغیب اور ایمان والوں کیلئے خوشخبری ہے۔

تفسیر55 اس آیت میں دلیل ہے کہ ہر چیز کے اختیار اللہ تعالی کے پاس ہے اور دوسرے جملے میں مرنے کے بعد دوسری زندگی کا ثبوت ہے: وَعْدَ اللّٰهِ: سے مراد وہ ہے جو سابقہ آیتوں میں گزر چکا ہے اور: إِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ :فدیہ قبول نہ کرنے پر دلالت کرتا ہے۔

هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ "وہی اللہ تعالی زندگی اور موت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے" [56]۔

تفسیر56 اس آیت میں بھی دلیل عقلی ہے کہ موت اور زندگی کا اختیار اللہ کے پاس ہے اور آخری جملے میں اثبات قیامت ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ "اے لوگوں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آچکی ہے اور جو بیماریاں سینوں میں ہیں اس کیلئے شفاء ہے اور ایمان والوں کیلئے ہدایت اور رحمت ہے" [57]۔

تفسیر57 اس آیت میں قرآن مجید کی طرف ترغیب ہے چونکہ سابقہ آیتوں میں عذاب اور قیامت کا ذکر گزر گیا تو اب اس آیت میں عذاب قیامت سے بچنے کا ذریعہ ذکر کر رہے جو قرآن مجید ہے۔ نیز قرآن مجید کی چار صفتوں کا ذکر ہوا ہے پہلی صفت: مَّوْعِظَةٌ: یعنی برے اخلاق سے منع کرنے والا۔ وعظ وہ نصیحت ہے جس کے ساتھ وعید بھی ہو (تفسیر خازن) دوسری صفت: شِفَاءٌ: دلوں کی بیماریوں کا علاج ہے جو شرک، نفاق، بغض، شکوک وغیرہ کو شامل ہیں ان دونوں صفات کو صفات تخلیہ: کہتے ہیں تیسری صفت: هُدًى: اچھے عقائد واعمال کیلئے راہنما ہے۔ چوتھی صفت: رَحْمَةٌ: دل کیلئے نرمی کا سبب ہے اور ایمان والوں پر رحمت الہی کے نزول کا سبب ہے۔ ان دونوں صفات کو صفات تحلیہ: و تجلیہ: کہا جاتا ہے۔ فائدہ: پہلے ضرر کو ہٹانا لازم ہوتا ہے تو اس کیلئے: مَّوْعِظَةٌ وَشِفَاءٌ: بیان فرمایا ہے اور: هُدًى وَرَحْمَةٌ: میں فائدہ نفع ہے اس لئے اس کو بعد میں ذکر کیا ہے۔ اور ضرر کو ہٹانے کے بھی دو طریقے ہیں: (1) ضرر سے منع کرنا (2) پہلے سے موجود ضرر کو زائل کرنا۔ پہلی بات کی طرف: مَّوْعِظَةٌ: میں اشارہ ہے اور دوسری کی طرف: شِفَاءٌ: میں اشارہ ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾ "آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت پر ان کو خوش ہونا چاہئے یہ (قرآن) اس مال سے بہتر ہے جس کو لوگ جمع کرتے ہیں" [58]۔

تفسیر 58 اس میں بھی قرآن کی طرف ترغیب ہے۔ فَبِذٰلِكَ: میں فضل و رحمت کے مجموعہ کی طرف اشارہ ہے اس کلام میں اختصار کیا گیا ہے اصل عبارت اس طرح ہے بِذٰلِكَ يَفْرَحُوْا بِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا بِذٰلِكَ: اور اس تکرار میں زیادہ تاکید مقصود ہے: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ: فَضْلُ اللّٰهِ: سے قرآن مراد ہے اور رحمت سے توحید و سنت مراد ہے۔ دونوں ایمان والوں کیلئے خوشی کے اسباب ہیں۔ اس لئے حدیث میں وارد ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اسلام کی ہدایت اور علم قرآن دیدے اور پھر بھی وہ لوگوں کو اپنی فقیری محتاجی بیان کرتا ہے تو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان اللہ تعالیٰ موت تک فقیری مسکینی لکھ دیگا۔ نوٹ: مذکورہ لفظوں میں یہ روایت ہمیں نہیں ملی البتہ کچھ فرق کے ساتھ یہ روایت ملی ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، احمد، بیھقی فی سنن کبریٰ قال الشیخ البانی اسنادہ صحیح و رجال الثقات کما قال البوصیری فی الزوائد۔ الصحیحہ حدیث 950)۔ دوسرا قول یہ ہے کہ فضل سے قرآن مراد ہے اور رحمت سے وہ لوگ مراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ قرآن کا اہل بنادے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ فضل سے قرآن اور رحمت سے سنت مراد ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ اٰۗللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَي اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ "آپ فرما دیجئے کہ تم غور و فکر کرو تمہارے لئے جو رزق اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے پھر تم اس میں سے کچھ کو حلال اور کچھ کو حرام قرار دیتے ہو۔ آپ پوچھئے کہ کیا تمہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے یا اللہ پر جھوٹ ہی بناتے ہو" [59]۔

تفسیر 59 اس آیت میں شرک فعلی کا رد ہوا ہے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید موجود ہے اور توحید کے دلائل بیان ہو چکے ہیں تو پھر کیوں تم اپنی جانب سے حلال اور حرام قرار دیتے ہو: مِّنْ رِّزْقٍ: مراد مویشی، فصلیں وغیرہ جو بھی اموال ہیں یہ آسمانی برکات سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے: اَنْزَلَ: ارشاد فرمایا ہے اس آیت میں ان لوگوں پر سخت تنقید ہے جو بلا دلیل کسی کی تقلید سے حلال و حرام جائز ناجائز گرادنتے ہیں اس کو: شِرْكٌ فِي التَّشْرِيْعِ . فِي الْحُكْمِ اور فِي التَّحْلِيْلِ وَ التَّحْرِيْمِ: کہا جاتا ہے۔

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَھُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾

"ان لوگوں کا کیا گمان ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں (کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ) قیامت کے دن (کیا معاملہ کریگا)۔ یقیناً اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن لوگوں کی اکثریت شکر نہیں ادا کرتی" [60]۔

تفسیر 60 اس آیت میں شرک فعلی (عملی) کرنے والوں کیلئے ڈانٹ ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں إِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ: اس فَضْلٍ: سے دنیا کی نعمتوں کی مہلت مراد ہے: فَضْلٍ: سے قرآن مراد ہے جس میں حلال وحرام کے فیصلے موجود ہیں: يَوْمَ الْقِيَامَةِ: یہ ظَنُّ: کی وجہ سے منصوب ہیں یعنی انکا قیامت کے بارے میں کیا گمان ہے یا مقدر کلام اس طرح ہے: مَاذَا يَفْعَلُ بِهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۱﴾ "اور آپ کسی حال میں نہیں ہوتے ان احوال میں سے کبھی جس میں آپ قرآن پڑھتے ہو اور جو کام بھی کرتے ہو مگر ہمیں سب کی خبر ہے جب تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو۔ اور آپ کے رب سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں زمین میں اور نہ آسمان میں نہ اس سے کوئی چیز چھوٹی اور نہ ہی بڑی ہے مگر سب (اللہ تعالیٰ کے علم) کتاب مبین میں ہے" [61]۔

تفسیر 61 اس آیت میں عقلی دلیل ہے کہ ہر چیز پر عالم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے: فِيْ شَاْنٍ: اس کو جب مصدر بنائے تو معنیٰ قصد کرنے کا ہوگا کبھی اسم مصدر ہوتا ہے جسکا معنیٰ ہر حال اور کام کا ہوتا ہے جو مقصود ہوتا ہے یہاں پر نبی کریم ﷺ کے حالات اور اوقات مراد ہیں جو تنہا ہونے کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں: وَمَا تَتْلُوْ مِنْهُ: اس میں امت کو قرآن سنانے اور درس دینے کی حالت ذکر ہے: مِنْهُ: کی ضمیر اللہ کیطرف راجع ہے اور: مِنْ قُرْاٰنٍ: اس میں: مِنْ بَعْضِيَةٍ: ہے یا ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے دوسری بات کہ قرآن سے مراد ٹکڑا ہے جیسے کوئی آیت یا سورۃ: وَلَا تَعْمَلُوْنَ: سے امت کے تمام اعمال مراد ہیں: كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ: اس سے لوح محفوظ مراد ہے جو علم الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فائدہ: فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ: اس طرح سورۃ سباء آیت 3 میں بھی ہے۔ سوال: یہاں پر: فِي الْاَرْضِ: کو مقدم کیا ہے اور سورۃ سباء میں مؤخر ہے۔ جواب: یہاں پر زمین والوں کے احوال بیان ہوئے ہیں اس لئے: اَلْاَرْضِ: کو مقدم کیا ہے: وَلَاۤ اَصْغَرَ: یہ لائے نفی جنس کیلئے اسم ہے جو کہ منصوب ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ "خبردار کوئی خوف اور غم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دوستوں

پر نہیں ہوگا" [62]۔

تفسیر 62 اس آیت میں نیک لوگوں کیلئے خوشخبری ہے اس سورت میں اولیاء اللہ کا ذکر اس غرض سے کیا گیا ہے کہ لوگ اُن کو شفعاء (سفارشی) مانتے ہوئے ان کی بندگی کرتے ہیں تو اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے انکا حال ذکر کیا ہے۔ کہ وہ أَوْلِيَآءَ اللهِ: تو ہو سکتے ہیں مگر شفعاء نہیں ہیں: أَوْلِيَآءَ اللهِ: ان کی ولایت حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے عبادت اور اطاعت کی صورت میں محبت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ولایت ان سے محبت ہے اور انکی حفاظت ومدد ہے۔ اور دوسرا معنیٰ سورت بقرہ آیت (257) کے ساتھ موافق ہے: لَا خَوْفٌ: ان پر قبر اور حشر میں خوف وغم نہیں ہوگا۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ہر گناہ سے اجتناب کیا کرتے تھے۔" [63]

تفسیر 63 اس آیت میں دو صفتوں کے ذریعے اولیاء اللہ کی پہچان کی گئی ہے۔ پہلی صفت ایمان ہے جس سے کامل ایمان مراد ہے دوسری صفت تقویٰ ہے یعنی شرک بدعت اور ہر قسم کے گناہوں سے اجتناب ہے مفسر خازن نے لکھا ہے کہ اولیاء اللہ وہ ہیں جن کا عقیدہ دلائل پر قائم ہوتا ہے یعنی اہل توحید اور ان کا عمل شریعت (سنت) کے موافق ہوتا ہے ایک مرسل روایت میں یہ بھی ہے کہ اولیاء اللہ وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آئے۔ (مجمع الزوائد حدیث 16779، طبرانی کبیر حدیث 12325، الصحیحۃ حدیث 1733، نسائی فی التفسیر 12305)۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ جو شخص شرک یا بدعت کے ذریعے حکم شرعی کی مخالفت کرتا ہے وہ ولی اللہ نہیں ہو سکتا۔ علامہ خطیب شربینی نے قشیری سے نقل کیا ہے کہ نبی کے لیے عصمت شرط ہے اور ولی کے لیے گناہوں سے اپنی حفاظت شرط ہے لہٰذا جس شخص سے شریعت کی مخالفت ثابت ہو وہ ولی اللہ نہیں قرار دی ہے۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٤﴾

"ان کیلئے دنیا و آخرت میں خوشخبری ہے اللہ تعالیٰ کے کلمات (وعدوں) میں کوئی تبدیلی نہیں ہے اور یہ عظیم کامیابی ہے۔" [64]

تفسیر 64 اس آیت میں اولیاء کرام کیلئے بشارت وخوشخبری ہے۔ دنیا میں خوشخبری کا معنیٰ یہ ہے کہ موت کے وقت ملائک ان کو جنت کی خوشخبری دیتے ہیں۔ اچھے خواب بھی دکھاتے ہیں نیز صحیح مسلم کتاب البر و الصلۃ حدیث 2642 کی

حدیث میں ہے کہ صالح آدمی کی نیکیوں پر لوگ اس کی تعریفیں کرتے ہیں تو یہ مومن کیلئے دنیاوی بشارت ہے۔ لفظ:
اَلْبُشْرٰی: عام ہے ملائکہ کی طرف سے ہو یا انسانوں کی طرف سے ہو اور آخرت میں جب قبروں سے اٹھیں گے تو ملائکہ
ان کو خود جنت کی خوشخبری دینگے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۚ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٥﴾

"ان کی باتیں آپ کو غمگین نہ کریں یقیناً ساری کی ساری عزتیں اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں وہی خوب سننے والا اور جاننے والا ہے"۔[65]

تفسیر 65 اس آیت میں نبی کریم ﷺ اور انکے ساتھیوں کو تسلی و اطمینان دینا مقصود ہے یعنی مخالفین تمہاری عزت کم کرنے کیلئے تم پر الزام تراشی اور جھوٹ باندھتے ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑیگا۔ کیونکہ عزت اللہ تعالیٰ کے پاس ہے سابقہ آیت سے ربط یہ ہے کہ اولیاء اللہ پر توحید وسنت کی وجہ سے لوگ طعن وتشنیع کرتے ہیں تو انہیں اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی عزت میں فرق آتا ہے۔

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿٦٦﴾

"یاد رکھو جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے سب ہی اللہ کا ہے اور جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے شرکاء کی عبادت کرتے ہیں وہ کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے ہیں صرف بے بنیاد خیال کے پیروکار ہیں۔ اور فقط اٹکلوں میں مصروف ہیں"۔[66]

تفسیر 66 اس آیت میں مشرکین کیلئے وعید ہے اور یہ دلیل عقلی اور: إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا: کیلئے علت بھی ہے۔ اس آیت میں مَنْ: ذکر کیا ہے جو ذوی العقول یعنی انسان، جنات اور ملائکہ کے ساتھ خاص ہے، اور آیت (55) میں لفظ (ما) ذکر کیا ہے جو غیر ذوی العقول کیلئے ہے یا پھر عام ہے اور اس آیت میں لفظ بمَنْ: اسلئے ذکر کیا ہے کہ اس میں اولیاء اللہ داخل ہو جائیں اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اولیاء اللہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور ملکیت میں ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے:
وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ: اس جملے کی دو تفسیریں ہیں۔ پہلی تفسیر یہ ہے: شُرَكَاءَ: يَتَّبِعُ: کیلئے مفعول اور اس سے مراد اولیاء اللہ تھے تو معنی یہ ہوا کہ مشرکین اولیاء اللہ کی دینی امور میں پیروی نہیں کرتے اور انہیں اللہ

تعالیٰ کا ویسے ہی شریک ٹھراتے ہیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ: شُرَكَآءَ: يَدْعُوْنَ: کیلئے مفعول ہے اور: يَتَّبِعُ: کا مفعول حذف کیا گیا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اولیاء اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور ان کو مدد کیلئے پکارتے ہیں تو وہ دلیل کے پیروکار نہیں ہیں بلکہ گمان کے پیروکار ہیں۔ اور ان دونوں توجیہات میں لفظ (ما) نافیہ ہے اور آخری توجیہ کے ساتھ (ما) استفہامیہ بھی ہوسکتا ہے: إِنْ يَتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُوْنَ: سوال: إِنْ: اور: إِلَّا: حصر کے کلمات ہیں اور کسی ایک چیز میں حصر دو طریقوں سے صحیح نہیں ہوسکتا ہے؟ جواب ۱: پہلا حصر ان کی اتباع اور دلیل کا ہے۔ اور دوسرا حصر ان کی شرکیہ باتوں کا ہے وہ سب جھوٹ ہے؟ جواب ۲: یہ ہے کہ: اَلظَّنَّ: دو قسم پر ہے پہلا یہ ہے کہ جسکی مستند شرعی دلیل ہو۔ دوسرا وہ ہے جسکی دلیل نہ ہو تو دوسرے جملے میں اشارہ ہوا کہ انکا: اَلظَّنَّ: بے دلیل ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ۝۶۷

"اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے رات کو (اندھیرے والا) بنایا تا کہ اس میں تم آرام کرو اور دن کو روشن بنایا (تا کہ اس میں معاش کی تلاش کرو) یقیناً اس میں سننے والی قوم کیلئے اللہ تعالیٰ کی عظمت کے دلائل ہیں" [67]۔

تفسیر 67 هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا: یہ توحید کیلئے دلیل عقلی ہے اس آیت میں اختصار کیلئے ایک لفظ گرا دیا ہے اصل عبارت اس طرح ہے۔ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ مُظْلِمًا: اور مُبْصِرًا: کے بعد لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ: مقدر ہے سورۃ قصص آیت 73 میں اسی طرح وارد ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۸

"وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہیں سبحان اللہ (وہ تو اولاد سے پاک ہے) وہ تو کسی کا محتاج نہیں اسی کی تو ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے اس پر تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں کیا اللہ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے ہو" [68]۔

تفسیر 68 اس آیت میں ان لوگوں کے لئے وعید ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں اور اس عقیدے پر پانچ طریقوں سے رد کیا گیا ہے اور اسی طرح مشرکین کے اس نظریئے کا رد بھی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہماری سفارش اللہ تعالیٰ کو محبوب مطلق ہے یعنی ہم اللہ تعالیٰ کو لاڈلے اولاد کی طرح محبوب ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان کی سفارش ضرور قبول فرماتا

ہے تو اس عقیدہ پر اللہ تعالیٰ نے رد کیا ہے۔ اور لفظ: اِتَّخَذَ: صریح دلیل ہے کہ اس سے حقیقی: وَلَدً: مراد نہیں ہے بلکہ حکمی ولد مراد ہے جیسا کہ اولاد میں باپ کی صفات پائی جاتی ہیں مشرکین کہتے ہیں کہ اس طرح اللہ کی الوھیت کی صفات اولیاء اللہ میں موجود ہیں۔ نیز اس کی تفصیل سورت بقرہ میں گزر چکی ہے۔

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

"آپ فرما دیجئے یقیناً جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ عذاب الٰہی سے بچ نہیں سکتے" [69]۔ ان کیلئے عارضی تھوڑا مزا ہے دنیا کی زندگی میں پھر انکو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے پھر ان کے کفر کے سبب ہم ان کو سخت عذاب چکھائیں گے" [70]۔

تفسیر 69، 70 ان دونوں آیتوں میں ان لوگوں کیلئے وعید ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں اَلْكَذِبَ: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف ولد کی نسبت اور شریک ٹھہرانے کا عقیدہ ہے: مَتَاعٌ: میں سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ جب یہ نجات پانے والے نہیں اور قیامت میں عذاب چکھیں گے تو ان کے پاس دنیا میں مال و متاع طویل عمریں ساز و سامان کیوں ہے؟ جواب ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی دنیاوی تقسیم ہے جو اللہ تعالیٰ کافروں کو بھی دیتا ہے اور یہ ان کیلئے مہلت ہے اور: لَهُمْ: مقدر مراد ہے: نُذِيْقُهُمُ: ذوق سے تعبیر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عذاب ان کے ہر عضو جسم کے ہر جوڑ کو احاطہ کرے گی: اَلْعَذَابَ الشَّدِيْدَ: میں اشارہ ہے کہ آخرت کا عذاب قبر اور دنیا کے عذاب سے سخت ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾

"اور آپ ان کو نوح علیہ السلام کا قصہ پڑھ کر سنائیں! جب انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! اگر تمہیں میرا رہنا اور احکام الٰہی کی نصیحت کرنا بھاری لگتا ہے تو میرا اللہ ہی پر بھروسہ ہے تم شرکاء سمیت اپنی تدبیر پختہ کر لو پھر تمہاری تدبیر تم پر مخفی نہ رہے پھر فیصلہ لے آؤ میرے پاس اور مجھے مہلت بھی نہ دو" [71]۔

خلاصہ: اس آیت سے سورۃ کے آخر تک پانچواں باب ہے اس میں منکرین کے دنیاوی عذاب کیلئے بطور نمونہ موسیٰ اور نوح

ہما السلام کی قوم کی ہلاکت کا بیان ہے اور ان دونوں واقعات کی تخصیص دو وجوہات سے ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم کا واقعہ ابتداء میں ہے اور فرعون کی ہلاکت آخر میں ہے تو باقی واقعات اشارتاً بیچ میں آگئے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سورۃ کی آیت 22 میں غرق ہونے کے وقت مشرکین کے ڈر اور خوف کا ذکر ہوا تھا تو اس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے قدرت اور ارادے سے ہوتا ہے وہ چاہے تو قوم نوح اور فرعونیوں کی طرح سب کو غرق کردے اور وہ چاہے تو یونس علیہ السلام کی قوم طرح غرق ہونے سے بچالے اور اس کی قوم کو توبہ کی قبولیت کی وجہ سے عذاب سے بچالیا۔ اس باب میں عذاب آنے سے قبل توبہ کی طرف ترغیب کیلئے یونس علیہ السلام کی قوم کا ذکر ہے اور آخر میں شرک کے اقسام کا رد اور ترغیب الی القرآن کیلئے ہمارے نبی ﷺ کا ذکر ہے۔

تفسیر 71 آیت میں نوح علیہ السلام کے واقعہ کا بیان ہے اور یہ واقعہ برائے خوف اور تسلی کیلئے ذکر ہوا ہے اس وجہ سے اس میں مسئلہ توحید ذکر نہیں ہوا: مَّقَامِيْ: میم پر زبر پڑھنے کے ساتھ قیام کو کہتے ہیں تو معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام (اکثر) اوقات کھڑے ہو کر درس دیتے تھے: وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: یہ دلیل ہے کہ تمام انبیاء کی دعوت و تبلیغ اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے تھی: فَعَلَى اللّٰهِ: اس سے پہلے لفظ مقدر ہے یعنی: فَعَزَمْتُمْ عَلٰى قَتْلِيْ وَاِيْذَائِيْ: یعنی تم لوگوں نے میرے قتل و ضرر کا عزم کر رکھا ہے۔ اس آیت میں نوح علیہ السلام کی دلیری کا ذکر ہوا ہے: ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً: مطلب یہ ہے کہ تم اپنے کام کو میرے مقابلے میں ظاہر کرو اسلئے جو کوئی ایک کام چھپ کر کرتا ہے تو وہ مقصد تک نہیں پہنچ سکتا: ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ: میرے بارے میں جو فیصلہ کرلو تو مجھ تک پہنچادو یا تکلیف مراد ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

"پھر بھی اگر تم اعراض پر مصر ہو تو میں نے تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا ہے میرا معاوضہ تو ذات الٰہی پر ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تابعداروں میں سے رہوں" [72]۔

تفسیر 72 اس آیت میں نوح علیہ السلام کے اخلاص بے لوث ہونے کا بیان ہے کیونکہ طمع رکھنے والا انسان پورا حق بیان نہیں کرسکتا اسلئے فرمایا کہ مجھے تم سے کوئی طمع نہیں: فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ: اس کی جزاء مقدر ہے یعنی مجھے کوئی ملامت یا پرواہ نہیں۔ اور بعد والا جملہ جزاء کیلئے علت ہے۔ چونکہ انبیاء کرام پر دعوت دینا فرض عین ہے اس لئے ان کیلئے اجرت لینا منع ہے اسی طرح جس پر کوئی عمل فرض عین ہو تو صرف اس کی ادائیگی پر اجرت لینا حرام ہوتا ہے: مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ: اللہ تعالیٰ کے حکم کا بے

لوٹ مخلص پیروکار اور اسی کی طرف دعوت دینے والا خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے: اَلْمُسْلِمِیْنَ: سے انبیاء علیہم السلام کی جماعت مراد ہے یعنی اس خالص دعوت دینے پر بلا معاوضہ انبیاء کرام کی نقش قدم پر ہوں۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ اسلام تمام انبیاء کا دین ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝

"پس ان لوگوں نے اس کو جھٹلایا لہٰذا ہم نے ان کو اور جو ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے نجات دی اور ہم نے انہیں جانشین بنایا اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کو غرق کیا تو دیکھو کہ کس طرح انجام ہوا ان لوگوں کا جو ڈرائے گئے تھے" [73]۔

تفسیر 73 اس آیت میں منکرین کیلئے عذاب اور نوح علیہ السلام کے ساتھیوں کیلئے نجات کا ذکر ہے: فَكَذَّبُوْهُ: یہ عذاب کا سبب ہے: خَلٰٓئِفَ: یعنی نوح علیہ السلام کی اولاد کو زمین میں آباد کیا جیسا کہ سورۃ صافات آیت 77 میں مذکور ہے: الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا: اس میں دلیل ہے کہ صرف مخالفین مکذبین نوح علیہ السلام غرق ہوئے ہیں ساری زمین پر طوفان نہیں آیا ہے اس طرح تفصیل سورۃ اعراف اور سورۃ ھود میں گزر گئی ہے: فَانْظُرْ: میں عبرت اور غور و فکر کرنا مراد ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

"نوح علیہ السلام کے بعد ہم نے اور رسولوں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا لہٰذا وہ ان کے پاس روشن دلائل اور نشانیاں لائے پھر جس چیز کو انہوں نے اول سے جھٹلایا نہیں تھے وہ کہ اس پر ایمان لاتے اللہ تعالیٰ اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگاتا ہے" [74]۔

تفسیر 74 اس آیت میں انبیاء سے دلائل نقلی ذکر کئے ہے اور منکرین کے تین درجات ذکر ہیں۔ (1) جھٹلانا (2) ایمان نہ لانا (3) دلوں پر مہر: بِمَا كَذَّبُوْا: اس میں دو توجیہ ہیں پہلی توجیہ یہ ہے کہ: لِيُؤْمِنُوْا: اور كَذَّبُوْا: کا ایک ہی مرجع ہے اور قبل سے مراد پہلی حالت ہے یعنی پہلی حالت میں انہوں نے جھٹلایا اور پھر ایمان سے محروم ہو گئے۔ دوسری توجیہ

لِیُؤْمِنُوْا: کی ضمیر بعد والی قوموں کی طرف راجع ہے اور: کَذَّبُوْا: کی ضمیر نوح علیہ السلام کے قوم کی طرف راجع ہے اور کَذَّبُوْا: کی با میں دو احتمالات ہیں پہلا احتمال یہ ہے کہ باسببیہ ہے یعنی پہلی قوموں کی تکذیبوں کے سبب سے بعد والے بھی (انکی تقلید کی وجہ سے) ایمان سے محروم ہو گئے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ با: لِیُؤْمِنُوْا: کیلئے صلہ ہے تو معنیٰ یہ ہوا کہ بعد والے اس چیز پر ایمان نہیں لائے جسکی تکذیب پہلے والے کر چکے تھے: کَذٰلِكَ: اس میں (ك) برائے علت ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝

"پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا پس انہوں نے تکبر کیا ہماری آیتوں سے اور وہ مجرم قوم تھی" [75]۔

تفسیر 75 اس آیت میں دلیل نقلی ہے موسیٰ علیہ السلام سے اس میں منکرین کو دنیاوی عذاب سے خوف دلانا مقصود ہے اور موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کی بہادری بھی ذکر ہے: فَاسْتَكْبَرُوْا: توحید اور رسالت سے انکار تکبر کی وجہ سے تھا: مُّجْرِمِيْنَ: یعنی کھل کر جرم کا ارتکاب کرتے تھے بعد والی آیتوں میں انکا جرم اور تکبر ذکر ہوا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

"پھر جب ہمارے پاس سے ان کو صحیح دلیل پہنچی تو کہنے لگے کہ یہ تو یقیناً صریح جادو ہے" [76]۔

تفسیر 76 اس آیت میں ان کے تکبر کا ذکر ہے اور حق سے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات مراد ہیں: لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ: چونکہ اس زمانہ میں سحر کا کاروبار بہت زیادہ تھا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ بھی اس پر قیاس کیا۔

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝

"موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے کہ تم حق کے متعلق کہتے ہو جب وہ تمہارے پاس آئے (کہ یہ جادو ہے) حالانکہ جادوگر کامیاب نہیں ہو سکتے" [77]۔

تفسیر 77 اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے منکرین پر رد ہے: لَمَّا جَآءَكُمْ: اس کے بعد: اَتَقُوْلُوْنَ: کا مقول هٰذَا سِحْرٌ: حذف کیا گیا ہے: اَسِحْرٌ هٰذَا: اس میں همزہ استفہامیہ برائے انکار وتوبیخ ہے یا پھر یہ: اَتَقُوْلُوْنَ: کیلئے مقول ہے اور: اَسِحْرٌ: میں همزہ استفہامیہ زیادہ ہے جو برائے (وعید) ڈانٹ ہے: وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ: اس طرح سورۃ طٰہٰ آیت 69 میں بھی ہے۔

قَالُوٓا اَجِئۡتَنَا لِتَلۡفِتَنَا عَمَّا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوۡنَ لَكُمَا الۡكِبۡرِيَآءُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَمَا نَحۡنُ لَكُمَا بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۷۸﴾

"وہ لوگ کہنے لگے کیا تم دونوں اس لئے آئے ہو کہ ہمیں اس دین سے ہٹا دو جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا ہے اور دنیا میں تم دونوں کو برتری حاصل ہو جائے ہم تم دونوں کو کبھی نہیں مانیں گے" [78]

تفسیر 78 اس آیت میں ان کے تکبر کا دوسرا انداز ذکر ہے اور موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام پر دو الزام لگائے ہیں پہلا الزام یہ لگایا کہ تم دونوں بڑوں کے راستے سے ہم کو پھیر دینا چاہتے ہو دوسرا الزام یہ لگایا کہ تم مصر کے بادشاہی ہم سے لینا چاہتے ہو۔ پہلے الزام میں عوام الناس کی ناراضگی اور دوسرے میں اقتدار والوں کی ناراضگی ہے حقیقت میں پہلی بات صحیح ہے مگر دوسری بات غلط ہے۔

وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ائۡتُوۡنِىۡ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيۡمٍ ﴿۷۹﴾

"فرعون نے کہا میرے پاس ماہر جادوگروں کو جمع کرو" [79]۔

تفسیر 79 اس میں فرعون کا تیسرا تکبر ذکر کیا ہے جو ساحروں کے ذریعے مقابلہ کرنا ہے اس طریقے سے وہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جادوگر ہیں مگر کامیاب نہیں ہوا۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمۡ مُّوۡسٰٓى اَلۡقُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ مُّلۡقُوۡنَ ﴿۸۰﴾

"جب جادوگر آئے تو ان کے کہنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ڈالو جو کچھ تم ڈالنے والے ہو" [80]۔

تفسیر 80 اس آیت میں مقدر عبارت اس طرح ہے: قَالَ لَهُمۡ مُّوۡسٰى بَعۡدَ قَوۡلِهِمۡ اَلۡقُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ مُّلۡقُوۡنَ: یعنی پہلے جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ پہلے ڈالتے ہو یا ہم تو ان کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ ڈالو۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف آیت 115 سورۃ طٰہٰ آیت 65 میں ذکر ہوا ہے۔ یہاں چونکہ واقعہ کو مختصر بیان کرنا مقصود ہے اس لئے ان کا قول حذف کیا ہے۔

فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا قَالَ مُوۡسٰى مَا جِئۡتُمۡ بِهِ ۙ السِّحۡرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبۡطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۸۱﴾

"پھر جب انہوں نے ڈالا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کچھ تم لائے ہو یہ تو جادو ہے یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے اثر کو عنقریب ختم کر دیگا یقیناً اللہ تعالیٰ فسادیوں کے عمل کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کرتا" [81]۔

تفسیر81 اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام نے ساحرین پر رد کیا ہے اور جادو کا انجام بتایا ہے کہ (ناکامی ہے) اور اس میں اشارہ ہے کہ جادو فساد ہے: مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ: اس جملہ میں حصر قلب پر دلالت ہے یعنی میرا معجزہ جادو نہیں ہے اور تمہارا عمل جادو ہے۔ فائدہ: تفسیر قرطبی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ اگر رات کو کوئی شخص یہ کلمات مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ: پڑھ کر سو جائے تو جادو کے ضرر سے محفوظ رہے گا۔ اور جس پر جادو کیا گیا ہو یہ آیت اس کے بدن پر لکھ ڈالے تو اس کا سحر زائل ہو جائے گا لیکن لکھنے سے مزید نقصانات پیدا ہوتے ہیں البتہ قرآن کریم پڑھنا ذریعہ شفاء ہے اور ثابت بھی ہے۔

وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿٨٢﴾

"اور اللہ تعالیٰ اپنے فرمان سے حق کو ظاہر کر دیتا ہے اگر چہ مجرموں کو نا گوار ہو" [82]۔

تفسیر82 بِكَلِمَاتِهِ: اللہ تعالیٰ کے دلائل یا مدد کے وعدے یا معجزات مراد ہیں: وَيُحِقُّ اللَّهُ: یہ سَيُبْطِلُهُ پر عطف ہے۔

فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَن يَفْتِنَهُمْ ۚ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ ﴿٨٣﴾

"پس موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے سوائے چند نوجوانوں کے اور وہ بھی فرعون اور اپنی قوم سے ڈرتے کہ ان کو دین سے پھیر نہ دے اور یقیناً فرعون اس ملک مصر میں زور رکھتا تھا اور وہ حد سے بڑا ہوا تھا" [83]۔

تفسیر83 اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی بہادری کا ذکر ہے: إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِ: مراد تھوڑے لوگ ہیں جو عورتیں بچے ضعیف العمر لوگ تھے اور ذُرِّيَّةٌ: لفظ کی تحقیق سورۃ العمران میں گزر چکی ہے۔ اس آیت میں دو توجیہ ہیں پہلی توجیہ یہ ہے کہ: مِّن قَوْمِهِ: میں ضمیر موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے تو مراد وہ بنی اسرائیل ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ ضمیر فرعون کی طرف راجع ہے تو مراد وہ چند لوگ ہیں جو قوم فرعون میں سے ایمان لا چکے تھے جیسا کہ: رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ: جسکا ذکر سورۃ مومن میں مذکور ہے اور فرعون کی بیوی اور جادوگر وغیرہ۔ تو پھر معنی یہ ہوا کہ یہ لوگ ایسے وقت میں ایمان لائے کہ ان کو خوف تھا کہ وہ سخت امتحان میں ڈال دے جائیں گے لیکن انہوں نے ان تمام تکلیفوں کو بالائے طاق رکھا: لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ: اس سے اقتدار اور بادشاہی مراد ہے: وَإِنَّهُ لَمِنَ

الْمُسْرِفِيْنَ: اس سے شرک کفر اور ظلم مراد ہے۔

وَقَالَ مُوسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿٨٤﴾

"موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر توکل کرو اگر تم (تابعدار) مسلم ہو" [84]۔

تفسیر 84 جب وہ ایمان لائے تو فرعون کی طرف سے ان پر مصیبتیں شروع ہو گئیں۔ جب انہوں نے ایمان والوں پر مظالم ڈھائے تو موسیٰ علیہ السلام نے ایمان والوں کو مصائب کے وقت یہ تسلی دی ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اسلام و ایمان میں کمال تب ہے کہ اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں۔ اس آیت میں اسلام اور ایمان دونوں جمع کئے ہیں لہٰذا ایمان صفت قلبی ہے اور اسلام ظاہری احکام الٰہی پر عمل ہے اور ایمان کیلئے جزا مقدر: فَاصْبِرُوْا وَاثْبُتُوْا: ہے یہ آیت اس بات پر صریح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اسلام پر عمل کا تقاضہ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ پر مکمل توکل کرے۔

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٥﴾

"انہوں نے عرض کیا کہ ہم نے اللہ پر توکل کیا ہے۔ اے ہمارے رب ہم کو ظالموں کیلئے فتنہ نہ بنانا" [85]۔

تفسیر 85 رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً: اس فتنہ سے مراد ظالموں کے ہاتھوں سے عذاب میں مبتلا ہونا ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحانات مراد ہیں جو ظالموں کیلئے فتنہ ہے کیونکہ عام لوگوں کی عادت ہے کہ جب ایمان والوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ لوگ حق پر ہوتے تو مصیبتوں میں مبتلا نہ ہوتے۔ حالانکہ یہ امتحان ہے۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا: اس میں اشارہ ہے کہ توکل کے ساتھ دعا بھی شامل کرنی چاہئے۔

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾

"اور ہمیں اپنی رحمت کے ذریعے سے کافر قوم سے نجات عطاء فرما" [86]۔

تفسیر 86 اس آیت میں دلیل ہے کہ بہتر وسیلہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دعا طلب کرنا ہے۔ یہ نجات عام ہے ظالم قوم کی ہلاکت کے ذریعے سے ہو یا توفیق ہجرت کے ذریعے سے ہو یا دونوں مراد ہوں یہاں پر دونوں کام ہو گئے ایمان والوں کو ہجرت کی توفیق عطاء فرمائی اور ظالموں کو ہلاک کر ڈالا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

"اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی کو وحی بھیجی کہ تم دونوں اپنی قوم کیلئے مصر میں گھر بنا رکھو اور اپنے انہی گھروں کو نماز کی جگہ بناؤ اور نماز کے پابند رہو اور ایمان والوں کو (نجات کی) خوشخبری دو" [87]۔

تفسیر 87 مصیبتوں اور تکلیفوں کے وقت اصلاح کے امور کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس آیت میں مذکور ہے یعنی جب فرعون نے ان کو تنگ کیا اور عبادت خانوں میں عبادت پر پابندیاں لگائیں تو ان کو حکم ہوا کہ گھروں میں نماز کا اہتمام کرو اور گھروں میں مساجد بنالو: اَنْ تَبَوَّءَا لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا: یعنی اپنے گھروں کو فرعونیوں سے الگ کرو تا کہ ان پر جب عذاب آئے تو تم محفوظ رہو یا مراد عبادت خانے ہیں: قِبْلَةً: اس سے کعبہ مراد ہے کیونکہ تمام انبیاء کا قبلہ کعبہ ہی رہا ہے یعنی عبادت گاہوں کو کعبہ کی طرف متوجہ بناؤ یا قبلہ مساجد کے معنی میں ہو تو مراد یہ ہوگا کہ گھروں میں نمازوں کا اہتمام کرو۔

فائدہ: پہلا خطاب موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کو ہے تثنیہ ہے۔ کیونکہ عبادت کیلئے انتظام کرنا انبیاء کرام علیہم السلام کی ذمہ داری ہے دوسرا اور تیسرا خطاب جمع ہے کیونکہ عبادت ساری امت پر فرض ہوتی ہے چوتھا خطاب صرف موسیٰ علیہ السلام کو ہے اس میں خوشخبری دینے والے اور جس چیز کی خوشخبری دیتا ہے اس کی عظمت مراد ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾

"اور موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی طرح طرح کی مال و زینت دی ہے اے ہمارے رب! (ان کو دنیا اسلئے دی ہے کہ) لوگوں کو تیری راہ سے گمراہ کریں اے ہمارے رب! ان کے مال کو نیست و نابود کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے تا کہ ایمان لانے نہ پائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں" [88]۔

تفسیر 88 اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے فرعونیوں پر بددعاء کا ذکر ہے اور بددعاء کیلئے پہلے قوم کے مظالم و جرموں کا ذکر کرنا ضروری ہے تو اس لئے ان کو مقدم کیا: اِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ

الدُّنۡيَا: معلوم ہوا کہ دنیا سے محبت کرنا جرم کرنے کا سبب ہے :لِيُضِلُّوا عَنۡ سَبِيۡلِكَ: یہ لام عاقبت کیلئے ہے یعنی اس مالداری کا انجام یہ ہوا کہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا: اِطۡمِسۡ عَلٰۤى اَمۡوَالِهِمۡ : مراد یہ ہے کہ ان کا مال دینار و درھم ہو یا فصل ہو سب کو برباد کرو چنانچہ وہ تمام چیزیں پتھر بن گئیں: وَاشۡدُدۡ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ : اس سے مراد ان کے دلوں پر مہر لگانا ہے تاکہ ایمان نہ لائیں: فَلَا يُؤۡمِنُوۡا : یہ لِيُضِلُّوا: پر عطف ہے یہ عام علماء نحو کا قول ہے اخفش اور فراء کے نزدیک یہ اطۡمِسۡ: اور: اُشۡدُدۡ: کا جواب امر ہے اور یہ دعاء موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت مانگی جب ان کے ایمان لانے سے ایسے ناامید ہوئے جیسے نوح علیہ السلام اپنی قوم کے ایمان سے ناامید ہوئے تھے۔

قَالَ قَدۡ اُجِيۡبَتۡ دَّعۡوَتُكُمَا فَاسۡتَقِيۡمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيۡلَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۹﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا یقیناً تم دونوں کی دعاء قبول ہوئی ہے لہذا ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کی راہ پر مت چلنا جو ناسمجھ ہیں" [89]۔

تفسیر 89 موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کی دعاء کی قبولیت کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے اور اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ دعاء موسیٰ علیہ السلام نے مانگی تھی اور ہارون علیہ السلام نے آمین پکارا تھا اور آمین بھی ایک دعاء ہے۔ اس لئے اس آیت میں دعاء کی نسبت دونوں کی طرف کی گئی ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے اس سے حجت لی ہے کہ امام کے فاتحہ پر مقتدی آمین پکاریں تو یہ بھی فاتحہ پڑھنے کے حکم میں شامل ہو جائے گا لیکن یہ روایت موقوف ہے (جو کہ نا قابل استدلال ہے) امام بقاعیؒ نے لکھا ہے کہ اس وقت ہارون علیہ السلام حاضر نہیں تھے مگر چونکہ اس دعاء پر راضی تھے اس لئے دونوں کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ فَاسۡتَقِيۡمَا۔ دعا کی قبولیت تک اپنے دین پر مضبوط رہنا اور دعوت کو جاری رکھنا اور اسی طرح استقامت سے مراد قبولیت میں جلد بازی مت کرو۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس دعاء کے قبول ہونے کے چالیس سال بعد فرعون ہلاک ہوا ہے: وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيۡلَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ: مطلب یہ ہے کہ ناسمجھ لوگوں کی طرح قبولیت دعاء میں جلد بازی مت کرو کیونکہ اس مہلت کی حکمت نادان اور ناسمجھ لوگوں کو معلوم نہیں۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾

"پھر ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کیا پھر ان کے پیچھے فرعون اپنے لشکر سمیت ظلم وزیادتی کے ارادے سے چلا یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا تو بول پڑا کہ میں ایمان لایا ہوں اس معبود پر جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں" [90]۔

تفسیر 90 اس آیت میں بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونیوں کی ہلاکت کا ذکر ہے: بَغْيًا وَّعَدْوًا: اس میں ایک فرق یہ ہے کہ: بَغْيًا: قول میں ہے اور: عَدْوًا: عمل میں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ: بَغْيًا: عقیدہ اور: عَدْوًا: عمل میں ہے تیسرا قول یہ ہے کہ: بَغْيًا: حقوق اللہ میں ہے اور: عَدْوًا: حقوق العباد میں ہے: اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ: ادراک احاطے کے معنی میں ہے یعنی ہر طرف سے عذاب نے اس کو گھیر لیا۔ معلوم ہوا کہ فرعون غرق ہونے سے بچ نہیں سکا اگرچہ اس نے ایک مقصد کو تین عبارتوں سے زبان پر جاری کیا ہے: (1) اٰمَنْتُ (2) لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ (3) وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ: یہاں پر ایمان اور اسلام ایک چیز ہے۔

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾

"کیا اب تو ایمان لاتا ہے جبکہ اس سے پہلے تم نافرمانی پر مصر تھے اور تم فساد کرنے والوں میں سے تھے" [91]۔

تفسیر 91 یہ اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے جبرائیل یا کسی اور ملائکہ کے ذریعے سے البتہ (ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3107، نسائی فی التفسیر 258، صحیح ابن حبان حدیث 6215، احمد 245/1، ابن جریر 17875) امام البانی نے ترمذی میں اس کو صحیح لغیرہ فرمایا ہے) کہ جبرائیل علیہ السلام اس وقت سمندر کی کیچڑ اس کے منہ میں ڈال رہے تھے تاکہ وہ رحمت الٰہی کا مستحق نہ ٹھہرے تو معلوم ہوا کہ یہ کلمات جبرائیل نے کہے ہیں اور اس روایت پر امام رازی نے طویل اعتراض کیا ہے مگر خازن نے اس کا مفصل جواب لکھا ہے۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝

"لہٰذا آج ہم صرف تیرے بدن کو نجات دینگے تا کہ آنے والوں کے لئے عبرت بنے اور حقیقت یہ ہے کہ بہت سارے لوگ ہماری آیتوں سے غافل ہیں" [92]۔

تفسیر 92 بعض روایتوں میں ہے کہ بنی اسرائیل کو یقین نہیں تھا کہ فرعون غرق ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا بدن ظاہر کیا۔ اس میں دو توجیہ ہیں پہلی توجیہ یہ ہے کہ فرعون کا بدن سمندر کے کنارے پر بغیر روح ڈال دیا گیا تھا جیسا کہ اب بھی معروف ہے کہ قاہرہ کے عجائب گھر میں اس کی لاش موجود ہے دوسری توجیہ یہ ہے کہ فرعون کا بدن ان کو پانی کے اوپر دکھایا گیا تب ان کے دلوں سے شک اتر گیا: نُنَجِّيْكَ: نجوہ سے لیا گیا ہے، نجوہ بلند مقام کو کہا جاتا ہے: بِبَدَنِكَ: اس سے بے جان بدن مراد ہے: اٰيَةً: ان لوگوں کیلئے عبرت ہے جو ربوبیت کے دعوے کرتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے احکامات سے تکبر کرکے اعراض کرتے ہیں: عَنْ اٰيٰتِنَا: اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب یہ ایک نشانی نہیں ہے بلکہ بہت سی نشانیوں کو شامل ہے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَھُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

"ہم نے رہنے کیلئے بنی اسرائیل کو بہترین ٹھکانا دیا اور ان کو مزیدار بہترین کھانے دئے انہوں نے اختلاف نہیں کیا یہاں تک کہ ان کو یقینی طور پر علم پہنچ گیا تیرا رب ان کے درمیان ان امور میں فیصلہ کریگا جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے" [93]۔

تفسیر 93 اس آیت میں فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل کا حال بیان ہو رہا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اجمالی انعامات کا ذکر کیا ہے یعنی ایک مکان اور دوسرا لذیذ کھانے پھر حق آنے کے بعد ان کے اختلاف کی وجہ سے انکی ناشکری کا ذکر ہوا: مُخْرَجَ صِدْقٍ، مُدْخَلَ صِدْقٍ، قَدَمَ صِدْقٍ: ذکر ہے: مُبَوَّاَ صِدْقٍ: اس سے شام یا مصر کی زمین مراد ہے عرب کی یہ عادت ہے کہ کسی چیز کی اچھائی بیان کرتے ہوئے لفظ صِدْقٍ: ذکر کرتے ہیں جگہ ہو قول یا عمل ہو۔ حَتّٰى جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ: علم سے مراد قرآن ہے یعنی نزول قرآن کے بعد ان میں اختلاف آیا یا علم سے تورات مراد ہے یعنی تورات میں باطل تاویلوں اور تحریفوں سے اختلاف پیدا ہوا۔

فَاِنۡ كُنۡتَ فِىۡ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ فَسۡـئَلِ الَّذِيۡنَ يَقۡرَءُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكَ‌ ۚ لَقَدۡ جَآءَكَ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ۙ﴿۹۴﴾

"پھر اگر آپ اس کے متعلق شک میں ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے تو آپ ان لوگوں سے دریافت کیجئے جو آپ سے پہلے کتابوں کو پڑھتے تھے یقینا آپ کے رب کی جانب سے آپ کے پاس حق آیا ہے لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے ہرگز مت ہونا" [94]۔

تفسیر 94 سابقہ آیت میں اہل کتاب کا اختلاف ذکر کیا گیا اور اختلاف شک کیلئے سبب ہوتا ہے۔ تو اب اختلاف زائل کرنے کیلئے علاج بیان فرمارہے ہیں اور وہ اہل حق علماء کی طرف رجوع ہے۔ اس آیت میں تین توجیہ ہیں۔ [1] خطاب نبی کریم ﷺ سے کیا گیا ہے اور شک کا مشہور معنی مراد ہے البتہ حرف (اِنۡ) سے کسی چیز کا وجود لازم نہیں ہوتا اس لئے اس آیت کے نزول پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ نہ کسی سے پوچھتا ہوں اور نہ ہی مجھے کسی قسم کا شک ہے۔ [2] شک کا معنی دل کی تنگی ہے گھٹن ہے تو معنی یہ ہوا کہ اگر مخالفین کی باتوں پر آپ کا دل تنگ ہوتا ہے تو صبر کرو اور ان حق پرست علماء سے پوچھ لو تا کہ سابقہ انبیاء کی ثابت قدمی وصبر پر آپ کو (اطلاع) خبر دیں یہ قول مفسر قرطبی نے لکھا ہے۔ [3] اس آیت میں مشرکین سے خطاب ہے کیونکہ وہ اہل کتاب پر اعتماد کرتے تھے۔ تو معنی یہ ہے کہ آپ اپنے مخاطب مشرک سے کہیں! کہ اگر میری بات پر اعتماد نہیں ہے تو جو توحید پر مبنی کتاب میں نے پیش کی ہے اس کے متعلق اہل حق علماء سے پوچھ لو (قرطبی نے لکھا ہے) فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ: اس میں خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے لیکن مراد امت ہے اور شک سے مراد حق میں شک ہے یا منکرین پر عذاب نازل ہونے میں شک مراد ہے۔

وَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۹۵﴾

"اور آپ ان لوگوں میں سے مت ہونا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلایا ہے ورنہ نقصان والوں میں سے ہو جاؤ گے" [95]۔

تفسیر 95 یہ تفریع ہے شک کرنے پر یعنی شک انکار و تکذیب کیلئے سبب ہے اور تکذیب خسران کیلئے سبب ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٩٦﴾

"یقیناً جن لوگوں کے حق میں تیرے رب کی بات ثابت ہوئی ہے وہ ایمان نہ لائیں گے"[96]۔

تفسیر 96 اس آیت میں منکرین کیلئے وعید ہے اور کلمہ سے مراد منکرین کیلئے عذاب کا تقدیری فیصلہ ہے۔

وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٩٧﴾

"اگر چہ ان کے پاس ہر قسم کی نشانی آجائے یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں"[97]۔

تفسیر 97 یہ سابقہ آیت سے متعلق ہے یعنی ان کے پاس ہر قسم کی نشانیاں آجائیں مگر یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے البتہ عذاب دیکھ کر ایمان لے آئیں گے مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ فائدہ: کُلُّ آيَةٍ: اس سے جمع آیات مراد ہیں اس لئے فعل مؤنث ذکر کیا ہے۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٩٨﴾

"لہذا کوئی بستی ایسی ایمان نہ لائی جو ان کیلئے نفع بخش ہوتا سوائے قوم یونس علیہ السلام کے جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ان کو دنیا کے رسوا کن عذاب سے بچایا اور دنیاوی زندگی میں ان کو ایک وقت خاص تک مہلت دی"[98]۔

تفسیر 98 اس آیت میں یونس علیہ السلام کی قوم کی توبہ کا ذکر ہے اور انہوں نے مناسب وقت پر توبہ کی تو عذاب سے بچ گئے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یونس علیہ السلام کی قوم علاقہ موصل گاؤں نینوا میں آباد تھی یونس علیہ السلام نے ان کو بار بار طویل عرصہ تک توحید باری تعالیٰ کی دعوت دی لیکن وہ شرک سے باز نہیں آئے۔ تو یونس علیہ السلام کو وحی کے ذریعے سے خبر دی گئی کہ ان کو مطلع کرو کہ اگر تین دن میں انہوں نے ایمان نہیں لایا تو عذاب الہی کی لپیٹ میں آجائیں گے تین دن پورے ہونے سے قبل یونس علیہ السلام آبادی سے نکل گئے قوم نے یونس علیہ السلام کے سفر کرنے سے محسوس کیا کہ عذاب الہی ضرور آئے گا تو انہوں نے شرک اور کفر سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہوئے استغفار کیا تو عذاب ٹل گیا اس میں صحیح قول یہ ہے کہ عذاب آنے سے قبل یعنی عذاب نہیں آیا تھا کہ انہوں نے توبہ کی اس لئے کہ عذاب آنے کے وقت توبہ استغفار اور ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں: فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ: یہ نفی کے معنی میں: فَنَفَعَهَا: فائدے والا ایمان

وہ ہے جو کیفیت موت (غرغرا) سے قبل ہو: إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ: یہ استثنیٰ منقطع ہے یعنی انہوں نے فائدے والا ایمان قبول کیا تھا۔ زجاج سے منقول ہے کہ انہوں نے عذاب نہیں دیکھا تھا صرف علامات عذاب دیکھ چکے تھے: كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ: فقط عذاب ٹالدینا مراد ہے یا پھر استثنیٰ متصل ہے تو پھر معنی یہ ہے کہ انہوں نے عذاب کا مشاہدہ کیا مگر فوری توبہ کرنے سے عذاب ٹال دیا گیا اور یہ اس قوم کی خصوصیت تھی ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادے سے کام کرتا ہے اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ یہ لوگ توبہ کرینگے اس لئے ان کے اخلاص کی توبہ قبول فرمائی: كَشَفْنَا: ہٹانے کے معنی میں ہے یعنی عذاب قریب تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے ہٹایا پھیر دیا۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۗ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾

"اگر آپ کا رب چاہتا تو روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا آپ لوگوں پر جبر کر سکتے ہو یہاں تک کہ ایمان لے آئے" [99]۔

تفسیر 99 اس آیت میں نبی کریم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کا ایمان مشیت الٰہی پر موقوف ہے آپ زبردستی ان پر ایمان مسلط نہیں کر سکتے: شَآءَ رَبُّكَ: یعنی انکا ایمان بھی مشیت الٰہی سے مربوط ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر محض لطف اور مہربانی ہے اور صرف ان لوگوں کیلئے ہیں جن کیلئے تقدیر میں لکھا ہے لہٰذا ایمان صرف وہی لائیں گے جبکہ معتزلہ کا قول ہے کہ اس سے مشیت جبری مراد ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبر نہیں ہر ایک کی اپنی مرضی ہے لیکن معتزلہ تقدیر کے منکر۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٠﴾

"اور توفیق الٰہی کے بغیر کوئی نفس ایمان نہیں لا سکتا ہے اور ڈال دیتا ہے اللہ تعالیٰ بے عقل لوگوں پر گندگی" [100]۔

تفسیر 100 اس آیت میں ماقبل کی تفصیل ہے یعنی سب لوگوں کے ایمان کی مشیت اللہ تعالیٰ نے نہیں کی ہے بلکہ بعض لوگ اس کی چاہت سے ایمان لاتے ہیں اور بعض شرک کی نجاست میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس آیت میں نبی کیلئے تسلی ہے کہ لوگوں کا ایمان لانا اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہوتا ہے اور جو لوگ حق نہیں جانتے تو شرک اور کفر کی نجاست میں وہ مبتلا ہوتے ہیں۔ یہاں پر: اِذْنِ: سے تقدیر الٰہی اور اس کی توفیق ہے جس سے شرک یا عذاب مراد ہے۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠١﴾

"آپ فرما دیجئے کہ غور کرو کتنی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالٰی کی توحید کی اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کو نشانیاں اور دھمکیاں کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی" [101]۔

تفسیر 101 اس آیت میں منکرین کیلئے آسمانوں اور زمین میں غور وفکر کرنے کی دعوت ہیں جو کہ عقلی دلائل ہیں۔ پھر ایمان نہ لانے والے سرکش اور متعصب لوگوں کو دھمکی دی گئی ہے نیز اس آیت میں دلیل ہے کہ انسان مجبور محض نہیں بلکہ ہدایت حاصل کرنے کیلئے غور وفکر کرنے پر مکلف ہے: قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ: اس سے ہٹ دھرم سرکش لوگ مراد ہیں۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾

"یہ لوگ ان لوگوں جیسے واقعات کے انتظار کرتے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں آپ فرما دیجئے کہ ٹھیک ہے تم انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں" [102]۔

تفسیر 102 اس آیت میں منکرین کیلئے دنیاوی عذاب کی وعید ہے۔ ایام سے سابقہ قوموں پر آنے والے عذاب کے دن مراد ہیں۔ ایام کا اطلاق عذاب کے اور انعام کے واقعات پر ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ ابراہیم آیت 5 میں ہے ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ۔

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾

"پھر ہم نے نجات دی اپنے رسولوں اور ان لوگوں کو جو ایمان لائیں اسی طرح ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے ایمان والوں کو نجات دینا" [103]۔

تفسیر 103 اس آیت میں ایمان والوں کیلئے نجات کی بشارت ہے: ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا: اس آیت میں ثُمَّ برائے تعقیب ذکر ہے اور صرف عطف کیلئے ہے جسکا معطوف علیہ محذوف کیا گیا ہے عبارت اس طرح ہے: فَنُهْلِكُ الْمُكَذِّبِيْنَ ثُمَّ نُنَجِّيْ: اور یہ مضارع ماضی کے معنٰی میں ہے جس کیلئے: خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ: قرینہ ہے: حَقًّا عَلَيْنَا: اس سے حق تفضلی مراد ہے واجبی نہیں اس لئے کہ اللہ تعالٰی پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی ہے۔ حق دو قسم کا ہوتا ہے ایک حق تفضلی جو اللہ تعالٰی نے وعدے کی وجہ سے اپنے اوپر لازم کیا ہو دوسرا حق واجبی استحقاقی ہوتا ہے۔ یہ دوسرا حق اللہ تعالٰی پر نہیں ہے اس لئے اللہ تعالٰی جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے: فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ: اور ہر چیز پر قادر ہے لہٰذا اس کے ذمہ کسی کا

حق نہیں ہے اس وجہ سے بحق فلاں کے وسیلے سے سوال منع ہے کہ اللہ پر کسی کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر حق سے دوسرا معنی مراد لیا جائے تو وہ اللہ کے ذمہ نہیں ہے اگر پہلا معنی مراد لیا جائے تو اس سے دوسرے معنی کا وہم پیدا ہوتا ہے جس پر کوئی صحیح حدیث نہیں ہے فقہ حنفی میں کتاب الکراھیۃ میں اسی طرح مذکور ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"فرما دیجئے کہ اے لوگوں! اگر تم میرے دین کے متعلق شک میں ہو تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ تعالی کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، میں اس ذات کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری جان کو قبض کرتا ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہو جاؤں" [104]۔

تفسیر 104 اس آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید بیان کرنے کا تفصیلی حکم ہے اور اس میں ردشرک فی العبادات ہے مطلب یہ ہے کہ اگر دین اسلام کے متعلق لوگ شک کرتے ہیں تو آپ ان کو مسئلہ توحید اچھی طرح بیان کریں اس لیے دیگر ادیان سے اسلام کا فرق مسئلہ توحید میں ہے۔ فائدہ: شک دو طرفوں کے درمیان کو کہا جاتا ہے تو اس لفظ کو اس لئے استعمال کیا ہے کہ مشرکین کے بعض معاملات لین دین اور بعض فروعی عبادات ایمان والوں کے برابر تھیں۔ تو شبہ پیدا ہوا کہ دونوں میں کیا فرق ہے تو اس آیت میں توحید سے اس فرق کو واضح کیا گیا: فَلَآ اَعْبُدُ: اس سے قبل (اِنْ) کی جزاء مقدر ہے یعنی فَاسْتَمِعُوْا لِاِزَالَةِ الشَّكِّ: یعنی شک زائل کرنے کیلئے کان لگا کر سنو: اَلَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ: وفات ذکر کرنے میں سابقہ دنیاوی زندگی اور موت تک تربیت کی طرف اشارہ ہے جو اللہ کی قدرت کیلئے دلیل ہے نیز موت کا خاص ذکر اس لئے کیا کہ اس میں خوف بہت ہے: وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: عبادات سے مراد ظاہری عبادت ہے اور ایمان باطنی عمل ہے اس میں اشارہ ہے کہ عمل ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

"اور مجھے کہا گیا ہے کہ تم اپنے آپ کو دین توحید پر مضبوط رکھو اور مشرکین کے گروہ میں سے مت ہونا" [105]۔

تفسیر 105 اس آیت کی ابتداء میں لفظ: قِيْلَ: مراد ہے: وَجْهَكَ: چہرے سے کل بدن اور اعمال مراد ہیں۔ سابقہ آیت میں توحید کا ذکر تھا اور اس آیت میں اس پر استقامت اختیار کرنے اور ثابت قدم رہنے کا ذکر ہے اور شرک سے اجتناب کا

بیان ہے: اَلْمُشْرِكِيْنَ: یعنی مشرکین کی جماعت سے کوئی تعلق نہ رکھنا۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

"اور مت پکارو ان ہستیوں کو اللہ کے سوا جو نہ تمہیں نفع دے سکتی ہیں اور نہ ہی نقصان اگر آپ نے ایسا کیا تو اس وقت آپ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے" [106]۔

تفسیر 106 اس آیت میں رد شرک فی الدعاء ہے جو شرک فی العبادت کی ایک قسم ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالٰی کے سوا حاجت روائی کسی کے اختیار میں نہیں۔ اور مخلوق میں نفع و نقصان کا مالک کوئی نہیں ہے اور اس شخص کو ظالم کہا گیا جو اللہ تعالٰی کے سوا دوسروں کو پکارتا ہے۔ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے مگر امت کے عام لوگ مراد ہیں۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

"اگر وہ آپ کو کوئی ضرر پہنچائے تو اسے کوئی ٹال نہیں سکتا اور اگر وہ آپ کو خیر بھلائی پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ یہ خیر و شر (نفع و نقصان) اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے پہنچاتا ہے اور وہ خوب معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے" [107]۔

تفسیر 107 یہ سابقہ آیت کیلئے مثل علت ہے یعنی پکارنے اور دعاء کا حقدار اس لئے کوئی نہیں کہ خیر اور شر کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے اور اسی کی صفت ہے۔ اس آیت میں رد شرک فی التصرف ہے: لِفَضْلِهٖ: اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالٰی کی طرف سے خیر کا ارادہ بھی فضل ہے اور خیر پہنچانا دوسرا فضل ہے: يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فضل اللہ تعالٰی کی مشیت سے ہوتا ہے لہٰذا اگر فضل الٰہی کسی سے بند ہو جائے تو وہ غیر اللہ یعنی نبی و ولی بزرگ کی وجہ سے نہیں بلکہ مشیت الٰہی سے ہے: بِهٖ: کی ضمیر فضل یا ضرر و فضل دونوں کی طرف راجع ہے۔ سوال: ضرر کی ساتھ مس اور خیر کے ساتھ ارادہ ذکر کیا ہے اس میں کیا حکمت ہے جواب: یہ اکتفاء کے طور پر ذکر کیا ہے یعنی ارادے کے ساتھ مس اور مس کے ساتھ ارادہ شامل ہے۔ لیکن ایک کو ذکر کیا اور دوسرے کو حذف کیا۔ جواب: 2 انسان کو جب معمولی تکلیف پہنچتی ہے تو فریاد کرنے لگتا ہے اور خیر کا اظہار تب کرتا ہے جب کثرت ہو۔ سورۃ انعام آیت 17 میں بھی اس طرح ذکر ہوا ہے البتہ اس سورۃ میں چونکہ دلائل کرنے کیلئے تفصیل ضروری تھی تو اس لئے خیر کی جانب میں ارادہ اور فضل ذکر کیا اور سورۃ انعام میں دلائل

بیان کرنا مقصود تھا اس لئے اس میں اختصار کیا ہے۔

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنِ ٱهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِى لِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَآ أَنَا۠ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ﴿١٠٨﴾

"آپ فرما دیجئے اے لوگوں تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق آچکا ہے لہذا اب جو بھی ہدایت کی پیروی کریگا تو اس کا فائدہ اسی کیلئے ہے اور جو حق سے اعراض کریگا تو اس کا وبال اسی پر اور میں تم پر کارساز مسلط نہیں کیا گیا ہوں" [108]۔

تفسیر 108 اس آیت میں قرآن کی طرف ترغیب ہے تا کہ شک زائل ہو جائے: اَلْحَقُّ: سے قرآن مجید یا توحید کی تفصیل بیان کرنا مراد ہے اور اس بارے میں دو گروہ کا ذکر کیا ہے: وَكِيْلٍ: بندوں میں وکیل وہ ہوتا ہے جس کو حقوق سونپ دیئے گئے ہوں تو وہ ذمہ دار ہوتا ہے۔

وَٱتَّبِعْ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيْكَ وَٱصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ ٱللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ ٱلْحَٰكِمِينَ ﴿١٠٩﴾

"اور آپ تابع رہو اس چیز کی جو آپ کی طرف وحی کی جارہی ہے اور صبر کرتے رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ صادر فرمادے اور وہ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے" [109]۔

تفسیر 109 اس میں تسلی اور شجاعت کی ترغیب دی گئی ہے کہ مسئلہ توحید کو دلیری سے بیان کرو۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے تک مصائب پر صبر کرتے رہو فیصلہ سے مراد عذاب دینا ہے یا منکر مخالفین کو ہدایت کی توفیق دینا ہے۔

سورۃ یونس کی خصوصیات:

۱۔ کثیر تعداد میں وعیدیں اس سورۃ میں ذکر ہے۔

۲۔ عقلی دلائل اس سورۃ میں تفصیل سے ذکر ہیں۔

۳۔ اس سورۃ میں مشرکین کے دلیل اعترافی کا ذکر ہے۔

۴۔ مشرکین کا عقیدہ شفاعت شرکیہ کی حقیقت کا ذکر۔

۵۔ مصیبتوں اور مشکلات میں مشرکین کا اللہ سے التجائیں کرنا۔

۶۔ فرعون کے ایمان کا تذکرہ جو کہ بے سود رہا۔

۷۔ یونس علیہ السلام کی قوم کی توبہ جو کہ ان کے لئے مفید رہا۔

۸۔ شک کو زائل کرنے کیلئے دو طریقے ذکر ہیں: (۱) اہل علم سے سوال (۲) واضح کامل بیان۔

۹۔ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے خلاف بددعا اور اُسکی قبولیت کا ذکر۔

۱۰۔ اولیاء اللہ کی شان اور ان کی پہچان اس سورۃ میں ذکر ہے۔

۱۱۔ مشرکین سے ان کے معبودانِ باطلہ کی بےخبری کا ذکر۔

الحمدللہ! سورۃ یونس کی تفسیر اللہ کی توفیق سے مکمل ہوئی

آیاتها ۱۲۳ — ۱۱ سُوْرَةُ هُوْدٍ مَكِّيَّةٌ ۵۲ — رکوعاتها ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

خاص اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ

"اللہ تعالیٰ ہی اس کے مقاصد کو جانتا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں پھر صاف واضح بیان کی گئی ہیں ایک حکیم باخبر کی طرف سے ہے"[1]۔

عنوان ماقبل سورۃ کے ساتھ ربط: (۱) سورۃ یونس میں مسئلہ توحید پر عقلی دلائل بیان ہوئے ہیں تو اس سورۃ میں انبیاء کرام سے توحید پر نقلی دلائل بیان ہونگے (۲) گزشتہ سورۃ میں مسئلہ توحید کی تفصیل تھی تو اس سورۃ میں توحید کی تبلیغ پر شجاعت کا ذکر ہے۔ سورۃ کا عنوان: اس سورۃ کے تین عنوانات ہیں پہلا عنوان: 1 رد شرک فی العبادات ہیں جو آیت 2 میں ہے نیز شرک فی العلم والتصرف پر آیت 5، 6 میں رد ہوا ہے۔ دوسرا: 2 عنوان: دعوت توحید پر دلیری کی شجاعت اختیار کرو یہ آیت 12 میں ہے۔ تیسرا: 3 عنوان: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آیت 17 میں تسلی دی گئی ہے۔ خلاصہ: اس سورۃ میں تین باب ہیں پہلا باب آیت 24 تک ہے اس باب میں قرآن کی طرف ترغیب ہے اس میں تینوں عنوان ذکر ہیں نیز انکار کرنے والوں کے لئے وعید ہیں اور ماننے والوں کیلئے خوشخبریاں ہیں۔

تفسیر 1 آیت 1 حروف مقطعات سے قرآن کا اعجاز ثابت کیا ہے پھر قرآن کی طرف: الٓرٰ: کے ساتھ ترغیب دی ہے اور اس کی تین صفات مذکور ہیں: پہلی صفت آیت 1: اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ: اس کا ایک معنی یہ ہے کہ اس کی آیتیں حکمت سے بھر دی گئی ہیں۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ محکم آیتیں ہیں اس میں کسی قسم کے فساد اور نقصان ہونے کا اندیشہ نہیں۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ یہ کتاب کسی دوسری کتاب سے منسوخ نہیں ہوسکتی۔ دوسری صفت: ثُمَّ فُصِّلَتْ: یہ مطلب یہ ہے کہ اس میں توحید اور اصولی مسائل تفصیل سے بیان ہوئے ہیں اور حکمتوں سے بھرے ہوئے تھا اس لئے کہ: حَكِيْمٍ: کی طرف سے ہے اور تفصیل اس میں اس لئے ہے کہ: خَبِيْرٍ: کی جانب سے ہے۔

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۚ إِنَّنِي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ ﴿٢﴾

"یہ کہ بندگی مت کرو سوائے اللہ کے یقیناً میں اس کی طرف سے ڈرانے اور خوشخبری دینے والا ہوں"[2]۔

تفسیر 2 اس میں سورۃ کا پہلا عنوان ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں کسی کو شریک مت ٹھہراؤ۔ نیز اس میں رسول کی سچائی بھی ہے: أَلَّا تَعْبُدُوا: یہ لام کی تقدیر کے ساتھ: لِئَلَّا تَعْبُدُوا: حکمت اور فصلت کیلئے مفعول له ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کا اصل مقصد رد شرک فی العبادة ہے۔

وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُم مَّتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ ۖ وَإِن تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ ﴿٣﴾

"اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی مانگو اور پھر اسی کی طرف رجوع کرو وہ تمہیں ایک وقت مقرر تک اچھا فائدہ دیگا اور ہر اچھے عمل کرنے والے کو اچھا بدلہ دیگا اور اگر تم پھر گئے تو میں تم پر بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"[3]۔

تفسیر 3 توبہ اور استغفار میں فرق یہ ہے کہ استغفار زبان سے اور توبہ کا دل سے تعلق ہے۔ دوم۔ استغفار کا مطلب یہ ہے کہ پہلے جو کفر شرک کیا ہے اس سے معافی مانگے اور توبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توحید وسنت اور اطاعت کے ذریعے پھر جائے اور اسکے دو فائدے ذکر کئے ہیں ایک فائدہ: متاعا حسنا اطمینان والی زندگی ہے اور اس کی تفصیل سورۃ نوح آیت 11 تا 12 میں ہے۔ (2) دوسرا فائدہ: یہ ہے کہ: يُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ: اچھے اعمال کرنے والے کو زیادہ اجر سے نوازنا جو کہ جنت ہے: ذِي فَضْلٍ: پہلی: فَضْلٍ: سے صحیح عقیدہ۔ اور عمل مراد ہے اور دوسرے فضل سے اس کی جزاء مراد ہے یا مضاف مقدر ہے یعنی: جَزَاءَ فَضْلِهِ. وَإِن تَوَلَّوْا: ترغیب کے بعد اب ترہیب ہے یہ اصل میں: تَتَوَلَّوْا: ہے۔ اس میں سے ایک (تا) کو حذف کیا گیا ہے: يَوْمٍ كَبِيرٍ: قیامت کا دن مراد ہے یا دنیاوی عذاب مراد ہے کیونکہ ہر عذاب کا دن بڑا دن ہوتا ہے یا کبیر عذاب کی صفت ہے لیکن یوم مجرور ہے اور یہ اس کے قریب ہے لہذا اس کو بھی مجرور کیا گیا۔

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٤﴾

"خاص اللہ تعالیٰ کی طرف تمہارا پلٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"[4]۔

تفسیر 4 اس آیت میں آخرت کا خوف ہے: قَدِيرٌ: للن انعامات وعذاب کی طرف اشارہ ہے جو سابقہ آیت میں گزرے

ہیں نیز دوبارہ زندگی دینے پر بھی وہ قادر ہے۔

أَلَآ إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٥﴾

"آگاہ رہو کہ یقیناً کافر اپنے سینوں کی باتوں کو دھرا کئے دیتے ہیں یاد رکھو جس وقت کپڑوں میں وہ اپنے آپ کو لپیٹتے ہیں تب بھی اللہ تعالیٰ ان کی کھلی اور چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے یقیناً وہ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے" [5]۔

تفسیر 5 یہ بھی سورۃ کے پہلے والے عنوان میں شامل ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر عالم ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ اس آیت میں انبیاء اور اہل ایمان کے ساتھ مشرکین کی عداوت کا بیان ہے یعنی مشرکین اپنے دلوں میں انبیاء اور ایمان والوں کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں اور انکا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس دشمنی سے بے خبر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہے کہ اگر یہ اپنے اوپر کپڑے ڈال کر دلوں میں دشمنی چھپا لیتے ہیں تب بھی اس کی خبر اللہ تعالیٰ کو ہے: لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ: مِنْهُ: کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یا رسول کی طرف راجع ہے اور اس عمل میں حق پرستوں کے ساتھ حسد کرنے والے سب داخل ہیں یعنی منافقین بھی شامل ہیں: أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ: یعنی نبیوں سے حسد رکھتے ہوئے اپنے آپ کو کپڑوں میں چھپاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے چھپ نہیں سکتے۔ یہ مشرکین کا حال تھا جب نبی ﷺ کے خلاف مشورے کرتے تھے اور عام حالات بھی اس میں شامل ہیں۔

وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿٦﴾

"نہیں ہے زمین میں چلنے پھرنے والا کوئی جاندار مگر اس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہی ان کے رہنے کی جگہ اور سونے جاگنے کی جگہ بھی جانتا ہے یہ سب کچھ ایک واضح کتاب میں موجود ہے" [6]۔

تفسیر 6 اس آیت میں پہلے عنوان کا تیسرا جزء ذکر ہوا ہے یعنی کارساز اور رزق کا ذمہ دار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے: مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا: کی تفسیر سورۃ انعام میں گزر چکی ہے: كِتَابٍ مُّبِينٍ: اس سے لوح محفوظ مراد ہے اور وہی تقدیر کی کتاب ہے اور اس آیت میں تقدیر مطلق کی دلیل ہے: دَابَّةٍ: لغت میں: دَابَّةٍ: کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو زمین پر چلتی ہو عرف عام میں چوپائیوں پر بولا جاتا ہے اور خصوصاً گھوڑے خچر کو کہا جاتا ہے مگر یہاں پر انسانوں سمیت عام جاندار مراد ہیں: عَلَى اللَّهِ: یہ وجوب تفضلی ہے ایجابی نہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ ذمہ داری رکھی ہے۔ چونکہ ہر چیز

کو رزق پہچانے کیلئے تفصیلی علم ہونا چاہئے تو اس لئے :يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا: کا ذکر کیا ہے نیز ہر چیز کتاب میں لکھنے سے ثابت ہوتی ہے کہ ہر چیز پر اللہ تعالیٰ علم مطلق رکھتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَّبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

"اللہ ہی کی ذات ہے جس نے چھ دنوں میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا تا کہ وہ آزمائے کہ تم میں سے اچھا عمل کون کرتا ہے اگر آپ نے کہا کہ تم مرنے کے بعد پھر زندہ کئے جاؤ گے تو ضرور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے بول اٹھیں گے کہ یہ کھلا جھوٹ ہے" [7]۔

تفسیر 7 آیت کے پہلے حصہ میں اللہ تعالیٰ کے متصرف اور خالق ہونے کا ذکر ہے سابقہ آیت سے تعلق یہ ہے کہ رازق ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خالق بھی ہے اور دوسرے حصہ میں بعث بعد الموت کے منکرین کے لیے زجر اور توبیخ ہے اس لئے کہ آیت کا پہلا حصہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور طاقت کی عظمت پر مشتمل ہے اور یہی اس کے دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت کی دلیل ہے لہٰذا جو اتنی عظیم قدرتوں کے مالک کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں مانتے وہ بہت ہی ڈانٹ اور زجر توبیخ کے حقدار ہے :وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ: (صحیح بخاری کتاب التفسیر حدیث 4684) اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں سے قبل عرش پیدا کیا تھا۔ اور وہ پانی پر قائم تھا بعد میں آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا۔ اس کے ظاہر پر ایمان لانا لازم ہے اور اس میں تاویل کرنا درست نہیں۔ بعض معتزلہ کا قول ہے کہ سارے موجودات پر حکومت و سلطنت مراد ہے۔ اور کان اس میں زائد ہے بعض صوفیوں کا بھی یہی قول ہے لیکن یہ قول باطل ہے :أَحْسَنُ عَمَلًا: احسن عمل وہ ہے جس میں اخلاص ہو یعنی شرک اور دکھلاوا سے پاک ہو اور سنت طریقہ کے مطابق ہو تو وہ احسن عمل ہے ان دونوں اجزاء میں ایک جزا گر کم ہو تو وہ احسن عمل نہیں کہلا یا جاسکتا۔ اس طرح سورۃ کھف آیت (7) اور سورۃ ملک آیت (2) میں ہے۔ لِيَبْلُوَكُمْ :بلا: سے حقیقت ظاہر کرنا مراد ہے کیونکہ دنیا میں ہر شخص اپنے عمل کو احسن یعنی اچھا عمل قرار دیتا ہے لیکن اس کی حقیقت قیامت کے دن ظاہر ہوگی۔ دنیا میں کسی چیز کی حقیقت امتحان سے معلوم ہوتی ہے اس لئے :لِيَبْلُوَ: کو :خَلَقَ: سے متعلق کر لیا ہے: سِحْرٌ مُّبِينٌ: یہاں سحر جھوٹ اور باطل کے معنیٰ میں ہے جیسا کہ قاموس نے لکھا ہے: هٰذَا: موت کے بعد اٹھانے کی طرف اشارہ ہے تو اسلئے یہاں پر جادو کا معنیٰ صحیح نہیں ہوسکتا۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَ
حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

"اگر ہم ان سے عذاب متعین مدت کیلئے ٹال دیں تو وہ ضرور بول اٹھیں گے کہ اس عذاب کو کس چیز نے روک رکھا ہے سن رکھو جس دن ان کے پاس عذاب آئے گا تو اس کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہوگا اور جس کی وہ ہنسی اڑا رہے ہیں ان کو گھیر لے گی" [8]۔

تفسیر 8 اس آیت میں منکرین کیلئے مزید زجر اور توبیخ ہے دنیوی عذاب کا حوالہ دیکر ڈرانا مقصود ہے: اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ: سورۃ بقرۃ میں: اُمَّةٍ: کی تفسیر گزر گئی ہے کہ یہ بہت معنوں پر مشتمل ہے یہاں پر مدت کے معنی میں ہے: مَا يَحْبِسُهٗ: یہ ان کی طرف سے بطور مزاح (استھزاء) ہے۔ مَصْرُوْفًا: یعنی اللہ تعالیٰ عذاب بھیج رہا ہے اور کسی میں اس عذاب روکنے کی طاقت نہیں اور نہ ہی کسی اور طرف پھیر دینے کی طاقت ہے: مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِئُوْنَ: اس میں مضاف حذف ہے جو کہ وَبَالَ: ہے اور: مَا كَانُوْا: میں (مَا) مصدریہ ہے یعنی: وَبَالَ اِسْتِهْزَائِهِمْ: یا پھر (ما) عذاب کے معنی میں ہے: اور يَسْتَهْزِئُوْنَ: کا معنی: يَسْتَعْجِلُوْنَكَ: ہے یعنی وہ عذاب جسے یہ لوگ جلدی طلب کر رہے تھے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝

"اگر ہم انسان کو کسی نعمت کا مزہ چکھا کر پھر اس سے چھین لیتے ہیں تو یقیناً وہ بڑا ہی نا امید و ناشکرا بن جاتا ہے" [9]۔

تفسیر 9 اس آیت میں بھی انسان کو عقیدے کے کمزور ہونے پر تنبیہ دی گئی ہے کہ فراخی سے تنگی کی طرف منتقلی کے وقت ڈگمگا جاتا ہے: لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ: پہلی حالت باطن کی ہے اور دوسری حالت زبان اور ظاہر کی ہے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝

"اور اگر تکلیف کے بعد جو انسان کو پہنچی تھی ہم اسے نعمت سے نوازتے ہیں تو وہ کہنے لگتا ہے کہ ساری مشکلات ختم ہوئی یقیناً وہ بڑا متکبر اور فخر کرنے والا ہے" [10]۔

تفسیر 10 اس آیت میں بھی ڈانٹ اور زجر ہے تنگی سے فراخی کی طرف انتقال کے وقت کیونکہ نعمت اور فراخی کے وقت انسان تکبر کرتا ہے اور اپنی ظاہری اور باطنی پر اتراتا ہے۔ نعمت کے چکھانے کا اشارہ ہے کہ وہ نعمت صرف اس کی رحمت

سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس میں یہ بھی نکتہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی نعمتیں صرف ایک چکھنے تک ہیں یعنی عارضی اور معمولی ہیں۔ لَفَرِحٌ: بے جا تکبر اترانا مراد ہے: ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي: یعنی میری تدبیروں سے یا میرے معبودان اولالہ کی طاقت اور قدرت کی وجہ سے میری مشکلات زائل ہو گئیں۔ فَخُورٌ: یعنی اپنی صفتیں خود لوگوں سے ذکر کرتا ہے اس کے لیے اردو میں کہتے ہیں لمبی لمبی چھوڑنا، بھیکنا۔ یہ فرح اور فخر انسان کو شکر گزاری سے روکتا ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝

"مگر وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اور اعمال سنت کے مطابق کرتے رہے ان کیلئے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے" [11]۔

تفسیر 11 اطاعت کرنے والوں کیلئے اس آیت میں خوشخبری ہے: صَبَرُوا: یعنی تنگی اور فراوانی میں ایمان پر گامزن رہتے ہیں اور: صَبَرُوا لَيَئُوسٌ كَفُورٌ: کے مقابلے میں ہے اور: اَلصَّالِحَاتِ: فَرِحٌ فَخُورٌ: کے مقابلے میں ہے اور مَّغْفِرَةٌ: مصیبتوں پر صبر سے متعلق ہے۔ اور: أَجْرٌ كَبِيرٌ: صالح اعمال کی وجہ سے ہے۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ كَنزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۚ إِنَّمَا أَنتَ نَذِيرٌ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۝

"شاید آپ چھوڑنے والے ہیں بعض وہ جو آپکی طرف وحی کی گئی مسئلہ توحید کی اور اس کی وجہ سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے کہ وہ کہتے اس پر خزانہ کیوں نہیں اترتا ہے یا اس کے ساتھ ملک کیوں نہیں آتا ہے (سن لیجئے) آپ صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر چیز کی ذمہ دار اللہ کی ذات ہے" [12]۔

تفسیر 12 اس آیت میں سورۃ کا دوسرا دعویٰ ہے جو کہ مسئلہ توحید بیان کرنے پر بہادری شجاعت سے عمل پیرا ہونا ہے۔ یعنی مشرکین کے اعتراضات پر آپکا دل تنگ نہ ہو جس کے نتیجہ میں آپ مسئلہ توحید بیان کرنا چھوڑ دیں: فَلَعَلَّكَ لَعَلَّ: اس مقام پر برائے استفہام انکاری ہے یعنی اے نبی! آپ چھوڑنے والے نہیں ہے (فَا) برائے (تفریع) گزشتہ چار احوال کے لیے یعنی جادوگر کہنے یا استہزاء کی صورت میں یا ناشکری کے وقت اور فخر تکبر اور غرور کے وقت آپ دعوت توحید چھوڑنے والے نہیں عموماً یہ چار احوال انسان مبلغ کے لیے دعوت وتبلیغ میں مداہنت کا سبب بنتے ہیں اور دعوت توحید چھوڑ دیتا ہے اس لیے آپ ﷺ کی تشجیع اور حوصلہ دلانا مقصود ہے۔ اس لئے اس آیت میں اس سے منع کیا گیا: بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ: اس سے توحید کا بیان مراد ہے کیونکہ مشرکین پر توحید کا مسئلہ بھاری گزرتا ہے: وَضَائِقٌ: یہ عطف سبب کا مسبب پر

ہے۔یعنی تنگ ہونا سبب بنتا ہے اس مسئلہ کو چھوڑ دینے کیلئے: لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ‌ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ نَذِيۡرٌ‌ؕ: اس میں دو قوتوں کی طرف اشارہ ہے ایک قوت ظاہری دوسری قوت باطنی کی طرف ہے۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَـرٰٮهُ‌ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۳﴾

"کیا وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو اس نے خود گھڑا ہے فرما دیجئے تم بھی اس کی طرح گھڑی ہوئی دس سورتیں بنا لاؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا جنکی تم طاقت رکھتے ہو ان کو بھی (مدد کیلئے) بلا لو اگر تم سچے ہو" [13]۔

تفسیر 13 اس آیت میں منکرین قرآن کیلئے ڈانٹ اور زجر ہے اور قرآن مجید کا اعجاز بھی ذکر ہوا ہے یعنی مخالفین سے دس سورتوں کے لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔کہا جاتا ہے کہ دس سورتوں کا مطالبہ اسلئے ہوا کہ اس وقت مخالفین قرآن کے دس قبیلے تھے اس لئے ہر قبیلے سے ایک سورۃ کا مطالبہ ہوا جس سے دس سورتیں بنے یا دس سورتوں کا مطالبہ اس لیے کیا گیا کہ اس سورت تک ابتداء سے دس سورتیں بنتی ہے تو تنبیہ دیتے وقت ان دس سورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سوال: سورۃ یونس میں ایک سورۃ کا مطالبہ کیا گیا تھا جبکہ وہ نزول میں اس سورۃ سے پہلے ہے تو کم سے زیادہ کی طرف کیوں ترقی کی گئی۔

جواب: امام مبرد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ سورۃ یونس میں وعد وعید علم غیب کی خبریں اور احکام کے ساتھ مقابلہ ذکر تھا تو اس کیلئے مطالبہ ایک سورۃ کا تھا ان کیلئے ایک سورۃ کا مطالبہ مناسب تھا جبکہ یہاں فصاحت و بلاغت کیلئے دس سورتوں کا مطالبہ کیا گیا ہے۔اور اس موضوع کیلئے زیادہ سورتوں کی ضرورت تھی تاکہ خوب فصاحت و بلاغت کا فرق معلوم ہوسکے۔

فَاِلَّمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَـكُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰهِ وَاَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۴﴾

"پھر اگر وہ آپ کی اس بات کو قبول کرنے سے انکار کریں تو آپ جان لو کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے علم سے نازل ہوا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں کیا تم مسلمان ہوتے ہو" [14]۔

تفسیر 14 اس آیت میں قرآن کی سچائی اور اس مسئلہ کی حقانیت بیان ہوئی ہے جس کیلئے قرآن اتارا گیا جو کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ هُوَ: ہے: لَـكُمۡ: میں اشارہ ہے کہ مومنین بھی مقابلہ میں نبی کے ساتھ شریک ہیں: بِعِلۡمِ اللّٰهِ: یعنی اللہ کے علوم پر مشتمل ہے اور مخلوق کے بس میں علوم الٰہی کا مقابلہ نہیں: وَأَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: یہ عِلۡمِ اللّٰهِ یا اَنَّمَا: پر عطف ہے اور دونوں معنوں میں خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا موضوع اور خلاصہ توحید باری تعالیٰ ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴿15﴾

"جو دنیا اور اس کے زیب وزینت کے متمنی ہیں انہیں ہم دنیا میں انکے اعمال کا پورا بدلہ دیتے ہیں اور ان کیلئے اس دنیا میں کمی نہیں کی جائے گی" [15]۔

تفسیر 15 اس آیت میں ان لوگوں کیلئے ڈانٹنا مقصود ہے جنہوں نے دنیا کو ہی اپنا مقصد بنا رکھا ہے۔ کیونکہ یہ انکار قرآن مجید کیلئے سبب ہے اور یہ آیت ان کیلئے بھی وعید ہے جو دین کے کسی بھی عمل پر دنیا کماتے ہیں۔ (یعنی عبادت پر اجر کی نیت نہیں بلکہ دنیا کمانا چاہتے ہیں) مَنْ كَانَ يُرِيدُ: ماضی استمراری کے صیغہ لانے میں اشارہ ہے کہ انکی ہمیشہ یہی نیت رہتی ہے: اَلْحَيَاةَ الدُّنْيَا: نیک اعمال کرنے سے صحت، ریاست اور دنیاوی عافیت چاہتے ہیں: وَزِيْنَتَهُ: اس سے مالی وسعت اور کثرت اولاد مراد ہے۔ جیسا کہ سورۃ کہف آیت 46 میں ذکر ہے: نُوَفِّ إِلَيْهِمْ: اللہ تعالیٰ ان کی نیت کے موافق ان کو دنیاوی مرادوں میں کامیاب کردیگے۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿16﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور ان کے وہ اعمال جو دنیا میں کئے تھے ضائع ہو جائیں گے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب بے فائدہ ہونگے" [16]۔

تفسیر 16 اس آیت میں ان لوگوں کیلئے تخویف اخروی بیان ہو رہا ہے جنکا تذکرہ سابقہ آیت میں ہے: وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا: اس میں ان نیک اعمال کی طرف اشارہ ہے جو وہ طلب دنیا کی نیت سے کرتے ہیں: وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: اس میں ان اعمال کی طرف اشارہ ہے جو بذات خود قبیح اور خلاف شریعت ہیں۔ مفسرین کا قول ہے کہ اس آیت میں مشرکین منافقین ۔ ریاکار اور دنیا پرست لوگ شامل ہیں۔

اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ وَيَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ وَمِنۡ قَبۡلِهٖ كِتٰبُ مُوۡسٰٓى اِمَامًا وَّرَحۡمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡهُ ۚ اِنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿17﴾

"کیا وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے واضح دلیل پر ہو اور اس کی طرف سے اس کے پاس گواہ ہو اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب (گواہ) پیشوا اور رحمت ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور سب فرقوں میں سے جو بھی اس کا منکر ہوا انکے آخری وعدے کی جگہ جہنم ہے۔ آپ کسی قسم کے شبہ میں نہ پڑئیے۔ یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہی ہے لیکن اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں" [17]۔

تفسیر 17 اس آیت میں سورۃ کا تیسرا دعویٰ ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آن کے ساتھیوں کیلئے تسلی ہے۔ سابقہ آیت میں دنیا پرستوں کا ذکر تھا تو بطور تقابل اب دینداروں پرہیزگاروں کا حال ذکر ہورہا ہے۔ جسکا خلاصہ یہ ہے کہ اے نبی اور نبی کے ساتھیوں اتمہارا (مسئلہ توحید) عقلی دلائل سے اور وحی دلائل یعنی قرآن مجید سے ثابت جبکہ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب بطور دلیل نقلی تمہاری تائید میں ہے لہٰذا اس مسئلہ سے جو بھی اعراض کریگا وہ ہٹ دھرم اور ضدی ہوگا جس کیلئے عذاب تیار ہے کسی ایسے ضدی اور ہٹ دھرم آدمی کے انکار کی وجہ سے آپ لوگ حق میں شک نہ کریں۔ بَيِّنَةٍ: اس سے مراد توحید ہے جو دلائل عقلیہ سے بھی ثابت ہے: شَاهِدٌ: اس سے قرآن مجید مراد ہے جو توحید ثابت کرنے میں کامل گواہ ہے۔ اِمَامًا: کتاب الہٰی کو امام اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی اقتداء اور پیروی لازم ہوتی ہے: اَفَمَنۡ كَانَ: اس کی جزاء حذف ہے۔ یعنی: كَمَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَزِيۡنَتَهَا وَلَيۡسَ لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ: یا جزاء اس طرح ہے: اَيَبۡقٰى لَهٗ مَحَلُّ شُبۡهَةٍ وَّشَكٍّ: یعنی اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جس نے دنیا اور اس کی زیب و زینت اختیار کی ہو ان کیلئے تو آخرت میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں ہے۔ کیا اس کیلئے مزید شک و شبہ کی گنجائش باقی ہے: اُولٰٓئِكَ: لفظ جمع میں اشارہ ہے کہ مَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سب صحابہ رضی اللہ عنہ مراد ہیں اور بِهٖ: کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ: يُؤۡمِنُوۡنَ: کے مقابل ہے: اَلۡاَحۡزَابُ: اس سے کفار کی جماعتیں مراد ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ضد و عناد کرتی رہی: مِّنۡهُ: ضمیر قرآن یا موعد کی طرف راجع ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا

عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٨﴾

"اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اپنے رب پر جھوٹ باندھے یہ لوگ اپنے رب کے سامنے پیش کیئے جائینگے اور سارے گواہ کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا۔ باخبر رہو ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے [18]"۔

تفسیر 18 اس آیت میں مشرکین کیلئے عذاب اخروی سے ڈرانا مقصود ہے اور یہ لَا يُؤْمِنُونَ: سے متعلق ہے :اِفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف شریک کی نسبت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لئے :وَلَدٍ: کا عقیدہ رکھتے ہیں قرآن اور رسول اکرم ﷺ انکار کرتے ہیں :يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ: رب کے سامنے پیشی تو ساری مخلوق کی ہے جیسا کہ سورۃ کہف آیت 48 میں ہے مگر یہاں ذلت و رسوائی کی پیشی ہے :اَلْاَشْهَادُ: ذکر کیا ہے گواہی مندرجہ ذیل آیتوں میں ذکر ہے اس لئے اس کو جمع کے صیغہ سے ذکر کیا ہے۔ سورۃ النساء 41 سورۃ النحل آیت 84 سورۃ النور آیت 24 سورۃ یسین آیت 65 سورۃ حم سجدہ آیت 20 سورۃ ق آیت 21 سورۃ البقرۃ آیت 143 یہ مختلف شہادات کا ذکر ہے۔ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ: اس سے مراد انبیاء کرام ملائکہ اس امت کے مواحدین اور انسان جسم کے اعضاء ہیں اس لئے اَلْاَشْهَادُ جمع ذکر کیا: كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ: یعنی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے اور اس جرم عظیم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف جائز سمجھتے تھے۔

الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿١٩﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں کجی کے متلاشی ہیں اور یہ آخرت کے بھی منکر ہیں" [19]۔

تفسیر 19 اس آیت میں ظالموں کے تین صفات بیان ہوئے ہیں (1) :يَصُدُّوْنَ: اس میں اشارہ ہے کہ یہ متعدی کافر ہیں یعنی دوسروں کو بھی روکتے ہیں سبیل اللہ یہ توحید، قرآن اور سنت ہے :يَبْغُوْنَهَا: یہ ضمیر سبیل کی طرف راجع ہے اور سبیل مذکر و مونث دونوں آتا ہے :عِوَجًا: سے مراد توحید کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈال دینا ہے :يَبْغُوْنَهَا: میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کجی نہیں ہے مگر یہ اس میں کجی کے متلاشی ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ظالم ضد اور عناد

کی وجہ سے اس میں طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں تاکہ اور لوگوں کو حق سے پھیر دیں۔ سورۃ اعراف آیت 45 اور سورۃ آل عمران آیت 99 میں بھی اس طرح بیان ہوا ہے۔

أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ۘ يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو دنیا میں بے بس نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان کیلئے کوئی دوست ہوگا ان کیلئے عذاب دگنا کیا جائے گا وہ حق سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی حق دیکھتے تھے" [20]۔

تفسیر 20 اس آیت میں اخروی عذاب سے منکرین کو ڈرانا مقصود ہے: مُعْجِزِينَ بمعجز کی اور لازمی دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ یعنی بچنے والے نہیں ہیں یا اللہ تعالیٰ کو عذاب دینے سے روک نہیں سکتے: مِنْ أَوْلِيَاءَ: اس سے وہ معبود مراد ہیں جو انہوں نے سفارشی بنا رکھے تھے جیسا کہ سورۃ یونس میں گزرا ہے: يُضَاعَفُ: مضاعفہ یعنی دوگنا عذاب اس لیے ہوگا کہ کفر کی مختلف طریقوں کے مرتکب تھے اور ان سب میں شرک کسی نہ کسی درجے میں شامل تھا یا معنی یہ ہے خود تو گمراہ تھے مگر دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے تھے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢١﴾ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ﴿٢٢﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنا نقصان آپ کیا اور ان سے غائب ہو گیا جو کچھ انہوں نے گھڑ رکھا تھا [21]۔ لازم ہے کہ بیشک یہ لوگ آخرت کے خسارہ میں ہیں" [22]۔

تفسیر 21، 22 عذاب کا سبب یہاں بیان ہو رہا ہے اور اسی طرح منکرین کے لیے ڈانٹ اور زجر ہے اور دوسری آیت میں آخرت کا خوف دلانا مقصود ہے: خَسِرُوا: شرک کی وجہ سے انکی نیکیاں تباہ ہو گئیں لہذا خسران کا اصل سبب شرک ہے وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ: افتراء سے باطل معبود بنانا مراد ہے: ضَلَّ: غائب ہو جانے کے معنی میں ہے۔ یا اِفْتِرَاءٌ: سے مراد شرک کے وہ قصے کہانیاں ہیں جو انہوں نے گھڑ رکھی تھی اور ضل اور نسیان یعنی بھول جانے کے معنی میں ہے: لَا جَرَمَ: امام فراء کا قول ہے کہ یہ لفظ: لَا بُدَّ یا لَا مَحَالَةَ: کے معنی میں ہے اور حَقًّا کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور امام زجاج کا قول ہے کہ: لَا: میں لوگوں کے گمان کی نفی ہے اور جرم کسب کے معنی میں ہے تو معنی یہ ہوا کہ ان لوگوں کے گمان میں جو بات ہے حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ انہوں نے آخرت کیلئے سامان خسران کا بندوبست کر ہی لیا

ہے۔امام سیبویہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ لام گمان کی نفی کیلئے ہے اور جرم حق کے معنی میں ہے۔امام خطیب شربینی کا قول ہے کہ آیت 18 سے یہاں تک: لَا یُؤْمِنُوْنَ: کیلئے 14 حالات وصفات ذکر کئے گئے ہیں۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٣﴾

"یقیناوہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور اپنے مالک حقیقی کی ہی طرف جھکتے رہے یہی لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ ہی رہیں گے"[23]۔

تفسیر 23 منکرین کو وعید یں سنانے کے بعد اس آیت میں ایمان والوں کیلئے خوشخبری ہے: وَأَخْبَتُوا: اس کے کئی معانی ہیں: (۱) انابت کرنا (۲) اطاعت (۳) عاجزی (۴) اخلاص جب: وَأَخْبَتُوا: کے صلہ میں: إِلَى: آجائے تو پھر معنی خشوع عاجزی انکساری ہے اس میں اعمال قلبیہ کی طرف اشارہ ہے: وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ: اس میں اعضاء کے اعمال کی طرف اشارہ ہے۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٤﴾

"ان دونوں فرقوں کی مثال اندھے بہرے دیکھنے اور سننے والے جیسی ہے کیا یہ دونوں مثال میں برابر ہیں کیا تم پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے"[24]۔

تفسیر 24 یہ بھی خوشخبری میں داخل ہے: اَعْمٰى: اور: اَصَمّ: کی مثال مشرک کی ہے اور: بَصِيْر: اور السَّمِيْع: کی مثال مؤحد کی ہے اس میں ان لوگوں پر رد ہے جو کافر مؤمن میں فرق نہیں کرتے اس زمانہ میں اس عقیدہ کو سیکولرازم کہا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٥﴾

"یقیناہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا (انہوں نے کہا) کہ میں تمہیں صاف صاف ڈرانے والا ہوں"[25]۔

خلاصہ: اس آیت سے آیت 111 تک دوسرا باب ہے اس میں شروع کے تین واقعات اور چھٹے واقعہ کا تعلق ردشرک فی العبادت کے ساتھ ہے اور چوتھے، پانچویں واقعہ کا تعلق ردشرک فی العلم اور فی التصرف سے ہے جبکہ ساتواں واقعہ موسیٰ علیہ السلام جس کا تعلق دوسرے دعوے کے ساتھ ہے درمیان میں خوف اور خوشخبری کا ذکر ہے اور آیت 109 کا تعلق سورۃ کے تیسرے دعوے سے ہے۔ ربط: اس آیت کا تعلق سابقہ آیت سے یہ ہے کہ فریقین کیلئے بطور امتیاز مثال ذکر ہوئی ہے

ندھے بہرے اور بصارت وسماعت رکھنے والوں کی تو اب اس کے مزید توضیح کے لیے انبیاء علیہم السلام کے واقعات وقصوں کے ساتھ دونوں فریقوں کے انجام میں فرق کو بیان کر رہے ہیں۔

تفسیر 25 یہ آیت پہلی دلیل نقلی ہے اور نوح علیہ السلام سے مسئلہ توحید کے اثبات کے لیے۔ اس میں ان کی شجاعت بہادری طریقہ دعوت اور ان کی قوم پر آنے والے عذاب کا ذکر تخویف دنیاوی کیلئے کیا گیا ہے: أَرْسَلْنَا: میں: فَقَالَ: کا معنی مخفی ہے: إِنِّي: اس کیلئے مقولہ ہے نَذِيرٌ مُّبِينٌ: میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے میں کسی کا لحاظ نہیں رکھتا اور نہ ہی کچھ بچھپاتا ہے۔

أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ ﴿٢٦﴾

"تم صرف اللہ ہی کی بندگی کرو مجھے تم پر دردناک دن کے عذاب کا خوف ہے" [26]۔

تفسیر 26 أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ: یہ: إِنِّي: سے بدل ہے یا: مُّبِينٌ: کیلئے مفعول ہے اور دعوت توحید ہے أَلِيمٍ: يَوْمٍ: کیلئے صفت ہے مطلب یہ ہے کہ عذاب کا دن سخت ترین دن ہوتا ہے چاہے عذاب دنیاوی ہو یا اخروی ہو۔ یا پھر عذاب کیلئے صفت ہے لیکن: أَلِيمٍ: کا زیر یوم کی قربت کی وجہ سے ہے۔ پھر دردناک عذاب کا معنی بنے گا۔ اور اس کو جر للجوار کہتے ہیں: إِنِّي أَخَافُ: یعنی توحید سے انکار پر مجھے عذاب آنے کا خوف ہے۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ﴿٢٧﴾

"اس کی قوم میں سے کافر سرداروں نے کہا کہ ہم تو آپ کو ایک اپنے جیسا انسان ہی تصور کرتے ہیں اور تیرے پیروکار سرسری نظر رکھنے والے نیچ لوگوں اور موٹی عقل والوں کے سوا کوئی نہیں اور ہم تمہاری کوئی برتری بھی نہیں دیکھتے بلکہ تجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں" [27]۔

تفسیر 27 الْمَلَأُ: اشراف کو کہتے ہیں چاہے شرافت دینی ہو یا اخروی لیکن یہاں دنیاوی سرداری وشرافت مراد ہے۔
سوال: سورۃ اعراف آیت 60 میں: الَّذِينَ كَفَرُوا: میں ذکر ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوم کافر تھی جبکہ یہاں صرف اشراف کا ذکر ہو رہا ہے۔ جواب: اس میں اشارہ ہے کہ سورۃ اعراف میں پوری قوم کافر تھی جبکہ یہاں بطور تکبر اعتراضات ہیں جو مالدار متکبرین کا کام ہے۔ قوم نوح علیہ السلام کے سرداروں کے چار اعتراضات ذکر ہیں۔

پہلا اعتراض: تم ہماری طرح بشر ہو۔ دوسرا اعتراض: آپ کے پیروکار ذلیل لوگ ہیں اس لیے کہ نوح علیہ السلام پر ایمان والے اکثر غریب لوگ تھے جیسا کہ حدیث ہرقل میں ہرقل نے کہا تھا کہ انبیاء کے اکثر پیروکار غریب ہوتے ہیں (صحیح بخاری کتاب بدء الوحی حدیث 7)۔ تیسرا اعتراض: ہم پر تمہاری کوئی برتری نہیں ہے۔ یعنی تیرے اندر صفت نبوت نہیں ہے۔ چوتھا اعتراض: تم جھوٹے ہو۔ اول دوم اعتراضات صرف نوح علیہ السلام پر تھے اس لیے مخاطب کو مفرد (واحد) ذکر کیا بعد والے اعتراضات میں ایمان والے بھی نوح علیہ السلام کے ساتھ شامل ہیں تو اس لئے جمع کا صیغہ ذکر کیا ہے: بَادِيَ الرَّأْيِ: یعنی انہوں نے بلا سوچ وتدبر تجھ پر ایمان لایا ہے اگر غور وفکر اور سوچ کر فیصلہ کرتے تو کبھی ایمان نہ لاتے: أَرَاذِلُنَا: یہ لفظ انہوں نے ان کے مسکینی فقیری کی وجہ سے کہا ورنہ ایمان والے تو نوح علیہ السلام کے بچے اور ان کی بیویاں ہیں جو کہ اعلی نسب والے ہیں کیونکہ انبیاء اعلی نسب میں منتخب کیے جاتے ہیں جیسا کہ بخاری کی ہرقل والی حدیث میں وارد ہے۔ (صحیح بخاری کتاب بدء الوحی حدیث 7)۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ۝

"نوح علیہ السلام نے فرمایا اے میری قوم کے لوگو! اگر اللہ تعالی نے مجھے اپنی طرف سے واضح دلیل دی ہو اور میں اس کی طرف سے ایک خاص (نبوت کی) رحمت پر ہوں اور یہ نعمت تم پر مخفی ہو تو کیا میں اسے تم پر جبرا مسلط کر سکتا ہوں جبکہ اس سے تمہیں نفرت ہے" [28]۔

تفسیر 28 بَيِّنَةٍ: اس سے توحید کے واضح دلائل مراد ہیں اور: رَحْمَةً: سے نبوت مراد ہے مطلب یہ ہے کہ میرے پاس توحید کے واضح دلائل اور نبوت کی روشن علامتیں موجود ہیں لیکن اگر تم اسے نہیں مانتے تو میں زبردستی تمہارے سے نہیں منوا سکتا ہوں جبکہ میں جھوٹا نہیں سچا ہوں۔ یہ ان کے تمام اعتراضات کا جواب ہے: فَعُمِّيَتْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا: ضمیروں کو مفرد مؤنث ذکر کیا ہے کیونکہ: بَيِّنَةٍ وَرَحْمَةً: کا مقصد ایک ہے یا پھر ہر ایک کی تاویل کے ساتھ ہے۔

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْـهَلُوْنَ ؀

"اے میری قوم! میں اس پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا میرا اجر تو اللہ تعالی کے ہاں ہے اور نہ ہی میں ایمان والوں کو اپنے پاس سے ہٹا سکتا ہوں۔ انہوں نے اپنے رب سے ملتا ہے البتہ میں تمہیں جاہل قوم دیکھتا ہوں" [29]۔

تفسیر 29 اس آیت میں نوح علیہ السلام کے اخلاص کا ذکر ہے اور قوم کیلئے اس میں ترغیب ہے اور: مَالًا: اس لیے فرمایا کہ اکثر دنیاوی اجرت مال کی صورت میں ہوتی ہے۔ اور: أَجْرِيَ: اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالی کے پاس جزاء دینے کے اللہ تعالی کے پاس جہت سے قسمیں ہیں پھر ان کے قول کا جواب ہے انہوں نے کہا اپنی مجلس سے ان غریبوں کو ہٹا دو تب ہم آپ پر ایمان لائیں گے تو جواب ہوا کہ میں ان کو ہٹانے کا اختیار نہیں رکھتا ہو کیونکہ یہ تو اللہ تعالی کی عدالت میں جانے والے ہیں تو ایسا نہ ہو کہ میری شکایت کریں: تَجْهَلُوْنَ: اس میں اشارہ ہے کہ ایمان والوں کو حقارت سے دیکھنا جاہلوں کا کام ہے۔

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ؀

"اے میری قوم کے لوگوں اگر میں نے اپنی مجلس سے ان کو ہٹایا تو اللہ تعالی کے مقابلہ میں میری مدد کون کریگا۔ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے ہو" [30]۔

تفسیر 30 اس میں ان کی بات کا دوسرا جواب ہے یعنی اگر میں ان کو اپنی مجلس سے نکال دوں تو میرا کون مددگار ہوگا جو مجھے اللہ تعالی سے بچائے: أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: اس میں اللہ تعالی کی عظیم قدرت کی طرف اشارہ ہے کہ کسی بھی صورت میں اس کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکتا ہے۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

"نہ میں تمہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ ہی میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں ملک ہوں میں اس کا بھی قائل نہیں ہوں کہ جن کو تمہاری نظریں حقیر دیکھ رہی ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کوئی نعمت ہی نہیں دیگا (کیونکہ) ان کے دلوں میں جو کچھ ہے اس کو اللہ ہی جانتا ہے اگر میں ایسی بات کہوں تو میرا شمار ظالموں میں سے ہو جائے گا" [31]۔

تفسیر 31 اس آیت میں ان چار اعتراضات کے جوابات ہیں جس کی تفصیل سورۃ انعام آیت 50 میں گزری ہے اس سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے رسول نوح علیہ السلام پر جو اعتراض کئے گئے ہیں وہ ہمارے آخری نبی محمد ﷺ پر کئے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ تمام انبیاء کی صفات سلبیہ ہیں: بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ: اس میں اشارہ ہے کہ ایمان والوں پر وہ منافقت کا گمان کرتے تھے: جو بَادِيَ الرَّاْيِ: سے معلوم ہوتا ہے: خَيْرًا: سے جنت، ثواب اور اجر مراد ہے: لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ: اس طرح سورۃ انعام آیت 52 میں گزرا ہے۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

"انہوں نے کہا اے نوح! تم نے ہمارے ساتھ بحث کر لی اور خوب بحث کر لی اب ہمارے پاس وہی لیکر آنا جس کی تو ہمکو دھمکی دے رہے ہو اگر تو سچوں میں سے ہے" [32]۔

تفسیر 32 اس آیت میں منکرین کی طرف سے نوح علیہ السلام پر طعن ہوا ہے انہوں نے ان کی دعوت کو جھگڑا قرار دیا اور انکو جھگڑالو قرار دیا جیسا کہ اس وقت بھی اہل حق کو شر پسند جھگڑالو قرار دیتے ہیں یا جدال سے مراد توحید کو دلائل سے ثابت کرنا اور رسالت کی دعوت اور ان کے شبہات کا جواب دینا ہے جو ان کے نزدیک شر پسندی تھی علامہ شربینی نے تفسیر سراج المنیر میں لکھا ہے کہ یہ طریقہ انبیاء کا ہے اور تقلید و جہالت کافروں کے عمل میں سے ہے بِمَا تَعِدُنَآ: وہ اس وعدے کا ذکر آیت 26 میں گزر چکا ہے۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۳۳

"نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ اس عذاب کو لائے گا اگر وہ چاہے اور تم اس کے عذاب سے بچنے والے نہیں ہو"[33]۔

تفسیر 33 اس آیت میں انکی اس بات کا جواب ہے جو سابقہ آیت میں گزر گئی ہے: فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا: جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ عذاب نازل کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۳۴

"تمہیں میری خیر خواہی کوئی فائدہ نہیں دے سکتی اگر چہ میں کتنا ہی خیر خواہی کا ارادہ کروں جبکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں گمراہ کر نے کا ارادہ کر رکھا ہو وہی تمہارا رب ہے اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے"[34]۔

تفسیر 34 یعنی جس طرح عذاب اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے تو اسی طرح ہدایت اور گمراہی بھی اسی کے اختیار میں ہے اور اسی عذاب کا سبب ہے آیت سے معلوم ہوا کہ انسان عمل تو کرتا ہے مگر اس سے نفع پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اسی طرح کوئی انسان اللہ تعالیٰ کے ارادے کے خلاف نہیں کر سکتا اور شرط کی جزاء محذوف ہے اصل عبارت اس طرح ہے: إِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ أَنْ يُّغْوِيَكُمْ فَإِنْ أَرَدْتُّ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ فَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝۳۵ ع

"وہ کہتے ہیں کہ اس (قرآن) کو اس نے گھڑ لیا ہے فرما دیجئے کہ اگر میں نے گھڑا ہو تو میرا جرم میرے ذمہ ہے اور میں ان گناہوں سے بری ہوں جو تم کرتے ہو"[35]۔

تفسیر 35 اس آیت میں دو توجیہ ہیں: (1) نوح علیہ السلام کا اپنی قوم سے مکالمہ ہے غائب کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے (2) دوسرا توجیہ یہ ہے کہ یہ مکالمہ ہمارے نبی ﷺ کا اپنی قوم سے ہے لہٰذا یہ جملہ معترضہ ہے: إِجْرَامِيْ: گناہ ظاہری جرم کو کہا جاتا ہے اور مضاف مقدر ہے یعنی إِثْمَ إِجْرَامِيْ: میرے جرم کا گناہ مقدر عبارت یہ بھی ہو سکتی ہے أَنْتُمْ بَرِيْئُوْنَ عَنْ إِجْرَامِيْ۔

وَأُوْحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُۥ لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ ءَامَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا۟ يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾

"نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے اب (مزید) کوئی ایمان نہیں لائے گا ان کے سوا جو ایمان لا چکے ہیں لہٰذا آپ ان کے کاموں پر غمگین مت ہونا" [36]۔

تفسیر 36 دعوت نوح کی تفصیل کے بعد اب ان کی قوم کے عذاب کی تفصیل ذکر ہو رہی ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس وقت بددعاء کی تھی جب ان کو یہ وحی کی گئی تو اس کے ذریعے سے ان کے ایمان سے نا امید ہو گئے: لَن يُؤْمِنَ: اللہ تعالیٰ کی یہ خبر صادق ہے جیسا کہ سورۃ بقرۃ آیت 6 میں گزر رہا ہے۔

وَٱصْنَعِ ٱلْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَـٰطِبْنِى فِى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓا۟ ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴿٣٧﴾

"ایک کشتی ہماری وحی کے ذریعے اور ہماری آنکھوں کے سامنے تیار کر اور ظالموں کے بارے میں سفارش نہ کرنا یقیناً وہ غرق کیے جانے والے ہیں" [37]۔

تفسیر 37 اس سے قبل یہ مراد ہے کہ جب نوح علیہ السلام کی قوم نے مخالفت زیادہ کر دی تو نوح علیہ السلام نے ان کے حق میں بددعاء فرمائی جس کا سورۃ نوح میں ذکر ہے اور جب وہ دعا قبول ہوئی تو نوح علیہ السلام نے کشتی بنائیں۔ وَٱصْنَعِ ٱلْفُلْكَ: اس آیت میں نجات اور بچاؤ کے لیے نوح علیہ السلام کو تدبیر سکھائی جا رہی ہے: بِأَعْيُنِنَا: یہ لفظ متشابہات میں سے ہے اس کا ظاہری معنیٰ تو آنکھیں ہے البتہ اس کی کیفیت متشابہ ہے اور اس کا حفاظت کے ساتھ معنیٰ کرنا سلف صالحین کے منہج کے خلاف ہے: وَوَحْيِنَا: وحی سے مراد کشتی بنانے کا حکم اور بنانے کا طریقہ ہے: وَلَا تُخَـٰطِبْنِى: اس میں مشرکین کیلئے سفارش سے ممانعت ذکر ہے: مُّغْرَقُونَ: یعنی ان کے غرق ہونے کا حکم ہو چکا ہے۔

وَيَصْنَعُ ٱلْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِۦ سَخِرُوا۟ مِنْهُ ۚ قَالَ إِن تَسْخَرُوا۟ مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ﴿٣٨﴾

"اور کشتی نوح علیہ السلام بنا رہے تھے جب اس کی قوم کے سردار گزرتے تو اس کا مزاق اڑاتے وہ کہتے اگر تم ہمارا مزاق اڑاتے ہو تو ہم بھی ایک دن تمہاری ہنسی اڑائیں گے جیسے تم ہم پر ہنستے ہو" [38]۔

تفسیر 38 وَيَصْنَعُ ٱلْفُلْكَ: اس میں لفظ: كَانَ: استمراری (ہمیشگی) کیلئے مخفی ہے یعنی: كَانَ يَصْنَعُ: اس آیت میں اشارہ ہے کہ بے وقوف اور جاہل لوگ انبیاء اور صالحین کے کاموں پر ہنسی مزاق کرتے ہیں اور ان کے کاموں کی حکمتیں نہیں جانتے ان کی ہنسی اور مذاق کا طریقہ یوں تھا کہ جب نوح علیہ السلام کے پاس سے گزرتے تو کہتے پانی یا

سمندر تو نہیں اور نوح علیہ السلام کا یہاں کشتی بنانا دیوانوں کا کام ہے کیونکہ یہاں تو ریت کے ٹیلے تھا۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ کفار اور مشرکین پر ہلاکت کے وقت ہنسی اور مذاق کر سکتے ہیں اسی طرح سورۃ مطففین آیت 34 میں ذکر ہے۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝

"عنقریب تم جان لوگے کہ کن پر عذاب آتا ہے جس سے وہ رسوا ہوں گے اور ہمیشگی کا عذاب ان پر واقع ہوگا" [39]۔

تفسیر 39 پہلے عذاب سے دنیاوی اور دوسرے سے آخرت کا عذاب مراد ہے یا دونوں سے دنیا ہی کا عذاب مراد ہے۔ بعض یَاْتِيْهِ: اتیان اس سے مراد شروع ہونا ہے۔ وَيَحِلُّ: سے پورا احاطہ کرنا مراد ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝

"یہاں تک کہ جب ہمارے عذاب کا حکم آپہنچا اور تنور میں (پانی) ابلنے لگا ہم نے کہا کہ اس کشتی میں ہر قسم کے جوڑے سوار کرلو اور اپنے اہل کو بھی سوائے ان لوگوں کے جن کے بارے میں عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور ایمان والوں کو بھی۔ اور ان پر ایمان نہیں لائے تھے مگر بہت کم لوگ" [40]۔

تفسیر 40 حَتّٰٓى: ابتدائیہ ہے التنور اس سے عام تنور یا نوح علیہ السلام کے گھر کے تنور مراد ہیں یا اس سے ساری روئے زمین مراد ہیں یعنی جب تنور میں یا روئے زمین پر پانی ابلنے لگے۔ بعض علماء نے غضب الٰہی سے کنایہ مراد لیا ہے مگر یہ قول ضعیف ہے۔ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ: اس سے نوح علیہ السلام کے ایک بیٹے اور ایک اہلیہ کی طرف اشارہ ہے اور سبقت سے تقدیر میں لکھنا مراد ہے یا آیت 37 میں اس کا ذکر ہوا ہے۔ زَوْجَيْنِ: ہر وہ دو چیزیں جو ایک دوسرے کی محتاج ہوتی ہیں اور وہ دونوں جوڑی کی صورت میں ہوئی تو ان پر "زوجان" کا اطلاق ہوتا ہے۔ اِلَّا قَلِيْلٌ: اس میں مختلف اقوال ہیں کم سے کم تعداد علاوہ نوح علیہ السلام چھ افراد کی ہے یہ چھ افراد نوح علیہ السلام کے تین بیٹے اور ان کی بیویاں ہیں۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"نوح (علیہ السلام) نے فرمایا کشتی میں سوار ہو جاؤ اللہ ہی کی مدد سے اس کا چلنا اور اسی کے حکم سے ٹھہرنا ہے یقیناً میرا رب بڑا بخشش والا رحم والا ہے" [41]۔

تفسیر 41 یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف نوح علیہ السلام کو یا نوح علیہ السلام کی طرف سے اپنی قوم کی طرف اس آیت میں سوار ہونے کا وقت اور اس سے متعلق اداب مذکور ہیں۔ بسم اللہ متعلق ہے: إِرْكَبُوْا: کے ساتھ یا: إِسْتَعِيْنُوْا: مقدر ہے اور اس کے ساتھ متعلق ہے یا پھر: مَجْرٖىهَا: سے متعلق ہے۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۣ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

"وہ کشتی انہیں لے کر پہاڑ کی طرح موجوں میں جارہی تھی اور نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جو ایک کنارے پر تھا آواز دی اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں میں شامل مت ہونا" [42]۔

تفسیر 42 وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ: اس سے قبل عبارت مقدر ہے کہ جب یہ لوگ اللہ تعالیٰ کا نام لیکر کشتی میں سوار ہو گئے اور کشتی انہیں لیکر چلنے لگی: وَنَادٰى نُوْحُ ِۨ ابْنَهٗ: اس میں پہلی توجیہ یہ ہے کہ بیٹے نے منافقت کی تھی تو والد کو اس کا کفر معلوم نہیں تھا اس لئے اس کو سواری میں بٹھانے کیلئے اسے آواز دی: فِيْ مَعْزِلٍ: سے مراد یہ ہے کہ وہ کنارے پر دور تھے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ اس کے کفر پر خبردار تھے لیکن اس کو دعوت دے رہے تھے تاکہ وہ توبہ کر کے اسلام میں آجائے إِرْكَبْ: معنی یہ ہے ایمان لاکر کشتی میں سوار ہو جاؤ جیسا کسی کو کہا جائے کہ نماز پڑھو مطلب یہ ہے کہ وضوء کر کے نماز پڑھو اور معزل اس وقت دین سے دوری کے معنی میں ہیں لیکن پہلی توجیہ بہتر ہے۔

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

"اس نے کہا کہ میں کسی بڑے پہاڑ کی پناہ حاصل کرلوں گا وہ مجھے پانی سے بچالے گا نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ آج عذاب الٰہی سے بچانے والا کوئی نہیں صرف وہی بچیں گے جن پر اللہ تعالیٰ کا رحم ہوا۔ اسی دوران ان دونوں کے درمیان پانی حائل ہوگیا اور وہ غرق ہونے والوں میں سے ہوگیا" [43]۔

تفسیر 43 لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ: اس میں تین توجیہات ہیں: پہلی توجیہ یہ ہے کہ: مَنْ رَّحِمَ: سے مراد اللہ تعالیٰ ہے جو کہ رحیم ہے دوسری توجیہ یہ ہے کہ: عَاصِمَ: مَعْصُوْمٌ: کے معنیٰ میں ہے جیسا: دَافِقٍ: مَدْفُوْقٍ: کے معنیٰ میں ہے۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ: اِلَّا، ستثنیٰ منقطع ہے۔ اور: لٰکِنْ: کے معنیٰ میں ہے اور اس کا یہ قول کہ: سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ: کفر کا کلمہ نہیں ہے بلکہ ظاہری اسباب کی طرف اشارہ ہے اسلئے نوح علیہ السلام کو ان کے کفر کا یقین نہیں آیا۔

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

"اور کہا گیا اے زمین! پانی نگل جا اور آسمان! تھم جا اور اس وقت پانی خشک کردیا گیا اور کام پورا کیا گیا اور جودی پہاڑ پر کشتی ٹھہر گئی اور فرمادیا گیا کہ ظالم قوم کیلئے ہلاکت وتباہی ہو" [44]۔

تفسیر 44: وَغِيْضَ الْمَآءُ: پانی کم ہونے وجہ یہ ہے کہ زمین کا اپنا پانی خشک ہوگیا صرف آسمانی پانی رہ گیا وہ بھی زمین نگل گئی: اَلْجُوْدِيِّ: ایک پہاڑ کا نام ہے جو ارارط کوہستان میں واقع ہے اور یہ موصل شہر کے قریب ہے یہ نجات عاشوراء کے دن حاصل ہوئی: وَقِيْلَ: یہ آواز ہر طرف سے ہوئی خصوصا ملائک نے دی اس لئے قیل کہا گیا تاکہ عموم آجائے۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾

"نوح علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارتے ہوئے فرمایا اے میرے رب! میرا بیٹا تو میرے گھر والوں میں سے ہے یقینا تیرا وعدہ سچا ہے اور تو تمام حاکموں سے بہتر حاکم ہے" [45]۔

تفسیر 45 وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ: نداء عاجزی کے ساتھ دعاء کرنے اور پکارنے کے حق میں ہے۔ جو سورۃ مریم آیت 3 میں

ہے: إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي: اس میں اشارہ ہے کہ تو نے مجھ سے اہل کی نجات کا وعدہ کیا تھا جیسا کہ آیت 40 میں ہے: وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ: اس میں اشارہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر اعتراض نہیں کیا ہے صحیح قول یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کو اپنے بیٹے کے کفر پر یقین نہیں تھا ان کا گمان تھا کہ یہ مؤمن ہے البتہ عملی نفاق میں مبتلا ہے اور اس کے بعض اعمال کی حسن توجیہ کرتے تھے اور یہ ان کا اجتہادی عمل تھا لہٰذا اس وجہ سے انہوں نے دعاء کی۔

قَالَ يَٰنُوحُ إِنَّهُۥ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُۥ عَمَلٌ غَيْرُ صَٰلِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِۦ عِلْمٌ ۖ إِنِّىٓ أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ ٱلْجَٰهِلِينَ ۝

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے نوح! یقیناً وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے (اس لئے) کہ اس کے اعمال اچھے نہیں ہیں اور تجھے ہرگز وہ چیز نہیں مانگنی چاہئے جسکا تجھے علم یقینی نہ ہو میں تجھے نصیحت کرتا ہوں تاکہ آپ جاہلوں کے گروہ میں سے نہ ہو جاؤ" [46]۔

تفسیر 46 اس آیت میں دلیل ہے کہ جس شخص کے اعمال خلاف شریعت ہوا سے نسب فائدہ نہیں دے سکتا: إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ: ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد سے روایت ہے کہ وہ ان کا حقیقی بیٹا تھا اور اس کی دلیل يَا بُنَيَّ: اور إِنَّ ابْنِي: ہے۔ اس میں مجاز کی ضرورت نہیں ہے: أَهْلِكَ اور اہل سے مراد وہ اہل ہیں جنکی نجات کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ یا مراد یہ ہے کہ اس بیٹے کی نسبت آپ کی طرف مناسب نہیں کیونکہ اس کے اعمال صالحہ نہ تھے: إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ: جنہوں نے مجاہد اور حسن کے حوالے سے یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ ولد الزنا تھا اس قول کی سند صحیح نہیں ہے اور اس میں انبیاء کی توہین ہے اور اس پر امام ابن کثیر رازی اور سراج المنیر نے سخت رد کیا ہے۔ اس آیت میں سوال کرنے اور دعا مانگنے کے آداب کا بیان ہے تاکہ جاہلوں کے طرز عمل سے بچا جا سکے۔ (نوٹ) اس مقام پر بعض مفسرین نے جیسا کہ صاحب کشاف اور سید مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ نوح علیہ السلام سے جہالت سرزد ہوئی تھی یہ بے ادبی اور توہین انبیاء ہے۔ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ: اس میں مضاف کو حذف کیا ہے یعنی: ذُو عَمَلٍ غَيْرِ صَالِحٍ: إِنَّهُ: کی ضمیر دعاء نوح کی طرف راجع کرنا غلط قول ہے: فَلَا تَسْئَلْنِ: یہ آداب آنے والے وقت میں دعا کیلئے ہے: مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ: مراد یہ ہے کہ جس کے ایمان پر آپ کو شک ہے اس کیلئے نجات کے بارے میں سوال مت کریں!: إِنِّي أَعِظُكَ: اس نصیحت سے وعید مراد نہیں ہے بلکہ آئندہ کیلئے بچانا مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے عمل سے ہمیں محفوظ فرمائے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۴۷

"اے میرے رب! میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں اس بات کی میں تجھ سے معافی طلب کروں اس کے بارے میں جس کے ایمان کے بارے میں مجھے علم نہیں اگر تو مجھے نہ بخشے گا اور مجھ پر رحم نہ کریگا تو میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤں گا"[47]۔

تفسیر 47 اس جملے: وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْٓ: میں نبی کی عبدیت (بندگی) اور عجز کمزوری کو بیان کرنا مقصود ہے اس سے گناہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ دعاء آدم علیہ السلام کی دعا کی طرح ہے یعنی اظہار بندگی ہے نہ کہ گناہ پر دلیل ہے۔ علامہ شربینی نے بھی اپنی تفسیر میں اسی طرح لکھا ہے۔

قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۴۸

"فرمادیا گیا اتر جا اے نوح! تجھ پر ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہیں اور ان بعض امتوں پر جو تیرے ساتھ موجود لوگوں سے پیدا ہونگی اور دیگر بہت ساری امتیں جنہیں ہم دنیا میں لذتیں دیں گے لیکن پھر ان کو ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا"[48]۔

تفسیر 48 اس آیت میں نوح علیہ السلام کو کئی بشارت اور خوشخبریاں دی گئی ہیں پہلی بشارت سلامتی اور برکات کی ہے سلامتی سے عذاب اور مصائب اور برکات دنیویہ جیسے نباتات اور وسعت رزق اور برکات اخرویہ دین کی نشر واشاعت مراد ہیں۔ دوسری خوشخبری یہ ہے کہ ان کی اولاد میں بھی صالحین پیدا ہونگے تیسری خوشخبری یہ ہے کہ دنیا میں آئندہ تیری ہی نسل ہوگی۔ چوتھی بات یہ ثابت ہوئی کہ انبیاء بھی رحمتوں برکتوں میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہوتے ہیں پانچویں بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ تمام انسان دو گروہوں میں تقسیم ہوں گے۔ سلامتی و برکتیں سب ایمان والوں کیلئے عام ہے جبکہ متاع اور عذاب تمام کافروں کیلئے عام ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ ؕ فَاصْبِرْ ۛ ؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝۴۹ ع

"یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جن کی وحی ہم آپ کی طرف کرتے ہیں نہ اس سے پہلے آپ اسکو جانتے تھے اور نہ ہی آپ کی قوم لہٰذا آپ صبر کرتے رہیں اور بہترین انجام پرہیزگاروں ہی کیلئے ہیں"[49]۔

تفسیر 49 یہ آیت صدق محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر دلیل ہے اور آپ علیہ السلام کو تسلی دی گئی ہے۔ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ وہ تاریخی

واقعات نبی علیہ السلام کے علم میں نہ تھے اور نہ ہی مشرکین کو ان کے بارے میں کچھ علم تھا وہ تاریخیں خبریں جس سے نبی بھی بے خبر تھے اور اس وقت کے مشرکین بھی جو کہ مخاطب تھے اور یہ بعد والا جملہ یعنی: مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا: ماقبل کی تفسیر ہے وَلَا قَوْمُكَ: یہود اور نصاریٰ کو یہ واقعہ معلوم تھا لیکن وہ چھپاتے تھے تو اس لئے قوم فرمایا کہ مشرکین عرب اُمیّین اس سے بے خبر تھے: إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ: نوح علیہ السلام اور اس کے ماننے والے مؤمنین نے تقویٰ کی وجہ سے نجات پائی اور آئندہ آنے والے تمام مسلمانوں کو بھی تقویٰ اختیار کرنی چاہیے۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ﴿٥٠﴾

''اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود علیہ السلام کو بھیجا اس نے کہا میری قوم کے لوگوں! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود برحق نہیں تم تو صرف افتراء کرتے ہو'' [50]۔

تفسیر 50 اثبات توحید کے لیے اس آیت میں دوسری دلیل نقلی بیان ہو رہی ہے ھود علیہ السلام سے اور اسی طرح مسئلہ توحید کے بیان میں اس کی شجاعت اور بے خوفی کا ذکر ہے اور پھر ان کی قوم کی عذاب کا تخویف دنیوی کے لیے ذکر ہے

إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ: تمام مشرکین اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں کیونکہ وہ معبودان باطلہ کے متعلق جھوٹے قصے بناتے رہتے ہیں۔ آیت 50 کے بعد سے تین آیتوں تک دعوت کا طریقہ ذکر ہوا ہے پھر دو آیتوں میں قوم کی طرف سے مخالفت کا ذکر ہے پھر چار آیتوں میں ان کی شجاعت کا ذکر ہے پھر ان کی تخویف کا بیان ہے اور آخری تین آیتوں میں ایمان والوں کی نجات اور عذاب کے اسباب کا ذکر ہے اور آخر میں دنیاوی اور اُخروی عذاب ذکر ہوا ہے۔

يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٥١﴾

''اے میری قوم کے لوگوں! میں تم سے اس دین کی دعوت پر کوئی معاوضہ نہیں طلب کرتا ہوں میری مزدوری تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے کیا تم عقل سے فائدہ نہیں لیتے ہو'' [51]۔

تفسیر 51 اس آیت میں ان کے اخلاص کا بیان ترغیب کے طور پر ہے کیونکہ کوئی بھی طمع رکھنے والا کبھی بھی مکمل حق اخلاص کے ساتھ نہیں بیان کر سکتا ہے: فَطَرَنِي: میں کامل اخلاص کا اظہار ہے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا

تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

"اے میری قوم کے لوگوں تم اپنے رب سے معافی طلب کرو اور اس کی طرف متوجہ ہو کر توبہ کرو وہ تم پر برسنے والے بادلوں کو بھیج دے گا اور تمہاری قوت میں مزید اضافہ کرے گا اور تم اعراض کرتے ہوئے مجرم نہ بنو" [52]۔

تفسیر 52 اس آیت میں توحید کی دعوت دی گئی ہے توبہ اور استغفار کے ساتھ اور ترغیب دی گئی دنیوی نعمتوں کے ذکر کرنے کے ساتھ نیز استغفار اور توبہ کے درمیان فرق آیت 3 میں گزر چکا ہے اور اس آیت میں استغفار اور توبہ کے دو دنیاوی فائدے بیان ہوئے ہیں سورۃ نوح کی آیت 11، 12 میں ذکر ہوئے ہیں یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا: چونکہ یہ کاشت کار زمیندار لوگ تھے جو بارشوں کی شدت سے ضرورت مند ہوتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق تین سال تک ان کی بارش روک دی گئی تھی: وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ: مالی و افرادی قوت مراد ہے۔ ایک روایت کے مطابق تین سال تک ان کی عورتوں کے بچے بند ہو گئے تھے: مُجْرِمِيْنَ: میری دعوت سے روگردانی صراحتاً ارتکاب جرم ہے۔

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾

"انہوں نے کہا اے ہود علیہ السلام! تم ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لیکر نہیں آئے اور نہیں ہم تیرے کہنے پر اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے اور نہ ہی ہم آپ کی بات پر یقین رکھتے ہیں" [53]۔

تفسیر 53 اس آیت میں تین طریقوں سے ان کے عناد کا ذکر ہوا ہے پہلا طریقہ: بِبَيِّنَةٍ: باوجود دلائل کے ان کی قوم نے تعصب اور عناد کی وجہ سے انکار کر دیا کیونکہ ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے معجزات اور بینات دئے ہوئے ہیں۔ دوسرا طریقہ وہ اپنے شرک پر اصرار کر رہے تھے جیسے اس جملہ میں ہے: وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا: اور: عَنْ قَوْلِكَ: میں بھی انہوں نے اشارہ کیا ہے کہ ہم آپ کی بات نہیں مانتے اس لئے کہ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ تیسرا طریقہ: وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ: مستقبل زمانہ میں ایمان کی نفی کی ہے تاکہ ان کے ایمان لانے کی کوئی امید بھی نہ ہو۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

"بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تجھے اذیت پہنچائی ہے (اس لیے آپ دیوانہ ہو گئے ہو) ہود علیہ السلام نے کہا تم گواہ رہو اور میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہوں کہ یقیناً میں بیزار ہوں اس سے جو تم اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہراتے ہو" [54]۔

تفسیر 54 اس آیت میں بھی ان کے عناد اور جہالت کا ذکر ہوا ہے اور انکا ایمان سے انکار ذکر ہوا ہے۔ انہوں نے کہا آپ کا دماغ خراب ہو گیا اور یہ نسبت ضرور وہ غیر اللہ کی طرف کرتے تھے یہ شرکیہ عقیدہ ہے اور ایک نبی کے متعلق یہ کہنا کہ ہمارے بزرگ معبود نے تیرا دماغ خراب کیا ہے۔ آج بھی جاہلوں میں یہ عقیدہ موجود ہے کہ اگر کسی موحد کو تکلیف پہنچے تو اس کی نسبت کسی بزرگ ولی اور مزار کی طرف کرتے ہیں کہ غیر اللہ نے انہیں نقصان پہنچایا ہے: قَالَ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ اس میں ھود علیہ السلام کی شجاعت کا اور بہادری کا بیان ہے اسی طرح توحید پر ان کی استقامت کو بیان کر رہے ہے: وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ: یہ برات عام ہے ان کی معبودان باطلہ سے برات اور ان معبودان کی طرف سے ضرر یا تکلیف پہنچنے والے عقیدے سے برأت ہے۔

مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝

"اللہ تعالیٰ کے سوا تو تم سب مل کر میری خلاف بدی کرلو اور مجھے مہلت بھی نہ دو" [55]۔

تفسیر 55 اس آیت میں بھی ان کی استقامت اور بہادری کا ذکر ہوا ہے: مِنْ دُوْنِهٖ: اس کو تاکید کیلئے الگ ذکر کیا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تو کوئی شریک نہیں جبکہ سب اس کے سامنے بے بس اور کمزور ہیں تو یہ شریک اور برابر کیسے ہوئے: فَكِیْدُوْنِیْ: یہ نوح علیہ السلام کے قول کی طرح ہے جو سورۃ یونس آیت 71 میں گزرا ہے اور اس میں دلیل ہے کہ وہ غیر اللہ سے کوئی خوف محسوس نہیں کرتے تھے۔

إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُم ۚ مَّا مِن دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٥٦﴾

"میرا بھروسہ تو صرف اللہ ہی کی ذات پر ہے جو میرا اور تمہارا رب ہے زمین پر جتنے بھی چلنے والے ہیں سب کی پیشانی اس نے تھام رکھیں ہیں۔ میرا رب بالکل صحیح راہ پر ہے" [56]۔

تفسیر 56۔ یہ ماقبل کیلئے دلیل ہے یعنی اللہ پر خالص توکل ہر قسم کے شرک سے برأت کو مستلزم ہے اور دوسرا جملہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کیلئے علت ہے یعنی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضہ اور قدرت میں ہے سو اللہ تعالیٰ کے ارادے کے بغیر یہ معبودان باطلہ کسی قسم کا ضرر پہچانے کا اختیار نہیں رکھتے۔ بِنَاصِيَتِهَا: ناصیہ ان بالوں کو کہتے ہیں جو ماتھے پر ہوتے ہیں اور عرب ناصیہ پکڑنے کو قبضہ میں لینے اور ذلیل کرنے کے لئے محاورۃً استعمال کرتے ہے۔ تیسرے جملے کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عدل اور انصاف پر قائم ہے اور: صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ: سے مراد عدل ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ اہل توحید کو مشرکین کی چالوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ توحید کے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے اس معنیٰ میں عَلَى زائد کے معنیٰ میں ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ موحد کو ذلت سے بچاتا ہے۔

فَإِن تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ﴿٥٧﴾

"پس اگر تم روگردانی کرتے ہو تو تحقیق جس پیغام کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں تمہاری طرف وہ میں نے تمہیں پہنچایا اور میرا رب تمہارے سوا دوسری قوم کو جانشین بنادے گا جبکہ تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے یقیناً میرا رب ہی ہر چیز پر نگہبان ہے" [57]۔

تفسیر 57 اس آیت میں قوم کا عذر ختم کرنا مقصود ہے تا کہ وہ نہ کہیں کہ ہم حق سے بے خبر تھے: فَإِن تَوَلَّوْا: اس کی جزاء مقدر ہے یعنی میں ذمہ دار نہیں ہوں اور میں مجھ پر کوئی ملامت نہیں کیونکہ میں نے حق پہنچایا اور رجت قائم کی: فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ: یہ جزاء کیلئے علت ہے: وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ: یہ فَيُهْلِكَكُمْ مقدر پر معطوف ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ہلاک کر کے تمہارے جگہ دوسری قوم کو بسادے گا یہ مخفی لفظ پر معطوف ہے۔ یعنی فَيُهْلِكَكُمْ یعنی تمہیں اللہ تعالیٰ ہلاک کر کے تمہاری جگہ اور قوم کو بسادے گا اور یہ تخویف دنیوی ہے: حَفِيظٌ: یعنی ہر قسم کے عمل کی اپنے علم اور قدرت کے ساتھ حفاظت کرنے والا ہے خواہ وہ عمل چھوٹا ہو یا بڑا۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

"اور جب ہمارے عذاب کا حکم آپہنچا تو ہم نے ھود علیہ السلام اور ان کی پیروی کرنے والوں کو نجات دی اور اپنی رحمت سے ان کو سخت عذاب سے بچالیا "[58]۔

تفسیر 58 أَمْرُنَا: سے تیز آندھی کا عذاب مراد ہے جسکا بیان سورۃ حم سجدہ آیت 16 اور سورۃ الحاقہ آیت 6 میں ہوا ہے: نَجَّيْنَا: میں اشارہ ہے کہ عذاب کے آنے سے پہلے اس سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ عذاب کے وقت اللہ تعالیٰ پہلے اپنے رسولوں کو نجات دیتا ہے اور پھر ان کے مُتَّبِعِيْنَ: کو پھر اس کے بعد کافروں پر عذاب لاتا ہے۔ اور بِرَحْمَةٍ: میں اشارہ ہے کہ نجات کا سبب صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ فائدہ: اس آیت میں لفظ نجات دو دفعہ ذکر ہوا ہے پہلے سے مراد دفعہ نجات مشرکین کی چالوں مظالم اور مکروفریب سے ہے اور دوسری مرتبہ عذاب دنیاوی سے نجات مراد ہے۔ یا اول نجات سے مراد دنیاوی عذاب سے ہے اور دوم نجات اخروی عذاب سے ہے۔

وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾

"یہ قوم عاد تھی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے انکار کیا اور اس کے رسول کے حکم کی عدولی کی اور ہر سرکش نافرمان کی پیروی کی"[59]۔

تفسیر 59 وَتِلْكَ عَادٌ: لفظ عاد قبیلہ کی تاویل سے مونث ہے اور تِلْكَ: سے اس لئے اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ لوگوں کے ذہنوں میں مشہور ہوا تھا۔ اور اسمائے اشارہ سے اکثر معبود ذہنی کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور یہ واقعہ لوگوں کے ذہنوں میں موجود تھا۔ اس آیت میں عذاب کے تین اسباب ذکر ہیں۔ (۱) توحید کی آیتوں سے انکار (۲) [illegible] رسول کی مخالفت جو تمام انبیاء کی مخالفت کو مستلزم ہے۔ (۳) جبار سرکش لوگوں کی تقلید جو کسی کا حکم اپنے اوپر نہیں مانتے ہیں اسی طرح دلیل اور قانون شرعی کے ساتھ عناد اور ضد رکھنے والے جیسے عنادی کافر ہے۔

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

"ان کے پیچھے دنیا میں بھی لعنت لگادی گئی اور قیامت کے دن بھی جان لو یقیناً قوم عاد نے اپنے رب کی نافرمانی کی سنو قوم عاد کیلئے تباہی ہے جو کہ ھود علیہ السلام کی قوم ہے"[60]۔

تفسیر 60 اس آیت میں عذاب دنیاوی اور اخروی کی ترقی کا بیان ہے یعنی تیز آندھی سے ان کی ہلاکت کے بعد اللہ تعالیٰ

اور ملائکہ اور مومنوں کی طرف سے ان پر دائمی لعنت کی گئی ہے اور یہ لعنت ہمیشہ ان کا پیچھا کرے گی اور اس کا سبب : کَفَرُوا رَبَّهُمْ :ذکر کیا ہے: قَوْمِ هُودٍ: اس میں اشارہ ہے کہ پہلے قوم عاد دوسرے قوم عاد ارم تھے اور لفظ أَلَا میں اشارہ ہے کہ ان کا کفر بالکل ظاہر و اعلانیہ تھا۔ اور ان کا عذاب بھی اسی طرح تھا اور ظاہر تھا: کَفَرُوا رَبَّهُمْ :اس میں (با) حذف ہوا ہے۔ لہٰذا کفر کا معروف معنی مراد ہے یا اس سے انکار کرنا مراد ہے تو پھر حذف با کی ضرورت نہیں ہے: بُعْدًا: اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص سے دوری ہلاکت اور تباہی ہے۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴿٦١﴾

"اور ہم نے بھیجا قوم عاد کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو اور اس نے کہا اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے اور اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور اسی زمین میں بسایا ہے اس سے معافی طلب کرو اور اسی کی طرف رجوع کرو یقیناً میرا رب قریب اور دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے" [61]۔

تفسیر 61 اس آیت میں اثبات توحید کے لیے تیسری دلیل نقلی صالح علیہ السلام سے بیان ہو رہی ہے اور ان کی قوم کی طرف سے جواب پھر لفظ: اِسْتَعْمَرَكُمْ : سے ان کو دعوت دی ہے استعمار طول دینے یا آباد کرنے کے معنی میں ہے یا یہ عُمْرٰی سے ماخوذ ہے یعنی پوری عمر کے لیے کسی کو کوئی چیز تفویض کر دینا اور بخشش دینا۔ پھر صالح علیہ السلام کی شجاعت کا بیان توحید کے متعلق ذکر ہے۔ معجزہ ذکر کرنے کے بعد قوم کی جانب سے تکذیب کا بیان ہے اور تخویف دنیوی کے لیے ان کی قوم کے عذاب کا تذکرہ ہوا ہے لہذا توحید کے بیان کے بعد اس آیت میں دو نعمتیں ذکر ہوئی پہلی نعمت ایجاد ذکر ہوئی :أَنشَأَكُمْ :مراد یہ ہے کہ ابو الانسان سیدنا آدم علیہ السلام کی پیدائش زمین سے ہوئی، یا انسانوں کے رزق اس میں سے ہے اور اسی سے انسان کا نطفہ پیدا ہوتا ہے یا مِنْ: میں: فِي: کا معنی ہے۔ دوسری نعمت بقاء دینا ہے جو ان لفظوں میں ہے: وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا: پھر استغفار اور توبہ کا حکم ہوا ہے اور آخر میں توحید کی ترغیب کیلئے اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی قریب اور مجیب ذکر کی ہے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾

"انہوں نے کہا اے صالح علیہ السلام! اس سے پہلے تو ہماری بہت اچھی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں کیا تم ہمیں ان کی عبادت سے روک رہے ہو جن کی عبادت ہمارے بڑے کیا کرتے تھے ہمیں اس دین میں حیران کن شک ہے جس کی طرف آپ ہمیں بلا رہے ہیں" [62]۔

تفسیر 62 مَرْجُوًّا: پسندیدہ شخص جن سے لوگ اچھے کام کی امید رکھتے ہوں انہوں نے یہ بات اس لئے کہی کہ دعویٰ نبوت سے قبل یعنی ان کے اچھے اخلاق تھے جیسے یتیموں کی کفالت، عاجز مسکین کے ساتھ تعاون کرنا بیماروں کی عیادت اور یتیم بچوں پر ترس کھانا اس میں اشارہ ہے جب تک حق بیان نہ کیا ہو تو لوگ مخالفت نہیں کرتے بلکہ اس کی عزت کرتے ہیں اور یہ اچھے اخلاق ہمارے آخری نبی ﷺ میں موجود تھے جیسا کہ امام بخاری نے کتاب بدء الوحی حدیث 3 میں ذکر کیا ہے: أَتَنْهَانَا أَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا: اس میں اشارہ ہے کہ قوم کی ناراضگی کا سبب بڑوں کے طریقے کی مخالفت تھی مُرِيْب۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا شک تیری متعلق اس درجہ تک ہے کہ بدگمانی یا لڑائی تک پہنچتا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

"اس نے جواب دیا کہ اے میری قوم کے لوگوں مجھے بتاؤ تو سہی اگر میں اپنے رب کی طرف سے مضبوط دلائل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت عطاء کی ہو پھر اگر میں نے اس کی نافرمانی کر لی تو وہ کون ہے جو اس کے مقابلہ میں میری مدد کریں۔ تم نقصان کے سوا کسی چیز میں مجھے زیادہ نہیں کر سکتے ہو" [63]۔

تفسیر 63 اس آیت میں: أَتَنْهَانَا: کا جواب ہے کیونکہ: إِنْ عَصَيْتُهٗ: سے مراد یہ ہے کہ میں اگر رد شرک اور دعوت توحید نہ چھوڑ دوں تو یہ نافرمانی ہے: إِنْ كُنْتُ: میں إِنْ: شک کیلئے نہیں ہے البتہ مخاطبین کو مائل کرنے کیلئے ہے: بَيِّنَةٍ: اس سے واضح عقلی دلائل مراد ہیں: رَحْمَةً: سے مراد نبوت اور وحی الہیٰ ہے: فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ إِنْ عَصَيْتُهٗ: یہ استفہام انکاری ہے: غَيْرَ تَخْسِيْرٍ: کے دو معنی ہیں (1)۔ یعنی جب مجھے بیان توحید سے منع کرتے ہو تو یہ میرے لئے یقینی نقصان

ہے۔(2) تم اپنے آباؤ اجداد کی دین سے دلیل لاتے ہو تو یہ نقصان والی بات ہے کیونکہ علم آپ لوگوں کی گمراہی کے متعلق مزید پختہ ہو گیا اور یہ کہ تم لوگ ہلاک ہوں گے کیونکہ تم لوگ شرک کرتے ہو اور شرک ہلاکت کا سبب ہے البتہ آپ لوگ اپنے اباؤ اجداد کے عمل کو دلائل میں پیش کرتے ہو جبکہ یہ دلیل نہیں بلکہ آباؤ اجداد کی تقلید ہے اور مجھے یقینی علم ہے کہ یہ گمراہی اور ہلاکت کا سبب ہے۔

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿٦٤﴾

"اور اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی گئی اونٹنی ہے جو تمہارے لئے بطور معجزہ ہے تم اس کو اللہ تعالیٰ کی زمین میں کھاتے ہوئے چھوڑ دو اور کسی طرح سے اس کو ایذا مت دو ورنہ تمہیں فوری عذاب پکڑ لے گا" [64]۔

تفسیر 64 نَاقَةُ اللّٰهِ: اس کی نسبت اللہ کی طرف عظمت و شرافت کیلئے کی گئی اس لئے کہ اس کے پیدا کرنے کے کوئی ظاہری اسباب نہیں تھے: فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ: یعنی اس کے کھانے کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں :فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ: اس میں اشارہ ہے کہ معجزہ کی توہین سبب عذاب (دنیوی) ہے۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾

"انہوں نے اس کی پونچھیں کاٹ ڈالیں صالح علیہ السلام نے فرمایا تین دن زندگی سے گھروں میں لطف اٹھالو یہ جھوٹا وعدہ نہیں ہے" [65]۔

تفسیر 65 فَعَقَرُوْهَا: عَقَرَ: جوڑوں کے کاٹنے کو کہتے ہے اور عمل ایک نے کیا جیسا کہ سورۃ قمر آیت 29 میں ہے لیکن چونکہ سب اس عمل پر راضی تھے اس لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا: تَمَتَّعُوْا: کے متعلق امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ کنایہ ہے تین دن کے حیات سے کیونکہ تین دن کا کیا مزہ ہو گا جیسا کہ کہا گیا ہے :اَلْمَيِّتُ لَا يَتَلَذَّذُ وَلَا يَتَمَتَّعُ بِشَيْءٍ: یعنی مردہ دنیا کی کسی چیز سے فائدہ اور مزہ نہیں لے سکتا ہے :دَارِكُمْ: سے ان کی بستیاں یا دنیا کا گھر مراد ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾

"پس جب آیا ہمارے عذاب کا فیصلہ تو ہم نے صالح کو اور اس پر ایمان لانے والوں کو اپنی خاص رحمت کے ساتھ اس سے بچالیا اور اس دن کی رسوائی سے بھی۔ یقیناً تیرا رب طاقت والا غالب ہے" [66]۔

تفسیر 66 بِرَحْمَةٍ مِّنَّا: اس میں اشارہ ہے کہ صالحین کی نجات رحمت الٰہی کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ ان کے عمل کی وجہ سے

اور نہ ہی اللہ تعالٰی انہیں نجات دینے کے معاملے میں مجبور ہے بلکہ ان کی نجات خالص رحمت الٰہی ہے اس میں ان کے کسی عمل کو دخل نہیں۔ وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ: یعنی اس ذلت اور رسوائی سے انہیں نجات دی جو عذاب الٰہیہ کولازم تھی یا دوسرا معنٰی یہ ہے کہ اس گاؤں سے نجات دی اور عذاب دنیاوی سے جو کہ رسوائی تھی۔ اور يَوْمِئِذٍ: میں قیامت کے دن کی طرف اشارہ ہے۔

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٦٧﴾

"اور ظالموں کو ایک آواز (چنگھاڑ) نے آ پکڑا پھر وہ اپنے گھروں میں مرے ہوئے اوندھے منہ پڑے ہوئے تھے" [67]۔

تفسیر 67 عذاب ان کے عمل کی مناسبت سے چیخ چنگاڑ والی تھی کیونکہ اونچی آوازوں اور تیز تیز بولنے کی وجہ سے انہوں نے سیدنا صالح علیہ السلام کی بے عزتی کی تھی تو اللہ تعالٰی نے ان پر زوردار چیخ کی آواز کے ساتھ عذاب مسلط کیا باقی تفصیل سورۃ اعراف میں گزری ہے: جٰثِمِيْنَ: اس میں تین حالتوں کی طرف اشارہ ہے (۱) ہیبت کی وجہ سے اوندھے منہ گر جانا۔ (۲) اٹھنے سے قاصر ہو جانا۔ (۳) مر جانا۔

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۗ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۠ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۗ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿٦٨﴾ ع

"ایسے فنا ہو گئے گویا کہ وہ وہاں آباد ہی نہ تھے آگاہ رہو قوم ثمود نے اپنے رب کی نافرمانی کفر کیا تو سن لو ان ثمودیوں پر پھٹکار ہے" [68]۔

تفسیر 68 كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا: انکی بستی کے فنا ہونے کی طرف اشارہ ہے اس سے پہلے: قَنَوْا یا اَهْلَكُوْا: مقدر ہے: كَفَرُوْا رَبَّهُمْ: یہ سبب عذاب ہے: اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ: جملہ خبریہ ہے یعنی ان کے عذاب کے بعد کہا گیا کہ ہلاکت اور تباہی ہو ان ثمودیوں کیلئے یا جملہ دعائیہ ہے قیامت کے بارے میں۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۗ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾

"اور ہمارے ملائک ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے اور سلام کیا انہوں نے بھی سلام کا جواب دیا تو وہ گائے کا بھنا ہوا بچھڑا بلا تاخیر لے آئے" [69]۔

تفسیر 69 یہ چوتھا واقعہ ہے جس میں رد شرک فی العلم ہوا ہے یعنی علم غیب اللہ تعالٰی کیلئے خاص ہے۔ ابراہیم علیہ السلام خلیل

اللہ ہوتے ہوئے بھی مہمانوں کے متعلق علم نہیں رکھتے ہیں کہ یہ ملائک ہیں اور ملائک کھانا نہیں کھاتے: وَلَقَدْ جَآءَتْ: واوَ حرف عطف میں دلیل ہے کہ تمام قصوں کا خلاصہ اور مقصد ایک ہی ہے وہ ہے اثبات توحید باری تعالیٰ لَقَدْ: کو برائے تاکید اس لئے ذکر کیا ہے کہ علم غیب کے مسئلے میں منکرین کو بہت شک تھا تو اس واقعہ میں انکار د ہے۔ رُسُلُنَا: اس لفظ میں ان کے آنے کا مقصد ذکر کیا ہے کہ وہ ایک پیغام لے کر آئے ہیں جبکہ سورۃ حجر آیت 51 اور سورۃ ذاریات آیت 24 میں: ضَیْف: مہمان لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کے خیال میں مہمان تھے۔ بِالْبُشْرٰی: لوط علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت یا بیٹے کی خوشخبری مراد ہے اصل مقصد تو خوشخبری تھی اس سے قبل سلام وطعام کا ذکر کیا ہے۔ سلام میں اشارہ ہے کہ سلام ملائک اور انبیاء کا مستقل طریقہ ہے لفظ سلام پر پیش پڑھنے میں ہمیشگی اور دوام کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جملہ اسمیہ ہے جو سَلَامًا (مَفْتُوح) کی بنسبت بہتر ہے یعنی زبر سے پڑھنے میں مخفی فعل کیلئے مفعول ہے یعنی: سَلَّمْنَا سَلَامًا: قَالُوْا: کے لئے مفعول ہے: أَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ: یہاں أَنْ: حَتّٰی: کے معنیٰ میں ہے یعنی: حَتّٰی جَآءَ: یا پھر لفظ بِمِنْ: مقدر ہے۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ ؕ﴿۷۰﴾

"آپ جب انہوں نے دیکھا کہ انکے تو ہاتھ بھی کھانے کو نہیں پہنچ رہے ہیں تو دل ہی دل میں خوف محسوس کیا، انہوں نے کہا ذر ومت ہم تو قوم لوط علیہ السلام کی طرف بھیجے گئے ہیں" [70]۔

تفسیر 70 لَا تَصِلُ اِلَیْهِ: یہ نہ کھانے سے کنایہ ہے: نَكِرَهُمْ: سنت یہ ہے کہ مہمانوں کے سامنے جب بھی کھانا رکھا جائے تو انہیں دعوت قبول کرنی چاہئے اور کھانا جلدی شروع کرنا چاہئے لیکن جب انہوں نے معمول کے خلاف ہاتھ بڑھانے کے بجائے روک رکھے تو اس لئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے خوف محسوس کیا: خِیْفَةً: تکلیف اور ضرر پہنچانے کا خوف: قَالُوْا لَا تَخَفْ: اگر سوال کیا جائے کہ ملائک نے ابراہیم علیہ السلام کے دلی خوف کو کس طرح جان لیا یہ تو علم غیب ہے؟ جواب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس خوف کا اظہار اپنی زبان پر کیا تھا جیسا کہ سورۃ حجر آیت 52 میں ہے لَا تَخَفْ اِنَّا اُرْسِلْنَا: ہم آپ کو ضرر ونقصان کیلئے نہیں آئے بلکہ لوط علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کیلئے بھیجے گئے ہیں: اِنَّا اُرْسِلْنَا: میں اشارہ تھا کہ یہ ملائک ہیں اس لئے کھانا بھی نہیں کھاتے تب ابراہیم علیہ السلام کو تسلی ہو گئی: اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ: یہاں کے بھیجنے کا دوسرا مقصد ہے۔ سوال: سورۃ حجر اور ذاریات سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کی خوشخبری اور خوف کے

ازالے کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے ملائکہ سے پوچھا کہ :فَمَا خَطْبُكُمْ: کس اہم مشن پر آئے ہو تو انہوں نے قوم لوط علیہ السلام کی ہلاکت کی خبر سنا دی۔ جبکہ یہاں پر :لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ: سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خوف کو زائل کرنے کیلئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ جواب: یہاں عبارت میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی پہلے خوف کو زائل کرنے کیلئے بیٹے کی خبر دی تا کہ وہ خوش ہو جائیں۔ پھر خوف کے ازالے کی تاکید کیلئے لوط علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کی خبر سنائی جو کہ ابراہیم علیہ السلام کے سوال میں ذکر تھا۔

وَامْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِن وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ ﴿٧١﴾

"اس کی بیوی جو کہ کھڑی تھی تو خوش ہوئی پس ہم نے اس کو اسحاق علیہ السلام کی اور اس کے پیچھے یعقوب علیہ السلام کی خوشخبری دی"[71]۔

تفسیر 71 وَامْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ: یعنی مہمانوں کی خدمت کیلئے پردے کے پیچھے کھڑی تھی جیسا کہ ذاریات آیت 29 سے معلوم ہوتا ہے یعنی :فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ: جب وہ جان گئی کہ یہ ملائکہ کی جماعت ہے سامنے آگئی۔ فَضَحِكَتْ: اس سے ہنسا مراد نہیں ہے کیونکہ حیادار خاتون کسی مجلس میں نہیں ہنستی لہذا اس سے خوش ہونا مراد ہے۔ سوال: سورۃ ذاریات آیت 28 سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کی خوشخبری ملنے کے بعد سامنے آئی اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنے کے بعد خوشخبری دی گئی تھی۔ جواب: یہ ہے کہ ملائکہ نے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو خوشخبری دی جیسا کہ ذاریات 28 میں ہے تو ان کی بیوی نے پردے کے آڑ میں سن لیا تو خوش ہوئی لیکن ان کے خیال میں تھا کہ شاید دوسری بیوی سے ولد ہوگا لیکن ملائکہ نے بعد میں ان کو بشارت دی۔ سوال: ہنسی کی کیا وجہ تھی؟ جواب 1: مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ کا قول ہے کہ ضَحِكَتْ: حَاضَتْ: کے معنی میں ہے۔ حائضہ ہوگئی اگرچہ عمر بڑھاپے کی ہے یعنی اس عمر میں حیض آنے سے جان گئی کہ میں خود ولادت اولاد کی لائق بن گئی۔ لہذا خوشی کا سبب بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یعنی بچے کی خوشخبری سن کر سامنے آئی اور تعجب میں ہوئی۔
جواب 2: امام فراء رحمہ اللہ کا قول ہے کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی پہلے خوشخبری دی گئی تو وہ خوش ہوئی۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿72﴾

"وہ کہنے لگیں ہائے تعجب! کیا میری اولاد پیدا ہوگی میں بوڑھی ہوں اور یہ میرا خاوند بھی بڑے عمر کے ہیں یہ تو یقینا تعجب کی بات ہے" [72]۔

تفسیر 72 تعجب کے وقت میں یٰوَیْلَتٰی: کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ خاتون سارا بن ہاران تھی اور یہ ابراہیم علیہ السلام کی چچازاد بہن تھی: عَجِیْبٌ: یہ قدرت الٰہی کو دیکھتے ہوئے تعجب نہیں کیا بلکہ عمومی عادت کے لحاظ سے تعجب کا اظہار کیا کیونکہ اس عمر میں عورتوں کے بچے پیدا نہیں ہوتے۔

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿73﴾

"ملائک نے کہا کیا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے تم تعجب کرتے ہوا ے ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے والوں تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکتیں ہوں یقیناً وہ بڑی شان حمد وثناء کا حقدار ہے" [73]۔

تفسیر 73 اَمْرِ اللّٰهِ: سے اللہ تعالیٰ کی قدرت یا فیصلہ مراد ہے: رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ: مناسب اور اولیٰ یہ ہے کہ یہ جملہ خبریہ اور خبر ہو یہ دعا نہیں ہے یہ آیت دلیل ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے اہل بیت ہونے میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے جیسے کہ سورۃ احزاب آیت 33 میں ہے: حَمِیْدٌ: وہ ذات ہے جس کی تعریفیں مخلوق کی زبان پر ہر دونوں حالتوں میں جاری ہوں یعنی خوشی سے یا ناخوشی سے ہو: مَجِیْدٌ: شرافت اور عظمت کو کہتے ہیں۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿74﴾

"جب ابراہیم علیہ السلام کا ڈر وخوف زائل ہوا اور خوشخبری پائی تو قوم لوط علیہ السلام کے متعلق ہمارے ساتھ بحث کرنے لگے" [74]۔

تفسیر 74 اَلْبُشْرٰی: میں بیٹے کی خوشخبری اور ہلاکت قوم لوط کی خوشخبری بھی شامل ہے: یُجَادِلُنَا: عذاب کو مؤخر کرنے کیلئے بحث کر رہے تھے جسکو مجادلہ کہا گیا ہے جیسا کہ سورۃ عنکبوت آیت 32 میں ذکر ہے اور اس میں اصل مقصد ابراہیم علیہ السلام کا یہ تھا کہ لوط علیہ السلام بھی بستی میں موجود ہیں اور جب نبی موجود ہوتا ہے تو عذاب نہیں آتا۔ لہٰذا اس کو مؤخر کیا جائے۔

إِنَّ إِبْرٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ ﴿٧٥﴾

"یقینا ابراہیم تحمل والے اللہ کی جانب جھکنے والے نرم دل تھے" [75]۔

تفسیر 75 اس آیت میں دلیل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا مباحثہ ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف انابت کرنے والے تھے :حَلِيمٌ اور :أَوَّاهٌ: کی صفت بھی تھی یعنی :حَلِيمٌ :ہونے کی وجہ سے عذاب میں تاخیر کا مطالبہ کر رہے تھے اور :أَوَّاهٌ : کی وجہ سے عذاب میں نرمی کا مطالبہ کر رہے تھے اور انابت کی وجہ سے قوم کیلئے حق کی تابعداری کے طالب تھے۔

يَا إِبْرٰهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۖ إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ﴿٧٦﴾

"ابراہیم! آپ اس بات سے صرف نظر کرو یقینا ان کی ہلاکت کے متعلق تیرے رب کا حکم آچکا ہے جو ٹلنے والا نہیں ہے" [76]۔

تفسیر 76 ابراہیم علیہ السلام کو یہ قول ملائک کی طرف سے ہے :أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا : یعنی اس بحث میں فائدہ نہیں ہے لہذا اس کو چھوڑ دینا چاہئے بعد میں دو علتوں کا تذکرہ ہے :غَيْرُ مَرْدُودٍ: میں اشارہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے مباحثہ سے یہ عذاب واپس ہونے والا نہیں۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ﴿٧٧﴾

"جب ہمارے بھیجے ہوئے ملائک لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو وہ ان کی وجہ سے بہت غمگین ہوئے اور دل ہی دل میں ڈرنے لگے اور کہنے لگے کہ آج کا دن بڑی ہی مصیبت کا دن ہے" [77]۔

تفسیر 77 یہ پانچواں واقعہ ہے جسکا تعلق رد شرک فی العلم سے ہے یعنی علم غیب اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے لوط علیہ السلام کو ان کا علم نہیں کہ یہ ملائک ہیں اور قوم کو روکنے کی قوت بھی نہیں رکھتے تھے :بِهِمْ: ضمیر ملائک کی طرف راجع ہے یعنی ان کے آنے پر ناراض ہوگئے یا قوم کی طرف ضمیر راجع ہے ان کے اس عمل پر ناراض ہوئے :وَضَاقَ بِهِمْ :ذَرْعًا: اونٹ جب چلتا ہے تو اگلے قدم لمبے لمبے لیتا ہے جب وہ وزن سے بھاری ہوتا ہے تو قدم قریب رکھتا ہے اور لفظ ذرع سینہ کو کہا جاتا ہے۔ اور :بِهِمْ :ضمیر قوم کی طرف راجع ہے ملائک کی طرف راجع نہیں اس میں طاقت کی کمی بطور کنایہ بیان ہوئی ہے :عَصِيبٌ: یہ :عُصَابَةٌ: سے لیا گیا ہے سر پر درد کی وجہ سے جو پٹی باندھی جاتی ہے اس پٹی کو عصیب کہتے ہیں یعنی سخت ترین لمحات کی

طرف اشارہ ہے۔

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾

"ان کے پاس اس قوم کے لوگ دوڑتے ہوئے آپہنچے اور اس سے قبل وہ برے کاموں میں مبتلا تھے۔ لوط علیہ السلام نے فرمایا اے میری قوم کے لوگوں! یہ (تمہاری عورتیں) میری بیٹیاں تمہارے لئے حلال ہیں اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے بارے میں مجھے رسوا نہ کرو کیا تم میں کوئی بھی سمجھدار آدمی نہیں ہے" [78]۔

تفسیر 78 وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ: اهراع کا فعل مجہول فعلِ معلوم کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کو برے عمل پر ابھارہے تھے یا مطلب یہ ہے کہ شہوت ان کو اس عمل کی طرف ابھار رہی تھا: وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: یہ اهراع کیلئے سبب ہے یعنی پہلے سے اس عمل کے عادی تھے: اَلسَّيِّئَاتِ: اغلام بازی (یعنی لڑکوں سے بدفعلی کرنا)، مہمانوں کو تنگ کرنا، پتھروں سے ان کو مارنا، راستے میں لوگوں کو لوٹتے رہنا و دیگر برے اعمال کرنا قَالَ: ان کو ہٹانے دفع کرنے کیلئے فرمایا: بَنَاتِيْ: یہ امت کی خواتین کے متعلق فرمایا اسلئے کہ نبی کیلئے خواتین امت بیٹیوں کے مرتبہ میں ہوتی ہیں۔ یہ مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ کا قول ہے: اَطْهَرُ: اس میں تفضیل کا معنی مراد نہیں ہے کیونکہ مردوں سے بدعملی میں کسی قسم کی خیر نہیں ہے بلکہ یہ طہارت کی تاکید کیلئے فرمایا ہے: رَشِيْدٌ: مراد صالح مصلح انسان ہے جو برائیوں سے لوگوں کو منع کرتا ہو۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾

"انہوں نے کہا کہ تو یقیناً جانتا ہے کہ تیری بیٹیوں کی ہمیں حاجت ضرورت نہیں ہے اور یقیناً تم ہماری چاہت کو خوب جانتے ہو" [79]۔

تفسیر 79 حَقٍّ: سے مراد حاجت اور شہوت ہے۔ ان کا یہ قول انتہائی بے حیائی کی وجہ سے ہے: مَا نُرِيْدُ: یعنی ان مہمانوں سے بے حیائی کرنا ہماری چاہت ہے۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿80﴾

"لوط علیہ السلام نے فرمایا کاش مجھے تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط قبیلہ کا سہارا لیتا" [80]۔

تفسیر 80 لَوْ: یا تو تمنی کیلئے ہے یا شرطیہ ہے جس کی جزا محذوف ہے یعنی لَدَفَعْتُكُمْ: میں ضرور تمہارا مقابلہ کرتا: قُوَّةً: بدنی قوت یا مددگار ساتھی: رُكْنٍ شَدِيْدٍ: سے مضبوط قبیلہ اور خاندان مراد ہے۔ لوط علیہ السلام نے یہ بات اسلئے فرمائی کہ اس علاقہ میں وہ مہاجر بن کر آئے تھے وہاں ان کا نسب وقبیلہ نہیں تھا: رُكْنٍ شَدِيْدٍ: سے اللہ تعالی مراد نہیں کیونکہ نبی اللہ تعالی سے غافل نہیں ہوتا۔ حدیث میں وارد ہے کہ يَرْحَمُ اللّٰهُ لُوْطًا لَقَدْ كَانَ يَأْوِيْ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ (صحیح بخاری کتاب أحادیث الأنبیاء حدیث 3192,3372، صحیح مسلم حدیث 1233) اس حدیث کے بیان کرنے کا مقصد لوط علیہ السلام کا کامل مدافعت ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی لوط پر رحم فرمائے وہ مضبوط قبیلہ کا سہارا طلب کر رہے برائی کے خلاف تھے۔ اس میں ان کی عالی شان کا بیان ہے کہ برائی کے مقابل ودفاع کیلئے قوت طلب کر رہے تھے۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿81﴾

"ملائکہ نے فرمایا اے لوط! ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں؟ یہ تجھ تک پہنچ نہیں سکتے لہذا آپ اپنے اہل کو رات میں لے کر نکل جاؤ تم میں سے کسی کو مڑ کر نہیں دیکھنا چاہئے البتہ تیری بیوی کیونکہ اسے پہنچنے والا ہے جو ان کو پہنچے گا یقیناً ان کے وعدے کا وقت صبح ہے کیا صبح بالکل قریب نہیں ہے" [81]۔

تفسیر 81 لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ: اس میں اشارہ تھا کہ ہماری فکر مت کریں ہمیں کچھ بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتے بلکہ آپ کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے اس وقت جبرائیل نے ان کی نظروں پر پر مار کر ان کو اندھا بنا دیا جیسا کہ سورۃ قمر آیت 37 میں ہے: وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ: یعنی مال اور اولاد کی پرواہ نہ کریں: اِلَّا امْرَاَتَكَ: یہ اہل میں سے استثنی ہے یعنی ان کو لیکر مت جانا۔ اس عورت پر عذاب اس کی شرکیہ عقیدہ کی وجہ سے مسلط ہوا۔ اس کی خیانت سورۃ تحریم میں ذکر ہوئی ہے اور خیانت سے مراد شرک ہے۔ معلوم ہوا کہ اس قوم میں شرک جیسی عظیم برائی بھی تھی: اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ: لوط علیہ السلام نے چاہا کہ جلد از جلد ان پر عذاب آجائے تو جواب ہوا کہ صبح تو قریب ہی ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾

"ہمارے عذاب کا حکم جب ان پر آ پہنچا تو ان کو ہم نے تہہ و بالا کر دیا اور ان پر تہہ بہ تہہ کنکر کے پتھر برسائے" [82]۔

تفسیر 82 أَمْرُنَا: اس سے عذاب کا وقت یا صرف نفس عذاب مراد ہے: وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً: واؤ برائے ترتیب نہیں ہو سکتا کیونکہ پتھر برسانا خواہ پہلے ہو یا بستیاں الٹنا پہلے ہو اللہ تعالیٰ ہر طرح سے عذاب دینے پر قادر ہے جیسا کہ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ: میں اس کی طرف اشارہ ہے: سِجِّيْلٍ: مٹی سے بنے ہوئے اس کنکری کو کہتے ہیں جسکو آگ میں پکایا جائے۔ اشارہ ہے کہ اس عذاب میں آگ کا مادہ بھی موجود تھا۔ جو کہ خرق عادت کام ہے۔ کیونکہ آسمان سے تو پانی برستا ہے آگ نہیں۔

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۗ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ ع

"تیرے رب کی طرف سے وہ نشان زدہ تھے اور وہ ظالموں سے دور نہیں تھے" [83]۔

تفسیر 83 مُّسَوَّمَةً: کہا گیا ہے کہ ہر کنکری پر مجرم کا نام لکھا گیا تھا: عِنْدَ رَبِّكَ: اس میں دلیل ہے کہ یہ زمین کے پتھر نہیں تھے بلکہ من جانب اللہ آئے تھے: وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ: اس جملہ میں تین توجیہات ہیں: (1) هِيَ ضمیر پتھروں کی طرف راجع ہے اور: اَلظّٰلِمِيْنَ: سے لوط علیہ السلام کی قوم مراد ہے۔ (2) اَلظّٰلِمِيْنَ: سے کفار مکہ اور اس امت کے وہ لوگ جو قوم لوط کا عمل کرتے ہیں۔ (3) ضمیر قوم لوط علیہ السلام کی بستیوں کے طرف راجع ہے اور اَلظّٰلِمِيْنَ: سے کفار مکہ مراد ہیں یعنی لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں مشرکین مکہ کے قریب واقع ہیں جو کہ شام کے راستے میں بحر میت کے پاس ہیں۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ۚ إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ﴿٨٤﴾

"اور ہم نے مدین والوں کی طرف ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا اس نے فرمایا اے میری قوم کے لوگوں ایک اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارے لئے کوئی بندگی کا حقدار نہیں اور تم ناپ تول میں بھی کمی نہ کرو میں تمہیں اچھے حالات (مالداری) میں دیکھ رہا ہوں اور مجھے تم پر گھیرنے والے دن کے عذاب کا خوف ہے" [84]۔

تفسیر 84 یہ چھٹا واقعہ بھی سورت کے پہلے دعویٰ کے لیے دلیل نقلی ہے یعنی شعیب علیہ السلام نے مسئلہ توحید بیان کیا تھا اسی طرح اپنی قوم کو اموال میں خیانت کرنے سے منع فرمایا تھا: إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ: یعنی تم پر رزق کی فراوانی اور فراخی ہے؛ يَوْمٍ مُّحِيطٍ: مُحِيطٍ: صفت عذاب ہے لیکن قوم کی قربت کی وجہ سے اس پر زیر لگا دی گئی ہے جسکو: جَرِّ لِلْجَوَارِ کہتے ہیں اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ شرک کرنا اور اسی طرح ناپ تول میں کمی کرنا عذاب کے اسباب ہیں۔

وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٨٥﴾

"اے میری قوم! ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں سے انکے مال کم نہ کرو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے مت پھرو" [85]۔

تفسیر 85 اس آیت میں تین حکم ہیں: (۱) حکم بالقسط۔ ناپ تول میں عدل و انصاف۔ اس کو: لَا تَنقُصُوا: کے بعد اسلئے ذکر کیا گیا ہے کہ انسان زیادتی کرنے پر مکلف نہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ: لَا تَنقُصُوا: میں ان کے برے عمل سے صراحتاً منع ہوا ہے جبکہ اس میں امر بالمعروف ہے یعنی ناپ تول پورا کرنے کا حکم ہے۔ (٢) اس میں (بخس) کمی کرنے سے منع ہے جس سے مراد ہر قسم کا نقصان ہے یعنی چوری، ڈاکہ، غصب، ناجائز حیلے وغیرہ سب مراد ہیں۔ (٣) فساد سے ممانعت ہے۔ آیت میں اشارہ ہے کہ ناپ تول میں کمی معاشرے میں فساد ہے۔ فساد سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو شعیب علیہ السلام کی تابعداری سے منع کرنا اسی طرح ناپ تول میں کمی بھی فساد کے ذریعے سے آئی ہے۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿٨٦﴾

"اللہ تعالیٰ کی اطاعت بہت بہتر ہے اگر تم مانتے ہو۔ اور میں تمہارے اوپر نگہبان نہیں ہوں" [86]۔

تفسیر 86 بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ: اس سے مراد تجارت میں جائز منافع ہیں یا مراد اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: اس شرط کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ثواب ایمان پر موقوف ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کی قوم ایمان کا دعویٰ کرتی تھی۔ بِحَفِيْظٍ۔ تمہارے گناہوں کے سبب اگر تم سے اللہ تعالیٰ نعمتیں زائل کرے تو میں تمہیں نہیں بچا سکتا ہوں۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿٨٧﴾

"انہوں نے کہا اے شعیب! کیا تیرا دین (نماز) تجھے یہ حکم دیتا ہے کہ ہم وہ طریقہ عبادت چھوڑ جائیں جس پر ہمارے بڑے بندگی کرتے ہوئے گزر گئے اور اپنے مالوں میں اپنے اختیار سے کچھ بھی کرنا چھوڑیں یقیناً آپ (اپنے خیال میں) باوقار اور ہوشیار آدمی ہو" [87]۔

تفسیر 87 "قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ: اس مقام پر صلاۃ دین یا نماز کے معنیٰ میں ہے۔ یعنی تو بڑا ہی نمازی آدمی ہے پھر بھی اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔ شعیب علیہ السلام کثرت سے نمازیں پڑھتے تھے یا ان کا یہ کہنا بطور استہزا تھا۔ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ: اس میں تین توجیہات ہیں: (۱) اس سے قبل لفظ نَتْهَانَا: مقدر ہے۔ (۲) یا لفظ لا مقدر ہے۔ (۳) یہ مَا يَعْبُدُ: پر عطف ہے اور نَتْرُكَ: کے ضمن میں ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے مالوں میں ہماری ہی مرضی چلے گی جو ہم چاہیں کریں آپ کو ہمارے مالوں میں بولنے کا کیا حق ہے۔ یہ ان سرمایہ دار لوگوں کی بات ہے جو حکم الٰہی کو نہیں مانتے: اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ: یہ بطور استہزاء، مذاق ہے یا يَزْعُمُكَ: لفظ اس میں مقدر ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾

"شعیب علیہ السلام فرمانے لگے اے میری قوم کے لوگوں! سوچو تو سہی اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلائل پر ہوں اور اس نے مجھے بہترین (نعمت) روزی اپنے پاس سے دی ہو اور میں نہیں چاہتا ہوں کہ تمہاری مخالفت میں وہ کام کروں جس سے تمہیں منع کرتا ہوں اور میرا ارادہ تو اپنی طاقت کے مطابق اصلاح کرنے کا ہی ہے میری توفیق اللہ ہی کی مدد سے ہے اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں" [88]۔

تفسیر 88 ''رِزْقًا حَسَنًا: اس سے وحی نبوت مراد ہے یا حلال رزق مراد ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ شعیب علیہ السلام بھی مالدار تھے۔ شرط کی جزا مقدر ہے یعنی میرے لئے یہ مناسب نہیں کہ میں وحی الٰہی میں خیانت کروں: اَنْ اُخَالِفَكُمْ اس سے سبقت مراد ہے یا: اُخَالِفَكُمْ: اپنے معنی مخالفت سے ہے اور اس کے بعد: اُمِيْلُ: کا لفظ مقدر ہے۔ اس آیت میں حق کے داعی کیلئے پانچ آداب کا ذکر ہے: وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ: مطلب یہ ہے کہ میں تمام مشکلات و مصائب میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ یا مراد یہ ہے کہ آخرت میں رجوع اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے۔ علامہ شربینی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شعیب علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ خطیب الانبیاء تھے۔ انہوں نے اپنی قوم سے بہترین انداز میں گفتگو کی ہے۔ (تفسیر ابن ابی حاتم محققا)۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْۤ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَاۤ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾

"اے میری قوم! میرے خلاف ضد تمہارے لئے اس بات کا باعث نہ بنے کہ تمہیں بھی وہی معاملہ پیش آئے جو قوم نوح علیہ السلام یا قوم ہود یا قوم صالح کو پیش آچکا ہے۔ اور قوم لوط تو تم سے کوئی دور نہیں" [89]۔

تفسیر 89 اس آیت میں تخویف دنیوی ہے سابقہ قوموں کے واقعات بیان ہوئے ہیں اور آیت میں تقدیر عبارت اس طرح ہے: لَا يَحْمِلَنَّكُمْ شِقَاقِيْ عَلٰى تَرْكِ الْاِيْمَانِ فَيُصِيْبُكُمْ اِجْرَامٌ: یعنی میری دشمنی تمہیں جرم پر نہ ابھارے کہ تم ایمان کو ترک کر دو ورنہ جرم کے مرتکب بن جاؤ گے: بِبَعِيْدٍ: یعنی لوط علیہ السلام کا دور تم سے کوئی دور نہیں

گزرا ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ان کا وطن تم سے دور نہیں ہے: بِبَعِیْدٍ: کا لفظ قوم پر محمول کرنا درست ہے اسلئے کہ یہ مونث و مذکر دونوں کیلئے استعمال ہوسکتا ہے۔ یا پھر قوم سے پہلے لفظ اھلاک مقدر ہے۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰

"اپنے رب سے استغفار کرو اور اس کی طرف متوجہ ہوجاؤ یقیناً میرا رب بڑی مہربانی والا اور بہت محبت کرنے والا ہے" [90]۔

تفسیر 90 اس آیت میں ترغیب ہے اور اس میں لف نشر مرتب ہے۔ یعنی استغفار کرو تو اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے گا اور توبہ کرو تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ حدیث شریف میں ہے شعیب علیہ السلام کی دعوت میں سب طریقے تھے اسلئے کہ وہ خطیب الانبیاء تھے۔ (تفسیر سفیان ثوری سورۃ ھود تفسیر عزبن عبدالسلام تفسیر کشاف تفسیر محرر الوجیز تفسیر خازن تفسیر طبری، حاکم 620/2 رقم الحدیث 4071،72، حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں طبرانی نے جامع البیان میں امام قرطبی نے تفسیر میں نقل کیا ہے مگر یہ موضوعا ضعیف ہے کما قال مصطفی عبدالقادر)

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ۝۹۱

"انہوں نے کہا اے شعیب! تیری اکثر باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں اور ہم تو تجھے اپنے درمیان بہت ہی کمزور پاتے ہیں اگر تیرے قبیلے کا لحاظ نہ کرتے تو تجھے ہم سنگسار کر دیتے اور نہیں ہے تو ہم پر عزت والا" [91]۔

تفسیر 91 اس آیت میں قوم کی جانب سے تکذیب ہے جس میں انہوں نے بے ادبی اور توہین آمیز انداز اختیار کیا ہے۔ چار طریقوں سے توہین کی ہے۔ پہلے جملہ میں توہین کے الفاظ ہیں کہ ہم آپ کی باتوں کو نہیں سمجھتے حالانکہ بات چیت، دعوت سب ان کی شرکیہ زبان میں ہوتی تھیں: مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ: دوسرا جملہ: وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا: مطلب یہ ہے کہ تم تنہا ہو۔ تمہارے ساتھی نہیں ہیں یا دنیا کی مصلحت اور سیاست کو نہیں جانتے یعنی ضعیف العقل ہو جیسا کہ دور حاضر میں بھی اہل حق کو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ حالات اور وقت کی سیاست نہیں جانتے اور یہ باتیں اکثر دنیا پرستوں کی ہوتی ہیں۔ تیسرے جملے میں: وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ: یعنی تیرے رشتہ دار ہمارے دین پر ہے اسلئے ہمارے

نزدیک عزت مند لوگ ہیں۔ چوتھے جملے میں: وَمَآ اَنتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ: اس میں انہوں نے وضاحت کی ہے کہ ہمارے نزدیک آپ کی کوئی عزت نہیں ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٩٢﴾

"انہوں نے جواب دیا کہ اے میری قوم کے لوگو! کیا میرا قبیلہ تمہارے نزدیک عزت کا زیادہ حقدار ہے (اللہ تعالیٰ کی عزت سے) جبکہ تم نے اسے فراموش کر دیا یقیناً جو کچھ تم کر رہے ہو وہ سب کو گھیرے ہوئے ہے" [92]۔

تفسیر 92 تیسرے جملے پر قوم کو شعیب علیہ السلام تنبیہ کر رہے ہیں یعنی باطل پرست لوگ اللہ تعالیٰ کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ مخلوق کے لحاظ کو اللہ تعالیٰ پر مقدم کرتے ہیں اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بجائے قوم سے ڈرتے ہیں: ظِهْرِيًّا: اصل میں ظہر کی طرف منسوب ہے اور (ظ) پر زیر نسبت کی وجہ سے ہے: وَرَاۗءَكُمْ: اس میں مبالغہ ان کے انکار اور سیدنا شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی طرف۔

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿٩٣﴾

"اور اے میری قوم کے لوگوں! تم اب اپنی جگہ عمل کرتے رہو اور میں بھی عمل کر رہا ہوں۔ عنقریب تم جان لوگے کہ وہ عذاب کس کے پاس آتا ہے جو اسے رسوا کر دے اور کون ہے جو جھوٹا ہے تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار میں ہوں" [93]۔

تفسیر 93 اس آیت میں شعیب علیہ السلام کا اپنی قوم سے برأت کا اعلان ہے اور حکیمانہ طریقے سے ان کو عذاب سے ڈرایا ہے: مَكَانَتِكُمْ: اس حالت کو کہا جاتا ہے جس میں انسان کام کرنے پر طاقت رکھتا ہے: سَوْفَ: میں حرف (فا) اس لئے ذکر نہیں کیا کہ یہ استیناف بیانی ہے: وَارْتَقِبُوْٓا: انتظار لفظ کے بنسبت ارتقاب میں مبالغہ زیادہ ہے یعنی انتظار کے ساتھ حفاظت بھی اس میں مراد ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾

"اور جب ہمارا (عذاب) حکم نامہ آیا تو ہم نے شعیب علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت کے ساتھ نجات دی اور ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا تھا سخت چنگھاڑ نے آ پکڑا جس سے وہ اپنے گھروں میں اندھے منہ پڑے رہ گئے" [94]۔

تفسیر 94 اس آیت میں شعیب علیہ السلام اور ایمان والوں کی نجات کا ذکر ہے اور یہ نجات اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہے اور ان لوگوں کے عذاب کا ذکر ہے جو منکر تھے۔ سوال: عاد اور مدین والوں کے قصہ میں: وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا: حرف واؤ کے ساتھ اور قوم ثمود اور قوم لوط کے قصے میں حرف فا کے ساتھ ذکر کیوں کیا ہے؟ جواب: وجہ یہ ہے کہ ثمود اور قوم لوط کے واقعے میں وعدے کا ذکر گزرا ہے تو سبب کے مرتبہ میں ہے یعنی: وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ: اور: مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ: اس لئے وہاں (فا) کا ذکر کیا ہے اور مدین اور عادیوں کے واقعے میں وعدے کا ذکر پہلے نہیں ہوا ہے۔

رکوع

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۗ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾

"گویا کہ وہ ان گھروں میں رہے بسے ہی نہ تھے۔ آگاہ رہو مدین والوں کے کیلئے بھی ویسی ہی ہلاکت ہے جیسی ہلاکت ثمود کی ہوئی" [95]۔

تفسیر 95 اس آیت میں شعیب علیہ السلام کے قوم کی عذاب کی تشبیہ ثمود کے ساتھ دی گئی ہے کیونکہ عذاب صیحہ ورجفہ دونوں پر مسلط کیا گیا تھا یا مطلب یہ ہے کہ دونوں عرب میں واقع تھے۔ سوال: آیت 67 میں أَخَذَ مذکر کا صیغہ ذکر کیا تھا اور یہاں: أَخَذَتْ: مونث صیغہ ذکر ہے۔ جواب: مذکر اس لیے ہے کہ صیحہ بتاویل صیاح ہے نیز ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل ہے کہ ثمود کا صیحہ زمین سے تھا اور قوم شعیب کا صیحہ آسمان سے تھا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾

"اور یقیناً ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو واضح دلائل اور معجزات کے ساتھ بھیجا" [96]۔

تفسیر 96 اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ذکر ہے جو ساتواں قصہ ہے اور یہاں اسلئے مختصر ہے کہ سورۃ یونس میں

تفصیل سے گزرا ہے اور اس کا تعلق سورۃ کے دوسرے عنوان سے ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام کی شجاعت دلیری کو یاد کرو جس کا انہوں نے فرعون کے مقابلہ میں مظاہرہ کیا تھا: بِاٰيٰتِنَا: مراد معجزات موسیٰ علیہ السلام ہے: سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (عصا) لاٹھی کا خاص معجزہ مراد ہے یا وہ رعب و ہیبت مراد ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے مقابل دیا گیا تھا جس کی وجہ سے ان سے فرعون ڈرتا تھا۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿٩٧﴾

"فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی طرف انہوں نے فرعون کے طریقے کی تابعداری کی اور اس کا کوئی بھی حکم درست نہ تھا" [97]۔

تفسیر 97 اس آیت میں ان کی بڑی خباثت کا ذکر ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے بجائے فرعون کی پیروی کی اَمْرَ سے مراد دین اور طریقہ ہے: وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ: یہ اس قول کا رد ہے جو سورۃ مومن کی آیت 29 میں ہے یعنی اس کا دعویٰ تھا کہ وہ رُشْد: وارشاد کا داعی ہے۔

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾

"وہ قیامت کے دن اپنی قوم کی قیادت کریگا ان سب کو جہنم میں جا کھڑا کریگا وہ بہت ہی برا گھاٹ ہے جس پر لا کھڑے کئے جائیں گے" [98]۔

تفسیر 98 اس میں مقصود تخویف اخروی ہے: يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: جزاء تو عمل کی جنس سے ہوتی ہے یعنی دنیا میں بھی قوم کے قائد تھے تو آخرت میں بھی جہنم کے قافلے کی قیادت کریں گے: اَلْوِرْدُ: پانی کی گھاٹ کو کہتے ہیں لیکن جہنم کو: تَهَكُّمًا: (استہزاء) کے طور پر گھاٹ کہا گیا ہے۔

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿٩٩﴾

"دنیا میں بھی ان پر لعنت ان کے پیچھے لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی جو دیا گیا برا انعام ہے" [99]۔

تفسیر 99 اس میں دنیا و آخرت دونوں کے عذاب کا ذکر ہے یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ۔ ملائک اور مومنین کی طرف سے ان پر لعنت ہے اور لعنت کو ان کے لئے بطور مذاق: تَهَكُّمًا: کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ رفد مدد کو کہا جاتا ہے اور لعنت کو اصل میں : رِفد: نہیں کہا جاتا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾

"یہ بستیوں کی خبروں میں سے بعض ہم بیان کر رہے ہیں بعض ان میں سے (اپنی جگہ) قائم ہے اور بعض کو ہم نے ریزہ ریزہ کیا ہے" [100]۔

تفسیر 100 یہ آیت سابقہ تمام واقعات کے متعلق ہے۔ قَآئِمٌ۔ ان میں بعض قائم ہے جیسا کہ فرعون کا مصر یا ثمودیوں کی مدائن صالح کے پہاڑوں میں آبادیاں اور عادیوں اور لوط علیہ السلام کی قوم کی آبادیاں فنا کر دی گئی ہیں۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

"ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور ان کو ان کے معبودوں نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا جن کو وہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا پکارا کرتے تھے جب تیرے رب کا حکم (عذاب) آیا بلکہ ان کا نقصان ہی انہوں نے بڑھایا" [101]۔

تفسیر 101 یہ آیت سابقہ واقعات کے متعلق ہے اور سبب عذاب کا اس میں ذکر ہوا ہے جو کہ شرک ہے نیز اس میں شرک فی التصرف پر رد کیا گیا ہے یعنی ان تمام قوموں نے اپنے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا معبود بنا رکھے تھے لیکن ان معبودوں نے ان قوموں کی مدد نہیں کی بلکہ ان کو حاجت روا مشکل کشا مختار کل ماننے کی وجہ سے ان پر عذاب آیا تھا۔ وَمَا زَادُوْهُمْ اس زیادت کی نسبت معبودوں کی طرف مجازی ہے سورۃ احقاف آیت ۲۸ میں بھی اسی طرح ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾

"تیرا رب جب بستیوں کو پکڑنے پر آتا ہے تو اسی طرح پکڑتا ہے اور جبکہ وہ ظلم کی مرتکب ہوئی یقیناً تیرے رب کی پکڑ دردناک اور سخت ہے" [102]۔

تفسیر 102 اس آیت میں سبب عذاب ذکر کرتے ہوئے موجود لوگوں کو ڈرایا گیا ہے اور وہ سبب شرک اور کفر ہے جسکو ظلم سے تعبیر کیا ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ۝

"یقیناً اس میں ان لوگوں کیلئے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں عبرت ہے یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگ جمع کئے جائیں گے اور یہ وہ دن ہے جس میں سب حاضر کئے جائیں گے"[103]۔

تفسیر 103 اس میں اشارہ ہے کہ دنیاوی عذاب کے ذریعے آخرت کے عذاب سے ڈرا جائے اور عبرت حاصل کریں اس میں دنیاوی عذاب سے آخرت کی طرف انتقال کیا ہے آخرت کے دو نام بھی ذکر ہوئے ہیں یعنی اول یوم مجموع اور دوم یوم مشھود یعنی اس میں شہادتیں قائم ہونگی یعنی اصل میں مشھود فیہ ہے۔

وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ؕ ۝

"نہیں ہم اسے موخر کرتے ہیں مگر ایک محدود وقت تک"[104]۔

تفسیر 104 اس میں اشارہ ہے کہ قیامت کیلئے وقت مقرر ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ ۝

"جس دن وہ آجائے گی اختیار نہیں ہوگا کسی کو کہ وہ اجازت کے بغیر بات کر سکے پس بعض ان میں نیک بخت اور بعض بد بخت ہوں گے"[105]۔

تفسیر 105 اس آیت میں قیامت کی ہیبت ناک کیفیت کا ذکر ہے اس طرح سورۃ النباء آیت 28 میں بھی ہے۔ اور لوگوں کا دو قسموں میں تقسیم کا بیان ہے۔ پہلا گروہ: شَقِیٌّ: اس میں بھی دو قسم ہیں مشرک اور کافر اعلیٰ درجہ کے بد بخت ہیں اور مومن گنہگار ادنیٰ درجہ کے شقی ہیں۔ اور دوسرے نمبر پر: سَعِیْدٌ: نیک بخت لوگ ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ۙ ۝

"لہٰذا جو بد بخت ہوئے وہ آگ میں ہونگے اور چیخیں گے چلائیں گے"[106]۔

تفسیر 106 "فَأَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ: اس میں ایک گروہ کیلئے تخویف اخروی کا ذکر ہے: شَقُوْا: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول کی نافرمانی کی ہے یعنی مشرک کافر اور فاسق ہیں: زَفِیْرٌ: غم اور افسوس کے وقت سانس کھینچنے کو کہتے ہیں اور: شَهِیْقٌ: اس سانس کو واپس زور کے ساتھ نکالنے کو کہتے ہیں گدھے کی آواز میں یہ طریقہ واضح پایا جاتا

ہے۔ زَفِیر گلے کی آواز اور شَہِیْقٌ: سینے کی آواز کو کہتے ہیں۔ زَفِیر تیز آواز اور شَہِیق آہستہ آواز اور ان سب کیفیتوں میں انتہائی غم اور دکھ بیان کرنا مقصود ہے۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ﴿۱۰۷﴾

"وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہے البتہ تیرا رب جو چاہے یقیناً تیرا رب جو چاہے کر گزرتا ہے" [107]۔

تفسیر 107 اس سے مراد قیامت کی زمین و آسمان جو کہ ہمیشہ رہیں گے جیسا کہ سورۃ ابراہیم آیت 48 میں ہے اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ: اس سے وہ گنہگار مسلمان مراد ہیں جو معاف نہ ہونے کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے پھر جب اللہ تعالیٰ سزا دینے کے بعد چاہے گا تو ان کو معاف کر کے جہنم سے نکال دے گا لہٰذا یہ خَالِدِیْنَ فِیْهَا: سے استثناء ہے یا اس سے مراد جہنم کے دوسرے اقسام کے عذاب کی طرف اشارہ ہے جو کہ زَمْهَرِیْرًا: اور کھانے پینے کا عذاب ہے لیکن جہنم میں ہے تو اس صورت میں یہ اَلنَّارُ: سے استثناء ہے اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ: اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے ارادے کے کوئی خلاف کر سکتا ہے۔

وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

"اور وہ لوگ جو نیک بخت بنا دیئے گئے وہ ہمیشہ کی رہنے والی جنتوں میں ہونگے جب تک (اس وقت کی) زمین و آسمان قائم رہیں گے مگر وہ جن کو تیرا رب چاہے یہ بے انتہا بخشش ہے" [108]۔

تفسیر 108 اس آیت میں خوشخبری ہے سُعِدُوْا: مجہول صیغہ ذکر کرنے میں اشارہ ہے کہ سعادت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہو سکتی ہے اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ: اس سے مراد وہ گناہ گار مومنین ہیں جو ابتدا سے جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے یعنی اپنے گناہوں کی وجہ سے البتہ کچھ عرصہ بعد انہیں جنت میں داخل کر لیے جائیں گے تو یہاں استثناء فَفِی الْجَنَّةِ: سے ہے۔ عبارت اس طرح سے ہے یعنی اَیْ یَدْخُلُوْنَ فِی الْجَنَّةِ اِبْتِدَاءً اِلَّا الْمُؤْمِنِیْنَ الْعُصَاةَ: یعنی نیک بخت لوگ ابتداء سے جنت میں داخل ہونگے سوائے گنہگار مومنین کے: عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ: میں اشارہ ہے کہ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ: میں یہ مطلب نہیں ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد جنت سے مومنوں کو نکالا جائے گا بلکہ ایک

مرتبہ داخل ہونے کے بعد نکلنے کا تصور بھی نہ ہوگا اور یہ واضح دلیل ہے کہ جنت اور جنت والوں کیلئے فنا نہیں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اسی طرح جہنم کا معاملہ ہے۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۝۱۰۹

"آپ کسی قسم کے شبہ میں مت رہنا اس سے جس چیز کی بندگی یہ لوگ کرتے ہیں یہ لوگ بندگی نہیں کرتے مگر اس چیز کی جس کی عبادت ان کے بڑوں نے اس سے پہلے کی ہے اور یقیناً ہم ان کو پورا پورا بدلہ دیں گے جس میں ہم کسی قسم کی کمی نہیں کریں گے" [109]۔

تفسیر 109 جب جنتیوں کیلئے خوشخبری اور جہنمیوں کیلئے وعید سنا دی گئی تو نتیجہ یہ نکلا کہ شرک باطل ہے لہٰذا اس کے باطل ہونے میں شک مت کرو۔ آیت کے دو مطلب ہوسکتے ہیں یعنی توحید میں اس سبب سے شک مت کرنا کہ مشرکین غیر اللہ کی بندگی جوش وخروش سے کرتے ہیں ان کی عبادت تو اپنے بڑوں کی تقلید کی بناء پر ہے اس پر دلیل نہیں ہے۔ عبارت اس طرح ہے: فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ فِي التَّوْحِيْدِ مِنْ اَجْلِ مَا يَعْبُدُ هٰؤُلَاءِ :دوسرا معنی یہ ہے کہ غیر اللہ کی عبادت کے باطل ہونے میں شک مت کرو۔ اس صورت میں :مِمَّا: کا معنی :فِيْمَا: کا ہوگا اور (ما) مصدریہ ہوگا:وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ اس میں سوال کا جواب ہے یعنی اگر یہ شرک باطل عبادت ہوتا تو ان مشرکین کو دنیا میں مال ودولت سے نہ نوازا جاتا۔ جواب دنیا میں انکا حصہ ہے اور یہ اموال دولت میں ان کا حصہ ہے امتحان اور انکی آزمائش کے لیے ہے یا نصیب سے جہنم کے عذاب کا حصہ مراد ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝۱۱۰

"اور یقیناً ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی پس اس کے بارے میں اختلاف کیا گیا اگر پہلے سے تیرے رب کا فیصلہ (تقدیر میں) صادر نہ ہوا ہوتا تو ان کے درمیان ان کا فیصلہ کب کا ہو چکا ہوتا اور یقیناً وہ تو اس سے سخت شک میں ہے" [110]۔

تفسیر 110 اس آیت میں ایک اور سوال کا جواب ہے جب شرک باطل اور بغیر کسی دلیل کے ہے تو ان مشرکین پر دنیا میں عذاب کون لائے گا؟ تو جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے کتاب الٰہی میں اختلاف کیا تھا بعض ان میں مشرک

ہوئے اور بعض موحد لیکن حکمت الٰہی کی وجہ سے پھر بھی عذاب کو موخر کیا گیا: وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ: ایک معنی تو یہ ہے کہ بنی اسرائیل اختلاف کی وجہ سے اپنے کتاب میں متردد ہو گئے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ اختلاف کی وجہ سے بنی اسرائیل قرآن میں شکی ہو گئے۔ مطلب یہ ہے کہ اختلاف سبب شک ہے۔

وَإِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ ۚ إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿١١١﴾

"اور یقیناً (جب وہ رب کے سامنے کھڑے ہونگے) تو تیرا رب ان میں سے ہر ایک کو پورا پورا بدلہ دیگا اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے وہ خوب خبردار ہے" [111]۔

تفسیر 111 اس آیت میں ایک اور سوال کا جواب ہے یعنی جب دنیا میں ان کو عذاب نہیں دیا گیا تو کیا معاف ہونگے؟ تو جواب ہوا کہ قیامت کے دن ہر ایک کیلئے جزاء وسزا ہوگی۔ ترکیب: كُلًّا: إِنَّ کیلئے اسم ہے اور لما شرطیہ ہے جس کی شرط مقدر ہے یعنی: يُبْعَثُنَّ أَوْ لَيُوَفِّيَنَّهُمْ: اس کیلئے جزاء ہے اور شرط جزا مل کر: إِنَّ: کیلئے خبر ہے۔ دوسری قرأت میں لَمًّا تنوین کے ساتھ ہے جو: جَمِيعًا: کے معنی میں ہے تو پھر: كُلًّا: کیلئے تاکید ہے اور: لَيُوَفِّيَنَّهُمْ: إِنَّ: کیلئے خبر ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٢﴾

"(دین) پر قائم رہو جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی جنہوں نے (اللہ تعالیٰ کی طرف) تیری پیروی میں رجوع کیا ہے اور حد سے تجاوز مت کرو یقیناً وہ ان اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے جو تم کرتے ہو" [112]۔

خلاصہ: یہاں سے سورت کے آخر تک تیسرا باب ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں نبی کریم ﷺ اور دواعیان دین کے لیے تشجیع اور تسلی کا بیان ہے پانچ امور کے ساتھ ان پانچ میں سے تین اوامر ہیں اور دو نواہی ہیں۔ پھر سبب عذاب بیان کیا گیا ہے پھر تاخیر عذاب کا ذکر ہے پھر تنبیہ اور تخویف ہے پھر انبیاء کرام کے واقعات کے فائدے مذکور ہیں پھر براءۃ کا بیان ہے اور آخری آیت میں سورۃ کا خلاصہ ذکر کیا گیا ہے۔

تفسیر 112 اس آیت میں پہلے نبی کریم ﷺ اور پھر امت کو استقامت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے پھر سرکشی یعنی حد سے تجاوز کرنے سے منع ہوا ہے کیونکہ حد سے تجاوز استقامت کی ضد ہے اور استقامت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات پر اس انداز سے عمل پیرا ہو کہ اس سے دائیں بائیں نہ مڑے: كَمَا أُمِرْتَ: اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کے دوام اور ہمیشگی استقامت کہلاتے ہیں شرک وبدعات پر ڈٹ جانا استقامت شرعیہ نہیں اور نہ ہی مطلوب ہے

اس کو تعصب اور ہٹ دھرمی کہا جاتا ہے (جو اپنے مذہب و مسلک پر ڈٹ جانے کیلئے ہو) شریعت کے موافق استقامت مشکل کام ہے اسلئے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ :شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَأَخَوَاتُهَا:(ترمذی کتاب التفسیر حدیث 3297، سلسلة الصحيحة 955، مستدرك حاكم 344/2) سورۃ ھود اور اس جیسی سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ فائدہ: چونکہ صحابہ کرام اور دیگر امتی نبی کے ساتھ استقامت میں برابر نہیں ہو سکتے تو ان کو عطف کے ساتھ ذکر کیا۔ طغیان شرک کفر بدعت کے ذریعے ہوتا ہے تو اس سے منع فرمایا۔

وَلَا تَرْكَنُوٓا۟ إِلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ فَتَمَسَّكُمُ ٱلنَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿۱۱۳﴾

"اور ان لوگوں کی طرف مت جھکنا جنہوں نے ظلم (شرک) کیا ہے ورنہ تمہیں بھی (جہنم کی) آگ پہنچ جائے گی اور اللہ تعالی سے چھڑانے کیلئے کوئی دوست مددگار نہیں ہوگا اور نہ ہی تم مدد کئے جاؤ گے" [113]۔

تفسیر 113 اس آیت میں استقامت پر دوام اور برقرار رہنے کے لیے ظالموں کی طرف میلان سے منع فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین مبتدعین دنیا پرست دہریوں کے ساتھ مجالس واختلاط سے اجتناب کرو ورنہ اس شرکت سے عذاب الہی کے حقدار ہو گے: وَلَا تَرْكَنُوٓا۟ إِلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟: رکون کا مطلب یہ ہے کہ ظالموں کی طرف اتنا مائل ہو جاؤ جس سے ان کے گناہ کی تاثیر تم میں پیدا ہو جائے اور ان کے گناہ کی تائید کرنے لگو۔ کیونکہ رکون تقویت پر دلالت کرتا ہے۔

وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ طَرَفَىِ ٱلنَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ ٱلَّيْلِ ۚ إِنَّ ٱلْحَسَنَٰتِ يُذْهِبْنَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ ۚ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّٰكِرِينَ ﴿۱۱۴﴾

"دن کے دونوں سروں میں نماز قائم رکھو اور رات کے کئی حصوں میں یقیناً نیکیاں برائیاں مٹاتی ہے یہ نصیحت ہے نصیحت حاصل کرنے والوں کیلئے" [114]۔

تفسیر 114 اس آیت میں پانچ اوقات میں نماز پڑھنے کا حکم ہے پھر اس کے دو فائدے بیان کئے ہیں اور یہ داعی کیلئے چوتھا ادب ہے: طَرَفَيِ النَّهَارِ: دونوں سروں سے مراد فجر اور عصر ہے اس میں ظہر کی نماز بھی داخل ہے اسلئے کہ طرف یہاں پر نصف کے معنی میں لیا جا سکتا ہے اور :وَزُلَفًا: میں مغرب وعشاء داخل ہے :زُلَفًا: کا معنی قربت کا ہے یعنی اول رات کا وہ حصہ جو دن کے قریب ہے یعنی سورج غروب ہونے پر مغرب ہوتی ہے اور دوسرا شفق یعنی سرخی چھپنے پر عشاء قائم ہوتی ہے إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ: اس میں پہلے فائدے کا ذکر ہے یعنی اچھے طریقے سے سنت کے موافق نماز ادا کرنے سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور نماز برائیوں سے روکتی ہے اور بری صفات اور ناموں سے بچاتی ہے: ذَٰلِكَ

ذِكْرٰى: اس میں دوسرا فائدہ ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ نماز ذکر ہے نصیحت کیلئے مجموعہ ہے اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا ذریعہ ہے۔ ذٰلِكَ یہ ماقبل کی طرف بتاویل مذکور راجع ہے۔

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

"صبر کرتے رہیے یقیناً اللہ تعالیٰ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے" [115]۔

تفسیر 115 اس میں پانچواں ادب ہے اور جب انسان میں یہ صفتیں جمع ہو جائیں تو انسان محسن کہلاتا ہے اسلئے آیت کا اختتام: الْمُحْسِنِيْنَ: پر کیا۔

فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

"پس ان چند لوگوں کے سوا اہل خیر لوگ کیوں نہ ہوئے جو لوگوں کو زمین میں فساد سے منع کرتے ان لوگوں میں سے جو تم سے پہلے گزرے ہیں ان چند کو ہم نے نجات دی اور ظالم لوگ تو اس مال (کی محبت) میں لگ گئے جس کے ذریعے انہیں مست کیا گیا تھا اور وہ فاسق تھے" [116]۔

تفسیر 116 گذشتہ آیتوں میں داعی کی ذمہ داریاں بیان کی گئیں تو اب دعوت چھوڑنے کے نقصانات کا بیان ہے کہ ترک دعوت سبب عذاب ہے یعنی سابقہ قوموں کی تباہی اسلئے ہوئی کہ سمجھدار لوگوں نے خیر کی دعوت نہیں دی اور فساد کو پھیلتے ہوئے زمین میں دیکھتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چند افراد جو داعی تھے بستیوں سے نکال دیئے گئے اور باقی ماندہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کیا۔ اُولُوْا بَقِيَّةٍ: اہل خیر اور اصحاب الرائی فضل یہاں (علم) کے معنیٰ میں ہے: وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اس میں عذاب کا دوسرا سبب بیان ہوا ہے: اُتْرِفُوْا: مالداری میں حد سے تجاوز کو اتراف کہتے ہیں یعنی تکبر فخر اور دنیا پرستی میں مست ہونا مراد ہے جو جرائم کا سبب ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

"تیرا رب ایسا نہیں کہ بستی والوں کو ظلم سے ہلاک کریں اور وہاں کے رہنے والے مصلحین ہوں" [117]۔

تفسیر 117 اس آیت میں دعوت دینے کا فائدہ ذکر کیا ہے مصلحین سے حق کی دعوت دینے والے مراد ہیں یعنی قانون الٰہی

یہ ہے کہ بستی میں دعوت دینے والے موجود ہوں کیونکہ بستی والوں کے شرک کی وجہ سے ان پر عذاب نہیں آتا جیسا کہ سورۃ الانعام آیت 131 میں گزرا ہے: وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ: سے بعض اہل مراد ہیں یعنی دعوت حق دینے والے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد کافروں میں اصلاح کرنے والے لوگ ہیں یعنی ان میں وہ لوگ جو معاشرے میں لوگوں کے درمیان معاملات کی اصلاح کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ساری قوم پر ہلاکت والا عذاب صرف کفر شرک کی وجہ سے نہیں آتا ہے بلکہ اس کے ساتھ دیگر ان کا ظلم بھی شامل ہے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ﴿١١٨﴾

"اگر تیرا رب چاہتا تو ضرور سارے لوگ ایک ہی گروہ (راستے) پر ہوتے لہٰذا ان میں ہمیشہ اختلاف رہے گا۔"[118]۔

تفسیر 118 اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مُصْلِحِينَ: جتنی بھی کوشش اور محنت کرے مگر اللہ تعالیٰ کی (مشیت) اور چاہت کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتے جبکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ نہیں کہ تمام لوگ ایک دین پر جمع ہو جائیں بلکہ ان میں اختلاف رہے گا اس لئے لوگ مختلف گروہ اور دینوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ اس سے باطل پرستوں کا اختلاف مراد ہے۔ کہ ان میں سے ہر ایک گروہ باطل پر ہوتا ہے۔

إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١١٩﴾

''ان لوگوں کے سوا جن پر تیرا رب رحم کریں اور اسی کیلئے ان کو پیدا کیا ہے اور تیرے رب کا فیصلہ اٹل ہے کہ جہنم کو سب انسانوں اور جنوں سے ضرور بھر دوں گا۔''[119]۔

تفسیر 119 اس سے مؤمنین اہل توحید مراد ہیں جن میں عقیدے اور اصول کا اختلاف نہیں ہوتا اور فروعی اختلاف فی الحقیقت اختلاف نہیں ہوتا بلکہ وسعت اور فراخی ہے: إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ: رحمت سے توفیق حق وہدایت مراد ہے وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ: یعنی بعضوں کو اختلاف اور بعضوں کو رحمت کیلئے پیدا کیا ہے اور اس میں تقدیر کی طرف اشارہ ہے۔ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ: یعنی جن وانس کے علاوہ اس میں کسی اور کو داخل نہیں کریں گے: لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ: یہ کلمہ کی تفسیر ہے یعنی انسانوں اور جنوں کیلئے جنت وجہنم کا فیصلہ تقدیر میں کیا گیا ہے اور اس کے ثبوت پر بہت احادیث وارد ہیں: مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ میں مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق سے اعراض کرتے ہوئے اختلاف کیا ہے اور باطل دین پر چل پڑے ہیں

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِۦ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِى هَٰذِهِ ٱلْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٢٠﴾

"رسولوں کے سب احوال کو ہم آپ کے سامنے بیان فرماتے ہیں تو یہ تیرے دل کی تسکین کیلئے ہیں اور آپ کے پاس ان واقعات میں حق پہنچا ہے جو مومنوں کیلئے وعظ اور نصیحت ہے" [120]۔

تفسیر 120 سابقہ آیت میں اختلاف اور وعید بیان ہوئی تو اب اس آیت میں لوگوں کے مختلف اعذار حیلوں بہانوں کے دفع کرنے کا بیان ہے کہ رسولوں کو بھیج کر اللہ تعالیٰ عذروں کو ختم کر چکا ہے نیز اس آیت میں رسولوں کے قصوں کے چار فائدے ذکر کئے ہیں۔ (۱) مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ: دل کی تسلی اطمینان سابقہ انبیاء کی دل کی مضبوطی اور دعوت پر پختگی انبیاء کی تکالیف اور مصائب کو یاد کر کے حاصل ہوگی۔ (۲) وَجَاءَكَ فِي هٰذِهِ الْحَقُّ: توحید صحیح عقائد اور اعمال مراد ہے (۳) وَمَوْعِظَةٌ: تخویف اور منہیات سے وعید ہے (۴) وَذِكْرٰى: یعنی دعوت کے طریقے اور اچھی نصیحتیں حاصل کرنا چونکہ اس سورت میں نبیوں کے واقعات اور قصے گزر چکے ہیں اسلئے اس کے فائدے بیان کئے۔

وَقُل لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ٱعْمَلُوا۟ عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَٰمِلُونَ ﴿١٢١﴾ وَٱنتَظِرُوٓا۟ إِنَّا مُنتَظِرُونَ ﴿١٢٢﴾

"اور ان لوگوں سے فرما دیجئے جو ایمان نہیں لاتے کہ عمل کرو اپنے طریقے پر ہم بھی اپنے طریقے پر عمل کرتے ہیں [121]۔ تم انتظار کرو ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں" [122]۔

تفسیر 122,121 قصے اور ان کے فائدے بیان کرنے کے بعد اب اعلان براءۃ ہے :مَكَانَتِكُمْ: طریقہ یا تمکن طاقت اور قوت مراد ہے: وَانْتَظِرُوْا: اس سے ہر عمل کے انتظار کا انجام مراد ہے۔

وَلِلَّهِ غَيْبُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ ٱلْأَمْرُ كُلُّهُۥ فَٱعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٢٣﴾ ع

"اور اللہ ہی کیلئے علم (واختیار) آسمانوں اور زمین کا ہے تمام کاموں کا رجوع بھی اسی کی طرف ہے۔ بس تجھے اسی کی بندگی کرنی چاہئے اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں" [123]۔

تفسیر 123 اس آیت میں سورت کے مقاصد کا پھر سے اعادہ ہے۔ پہلے دو جملوں میں رد شرک فی العلم اور شرک فی التصرف ہے جبکہ تیسرے جملے میں رد شرک فی العبادت ہے چوتھے جملے میں تشجیع یعنی دعوت کے کام میں بہادری دلانے کا بیان ہے پانچویں جملے میں تسلی ہے۔

سورۃ ھود کی خصوصیات:

۱۔ نبیوں کے کثیر واقعات برائے فوائد کثیرہ تفصیل سے ذکر ہوئے ہیں۔

۲۔ نوح علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔

۳۔ ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا تذکرہ۔

۴۔ لوط علیہ السلام کے مہمانوں کا تذکرہ۔

۵۔ ہود علیہ السلام پر مشرکین کی طرف سے تہمت کہ ہمارے معبودوں نے تمہیں تکلیف میں مبتلا کیا ہے۔

۶۔ واقعات انبیاء کا ایک ہی آیات میں فوائد بیان کئے ہیں۔

۷۔ لوگ دو حصوں میں تقسیم ہیں۔

۸۔ عذاب کے وقت معبودان باطلہ کچھ کام نہیں آتے ہیں۔

۹۔ دس سورتیں لانے کا چیلنج۔

۱۰۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو استقامت اختیار کرنے کا حکم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کہ مجھے سورۃ ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔

آیاتہا ۱۱۱ ۱۲ سورۃ یوسف مکیۃ ۵۳ رکوعاتہا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خاص اللہ تعالیٰ کے نام کی مدد سے شروع کرتا ہوں جو رحمٰن اور رحیم ہے

ماقبل سورت کے ساتھ اس سورت کا تعلق۔ ربط (۱) سورۃ ھود میں ان مخالفین کی طرف سے جو غیر تھے داعیان حق کو دعوت توحید کی وجہ سے مصائب ڈھانے کا ذکر تھا تو سورت یوسف میں اپنوں کی جانب سے جو کہ بھائی ہے مصائب ڈھانے کا ذکر ہے۔ (۲) یہ آیت تفصیل اور تفسیر ہے سورۃ ھود کی آخری آیت کی وہاں انبیاء کے مصائب کی طرف سرسری اشارہ تھا یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کی تکالیف کا مفصل بیان ہے۔ سورۃ کا دعویٰ: اس میں تین دعوے ہیں: (۱) پانچ طریقوں سے توحید ثابت کرنا۔ پہلا طریقہ: ردِ شرک فی العلم یعنی یعقوب علیہ السلام بیٹوں کا فریب نہیں جانتے تھے۔ یعقوب علیہ السلام خبر دار نہیں تھے یوسف علیہ السلام کی حالت پر جب وہ کنویں میں تھے، پھر ان کے حالات جیل اور اقتدار کے حالات سے بے خبر تھے جیسا کہ آیت 8 سے 11 تک اور آیت 15 اور 87 میں ہے۔ دوسرا طریقہ: ردِ شرک فی التصرف ہے۔ یعقوب علیہ السلام نہ یوسف علیہ السلام سے ضرر ہٹا سکے اور نہ ہی دیگر بیٹوں سے جیسا کہ آیت 18، 21، 39، 40، 67، 101 میں ہے۔ تیسرا طریقہ: ردِ شرک فی العبادت آیت 40۔ چوتھا طریقہ: شرک کی تمام قسموں کا رد کیا گیا آیت 106، 108۔ پانچواں طریقہ: پندرہ اسماء الحسنیٰ اللہ تعالیٰ کے ذکر کیے گئے ہیں۔ سورۃ کا دوسرا عنوان: رسول کی سچائی دو طریقوں سے ثابت کی گئی ہے۔ پہلا طریقہ: وحی کے ذریعے نبی کی سچائی آیت 3 میں ثابت کی۔ دوسرا طریقہ: یہ نبی اس وقت حاضر و ناظر نہ تھے لیکن پھر بھی یوسف علیہ السلام کے واقعے کی خبر دے رہے ہیں۔ آیت 102۔ تیسرا عنوان: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے یعقوب اور یوسف علیہم السلام کے صبر کرنے پر اور اس واقعہ کی تفصیل ذکر کرنے سے آیت 110 میں بھی۔ سورۃ کا خلاصہ: آیت 7 تک تمہید ہے اول قرآن کی سچائی برائے ترغیب آیت 1، 2 میں دوم رسول کی سچائی کا ذکر آیت 3 میں سوم یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی تفصیل اور سبب یعنی انہوں نے خواب دیکھا اور پھر والد کی جانب سے اس کا ادب اور نتیجہ ذکر ہوا ہے آیت 4، 5، 6 میں۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝

"اس کی مراد اللہ جانتا ہے یہ آیتیں ایسی کتاب کی ہیں جو واضح بیان کرنے والی ہے"[1]۔

تفسیر 1 اس آیت میں کتاب اللہ کی سچائی بیان ہوئی ہے اور: الْمُبِيْنِ: سے مراد وہ کتاب ہے جو خود بھی واضح ہے اور حق و باطل کے درمیان وضاحت کرنے والی بھی ہے۔ تِلْكَ: میں اس سورۃ کی طرف اشارہ ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

"ہم نے اس کتاب کو عربی زبان میں اتارا ہے تاکہ تم سمجھ سکو"[2]۔

تفسیر 2 اس آیت میں قرآن کی سچائی تین طریقوں سے بیان ہوئی ہے: (۱) اَنْزَلْنٰهُ: اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔ (۲) قُرْءٰنًا: جمع کیا ہوا ہے کیونکہ قرآن کا اطلاق مجموع یعنی پڑھنے کے لیے جمع کی گئی کتاب پر بھی ہوتا ہے۔ (۳) عَرَبِيًّا واضح بیان والا ہے کیونکہ عربی اصل میں واضح کو کہتے ہیں اور اس آیت میں نزولِ قرآن کے فائدے کا بھی ذکر ہے لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: مراد یہ ہے کہ قرآن کی حقانیت حکمتوں اور معنوں سے روشناس ہو جاؤ۔ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا: یہ دلیل ہے کہ قرآن کریم میں عجمی الفاظ نہیں ہیں کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ اس میں کسی مقام پر عجمی کلام ہے تو یہ بات لازم آئے گی کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ عربی الفاظ سے عاجز ہو گئے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ عاجز آجانے سے پاک ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو منقول کہ: قِسْطَاس، سِجِّيْل: وغیرہ الفاظ عجمی ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ ان لفظوں کو عرب نے عجم سے سیکھا پھر عرب لوگوں نے ان الفاظ کو استعمال کرنا چھوڑ دیا اور عجم ان کو استعمال کرتے ہے کہ عجم میں مشہور ہے اگرچہ وہ اپنی اصل میں عربی تھے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝

"ہم آپ کو بہترین بیان پیش کرتے ہیں اس قرآن سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی کے ذریعے نازل کیا ہے اور یقیناً اس سے پہلے آپ بے خبروں میں سے تھے"[3]۔

تفسیر 3 اس آیت میں رسول کی سچائی بیان ہوئی ہے۔ اس کو احسن القصص اسلئے کہا گیا ہے کہ اس واقعہ میں حکمتیں بہت زیادہ ہیں یعنی احکام و مسائل اس میں کثرت سے ہیں۔ اس میں کچھ تفصیل یہ ہے۔ عقائد کے مسائل کہ (۱) انبیاء کرام غیب نہیں جانتے (۲) اپنی اولاد یا کسی اور سے کسی قسم کی تکلیف کو دور نہیں کر سکتے (۳) اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور تقدیر کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا (۴) عام مشرکین کا رد ہوا ہے رد شرک فی العبادۃ۔ (۵) رد شرک فی الاسماء والصفاۃ (۶) رد شرک فی

التصرف (۷) رد شرک فی الربوبیت (۸) شرک کی ملاوٹ سے ایمان باطل ہوتا ہے (۹) عمل صالح کے مسائل اس میں موجود ہیں یعنی صبر (۱۰) اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا (۱۱) معصیت پر مصیبت کو ترجیح دینا (۱۲) اللہ تعالیٰ سے معصیت میں پناہ طلب کرنا (۱۳) نافرمانی سے فرار اختیار کرنا (۱۴) بدنامی سے نجات کیلئے اپنی صفائی کروانا (۱۵) اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے تدبیروں پر عمل کرنا (۱۶) صالح اولاد سے محبت اور حتی الوسع ان کی حفاظت کرنا۔ اس سورت میں برے اعمال اور انکے نتائج یہ مذکور ہیں (۱۷) حسد اور اس کا ناکام انجام (۱۸) والد کے ساتھ فریب (۱۹) والد کو جھوٹے بہانے بیان کرنا (۲۰) بھائی کے ساتھ دھوکہ کرنا (۲۱) بھائی کو تکلیف دینا اور اس پر ظلم کرنا (۲۲) عورتوں کا مردوں سے مکر وفریب کرنا (۲۳) خواتین کا آپس میں ایک دوسرے پر طعن اور تشنیع کرنا (۲۴) اجنبی آدمی سے عاشق لگانا (۲۵) اور اس سے بدکاری فحاشی کا مطالبہ اور کوششیں کرنا (۲۶) مکر وفریب اور دھوکہ (۲۷) دھوکہ دینے کیلئے حیلے بنانا (۲۸) آزاد لوگوں کو فروخت کرنا، نیک اور اچھے اخلاق اس واقعہ میں یہ ہے (۲۹) مالک کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنا اور اس کے احسان کو ملحوظ خاطر رکھنا (۳۰) اس کے گھر میں خیانت سے بچنا (۳۱) پاکدامنی (عفت) اختیار کرنا (۳۲) جیل کے ساتھیوں کے ساتھ احسان کرنا (۳۳) انکو دعوت حق دینا (۳۴) خطا کار مثلاً مجرموں کو معاف کرنا (۳۵) تقسیم میں خیانت سے اجتناب کرنا (۳۶) غیر مجرم کو سزا دینے سے اجتناب کرنا (۳۷) مجرم کو سب سامنے ذلیل کرنے سے اجتناب کرنا (۳۸) اس کیلئے استغفار کرنا۔ اس واقعہ میں چیزوں کے مختلف احوال واقسام (۳۹) خواب اور اس کی مختلف قسمیں (۴۰) چال، دھوکہ کی مختلف قسمیں (۴۱) محبت کی قسمیں (۴۲) رونے کی قسمیں (۴۳) نفس کی قسمیں (۴۴) عقل والوں کی قسمیں: بشر، ملک، شیاطین (۴۵) آبادیوں کی قسمیں: مصر، بدو، غیابت الجب (۴۶) قیمتوں کی قسمیں: ثمن، بضاعۃ، دراہم (۴۷) برتنوں کی قسمیں: متاع، سقایۃ، صواع، وعاء، کیل (۴۸) روشنی دینے والی چیزوں کی قسمیں، شمس، قمر، کواکب۔ بعض گنتی کی قسمیں (۴۹) سبع، احد عشر (۵۰) حیوانوں کی بعض قسمیں: ذئب، بقر، طیر، بعیر (۵۱) کھانے پینے کی چیزوں کی بعض قسمیں۔ خبز، خمر، سنبلات (۵۲) قافلوں کے انتظام۔ سیارۃ۔ وارد (۵۳) اوقات۔ غد۔ عشاء۔ سیاست اور تاریخ کا ذکر (۵۴) ملک (۵۵) عزیز (۵۶) وزیر خزائن (۵۷) تقسیم کا طریقہ راشن وغیرہ میں (۵۸) رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرنا (۵۹) بنی اسرائیل شام سے مصر میں کیوں منتقل ہوئے۔ اس قصہ میں اس کے علاوہ بھی بہت ساری حکمتیں اور نکات موجود ہیں جو غور وتدبر سے سمجھ میں آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ: یہ دلیل ہے کہ نبی کا علم بذریعہ وحی ہے[1] اسا

کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۝

"جب یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے ذکر کیا کہ میں نے (خواب میں) گیارہ تارے چاند اور سورج کو مجھے جھکتے ہوئے دیکھا ہے" [4]۔

تفسیر 4 اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے خواب دیکھنے کا ذکر ہے جو بعد والے واقعہ کیلئے سبب بنا ہے: رَأَيْتُ کا لفظ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے اول کا تعلق ستاروں کی ذات سے ہے اور دوم کا تعلق ان کے احوال سے ہے: أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا: گیارہ ستاروں سے یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی مراد ہیں تاروں میں روشنی کم ہوتی ہے لہذا انکے توبہ کرنے سے ان میں کچھ روشنی آ گئی تھی جو کہ نور ہدایت ہے۔ اور: وَالشَّمْسَ: میں والد کی طرف اشارہ ہے چونکہ سورج کی روشنی کامل ہوتی ہے تو نور نبوت بھی کامل ہوتا ہے۔ اور: وَالْقَمَرَ: میں یوسف علیہ السلام کی والدہ محترمہ کی طرف اشارہ ہے جیسے چاند کی روشنی درمیانی ہوتی ہے تو نور ولایت جو یوسف علیہ السلام کی والدہ کو حاصل تھا وہ بھی درمیانہ تھا۔ بعض علماء نے برعکس ذکر کیا ہے کہ شمس مؤنث ہے اور قمر مذکر ہے لیکن یہاں پر مثال روشنی کے اعتبار سے ہے نا کہ الفاظ کے اعتبار سے لہذا اس میں پہلا قول بہتر ہے۔

قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝

"یعقوب علیہ السلام فرمانے لگے اے بیٹے اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا۔ پس وہ آپ کو ضرر دینے کیلئے کوئی تدبیر کر لینگے یقیناً انسان کیلئے شیطان کھلا دشمن ہے" [5]۔

تفسیر 5 اس آیت میں یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام کو خوابوں سے متعلق آداب سکھاتے ہیں کہ اپنا خواب بھائیوں کو نہ بتانا بلکہ اس کو ان سے مخفی رکھو۔ اس میں اشارہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام اس خواب کی تعبیر جان چکے تھے۔ اس آیت میں کئی فائدے ہیں: فائدہ (۱) بعض خوابوں کو مخفی رکھنا چاہئے۔ فائدہ (۲) ہر مسلمان پر لازم ہے کہ دوسرے مسلمان کو ضرر سے محفوظ رکھنے کیلئے اس کو تنبیہ کریں۔ فائدہ (۳) جب کسی انسان سے ضرر کا خطرہ ہو تو اس کا ذکر دوسرے انسان سے کیا جا سکتا ہے لہذا یہ غیبت میں داخل نہیں۔ کیونکہ اس میں اس بندے کی توہین اور ذلت مقصود نہیں ہے بلکہ دوسرے ل کو اس کے خطرے سے متنبہ کرنا مقصود ہے۔ فائدہ (۴) یوسف علیہ السلام کے بھائیوں میں کوئی نبی نہیں تھا اسلئے کہ

انہوں نے حسد کیا ہے جو کہ گناہ کبیرہ ہے اور انبیاء کرام گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ اور قرطبی رحمہ اللہ نے اس میں خوب وضاحت کی ہے۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا

عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ ع

"اور اسی طرح تیرا رب تجھے برگزیدہ بنائے گا اور تجھے حقیقت کا فہم (سابقہ نبیوں کے وحی) میں سے سکھائے گا اور اپنی نعمت تجھ پر پوری فرمائے گا اور یعقوب علیہ السلام کے اہل پر جیسے اس سے قبل تیرے دادا و پردادا یعنی اسحاق وابراہیم علیہم السلام پر بھر پور نعمت کی بلاشبہ تیرا رب بہت بڑے علم اور زبردست حکمت والا ہے" [6]۔

تفسیر 6 اس آیت میں یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام کو تین چیزوں کے ساتھ تسلی دینے کا بیان ہے۔ تین چیزوں کے ساتھ۔ پہلی بات: اجتباء ہے یعنی کسی شخص کو بڑے کاموں کیلئے منتخب کرنا جو کہ دعوت توحید ہے اور اس پر آنے والے مصائب پر صبر ہے۔ دوسری بات: تاویل حدیث کی تعلیم ہے۔ اسمیں دو تفسیر ہیں پہلی تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد خوابوں کی وحی کے ذریعے سے تعبیر کرنا ہے جو کہ معجزہ ہے۔ دوسری تفسیر اس سے مراد دلائل ہیں جو توحید باری تعالیٰ پر وارد ہے اور سابقہ امتوں کے واقعات ہیں۔ تیسری چیز: نعمت کی تکمیل کرنا جس سے نبوت اور وحی مراد ہے آل یعقوب سے مراد بنی اسرائیل ہیں کیونکہ ان میں بہت انبیاء کرام بھیجے گئے ہیں: وَكَذٰلِكَ: یہ برائے تشبیہ ہے اور مشبہ بہ وہی خواب ہے جو بیان کیا گیا ہے یا کاف لام تعلیلیہ کی معنی میں ہے: أَبَوَيْكَ: یہ دلیل ہے کہ اب کا اطلاق دادا پردادا پر ہوتا ہے یعنی یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝

"یقیناً یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں پوچھنے والوں کیلئے بہت ساری عبرتیں ہیں" [7]۔

تفسیر 7 اس آیت میں ان فائدوں کی طرف اشارہ ہے جو واقعہ یوسف میں موجود ہیں: آيَاتٌ لِّلسَّائِلِينَ: میں دو تفسیر ہیں: (1) سائلین سے مراد مشرکین مکہ ہیں جنہوں نے یہودیوں کے کہنے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ بنی اسرائیل کا تو اصل (مسکن) وطن شام تھا تو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہ مصر میں کیوں رہائش پذیر تھے؟ تو جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے حسد کی وجہ سے ملک سے نکال دیا اور تین دن کنویں میں رہے پھر وہاں سے

بادشاہی تک جا پہنچے پھر ان سے بھائیوں نے معافی طلب کی انہوں نے یہ فرمایا کہ تم پر آج کوئی ملامت نہیں ہے پھر بھائی ان کے تابع ہو گئے اسی طرح مکہ والے اس نبی کو بستی سے نکال دینگے پھر غار میں تین رات رہیں گے پھر یہ نبی غالب ہو جائینگے اور مکہ والے ان سے معافی کا مطالبہ کریں گے اور یہ جواب میں فرمائیں گے: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ: پھر وہ ان کے تابع ہو جائیں گے۔ فتح مکہ کے موقع پر ایسا ہی ہوا۔ دوسری تفسیر: وہ لوگ سائلین سے مراد ہیں جو اس واقعہ کو غور اور تدبر کیلئے پوچھتے ہیں تاکہ اس کی حکمتوں اور عبرتوں سے بہت سارے مسائل نکال سکیں۔(تفسیر الوجیز سورۃ یوسف اخرجه ابن مردويه في تفسيره من حديث ابن عباس و البيهقي في دلائل النبوة 87/5 من حديث ابن عمر)۔

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٨﴾

"جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کو ہمارے بنسبت بہت ہی محبوب ہے جبکہ ہم ایک مضبوط (گروہ) جماعت ہیں یقیناً ہمارے والد ضرور واضح سادگی میں مبتلا ہیں" [8]۔

تفسیر 8 اس آیت سے یوسف علیہ السلام کا تفصیلی قصہ شروع ہوتا ہے جو 12 مقامات اور حصوں پر مبنی ہے۔ پہلا مقام آیت 18 تک ہے اس حصہ کا خلاصہ یہ ہے: بیٹوں کا اپنے والد اور اپنے بھائی یوسف علیہ السلام کے متعلق مختلف قسم کے مکروفریب بناتے تھے ان کا بیان ہے انہوں نے پانچ طریقوں سے فریب کیا: (۱) آپس میں غائبانہ مشورہ کرنا (۲) والد کے سامنے مکروفریب کی باتیں کرنا (۳) کنویں میں پھینکنا (۴) جھوٹ سے رونا (۵) قمیص پر جھوٹ کا خون لگانا۔ ان سب کاموں میں یعقوب علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کیلئے امتحان ہے۔ اس آیت میں یعقوب علیہ السلام پر بیٹوں کی طرف سے اس الزام کا ذکر ہے کہ وہ یوسف اور اس کے بھائی بنیامین سے زیادہ محبت کرتا ہے اور انہوں نے اپنے والد پر غلطی کا حکم صادر کیا ہے جبکہ یہ دونوں گناہ کبیرہ ہیں۔ یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام سے محبت خواب کی وجہ سے تھی جو خواب یوسف علیہ السلام کے کمال پر دلالت کررہی تھی۔ اور یہاں پر گمراہی سے دینی گمراہی مراد نہیں ہے بلکہ تدبیری غلطی اور سادگی مراد ہے جیسا کہ تفسیر مدارک اور قرطبی نے لکھا ہے کیونکہ دینی گمراہی تو کفر ہے یہ بات تفسیر قرطبی نے لکھی ہے اس آیت میں دلیل ہے کہ حسد انسان کو والد کی بےعزتی پر آمادہ کردیتا ہے۔

اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ⑨

"یوسف کوتو مار ہی ڈالو یا کسی زمین میں پھینک ڈالو تو تمہارے لئے والد کی توجہ تنہا ہو جائے گی اس کے بعد (توبہ کر کے) نیک بن جانا"[9]۔

تفسیر 9 اس آیت میں یوسف کے خلاف بھائیوں کے مشورے کا ذکر ہے تا کہ اسے غائب کر کے والد کی محبت اور توجہ اپنی طرف مرکوز کریں۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ باطل طریقہ سے جائز چیز وصول کرنا درست نہیں ہے دوسری بات یہ ہے کہ گناہ اس نیت سے کرنا کہ بعد میں توبہ کر لیں گے غلط اور انتہائی ناجائز سوچ ہے: وَجْهُ: ذات یا توجہ کے معنی میں ہے: مِن بَعْدِهِ: ضمیر قتل اور: طَرْح: یعنی پھینک دینے کی طرف راجع ہے۔ یہ دلیل ہے کہ حسد انسان کو دوسرے انسان کے قتل بلکہ اپنے بھائی کے غائب کرنے پر اماده کرتا ہے۔

قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ⑩

"ان میں سے ایک نے کہا یوسف کو قتل مت کرو بلکہ کسی اندھے کنویں (کی تہ میں) ڈال دو کوئی (گزرنے والا) قافلہ اٹھا لے جائے گا اگر تم نے کرنا ہے (تو ایسا کرو)"[10]۔

تفسیر 10 اس آیت میں بڑے بھائی کی رائے ذکر کی ہے کہ یوسف کو قتل کرنا بہت مشکل کام ہے اور کسی دوسرے ملک چھوڑ آنا بھی مشکل ہے لہذا تیسرا مشورہ یہ ہے کہ راستے کے کنارے کسی ایسے کنویں میں ڈال دو کہ مر بھی نہ جائے اور واپس بھی نہ نکل سکے لہذا کوئی گزرنے والا قافلہ اپنے ساتھ لے جائے گا: فِي غَيَابَةِ الْجُبِّ: کنویں کو: جُبّ: کہتے ہیں اور غَيَابَتِ: وہ کنواں جو گہرا بھی ہو اور پانی کی جھونکوں نے اسے کھوکھلا کیا ہوا ہو اور اس کے کناروں میں خشک زمین موجود ہو جو اوپر سے دیکھنے والوں کو نظر نہ آتی ہو اور پانی کی سطح سے بلند ہو: يَلْتَقِطْهُ: اس سے مسائل لقیط اور لقطہ کی طرف اشارہ ہے یعنی کسی کی گری پڑی چیز مل جانا جس کی تفصیل احادیث اور فقہ کی کتب میں موجود ہے اور اس میں دلیل ہے کہ حسد انسان کو اپنے بھائی کی تکلیف پر آمادہ کرتا ہے۔

قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ ۝

"انہوں نے کہا ابا جان کیا بات ہے آپ یوسف کے بارے میں ہم پر اعتبار نہیں کرتے جبکہ ہم یقیناً اس کے خیر خواہ ہیں"[11]۔

تفسیر 11 اس آیت میں والد کے سامنے ان کے فریب اور بناوٹی باتوں کا ذکر ہے: وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ: اس میں ان کے مخلص ظاہر ہونے کی دلیل ہے چنانچہ اسی دوران وہ کاروائیاں کر رہے تھے۔ اس میں دلیل ہے کہ حسد کے سبب سے انسان جھوٹ پر آمادہ ہوتا ہے۔ ابن اسحاق کا قول ہے کہ یہ کئی گناہوں پر مشتمل تھا: صلہ رحمی توڑنا، والدین کی نافرمانی، بچے پر شفقت نہ کرنا، امانت میں خیانت کرنا، احمد کی خلاف ورزی، جھوٹ بولنا، یہ سب حسد کا ثمرہ ہے۔

أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝

"کل ضرور آپ ہمارے ساتھ اس کو بھیجئے تاکہ کھائے اور کھیلے اور ہم ضرور اس کی حفاظت کریں گے"[12]۔

تفسیر 12 اس آیت میں والد سے یوسف کو طلب کرنا مقصود ہے تاکہ اس کو صحرا میں لے جائے۔ يَرْتَعْ: اس میں کھیل کود اور جنگلی پھل کھانا جیسے علاقہ میں مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ يَلْعَبْ: میں اشارہ ہے کہ جائز کھیل کود شریعت میں جائز ہے اور اس میں ان کے حیلے بازی کا ذکر ہے تاکہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کریں۔ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ: یہ بھی جھوٹا وعدہ ہے اور وہ بھی غدر و دھوکے کی نیت سے کر رہے ہیں۔

قَالَ إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَن تَذْهَبُوا بِهِ وَأَخَافُ أَن يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ ۝

"یعقوب علیہ السلام نے فرمایا مجھے سخت صدمہ ہوتا ہے یہ کہ تم اس کو لے جاؤ اور مجھے یہ کھٹکا بھی رہے گا کہ تمہاری غفلت سے اس کو کوئی بھیڑیا کھا جائے گا"[13]۔

تفسیر 13 اس آیت میں یعقوب علیہ السلام کے خوف اور غم کا ذکر ہے کہ یوسف کو صحراء میں لے جانے سے بھیڑیا نہ کھا جائے ان کی ہلاکت کے خوف سے انہوں نے اظہار کیا اور اس میں دلیل ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام پر اسباب کے تحت خوف و حزن آ سکتے ہیں۔

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ⑭

"انہوں نے کہا اگر وہ ہم سے بھیڑیا کھا جائے جبکہ ہم (قوت والی جماعت) ہیں تو اس وقت تو ہم انتہائی نکمے ہونگے" [14]۔

تفسیر 14 اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی ان کی حفاظت کرنے پر تاکید کا ذکر ہے اور اس میں یعقوب علیہ السلام کے دوسرے جملے کا جواب ہے پہلے قول کا جواب اسلئے نہیں دیا کہ لیجانا تو انہوں نے طے کیا تھا: وَنَحْنُ عُصْبَةٌ: عُصْبَةٌ: مضبوط قوی جماعت کو کہا جاتا ہے جس کی تعداد کم از کم دس ہو اور بن یامین کے سوا یہ بھی دس افراد تھے: لَّخٰسِرُوْنَ: مراد یہ ہے کہ ہم تو صحراؤں میں بھیڑ بکریوں کو پالنے والے لوگ ہیں اگر ہم بھیڑیا سے بھائی کو نہیں بچا سکتے تو پھر ہم انتہائی نقصان اٹھانے والے ہیں بلکہ ایسی بات نہیں ہے ہم اپنے بھائی کا دفاع کر سکتے ہیں۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ⑮

"پھر جب اسے لے گئے اور سب نے ملکر اس کو غیر آباد گہرے کنوئیں کی تہ میں ڈالنے کا عزم کیا تو ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ ضرور تم انکو ان کے اس معاملہ کی خبر (ایک دن) دو گے کہ ان کو شعور تک نہ ہوگا" [15]۔

تفسیر 15 اس آیت میں بھائیوں کی طرف سے یوسف کے گرانے کیلئے عزم کا ذکر ہے اس میں دلیل ہے کہ زیادہ افراد کا کسی گناہ پر جمع ہونے سے وہ کام جائز نہیں ہوجاتا: فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ: شرط کی جزاء حذف کی گئی ہے یعنی: فَعَلُوْا بِهٖ مَا فَعَلُوْا: (انہوں نے اس کے ساتھ جو کچھ کرنا تھا وہ کرلیا)۔ مفسرین کے بقول انہوں نے کنوئیں کے غار میں تین دن گزارے تھے: وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ: صحیح قول کے مطابق اس میں حقیقی وحی مراد ہے وحی سے مراد وحی نبوت نہیں ہے بلکہ نبوت سے پہلے کی وحی مراد ہے جیسے: اِرْهَاص: سے تعبیر کیا جاتا ہے: وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: اس میں دو توجیہ ہے پہلی توجیہ یہ ہے کہ ان کے بھائی اس وحی سے اور اسی طرح ان کے عظیم مرتبہ سے بھی بے خبر تھے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جب ان کو انکے فریب اور اس دھوکہ دہی کی خبر دیں گے تو یہ لوگ یوسف علیہ السلام کو پہچان نہیں پائیں گے۔

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ⑯

"وہ اپنے والد کے پاس رات شام کے اندھیرے میں روتے ہوئے آئے" [16]۔

تفسیر 16 اس آیت میں اپنے والد کے سامنے مکر وفریب کرنے کا ذکر ہے اور وہ دو طریقوں سے ہے پہلا طریقہ یہ تھا کہ:

عام دنوں کے بنسبت رات کو دیر سے آئے تاکہ اندھیرے کی وجہ سے ان کی مکاری اور رونے کی کیفیت صحیح اندازہ نہ ہو کیونکہ رات کے وقت اندھیرے میں یہ اندازہ لگانا اور بھی مشکل ہوجاتا ہے کہ بندہ مکروفریب کرتے ہوئے رورہا ہے یا حقیقت میں رورہا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ جھوٹ سے رو رہے تھے۔ علماء نے لکھا ہے کہ کسی کا رونا اس کی حقانیت کیلئے دلیل نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ مکروفریب کیلئے روتا ہو اس لیے کہ رونے کے امام ابن قیمؒ نے زاد المعاد (ص 184) میں دس اقسام بیان کی ہیں: (۱) دل کی نرمی شفقت کی وجہ سے رونا جو کہ رحمت ہے (۲) ڈر اور خوف کی وجہ سے رونا (۳) محبت اور شوق سے رونا (۴) خوشی سے رونے لگ جانا (۵) مرض کے درد و فریاد کی وجہ سے رونا (۶) غم کی وجہ سے رونا حزن سے رونا (۷) دل کی بزدلی اور کمزوری سے رونا (۸) منافقت کا رونا بظاہر آنسو بہاتا ہو لوگوں کو اپنا خشوع دکھاتا ہو ریاکاری کرتا رہتا ہو لیکن دل اس کا سخت ہو (۹) اجرت لے کر رونا جیسا نوحہ کرنے والی عورتیں روتی ہیں (۱۰) موافقت کا رونا یعنی رونے والے کو دیکھ کر بغیر کسی سبب کے اس کے رونے کی وجہ سے خود بھی رونا شروع کرلیتا ہے۔

قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۖ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ﴿١٧﴾

"کہنے لگے ابا جان! ہم آپس میں کھیل کود میں مصروف تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان (اسباب) کے پاس بٹھایا تھا تو اس کو بھیڑیا نے کھایا اور آپ ہم پر یقین نہیں کریں گے اگرچہ ہم سچے ہی کیوں نہ ہوں" [17]۔

تفسیر 17 اس آیت میں ان کا جھوٹے بہانوں سے والد کو تسلیاں دینے کا ذکر ہوا ہے: نَسْتَبِقُ: اس آیت میں گھوڑ دوڑ یا اونٹوں کو مقابلے کے لیے دوڑانا یا ایک دوسرے کے ساتھ پیدل دوڑنے کا مقابلہ رکھنا تینوں کا ثبوت ہے یہ (استباق) او مقابلہ تیروں سے بھی ہوتا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں وارد ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الصلوۃ حدیث 7336,2868,420 ابن ماجه کتاب الجهاد حدیث 2811) اور یہاں پر استباق سے تیز رفتاری سے آپس میں دوڑنا ہے۔ یہ استباق شرعاً درست ہے بشرطیکہ ان شروط کے موافق ہو جو حدیث سے ثابت ہے: مَتَاعِنَا: یعنی مقابلہ کے وقت جو اضافی لباس چادر اور دیگر چیزیں نکال کر ایک جگہ جمع کرکے رکھی جاتی ہیں: وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ: یہ ان کے جھوٹ بولنے پر تاکید ہے کیونکہ ابھی تک انکو والد نے جواب نہیں دیا اور خود سے کہنے لگے کہ آپ ہماری باتوں پر یقین نہیں کرتے جبکہ انہوں نے ابھی تک کوئی بات نہیں کی۔

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰي مَا تَصِفُوْنَ ﴿18﴾

"اور اس کی قمیص جھوٹ کے خون میں لت پت کر کے لے آئے (یعقوب علیہ السلام) کہنے لگے ایسی بات نہیں ہے بلکہ تمہارے نفسوں نے تمہیں کوئی بات بنا کر دی ہے پس صبر ہی بہتر ہے اور تمہاری بنائی باتوں پر اللہ تعالیٰ ہی سے صبر کی طلب ہے"[18]۔

تفسیر 18 اس آیت میں ان کے ایک اور فریب کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ کسی جانور کو ذبح کر کے اس کا خون یوسف کی قمیص پر لگا دیا البتہ قمیص پھاڑنا یاد نہیں رہا لہٰذا یعقوب علیہ السلام اپنی علمی فراست سے سمجھ گئے کہ اگر بھیڑیا یوسف کو چیر پھاڑتا تو ضرور قمیص بھی پھٹ جاتی لہٰذا یہ بھی فریب ہے اسلئے فرمایا کہ: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ: کا مطلب یہ ہے کہ مصیبت کے وقت مخلوق کے بجائے اللہ تعالیٰ سے عاجزی انکساری کرتا رہے اور مخلوق سے گلے شکوے نہ ہوں۔ یہ دلیل ہے کہ مصیبتوں پر صبر کرنا جمیع انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے: وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ: اس میں شرک فی الاستعانت پر رد کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے مدد طلب کرنا شرک ہے خواہ مصیبت دور کرنے یا حاجت پوری کرنے کیلئے ہو۔ سورۃ انبیاء آیت 112 میں بھی ذکر ہے۔ اس میں مبتداء اور خبر دونوں معرفہ ہے جو حصر پر دلالت کرتا ہے۔

وَجَاۗءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ۭ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ۭ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿19﴾

"اور ایک قافلہ آیا جنہوں نے پانی لانے والے کو بھیجا اس نے لٹکایا اپنے ڈول کو کہنے لگا واہ خوشی کی بات ہے یہ تو ایک لڑکا ہے انہوں نے اس کو مال تجارت سمجھ کر سامان قرار دے کر چھپا لیا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے اللہ تعالیٰ اس سے باخبر تھا"[19]۔

اس آیت میں اس واقعہ کا دوسرا باب آیت 21 تک ہے۔ خلاصہ: اس آیت میں یوسف علیہ السلام پر مزید امتحانات کا ذکر ہے کہ انہیں غلام بنا کر بیچا گیا ان کے ساتھ فریب کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس امتحان کے ساتھ احسان کا بھی ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کے گھر میں انہیں ٹھکانہ مہیا کیا اور زمین میں ان کی حکومت قائم کر دی۔

تفسیر 19 اس آیت میں یوسف علیہ السلام کا کنویں سے نکل آنے کے سبب کا ذکر اور غلام بننے کی ابتداء کا بیان ہے۔ سَيَّارَةٌ: اس قافلہ کا ذکر ہے جو مدین سے مصر کی طرف رواں دواں تھا فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ: وارد ایک شخص تھا یا اسم جنس

ہے یعنی کئی افراد تھے لیکن اس بندے کو کہتے ہیں جو قافلہ کیلئے پانی اور دیگر امور کا انتظام کرتا ہے: قَالَ: اس سے قبل یہ الفاظ ہیں: فَتَبَشَّتْ بِهٖ يُوسُفُ: یعنی یوسف ڈول کے ساتھ چمٹ گئے یٰبُشْرٰی: معنی یہ ہے کہ اے خوشی آ تو یہ تیرے آنے کا وقت ہے ایک قول یہ بھی ہے کہ بشریٰ اس کے ساتھی کا نام تھا: هٰذَا غُلٰمٌ: یہ تاجروں کے عادت کے موافق کہنا ہے ان کو جب اس قسم کی چیز مل جاتی ہے تو اس کو تجارت میں استعمال کرتے ہیں: وَأَسَرُّوْهُ: اس میں دو تفسیر ہیں: یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کی حالت کو مخفی رکھا اور انہیں مال تجارت بنا کر بیچ دیا۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ پانی پلانے والے اور ان کے ساتھیوں نے یوسف علیہ السلام کو دوسرے لوگوں سے چھپا کر رکھا۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ۝ ع

''انہوں نے یوسف علیہ السلام کو بہت ہی ناقص (حرام) قیمت پر جو چند درہم تھے بیچ ڈالا اور اس کے بارے میں وہ بہت ہی بے رغبت تھے''[20]۔

تفسیر20 ''وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ: اس میں تین معانے ہیں: پہلا معنی یوسف کے بھائیوں نے اس کو بیچ ڈالا اور اس ثمن اور قیمت میں یہ لوگ رغبت نہیں رکھتے تھے کیونکہ یہ لوگ اسے حرام سمجھتے تھے۔ دوم معنیٰ (مشکی) پانی پلانے والے اور اس کے ساتھیوں نے (اس کو) بیچ ڈالا عزیز مصر اور اہل قافلہ یوسف علیہ السلام میں دلچسپی نہیں لے رہے تھے کیونکہ انہوں نے خیال کیا کہ یہ اپنے مالک کا نافرمان غلام ہے۔ سوم: اور اس کے ساتھیوں نے خریدا تو اس میں شراء کا معنی اشتراء ہے۔ بَخْسٍ: کے دو معنیٰ ہیں ایک معنی یہ ہے کہ ناقص دوسرا معنی ہے حرام یہاں پر دوسرا معنیٰ مراد ہے کیونکہ آزاد آدمی کو بیچنا حرام ہے: مَعْدُوْدَةٍ: یعنی جس کی گنتی آسان ہو یہ کم پیسوں سے کنایہ ہے: وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ: زهد کی صلہ میں جب فی آجائے تو اس کا معنیٰ ہوتا ہے بے رغبت ہونا اور فِيْهِ: میں ضمیر یوسف کی طرف راجع ہے۔ جب ضمیر جمع مشکی اور اس کے ساتھیوں کے طرف راجع ہو تو اس آیت میں دلیل ہے کہ اعلیٰ چیز ادنیٰ قیمت پر لینا جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں دھوکہ نہ ہو اور دونوں فریق راضی ہوں۔ یا فیہ میں ضمیر رقم کی طرف راجع ہے جب فاعل کی ضمیر یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرف راجع ہو یا ضمیر مشکی اور اس کے ساتھیوں کی طرف راجع ہے اور زہد کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی محبت ان لوگوں کے دلوں میں نہیں ڈالی تھی تاکہ ان کے برے کاموں سے محفوظ رہیں۔

وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ؗ وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۟

"اور مصر والوں میں سے جس نے اس کو خریدا تھا اس نے اپنی بیوی سے کہا اس کو عزت و احترام سے بساؤ بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا اسے ہم اپنا بیٹا ہی بنالیں اس طرح ہم نے یوسف کو زمین مصر میں بسایا تاکہ ہم اس کو خوابوں کی تعبیر کا کچھ علم سکھادیں اللہ تعالیٰ اپنے ارادے پر غالب ہے لیکن لوگوں کی اکثریت بے علم ہوتی ہے" [21]۔

تفسیر 21 اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے احسان کا ذکر فرمارہے ہے جو یوسف علیہ السلام پر فرمایا اور وہ ہے یوسف علیہ السلام کو عزت دینا۔ خریدنے والے کا نام قطفیر ذکر کیا گیا ہے البتہ مشہور تھا عزیز مصر کے نام سے اور یہ وزیر خزانہ مصر کے لیے سب سے بڑے وزیر کہلاتے تھے اور اس کی بیوی کا نام راعیل تھا البتہ زلیخا نام سے معروف تھی: مَثْوَاہُ: منزل کو کہا جاتا ہے مراد اس سے کھانے، پینے اور رہنے کی جگہ ہے: عَسَى أَنْ يَنْفَعَنَا: یعنی بیچ کر زیادہ قیمت حاصل کرینگے کیونکہ ان کے ظاہری حسن کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کے اخلاق بھی اچھے ہوں گے: أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا: یہ عام عادت ہے کہ لوگ کسی کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا کر پالتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں جس کو متبنیٰ کہتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ عزیز مصر کی اس بیوی سے اولاد نہیں تھی: وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا: کذلک یعنی جس طرح اس کو اللہ تعالیٰ نے کنویں سے اور بھائیوں کے قتل سے بچالیا تو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس پر عزیز مصر کو مہربان کیا۔ اس کے مہربانی کی وجہ سے مصر میں اس کو اللہ تعالیٰ نے عزت دی اور اس کے گھر میں بھی عزت و احترام کے ساتھ رہے: وَلِنُعَلِّمَهُ: یہ مخفی لفظ پر معطوف ہے۔ اس کے دو معنی آیت 6 کی تفسیر میں گزر گئے ہیں: وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ: اس میں شرک فی التصرف کا رد ہے اور: أَمْرِهِ: کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور اس سے تمام امور مراد ہیں۔ جس چیز کا اللہ تعالیٰ ارادہ کرلیتا ہے تو پھر اس کو کوئی روک نہیں سکتا ہے یا ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہے اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمکین دی یعنی عزت سے بسایا جبکہ بھائی اس کو ذلیل کرنا چاہتے تھے: وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ: اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا کوئی بھی علم غیب نہیں جانتا۔ اس طرح یہ تفسیر قرطبی میں لکھا ہوا ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝

"اور جب (یوسف) جوانی (پختگی) کو پہنچ گئے تو ہم نے اس کو قوت فیصلہ اور علم دین سے نوازا، ہم نیک عمل کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں" [22]۔

خلاصہ: اس آیت سے آیت 29 تک تیسرا مقام ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں یوسف علیہ السلام پر ایک اور امتحان کا ذکر ہے جس کا ذریعہ عزیز مصر کی بیوی بنی ہے یعنی یوسف سے فحاشی کا مطالبہ کرنا۔ گناہ کا پختہ عزم کرنا۔ یوسف کو دعوت دینا۔ دروازے بند کر کے گناہ کا پختہ ارادہ کرنا ان کے پیچھے دوڑ لگانا۔ ان کی قمیص کو پھاڑ دینا اور ان پر جھوٹی تہمت لگانا آخر میں یوسف پر احسان الٰہی کا ذکر ہے کہ ایک گواہ نے اس کی پاکدامنی بیان کی جو فیصلہ کن ثابت ہوئی۔

تفسیر 22 اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر ہے کہ یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوت اور دین کے علم سے نوازا: أَشُدَّهٗ: بلوغت کو کہا جاتا ہے بعض کے نزدیک 18 سال سے 30 سال کی عمر پر اطلاق ہوتا ہے۔ اشد کو جمع ذکر کیا ہے یہ اسلئے کہ جوانی میں ساری قوتیں قوی ہوتی ہیں: اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا: حکم سے نبوت یا فہم دین مراد ہے۔ جس پر لوگوں کے درمیان فیصلے کریں: عِلْمًا: پہلے معنی کے اعتبار سے تاکید ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے تعمیم بعد التخصیص ہے۔ یعنی حکمت خاص ہے اور علم اس سے عام ہے: وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ: جب: حُكْمًا: سے نبوت مراد لی جائے تو اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس کا حاصل معنی یہ بنتا ہے کہ نبوت احسان کی جزا یعنی بدلہ میں ملتا ہے جبکہ سلف و خلف اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ نبوت کسبی چیز نہیں ہے یعنی کسب اور محنت سے نہیں حاصل ہوتی ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ: نَجْزِى بدلہ دینے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ کفایت کے معنی میں ہے اسلئے کہ لسان العرب میں ہے کہ جزاء بمعنی کفی آتا ہے تو اس لحاظ سے معنی یہ ہوا کہ اسی طرح ہم پوری نعمت انبیاء کرام علیہم السلام کو دیتے ہیں۔ اور انبیاء کرام نبوت سے پہلے بھی محسنین ہوتے ہیں۔ اگر: حُكْمًا: سے دین کی اور فیصلوں کی سمجھ مراد لی جائے تو پھر أَشُدَّهٗ سے انتہا اور جوانی مراد ہے یعنی جوانی میں احسان کیا ہو یعنی محسن بنا ہو تو اس پر حکمت اور علم ملتا ہے۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي

أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٣﴾

"اس کو بہلانا پھسلانا شروع کیا اس کے نفس کے متعلق اس عورت نے جس کے گھر میں یوسف تھے اور سارے دروازوں کو بند کر کے کہنے لگی لو جی آؤ یوسف فرمانے لگے اللہ تعالیٰ کی پناہ وہ میرا رب ہے اس نے مجھے بہت اچھی طرح رکھا ہے اور ظالموں کو کامیابی نہیں ملے گی" [23]۔

تفسیر 23 اس میں یوسف علیہ السلام کے امتحان کا ذکر ہے اور یہ تین طریقوں سے ہے: پہلا طریقہ: وَرَاوَدَتْهُ مراودہ سے مراد مخفی چالاکی سے یوسف کو اپنی طرف مائل کرنا تھا۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس خاتون نے یوسف کے بالوں کا ذکر کیا کہ کتنے خوبصورت ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ مرنے کے بعد جھڑ جائیں گے پھر اس نے آنکھوں کی تعریف کی تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ مرنے کے بعد قبر میں یہ پہلی چیز ہے پھٹ کر چہرے پر بہہ جائیں گی پھر اس نے یوسف کے چہرے کا حسن بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ بھی مٹی کیلئے بنایا گیا ہے ان تمام حیلوں بہانوں کو مراودہ کہتے ہیں۔ دوسرا طریقہ: وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ: دروازے بند کرنا۔ چونکہ اس گھر کے دروازے زیادہ تھے اور کسی شخص کو تب گھیرا جا سکتا ہے جب سب دروازے بند کئے جائیں۔ تیسرا طریقہ: وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ: یوسف علیہ السلام کو اپنے نفس کی طرف دعوت دی: هَيْتَ لَكَ: یہ اسم ہے جس کا معنی ہے: تَعَالَ وَأَقْبِلْ: یعنی آؤ متوجہ ہو جاؤ۔ مجاہد کا قول ہے کہ یہ عربی کلمہ ہے جو کسی کام پر ابھارنے کیلئے بولا جاتا ہے: قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ: اس میں دلیل ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام معصیت اور مصیبت سے بچنے کیلئے اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں: إِنَّهُ رَبِّي: اس سے مراد اللہ تعالیٰ یا عزیز مصر ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رب کا اطلاق غیر اللہ پر ہو سکتا ہے بشرطیکہ مطلق نہ ہو اور عام اضافت کے ساتھ بھی نہ ہو یعنی رَبُّ الْعَالَمِينَ رَبُّ النَّاسِ: کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے: اَلظَّالِمُونَ: اس میں دلیل ہے کہ مالک کے گھر میں خیانت و فحاشی کرنا ظلم ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

"یقیناً اس خاتون نے یوسف کا پختہ قصد کیا تھا اور یوسف علیہ السلام بھی قصد کر لیتے اگر وہ اپنے رب کی طرف سے دلیل نہ دیکھتے یہ اسلئے کہ ہم اس سے برائی فحاشی کو پھیر دیں یقیناً وہ ہمارے منتخب بندوں میں سے تھا" [24]۔

تفسیر 24۔ اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے متعلق زلیخا کے گناہ پر امادہ کرنے کا پختہ عزم کا بیان ہے پھر یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی اور عصمت بیان ہوئی ہے: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ۔ اہل تحقیق کا قول ہے کہ ھَم دو قسم کا ہے پہلا ھم جو بمعنی عزم ہے اس میں قصد اور اختیار ہے جو خاتون زلیخا نے کیا تھا جس کی دلیل سابقہ آیت میں گزری نیز مراد دروازے بند کرنے اور اس کو آواز دینے اور لام تاکید اور قد برائے تاکید بھی اس کیلئے دلیل ہے جبکہ دوسرا ھم یعنی قصد عارضی ہے جو بے اختیار نا گہانی دل میں خیال گزر جائے اور وہ گناہ نہیں ہے دوسرا قول مفسرین کا یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کا ھم بھی قصد والا ہے مگر اس جملہ کے ساتھ معلق ہے کہ: لَوْلَآ أَنْ رَّأٰی بُرْهَانَ رَبِّهٖ: یعنی رب کے دلائل دیکھنے کی وجہ سے اس نے (ھم) قصد نہیں کیا۔ بعد والا جملہ اس پر دلیل ہے لہذا یہ الفاظ: لَوْلَآ أَنْ رَّأٰی بُرْهَانَ رَبِّهٖ معنی میں: هَمَّ بِهَا: سے پہلے ہے۔ اور: بُرْهَانَ: سے علم وشریعت دلائل مراد ہے جو آیت 22 میں ذکر ہوئے ہیں۔ جن تفسیروں میں ھم کے متعلق لکھا ہوا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ازار کھول دیا اور قریب ہوا اور برھان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ یعقوب علیہ السلام کی صورت شبیہ تھی یا ان کو آواز آئی۔ یہ سب اسرائیلیات اور منگھڑت کہانیاں ہیں انکا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔ آنے والے جملوں یعنی: هِيَ رَاوَدَتْنِي: اور شاہد کی شہادت کے بھی خلاف ہے اور محققین مفسرین نے اس پر رد کیا ہے۔ تا: السُّوْٓءَ: سے ھم اور گناہ صغیرہ مراد ہیں: اَلْمُخْلَصِيْنَ: اس میں اشارہ ہے کہ انبیاء عصمت میں اللہ تعالی کے محتاج ہیں۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِن دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ ۚ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَن يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٥﴾

"دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور عورت نے یوسف کا قمیص پیچھے کی جانب سے پھاڑ ڈالا اور دروازے کے پاس ہی دونوں نے عورت کا شوہر پایا تو عورت کہنے لگی کہ جو شخص تیری بیوی کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے نہیں ہے اس کی سزا مگر یہ کہ اسے قید کیا جائے یا کوئی دردناک سزا دی جائے" [25]۔

تفسیر 25 اس آیت میں زلیخا کی طرف سے تین مکاریوں اور فریب اور دغہ بازیوں کا بیان ہیں: پہلی مکاری: دوڑ لگانا یوسف علیہ السلام کے پیچھے دروازے تک اور یوسف علیہ السلام جان بچانے کیلئے اس سے دوڑ رہے تھے دوسری مکاری یہ تھی کہ ان کی قمیص کو پیچھے کی جانب سے پھاڑا جو کہ واضح ثبوت ہے کہ یوسف علیہ السلام جان چھڑانے کیلئے آگے زور لگا رہے تھے اور زلیخا ان کو پیچھے کھینچ رہی تھی جس سے قمیص پھٹ گئی۔ تیسرا مکاری: یہ تھا کہ ان پر الزام لگا کر کہ انہوں نے مجھ سے گناہ کا ارادہ کیا ہے اور اس کیلئے سزا بھی تجویز کر لی تا کہ وہ مجرم ثابت ہو جائے: وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا: سید سے مراد شوہر ہے اور یہ دلیل ہے کہ سید کا اطلاق اللہ تعالی کے علاوہ کسی اور بندے پر بھی ہو سکتا ہے: لَدَى الْبَابِ: اس کو مفرد ذکر کیا ہے اسلئے کہ نکلنا ایک دروازے سے ہوتا ہے جبکہ بند کرتے وقت: الْأَبْوَابَ: فرمایا تھا اسلئے کہ گھیر لینے کیلئے سب دروازوں کو بند کرنا پڑتا ہے۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَن نَّفْسِي ۚ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا إِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٢٦﴾

"یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ عورت ہی مجھے میرے نفس کی بارے میں ورغلا رہی تھی اور عورت ہی کی رشتہ داروں میں سے ایک رشتہ دار نے گواہی دی (فیصلہ کیا) کہ اگر قمیص یوسف کا آگے سے پھٹا ہے تو عورت سچی ہے اور یوسف جھوٹوں میں سے ہے" [26]۔

تفسیر 26 اس آیت میں یوسف علیہ السلام کی اس صفائی کا بیان ہے جو انہوں نے اپنی ذات کے متعلق پیش کی تھی کسی الزام کے وقت لوگوں کے لعن طعن سے بچنے کے لئے اپنی صفائی بیان کرنا واجب ہے۔ پھر اس آیت میں حاکم کے فیصلہ کا ذکر ہے وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا: صحیح قول یہ ہے کہ یہ ایک بالغ عاقل ہوشیار بڑے عمر کا آدمی تھا جس نے انصاف کا فیصلہ کیا تھا۔ اور شہادت سے فیصلہ مراد ہے شہادت سے گواہی مراد نہیں ہے یاں جس روایت کو مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ گواہ چھوٹا

بچہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے گویائی عطا کی وہ روایت صحیح نہیں ہے (ابن حبان 2904، ابو یعلی 2517، طبرانی 12280، شیخ البانی نے اس کو سلسلة الضعیفہ میں باطل قرار دیا 880)۔ صحیح روایت (صحیح بخاری کتاب الاحادیث الانبیاء حدیث 3436 وفی الصلوۃ حدیث 1206) میں صرف تین شیرخوار بچوں کی گواہی اور بات کا ذکر ہے ان میں یہ والا واقعہ نہیں۔ اس میں ایک عیسیٰ علیہ السلام ایک ابن جریج اور ایک خاتون کے بچے کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل میں سے تھا۔

وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٧﴾

"اور اگر اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یوسف علیہ السلام سچوں میں سے ہیں" [27]۔

تفسیر 27 یہ بھی اس فیصلہ کا ایک حصہ ہے اور یہ فیصلہ علامات، نشانیوں کی بنیاد پر ہوا تھا اسی طرح کے فیصلوں کی ہماری شریعت میں بھی کئی مثالیں ہیں۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۖ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿٢٨﴾

"پس جب اس کے (شوہر) نے قمیص دیکھی تو وہ پیٹھ کی جانب سے پھٹی ہوئی تھی تو کہنے لگا کہ تم عورتوں کی یہ چال بازی ہے بیشک تمہاری چال بازی بہت بڑی ہے" [28]۔

تفسیر 28 اس آیت میں یوسف علیہ السلام کی عصمت کی دلیل ہے جو صحیح علامات سے ثابت ہوئی ہے اور زلیخا کے مکر کی وضاحت ہے کہ چال بازی اسی نے کی تھی۔ فائدہ: اس آیت میں ہے کہ عورتوں کا مکر بہت بڑا ہے اور سورۃ النساء آیت 76 میں ہے کہ شیطان کا مکر کمزور ہے تو اس سے سوال پیدا ہوا کہ کیا عورتوں کا مکر شیطان کے مکر سے بڑا ہے؟ جواب۔ شیطان کا مکر اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے مقابلہ میں کمزور ہے جبکہ عورتوں کا مکر مردوں کے مقابلے میں بڑا ہے۔

يُوْسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۜ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿٢٩﴾

"یوسف علیہ السلام! آپ اس بات سے درگزر کرلو۔ اے عورت! تو اپنی گناہ کی معافی مانگ لے یقیناً تو گنہگاروں میں سے ہے" [29]۔

تفسیر 29 اس آیت میں یوسف علیہ السلام کو یہ معاملہ مخفی رکھنے کا حکم ہے اور خاتون کو اللہ تعالیٰ یا یوسف علیہ السلام یا شوہر سے معافی مانگنے کا حکم ہے۔ کیونکہ وہ باوجود شرک کے اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے اسی طرح عزیز مصر کے غصہ نہ کرنے کا بیان ہے

مدارک نے لکھا ہے کہ غیرت کی کمی کی وجہ سے انہوں نے اپنی بیوی کو کچھ نہیں کہا جبکہ ظاہری علامات سے ان کی بیوی پر گناہ ثابت ہو چکا تھا۔ تفسیر مدارک نے بھی ایسا لکھا ہے۔ کیونکہ عورت کی غلطی ثابت ہونے کے بعد تقاضہ یہ تھا کہ شوہر اس کو سزا دیتے لیکن فیصلہ کے بعد بھی انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۳۰

"اور شہر کی عورتوں میں یہ بات شہرت پا گئی کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے غلام سے اپنی خواہش پوری کرنے کیلئے اسے ورغلاتی پھسلاتی ہے اس کے دل میں یوسف علیہ السلام کی محبت بیٹھ گئی ہے ہمارے خیال کے مطابق وہ صریح غلطی پر ہے" [30]۔

خلاصہ: یہاں سے آیت 35 تک چوتھا مقام ہے۔ خلاصہ: اس مقام میں چار مکاریوں کا ذکر ہے: (۱) عام عورتوں کی طرف سے زلیخا پر لعن طعن کا بیان ہے (۲) زلیخا کا مکر ان عورتوں کے ساتھ (۳) ساری عورتوں کا مکر یوسف علیہ السلام کے خلاف مکر و چالوں کا ذکر ہے (۴) سب عورتوں کا مکر یوسف علیہ السلام کے خلاف چال اور مکر جس سے ان کو جیل میں جانا پڑا۔

تفسیر 30: اس آیت میں عورتوں کے طعن کا بیان ہے جو انہوں نے دس طریقوں سے زلیخا پر کیا: (۱) اس کا شوہر ہے یعنی شادی شدہ ہے (۲) شوہر بھی عزیز مصر ہے (۳) عورت نے آدمی سے مطالبہ کیا ہے (۴) اس سے طلب میں کوشش اور مبالغہ کیا ہے (۵) اپنے ہی غلام سے ایسی نامناسب حرکت کا مطالبہ کیا (۶) مطالبہ کے وقت باقاعدہ صراحت اور وضاحت سے ان کے نفس کا مطالبہ کیا (۸) دل کی گہرائی میں اس کی محبت کو جگہ دی ہے یعنی شغف میں (۹) واضح غلطی میں واقع ہوئی ہے (۱۰) غلطی بھی ایسی واشگاف جس کی معاشرے میں شہرت ہوئی: قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا: شغف دل کے پردے کو کہتے ہیں یعنی زلیخا کے دل میں یوسف علیہ السلام کی محبت نے ایسی جگہ بنائی ہے کہ دل کے اندر داخل ہوئی ہے۔ اور یہ محبت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے امام ابن القیم رحمہ اللہ نے الجواب الکافی میں ایسی محبت کی دس اقسام لکھی ہیں۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۖ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿٣١﴾

"جب اس (زلیخا) نے ان عورتوں کی مکر کی یہ بات سنی توان کو (اپنے گھر میں) بلوالیا اوران کیلئے تکیوں والی نشست تیار کرلی اوران میں سے ہر ایک کو ایک چاقو دیدیا اور (یوسف علیہ السلام) سے کہا کہ باہر نکل کر ان کے سامنے آجاؤ جب ان عورتوں نے دیکھا تو ان کو اس کے حسن کی حیرت ہوئی، اوراس کو بہت بڑا جانا اوراپنے ہاتھ کاٹ دیئے اور بول اٹھیں کہ ماشاءاللہ یہ شخص کوئی انسان نہیں بلکہ قابل تکریم ملک ہے اسکے سوا کچھ نہیں ہے" [31]۔

تفسیر 31 اس آیت میں زلیخا کا اپنی ذات سے ان عورتوں کا طعن دفع کرنا مقصود ہے اوراپنے عذر کو ثابت کرنا کہ مجھے ان سے محبت ہے: فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ: اس کو مکر اسلئے کہا کہ وہ عورتیں پیٹھ پیچھے یوسف علیہ السلام یا زلیخا کی بدنامی کے لیے یہ باتیں کیا کرتی تھیں یا غیبت کی وجہ سے اس کو مکر کہا کیونکہ وہ بھی مکر کی طرح مخفی ہوتا ہے: وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً: اس سے تکیے مراد ہے یا طعام مراد ہے کہ ٹیک لگا کر کھائیں اور حدیث میں ضمنا اس سے منع آیا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تکیہ لگا کر کھانا نہیں کھاتا (صحیح بخاری کتاب الاطعمة حدیث 5398 ترمذی ابن ماجه ابوداؤد وغیرہ یہ بھی قول ہے کہ: مُتَّكَأً: ہر اس کھانے کو کہا جاتا ہے جو چاقو سے کاٹ کر کھایا جائے: سِكِّينًا: اس زمانہ میں چاقوؤں سے کاٹ کر مہذب لوگوں کا کھانا ہوتا تھا: أَكْبَرْنَهُ: یعنی ان خواتین نے اس کے ظاہری حسن اور حسن نبوت واخلاق نبوت سے ہیبت زدہ ہوکر اپنے ہاتھ کاٹ دیئے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کو شطر یعنی آدھا حسن دیا گیا تھا۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث 162، صحیح ابن حبان حدیث 48، جامع الصغیر حدیث 127، شیخ البانی نے الصحیحة 873 میں اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے) وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ: یوسف علیہ السلام کے حسن سے حیران ہوکر ہاتھوں کو زخمی کرنا مراد ہے۔ یا حقیقی معنیٰ مراد ہے: وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ: یہ کلمہ بوقت تعجب سبحان اللہ یا معاذ اللہ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی پاکی مانتے تھے اور: حَاشَ: یہاں مصدری معنیٰ میں مستعمل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کیلئے پاکی ہے: إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ: یہ تشبیہ پاکدامنی میں دی ہے یعنی یہ ملائکہ کی طرح پاک ہے یا تشبیہ زینت وخوبصورتی میں ہے ملائکہ کی اگرچہ انہوں نے نہیں دیکھے لیکن ملائکہ خوبصورتی مشہور ہے جیسے کہ شیاطین کی بدصورتی

مشہور ہے۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَلَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

عزیز کی بیوی نے کہا اب دیکھو یہ وہ شخص ہے جس کے بارے میں تم نے مجھے طعن دی ہیں یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنا مقصد پورا کرنے کیلئے اس پر حربیں استعمال کئے ہیں مگر یہ مجھ سے بچ نکلا اور اگر یہ میرے کہنے پر عمل نہیں کریگا تو اسے ضرور قید کیا جائے گا اور یہ ذلیل ہو کر رہے گا" [32]۔

تفسیر 32 اس آیت میں زلیخا کی طرف سے زجر اور ڈانٹ ہے ان عورتوں کے لیے جنہوں نے ان پر لعن طعن کیا تھا کیونکہ ان سے لعن طعن کا بدلہ لینا تھا پھر زلیخا نے یوسف علیہ السلام کی عصمت کا واضح اعلان کیا ہے پھر ان پر دباؤ ڈالا ہے کہ میری چاہت کرلو ورنہ قید اور رسوائی اس کا مقدر ہوگی: فَاسْتَعْصَمَ: عصمت میں س اور ت کو مبالغہ کیلئے بڑایا ہے: مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ: مراد یہ ہے کہ میرا اقدام ہے تو جیل میں میری بنسبت اس کے کوئی کام نہیں آئے گی۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾

"یوسف علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے رب! اگر تو نے مجھے عورتوں کے چال سے نہیں بچایا تو میرا دل بھی ان کی طرف مائل ہو جائے گا اور میں نا سمجھ لوگوں میں سے ہو جاؤں گا" [33]۔

تفسیر 33 اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے قید ہونے اور جیل جانے کو ترجیح دینے کا ذکر ہے ان عورتوں کے مکر کے مقابلے میں اور بدکاری سے بچنے کے لیے اپنی عاجزی پیش کی اور اللہ تعالیٰ سے اس امتحان سے نکلنے کی دعا فرمائی كَیْدَهُنَّ: اس میں اشارہ ہے کہ ان سب عورتوں نے اپنا مطالبہ کیا تھا یا زلیخا کیلئے سفارش کی تھی۔ جیل کو اسلئے ترجیح دی کہ وہ جان گئے کہ اس گناہ سے بچنا ممکن ہے سوائے جیل جانے کے اور یہ صالحین کی عادت ہیں کہ معصیت پر مصیبت کو ترجیح دیتے ہیں یعنی گناہ سے محفوظ ہو جائیں اگرچہ مصیبت میں مبتلاء ہو جائیں۔ چونکہ جیل بھی حفاظت کیلئے کافی نہیں ہے اسلئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہوئے فرمایا: وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ: فائدہ: اس آیت سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ انسان پر جب ایک جانب معصیت کا آنا ہو اور دوسری جانب معصیت میں مبتلا ہونا ہو تو معصیت کے وقت مصیبت کو ترجیح دینا ضروری ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٤﴾

"اس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی اور ان عورتوں کے داؤ سے اس کو محفوظ کیا وہ ہر چیز کو سننے اور ہر چیز کو جاننے والا ہے"[34]۔

تفسیر 34 اس آیت میں یوسف علیہ السلام کی دعاء کی قبولیت اور دیگر عورتوں کے مکر وفریب سے نجات دینے کا بیان ہے۔
فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ: اس سے معلوم ہوا کہ ان کا جیل جانے کا مطلب گناہ سے بچنا تھا۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٣٥﴾

"پھر ان کو یہ مصلحت نظر آئی جب اس کی پاکدامنی ظاہر ہوئی کہ معین مدت تک اس کو جیل میں لازماً داخل کرو"[35]۔

تفسیر 35 "ثُمَّ بَدَا لَهُمْ: اس کا فاعل مقدر ہے یعنی الرائ اور لَيَسْجُنُنَّهُ: اس کیلئے تفسیر ہے: اَلْآيَاتِ: اس سے یوسف علیہ السلام کی عصمت اور پاکدامنی کے دلائل ونشانیاں مراد ہیں جس کا ذکر گزر گیا یعنی (۱) معاذ اللہ کہنا (۲) دروازے کی طرف دوڑنا (۳) پشت کی جانب سے قمیص کا پھٹا ہوا ہونا (۴) شاہد کا فیصلہ (۵) عزیز مصر کا اقرار (۶) زلیخا کا عورتوں کے درمیان اقرار (۷) یوسف علیہ السلام کی دعاء: مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ: اس واقعہ کو چھپانے کیلئے یوسف علیہ السلام کو قید کرنے میں مصلحت نظر آئی نہ اس لیے کہ یوسف علیہ السلام ان کی نظر میں کوئی مجرم تھے اور نہ ہی الزام کی وجہ سے وہ خود زلیخا اور عزیز مصر جانتے تھے کہ یوسف علیہ السلام بے قصور ہیں۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ ۖ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا ۖ وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْزًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۖ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٣٦﴾

"اور قید خانے میں یوسف کے ساتھ دو آدمی داخل ہوئے ان میں سے (ایک دن) ایک نے کہا: میں نے (خواب) دیکھا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا: میں یوں دیکھتا ہوں میں نے سر پر روٹی اٹھائی ہے (اور) پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں ہمیں ذرا اس کی تعبیر بتاؤ آپ نیک آدمی نظر آتے ہو"[36]۔

خلاصہ: اس مقام سے آیت 42 تک واقعہ یوسف کا پانچواں مقام ہے یوسف علیہ السلام کی حالت کا بیان ہے جیل جانے کے بعد پھر ان کی اپنی رسالت کی طرف دعوت معجزات اور نشانیوں کے ساتھ پھر توحید کا بیان اور شرک کا تفصیلی رد بعد

ا ہل علم سے خواب کی تعبیر پوچھنے کو خواب کی درست تعبیر کا بیان۔

تفسیر 36 اس آیت میں بادشاہ کے دو خادموں کا ذکر ہے جو جیل میں داخل ہوئے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیدی تین قسم کے ہوتے ہیں (۱) جن پر جرم ثابت ہوا ہو (۲) جن کو پر کسی جرم کا الزام ہو (۳) جن ظلما قید کیے گئے ہوں۔ پہلی قسم کی مثال بادشاہ کا نان بائی (باورچی) (۲) دوسری قسم کی مثال بادشاہ کا ساقی تھا اور (۳) تیسری قسم کی مثال یوسف علیہ السلام تھے: فَتَيَانِ: ان دونوں پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے بادشاہ کو قتل کرنے کیلئے بادشاہ کے کھانے یا پینے میں زہر ملا دیا ہے للہذا دونوں کو قید میں ڈال کر ان پر مقدمہ چلایا گیا تاکہ دونوں میں مجرم کا تعین ہو جائے: قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي: ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ خواب حقیقتاً دیکھ لیا تھا: إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ: آیت 22 میں یہ صفت یوسف علیہ السلام کی گزر چکی ہے اور یہ دلیل ہے کہ یوسف علیہ السلام جیل میں اچھے اخلاق و کردار سے معروف تھے اور خواب کی تعبیر ان سے پوچھنا چاہیے جو نیک صالح اور عقل مند ہو۔

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿٣٧﴾

"یوسف علیہ السلام نے فرمایا جو کھانا تمہیں (قید میں) ملتا ہے وہ آنے نہیں پائے گا کہ میں تمہیں اس کی حقیقت سے آگاہ کر دوں گا۔ یہ اس میں سے ہے جو مجھے میرے رب نے سکھایا ہے بے شک میں نے اس قوم کے دین کو چھوڑا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں" [37]۔

تفسیر 37 اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے معجزے کا تذکرہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم کے ذریعے بعض غائب کی خبریں دینا جیسا کہ ان الفاظ سے ثابت ہے: مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي: یعنی وحی الہٰی کی تعلیم مراد ہے اور آیت میں یوسف علیہ السلام کا اپنے عقیدے کا اظہار ہے اور اسی طرح اہل مصر شرک اور بت پرستی سے برأت کا بیان ہے: إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ: ترک سے مراد برات اور اعراض ہے یہ مطلب نہیں کہ پہلے وہ اس دین پر تھے پھر اس سے برات کرنے لگے ایسا نہیں کیونکہ انبیاء کرام نبوت سے قبل بھی کفر شرک سے پاک ہوتے ہیں۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ
اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

"اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم واسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے دین کی پیروی کی ہے ہمیں یہ حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک ٹھہرائیں۔ یہ (عقیدہ توحید) اللہ کا فضل ہم پر اور تمام لوگوں پر ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اس (رحمت) کا شکر ادا نہیں کرتی" [38]۔

تفسیر 38 یوسف علیہ السلام نے اس میں اپنی ملت کا اجمالاً اظہار کیا ہے: مِلَّةَ اٰبَآئِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ: یہ تینوں انبیاء اس وقت شام مصر عرب فلسطین میں مشہور تھے کہ ان کا دین حنیفیت یعنی دین توحید ہے اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ باپ دادا کی پیروی کو دلیل کی حیثیت میں پیش کر سکتے ہیں جب وہ انبیاء ہوں جیسا کہ اس جملہ میں اس کی وضاحت ہے کہ: مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ: اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین توحید باری تعالیٰ پر مشتمل تھا: مِنْ شَيْءٍ: یہ لفظ بہت زیادہ تعمیم کے لیے ہے اسلئے کہ لفظ شیء عام ہے اور سیاق نفی میں واقع ہوا ہے جبکہ مِنْ بھی عموم کی تاکید کیلئے ہے لہٰذا اس میں بت، حجر، شجر، دربار، اولیاء کرام، پیر، قبریں، ملائک اور جنات سب شامل ہیں: وَعَلَي النَّاسِ: یعنی توحید کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے سارے انسانوں کو دی ہے چاہے فطری طور پر ہو یا انبیاء کے دعوت کے ساتھ ہو: وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ: بہت بڑی نافرمانی اور کفران نعمت شرک ہے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝

"اے میری قید کے ساتھیوں! کیا متفرق رب بہتر ہے یا ایک ہی رب جس کا اقتدار سب پر چھایا ہوا ہے" [39]۔

تفسیر 39 تمہید کے بعد اب جیل کے ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں: يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ: اس لفظ میں شفقت اور نرمی مراد ہے یعنی میں تمہارے جیل کے ساتھیوں میں سے ہوں لفظ سجن میں اشارہ ہے کہ صرف جیل کے ساتھی ہیں دین کے نہیں جبکہ سیدنا ابوبکر صدیق نبی کریم ﷺ کے دین اور سفر کے ساتھی تھے اسلئے ان کیلئے سورت توبہ آیت 40 میں لفظ لِصَاحِبِهٖ: اور لفظ فِي الْغَارِ: کو مقدم فرمایا ہے اور اہل تشیع اور روافض کا قیاس باطل ہے کہ انہوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یوسف علیہ السلام کے ساتھیوں پر قیاس کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں سیدنا ابوبکر کی کوئی فضیلت نہیں ہے: نَحَقْ لَهُمُ اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ ان کو رسوا کریں: يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ: اصل میں صاحبین تثنیہ ہے اس میں متکلم کی ایک (ی) کو ثقل کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے

اس آیت میں رد شرک فی الربوبیت بطریقہ الزام حجت ہے: مُّتَفَرِّقُوْنَ: ایک معنی تو یہ ہے کہ الگ مقاصد و ضرورت کیلئے مختلف رب بنا رکھے ہیں۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ مشرکین نے ان کو الگ الگ مرتبوں کا مالک بنا رکھا ہے۔ خیر: یعنی ربوبیت اور عبادت کے مستحق ہیں: الْوَاحِدُ: ایک معنی یہ ہے کہ ذات و صفات میں اکیلا ہے اس کا کوئی مثیل، شبیہ، نظیر نہیں ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ بندگی اور عبادت کا اکیلے حقدار ہے: اَلْقَهَّارُ: ہر کام اور ہر کسی پر غالب جبکہ باقی تمام معبودان باطلہ سب کمزور اور عاجز ہیں۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

"اس کے سوا جس کی (بھی) تم عبادت کرتے ہو بجز چند ناموں کے جو تم اور تمہارے بڑوں نے رکھ لئے ہیں کچھ نہیں۔ ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے بندگی کرنے پر کوئی دلیل نہیں اتاری ہے حاکمیت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا حق نہیں ہے اسی نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا (صحیح) دین ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت نہیں جانتی" [40]۔

تفسیر 40 توحید ربوبیت سے توحید الوہیت ہی ثابت ہوتی ہے لہٰذا اس آیت میں شرک فی الحکم والعبادۃ پر رد کیا گیا ہے اور آیت میں اسماء سے مراد وہ اسمائے صفتیہ ہیں جن کے ساتھ مشرین نے اپنے معبودوں کو مشہور رکھا تھا جیسے مشکل کشاء یا غوث الاعظم اسی طرح کسی کو داتا کسی کو ہواؤں کو چلانے کی ذمہ داری سونپ دی ہے اسی طرح سورۃ الاعراف آیت 71 میں ذکر ہے البتہ وہاں لفظ نزل ہے: مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ: مَآ اَنْزَلَ: اور مَا نَزَّلَ: میں یہ نکتہ ہے کہ جو حق اللہ تعالیٰ نے ایک ساتھ اتاری ہے یا جو تھوڑا تھوڑا کر کے اتاری ہے ان دونوں میں سے کسی میں مشرکین کیلئے دلیل نہیں ہے، اسی طرح سورۃ النجم آیت 23 میں بھی ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ: حکم کی دو قسمیں ہیں: (۱) حکم تکوینی عالم کے نظام کو چلانا اور تصرف کرنا۔ (۲) حکم تشریعی ہے یعنی عبادت کا حکم امر و نہی حلال و حرام کے فیصلے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے امر حکم کرنے کے معنی میں ہے یا مراد امر بالتوحید ہے اور توحید کا حاصل یہ ہے کہ: اَلَّا تَعْبُدُوْٓا: آخر تک ہے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا ۖ وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِن رَّأْسِهِ ۚ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ ﴿٤١﴾

"اے میرے قید کے ساتھیوں! تم میں سے ایک کے (خواب کی تعبیر) کا معاملہ یہ ہے کہ وہ جیل سے آزادی پا کر بادشاہ کو شراب پلائے گا جبکہ دوسرے کو سولی دی جائے گی جس کے نتیجے میں پرندے اس کے سر کو (نوچ کر) کھائیں گے۔ جس معاملہ میں تم پوچھ رہے تھے اس کا فیصلہ اسی طرح ہو چکا ہے" [41]۔

تفسیر 41 اس واقعہ میں دعوت کا احسن طریقہ ذکر ہوا ہے۔ جب جیل کے دو ساتھیوں نے اپنے مقصد کیلئے یوسف علیہ السلام کی طرف رجوع کیا اور ان کے محتاج ہو گئے تو یوسف علیہ السلام نے پہلے انکو توحید اور رسالت کی دعوت دی توحید و رسالت کی دعوت کے بعد ان دونوں کے خواب کی تعبیر ذکر کر دیں جس میں ایک کیلئے سزا دوسرے کیلئے نجات ذکر کیا ہے اور قُضِيَ الْأَمْرُ: میں اشارہ ہے کہ یہ تعبیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو کہ یقینی ہے۔ لہٰذا خواب میں سر سے روٹی کھانے کا مطلب یہ ہوا کہ اس شخص کے سر کا گوشت پرندے نوچ کر کھائیں گے اور خواب اکثر تمثیلات میں سے ہوتا ہے۔

وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ ﴿٤٢﴾

"یوسف علیہ السلام نے اس شخص سے کہا جس کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ نجات پانے والا ہے کہ اپنے آقا کے سامنے میرا بھی تذکرہ کر لینا پس شیطان نے اس سے یوسف علیہ السلام کا تذکرہ بھلا دیا لہٰذا وہ کئی سال جیل میں رہے" [42]۔

تفسیر 42 اس آیت میں ایک ذمہ داری کا ذکر ہے جو یوسف علیہ السلام نے اس شخص کو سونپ دی تھی جن کے بارے یوسف علیہ السلام کو یقین تھا کہ یہ جیل سے چھوٹ جائیں گے۔ اور وہ یہ بات تھی کہ اپنے آقا سے میرا حال بیان کرو لیکن وہ بھول گیا اور وہ ذمہ داری یہ تھی کہ چونکہ آپ جیل میں میرے ساتھ رہ کر میرے دین اور میرے احوال پر باخبر ہو چکے ہیں یہ باتیں بادشاہ تک پہنچا دیں، یوسف علیہ السلام کی مراد اس سے دعوت توحید تھی۔ مگر شیطان نے اس شخص سے مسئلہ توحید کی دعوت اور دعوت اخلاق و کردار یوسف علیہ السلام کو بھلا دیا۔ لہٰذا یہ بات یوسف علیہ السلام کا جیل میں کئی عرصہ رہنے کا سبب بنی مفسرین کے اس مدت کے متعلق تین قول ہیں: سات برس بارہ یا چودہ برس ہے :لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا: ظَنَّ کی ضمیر یوسف علیہ السلام یا ساقی کی طرف راجع ہے اور ظن یقین کے معنی میں ہے کیونکہ وحی سے تعبیر کیا تھا جو کہ یقینی امر ہے: اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ : مراد جیل کے مکمل حالات جو معجزہ، دعوت توحید اور اخلاق نبوت وغیرہ پر مشتمل تھے: فَأَنسَاهُ

الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ: اس میں صحیح قول یہ ہے کہ ضمیر ساقی کی طرف راجع ہے جبکہ وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ: آیت 45 اس کیلئے قرینہ ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾

"اور چند سال بعد مصر کے بادشاہ نے (اپنے درباریوں سے) کہا کہ میں (خواب میں) دیکھتا ہوں کہ سات گائیں موٹی تازہ ہیں جنہیں سات پتلی دبلی گائیں کھا رہی ہیں نیز سات خوشے ہرے بھرے ہیں اور سات اور سوکھے ہوئے ہیں (اے درباریو!) اگر تم خواب کی تعبیر دے سکتے ہو تو میرے اس خواب کی تعبیر کر کے دکھاؤ" [43]۔

خلاصہ: اس آیت میں چھٹا مقام ہے جو آیت 57 تک ہے۔ اس مقام میں بادشاہ کا خواب دیکھنا۔ پھر اس خواب کی تعبیر سے مخلوق کا بے بس ہونا۔ یوسف علیہ السلام نے تعبیر اور تدبیر بیان کیں۔ پھر یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کا اقرار جو تمام خواتین اور زلیخا نے بادشاہ کی موجودگی میں کیا ہے پھر ان کی جیل سے رہائی اور مصر کا وزیر خزانہ مقرر ہونے اور عزت پا لینے کا تذکرہ ہے۔

تفسیر 43 اس آیت میں بادشاہ کا خواب اور اپنے مشاورین سے تعبیر کا مطالبہ ذکر ہے۔ چونکہ قحط کا تعلق مویشیوں اور فصلوں سے ہوتا ہے تو خواب میں بادشاہ نے ان دونوں چیزوں کو دیکھا ہے: تَعْبُرُوْنَ: خواب کی تعبیر کو تفسیر کہتے ہیں۔ یعنی ظاہر سے باطن کی طرف عبور ہوتا ہے۔ جبکہ تاویل عام ہے۔

قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾

"انہوں نے کہا کہ پریشان (خیال) قسم کے خواب (معلوم ہوتے) ہیں اور ہم خوابوں کے علم سے واقف بھی نہیں ہے" [44]۔

تفسیر 44 اس آیت میں شوریٰ والوں کا خواب کی تعبیر سے عاجز ہونا اور عزیز مصر کو تسلی دینے کا بیان ہے کہ یہ خیالی خواب ہے لہٰذا یہ تعبیر کے محتاج نہیں: اَضْغَاثُ: ضِغْثٌ: لکڑیوں کے اس گٹھے کو کہتے ہیں جو غیر مرتب ہو اور اس میں ایک قسم کی لکڑیاں نہ ہو بلکہ سوکھی اور خشک دونوں طرح لکڑیاں اس میں پائی جاتی ہوں اور بے معنی خیالی خواب کو بھی کہتے ہیں اَلْاَحْلَامِ: باطل خواب یا عام خواب مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اس خواب کی تعبیر سے بے بس کیا تا کہ یوسف

علیہ السلام کی طرف تعبیر کے محتاج ہو جائیں اور ان کی طرف رجوع کریں۔

39/39 وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُم بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿٤٥﴾

"ان دونوں قیدیوں میں سے جو ایک رہا ہو گیا تھا لمبے عرصہ کے بعد اس کو (یوسف علیہ السلام کی) بات یاد آئی اس نے کہا میں اس خواب کی تعبیر بتا دیتا ہوں پر مجھے یوسف علیہ السلام کے پاس جیل میں بھیج دو"[45]۔

تفسیر 45 اس آیت میں اس ساقی کا ذکر ہے جس نے رہائی پائی تھی اور پیغام یوسف، عزیز مصر کو پہنچانا بھول گئے تھے اور اب اس کو یاد آ گیا تو ارادہ کر لیا کہ ان سے خود ملاقات کر لے تاکہ ان سے تعبیر دریافت کریں تو اسلئے فرمایا فَأَرْسِلُونِ: اس نے جگہ اور طرف ذکر نہیں کیا تا کہ کسی اور کو نہ بھیجے۔

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَّعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٤٦﴾

"(لہٰذا جیل پہنچ کر یوسف سے کہنے لگے) اے یوسف جس کی ہر بات سچ پر مبنی ہے تم ہمیں اس (خواب) کا مطلب بتاؤ کہ سات موٹی گائیں ہیں جنہیں سات دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات خوشے ہرے بھرے ہیں اور سات خوشے اور ہیں جو سوکھے ہیں شاید میں واپس لوگوں کے پاس جاؤں (اور انہیں خواب کی تعبیر بتاؤں) تاکہ وہ بھی حقیقت جان لیں"[46]۔

تفسیر 46 اس آیت میں بادشاہ کے خواب کا ذکر ہے جو اس نے ساقی نے یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش کیا ہے اور لفظ: الصِّدِّيقُ: اس بات کی دلیل ہے کہ ساقی نے یوسف علیہ السلام کو ہر معاملہ میں سچا پایا تھا: يَعْلَمُونَ: خواب کی تعبیر یا مرتبہ یوسف کو جان لیں۔

ع قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا حَصَدتُّمْ فَذَرُوهُ فِي سُنبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ ﴿٤٧﴾

"یوسف علیہ السلام نے فرمایا تم سات سال تک مسلسل غلہ زمین میں اگاؤ گے اس دوران جو فصل کاٹو اس کو اس کی بالیوں میں رہنے دو البتہ اتنی مقدار جو تمہارے کھانے کے کام آئے (وہ نکال لیا کرو)"[47]۔

تفسیر 47 اس آیت میں خواب کی تعبیر کا ذکر ہے: سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ وَسَبْعِ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ: اس میں تدبیر کی تعلیم

کے ساتھ تعبیر بیان کی ہے اور اس میں حسن اخلاق کا ذکر ہے کہ ساقی کو اپنے پیغام پہنچانے میں تاخیر پر تنبیہ نہیں کی اور نہ ہی اسے ملامت کیا: تَزْرَعُوْنَ: یہ خبر ہے مگر حکم اور امر کے معنیٰ میں ہے: دَاَبًا: یعنی جیسے اور سالوں میں عادت کے مطابق زراعت کرتے ہو اسی طرح مزید سات سال زراعت کرو اور خوشوں میں رہنے کا مشورہ یا حکم اسلئے دیا تاکہ مختلف قسم کے آفتوں سے بچ جائے یعنی کیڑوں پرندوں وغیرہ سے محفوظ رہیں۔

ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿٤٨﴾

"پھر اس کے بعد سات سال ایسے آئیں گے جو بڑے سخت ہوں گے اور جو کچھ ذخیرہ ان سالوں کے لئے تم نے جمع کیا ہوگا اس کو کھا جائیں گے البتہ تھوڑا حصہ جو تم بیج ڈالنے کیلئے بچا سکو" [48]۔

تفسیر 48 اس آیت میں: سَبْعٌ عِجَافٌ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ: کی تعبیر ہے: يَاْكُلْنَ: ختم کرنا مراد ہے اور سالوں کی طرف نسبت بطریقہ توسیع کلام ہے جسکو مجاز بھی کہا جاتا ہے۔ فائدہ: اس میں دلیل ہے کہ کافر کا خواب سچ ہو سکتا ہے اور اس خواب کی سچائی میں معجزہ رسول بھی ثابت ہوا ہے: تُحْصِنُوْنَ: محفوظ رہنے کو کہا جاتا ہے۔ یعنی آئندہ سال کے بیج کیلئے اس میں سے محفوظ کرو۔

ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿٤٩﴾ ع

"پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں پر بارشیں ہوں گی اور اس میں وہ میوے نچوڑیں گے" [49]۔

تفسیر 49 اس آیت میں اس چیز کی خبر دینا ہے جو بادشاہ کے خواب میں نہیں تھی اور اسمیں یوسف علیہ السلام کی نبوت اور فضیلت پر دلیل ہے: وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ: عصیر انگور وغیرہ سے جوس نکالنا اور زیتون اور سرسو کا تیل نکالنا: يُغَاثُ: سے مراد وہ بارشیں جس سے قحط سالی ختم ہوتی ہے۔ ایسی بارش کو غیث کہا جاتا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾

"اور بادشاہ نے کہا اس (یوسف علیہ السلام) کو میرے پاس بلا لاؤ لہٰذا جب ایلچی اس کے پاس جا پہنچا تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا اپنے مالک کے پاس واپس چلے جاؤ اور اس سے ان عورتوں کا قصہ (حال) دریافت کرو جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے میرا رب ان کے مکر فریب سے خوب واقف ہے" [50]۔

تفسیر 50 اس آیت میں یوسف سے بادشاہ کے ملاقات اور اس کو جیل سے رہا کرانے کا ذکر ہے لیکن یوسف علیہ السلام نے شرط عائد کی کہ پہلے میری ذات پر لگائے گئے الزامات کی صفائی ہونی چاہئے تاکہ دعوت دینے سے قبل برات کا کھلے عام اظہار ہوجائے۔ یہ یوسف علیہ السلام کا اجتہاد تھا جبکہ ہمارے نبی ﷺ کا اجتہاد یہ تھا کہ جلدی نکلنا چاہئے تاکہ دعوت توحید کو عام لوگوں تک پہنچائے۔ اسلئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: لَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ مَا لَبِثَ يُوسُفُ لَأَجَبْتُ الدَّاعِيَ: (صحیح بخاری کتاب احادیث آلیاء حدیث 3372، صحیح مسلم حدیث 1233) اگر میں جیل میں قید ہوتا اور میرے لئے رہائی کا بلاوا آتا تو میں اس بلاوے کو قبول کر لیتا: مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ: یعنی انہوں نے اپنے ہاتھوں کو کیوں کاٹ ڈالا تھا۔ ان عورتوں کا خصوصی ذکر اسلئے کیا ہے کہ وہ عصمت یوسف علیہ السلام کی گواہ ہیں اور زلیخا کی جانب سے آیت 32 میں لفظ: فَاسْتَعْصَمَ: گزرا ہے اور یہ بھی بات واضح ہوگیا کہ گواہ سے ضرور دریافت کرنا چاہئے۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدتُّنَّ يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٥١﴾

"بادشاہ نے عورتوں سے کہا تمہارا کیا قصہ تھا جب تم نے یوسف کو ورغلانے کی کوشش کی ان سب عورتوں نے کہا پاکی ہے اللہ کیلئے ہم کو ان میں ذرا بھی برائی معلوم نہیں ہوئی عزیز کی بیوی نے کہا کہ اب سب پر حقیقت آشکارا ہوچکی ہے میں نے ہی اس کو اس کے نفس کے بارے میں ورغلانے کی کوشش کی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بالکل سچے ہیں" [51]۔

تفسیر 51 اس آیت میں بادشاہ کی موجودگی میں ان عورتوں کی اور بادشاہ کی بیوی کی گواہی مذکور ہے جو یوسف علیہ السلام کی

یا لکدامنی پر واضح دلیل ہے: قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ: خطب بہت بڑی خبر اور واقعہ کو کہا جاتا ہے یعنی تمہارے یوسف علیہ السلام سے اس قسم مطالبہ کرنے کا کیا سبب تھا۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾

"یہ اسلئے کہ وہ جان لے کہ اس کی غیر موجودگی میں میں نے کوئی خیانت نہیں کی ہے اور اللہ تعالی خیانت کرنے والوں کو کامیابی نہیں دیتا ہے" [52]۔

تفسیر 52 یہ زلیخا کے کلام میں داخل ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے یوسف علیہ السلام کی غیر موجودگی میں اس پر کوئی طعن و تشنیع یا الزام نہیں لگایا ہے اور نہ ہی اس پر حقیقت میں کوئی بہتان ہے: وَأَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ: اس میں دلیل ہے کہ زلیخا ذات باری تعالی کا اقرار کرتی تھی مگر جرم شرک میں مبتلا تھی۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

"اور مجھے اپنے نفس کے متعلق یہ دعوی نہیں کہ وہ بالکل پاک صاف ہے حقیقت یہ ہے کہ نفس تو گناہوں کی تلقین کرتا ہی رہتا ہے البتہ میرا رب جس پر رحم فرمادے تو اور بات ہے بیشک میرا رب بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے" [53]۔

تفسیر 53 یہ بھی زلیخا کے کلام میں شامل ہے۔ فائدہ: بعض مفسرین نے ان دونوں آیتوں کو یوسف علیہ السلام کا کلام قرار دیا ہے مگر یہ درست نہیں ہے اسلئے کہ اس وقت تک یوسف علیہ السلام جیل سے رہا نہیں ہوئے تھے۔ امام ابن کثیرؒ، قرطبیؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے یہی لکھا ہے۔ فائدہ ۲: اس آیت میں نفس کی اقسام کی طرف اشارہ ہے یعنی نفس میں تین قسم کی صفات پائی جاتی ہیں: اول قسم أَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ: یہ صراحتاً ذکر ہے۔ دوم نَفْسٌ لَوَّامَةٌ: اس کی طرف غفور میں اشارہ ہے۔ سوم نَفْسٌ مُطْمَئِنَّةٌ: اس کی طرف رحیم میں اشارہ ہے: إِلَّا مَا: من کے معنی میں ہے: رَحِمَ: سے عصمت مراد ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿٥٤﴾

"اور بادشاہ نے کہا اس کو میرے پاس لیکر آؤ میں اس کو اپنا خاص (معاون) بناؤں گا لہٰذا جب اس کو بادشاہ کے پاس لے گئے اور اس سے بادشاہ نے کلام کیا تو فرمایا کہ آج سے ہمارے پاس تمہارا بڑا مرتبہ ہے اور تم پر مکمل اعتماد کیا جائے گا" [54]۔

تفسیر 54 اس آیت میں بادشاہ کا یوسف علیہ السلام کو دوبارہ بلانے کا ذکر ہے اور جب بادشاہ کو انکی پاکدامنی اور صبر کا علم ہوا تو انہوں نے یہ لفظ مزید فرمایا کہ: أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي : جو عزت و اکرام کے الفاظ ہیں اور جب یوسف علیہ السلام تشریف لے آئے تو انکی باتوں سے بادشاہ پر اثر ہوا اسلئے اسکو اپنے ساتھ اقتدار میں حصہ دار بنایا۔

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿٥٥﴾

"یوسف نے فرمایا آپ مجھے ملک کے خزانوں کے انتظام پر مقرر کیجئے یقین کیجئے کہ مجھے حفاظت کرنا خوب آتا ہے اور میں اس کام کا پورا علم رکھتا ہوں" [55]۔

تفسیر 55 اس آیت میں منصب کا تعین کیا ہے۔ کیونکہ بادشاہ نے اپنی قربت اور عام مرتبے سے انہیں نوازا تو پھر انہوں نے انتخاب منصب خود کیا ہے لہٰذا جو لوگ حصول اقتدار کیلئے اس کو دلیل بناتے ہیں تو وہ غلط ہے۔ یوسف علیہ السلام نے شروع ہی سے نہیں مانگا تھا۔ اور ہماری شریعت میں اقتدار کا حصول جو چاہتا ہے اسکو نہیں دینا چاہئے کیونکہ اس کے حصول سے منع آیا ہے (صحیح بخاری کتاب الاحکام حدیث 7149, 2261) إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ : اس منصب کے تعین کا سبب بیان کیا ہے لہٰذا یہ نفس کا تزکیہ نہیں ہے کیونکہ خود سے تزکیہ نفس کرنا ہماری شریعت میں منع ہے۔ نیز اگر تزکیہ ہو تو انبیاء کرام کیلئے اس دلیل کے ذریعے جائز ہے کہ: فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ : یہ مقدم کلام ہے جو کہ سورۃ النجم آیت 32 میں واقع ہے۔ اور یہ بھی سبب ہے کہ نبی پر اپنی امت کی خیر خواہی واجب ہے اسلئے یوسف علیہ السلام نے اس منصب کو چنا تھا۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ ۚ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿56﴾

"اور اسی طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو ملک میں ایسا اقتدار دیا کہ جہاں چاہے اپنا ٹھکانا بنائیں ہم اپنی رحمت جسکو چاہتے ہیں پہنچاتے ہیں اور نیک لوگوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے" [56]۔

تفسیر 56 اس آیت میں (تمکین) سلطنت کے انعام کا ذکر ہے جو مصیبتوں پر صبر کے بعد ملا ہے: وَكَذٰلِكَ: اس میں گزرے ہوئے انعام کی طرف اشارہ ہے کہ کنویں سے نکال کر مصر میں پہنچانا اور بادشاہ کے دل میں ان کی محبت پیدا کرنا مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ: آیت 21 میں اس تمکین کیلئے ایک ذریعے کا ذکر تھا جو کہ عزیز مصر کے گھر میں جگہ دینا ہے اور اس آیت میں مصر کی زمین میں جگہ دینے کا ذکر ہے اسلئے بعد میں فرمایا کہ: يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ: اس میں عام لوگوں کو خوشخبری دی جارہی ہے کہ جو مصیبتوں پر صبر کرے اور اللہ تعالیٰ کے نافرمانیوں سے دامن کو بچائے تو ان کو اللہ تعالیٰ نوازتا ہے۔

وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿57﴾ ع

"اور آخرت کا اجر ان لوگوں کیلئے کہیں زیادہ بہتر ہے جو ایمان لائے اور تقویٰ پر کاربند رہتے ہیں" [57]۔

تفسیر 57 سابقہ آیت میں دنیاوی انعام کا ذکر ہوگیا تو اس آیت میں آخرت کے انعام کا ذکر ہے تاکہ زہد فی الدنیا یعنی دنیا سے بے رغبتی ہوجائے: خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا: اس میں اشارہ ہے آخرت کا خیر ایمان وتقویٰ پر حاصل ہوتا ہے جبکہ دنیا کا خیر عام ہے مومن اور غیر مومن دونوں کو ملتا ہے۔ فائدہ: محققین مفسرین نے لکھا ہے کہ اس دوران عزیز مصر مرگیا یا معزول کیا گیا اور یوسف علیہ السلام اس کی جگہ بادشاہ مقرر کئے گئے اور بادشاہ مصر نے ایمان قبول کیا اور اس خاتون زلیخا کا نکاح یوسف سے ہونے پر کوئی ثبوت نہیں ہے یا اس کی دوبارہ جوانی کا پلٹنا وغیرہ صحیح روایت میں ثابت نہیں ہے۔

وَجَآءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ ﴿٥٨﴾

"اور جب قحط سالی آئی تو یوسف علیہ السلام کے بھائی اس کے پاس پہنچے تو یوسف علیہ السلام نے انہیں پہچان لیا اور وہ یوسف کو نہیں پہچانے" [58]۔

خلاصہ: اس آیت سے آیت 68 تک ساتواں مقام ہے۔ پہلے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے آنے کا ذکر ہے جب وہ لوگ پہلی مرتبہ مصر میں آئے تھے پھر یوسف علیہ السلام کا دوبارہ بھائیوں کے آنے کیلئے سبب بنانے کا ذکر ہے جو کہ ان سے اپنے بھائی بنیامین کو بلانے مطالبہ ہے اور ان کو غلہ میں رقم بھی واپس رکھ دی۔ پھر والد کی طرف سے اولاد کو تعلیم کا ذکر ہے دوبارہ مصر سے غلہ خریداری کی تعلیم ہے والد کی طرف سے تاکہ بغیر کسی نقصان کے غلہ حاصل کرلیں۔ جب قحط کا زمانہ شروع ہوا قحط کا اثر کنعان تک پہنچ گیا جبکہ یوسف علیہ السلام نے اس کیلئے تدبیر کرتے ہوئے (ذخیرہ) اسٹاک اسٹور بنا رکھا تھا اور مصر میں بہترین تدبیر سے تقسیم شروع کی تھی اور طریقہ یہ تھا کہ حاضر شخص کو ایک کیل (وزن) غلہ دیتے تھے اور قیمت بھی مناسب مقرر کر رکھی تھی۔ جب یعقوب علیہ السلام کو خبر پہنچ گئی تو انہوں نے اپنے دس بیٹوں کو روانہ کیا۔

تفسیر 58 اس آیت میں ان کے آنے کا ذکر ہے جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو یوسف علیہ السلام نے فراست نبوت سے پہچان لیا جبکہ بھائیوں کی فراست کم تھی تو انہوں نے نہیں پہچانا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کا بھائی یوسف علیہ السلام کہ یوسف علیہ السلام اس مقام تک پہنچ پائیں گے۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿٥٩﴾

"اور جب یوسف علیہ السلام نے ان کا سامان تیار کیا تو ان سے کہنے لگا (آئندہ) اپنے باپ شریک بھائی کو لے آؤ کیا تم یہ نہیں دیکھ رہے ہو کہ میں پیمانہ بھر بھر کر دیتا ہوں اور میں بہترین مہمان نواز بھی ہوں" [59]۔

تفسیر 59 چونکہ یوسف علیہ السلام سے انہوں نے غائب بھائی کیلئے راشن اور غلہ کا مطالبہ کیا تو انہوں نے ان سے عرض کیا کہ اپنے بھائی کو آئندہ کیلئے ساتھ لیکر حاضر ہونا کیونکہ غائب کو حصہ نہیں دیا جاتا اور انکو بھائی حاضر کرتے کیلئے ان لفظوں میں ترغیب دی: أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ: کہ میں مہمان نواز بھی ہوں اور وزن بھی صحیح بھر کر دیتا ہوں مِنْ أَبِيكُمْ: چونکہ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ ہمارا علاتی بھائی ہے (ہمارا باپ شریک بھائی ہے) وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ: تجہیز مسافر کیلئے سامان تیار کرنے کو کہتے ہیں اسلئے میت کی تیاری کو تجہیز وتکفین کہتے ہیں۔ نیز دلہن کیلئے رخصتی کے وقت جو سامان

دیا جاتا ہے اس کو بھی جہیز کہتے ہیں (اگرچہ یہ رسم ہندوں سے مسلمانوں میں منتقل ہوا ہے)

فَاِنۡ لَّمۡ تَاۡتُوۡنِیۡ بِهٖ فَلَا كَيۡلَ لَـكُمۡ عِنۡدِیۡ وَلَا تَقۡرَبُوۡنِ ۝۶۰

"اگر تم اسکو میرے پاس نہیں لیکر آئے تو تمہیں غلہ نہیں دیا جائیگا اور تم میرے قریب بھی نہ آنا" [60]۔

تفسیر 60 اس آیت میں بھی انتہائی تاکید اور تخویف کے ساتھ بھائی کو حاضر کرنے کی ترغیب ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر تم انہیں ساتھ نہ لاسکیں تو آئندہ آپ لوگوں کو بھی راشن نہیں ملے گا اور نہ ہی مصر کی سرزمین پر داخل ہو سکیں گے کیونکہ تب تم لوگ جھوٹے اور دھوکے باز ثابت ہوں گے۔ فائدہ: یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائی بنیامین کا مطالبہ کرنا اور اسکو حاضر کرنے اور اپنے ساتھ روکنے کی تدبیر کرنا یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا یعقوب علیہ السلام کو ان سب باتوں کی وجہ سے تکلیف پہنچی تھی۔

قَالُوۡا سَنُرَاوِدُ عَنۡهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوۡنَ ۝۶۱

"انہوں نے کہا ہم اس کے بابت اسکے باپ کو منالینگے اور یقیناً ہم ایسا کرنے والے ہیں" [61]۔

تفسیر 61 اس آیت میں بنیامین کے حاضر کرنے کے بارے میں اسکے بھائیوں کا وعدہ ذکر ہے جو انہوں نے مجبوری کی وجہ سے کیا تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ پھر غلہ نہیں ملے گا۔ سَنُرَاوِدُ: وہ تدبیر اور حیلے کے ساتھ طلب کرنے کو کہتے ہیں اس وجہ سے کہ بغیر تدبیر کے باپ اسکو انکے حوالے نہیں کرتے۔

وَقَالَ لِفِتۡيٰنِهِ اجۡعَلُوۡا بِضَاعَتَهُمۡ فِىۡ رِحَالِهِمۡ لَعَلَّهُمۡ يَعۡرِفُوۡنَهَاۤ اِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰٓى اَهۡلِهِمۡ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ۝۶۲

"اور یوسف علیہ السلام نے اپنے خدمتگاروں سے کہا کہ انکی پونجی انکے سامان میں رکھ دو تاکہ وہ اسکو پہچان لے جب وہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ جائے شاید کہ یہ واپس آجائے" [62]۔

تفسیر 62 اس آیت میں اس طریقے کا ذکر ہے جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو حاضر کرنے کیلئے اختیار کیا اور وہ طریقہ یہ تھا کہ اپنے خادموں سے کہا کہ انکی پونجی انکے سامان میں واپس رکھ دو۔ لَعَلَّهُمۡ يَعۡرِفُوۡنَ: اس کی ایک توجیہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ اہل یعقوب بغیر قیمت کے راشن وصول نہیں کرتا اور جب یعقوب علیہ السلام کو یہ معلوم تھا کہ قیمت کے ادائیگی کے لیے اپنے لڑکوں کو واپس بھیج گا تو ساتھ میں بنیامین کو بھی بھیج دے گا۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کو کسی ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ یعقوب علیہ السلام کے گھر میں اور مال نہیں اور دوبارہ آنے کی

طاقت نہیں رکھتے لہٰذا یوسف علیہ السلام نے احسان کی وجہ سے یہ رقم واپس لوٹا دی ہے۔ اس قسم کا احسان اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حاکموں کیلئے جائز ہے۔ اس مسئلے کے جواز پر امام بخاری نے (باب) عنوان قائم کیا ہے کہ منتظم ومتولی اپنے مستحقین، رشتہ داروں کے ساتھ بیت المال کے وقف مال سے تعاون کر سکتا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الاحکام باب رزق الحکام والعاملین دلیلھا حدیث 7163) اس قیمت کو خفیہ دینے کی حکمت یہ تھی کہ یعقوب علیہ السلام یعنی والد محترم کا گھرانہ شرافت و بزرگی کی وجہ سے اس قسم کے ہدیے قبول نہیں کرتا ہے: لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ يَعْرِفُونَ: کیلئے غایہ یعنی انتہا ہے۔

فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا أَخَانَا نَكْتَلْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٦٣﴾

"لہٰذا جب واپس وہ اپنے والد کے پاس پہنچے تو کہنے لگے ابا جان ہم سے تو آئندہ کیلئے غلہ روک دیا گیا لہٰذا آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی بنیامین کو بھیج دیں تاکہ ہم پھر غلہ لیکر آئیں اور یقین رکھیں ہم اپنے بھائی کی پوری پوری حفاظت کریں گے" [63]۔

تفسیر 63 جب دوبارہ غلہ بھی لانا لازم تھا اور اس کیلئے شرط بھی بنیامین کی لگائی گئی تھی تو سامان کھولنے سے پہلے والد سے بھائی کا مطالبہ کیا اور اس کی وجہ بھی بتا دی کہ: مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ: اور ممانعت بھائی لانے سے مشروط کی گئی تھی۔ نَكْتَلْ: یہ لفظ اسلئے استعمال کیا گیا کہ سارے بھائیوں کا غلہ بنیامین کے لانے کے ساتھ مشروط کیا تھا: وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ: اس میں والد کے ساتھ بھائی کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔

قَالَ هَلْ آمَنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمِنتُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِن قَبْلُ ۖ فَاللَّهُ خَيْرٌ حِفْظًا ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿٦٤﴾

"والد نے فرمایا کیا میں تم پر اس کے بارے میں ویسا اعتبار کروں جس طرح اس کے بھائی (یوسف) کے متعلق کیا تھا؟ خیر اللہ تعالیٰ سب سے بڑھ کر نگہبان ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے" [64]۔

تفسیر 64 آیت کا مطلب یہ ہے کہ مجبوراً یعقوب علیہ السلام نے انکا مطالبہ مان لیا اسلئے کہ راشن کی اشد ضرورت تھی اور یہ بھی سبب ہوسکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسف علیہ السلام جیسا حسد بنیامین سے نہیں کرتے تھے۔ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے واقعہ پر قیاس کیا کہ میں نے اس کے متعلق بھی تمہارے اوپر اعتماد کیا تھا اور ابھی بھی اسی طرح تم پر اعتماد کر رہا ہوں البتہ پہلے تمہارے حوالے کیا تھا اب اللہ تعالیٰ کے سپرد کر رہا ہوں: فَاللَّهُ خَيْرٌ حَافِظًا: یہ ان کے اس قول کے مقابل فرمایا جب انہوں نے کہا: وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ اور وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ: خیر کیلئے علت ہے۔

وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ۖ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي ۖ هَٰذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا ۖ وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ۖ ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ ﴿٦٥﴾

"اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال ان کو واپس لوٹا دیا گیا ہے وہ کہنے لگے: ابا جان! ہمیں اور کیا چاہئے یہ ہمارا مال ہے جو ہمیں واپس کیا گیا ہے اور (اس مرتبہ) ہم گھر والوں کیلئے اور غلہ لے آئیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا غلہ زیادہ لے کر آئیں گے اس طرح یہ زیادہ غلہ بڑی آسانی سے مل جائے گا" [65]۔

تفسیر 65 جب ان کو والد کی طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا تو اب سامان کھول دیا تو اس میں انکو اپنی رقم ملی جس پر خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم اور کیا چاہتے ہیں: مَا نَبْغِي: اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر ہم اور کیا احسان کا مطالبہ کریں کہ ہمکو غلہ بھی پورا دیا اور ہماری قیمت بھی ہمیں لوٹا دی گئی ہے۔ اس معنی میں ما استفہامیہ ہے جو برائے تعجب ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ اے والد محترم! ہم آپ سے مزید رقم نہیں چاہتے جو ہمیں رقم واپس کی گئی ہے یہی کافی ہے۔ اس معنی میں (ما) نافیہ ہے: ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ: ذلک میں بھائی کے کیل (جو ایک اونٹ کا بوجھ ہے) کی طرف اشارہ ہے کہ بادشاہ کیلئے یہ آسان کام ہے یا سارے راشن کی طرف اشارہ ہے کہ راشن تھوڑا ہے تو پھر یسیر قلیل کے معنی میں ہے۔

قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّىٰ تُؤْتُونِ مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ ۖ فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿٦٦﴾

"والد نے کہا کہ میں اس بنیامین کو تمہارے ساتھ ہرگز نہیں جانے دوں گا جب تک تم اللہ تعالیٰ کے نام پر مجھ سے یہ عہد نہ کر لو کہ تم اسے ضرور میرے پاس واپس لیکر آؤ گے اِلَّا یہ کہ تم (حقیقت میں) بے بس ہو جاؤ چنانچہ جب انہوں نے والد کو عہد دیدیا تو والد نے کہا جو قول اقرار ہم کر رہے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نگہبان ہے" [66]۔

تفسیر 66 اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں سے منع نہیں کیا ہے صرف ان سے مضبوط (قوی) وعدہ طلب کیا تھا جب انہوں نے وعدہ کر لیا تو یعقوب علیہ السلام نے بطور تاکید فرمایا کہ: قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ: اور: إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ: کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم سب کسی حادثہ (واقع) میں گھیر لئے جاؤ تو پھر کوئی بات نہیں کہ بنیامین بھی تمہارے ساتھ گرفتار ہو جائے البتہ اگر تم سب سالم ہو کر گھر پلٹ آؤ اور صرف بنیامین گھیر لیا جائے تو میں یہ

تسلیم نہیں کروں گا۔ وکیل۔ اللہ تعالیٰ کیلئے بطور صفت اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ذات جس پر توکل بھروسہ کیا جائے یا یہ حافظ یعنی حفاظت کرنے والے کے معنی میں ہے: مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ: یعنی جب عہد وعدہ میں اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے تو اس میں مزید قوت پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کو بطور تاکید ذکر کیا ہے۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۞

"اور کہا کہ میرے بیٹو! تم سب ایک دروازے سے شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی مشیت سے نہیں بچا سکتا اللہ تعالیٰ کے سوا حکم کسی کا نہیں چلتا اسی پر میں نے بھروسہ کر رکھا ہے اور جنہیں بھروسہ کرنا ہو تو انہیں چاہئے کہ اسی پر بھروسہ کریں" [67]۔

تفسیر 67 جب انہوں نے مصر جانے کا ارادہ کیا تو یعقوب علیہ السلام نے انکو طریقہ اور ادب سکھایا کہ ایک ہی راستے اور دروازے سے مصر میں داخل مت ہونا دروازوں سے مراد شہر کے راستے یا بڑے مین گیٹ ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ نظر بد سے حفاظت مقصود تھی کیونکہ یہ ایک جماعت ہے اور اچھے خوبصورت حیثیت میں ہے اور یہ بات صحیح حدیث سے ثابت ہے (صحیح مسلم کتاب السلام حدیث 2188، موطا امام مالک 3463، ابن ماجہ 3508) کہ نظر بد حقیقت رکھتا ہے جس کیلئے حدیث میں مسنون دعائیں اور نظر توڑنے کیلئے صحیح طریقے آئے ہیں اور دم اور رقیات وارد ہیں۔ البتہ نظر بد سے بچنے کیلئے جو غیر شرعی طریقے ٹونے ٹوٹکے کئے جاتے ہیں جیسا کہ (وشم) چہرے میں سرمہ گھودنا وغیرہ یہ منع ہے۔ ابن قتیبہ اور خازن نے لکھا ہے کہ نظر لگانے والے کی نظر کے وقت کچھ جراثیم نکلتے ہیں تو جس پر نظر پڑتی ہے اس پر لگ جاتے ہیں جس سے وہ بیمار ہوتا ہے اور یہ سب کچھ قدرت الٰہی سے ہوتا ہے۔ دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ یہ بڑی جماعت ہے اور دوبارہ مصر میں آئے ہیں ایسا نہ ہو کہ مصر والے حسد کر کے ان کے خلاف کوئی تدبیر سوچیں کہ یہ لوگ ہمارا غلہ ختم کر دیں گے تو یہ والد محترم نے تدبیر بتائی: وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ: یہ اس بات پر واضح دلیل ہے کہ انبیاء کرام کسی سے کوئی تکلیف یا مصیبت نہیں ہٹا سکتے ہیں اور یہ حال تو انبیاء کی زندگی میں ہے تو اولیاء کیا کر سکتے ہیں اور جب فوت ہو جائے تو انبیاء ہوں یا اولیاء کسی کی کیا مدد کریں گے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ: حکم دو قسم کا ہے: (۱) حکم تشریعی یعنی حلال وحرام مقرر کرنا شریعت سازی کرنا اور (۲) حکم تکوینی یعنی تصرفات اور اختیارات لہٰذا اس میں کسی کا حق نہیں ہے یہ

دونوں حکم اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہیں اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ: اس آیت میں تدبیر کے بعد توکل کا ذکر ہوا ہے اس میں اشارہ ہے کہ توکل اسباب کے استعمال کرنے کے ساتھ ہے لہذا توکل اور اسباب کوئی متضاد چیزیں نہیں ہیں۔

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ ۚ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾

"اور جب وہ (مصر میں) اسی طرح داخل ہوئے جس طرح ان کے والد نے فرمایا تھا تو یہ عمل اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ان کو ذرا بچانے والا نہیں تھا لیکن یعقوب علیہ السلام کے دل میں ایک خواہش تھی جو اس نے پوری کی یقیناً وہ ہمارے سکھائے ہوئے علم کے حامل تھے لیکن اکثر لوگ (معاملے کی حقیقت) کو نہیں جانتے" [68]۔

تفسیر 68 اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ تدبیر انسان کی تقدیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی: مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یعقوب علیہ السلام کے اس قول کی تصدیق ہے کہ انہوں نے فرمایا جیسا گزر رہی ہوئی آیت میں ہے: وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ: تاکہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے جو فرمایا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کی مشیت سے تمہیں بچا نہیں سکتا ہوں وہ حقیقت ہے کوئی یہ نہ سمجھے کہ انہوں نے شاید یہ کلام عاجزی و انکساری کیلئے فرمایا ہوگا: وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ: یہاں پر علم سے مراد یہ ہے کہ تدبیر سے تقدیر نہیں بدلتی اگر چہ تدبیر شرعی ضروری اور جائز حکم ہے: إِلَّا حَاجَةً اس سے قبل فعل مقدر ہے یعنی: أَظْهَرَ حَاجَةً: اور بعد میں: قَضَاهَا: اس کیلئے تفسیر ہے: لَا يَعْلَمُونَ: اس میں وہ لوگ مراد ہیں جو تدبیر اور اسباب کو اصل سمجھتے ہیں یعنی مؤثر حقیقی قرار دیتے ہیں۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ ۖ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٩﴾

"اور جب وہ (مصر میں) یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے (سگے) بھائی کو اپنے پاس خاص جگہ دی (اور انہیں) بتایا کہ میں تمہارا بھائی ہوں لہذا تم ان باتوں پر رنجیدہ نہ ہونا جو یہ (سارے بھائی) کرتے رہے ہیں" [69]۔

تفسیر 69 اس آیت سے آیت 79 تک آٹھواں مقام ہے۔ خلاصہ: اس مقام میں یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس بلانے اور اس کو تدبیر کے ذریعے روک لینے کا ذکر ہے جو کہ اس کے سامان میں سقایہ پیمانہ کا برتن رکھتا ہے پھر

اس پر تہمت لگانے کا ذکر ہے جس کی وجہ سے ایک سال کیلئے اس کو اپنے پاس رکھا۔ اور بھائیوں کی بیزاری کا اعلان اور بھائیوں کا یوسف علیہ السلام پر چوری کے الزام کا ذکر ہے پھر بھائیوں کا یوسف علیہ السلام سے بنیامین چھڑانے کا مطالبہ اور یوسف علیہ السلام کا ان کو جواب دینا مذکور ہے: فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ: اس میں اشارہ ہے کہ بنیامین اور یوسف علیہ السلام کی جدائی کے بعد بھائیوں نے تکلیفیں پہنچائی ہیں۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ۝

"پھر جب یوسف علیہ السلام نے انکا سامان تیار کر دیا تو پانی پینے کا پیالہ اپنے سگے بھائی کے سامان میں رکھوا دیا پھر ایک منادی نے پکار کر کہا کہ اے قافلے والو! تم چور ہو" [70]۔

تفسیر 70 السقایۃ اور صواع۔ ایک برتن کے دو نام ہیں اس برتن میں شراب بھی پیا کرتے تھے اور غلے کے لیے بطور پیمانہ بھی اس کو استعمال کرتے تھے: إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ: اس میں ایک توجیہ یہ ہے کہ منادی نے اپنی طرف سے یہ آواز دی ہے اور اپنے غالب گمان کی وجہ سے ان پر چوری کی تہمت لگائی تھی۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ (نداء) آواز انہوں نے حکم یوسف علیہ السلام سے لگائی تھی۔ اور: إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ: توریہ کے طور پر کہا ہے یعنی ھمزہ استفہامیہ (ء) اس میں حذف ہوا ہے یا یہ کہ تم نے یوسف علیہ السلام کو ان کے والد سے چوری کیا ہے لیکن پہلی توجیہ بہتر ہے۔

قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ ۝

"انہوں نے ان کی طرف مڑ کر پوچھا کہ تمہاری کیا چیز تم سے گم ہوگئی ہے" [71]۔

تفسیر 71: چونکہ انہوں نے اپنے خیال کے مطابق چوری نہیں کی تھی اسلئے سامنے ہو کر کہنے لگے کہ تمہاری کیا چیز (گم) چوری ہوئی ہے: تَفْقِدُونَ: فُقْدَان: سے لیا گیا ہے جو گم ہونے اور پالینے دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ۝

"انہوں نے کہا ہمیں بادشاہ کے پیمانے کا برتن نہیں مل رہا ہے اور جو شخص اسے لاکر دیگا تو اس کو ایک اونٹ کا بوجھ انعام میں دیا جائے گا اور میں اس (انعام کے دلوانے) کا ضامن ہوں" [72]۔

تفسیر 72 اس آیت میں جائز امور میں انعام مقرر کرنے کی دلیل ہے اور کفیل ضامن بن جانے کی بھی دلیل ہے۔ سوال: چور کیلئے انعام اور ضامن بن جانا تو جائز نہیں ہے۔ جواب: یہ حکم یوسف علیہ السلام کی طرف سے تھا اور ان کو معلوم تھا کہ

انہوں نے چوری نہیں کی ہے اسلئے سَارِقٌ نہیں فرمایا بلکہ جَآءَ بِهٖ فرمایا ہے۔ جواب: ۲ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ: اس سے مراد یہ ہے کہ جو ہمیں یہ خبر دے کہ پیالہ فلاں کے پاس ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِیْنَ ۝

"وہ بھائی بولے اللہ کی قسم آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہم زمین میں فساد پھیلانے کیلئے نہیں آئے تھے اور نہ ہی ہم چوری کرنے والے لوگ ہیں" [73]۔

تفسیر 73 اس آیت میں انکا اپنی ذات سے فساد اور چوری کی برات کا ذکر ہے تَاللّٰهِ: تاء قسم میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ مختص ہے یہ تعجب اور مبالغہ کیلئے استعمال ہوتی ہے۔لَقَدْ عَلِمْتُمْ: اس میں اشارہ ہے کہ مصر میں ان سے کوئی چوری، ظلم اور خیانت صادر نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اپنے اونٹوں کے منہ باندھ لیا کرتے تھے تاکہ کسی قسم کے فصل اور گھاس کو نہ کھا سکیں۔

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِیْنَ ۝

"انہوں نے کہا کہ اگر تم لوگ جھوٹے (ثابت) ہوئے تو اس کی کیا سزا ہوگی" [74]۔

تفسیر 74 انہوں نے کہا کہ تم جھوٹے ثابت ہوئے تو چور کی سزا کیا ہوگی۔ یہ حقیقت میں یوسف علیہ السلام کا بتایا ہوا سوال تھا تاکہ اپنے بھائی کو روک سکے ورنہ مجرم سے سزا کا تعین نہیں پوچھا جاتا ہے۔ اور اس میں انکا وہم بھی ختم کرنا ہے کہ تم لوگ ہمیں جان بوجھ کر چور ثابت کرتے ہو تاکہ اپنے قانون کے مطابق ہمیں سزا دیں۔

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ۝

"انہوں نے کہا اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے کجاوے میں وہ (پیالہ) مل جائے تو وہی اس کی سزا ہے اور جو لوگ (چوری) ظلم کرتے ہیں ہم ان کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں" [75]۔

تفسیر 75 یعنی یعقوب علیہ السلام کے دین میں چور کیلئے یہ سزا تھی کہ جس کی چوری کرتے اس کی ایک سال غلامی کرتے۔ جبکہ قانون مصر میں چور سے دگنا مال بطور (تاوان) سزا واپس لیا جاتا تھا: اَلظّٰلِمِیْنَ: اس سے مراد چور کی ہے اور یعقوب علیہ السلام کی شریعت ودین میں جو سزا تھی اس کو وحی کے ذریعے سے پسند کیا لہٰذا یہ قانون، قانونِ مصر کیلئے ناسخ ہوا یا پھر

مطلب یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد والد کے دین پر عمل کی پابند یعنی مکلف تھی وہ قانون مصر کے مکلف نہیں تھے اسلئے ان کو ان کے دین وشریعت کے مطابق سزا دی۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾

"لہٰذا یوسف علیہ السلام نے اپنے (سگے) بھائی کے تھیلے سے پہلے دوسرے بھائیوں کے تھیلے کی تلاش شروع کی پھر پیالہ کو اپنے (سگے) بھائی کے تھیلے سے برآمد کیا اس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کی خاطر یہ تدبیر کی۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت نہ ہوتی تو یوسف علیہ السلام کیلئے یہ جائز نہیں تھا کہ قانون مصر کے مطابق اپنے بھائی کو روک لیتے اور ہم جس کو چاہتے اس کے درجے بلند کر لیتے ہیں اور جتنے علم والے ہیں ان سب پر ایک بڑا علم رکھنے والا موجود ہے" [76]۔

تفسیر 76 پہلے دیگر بھائیوں کے کجاوے اسلئے کھول دیئے کہ کہیں وہ گمان نہ کریں کہ انہوں نے جان کر یہ پیالہ بھائی کے تھیلے میں رکھا تھا: كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ: اس میں اس سوال کا جواب ہے کہ اس طریقے سے تو یوسف علیہ السلام نے والد کو تکلیف پہنچائی اور بھائی کو بدنام کیا جو دونوں کام شرعاً ناجائز ہیں؟ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تدبیر یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سکھائی تھی۔ یوسف نے خود سے ایسا نہیں کیا تھا۔ دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ: اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ: کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی چاہت اور شریعت سے ہوا ہے۔ نیز اگر کوئی اس کو دلیل بنائے کہ ہمارے لئے بھی اس طرح حیلے کرنا جائز ہے تو اس لفظ میں جواب دیا گیا کہ لِيُوْسُفَ: یہ تدبیر صرف یوسف کیلئے خاص تھی اس میں لام برائے تخصیص ہے اور اس پر غیر شرعی حیلے قیاس کرنا درست نہیں۔ اور حیلہ اسقاط وغیرہ تو کسی دلیل شرعی سے ثابت ہی نہیں ہے: وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ: اگر کوئی سوال کریں کہ اللہ تعالیٰ بھی علم والا ہے تو کیا اللہ کے اوپر بھی کوئی علم والا ہے؟ جواب: ذی علم اللہ تعالیٰ کو شامل نہیں ہے اس لئے کہ علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کے ذات کے لیے بمعنیٰ ذو ثابت نہیں ہے اور اس آیت میں دلیل ہے کہ علم کے بہت سارے درجات ہیں کسی عالم کیلئے یہ جائز نہیں کہ اپنے علم پر فخر کر بیٹھے اور علم کا آخری مرجع اللہ تعالیٰ ہے یا علیم سے اللہ تعالیٰ مراد ہے یعنی تمام اہل علم کے اوپر بھی علیم ہے جو کہ اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا علم سب پر غالب ہے۔

قَالُوۡۤا اِنۡ یَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ ۚ فَاَسَرَّهَا یُوۡسُفُ فِیۡ نَفۡسِهٖ وَلَمۡ یُبۡدِهَا لَهُمۡ ۚ قَالَ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا تَصِفُوۡنَ ﴿۷۷﴾

"وہ بولنے لگے اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے بھائی (یوسف علیہ السلام) اس سے پہلے بھی چوری کر چکا ہے اس پر یوسف علیہ السلام نے ان کو ظاہر کئے بغیر چپکے سے (دل) میں کہا کہ تم اس معاملے میں کہیں زیادہ برے ہو اور جو تم بیان دے رہے ہو اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے" [77]۔

تفسیر 77 اب چونکہ چوری ان پر ثابت ہوئی تو اس سے اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کیلئے کہنے لگے کہ بنیامین ہمارا سگا بھائی نہیں ہے بلکہ سوتیلا ہے اس کا جو سگا بھائی ہے اس نے بھی چوری کی تھی۔ یوسف علیہ السلام نے اس وقت ان کو جواب نہیں دیا اور چپکے سے یہ جملہ ارشاد فرمایا: أَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا: یعنی تم بہت برے ہو۔ اور وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ: یہ ظاہراً فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو۔ فَأَسَرَّهَا (ھا) ضمیر أَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا: کی طرف راجع ہے یعنی انکا یہ جملہ کہنا یا اپنی صفائی کیلئے دلیل پیش کرنا بدترین ہے۔ فائدہ: یوسف علیہ السلام پر چوری کا الزام لگانے میں مختلف اقوال ہیں اس میں بہتر قول یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بچپن لڑکپن میں نانا سے بت چھپا کر توڑ دیا تھا تاکہ وہ شرک سے باز آ جائے تو بھائیوں نے اس عمل کو الزام بنا کر ذکر کیا اور اس کو چوری قرار دیا۔

قَالُوۡا یٰۤاَیُّهَا الۡعَزِیۡزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَیۡخًا كَبِیۡرًا فَخُذۡ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۷۸﴾

''وہ کہنے لگے اے بادشاہ! اس کا والد بہت بوڑھا ہے اسلئے اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو اپنے پاس رکھ لیجئے ہم آپ کو ان میں تصور کرتے ہیں جو احسان کرنے والے ہیں'' [78]۔

تفسیر 78 انہوں نے چونکہ والد سے وعدہ کیا تھا کہ ہم بنیامین کو بحفاظت لیکر آئیں گے اسلئے اب عزیز (یوسف علیہ السلام) سے درخواست کرتے ہیں جو تین باتوں پر مشتمل ہے کہ ان تین باتوں میں سے کوئی بات منظور کرو: (۱) اس کا والد بڑھاپے کی انتہا میں ہے (۲) اس کے بدلہ میں ہم میں سے کسی کو پکڑ لو (۳) یوسف علیہ السلام کی تعریف کی کہ تم احسان کرنے والے محسن انسان ہو پہلے بھی ہمارے ساتھ احسان کر چکے ہو۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ۟

"یوسف نے فرمایا اس قسم کی بے انصافی سے میں اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں کہ جس شخص کے پاس ہمارا سامان ملا ہے اس کو معاف کر کے چھوڑ دو اور (بے قصور) کسی اور کو پکڑ لیں اگر ہم ایسا کریں گے تو یقیناً ہم ظالم ہوں گے" [79]۔

تفسیر 79 اس آیت میں واضح دلیل ہے کہ مجرم کی جگہ غیر مجرم کو پکڑنا بے انصافی ہے اور یہ ظلم ہے جس سے پناہ مانگنی چاہئے۔ مَعَاذَ اللّٰهِ مصدر ہے اور اس سے قبل: اَعُوْذُ: فعل مقدر ہے اور لفظ: وَجَدْنَا: اس لئے فرمایا ہے کہ اس کی چوری پر دلیل نہ بنے کیونکہ وہ حقیقت میں چوری نہیں تھی یہ نہیں فرمایا کہ جس نے ہماری چوری کی ہے۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۟

"چنانچہ جب وہ یوسف علیہ السلام سے خوب مایوس ہو گئے تو الگ ہو گئے اور چپکے چپکے مشورہ کرنے لگے ان سب میں جو بڑا تھا وہ کہنے لگا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے والد نے اللہ تعالیٰ کے نام پر تم سے پکا عہد لیا تھا اور اس سے قبل یوسف علیہ السلام کے بارے میں جو تم قصور کر گئے ہو (وہ بھی معلوم ہے) لہٰذا میں اس ملک سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک مجھے والد اجازت نہ دیں یا اللہ تعالیٰ ہی میرے حق میں کوئی فیصلہ صادر فرما دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے" [80]۔

خلاصہ: اس آیت سے آیت 57 تک اس واقعہ کا دسواں حصہ اور مقام ہے۔ اس میں پہلے ان کے آپس میں مشورے کا ذکر ہے، پھر بڑے بھائی کا مصر میں رہنے کا بیان ہے اور دیگر بھائیوں کو والد کے پاس حالات بتانے کیلئے روانہ کرلیا جائے پھر والد کے غم میں اضافہ کا ذکر ہے پھر یوسف کو یاد کرنا یعنی غم کا تازہ ہونا ذکر ہوا ہے نیز بیٹوں کی طرف سے والد کو یوسف علیہ السلام کی یاد سے منع کرنے کا ذکر ہے اسی طرح والد کی طرف سے جو جواب ان کو دیا گیا ہے وہ ذکر ہے اور والد کا تیسری مرتبہ ان کو مصر بھیجنے کا ذکر ہے تاکہ غلہ لیکر آئیں اور اپنے بھائیوں کو تلاش کریں۔

تفسیر 80 اس آیت میں ان کے مشورے کا ذکر ہے کہ بڑا بھائی مصر میں ٹھہر جائے اور اس کے دو سبب ہیں ایک سبب یہ ہے کہ والد سے عہد و پیمان کیا تھا اور دوسرا سبب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کی حفاظت کی بابت ان بھائیوں سے جو کوتاہی سرزد ہوئی تھی اس کا تدارک مقصود تھا۔ مِنْهُ۔ ضمیر یوسف یا بنیامین کی طرف راجع ہے: نَجِيًّا: مناجی کے معنیٰ میں مفرد ہے

مقدر اس طرح ہے: فَوْجًا نَجِيًّا: تو اس طرح جمع کے معنی میں ہے یا مصدر ہے تو ذی نجوی کے معنی میں ہے۔ مَا فَرَّطتُمْ: (ما) موصولہ ہے یا مصدریہ ہے: يَأْذَنَ لِيٓ: اس سے مراد اپنے وطن میں بلانا مراد ہے: أَوْ يَحْكُمَ اللَّهُ لِي یا مجھے بھائی واپس مل جائے گا یا خود فوت ہو جاؤں گا یا میرا بھائی فوت ہو جائے گا یعنی حکم سے مراد تقدیری حکم ہے۔ بعض نے اس سے قتال کا حکم مراد لیا ہے لیکن وہ قول ضعیف ہے۔

ارْجِعُوٓا إِلَىٰٓ أَبِيكُمْ فَقُولُوا يَٰٓأَبَانَآ إِنَّ ٱبْنَكَ سَرَقَ وَمَا شَهِدْنَآ إِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَٰفِظِينَ ﴿٨١﴾

"جاؤ اپنے والد کے پاس اور اس سے کہو کہ ابا جان! آپ کے بیٹے نے چوری کر لی تھی ہم نے وہی بات کہی جس کا ہمیں علم تھا اور ہم غیب کی نگہبانی سے قاصر ہیں" [81]۔

تفسیر 81 "إِنَّ ٱبْنَكَ سَرَقَ: یہ انہوں نے غالب گمان اور ظاہری اسباب کے اعتبار سے کہا ہے اور حکم بھی اس اعتبار سے لگایا گیا ہے کہ بنیامین کے سامان سے پیالہ نکالا گیا تھا: وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ: غیب سے چوری کی حقیقت حال مراد ہے اور بھائی کی چوری مراد ہے کہ یہ چوری کا اقدام کریں گے اور اس کی وجہ سے اس کی گرفتاری وجود میں آئے گی۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ شریعت میں گمان غالب کو علم کہا گیا ہے اور گمان غالب پر گواہی دینا جائز ہے بشرطیکہ علامات اور قرائن موجود ہوں۔

وَسْـَٔلِ ٱلْقَرْيَةَ ٱلَّتِى كُنَّا فِيهَا وَٱلْعِيرَ ٱلَّتِىٓ أَقْبَلْنَا فِيهَا وَإِنَّا لَصَٰدِقُونَ ﴿٨٢﴾

"اور جس بستی میں ہم تھے اس سے پوچھ لیجئے اور جس قافلے میں ہم آئے ہیں ان سے تحقیق کیجئے یہ بالکل حقیقت ہے ہم سچے ہیں" [82]۔

تفسیر 82 اس میں انہوں نے اپنے سچائی پر دو طریقوں سے دلیل پیش کی ہے اول مصر والوں سے پوچھ لو۔ دوم قافلے والوں سے دریافت کرو۔ الْقَرْيَةَ اس میں مضاف محذوف کیا گیا ہے یعنی اہل قریۃ اور اس سے مراد مصر والے ہیں۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ عَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿٨٣﴾

"یہ بھائی یعقوب علیہ السلام کے پاس گئے اور پوری بات سنائی یعقوب علیہ السلام نے فرمایا نہیں بلکہ تمہارے دلوں نے اپنے پاس سے ایک بات بنالی ہے اب تو میرے لئے صبر ہی بہتر ہے کوئی مشکل نہیں کہ اللہ تعالی ان سب کو اکھٹے میرے پاس لے آئے یقیناً اس کا علم قوی اور حکمت پختہ ہے"[83]۔

تفسیر 83 یعقوب علیہ السلام نے قیاس کیا سابقہ واقعہ پر لیکن یہ قیاس واقعہ کے موافق نہیں تھا۔ یا بل: هَلْ: استفہامیہ کے معنی میں ہے اور یہ واقعہ انبیاء کرام کے علم غیب کی نفی پر دلیل ہے: أَمْرًا: اس سے مراد بنیامین کا لیکر جانا اور تہمت لگا کر محصور کر لینا ہے۔ یا چوری کی شہادت تم سب کی آپس کی ہے حقیت ایسا نہیں: عَسَى اللَّهُ: یعقوب علیہ السلام کی یہ امید یوسف علیہ السلام کے اس خواب سے ہے جو انہوں نے دیکھا تھا یہ بات یقینی تھی مگر کبھی کبھار: عَسَى: یقین کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٨٤﴾

"اور (یہ کہہ کر) نہوں نے منہ پھیر لیا اور کہنے لگے ہائے یوسف علیہ السلام اور اس کی دونوں آنکھیں صدمہ سے (روتے ہوئے) سفید ہوگئی اور وہ دل ہی دل میں گھٹے جاتے تھے"[84]۔

تفسیر 84 اس آیت میں سیدنا یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹے سیدنا یوسف علیہ السلام کی جدائی اور فراق کے غم کا اظہار ہے جبکہ سیدنا بنیامین کی جدائی کے غم نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی جدائی کا غم تازہ کر دیا تھا کیونکہ چھوٹے غم ہمیشہ گزشتہ بڑے غموں کو تازہ کرتے ہیں، اور آنکھوں کا سفید ہونا کثرت رونے سے ہوا تھا لیکن یہ لازم نہیں کہ بینائی بھی ختم ہوئی ہو سیدنا محترم شیخ پر اللہ تعالی رحم فرمائے انہیں اس مقام پر سہوا ہوا ہے ورنہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کی بینائی جانے کا ذکر آگے آیت 96 میں صراحت سے بیان ہوا ہے (مترجم): يَا أَسَفَىٰ: یہ اللہ تعالی کو اپنی شکایت عرض کرنی ہے چنانچہ اسلئے مخلوق سے چہرہ پھیر دیا جیسا کہ فرمایا: تَوَلَّىٰ عَنْهُمْ: نیز آیت 86 میں بھی اس پر قرینہ موجود ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ مجھ پر رحم فرما یعنی: ارْحَمْ عَلَىٰ نَفْسِي: فائدہ: انبیاء کرام علیہم السلام پر کثرت غم طاری ہونا اور آنسو بہانا شرعا درست اور ثابت ہے ہمارے نبی ﷺ کے بھی غم کے وقت آنسو جاری ہوئے تھے جب بیٹا ابراہیم فوت ہوا تھا (صحیح بخاری کتاب الجنائز حدیث 1303) اور: كَظِيمٌ: میں دل کی غمگینی کی طرف اشارہ ہے اور غم کے وقت جو منع آیا ہے وہ چہرے کو مارنے نوچ لینے گریبان چاک کرنے اور بلند آواز کے ساتھ جہالت کے رونے سے منع ہے جیسا کہ بخاری

میں حدیث ہے اور یہ طریقہ مبتدعین کا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الجنائز حدیث 1297)

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

"بیٹوں نے کہا اللہ کی قسم! آپ یوسف کو یاد کرنا نہیں چھوڑیں گے یہاں تک کہ بالکل گھل جائیں گے یا ہلاک ہو گئے" [85]۔

تفسیر 85 یہ بیٹوں کی جانب سے والد پر شفقت ہے کہ غم کی وجہ سے بیمار نہ ہو جائے یا مر نہ جائے یہ یوسف علیہ السلام سے حسد کی بنیاد پر نہیں اسلئے کہ وہ تو یہ کر چکے تھے۔ تَفْتَؤُا: اس میں لام حذف ہے اور ثبوت کے معنی میں ہے یعنی ہمیشہ اسی طرح کرتے رہیں گے۔ حَرَضًا: وہ انسان جس کی کثرت بیماری یا بے حد غم سے نڈھالی اتنی بڑھ جائے کہ موت کے قریب ہو۔

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

"یعقوب علیہ السلام کہنے لگے میں اپنے غم و رنج کی فریاد (تمہیں نہیں) صرف اللہ سے کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے" [86]۔

تفسیر 86 یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر قسم کے غم وغیرہ کی شکایت و فریاد اللہ تعالیٰ ہی سے کرنا سنت انبیاء ہیں۔ بَثِّيْ: کثرت غم کو کہتے ہیں جو بے اختیار پھیل جائے اور مشہور ہو جائے اور اس میں یوسف علیہ السلام کے غم کی طرف اشارہ ہے۔ حُزْنِيْ: میں بنیامین کی جدائی اور فراق کی طرف اشارہ ہے۔ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: اس سے یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر مراد ہے ۔ جس میں انکا والدین کے ساتھ جمع ہونا ثابت ہوتا ہے یا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کی اور انکساری کے ساتھ دعاء کرنے والے کی دعاء کی قبولیت کی طرف اشارہ ہے۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَ لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

"اے بیٹو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور رحمت الٰہی سے نا امید مت ہو۔ یقین کرو کہ رحمت الٰہی سے نا امید وہ لوگ ہوتے ہیں جو کافر ہے" [87]۔

تفسیر 87 "فَتَحَسَّسُوْا: حواس کے ذریعے کسی چیز کو تلاش کرنا ہے اس کا استعمال اکثر شر میں ہوتا ہے اس آیت میں رحمت الٰہی سے نا امید ہونے پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے کیونکہ نا امیدی کرنے والا رحمت الٰہی کا منکر ہوتا ہے یعنی اس کی قدرت سے منکر ہوتا ہے۔ جبکہ قدرت الٰہی سے انکار کفر ہے باقی اس مسئلہ کی تفسیر سورۃ حجر آیت 56 میں آنے والی ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾

"جب وہ یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انہوں نے یوسف علیہ السلام سے کہا اے عزیز! ہم اور ہمارے گھر والوں پر سخت مصیبت آپڑی ہے اور ہم معمولی رقم لیکر آئے ہیں آپ ہمیں پورا پورا غلہ دیجئے اور اللہ کیلئے ہم پر احسان کیجئے یقیناً اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو بڑا اجر عطا فرماتا ہے" [88]۔

خلاصہ: اس آیت سے دسواں مقام ہے 93 تک اس واقعہ کا "خلاصہ" یہ ہے: اس میں تیسری مرتبہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی مصر کی طرف آنے کا بیان ہے۔ یوسف علیہ السلام (عزیز مصر) سے صدقہ مانگنے کا مطالبہ مذکور ہے پھر ان کی پہچان کا تذکرہ ہے ان کے اپنے جرم کا اعتراف بیان ہے اور یوسف کی برتری بھی اور یوسف علیہ السلام کا ان کو معاف کرنا پھر والد کی تسلی کیلئے قمیص روانہ کرنا ذکر ہوا ہے۔

تفسیر 88 اس آیت میں دلیل ہے کہ سخت ضرورت کے وقت مخلوق کو اسباب کے تحت شکوہ جائز ہے مگر صبر اس سے بہت بہتر ہے۔ مُّزْجٰىةٍ: وہ رقم جو خریدی گئی چیز کے مقابل کم ہونے کی وجہ سے واپس کی جاتی ہے اس سے جعلی رقم مراد نہیں ہے کیونکہ وہ تو سودا میں پیش کرنا جائز اور درست ہی نہیں ہے: فَاَوْفِ: یعنی پہلے جتنا غلہ آپ نے ہمیں دیا تھا اتنا غلہ اس کم قیمت پر ہمیں دے دیں، اضافی غلہ تیری طرف سے بطور صدقہ ہوگا یعنی اس میں رعایت مراد ہے چونکہ انہوں نے عزیز مصر کے

اعمال مومنوں جیسے پائے تھے اسلئے فرمایا کہ: إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ: فائدہ: صدقہ کا مطالبہ اس سے کیا جاتا ہے جو ثواب کا محتاج ہو اسلئے اللہ تعالیٰ سے ان لفظوں کے ساتھ دعاء مانگنا درست نہیں کہ ہم پر صدقہ کرو: اَللّٰهُمَّ تَصَدَّقْ عَلَيَّ: یہ حسنؒ اور مجاہدؒ کا قول ہے جسکو امام ابن کثیرؒ اور ابن جریرؒ نے نقل کیا ہے اگرچہ اس پر ایک روایت کی وجہ سے اعتراض وارد ہوتا ہے: صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ: (صحیح مسلم کتاب صلاۃ المسافرین 478/1، ابن جریر 19788، مسند فاروق لابن کثیر کتاب الصلوۃ، ص200)

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنتُمْ جَاهِلُونَ ﴿٨٩﴾

"یوسف نے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب تم جہالت میں مبتلا تھے تو تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا" [89]۔

تفسیر 89 "هَلْ عَلِمْتُمْ: اس میں سوال کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس عمل کی برائی اور قباحت ظاہر کرنا مقصود ہے جو انہوں نے یوسف علیہ السلام اور بنیامین کے ساتھ کیا تھا۔ اس آیت میں یوسف علیہ السلام کا بھائیوں کے ساتھ تعارف کا ذکر ہے اور بھائیوں کی طرف جہالت کی نسبت ہے جب انہوں نے حسد کی وجہ سے ان پر اور انکے بھائی پر ظلم کیا تھا۔ نیز اس میں دلیل ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں میں کوئی نبی نہیں تھا کیونکہ انبیاء نبوت سے قبل بھی جہالت اور لاعلمی سے معصوم ہوتے ہے۔

قَالُوٓا أَءِنَّكَ لَأَنتَ يُوسُفُ ۖ قَالَ أَنَا۠ يُوسُفُ وَهَٰذَآ أَخِى ۖ قَدْ مَنَّ ٱللَّهُ عَلَيْنَآ ۖ إِنَّهُۥ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿٩٠﴾

"وہ بول اٹھے کیا آپ یوسف علیہ السلام ہو؟ یوسف نے کہا میں یوسف علیہ السلام ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر سے کام لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ نیکی کرتے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا" [90]۔

تفسیر 90: اس آیت میں اشارہ ہے کہ تقویٰ اور صبر رفع درجات کے لیے اسباب ہیں اور یہ دونوں اسباب احسان ہیں: أَإِنَّكَ لَأَنتَ يُوسُفُ: سوال: استفہام میں تاکید اور یقین جمع نہیں ہوتے ہے جبکہ یہاں پر ھمزہ استفہامی ہے اور لام اور اِنَّ برائے تاکید ہے؟ جواب: اس میں دو حالتوں کا جمع ہونا ہے یعنی پہلے شک میں تھے تو جلدی یقین پیدا ہوا: قَدْ

مَنَّ اللّٰہُ عَلَیۡنَا: اس میں صبر کی توفیق ہے اور دونوں بھائیوں کا جمع ہونا ہے نیز ان دونوں بھائیوں کو دیگر بھائیوں کی طرح حسد سے بچانا ہے جبکہ وہ حسد میں مبتلا ہوئے تھے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ تقویٰ اور صبر کے مجموعہ کا نام احسان ہے۔

قَالُوۡا تَاللّٰہِ لَقَدۡ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیۡنَا وَ اِنۡ کُنَّا لَخٰطِئِیۡنَ ﴿۹۱﴾

"انہوں نے کہا یقیناً اللہ تعالیٰ نے تجھ کو ہم پر فضیلت دی ہے اور ہم یقیناً خطا کار تھے"[91]۔

تفسیر 91 یوسف علیہ السلام کو اپنے اوپر ترجیح دینا دلیل ہے کہ یہ انبیاء نہیں تھے: وَاِنۡ کُنَّا لَخٰطِئِیۡنَ: اس میں دلیل ہے کہ کبھی ذنب کا اطلاق گناہ کبیرہ پر ہوتا ہے اس اقرار میں ضمناً معافی کا مطالبہ بھی موجود ہے۔ خاطی اور مخطی میں مفسر خازن نے فرق نقل کیا ہے یعنی خاطی عمداً یعنی قصداً گناہ کیلئے استعمال ہوتا ہے جبکہ مخطی خطا میں استعمال ہوتا ہے۔

قَالَ لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ ؕ یَغۡفِرُ اللّٰہُ لَکُمۡ ۫ وَ ہُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۹۲﴾

"یوسف نے فرمایا آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہوگی۔ اللہ تمہیں معاف کرے گا وہ سارے رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے"[92]۔

تفسیر 92 اس آیت میں نبوت کے اچھے اخلاق کا تذکرہ ہے کہ ظلم کرنے والوں کو بھی معاف کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن مشرکین وغیرہ کو کہا تھا کہ میں آج وہ بات تمہیں کہوں گا جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی (اخرجہ ابن مردویہ فی تفسیرہ من حدیث ابن عباس والبیہقی فی دلائل النبوۃ 87/5 من حدیث عبداللہ بن عمرو) لَا تَثۡرِیۡبَ: یعنی کئے گئے گناہوں پر ملامت کرنا اور ذلت تنبیہ کرنا۔ یعنی ایسا نہیں بلکہ تمہارے اوپر درگزر کرتا ہوں اَلۡیَوۡمَ: یعنی آج کا دن ملامت کرنے کا ہے لیکن جب میں آج بھی ملامت نہیں کر رہا تو پھر تو کبھی ملامت نہیں کروں گا یَغۡفِرُ اللّٰہُ لَکُمۡ: یہ جملہ دعائیہ ہے یا خبریہ ہے اور وَہُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ: علت ہے۔

اِذۡہَبُوۡا بِقَمِیۡصِیۡ ہٰذَا فَاَلۡقُوۡہُ عَلٰی وَجۡہِ اَبِیۡ یَاۡتِ بَصِیۡرًا ۚ وَ اۡتُوۡنِیۡ بِاَہۡلِکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۹۳﴾

"میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے والد کے چہرے پر ڈال دینا اس سے ان کی بینائی واپس آجائیگی اور اپنے سارے گھر والوں کو میرے پاس لے آؤ"[93]۔

تفسیر 93 انہوں نے قمیص وحی کے ذریعے والد کی طرف روانہ کی جو کہ ان کی آنکھوں کیلئے سبب شفا تھی یہ بات مشہور ہے کہ یہ قمیص یوسف علیہ السلام کو ابراہیم علیہ السلام سے میراث میں ملی تھی اس کی کوئی حقیقت اور سند نہیں۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾

"جب یہ قافلہ (مصر سے) چل نکلا تو یعقوب علیہ السلام کنعان میں آس پاس والوں سے کہنے لگے کہ مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے اگر تم مجھے یہ نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا ہے" [94]۔

خلاصہ: اس آیت سے آیت 98 تک اس واقعہ کا گیارھواں باب ومرحلہ ہے اس کا خلاصہ اس طرح ہے: اس میں یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام کی قمیص کی خوشبو محسوس کرنے کا ذکر ہے پھر خوشخبری ملنے کا ذکر ہے۔ پھر بیٹوں کا والد سے استغفار طلب کرنے اور والد کے وعدے کا ذکر ہوا ہے۔

تفسیر 94 یوسف علیہ السلام کی قمیص کی خوشبو یعقوب علیہ السلام کو بطور خرقِ عادت و معجزہ حاصل ہوئی ہے ورنہ جب یوسف علیہ السلام کنعان یعنی والد کی بستی میں بنفس نفیس کنویں میں موجود تھے تو والد کو نہ خوشبو آئی اور نہ ہی کوئی خبر۔ تُفَنِّدُوْنِ: فند کا معنی ہے بڑھاپے کی وجہ سے جب عقل کام چھوڑ دیتی ہے تو پھر آدمی بے عقلی اور ناسمجھی کی باتیں کرتا رہتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾

"لوگوں نے کہا اللہ کی قسم! تم ابھی تک پرانی محبت کی یادوں میں ہو" [95]۔

تفسیر 95 "قَالُوْا: میں لوگوں سے مراد رشتہ دار اور پوتیں وغیرہ ہیں ورنہ بیٹے تو موجود نہیں تھے: اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ: اس آیت میں ضلال سے مراد گمراہی نہیں ہے بلکہ قدیم محبت مراد ہے، بہت زیادہ محبت مراد ہے کیونکہ کسی نبی کی طرف گمراہی کی نسبت کرنا کفر ہے۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

"پھر جب خوشخبری دینے والا پہنچ گیا تو اس نے قمیص یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دی چنانچہ ان کی بینائی فوراً واپس آگئی انہوں نے (اپنے بیٹوں) سے کہا کیا تم سے میں نے نہیں کہا تھا کہ جتنا اللہ تعالیٰ کے متعلق میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے" [96]۔

تفسیر 96 "اَلْبَشِيْرُ: سے مراد وہ شخص ہے جس نے یوسف علیہ السلام کی خون آلود قمیص یعقوب علیہ السلام کو پیش کی تھی اب وہ خوشخبری لے کر آگیا: فَارْتَدَّ بَصِيْرًا: معنی یہ ہے کہ آنکھوں سے وہ بیماری چلی گئی اور نظر درست ہوگئی: قَالَ اَلَمْ

أَقُلْ لَّكُمْ: آیت 86 میں جو جملہ گزرا ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔

قَالُوْا یٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕیْنَ ﴿۹۷﴾

"وہ کہنے لگے اباجان آپ ہمارے گناہوں کی مغفرت طلب کیجئے ہم یقیناً بڑے خطاکار ہیں" [97]۔

تفسیر 97 اس آیت میں دلیل ہے کہ نیک زندہ آدمی کی دعا کو بطور وسیلہ اللہ تعالیٰ کو پیش کرنا درست ہے: اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕیْنَ: یہ خطیہ سے لیا گیا ہے یعنی قصداً گناہ کرنے والے۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۹۸﴾

"یعقوب نے فرمایا عنقریب تمہاری بخشش کی دعا اپنے رب سے کروں گا یقیناً وہی تو ہے جو بہت بخشنے والا انتہائی مہربان ہے" [98]۔

تفسیر 98 اس میں بہتر قول یہ ہے جو امام شعبی سے نقل ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے دعا میں تاخیر اسلئے کی تاکہ یوسف علیہ السلام سے بھی مشورہ کریں اسلئے کہ انہوں نے ان پر مظالم ڈھائے ہوئے تھے لہٰذا وہ معاف کرتے ہیں یا نہیں کیونکہ یعقوب علیہ السلام کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو معاف کیا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى یُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَیْهِ اَبَوَیْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾

"اور جب سب مصر میں یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے تو یوسف علیہ السلام نے والدین کو اپنے پاس جگہ عنایت فرمائی اور ان سب سے فرمایا کہ مصر میں داخل ہو جاؤ اور ان شاء اللہ سب امن سے مصر میں رہو گے" [99]۔

خلاصہ: اس مقام سے آیت 101 تک اس واقعہ کا بارھواں مقام ہے۔ اس کا خلاصہ اس طرح ہے: یعقوب علیہ السلام کی ملاقات اور سارے اہل خانہ کی ملاقات یوسف علیہ السلام کے ساتھ اور سب کیلئے امن کے ساتھ مصر میں رہنے کا تذکرہ ہے اور اس خواب کی سچائی کا ذکر ہے جس میں گیارہ بھائیوں اور ماں باپ کا سجدہ مذکورہ ہے اور یوسف کی دعا پر اختتام ہے۔

تفسیر 99 "أَبَوَيْهِ": سے والدین مراد ہے اور جن مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ ان کی خالہ تھیں کیونکہ ان کی والدہ فوت ہو چکی تھیں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ جب یعقوب علیہ السلام مصر کی طرف اپنے اہل سمیت روانہ ہوئے تو یوسف علیہ السلام ان کے استقبال کیلئے شہر سے باہر تشریف لے گئے اور وہاں ان کے آرام کا انتظام کیا اور یہ ایک مجلس قائم کی جب وہ پہنچ آئے تو والدین کو اپنے ساتھ مجلس خاص میں بٹھالیا اور پھر ان کو اس طرح فرمایا کہ: اُدْخُلُوْا مِصْرَ: اور ان شاء اللہ کا لفظ

آمِنِينَ: کے ساتھ متعلق ہے یا پھر لفظ: اُدْخُلُوا: سے مصر میں داخل ہونا ہے مراد یعنی وہ مصر میں یوسف علیہ السلام کے محل میں داخل ہوئے اور: اُدْخُلُوا: اُسْكُنُوْ: کے معنی میں ہے۔

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝١٠٠

"انہوں نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے سامنے عزت واکرام کے ساتھ جھک گئے اور یوسف علیہ السلام نے فرمایا ابا جان! یہ میرے پرانے خواب کی تعبیر ہے جسے میرے پروردگار نے سچ کر دکھایا اور اس نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ مجھے قید خانے سے نکال دیا اور آپ لوگوں کو دیہات سے یہاں لے آیا حالانکہ اس سے قبل شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد برپا کیا تھا حقیقت یہ ہے کہ میرا رب جو کچھ چاہتا ہے اس کیلئے بڑی باریک تدبیر یں کرتا ہے یقیناً اس کا علم بھی کامل ہے اور حکمت بھی" [100]۔

تفسیر 100 عرش سے مراد بادشاہ کا وہ تخت ہے جو یوسف علیہ السلام کو دیا گیا تھا: وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا: اس میں مختلف اقوال ہیں جن میں بہتر قول یہ ہے کہ ہاتھ جوڑ کر سر جھکانے کی کیفیت کو کہتے ہیں۔ یہ طریقہ سابقہ امتوں میں جائز تھا کہ سلام کے وقت ہاتھ جوڑ دیں اور جھک جائیں لیکن ہماری شریعت میں یہ ممنوع ہے جیسا کہ امام ابن کثیر، قرطبی اور خازن نے لکھا ہے اور اس پر صحیح حدیث موجود ہے۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ سلام کے وقت ہم آپس میں ایک دوسرے کو سر جھکا سکتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ (ترمذی فی الاستئذان حدیث 2728، ابن ماجه في الادب حديث 3702، شیخ البانی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے): وَخَرُّوْا: اس آیت میں صاروا کے معنی میں ہے یعنی وہ ہو گئے یوسف علیہ السلام کے آگے سر جھکانے والے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام کے سبب سے اللہ تعالیٰ کیلئے سجدہ کیا تو یوسف علیہ السلام قبلہ کی منزلت پر مانے گئے یعنی جس طرح سجدہ اللہ تعالیٰ کو کیا جاتا ہے مگر چہرہ قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔ اور والدین کا سجدہ بھی امر الٰہی سے تھا تو اس لئے اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ پھر یوسف علیہ السلام نے تکبر اور تہمت ختم کرنے کیلئے فرمایا کہ: هٰذَا تَأْوِيْلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا: اور پھر اللہ تعالیٰ کے احسانات کی تفصیل اظہار عاجزی کے طور پر بیان کی: لَطِيْفٌ: اس کے تین معنی ہیں: (1) احسان کرنے والا

ہے۔اپنے بندوں کے ساتھ مگر ایسے طریقے سے کہ بندے اس کا گمان بھی نہیں کر سکتے۔ (۲) باریک چیزوں کا علم رکھنے والا ہے۔ (۳) باریک تدبیر کرنے والا ہے۔یوسف علیہ السلام نے ان احسانات میں کنویں سے نکالنے کا ذکر نہیں کیا اس میں یہ حکمت تھی کہ معاف کرنے کے بعد بھائیوں کو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِىْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِىْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِيّٖ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِىْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝

"میرے رب! تو نے مجھے حکومت میں سے بھی حصہ عطا کیا اور مجھے علم تعبیر خواب کی توفیق دی۔زمین و آسمان کو پیدا کرنے والے تو دنیا و آخرت میں میرا دوست ہے مجھے دنیا سے ایسے حال میں اٹھانا کہ میں تیرا فرمانبردار ہوں اور مجھے نیک لوگوں میں شامل کرنا"[101]۔

تفسیر 101 واقعہ کے اختتام پر دعا میں اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام بادشاہ ہونے کے باوجود اللہ کے سامنے عاجزی کرنے والے محتاج بندے تھے۔لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کے شریک نہیں ہو سکتے ہیں۔اس دعا میں یوسف علیہ السلام نے ظاہری انعام بادشاہت اور باطنی انعام علم کو وسیلہ بنایا اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اسماء فاطر اور ولی کو وسیلہ بنایا: تَوَفَّنِىْ مُسْلِمًا اس میں موت کی دعا مراد نہیں کیونکہ موت طلب کرنے کی دعا سے تو منع آیا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں حدیث وارد ہے کتاب الدعوات حدیث 6351 البتہ اس سے مراد اسلام پر موت تک بقا اور استقامت ہے: وَاَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ: اس میں موت کے بعد روح کا صالحین کے ساتھ اکٹھا ہونا مذکور ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حالت نزع میں یہ دعا فرمائی تھی اللّٰهُمَّ بِالرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى: (صحیح بخاری کتاب المغازی حدیث 4436، صحیح مسلم کتاب الفضائل حدیث 2444)

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝

"اے نبی! یہ تمام واقعہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تمہیں وحی کے ذریعے سے بتلا رہے ہیں اور آپ یوسف کے بھائیوں کے پاس موجود نہیں تھے جب انہوں نے سازش کر کے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کا اپنا فیصلہ پختہ کر لیا تھا"[102]۔

خلاصہ: اس مقام سے سورۃ کے آخر تک تتمہ ہے جو چھ امور پر مشتمل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے وہ اس طرح کہ پہلے بات رسول اللہ

ﷺ کی سچائی بیان کی ہے اور ان کو اطمینان دیا ہے دوسری بات یہ ہے کہ مشرکین کو توحید سے اعراض اور ایمان کے ساتھ شرک کی آمیزش پر وعید دی گئی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ دعوت دینے پر ترغیب دی ہے تا کہ عذاب ٹل جائے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ منکرین کے سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو نصرت و مدد کی تسلی دی گئی ہے اور چھٹی بات قرآن مجید کی سچائی بیان کی گئی ہے۔

تفسیر 102 اس آیت میں رسول ﷺ کی سچائی بیان ہوئی ہے وہ اس طرح کہ رسول اللہ ﷺ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے پاس موجود نہ تھے اور ان کے مکمل حالات (واقعہ) انہوں نے کامل طور سے سچائی کے ساتھ بیان بھی کیے ہیں۔ اسی طرح سورۃ آل عمران آیت 44۔ سورۃ قصص آیت 44،45،46 میں بھی ہے۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ "لوگوں کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں ہے اگرچہ آپ کتنا حرص کریں [103]"۔

ربع

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾

"آپ ان سے اس پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے بلکہ یہ تو عالم والوں کیلئے بس ایک پیغام نصیحت ہے" [104]۔

تفسیر 104 ان دونوں آیتوں میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ﷺ کے سچے ہونے کے باوجود اور ان کی ہدایت پر حرص رکھنے، ان سے اجرت نہ لینے اور ان کو پوری کامل وعظ ونصیحت کرنے کے باوجود یہ ضد وعناد کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے: اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ: یعنی اگر بالفرض اس پر اجرت لی جاتی تو سارے عالم کو یہ نصیحت نہیں پہنچتی۔ یہ جملہ سابقہ جملے کیلئے علت ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿١٠٥﴾

"آسمانوں اور زمین میں کتنی (توحید) کی نشانیاں ہیں جن پران کا گزر ہوتا رہتا ہے مگر یہ ان سے منہ موڑتے ہیں" [105]۔

تفسیر 105 اس آیت میں مشرکین کیلئے وعید ہے کہ آسمانوں اور زمین میں توحید کے بہت سارے دلائل ہیں جن پر یہ گزرتے ہیں مگر یہ ان سے اعراض کرتے ہیں جیسے یہ وحی الٰہی سے اعراض کرتے ہیں: يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا: اس سے بار بار گزر جاتے ہیں یعنی ان نشانیوں پر تمہاری نظریں بار بار دیکھنے کے باوجود گزرتی ہیں۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ⑩

"اور ان میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اللہ پر ایمان رکھتے بھی ہیں تو اس کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں" [106]۔

تفسیر 106 اس آیت میں ایمان کے ساتھ شرک کو ملانے پر وعید ہے اور یہ گزشتہ اعراض کی تفسیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سارے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں کہ خالق مالک ہے مصیبتوں میں اس سے مدد بھی طلب کرتے ہیں اور دیگر عبادات بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود شرک بھی کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو کارساز، مددگار، عالم غیب مانتے ہیں اور غائبانہ طور پر ان سے مدد طلب کرتے ہیں اور ان کے نام پر صدقے اور نذرانے چڑھاوے کرتے ہیں یقیناً یہ لوگ شرک کے مرتکب ہیں اور ان کا یہ ایمان شرک کی وجہ سے ضائع ہے اس آیت میں واضح دلیل ہے کہ ایمان شرک کی وجہ سے یقینی ضائع ہوتا ہے اس اقرار سے اس کو مومن نہیں کہا جا سکتا بلکہ مشرک کہلانے کے حقدار ہیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس میں ریا کاری، ہاتھوں پر دھاگہ باندھنا، غیر اللہ پر قسم کھانا وغیرہ داخل ہے۔ اسی طرح امام آلوسی رحمہ اللہ نے تفسیر روح المعانی میں تفصیلی رد لکھا ہے اور فرمایا کہ ہمارے زمانے کے مشرکین اگرچہ زمین میں کیڑوں کی تعداد سے زیادہ ہیں مگر اس کثرت کا کوئی اعتبار نہیں ہے جس میں شرک کی آمیزش موجود ہو۔

أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِنْ عَذَابِ اللَّهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ⑩

"کیا ان لوگوں کو اس بات کا کوئی خوف نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی لپیٹ میں آجائیں یا ان پر اچانک قیامت ٹوٹ پڑے اور ان کو پہلے سے احساس بھی نہ ہو" [107]۔

تفسیر 107 چونکہ سابقہ دو آیتوں میں ان کا شرک اور اعراض ذکر ہوا ہے تو یہ اسباب عذاب ہیں تو اب اس آیت میں عذاب کا تذکرہ موجود ہے تو گویا کہ سابقہ آیتوں میں سبب کا ذکر تھا اور اس میں مسبب کا ذکر ہے: غَاشِيَةٌ: یعنی وہ عذاب جو ان کو گھیر کر ڈھانپ لے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۸﴾

"فرمادیجئے یہ میرا راستہ ہے میں پوری بصیرت کے ساتھ اللہ تعالی کی طرف بلاتا ہوں اور وہ لوگ بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ تعالی پاک ہے (اس کا کوئی شریک نہیں ہے) اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں"[108]۔

تفسیر 108 اس آیت میں دعوت پر ابھارنا مقصود ہے جو عذاب کو ٹالنے کا سبب ہے چونکہ گزشتہ آیت میں عذاب کا ذکر تھا یہاں عذاب کو ٹالنے والے سبب کا بیان ہے: أَدْعُوْٓا إِلَى اللّٰهِ: یہ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْ: کی تفسیر ہے۔ اور: مَنِ اتَّبَعَنِیْ میں اشارہ ہے کہ نبی کا پیروکار وہ ہے جو دعوت توحید کو اپنا مشن بناتے ہے: عَلٰى بَصِیْرَةٍ: اس میں اشارہ ہے کہ دعوت کیلئے دلائل کا علم ضروری ہے۔ (وَسُبْحٰنَ) اس میں دعوت دینے والے کے عقیدے کا ذکر ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ سبحان اللہ کا معنی یہ ہے کہ اس کا شریک، نذیر، ولد، والد، صاحب، وزیر اور مشیر بھی نہیں ہے: وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ: یہ کلمہ تمام مشرکین سے برأت کیلئے ہے اس میں اشارہ ہے کہ دعوت توحید کا حامل شرک اور اہل شرک سے مبرا ہوتا ہے اور ان کے تعلق سے جان بچاتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

"اور ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھیجے وہ مختلف بستیوں کے رہنے والے تھے جن پر ہم نے وحی بھیجی تو کیا انہوں نے چل پھر کر نہیں دیکھا کہ ان سے پہلی قوموں کا کیا انجام ہوا اور آخرت کا گھر ان لوگوں کیلئے بہت بہتر ہے جو ایمان لائے اور پھر تقوی پر قائم رہے کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے"[109]۔

تفسیر 109 اس آیت میں مشرکین مکہ کے اس شبہ کا جواب ہے کہ آپ رسول اس لئے نہیں ہو سکتے کہ آپ (رجل) آدمی ہیں اور بشر اللہ کا رسول نہیں ہو سکتا۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ سابقہ انبیاء سب کے سب رجل یعنی مرد تھے نہ ان میں کوئی جن تھا اور نہ ہی کوئی ملائک میں سے تھا اور نہ کوئی عورت تھی۔ یہ آیت دلیل ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی۔ جن خواتین سے ملائک نے کلام کیا ہے یعنی آسیہ زوجہ فرعون، مریم ام عیسی علیہ السلام، سارہ، زوجہ ابراہیم علیہ السلام و ام موسیٰ وغیرہ تو وہ اہل السنت والجماعت کے صحیح عقیدہ کے مطابق صدیقات میں سے ہیں انبیاء نہیں۔ اس آیت میں نبی کریم ﷺ اور ان کے ساتھیوں

کو تسلی اور خوشخبری ہے جس میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور منکرین کی ہلاکت کا ذکر ہے: مِّنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ: اس سے بڑی آبادیاں مراد ہیں۔ ان میں عقل، علم دیہاتیوں کے مقابلے میں زیادہ تھا: وَلَدَارُ الْآخِرَةِ: یہ مخفی عبارت پر معطوف ہے یعنی: اَنْجَیْنَا اَھْلَ الْاِیْمَانِ فِی الدُّنْیَا: اہل ایمان کو ہم نے دنیا میں بچایا ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

"یہاں تک کہ اللہ کے رسول (ان کے ایمان لانے سے) ناامید ہو گئے تو اور لوگوں نے خیال کیا کہ وہ جھوٹا وعدہ کئے گئے تھے (تو پھر اچانک) ہماری مدد ان کے پاس آپہنچی پس جسے ہم بچانا چاہتے تھے بچا لیا اور مجرمین سے کبھی بھی ہمارا (عذاب) ٹل نہیں جاتا" [110]۔

تفسیر 110 اس آیت میں تسلی کا بیان ہے انبیاء کے لئے اللہ تعالی کی نصرت اور مدد کے ساتھ ان کی دعوت اور سچائی ثابت ہو جانے کے بعد قوموں پر عذاب کے کوڑے کا برسنا ذکر ہے: حَتّٰی: میں یہ احتمالات ہیں: (۱) حَتّٰی مَآ أَرْسَلْنَا کے متعلق ہے۔ (۲) مقدر عبارت کے ساتھ متعلق ہے یعنی: تَرَاخیٰ نَصْرُهُمْ حَتّٰی: (۳) یہ حتی ابتدائیہ ہے۔ اسْتَیْـَٔسَ: میں احتمالات (۱) ناامیدی کے قریب پہنچ گئے (۲) قوم کے ایمان لانے سے ناامید ہوئے۔ (۳) الزام مخاطب بِمَا لَا یَلْتَزِمُ: بطور حجت۔ ظَنُّوْا: میں احتمالات (۱) بمعنی یقین (۲) غالب گمان (۳) دل میں گزرنے والے بے اختیار سوچ و خیال: ظَنُّوْا: کی ضمیر میں احتمالات (۱) ظَنُّوْا غائب کی ضمیر کا مرجع: مُکَذِّبِیْنَ: ہے (۲) پیروی کرنے والوں کی طرف راجع ہے۔ (۳) ایک ساتھ دونوں کی طرف راجع ہے (۴) رسولوں کی طرف راجع ہے۔ اس کی رسولوں کی طرف نسبت میں احتمالات (۱) بے اختیار خیال کا دل میں آنا (۲) بطریقہ حجت الزام المخاطب بما لا یلتزم (۳) قریب تھے کہ گمان کر لیتے۔ (کذبوا) میں احتمالات (۱) مجہول مجرد کا صیغہ ہے (۲) معلوم مجرد کا ہے (۳) مجہول مزید مشدد ہے (۴) معلوم مزید مشدد ہے۔ ہماری قرأۃ میں مجہول مخفف ہے۔ کُذِبُوْا کی ضمیر اس میں احتمالات (۱) مُکَذِّبِیْنَ (۲) تابعدار (۳) دونوں گروہوں کی طرف۔ (۴) رسولوں کی طرف راجع ہے (۵) کُذِبُوْا: مخفف کی نسبت میں احتمالات رسولوں کی طرف۔ (۱) تبلیغ و دعوت کے طریقے میں سہواً غلطی کرنا (۲) مخفف بمعنی مشدد ہے (۳) اللہ تعالی کی جانب سے کذب گزرے ہوئے احتمالات کے ساتھ۔ یہ کل (۲۷) ستائیس احتمالات ہیں بقول خازن ظن اختیاری گمان کے معنی میں ہے اور اس کی نسبت انبیاء کرام کی طرف ہے اور: کُذِّبُوْا: یعنی اللہ تعالی کی طرف جھوٹ بولا گیا ہے اور وعدے کی مخالفت کی

گئی ہے۔ یہ توجیہ غلط ہے اس لئے کہ یہ تو ایک عام آدمی نہیں کر سکتا ہے جبکہ انبیاء کرام کی شان تو بہت ہی اعلیٰ ہے۔ گزرے ہوئے توجیہات اکثر تفسیر خازن میں ذکر کیے گئے ہیں۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿١١١﴾ ع

"یقیناً ان کے واقعات میں عقل والوں کے لئے عبرت کا بڑا سامان ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں جو جھوٹ گھڑ لی گئی ہو بلکہ اس سے پہلے جو کتابیں آ گئی ہیں یہ ان کی تصدیق ہے اور ہر بات کی وضاحت ہے اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کیلئے ہدایت اور رحمت ہے" [111]۔

تفسیر 111 اس آیت میں پانچ طریقوں سے قرآن کی سچائی بیان ہوئی ہے: اول (۱) سیدنا یوسف علیہ السلام اور انکی بھائیوں کا واقعہ اپنی سچائی کے ساتھ قرآن کریم کی سچائی پر دلالت کرتا ہے۔ دوم (۲) یہ سابقہ کتب کی تصدیق ہے اسلئے کہ ان کتابوں میں بھی یہ قصہ اس طرح موجود تھا۔ سوم (۳) اس میں ضروری عقائد اور احکام کا ذکر ہے۔ چہارم (۴) اس میں ہدایت ہے یعنی دلائل کے ساتھ بیان ہے۔ پنجم (۵) ایمان والوں کے لئے رحمت ہے یعنی اس پر ایمان لانے کی وجہ سے ایمان والوں پر رحمتوں کا نزول ہوتا ہے یا رحمت سے مراد صحیح عقیدہ (دین) پر استقامت ہے۔ جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت نمبر 8 میں ہے یا دل کی نرمی مراد ہے: عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ: اس میں بعض عبرتیں یہ ہیں: صبر کے نتائج کرامات اور سلامتی ہے جبکہ حسد و مکر کے نتائج شرمندگی، رسوائی اور ذلت ہے۔ وہ ذات جس نے یوسف کو کنویں سے نکالا پھر جیل سے نکال کر بادشاہت دی اور ان کے ساتھ ماں باپ اور بھائیوں کو ملایا تو وہ ذات محمد ﷺ کی کامیابی اور نصرت پر بھی قادر ہے۔

سورۃ یوسف کی خصوصیات:

۱۔ یوسف علیہ السلام کا تفصیلی واقعہ۔

۲۔ یہ بہترین قصہ ہے جو بہت سے فائدوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ جس نے شرک اور ایمان کو اکٹھا کیا وہ مشرک ہے۔

۴۔ رسول اللہ ﷺ کی رجولیت (مردانگی) کا ثبوت۔

۵۔ ایمان والوں کے لئے نصرت و نجات کی خوشخبری۔

آیاتھا ۴۳ ۱۳ سُوْرَۃُ الرَّعْدِ مَدَنِیَّۃٌ ۹۶ رکوعاتھا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ تعالیٰ ہی کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمن اور رحیم ہے۔

اس سورۃ کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے مگر قوی بات یہ ہے کہ یہ مدنی ہے۔

ربط: اس سورۃ کا ربط سورت یوسف سے یہ ہے کہ سورت یوسف میں نقلی دلائل کے ذریعے مسئلہ توحید کو ثابت کیا گیا تو اس سورت میں مسئلہ توحید کو پر دلائل عقلیہ کے ذریعے سے ثابت کیا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ مثالیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ گذشتہ سورت میں رسول کی سچائی کا اثبات کا بیان تھا اس سورت میں ان شبہات کے جوابات ذکر کر رہے ہیں جو صداقت رسول سے متعلق ہے۔ سورۃ کا عنوان: اس سورۃ کے دو عنوان ہیں: پہلا عنوان یا دعویٰ: پانچ طریقوں سے توحید کو ثابت کیا گیا ہے۔ پہلا طریقہ: شرک کی چار اقسام پر رد کیا گیا ہے یعنی شرک فی العلم فی التصرف۔ اور اسی طرح عبادت میں اور دعاء میں شرک کا رد ہے اور اس کو تیرہ آیتوں میں ذکر کیا ہے۔ دوم (۲) تفصیلی عقلی تیرہ دلائل ہیں۔ سوم: پہلے صرف دلائل کے ساتھ توحید ثابت کی ہے تو اب مزید وضاحت کیلئے دلائل کے امثلہ ذکر کرتے ہیں جو بغیر تکرار کے ہیں۔ چہارم (۴) پانچ مثالیں دی ہے۔ پنجم (۵) موحد اور مشرک کے صفات میں مقابلے کو ذکر کیا ہے، دس صفات موحد کی اور مشرک کی تین (۳) صفات ذکر کی ہیں جو کہ ٹوٹل تیرہ صفات ہیں۔ دوسرا عنوان اور دعویٰ، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ثابت کرنا ہے اور مشرکین کی طرف سے وارد ہونے والے چھ شبہات کے جوابات کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ اور اہل کتاب کی شہادت اور گواہی پر مبنی ہیں۔ خلاصہ: اس سورۃ میں چھ ابواب ہے پہلا باب آیت 7 تک اس میں کتاب اللہ کی طرف ترغیب ہے۔ آیت 1 میں پھر آیت 2 میں تین عقلی دلائل ہیں پھر آیت 3 اور 4 میں وعیدات ہیں۔ پہلی وعید انکار قیامت پر ہے آیت 5 میں دوسری وعید جلد عذاب کے مطالبہ پر ہے اور تیسری وعید رسول کی رسالت پر شک کرنے والوں کے لیے ہے کہ ان سے معجزے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

الٓمّٓرٰ ۟ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ①

"اس کے معنی اللہ ہی جانتے ہیں۔ یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور وہ جو آپکی طرف نازل کیا گیا ہے وہ آپکے رب کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ہیں" [1]۔

تفسیر 1 اس آیت میں قرآن کی طرف تین طریقوں سے ترغیب دی گئی ہے۔ پہلا طریقہ حروف مقطعات کے ذریعے اعجاز قرآن ذکر کیا ہے۔ دوسرا طریقہ: تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ: یعنی یہ کامل اور عظیم الشان کتاب کی آیتیں ہیں۔ تیسرا حکم حقانیت قرآن کے متعلق ہے اور آخری جملے میں ایمان نہ لانے والوں کیلئے وعید ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ②

"اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے بلند کیا ہے جو تم دیکھ رہے ہو پھر اس نے عرش پر استویٰ فرمایا چاند اور سورج کو تابع کیا ہر چیز ایک معین مدت تک کیلئے رواں دواں ہے وہی تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے اور وہی ان نشانیوں کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم یقین کرلو کہ ایک دن رب سے جاملنا ہے" [2]۔

تفسیر 2 چونکہ قرآن سے لوگوں کا رک جانا شرک کی وجہ سے ہے تو اب رد شرک پر عقلی دلائل بیان کئے ہیں۔ اس آیت میں دلیل عقلی اور قدرت الٰہی کے پانچ امور کا ذکر کیا ہے جو سب نظام علوی سے متعلق ہیں: بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا: اس کے دو معنی ہیں ایک معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے بلند کیا ہے جو کہ تمہیں نظر آتا ہے دوسرا معنی یہ ہے کہ اس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستون کے بلند کیا ہے جو تمہیں نظر نہیں آتے یعنی ستون تو ہیں مگر تمہاری نظروں سے اوجھل ہیں لیکن پہلا والا معنی زیادہ بہتر ہے: ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ: عرش اور استویٰ حقیقی معنی میں ہے بلا تمثیل و بلا تشبیہ اس کی کیفیت معلوم نہیں اور اس کی تاویل حرام ہے: لِاَجَلٍ مُّسَمًّى: اس سے دنیا کا اختتام مراد ہے: يُدَبِّرُ الْاَمْرَ: یعنی آسمانوں کو بلند کرنا مسخر کرنا پھر ان کو اپنے اختیار میں رکھا ہے ان کا نظام و تدبیر کسی اور کو حوالے نہیں کیا ہے: يُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ: مراد وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور پوری قدرت پر دلالت کریں: لَعَلَّكُمْ: یعنی اس میں توحید کے ساتھ ثبوت قیامت بھی موجود ہو۔

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا ۖ وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٣﴾

"اور وہی ذات تو ہے جس نے یہ زمین پھیلا دی اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور اس میں ہر قسم کے پھلوں کے جوڑے دو دو بنائے اور وہ دن کو رات کے ذریعے ڈھانپ دیتا ہے یقیناً ان میں بہت سارے توحید کے دلائل ہیں اس قوم کیلئے جو غور وفکر کرے"[3]۔

تفسیر 3 اس آیت میں دوسری دلیل عقلی کا بیان ہو رہی ہے جس کا تعلق زمین سے ہے یعنی دلیل عقلی سفلی اور اس میں قدرت الہی کے پانچ امور بیان ہوئے ہیں؛ زَوْجَيْنِ: یعنی تمام پودوں اور درختوں میں مونث ومذکر موجود ہیں۔ دوسرا قول یہ بھی ہے کہ زَوْجَيْنِ: سے مراد دو قسمیں ہیں یعنی میٹھا اور کھٹا چھوٹے دانے والے بڑے دانے والے تازہ اور سوکھے، سفید، ہرے، لال وغیرہ؛ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ: سابقہ آیت میں صرف محسوسات کا ذکر تھا جبکہ اس آیات میں محسوسات کے ساتھ معقولات کا بھی ذکر ہے۔ پھلوں میں (زوجیت) جوڑے ہونا دن رات کے انقلابات کا آنا اس میں فکر کی ضرورت ہے اسلئے آخر میں: يَتَفَكَّرُونَ: فرمایا۔ اس لیے کہ محسوسات سے معقول کی طرف پہنچنے کو فکر کہتے ہیں۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٤﴾

"زمین میں مختلف ٹکڑے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ واقع ہیں اور انگور کے باغ اور کھیتیاں اور کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ زیادہ شاخوں والے ہیں کچھ کم شاخوں والے۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور ان میں سے ہم بعض کو ذائقہ میں فوقیت دیتے ہیں یقیناً ان سب باتوں میں عقل رکھنے والی قوم کیلئے نشانیاں ہیں"[4]۔

تفسیر 4 یہ تیسری دلیل عقلی ہے اور اس میں اللہ کی قدرت کی پانچ نشانیاں ہیں؛ مُّتَجَاوِرَاتٌ: یعنی زمین کے مختلف ٹکڑے جو ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں آباد زمین، نمکین بنجر زمین، زرخیز اور مختلف رنگ والی زمین۔ آباد زمین اور غیر آباد وغیرہ؛ صِنْوَانٌ: یہ: صِنْوٌ: کی جمع ہے۔ وہ درخت جو جڑ سے کئی شاخیں نکلتی ہو اور غیر صنوان جو سیدھی ہو صرف ایک تنے پر قائم ہو اور بغیر شاخوں کے ہو؛ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ: زمین ایک ہے، پانی ایک ہے لیکن

پھلوں کے ذائقے مختلف ہیں۔ یہ مادہ پرستوں پر واضح رد ہے اگر چیزوں کی پیدائش مادوں پر ہوتی تو پھلوں میں اختلاف نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ ان سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے مادہ خود کوئی چیز نہیں: لِقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ: چونکہ زمین کے ٹکڑے اور مختلف رنگ، باغوں اور فصلوں کی مختلف کیفیات، درختوں اور پھلوں کے مختلف ذائقوں اور رنگوں کے حالات کیلئے عقل کی ضرورت ہے کیونکہ یہ عقلی امور ہے۔ اس لئے فرمایا: یَعۡقِلُوۡنَ:

وَ اِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝

"اگر آپ ان کافروں کی (سوچ) پر تعجب کرتے ہو تو ان کی تعجب والی بات یہ ہے کہ جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی پیدائش میں پیدا ہونگے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر کفر کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے گلوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں اور وہ جہنم میں رہنے والے ہیں وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے" [5]۔

تفسیر 5 اس آیت میں منکرین قیامت کیلئے وعید ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ان کے توحید سے انکار پر تعجب کرتے ہو تو اس سے زیادہ حیرت انگیز ان کی ایک بات دوسری ہے اس پر بھی تعجب کریں اور وہ انکار قیامت، انکار بعث بعد الموت ہے: فَعَجَبٌ: یعنی تعجب والا ہے۔ تعجب کی وجہ یہ ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ظاہر انکار ہے: أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ: اس میں دلیل ہے کہ آخرت سے انکار یقیناً کفر ہے: وَأُولَئِكَ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ: یہ دنیا میں بطور مثال ہے۔ یعنی ان کی گردنوں میں تقلید کی گمراہی کی پٹے لگے ہیں ان کے پاس ابھی اس بات پر کوئی دلیل نہیں۔ یا قیامت میں حقیقتاً ان کو طوق پہنایا جائے گا: اَلْأَغْلَالُ: یہ غل کی جمع ہے چمڑے کا وہ پٹہ جس پر بال ہوا اور اس میں جوئیں بھی ہوں۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۗ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۖ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

"اور جو تجھ سے (طلب سزائیں) راحت سے پہلے جلدی کر رہے ہیں یقیناً ان سے پہلے سزائیں بطور مثال گزر چکی ہیں اور یقیناً تیرا رب البتہ بخشنے والا ہے انکے ظلم کے باوجود بھی اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ تیرا رب بڑی سزا دینے والا بھی ہے"[6]۔

تفسیر6 اس آیت میں ان لوگوں کیلئے وعید ہے جو ایمان تو لائے نہیں اور عذاب طلب کرنے میں جلد بازی کرتے رہتے ہیں جیسا کہ سورۃ انفال آیت32 میں ہے :قَبْلَ الْحَسَنَةِ:اس سے ایمان لانا اور شرک سے تائب ہونا مراد ہے۔ :اَلْمَثُلٰتُ: یہ مُثْلَةٌ :کی جمع ہے اس عذاب کو کہا جاتا ہے جو رسوا کرنے والا ہو قتل ہونے والے شخص کے جب ناک کان وغیرہ کاٹ دیئے جائیں تو اسے مثلہ کہتے ہیں جس سے حدیث میں منع آیا ہے۔(صحیح بخاری کتاب المظالم حدیث 2474، ابن ماجه کتاب الجهاد حدیث 2857، ابن حبان 588/4):وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ: ظلم سے مراد کفر اور شرک ہے اور مغفرت سے مراد عذاب کو موخر کرتے رہنا ہے یعنی اللہ تعالٰی لوگوں کو شرک کا ارتکاب کرنے کے باوجود ڈھیل دیتا ہے۔ یا مغفرت اپنے معنی پر ہے البتہ ایمان کے ساتھ مشروط ہے اس کے ساتھ مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالٰی لوگوں کو معاف کرتا ہے جب شرک کے بعد ایمان لے آتے ہیں یا ظلم شرک اور کفر کے سوا دیگر گناہ مراد ہے اور الناس سے ایمان والے مراد ہیں۔ تو پھر یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالٰی ایمان والوں کو گناہوں کے باوجود معاف کرتا ہے جب وہ چاہتا ہے اور جب چاہے تو ایک وقت مقرر تک عذاب دیگا۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ ع

"اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس نبی پر ان کے رب کی جانب سے کوئی معجزہ کیوں نہیں اتارا گیا (اے نبی) آپ تو ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کیلئے کوئی نہ کوئی رہنما ہوا ہے"[7]۔

تفسیر7 اس آیت میں مشرکین کیلئے معجزات طلب کرنے پر وعید ہے اور یہاں پر آیت سے مراد نئے عذاب ہیں آسمان یا زمین سے ہوں یہاں :يَسْتَعْجِلُونَكَ: کا قرینہ اس پر دلالت کر رہا ہے نیز سورۃ بنی اسرائیل آیت 92 میں بھی اس طرح ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ماننا ہے کہ معجزات نبی کے اختیار میں ہیں اب اور نئے معجزات طلب کرتے ہیں

حالانکہ ایسا نہیں نبی کا کام صرف انذار ہے معجزات کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے: وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ: یہ مستقل جملہ ہے جس میں مبتدا موخر اور خبر مقدم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر قوم کیلئے رہنما ہوتا ہے خواہ نبی ہو یا غیر نبی ہو۔ یا پھر یہ جملہ منذر پر عطف ہے لہٰذا پھر یہ معنی ہوگا کہ یقیناً آپ ڈرانے والے ہیں اور ساری قوموں کے ہادی ہیں۔ اس میں آخری نبی کی تمام قوموں کیلئے عمومی طور سے بعثت ثابت ہوئی یا پھر مبتدا حذف ہے تو عبارت اس طرح ہے کہ: وَاللّٰهُ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ "یعنی اللہ تعالیٰ ہر ایک قوم کا ہادی ہے۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝

"کسی بھی مادہ کو جو بھی حمل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے اور ماؤں کے رحم میں جو کمی بیشی ہوتی ہے اس کو بھی اور ہر چیز کا اس کے پاس ایک اندازہ مقرر ہے [8]۔ وہ غائب اور حاضر کی تمام باتوں کو جاننے والا ہے اس کی ذات بہت بڑی اور شان بہت اونچی ہے [9]۔ تم میں سے کوئی چپکے سے بات کرے یا زور سے کوئی رات کے وقت چھپا ہوا ہو یا دن کو چل پھر رہا ہو وہ سب (بلحاظ علم الٰہی) برابر ہے" [10]۔

خلاصہ: اس آیت سے آیت 14 تک دوسرا باب ہے اس باب میں رد شرک فی العلم پر پانچ عقلی دلائل ہیں آیت 8 سے 12 تک پھر آیت 13 میں ملائکہ کی حالت کا بیان نقلی دلیل کی حیثیت سے تخویف کے لئے ذکر کی ہے پھر رد شرک فی الدعاء کا بیان ہے۔

تفسیر 8، 9، 10 اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل بیان کرنے کے بعد آیت 8، 9، 10 میں علم غیب ثابت کر رہے ہے: وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ: مراد یہ ہے کہ کبھی بچہ 9 ماہ کی مقررہ مدت میں پیدا ہوتا ہے اور کبھی 9 ماہ کی مقررہ مدت کے بعد پیدا ہوتا ہے اور مقررہ مدت کے بعد اضافی مدت میں آئمہ کا اختلاف ہے: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ 2 سال تک بچہ ماں کی پیٹ میں رہ سکتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک 4 سال امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک 5 سال تک اور کم سے کم مدت 6 ماہ کی ہے اسی طرح کبھی بچے کے اعضاء اور جوڑ کم ہوتے ہیں کبھی زیادہ اسی طرح بعض بچے ناقص الخلق پیدا ہوتے ہیں آیت کے مضمون میں یہ سب قسمیں شامل ہے: وَمَا تَزْدَادُ: ایک سے زیادہ بچوں کا پیدا ہونا بھی اس میں شمار ہے: وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ: اس کا ایک معنی گھومنے پھرنے کا ہے دوسرا معنی ظاہر ہونے کا ہے تیسرا معنی

چھپ جانے کا ہے مگر پہلے والا زیادہ صحیح ہے: اَلْکَبِیْرُ: یہاں بڑائی ذات اور صفات دونوں کیلئے شامل ہے اَلْمُتَعَالِ: یہ علو سے لیا گیا ہے یعنی بلند ہے جو کہ مستوی علی العرش ہے یعنی عرش کے اوپر ہے اس کی ذات سے بلند کوئی چیز نہیں ہے۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

"ہر شخص کے آگے پیچھے نگران (ملائک) مقرر ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے باری باری اس کی حفاظت کرتے ہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا ہے جب تک وہ خود اپنے حالات میں تبدیلی نہ لے آئیں اور جب اللہ کسی قوم پر آفت لانے کا فیصلہ کرلیتا ہے تو پھر اس کا ٹالنا کسی کے بس میں نہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کوئی بچانے والا نہیں" [11]۔

تفسیر 11 یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کے تصرف اور علم پر عقلی دلیل ہے: مُعَقِّبٰتٌ: اس میں وہ ملائک مراد ہیں جو دن اور رات کو باری باری سے انسانوں کی حفاظت کیلئے آتے ہیں جو کراما کاتبین کے علاوہ ہیں اور لفظ (لَهٗ) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ان ملائک کا آنا جانا ہے: يَحْفَظُوْنَهٗ: جنات اور دیگر شرور والی چیزوں سے ان کی حفاظت کرتے ہیں: مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ: یہ: يَحْفَظُوْنَهٗ: کے ساتھ متعلق ہے یا پھر: مُعَقِّبٰتٌ: کے ساتھ متعلق ہے: مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ: (مِنْ) اجلیہ ہے یا پھر (بِا) کے معنیٰ میں ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ اسی طرح سوۃ انفال آیت 53 میں گزرا ہے اور سوال کا جواب ہے کہ جب انسانوں کی حفاظت میں ملائک مسخر ہیں تو پھر ان پر مصیبتیں کیوں آتی ہیں تو جواب ہے کہ جب انسان اپنا آپ بدل دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنے ملائک کو ان کی حفاظت سے ہٹا دیتا ہے یعنی جب وہ توحید اور سنت چھوڑ کر کفر اور شرک اختیار کر لیتے ہیں تو پھر یہ تبدیلی واقع ہوتی ہے: يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ: اس میں یہ مقصد ہرگز نہیں کہ انسان میں حالات تبدیل کرنے کی قوت اور صلاحیت ہے بلکہ یہ سببی نسبت ہے۔ یعنی ان کے گناہوں کے سبب سے اچھائی برائی میں بدل جاتی ہے: وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ: اس میں بھی سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک انسان نے کوئی برائی کا عمل بھی نہیں کیا پھر بھی مصیبتوں کی لپیٹ میں آتا ہے تو ملائک کیسے اس کی حفاظت کرتے ہیں؟ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر مصیبت اللہ تعالیٰ کے ارادے سے آتی ہے ملائک اور دیگر مخلوق اللہ تعالیٰ کے ارادے کو ٹالنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾

"وہی ذات تو ہے جو تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے تمہیں خوف (بجلی گرنے کا) اور امید (بارش نازل) ہوتی ہے اور وہی تو ہے جو (پانی سے) لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے" [12]۔

تفسیر 12 اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کے متصرف ہونے پر عقلی دلائل ذکر ہیں: خَوْفًا وَّ طَمَعًا: یعنی آسمان سے بجلی گرنے کا خوف بھی رہتا ہے جبکہ انہیں بادلوں سے بارش کی امید بھی ہوتی ہے اسی طرح بارش سے ان لوگوں کو ڈر لگتا رہتا ہے جنہیں بارش سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے اور جن لوگوں کے لیے بارش میں فائدہ ہو تو انہیں فائدے کی طمع لگی رہتی ہے: اَلثِّقَالَ: وہ بادل جو بارش سے لدے ہوئے ہوں۔

وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَ هُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾

"رعد تسبیح پڑھتا ہے اس کی حمد کے ساتھ اور دیگر ملائکہ بھی اس کے خوف سے اور وہی ذات کڑکتی ہوئی بجلیاں جن پر چاہتا ہے مصیبت بنا کر گرا دیتا ہے اور ان (کافروں) کا حال یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بحثیں کر رہے ہیں حالانکہ اس کی طاقت بڑی زبردست ہے" [13]۔

تفسیر 13 اس آیت میں ملائکہ کی جانب سے توحید باری تعالیٰ پر دلیل نقلی ذکر ہوئی ہے جو بصورت حمد اور تسبیح ہے اور اس کے ساتھ تخویف دنیوی بھی مذکور ہے یعنی دنیوی عذاب سے ڈرانا مقصود ہے: اَلرَّعْدُ: یہ ایک ملک ہے جو بادلوں پر مقرر اور اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح میں ہر وقت مصروف رہتا ہے خصوصاً جب بارش جاری ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ رعد بادلوں کی آواز کو کہا جاتا ہے یعنی ان کا کڑکنا۔ ان کی طرف تسبیح کی نسبت حال کے اعتبار سے ہے مقال یعنی کلام کے اعتبار سے نہیں یعنی بادلوں کے گرجنے کے وقت گویا وہ رب کی حمد و تسبیح کرتے ہیں: وَهُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ: اس میں واؤ برائے حال ہے یعنی ان پر بجلی گرتی ہے جب وہ جدال کرتے ہیں یا واؤ استینافیہ ہے جو مشرکین کیلئے برائے تنبیہ ہے۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَى الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

''وہی تو ہے جس سے دعا طلب کرنا برحق ہے اور اس کو چھوڑ کر یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں وہ ان کی کوئی حاجت پوری نہیں کر سکتے البتہ اس کی مثال اس شخص کی ہے جو پانی کو طلب کرنے کیلئے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے منہ تک خود پہنچ جائے حالانکہ وہ کبھی اس کے منہ تک خود نہیں پہنچ سکتا اور نہیں ہے کافروں کا (غیر اللہ کو) پکارنا مگر بھٹکتے رہنا''[14]۔

تفسیر 14 ''لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ: اس کی دو توجیہات ہیں۔ پہلی توجیہ کے مطابق معنیٰ یہ ہے کہ (لَهٗ) خبر مقدم ہے جو برائے تخصیص ہے اور اس میں موصوف کی اضافت صفت کی طرف کی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ہی پکارنا برحق ہے جبکہ غیر اللہ کو پکارنا باطل ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ دعوۃ الحق سے مراد توحید کی دعوت ہے تو اس اعتبار سے یہ معنیٰ ہوا کہ توحید کی دعوت خالص اللہ کی دعوت ہے اور مشرکین کی دعوت باطل ہے۔ پہلی والی توجیہ بعد والے جملہ کے ساتھ زیادہ موافق ہے لہٰذا وہ بہتر ہے۔ اس آیت میں رد شرک فی الدعاء ہے جو بطور مثال بیان ہوا ہے۔ مثال کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی پیاس بجھانے کیلئے پانی کی طرف ہاتھ پھیلایا ہوا ہو اور پانی کو آواز بھی بلانے کیلئے دے رہا ہو لیکن وہ پانی از خود اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکتا اسی طرح جو بھی اللہ تعالیٰ کے سوا جن ہستیوں کو پکارتا ہے وہ ان کو اپنا حاجت روا یا مشکل کشا مانتے ہیں وہ یا تو ان سے دور ہیں تو دور ہونے کی وجہ سے ان کی پکار نہیں سن پاتے اگر مردے ہیں تو آواز نہیں سنتے اور حاجت پوری کرنے پر قادر نہیں ہیں اس میں معبودان باطلہ کی تشبیہ پانی کے ساتھ دی گئی ہے جو نہ تو سنتے ہیں نہ جانتے ہیں اور نہ ہی خود کسی کی مدد کر سکتے ہیں۔ مثال کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک پیاسا انسان سراب دیکھ کر یہ گمان کر لیتا ہے کہ یہ پانی ہے اور اس کی طرف ہاتھ پھیلا دے کہ وہ پانی اس کے منہ میں پہنچ جائے مگر وہ تو پانی ہی نہیں ہے بلکہ اس کا گمان ہی غلط ہے اس میں ان مشرکین کا گمان بطور مثال ذکر ہوا ہے جو باطل معبودوں پر معبود برحق کا گمان کر بیٹھے ہیں اپنی حاجتیں ان کے سامنے پیش کرتے ہیں حالانکہ وہ ان کی حاجتوں کو پورا کرنے پر قادر نہیں ہے لہٰذا ان کا عقیدہ باطل ہے جو غیر اللہ کو الٰہ بنا چکے ہیں۔ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ: مراد یہ ہے کہ جو کافر مشرک اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں ان سے دعا طلب کرتے ہیں یہ دعا نہیں یہ تو شرک اور گمراہی ہے دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ کافر جو اللہ تعالیٰ سے دعائیں طلب کرتے ہیں تو وہ ضائع

ہیں اس پر اجر نہیں ملتا ہے اگرچہ بعض اوقات دنیاوی فائدے ان کو حاصل ہوتے ہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾

''اور وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات تو ہے جس کو ہر وہ چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے سجدہ کرتی ہیں خواہ خوشی سے ہو یا مجبوری سے اور ان کے سائے بھی صبح وشام اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں'' [15]۔

خلاصہ: اس آیت سے آیت 25 تک تیسرا باب ہے اس میں نویں دلیل عقلی ہے پھر دسویں دلیل عقلی آیت 16 میں ہے۔ پھر شرک فی التصرف پر رد ہے اور دو مثالیں بیان کی گئی ہیں پھر دو مثالوں سمیت گیارہویں عقلی دلیل بیان کی گئی ہے آیت 17 میں پھر موحدین اور مشرکین کا تقابل کیا گیا ہے جو خوف اور خوشخبری پر مبنی ہے اور مومنین کو دس صفات حسنہ پر خوشخبری دی گئی ہے آیت 18 تا 24 اور مشرکین کی تین صفات کا ذکر اور ان کو خوف دلایا گیا ہے آیت 25 میں۔

تفسیر 15 اس آیت میں دلائل عقلیہ میں نویں دلیل بیان ہوئی ہے۔ اور تمام عالم کا سجدہ ذکر ہوا ہے اور یہ سجدہ برائے تسلیم اور اپنی عاجزی کا اظہار کرنے کے لئے ہے۔ مومن ہر ایک حالت کو خوشی سے قبول کرتا ہے خواہ امر تشریعی ہو یا تکوینی ہو۔ جبکہ مشرکین تکوینی حکم مجبوراً مانتے ہیں یا پھر سجدہ سے حقیقی سجدہ مراد ہے اور مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ: سے ملائک مراد ہیں اور وَالْاَرْضِ سے مومنین مراد ہیں: كَرْهًا: سے مراد یہ ہے کہ دلائل کے سامنے مجبور ہوتے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ کیلئے سجدہ خالص کرتے ہیں۔ یا مراد: طَوْعًا وَّ كَرْهًا: سے یہ ہے کہ خوشی ہو یا غم ہر دونوں صورتوں میں ایمان والے اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہے: بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ: بعض ملکوں میں زوال کے وقت سایہ نہیں ہوتا ہے اس لئے زوال کا ذکر نہیں ہوا یا غدو سے مراد زوال سے قبل کا وقت ہے اور آصال سے زوال کے بعد والا وقت مراد ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا
وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا
كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

"اے نبی! آپ فرمادیجئے (ان کافروں سے) کہ وہ کون ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے فرمادیجئے وہ اللہ ہی تو ہے فرمادیجئے کہ کیا پھر بھی اس کو چھوڑ کر تم نے اوروں کو کارساز بنالیا ہے جو اپنی ذات کو نہ نقصان دینے پر قادر ہیں اور نہ ہی نفع دینے پر فرمادیجئے کہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوسکتا ہے؟ یا اندھیرے اور روشنیاں برابر ہیں یا ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کیلئے ایسے شریک مانے ہیں جنہوں نے کوئی چیز اس طرح پیدا کی ہے جیسے اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے اور اس وجہ سے ان دونوں کی تخلیق ایک جیسی معلوم ہورہی ہو (اس غلط فہمی کا جواب یہ ہے کہ) فرمادیجئے صرف اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اور وہ اکیلا ہی ایسا ہے کہ اس کا اقتدار سب پر حاوی ہے" [16]۔

تفسیر 16 اس آیت میں دسویں دلیل عقلی ہے پھر مشرکین کیلئے زجر اور تنبیہ اور شرک فی التصرف پر رد ہے۔ پھر دو مثالیں بیان کی گئی مشرک اور موحد کی یعنی الاعمیٰ مشرک اور البصیر موحد کو کہا گیا ہے اور دوسری مثال شرک اور توحید کی ہے یعنی الظلمات سے مراد شرک اور النور سے توحید مراد ہے۔ پھر مشرکین کیلئے زجر اور تنبیہ ہے اور انہیں ملامت کیا جارہا ہے کہ خالق تو ساری کائنات کا ذات الٰہی ہے پھر تم اس کے ساتھ کیوں اوروں کو اللہ تعالیٰ کے صفات میں شریک ٹھہراتے ہو؟ جب سب مخلوقات کا خالق ایک اللہ ہی ہے تو پھر بندگی اور عبادت بھی اسی کا حق ہے اور کوئی کیونکر اس میں شریک ہوسکتا ہے: قُلِ اللّٰهُ جب مشرکین نے خاموشی اختیار کرلی کیونکہ وہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے تو پھر نبی کریم ﷺ کو حکم ہوا کہ آپ خود جواب دے دیں: اَفَاتَّخَذْتُمْ: شرک فی الربوبیت کی تردید کے بعد اب شرک فی التصرف پر رد ہوا ہے اسی طرح سورۃ فرقان آیت 3 میں بھی ہے: اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ: اس میں غیر اللہ سے خالقیت کی نفی کرکے شرک فی الوہیت پر رد کیا گیا ہے اور استفہام انکاری ہے۔

أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ
ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا
مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ

"اسی نے آسمان سے پانی برسایا جس سے ندی نالے اپنی بساط کے مطابق بہنے لگے پھر پانی کے ریلے نے پھولے ہوئے جھاگ کو اوپر اٹھا لیا اور اسی قسم کا جھاگ اس وقت بھی اٹھتا ہے جب لوگ زیور یا برتن آگ میں ڈال کر تپاتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے جھاگ تو ناکارہ ہو جاتا ہے لیکن جو لوگوں کو نفع دینے والی چیز ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ مثالیں بیان فرماتا ہے" [17]۔

تفسیر 17 اس آیت میں گیارہویں عقلی دلیل بیان ہو رہی ہے پھر دو مثالیں بیان کی ہیں جس میں حق اور باطل کا مقابلہ ذکر ہے پہلی مثال: کی تفصیل یہ ہے کہ جب بارش برستی ہے تو وادیوں میں ان کے حجم کے بقدر پانی جمع ہوتا رہتا ہے پھر سیلان پانی کی وجہ سے انہیں جمع شدہ پانی پر جھاگ آتا ہے اور بہت کم عرصے تک جھاگ خالص پانی پر غالب رہتا ہے پھر جھاگ خشک ہو جاتا ہے اور لوگوں کے فائدے کے لیے صاف پانی رہ جاتا ہے۔ اس کی مطابقت اس طرح ہے کہ لوگ اپنی وسعت کے مطابق کتاب و سنت کا علم حاصل کر لیتے ہیں پھر وہ مثل سیلاب کے دعوت حق کیلئے مختلف سمتوں میں روانہ ہو جاتے ہیں تو جہاں یہ حق پرست دعوت حق شروع کر لیتے ہیں تو مقابلے میں باطل پرست لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور حق کے خلاف شکوک اور شبہات لوگوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں تو ابتداء میں تو وہ غالب نظر آتے ہیں پھر کچھ عرصہ کے بعد یہ مغلوب ہو کر رہ جاتے ہیں اور حق دین لوگوں میں پھیل کر راسخ ہو جاتا ہے اور لوگوں میں جڑ پکڑ لیتا ہے لوگ اس سے فائدے حاصل کرتے ہیں۔ دوسری مثال: کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ سنار سونا چاندی پیتل وغیرہ آگ میں پگھلاتے ہیں تو بعض سے زینت کیلئے زیور بنا لیتے ہیں اور بعض سے دیگر سامان بنا لیتے ہیں جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس سونے چاندی تانبے کو پگھلانے کے بعد جھاگ آتا ہے پھر وہ جھاگ تو خشک ہو جاتا ہے اور خالص سونا چاندی وغیرہ باقی رہ جاتا ہے جو زیور اور سامان کی صورت میں لوگوں کیلئے نفع بخش ہوتا ہے کوئی برتن بناتے ہیں کوئی دیگر سامان وغیرہ جس سے لوگ فائدے حاصل کرتے ہیں تو اس مثال کی موافقت اس طرح ہے کہ قرآن و سنت کے علماء اپنی طاقت و وسعت سے علم حاصل کرنے کے بعد مختلف علاقوں میں درس و تدریس میں مصروف عمل رہتے ہیں اور غلط مسائل جو کہ شرک و بدعت رسم و

رواج کو صحیح مسائل یعنی توحید وسنت سے الگ کرتے رہتے ہیں اس کے ذریعے سے اور علماء کو پیدا کرتے ہیں جو دو قسم کے ہوتے ہیں ایک جو دوسروں کو فائدہ دیتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو خود اپنے لئے علم سے فائدہ حاصل کرتے ہیں لیکن ان کے خلاف باطل پرست پیر اور مولوی کھڑے ہوتے ہیں البتہ بعد میں ان کی قوتیں دم توڑ دیتی ہیں اور حق پرستوں کو کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ فائدہ: ثابت ہوا کہ دعوت دو طریقوں سے ہے (١) مختلف علاقوں میں سفر کرتے ہوئے لوگوں کو حق کی دعوت دینا۔ دوسرا طریقہ درس اور تدریس کا ہے اور دونوں مثالوں میں قرآن وسنت کو مبدء قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ صحیح دعوت قرآن وسنت کے علم کے بغیر نہیں ہو سکتی دعوت کے لیے ضروری ہے کہ داعی کے پاس بھی پختہ علم ہو۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۗ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۗ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝١٨

"جنہوں نے اپنے رب کا کہنا مانا ان کیلئے بھلائی ہے اور جنہوں نے رب کا کہنا نہیں مانا اگر ان کے پاس دنیا کی ساری چیزیں بھی ہوں بلکہ اتنی اور بھی ہوں تو وہ اپنی جان بچانے کیلئے (قیامت کے دن) وہ سب کچھ دینے کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ ان لوگوں کے حصے میں برا حساب ہے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے" [18]۔

تفسیر 18 دعوت حق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ان دو جماعتوں کا اس آیت میں بیان ہو رہا ہے۔ [illegible] اہل حق [illegible] اہل باطل جو ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں اس آیت میں اہل حق کیلئے خوشخبری اور اہل باطل کیلئے آخرت کا عذاب ذکر ہے: سُوْٓءُ الْحِسَابِ: برا اور سخت حساب یہ ہے کہ ہر جرم اس کا معاف نہ ہو اور ہر چھوٹی سی چھوٹی چیز کا اس سے حساب لیا جائے۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۗ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝١٩

"جو شخص یقین رکھتا ہو کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا ہے وہ برحق ہے کیا وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو بالکل اندھا ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ ہدایت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل و ہوش رکھتے ہوں" [19]۔

تفسیر 19 اس آیت میں بھی فریقین کے تقابل کا ذکر ہے ایک جو توحید اور قرآن وسنت کی حقانیت کا علم اور یقین رکھتا ہے یہ اَسْتَجَابُوْا: میں داخل ہے اور دوسرا فریق وہ ہے جو لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا: والے ہے جو قرآن وحدیث سے جاہل ہے اور مثل الاعمٰی نابینا کے ہے اور اس آیت میں ایمان والوں کی دس صفات میں سے پہلی صفت ذکر ہوئی ہے جو کہ

أُولُوا الْأَلْبَابِ نہ ہے۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿20﴾

"وہ لوگ جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور کئے ہوئے وعدے کی مخالفت نہیں کرتے"[20]۔

تفسیر 20 اس آیت میں اہل حق کی دو صفات کا بیان ہے اور: يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ: اس عہد سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور تمام اوامر ونواہی مراد ہے یعنی جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے یا اس سے روکا گیا ہے اور یہ عہد عقلی ونقلی دلائل سے مضبوط کیا گیا ہے اسلئے اس کو میثاق کہا گیا ہے لہٰذا عہد ومیثاق ایک ہی چیز ہے یہاں پر ایک صفت: يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ: ثبوتی ہے اور دوسری صفت: لَا يَنْقُضُوْنَ: سلبی ہے یا عہد سے اللہ تعالیٰ کے وعدے مراد ہیں اور میثاق سے بندوں کے آپس کے معاہدے اور عہود مراد ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿21﴾

"اور جن رشتوں کو اللہ تعالیٰ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے یہ لوگ انہیں جوڑے رکھتے ہیں اور اپنے مالک سے ڈرتے ہیں اور حساب کے برے انجام سے ڈرتے ہیں"[21]۔

تفسیر 21 اس میں اہل حق کی تین صفات کا ذکر ہے پہلی صفت کی تشریح سورہ بقرہ میں گزری ہے۔ خشیت اور خوف میں فرق یہ ہے کہ اکثر مقام تعظیم میں خشیت کا استعمال ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ مخشی عنہ (جس سے ڈرا جائے) کے بارے میں علم بھی ہو جبکہ خوف عام ہے یہ تعظیم اور بغیر تعظیم دونوں جگہ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ شیطان کبھی کبھار اللہ تعالیٰ سے خوف کھاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں ہوتا جیسا کہ غزوہ بدر میں ہوا کبھی غیر اللہ سے بھی طبعی خوف ہوتا ہے جبکہ خشیت اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہے۔

وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾

"اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی خوشنودی کیلئے صبر کیا اور نماز قائم کی ہے اور ہم نے جو انہیں رزق دیا ہے اس میں سے خفیہ اور اعلانیہ خرچ کرتے ہیں اور وہ بدسلوکی کا جواب حسن سلوک سے دیتے ہیں اور ان کا انجام آخرت میں بہت بہتر ہے" [22]۔

تفسیر 22 اس آیت میں اہل حق کی چار صفات بیان ہوئی ہیں: صَبَرُوْا: صبر تین طرح کا ہوتا ہے [redacted] بیماریوں اور مصیبتوں پر صبر کرنا (۲) احکام شرعی، واطاعتوں پر صبر کرنا (۳) حرام اور گناہوں سے اجتناب کرتے ہوئے صبر کرنا۔ اِبْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ: اس جملے سے صبر کی وہ تمام اقسام خارج ہوجاتی ہیں جن کے کرنے پر کوئی ثواب نہیں جیسے ریاکاری کے لیے صبر کرنا تاکہ لوگ صابر کا لقب دیں یا لوگوں کے ڈر سے کہ لوگ عیب جوئی نہ کریں صبر کرنا یا دشمنوں کی خوشی کے ڈر سے صبر کرنا اگرچہ یہ بھی صبر کی اقسام ہیں ان پر ثواب نہیں ملتا کیونکہ اجر صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں منحصر ہے۔ وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ: اس کا ایک معنی یہ ہے کہ توحید وسنت کے بیان سے شرک و بدعت کو دفع یعنی مٹاتے ہیں۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ جاہلوں کی بداخلاقی اچھے اخلاق سے دفع کرتے ہیں۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ گناہوں کو توبہ کے ذریعے دفع کرتے ہیں۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

"یعنی ہمیشہ رہنے کیلئے وہ باغات جن میں وہ ہمیشہ کیلئے خود بھی داخل ہونگے اور ان کے باپ دادوں بیویوں اور اولاد میں سے جو نیک ہونگے وہ بھی اور (ان کے استقبال کیلئے) ملائکہ ان کے پاس ہر دروازے سے داخل ہونگے [23]۔ (اور یہ کہتے ہوئے) کہ تم پر سلامتی نازل ہوگی اس کے بدلے میں جو تم نے دنیا میں صبر کیا تھا اور تمہارے اصل ٹھکانے میں تمہارا بہتر انجام ہے" [24]۔

تفسیر 23، 24 ان آیتوں میں مذکورہ صفات والوں کیلئے خوشخبری ہے: وَمَنْ صَلَحَ: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دائمی

توحید کے ساتھ توحید وسنت کی دعوت میں موافقت کرتے ہیں تا ہم اعمال صالحہ بجالاتے ہیں اور اس وائی سے پیچھے رہتے ہے۔ بِمَا صَبَرْتُمْ: گزشتہ تمام صفات پر صبر مشتمل ہے اس لیے اس کے ذکر پر اکتفا کیا گیا: وَمَنْ صَلَحَ: اس سے معلوم ہوا کہ صرف نسب قائم نہیں رہتا جب تک عقیدہ میں موافقت نہ ہو جس کی تعبیر یہاں صلاحیت سے ہوئی۔ یہاں مراد عقیدہ توحید موافقت اسی طرح حق پرستی میں موافقت اور تمام اعمال صالحہ میں برابری کرنا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ۝

"اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو مضبوطی کے بعد توڑتے ہیں اور جن رشتوں کو اللہ تعالیٰ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے اس کو کاٹ ڈالتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کیلئے لعنت ہے اور ان کا آخرت کا گھر (انجام اچھوٹی) برا ہے" [25]۔

تفسیر 25 گزشتہ آیات میں مومنین کی اچھی صفات کے مقابلے میں اب یہاں منکرین توحید کی تین قباحتوں کا بیان ہو رہا ہے اور بیان کے لیے تخویف اخروی بھی ہے سورۃ بقرہ آیت 27 میں بھی یہی مضمون گزر چکا ہے جنت اور سلام کے مقابل: اَللَّعْنَةُ: آیا ہے۔ عقبی الدار کے مقابل: سُوْۗءُ الدَّارِ: آیا ہے۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝ ۧ

"حالانکہ اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہتا ہے رزق وسیع کر دیتا ہے اور جس کیلئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے حالانکہ دنیاوی زندگی کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ معمولی پونجی ہے" [26]۔

خلاصہ: اس آیت سے آیت 32 تک چوتھا باب ہے اس میں بارھویں دلیل عقلی اور منکرین کے لیے زجر اور تنبیہ آیت 26 میں ہے۔ پھر آیت 27 میں منکرین رسول کیلئے زجر اور توبیخ ہے پھر 28، 29 میں خوشخبری ہے آیت 30 میں اثبات رسالت اور توحید ہے پھر آیت 32 میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔

تفسیر 26 اس آیت میں بارھویں عقلی دلیل ہے اور دنیا کی محبت پر ڈانٹ (وعید) ہے جو سابقہ بری عادتوں کیلئے سبب ہے اس آیت میں اشارہ ہے سوال کے جواب کی طرف اور وہ یہ ہے کہ ان کی مالداری اور رزق کی فراخی اس بات پر دلیل ہے کہ ان پر لعنت نہیں ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ رزق کی فراخی کا کوئی اعتبار نہیں ہے: وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: اس کو

فرح البطر (تکبر) کہتے ہیں جو کہ حرام ہے: مَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ: اس میں دنیا سے بے رغبتی کا ذکر ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ﴿٢٧﴾

"اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ان پر (یعنی محمد ﷺ پر) ان کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی ہے آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور انہی کو اپنے راستے کی ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کریں" [27]۔

تفسیر 27 اس آیت میں معجزہ طلب کرنے کی وجہ سے منکرین کیلئے وعید ہے اور اس کا جواب بھی دیا گیا ہے اور یہ فَرِحُوا پر عطف ہے اور اس میں دلیل ہے کہ ان کا یہ قول تکبر پر مبنی ہے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں تو معجزات بھی اسی کے اختیار میں ہیں: مَنْ أَنَابَ: اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرف حق ہو تو دلی طور پر اس کی طرف متوجہ ہو جائے اور ضد وعناد کو ترک کریں۔ اس آیت میں معجزہ وہ مراد ہے جو رزق کی فراخی سے متعلق ہو جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل آیت 91، 93 میں ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿٢٨﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور جن کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں یاد رکھو اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے" [28]۔

تفسیر 28 اس آیت میں خوشخبری ہے اور اس بات پر دلیل ہے کہ قرآن وحدیث جس مسئلہ پر بیان ہو جائیں تو اس پر یقین کرنا چاہئے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ توحید باری تعالیٰ اور تلاوت قرآن سے دلی تسلی واطمینان حاصل ہوتا ہے: أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ: چونکہ سابقہ جملہ میں تخصیص نہیں تھی تو اس جملے کو تخصیص کی غرض سے ذکر کیا گیا ہے اسلئے ذکر اللہ کو مقدم کیا ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اطمینان ایمان والوں کے ساتھ خاص ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ خاص ہے اور اس سے قرآن وسنت مراد ہے اور ذکر قلبی لسانی جو کہ ہمیشہ ہو۔ نیز یہ بھی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر جب قسم اٹھائی جائے تو مومن کا دل مطمئن ہو جاتا ہے اور یہ بھی مراد ہے کہ مومن کے سامنے جب کسی مسئلے کی دلیل کے لیے قرآن وسنت سے دلیل دی جاتی ہے مومن کا دل اس دلیل سے مطمئن ہو جاتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

"جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے ان کیلئے خوشحالی اور آخرت کا بہترین انجام ہے" [29]۔

تفسیر 29 اس آیت میں خوشخبری ہے۔طُوْبٰی: اچھے حالات کے معنی میں ہے تو جنت اور اس کے درخت اس میں داخل ہیں اور جنت کی تمام نعمتیں مراد ہیں۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِیْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَیْهِمُ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَهُمْ یَكْفُرُوْنَ
بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

"(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) اسی طرح آپ کو ہم نے ایک امت کی طرف بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی امتیں گزری ہیں تاکہ آپ ان کو وہ کتاب پڑھ کر سنا دیں جو ہم نے آپ پر بذریعہ وحی نازل کی ہے اور یہ لوگ اس ذات کی ناشکری کرتے ہیں جو سب پہ مہربان ہے فرما دیجئے وہ میرا پالنے والا رب اس کے سوا عبادت کا کوئی مستحق نہیں میں نے اسی پر بھروسہ کر رکھا ہے اور مجھے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے" [30]۔

تفسیر 30 اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات ہے اور بعثت رسول کی حکمت کا بیان ہے اور اس میں توحید کا دعویٰ ذکر ہوا ہے جو وحی کا خلاصہ ہے اور اس کو اصطلاح میں دلیل وحی بھی کہتے ہیں:وَهُمْ یَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ: اس سے اللہ تعالیٰ کی توحید رحمانیت سے انکار مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو رحمٰن تسلیم کرتے ہیں مگر اس صفت میں غیروں کو بھی شریک کرتے ہیں جیسے یہ لوگ مسیلمہ کو "رحمان الیمامہ" کہتے تھے۔یا پھر: یَكْفُرُوْنَ: بمعنی یُشْرِكُوْنَ ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک مانتے ہیں:قُلْ هُوَ رَبِّیْ: اس میں:اَلَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ: کا بیان ہوا ہے یعنی وحی کا خلاصہ توحید کا بیان ہے جو کہ توحید الوہیت اور ربوبیت ہے اور اس میں توحید کے چار جملے ہیں۔ فائدہ: كَمَاۤ اَرْسَلْنَا: یہاں پر مشبہ ذکر نہیں ہوا ہے تو معلوم ہوا کہ کاف لام اَجلیہ کے معنی میں ہے۔مراد یہ ہے کہ جب اطمینان کا ذریعہ (ذکر اللہ) وحی الٰہی ہے تو آپ کو ہم نے وحی بیان کرنے کے لیے بھیجا ہے:قَدْ خَلَتْ: اس میں اشارہ ہے کہ یہ آخری امت ہے اور ان کا نبی بھی خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۭ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ۭ اَفَلَمْ يَايْـــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

"اگر کوئی قرآن ایسا بھی اترتا جس کے ذریعے یہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا دیے جاتے یا اس کی بدولت زمین کٹ جاتی اور اس کے ذریعے مردوں سے بات کی جاتی (تب بھی یہ ماننے والے نہیں) حقیقت میں تمام تر اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں کیا پھر بھی ایمان والوں نے یہ جان کر اپنا ذہن فارغ نہیں کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سارے ہی انسانوں کو راہ راست پر (زبردستی) لے آتا؟ اور جنہوں نے کفر اپنایا ہے ان کے کرتوت کی وجہ سے ان پر کوئی نہ کوئی کھڑکھڑانے والی مصیبت پڑتی رہے گی یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا ہے وہ آکر پورا ہو جائے گا یقیناً اللہ تعالیٰ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ہے" [31]۔

تفسیر 31 اس آیت میں ان کے مطالبے کا جواب ہے ان کا سوال تھا کہ یہ قرآن حق تب ہوگا جب اس کے ذریعے مکہ کے ارد گرد پہاڑوں کو ہٹایا جائے یا زمین میں سرنگ بنا کر چشمے جاری کریں یا مردوں کو زندہ کر کے ہم سے ہم کلام کیا جائے تو جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ سارے کام کر کے بھی دکھائیں تب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے: وَلَوْ أَنَّ قُرْآناً: اس سے پڑھائی گئی کتاب بطور عموم مراد ہے اور لو کی جزا حذف ہے جو کہ یہ ہے: لَكَانَ هٰذَا الْقُرْآنَ: یعنی اگر کسی پڑھی گئی کتاب سے یہ کام ہو سکتے تو وہ ضرور اس کتاب قرآن سے ہو جاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کام کتاب سے نہیں ہوتا بلکہ امر الٰہی سے ہوتا ہے۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ قرآن سے مراد یہ قرآن ہے یعنی نکرہ بمعنی معرفہ ہے اور جزاء حذف ہوا ہے جو لَمَا اٰمَنُوا: ہے تو پھر معنی اس طرح ہے کہ اگر اس قرآن پر یہ سارے کام ہو بھی جائیں تب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ایمان کا اختیار تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے: أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الأَرْضُ: خازن نے لکھا ہے کہ مراد یہ ہے کہ مکہ کی زمین پھٹ جائے اور اس سے نہریں اور چشمے جاری ہو جائیں جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل آیت 91 میں ہے۔ بقول بعض مفسرین سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ: سے داؤد علیہ السلام کا معجزہ مراد ہے۔ اور قُطِّعَتْ بِهِ الأَرْضُ: سے زمین کی مسافت طے کرنا مراد ہے جو مختصر وقت میں زیادہ سفر کرنا ہے جس میں سلیمان علیہ السلام کے تخت کا سفر مراد ہے: أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ میں عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے کی طرف اشارہ ہے: أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِينَ آمَنُوا أَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ

جَمِيْعًا اس میں ایمان والوں کے سوال کا جواب ہے یعنی ایمان والے چاہتے ہیں کہ یہ معجزات انبیائے کرام کو دیئے جائیں تاکہ سارے لوگ ایمان سے منور ہو جائیں تو جواب ہوا کہ کیا ایمان والوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ہدایت تو مشیت الٰہی سے ہے یعنی ان سب کے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی جب تک اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا تو ان کو ہدایت نہیں مل سکتی: أَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا: لیث، ابوعبید اور قطرب کا قول ہے کہ اس سے مراد علم ہے جبکہ امام کسائی نے اس معنیٰ کا انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ نا امیدی کے معنیٰ میں ہے یعنی کیا ایمان والے کافروں کے ایمان سے نا امید نہیں ہوئے ہیں یہاں پر یہ جملہ مخفی ہے کہ: وَيَعْلَمُوْا عِلْمًا يَقِيْنًا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ (الخ) البتہ امام کسائی کو اگر یہ معنیٰ سمجھ میں نہیں آیا تو یہ نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے: وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ) اس میں ایمان والوں کیلئے تسلی اور کافروں کیلئے عذاب کی وعید ہے: أَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ: یہ مونث کا صیغہ ہے اور ضمیر قارعۃ کی طرف راجع ہے تو معنیٰ یہ ہوا کہ عذاب قارعۃ اگر ان پر نازل ہو جائے تو ان کے ملک کے قریب نازل ہوگا اس میں اشارہ ہے کہ دنیاوی عذاب کبھی منکر قوم پر آتا ہے اور کبھی ان کے قریب کسی اور نافرمان قوم پر عبرت کیلئے نازل ہوتا ہے دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ: تَحُلُّ: مخاطب کا صیغہ ہے جس میں نبی کریم ﷺ کو خطاب ہوا ہے اور معنیٰ یہ ہے کہ آپ ان کے ملک یعنی مکہ کے قریب دیگر بستیوں پر غالب ہو کر داخل ہونگے جیسا کہ فتح مکہ سے قبل قرب و جوار کی بستیوں پر آپ ﷺ نے غلبہ حاصل کیا تھا: حَتّٰى يَأْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ: اس سے فتح مکہ یا یوم قیامت مراد ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾

"اور بلاشبہ آپ سے قبل بھی نبیوں کے ساتھ استہزاء کیا گیا تھا اور میں نے ایسے کافروں کو بھی مہلت دی تھی پھر کچھ وقت کے بعد میں نے ان کو اپنی گرفت میں لیا اب دیکھ لو کہ میرا عذاب کیسا تھا" [32]۔

تفسیر 32 اس آیت میں معجزات طلب کرنے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ حقیقت میں اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دینا بھی مراد ہے یعنی جیسے دیگر قوموں کو بھی مہلت دی گئی تھی پھر ان کو عذاب کی لپیٹ میں لیا اسی طرح آپ کی قوم کے ساتھ بھی کرینگے۔

أَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَآءَ ۚ قُلْ سَمُّوهُمْ ۚ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۗ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾

"بھلا بتاؤ کہ وہ ذات جو ہر ہر شخص کے ہر کام کی نگرانی کر رہی ہے اور دوسری طرف انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرائے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے ان شریکوں کے نام تو بتاؤ کیا تم اللہ تعالیٰ کو ایسی ہستیوں کی خبر دیتے ہو جس کا دنیا بھر میں اللہ تعالیٰ کو بھی پتہ نہیں ہے یا صرف زبان سے ایسے نام لے لو گے جن کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کافروں کو اپنی مکارانہ باتیں بہت خوبصورت لگتی ہیں (اس وجہ سے) ان کی ہدایت کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں پڑا رہنے دے (یا خوش رکھے) تو ان کو ہادی نہیں مل سکتا ہے"[33]۔

خلاصہ: یہاں سے پانچواں باب ہے آیت 37 تک۔ اس میں تیرہویں عقلی دلیل ہے اور مشرکین کیلئے زجر اور وعید ہے۔ آیت 33 میں پھر آیت 34 میں تخویف ہے پھر آیت 35 میں بشارت ہے پھر آیت 36 میں اہل کتاب سے دلیل نقلی اور دلیل وحی ہے پھر آیت 37 میں قرآن کی طرف ترغیب ہے۔

تفسیر 33 اس آیت میں پہلے دلیل عقلی کا بیان ہے پھر مشرکین کے لیے زجر اور وعید ہے: قَآئِمٌ: اس سے لوگوں کی تدبیر کرنے والا مراد ہے یا عالم کے معنیٰ میں ہے اور اس کا جواب حذف ہے یعنی: كَمَنْ هُوَ لَيْسَ كَذٰلِكَ: سَمُّوهُمْ اس سے مراد ان معبودوں کیلئے ایسے کمالات اور صفات بیان کرنا ہے جس سے وہ الوہیت کے حقدار ثابت ہوں: بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ: یعنی اللہ تعالیٰ کو زمین میں اپنا شریک معلوم نہیں ہے اور تم لوگ اللہ تعالیٰ کو خبر دے رہے ہو اس کے شریک کے بارے میں دراصل یہاں کنایہ ہے کسی شریک کے وجود نہ ہونے سے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے علم کی نفی کا معنیٰ وہ چیز وجود میں ہی نہیں: فِي الْأَرْضِ: زمین کی تخصیص اسلئے کی ہے کہ یہ ان لوگوں پر رد ہے جنہوں نے زمین میں الہ بنا رکھے تھے اور سورۃ یونس آیت 18 میں عام مشرکین کا رد کیا گیا ہے اسلئے وہاں زمین آسمان دونوں کا ذکر ہوا: أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ظاہر کا معنیٰ ہے سرسری یا اوپری باتیں وہ باتیں جو حقیقت پر مبنی نہ ہوں جن کی دلیل بھی نہ ہو اور وہ باطل بھی ہوں۔ مَكْرُهُمْ: اس سے مشرکین کے اعمال مراد ہیں: وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ: یہ مسبب کا سبب پر عطف ہے۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿٣٤﴾

"ایسے لوگوں کیلئے دنیاوی عذاب بھی ہے اور یقیناً آخرت کا عذاب تو بہت ہی سخت ہے اور ان کو کوئی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے والا نہیں ہوگا" [34]۔

تفسیر 34 اس آیت میں تخویف دنیاوی اوراخروی دونوں کا بیان ہے۔تخویف دنیوی سیلاب ،طوفان اور قحط کے ذریعے ہوتا ہے: وَاقٍ: صرف بچانے والے کو کہا جاتا ہے، خواہ ان کے پاس اختیار ہو یا نہ ہو اور: وَالٍ: کا معنیٰ ہے کہ حفاظت کے ساتھ ولایت بھی ہو یعنی اختیار۔یہاں: اَشَقُّ: کی تفسیر رہ گئی ہے یہ لفظ اپنے معنیٰ میں اکبر اور اغلظ سے زیادتی رکھتا ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿٣٥﴾

"(دوسری طرف) وہ جنت جس کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اس کا پھل بھی سدا بہار ہے اور اس کی چھاؤں بھی یہ ان لوگوں کا انجام ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا جبکہ کافروں کا انجام تو دوزخ کی آگ ہے" [35]۔

تفسیر 35 اس آیت میں ایمان والوں کیلئے خوشخبری ہے اور ایمان والوں اور کافروں کے انجام کا موازنہ ہے اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ: یہ دلیل ہے کہ جنت پر فنا نہیں آئیگی۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿٣٦﴾

"اے نبی! جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کلام پر اللہ سے خوش ہوتے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اور انہی گروہ میں سے وہ بھی ہے جو اس کی بعض باتوں سے انکار کرتے ہیں فرما دیجئے کہ مجھے تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ مانوں اسی بات کی میں دعوت دیتا ہوں اور اسی کے پاس میں نے لوٹ کر جانا ہے" [36]۔

تفسیر 36 اس آیت میں اہل کتاب کے نیک علماء سے نقلی دلیل لی گئی ہے کیونکہ یہ بات سورۃ بقرۃ کی تفسیر میں گزر چکی ہے

کہ: اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ: اہل کتاب کے نیک علماء کیلئے استعمال ہوتا ہے: یَفْرَحُوْنَ: فَرَحٌ سے دل کی تسلی واطمینان مراد ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ نیک علماء کو کتاب اللہ پر خوشی منانی چاہیے جیسا کہ سورۃ یونس آیت 58 میں ہے اور: اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ: کے مصداق صحابہ کرام یا سابقہ اہل کتاب ہیں جیسا کہ تفسیر خازن میں ہے۔ چونکہ یہاں پر مؤمن اور منکر کا تقابل مراد ہے لہذا تقابل کیلئے عقیدہ توحید اور آخرت پر ایمان اور اس کی طرف دعوت ذکر کرنا چاہیے تھا تو یہاں پر اس لئے فرمایا کہ: اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ: یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں۔ جبکہ آیت 30 میں صرف رحمان کے متعلق عقیدے کا اظہار مقصود تھا اس لئے وہاں دعوت ذکر نہیں کی گئی رحمانیت کے ساتھ توبہ کا ذکر مناسب تھا اس لیے: مَتَابِ: فرمایا جبکہ یہاں پر دعوت کا تذکرہ ہے تو اسلئے یہاں پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع مناسب تھا اس لئے: مَاٰبِ: فرمایا۔ پھر منکر کیلئے وعید ہے پھر دلیل وحی کا بیان ہے: مَنْ یُّنْكِرُ بَعْضَهٗ: بعض سے مراد توحید کا مسئلہ ہے یعنی وہ قرآن کو مانتے تھے مگر مسئلہ توحید میں انکو اختلاف ہے جیسا کہ سورۃ اسراء آیت 46 میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَمَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝ ع

"اور اسی طرح ہم نے اس (قرآن) کو واضح زبان میں بطور فیصلہ نازل کیا ہے اور اے نبی! آپ کے پاس واضح دلائل آنے کے بعد بھی اگر آپ نے ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ کے مقابل نہ تو تمہارا کوئی بچانے والا اور نہ مددگار ہوگا" |37|۔

تفسیر 37 اس آیت میں قرآن کی طرف ترغیب ہے کہ یہ فیصلوں کیلئے نازل کیا گیا ہے یعنی گزری ہوئی ہوئے آیت میں وہ حکم بیان ہوا ہے پھر بے دلیل باتوں کی پیروی کرنے پر وعید ہے جسکو: اَهْوَاۗءَ: کہا گیا ہے۔ یعنی قرآن آنے کے بعد جو کہ علم ہے: وَكَذٰلِكَ: یہ ماقبل کے معنی پر عطف ہے یعنی جس طرح ہم نے توحید اختیار کرنے کا حکم دیا ہے تو اس طرح اس کتاب کو ہم نے واضح فیصلوں کیلئے نازل کیا ہے

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّیَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

"یقیناً آپ سے پہلے بھی ہم نے رسولوں کو بھیجا ہے اور انہیں بیوی بچے بھی دیئے ہیں اور کسی رسول کو یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ خود سے کوئی معجزہ لیکر آئے مگر اللہ کے حکم سے ہر مدت کو لکھ دیا گیا ہے" [38]۔

خلاصہ اس آیت سے سورت کے آخر تک چھٹا باب ہے۔ آیت 38 اور 39 میں شبہات کا ازالہ ہے جو رسالت پر منکرین کی طرف سے کئے گئے ہیں۔ پھر آیت 40 میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے، پھر آیت 41، 42 میں تخویف دنیاوی ہے، پھر انکار رسالت پر ان کو وعید دی گئی ہے اور رسالت کے اثبات کیلئے اللہ تعالیٰ نے اہل علم کی شہادت آیت 43 میں ذکر کی ہے۔

تفسیر 38 اس آیت میں خواہشات کی پیروی کرنے والوں کے تین شبہات کا جواب مذکور ہے۔ پہلا شبہ کہ ہم اس کو رسول نہیں مانتے اسلئے کہ یہ بشر ہے اور اس کے بیوی بچے ہیں جواب دیا گیا کہ سابقہ انبیاء بھی اسی طرح (ایک دو کو چھوڑ کر) بچوں بیویوں والے تھے اور اس جواب میں ضمنی طور پر ان پر رد تھا کیونکہ انکا کہنا تھا کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں جبکہ وہ بھی بشر اور رسول تھے اور ان کے بھی بیوی بچے تھے اگر وہ باوجود بشر ہونے کے رسول ہو سکتے ہیں تو محمد ﷺ کیوں نہیں اگر وہ گزشتہ بشر نہ تھے تو پھر تم لوگ ان کی اولاد کیسے پیدا ہوئے۔ دوسرا شبہ کہ اگر یہ رسول سچے ہوتے تو ہمارے طلب شدہ معجزات لے آتے تو اس کا جواب ہوا کہ کسی رسول کو یہ اختیار نہیں کہ وہ خود سے معجزات لا سکے اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ مگر صرف حکم الٰہی سے لاتے۔ معلوم ہوا کہ معجزات میں نبیوں کا کوئی اختیار نہیں ہوتا اسی طرح سورۃ ابراہیم آیت 11، سورۃ انعام 109 اور سورۃ عنکبوت آیت 50 میں ہے۔ تیسرا شبہ کہ جب اس رسول کی رسالت حق ہے اور ہم اس کے منکر ہیں تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا تو جواب ہوا کہ: لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ: ہر مدت کو لکھا گیا ہے ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک۔

یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ ۖۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

"اللہ تعالیٰ جس حکم کو چاہتا ہے منسوخ کر دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) باقی رکھتا ہے اور تمام کتابوں کی جو اصل ہے وہ اسی (اللہ) کے پاس ہے" [39]۔

تفسیر 39 اس میں ان کے چوتھے شبہ کا جواب ہے۔ شبہ یہ تھا کہ جب ہمارا عذاب لکھا جا چکا ہے تو پھر ایمان لانے کا کیا

فائدہ ہوگا؟ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس کتاب ہے جس میں سے بعض چیزوں کو وہ مٹاتا ہے اور بعض کو چھوڑ دیتا ہے لہٰذا اگر تم ایمان لاؤ تو تمہارے عذاب کے حکم کو مٹا دیگا: يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ: ایک معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک کتاب المحو والاثبات ہے اور وہ کتاب ملائکہ کے پاس بھی ہے اور انکے علم کی نسبت اس میں مٹانے اور چھوڑنے کا عمل ہوتا ہے یہ لَوْحُ الْمَحْفُوْظ: میں اُمُّ الْكِتٰبِ: کے سوا ہے اس پہلے والے کو تقدیر معلق اور دوسرے والے کو تقدیر مبرم بھی کہتے ہیں۔ دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نازل کردہ احکام میں سے بعض کو منسوخ کرتا ہے اور بعض کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ تیسرا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض گناہوں کو توبہ کے ذریعے معاف کرتا ہے اور اس کی جگہ نیکی برقرار رکھتا ہے۔ چوتھا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض گناہوں کو توبہ کے بغیر معاف کرتا ہے اور بعض کو توبہ نہ کرنے کی وجہ سے برقرار رکھتا ہے۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝

"اور جس عذاب کی دھمکی ہم ان کو دیتے ہیں چاہے اس کا کچھ حصہ ہم آپ کو دکھائیں یا آپ کو اس سے پہلے دنیا سے اٹھالیں تمہارے ذمہ تو صرف پیغام پہنچانا ہے حساب کی ذمہ داری ہماری ہے" [40]۔

تفسیر 40 مشرکین کے شبہات کے بعد اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ منکرین پر جو عذاب آئے گا اگر آپ کی حیات میں آجائے تو آپ دیکھ سکیں گے اور اگر آپ وفات پا گئے تو پھر نہیں دیکھ پائیں گے البتہ آپ کے ذمہ پہنچانا ہے عذاب تو اپنے وقت مقرر پر آئے گا آپ اس کی پرواہ مت کیجئے۔ اس طرح سورۃ یونس آیت 42 اور سورۃ زخرف آیت 41 اور 42 میں بھی ہے۔ ان کا جزاء مقدر ہے یعنی ان کے عذاب کی فکر مت کرو اس آیت میں وفات کو نُرِيَنَّكَ کے مقابلے میں ذکر کیا گیا ہے یعنی اس میں اشارہ ہے کہ وفات کے بعد نبی کریم ﷺ دنیا اور امت کے حالات سے بے خبر ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ۭ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

"کیا ان لوگوں کو یہ حقیقت نظر نہیں آئی کہ ہم ان کے ملک کو چاروں جانب سے گھٹاتے چلے جا رہے ہیں؟ ہر حکم اللہ تعالیٰ دیتا ہے کوئی نہیں جو اس کے حکم کو توڑ سکے اور وہ جلد حساب لینے والا ہے" [41]۔

تفسیر 41 گزشتہ آیت میں جس تخویف دنیوی کا بیان ہوا تھا اس آیت میں اس عذاب کی تفصیل بیان ہو رہی ہے اور

اطراف کے نقصان سے مکہ کے قرب وجوار میں لوگوں کا اسلام قبول کرنا اوران علاقوں پر مؤمنین کا غلبہ حاصل کرنا مراد ہے ۔دوسرا معنی یہ ہے کہ ہم زمین سے برکات کو ختم کرتے ہیں اور لوگوں کے شرک اور گناہوں کی وجہ سے سیلاب اور طوفان بھیجتے ہیں اور آیت کے عموم میں یہ بات داخل ہے ہم علماء اور صالحین لوگوں کو اٹھا لیتے ہیں۔ پہلی توجیہ پر اعتراض ہے کہ یہ سورت تو مکی ہے اور فتوحات تو مدنی دور میں ہوئی ہیں ۔ جواب: سورت مکی ہے مگر یہ آیت اس میں مدنی ہے یا پھر بطور پیشگوئی خوشخبری ہے۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۭ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۭ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ۝

"جو لوگ ان سے پہلے گزر رے ہیں، چالیں انہوں نے بھی چلی تھیں مگر تدبیر تو تمام تر اللہ تعالیٰ کی کامیاب ہے کوئی بھی شخص جو کوئی بھی عمل کرتا ہے وہ اس کو معلوم ہے اور کافروں کو عنقریب معلوم ہوگا کہ آخرت کا بہترین انجام کس کا ہے" [42]۔

تفسیر 42 "وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: سابقہ قوموں نے عذاب سے بچنے کیلئے اور نبیوں کی مخالفت میں مختلف تدبیریں کی تھیں لیکن اس کے ذریعے ان کو کوئی مقصد حاصل نہیں ہوا۔ اس میں اشارہ ہے کہ عذاب الٰہی کسی تدبیر سے پلٹتا نہیں ہے۔ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ: خیر کی تدبیر ہو یا شر وفساد کی ہو اس میں تاثیر اللہ تعالیٰ ہی ڈالتا ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝ ع

"اور جن لوگوں نے ارتکاب کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ آپ رسول نہیں ہیں، فرما دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کیلئے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور ہر وہ شخص جس کے پاس کتاب کا علم ہے" [43]۔

تفسیر 43 اس آیت میں منکرین رسالت کے لیے زجر اور وعید ہے اور اسی طرح اثبات رسالت رسول اللہ تعالیٰ کی گواہی کے ساتھ اسی طرح سورت عنکبوت آیت 52 اور سورت احقاف آیت 8 میں بھی ہے: وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ: اس میں مؤمنین اہل کتاب کا ذکر ہے جیسا کہ اس سورت میں آیت 36 میں گزرا ہے یا اس سے مراد جبرئیل امین ہے یا تمام مؤمنین مراد ہیں اور کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ: وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ: یہ بطریقہ قسم ہے یعنی قسم ہے اس ذات کی جس کے پاس تمام کتابوں کا علم ہے اور وہ ذات الٰہی ہے۔

سورۃ الرعد کی خصوصیات:

ا۔ کثرت سے دلائل عقلیہ اس میں وارد ہیں۔

۲۔ کثرت سے امثال اس سورۃ میں وارد ہیں۔

۳۔ مؤمنین کے صفات بھی اس میں کثرت سے ہیں۔

۴۔ رسالتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے شبہات اور انکا ازالہ۔

۵۔ شرک پر کثرت سے وعیدات اس سورۃ میں وارد ہیں۔

بحمد اللہ تعالیٰ سورۃ رعد کی تفسیر مکمل ہوئی۔